اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ

مقالاتِ راشدیہ

از قلم محدثُ العصر فضیلۃ الشیخ ابوالقاسم سید محب اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ علیہ

تقریظ سید قاسم شاہ راشدی حفظہ اللہ تقدیم پروفیسر مولا بخش محمدی حفظہ اللہ

اِعداد الشیخ افتخار احمد تاج الدین الازہری حفظہ اللہ

جلد اوّل

- ردّ قادیانیت
- انسانی اعضاء کی پیوندکاری کا حکم
- نماز میں سر ڈھانپنے کا مسئلہ
- تصویر کشی کا حکم
- اذانِ عثمانی
- محمد بن عبدالوہاب ایک مجدد
- پردہ اور اسلام
- مسئلہ تراویح
- قبلہ رخ پاؤں کرنے کا مسئلہ
- فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کا حکم
- رکوع کے بعد ہاتھ چھوڑنا
- اہلحدیث کی امتیازی خصوصیات
- ”کیا حضرت آسیہ، مریم اور موسیٰ کی بہن علیہم السلام جنت میں نبی ﷺ کی بیوی ہوں گی“ کی تحقیق
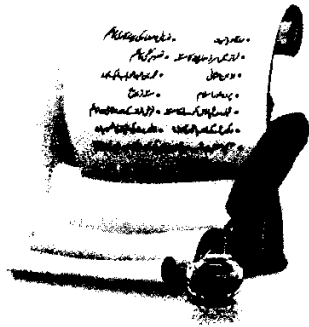
مقالاتِ راشدیہ
جلد اول
محدث العصر فضیلۃ الشیخ ابو القاسم سید محب اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ

نام کتاب

مقالاتِ راشدیہ

جلد اول

تالیف

محدث العصر فضیلۃ الشیخ ابو القاسم

سید محب اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ علیہ

تقریظ

سید قاسم شاہ راشدی حفظہ اللہ

تقدیم

پروفیسر مولا بخش محمدی حفظہ اللہ

اعداد

الشیخ افتخار احمد تاج الدین الازہری حفظہ اللہ

باہتمام

حافظ ثناء اللہ خاں (بیرانی)

تاریخ اشاعت

فروری 2011ء

مطبوعہ

چاچا حمید پرنٹرز لاہور

ناشر

نعمانی کتب خانہ

لاہور

e-mail: nomania2000@hotmail.com

NOMANI

COPY RIGHT

All rights reserved

Exclusive rights by Author. No part of this publication may be translated, reproduced, distributed in any form or by any means or stored in a data base retrieval system, without the prior written permission of the Author.
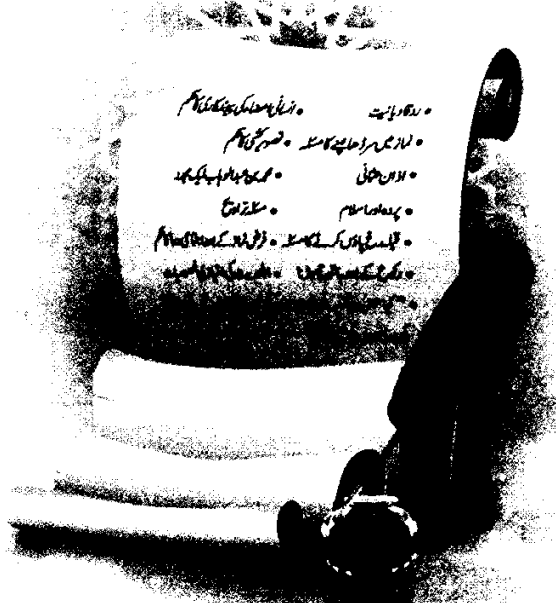
أُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ
مقالاتِ راشدیہ
از قلم محدث العصر فضیلۃ الشیخ ابو القاسم سید محب اللہ شاہ الراشدی رحمۃ اللہ علیہ
تقریظ سید قاسم شاہ راشدی حفظہ اللہ تقدیم پروفیسر مولا بخش محمدی حفظہ اللہ
اعداد الشیخ افتخار احمد تاج الدین الازہری حفظہ اللہ
جلد اوّل
NOMANI
نعمانی کتب خانہ
حق سٹریٹ اردو بازار لاہور 042 37321865
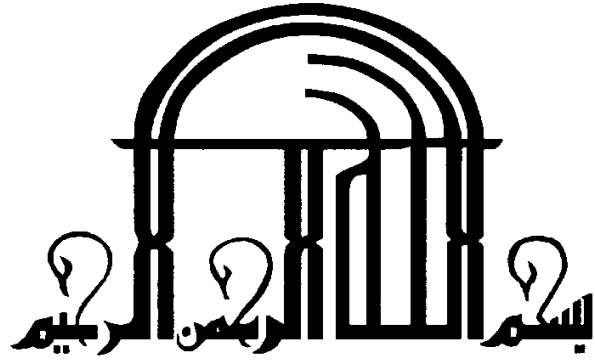
شروع اللہ کے نام سے

جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

باب اوّل — 1 — عقائد

البرهان القاطع من الله الوهاب الواحد علی ان سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ولد بلا والد

[illegible]

باب دوم — 2 — مسائل

افصح التبیان و اوضح البرهان علی لا صلوة لمن لم یقرأ فیها بام القرآن

باب سوم
3 تحقیق و تنقید

باب چہارم
4 سوالات و جوابات

باب پنجم
5 شخصیات

تقریظ

میرے والد محترم محب اللہ شاہ راشدی صاحب العلم السادس جن کا علمی دنیا میں ایک نام ہے جب بھی سندھ کے اکابر علماء کرام، فقہاء عظام کا نام لیا جاتا ہے تو ان میں سرفہرست انہی کی شخصیت ہوتی ہے، جنہوں نے بھی ان سے محبت کی وہ آج بھی ان کی یاد میں آنسو بہاتے نظر آتے ہیں، کیونکہ! ان کی شخصیت میں نہ کوئی تصنع بازی اور نہ ہی دروغ گوئی تھی بلکہ ہمیشہ محبت میں مگن سرشار رہتے تھے اور ہر ایک کے کام آنے والے تھے، تکبر اور غرور سے پاک، بات کرنے میں میٹھا پن اور خاموش طبع انسان تھے، کوئی بات کرے تو جواب دیں ورنہ اکثر خاموش رہا کرتے تھے اگر میں یہ کہوں کہ وہ اسوۂ رسول اللہ ﷺ کا عملی نمونہ تھے تو اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔

آج وہ ہم میں نہیں لیکن ان کی تحریر کردہ کتب، مقالات، فتاویٰ جات اور مضامین موجود ہیں، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک اعلیٰ مرتبہ مصنف تھے آپ کی تصانیف میں طرز استدلال محدثانہ اور طرز تحریر میں سلف صالحین کا نمونہ نظر آئے گا، کسی پر بے جا تنقید نہ فرماتے اور بحث برائے بحث بھی نہ کرتے تھے۔ ہمارے استاد مولانا دوست محمد لکھمیر نواب شاہی فرماتے تھے کہ حضرت سید بدیع الدین شاہ رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ (اگر بھائی محب اللہ شاہ صاحب کسی کتاب یا حدیث پر کوئی نوٹ لکھ لیں تو ہمیں اس کے رد کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی اور میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ علم وعمل میں بحر بے کنار تھے)

اب آپ خود ان کے مقالات پڑھ کر آپ اندازہ لگالیں گے کہ ان کا علم کتنا دقیق اور طرز استدلال کتنا زور کا تھا ان کے مضامین میں علمی حقائق راہ اعتدال، فکر ونظر میں وسعت اور تبحر علمی اور وقت نظر عیاں تھی۔

انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر میں یہاں اپنے ان دو مخلص ساتھیوں کا ذکر نہ کروں، جنہوں نے یہ مقالات آپ تک پہنچانے میں مرکزی کردار ادا کیا جناب دوست محترم فضیلۃ الشیخ جناب افتخار احمد الازہری کا جنہوں نے والد محترم کے علمی ذخیرہ کو ایک جگہ دن رات ایک کر کے جمع کر دیا اور پھر یہ شاہکار آپ کے ہاتھوں میں جو اس وقت موجود ہے انہی کی سعی جمیلہ کا نتیجہ ہے اور جناب محترم حافظ ثناء اللہ خان صاحب کا کہ جنہوں نے ہم سے دور رہتے ہوئے اس کام کو دین کی خدمت اور اپنے استاد محترم کی خواہش کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ ان مخلص ساتھیوں کی کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین

قارئین سے میں معذرت خواہ ہوں کہ والدہ صاحبہ کی علالت کی وجہ سے تفصیلی مقدمہ نہ لکھ سکا آئندہ اشاعت میں تفصیلی مقدمہ لکھ دوں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

سید قاسم شاہ راشدی

13/2/2011

مقدمہ

علمی دنیا میں فن رجال کے امام علامہ سید محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ کا نام اظہر من الشمس ہے۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے، بلا شبہ ایسی نابغہ روزگار ہستیاں سعادت مند اقوام میں ہی جنم لیتی ہیں۔ انہوں نے پوری زندگی کتاب وسنت کی خدمت میں بسر کر دی۔ علامہ کے علمی، ادبی، تحقیقی اور تدقیقی کارناموں میں ان کی سب سے نمایاں خدمات حدیث اور فن حدیث میں ہیں' ان کی تحریری خدمات میں مزید مسائل علمیہ کا حل، فتاوی نویسی، اہم مجتہدانہ مسائل میں کتاب وسنت کی روشنی میں رہنمائی، بیش بہا علمی وادبی خطوط وغیرہ کے علاوہ متعدد موضوعات پر پچاس سے زائد کتب تصانیف وتالیف فرمائیں، جن کی شان ومنزلت کے لیے ان کی صرف ایک کتاب "التحقیق الجلیل فی ان ارسال بعد الرکوع فی الصلوٰۃ ھو الحق من حیث الدلیل" کا نام لینا ہی کافی ہے اس کے علاوہ متعدد موضوعات پر بلند پایہ کتب، کتب احادیث پر شروح وحواشی سے مزین کر کے تشنگان علوم کی سیرابی کا سامان فراہم کیا۔

مزید یہ کہ آپ نے اپنے پیچھے نادر ونایاب، مضامین، مقالات، رسائل ومسائل ناقدانہ ومحققانہ مضامین کا بھی ایک عظیم الشان ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ جو انہوں نے بڑی مہارت، لیاقت اور قابلیت سے قلمبند فرمایا، جس کے مطالع سے جہاں متعدد علمی وتاریخی عقدے حاصل ہوتے ہیں وہیں پر دل ودماغ میں علمی وسعت پیدا ہو کر آئے، ہر دن پیش آنے والے متعدد واقعات کا حل بھی ملتا ہے، اخلاق وعادات، رواج ورسوم، سیاسی معاشی ومعاشرتی پریشانیوں سے بھی نجات ملتی ہے۔ ان کے مضامین میں علمی حقائق، متعدد مصابیح راہ اعتدال، فکر ونظر میں وسعت، نصیحت ہدایت کی دلکشی ودلآویزی بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ غرضیکہ سید صاحب کے مضامین ومقالات سدابہار گلدستہ سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ ان گلہائے رنگ رنگ سے بھینی بھینی خوشبو ذہن وفکر کو معطر کرنے کے ساتھ بالیدگی بھی بخشتی ہے، یہ یادگار مقالات شاہ صاحب کے تبحر علمی، وسعت مطالعہ، دقت نظر کے بھی غماز ہیں یہ ان کی یادگار تصانیف وتالیفات میں بھی بھرے گلستان میں گل سرسبد سے کسی طرح کم نہیں۔

افسوس کہ یہ علمی ارمغان مدت مدید سے قارئین کرام سے اوجھل تھا، ہمیں بھی خدشہ تھا کہ کہیں مرور زمانہ سے قیمتی مواد ضائع نہ ہو جائے، عرصہ سے ان جواہر ریزوں کو ایک سلک میں منسلک کر کے قارئین کرام تک پہنچانے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

علامہ شاہ صاحب مرحوم کے سانحہ ارتحال کو بھی ایک عرصہ بیت چکا تھا۔ بالآخر یہ کام علم وادب سے وابسطہ اخی

المکرّم، فاضل نوجوان مولانا محترم افتخار احمد تاج الدین الازہری حفظہ اللہ نے اپنے ذمہ لے لیا جو اس سے قبل اپنے ادارہ بحر العلوم سلفیہ کی جانب سے مفسر قرآن علامہ ابو محمد بدیع الدین شاہ کی خدمات جلیلہ پر ''شیخ العرب والعجم'' کے نام سے ایک ضخیم نمبر شائع کر کے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں، جس کے بعد شب وروز اس کی یہ تمنا بھی رہی کہ کسی طرح علامہ سید محب اللہ شاہ راشدی کی سوانح حیات بھی مرتب کر کے قارئین تک پہنچا سکوں۔ اسی کام کے دوران ہی شاہ صاحب کے مقالات ومضامین یکجا کر کے اشاعت کا اعزاز حاصل کرنا چاہتے تھے ؂

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ

یہ کام کتنا وقت طلب، مشکل ترین، محنت وسعی کا متقاضی ہے، وہ اصحاب علم وفن سے مخفی نہیں۔ ان کی شب وروز کی محنت کام آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسا مجموعہ مضامین مرتب ہوا جس میں شاہ صاحب مرحوم کے مقالات ومضامین جلد اول کی صورت میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین کرام تک پہنچ رہے ہیں۔ ان شاء اللہ شاہ صاحب کے بقایا مضامین ومقالات دوسری اور تیسری جلد کی رونق بنیں گے۔ بفضل خدا محترم الازہری صاحب نے جو محنت کی ہے وہ ایک ادارہ کا کام ہے۔ کام بڑا کٹھن تھا، پرانے اخبارات، ورسائل سے یہ مضامین ڈھونڈ نکالنا، عربی اور سندھی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنا، بوسیدہ اوراق سے مواد مرتب کرنا محنت وسعی کا متقاضی ہے، جس پر رب کریم ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

علامہ سید محب اللہ شاہ کی زندگی پر اگر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ شاہ صاحب کو بچپن سے پڑھنے لکھنے، تحقیق وتدقیق کا بے حد اشتیاق تھا، جو ان کی زندگی کے آخری لمحات تک باقی برقرار رہا، انہوں نے اپنے وقت کے جملہ علوم وفنون میں تخصیص حاصل کرنے کے بعد خصوصاً عربی ادب اور فارسی میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے بعد آپ نے علوم عصری میں بھی خصوصی مہارت سے ''پوسٹ گریجویٹ'' تک تعلیم کی تکمیل کر لی، اس طرح آپ نے فاضل علوم شرقیہ (ایم۔او۔ایل) کے درجہ تک بھی رسائی حاصل کی۔ مختصر وقت کے لیے آپ نے عربی میں بلند پایہ شاعری پھر بھی طبع آزمائی شروع کی۔ لیکن ان کے والد ماجد علامہ سید احسان اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ کی ہدایات پر شعر وسخن کو الوداع کہہ کر پھر فن رجال میں مہارت حاصل کی پھر حدیث اور فن حدیث کے ہی ہو کر رہ گئے، جب بھی کسی سے ملتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ مدتوں بعد ملے ہیں، ان کی زباں مطالعہ کے بعد ہمیشہ ذکر اللہ سے مرطوب رہتی تھی سچ ہے ؂

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالہ حیات
تا بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسانات کے راقم الحروف کو مدت مدید تک حضرت علامہ سید محب اللہ شاہ راشدی کا سایہ عاطفت، اور شرف تلمذ حاصل رہا۔ میں نے ان سے اہم کتب باقاعدہ زانوئے ادب طے کر کے پڑھیں، اور

ان کو بہت ہی قریب سے دیکھا، آپ کی خوبیوں اور شان ومنزلت سے واقفیت حاصل ہوئی۔ اس قحط الرجال کے دور میں ایسے پیکر اخلاص کہاں ملتے؟

ما قصہ سکندر ودارا نہ خواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

بلاشبہ علم وفن کا چمن اپنے اس دیدہ ور اور یکتائے روزگار پر ہمیشہ فخر کرتا رہے گا، ان کا خلوص، دیانتداری نرمی طبع، اعتدال پسندی، وسیع القلبی، وسعت ظرفی۔ آپ کی نمایاں خوبیاں تھیں۔ ان کے ہر مکتب فکر کے اصحاب علم وفضل سے اچھے تعلقات تھے، وہ محبت بانٹتے تھے، شاہ صاحب کے ہاں کتابوں کی رفاقت کے بغیر زندگی کا تصور نہ تھا۔ عمر بھر کتابوں کے درمیان رہے اس کے کون کون سے اوصاف گنوائے جائیں۔

اے تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم

شاہ صاحب سے دیرینہ خلوص ووفا کا رشتہ تھا بلکہ ہم کئی عشروں سے باہم خط وکتابت کے سلسلہ میں بھی منسلک رہے ہیں۔ جن کے شاہدان کے خلوص نامہ آج بھی عزیز جان کیے ہوں۔

مجھے علامہ سید محب اللہ شاہ راشدی صاحب اور ان کے برادر عزیز مفسر قرآن علامہ بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ سے دیرینہ تعلقات کے دوران ایک چیز مشترکہ نمایاں نظر آئی کہ دونوں حضرات نے کسی لحہ بھی مسلک اہل حدیث پر آنچ نہ آنے دی۔ ہر وقت احقاق حق وابطال باطل کے فریضہ کو احسن انداز میں نبھایا۔ مزید یہ کہ دوران تحقیق اگر کوئی بات کتاب وسنت سے ثابت نظر آئی تو اسی وقت صحیح بات پر نہ صرف خود عمل کرتے بلکہ اس کو دوسروں تک پہنچانا بھی اپنا فریضہ تصور کرتے تھے، مجھے ان کی پوری زندگی میں نہ علم میں بخل نظر آیا نہ علمی کبر تحقیق وتدقیق کے میدان میں شاید ہی کوئی ان کا مقابل دیکھا ہو، یہ برادران جب لکھتے یا بولتے تو اس موضوع کا حق ادا کردیا کرتے تھے۔

آخر میں مقالات راشدی کی اشاعت میں کلیدی کردار کے حامل حضرت علامہ محبت اللہ شاہ راشدی کے فرزند ارجمند، منبع علم وکمال بچپن کے رفیق شفیق فضیلۃ الشیخ سید محمد قاسم شاہ راشدی حفظہ اللہ کا بے حد ممنون ہوں، جس نے ذاتی دلچسپی لے کر، مفید مشوروں، مواد کے حصول، ترتیب وتبویب میں کمال شفقت کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا وعقبیٰ میں جزائے خیر عطا فرمائے۔ کراچی کے عزیز القدر صاحب علم وفضل علامہ راشدی سے بے پناہ محبت کرنے والے مخلص بھائی حافظ محمد نعیم کا شکریہ ادا نہ کرنا زیادتی ہوگی جس نے شاہ صاحب کی تصنیفات میں ہمیشہ نمایاں کردار ادا کیا ہے، آپ بلاشبہ پیکر اخلاص ہیں۔

اسی طرح نعمانی کتب خانہ مدیر محترم ضیاء الحق نعمانی صاحب بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے خصوصی دلچسپی سے اپنے ادارے کے زیر اہتمام خوبصورت اشاعت ممکن بنائی۔

امید ہے کہ ارباب علم وفضل کے ہاں یہ کتاب دست شوق میں لی جائے گی۔اور شرف قبولیت سے نوازی جائے گی۔

قارئین کرام سے بھی التماس ہے کہ مقالات کے مطالعہ کے وقت بشری تقاضوں کے تحت اگر کہیں اسقام نظر آئیں تو ازراہ کرم مرتبین کو مطلع کیا جائے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کی جائے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص عمل کی توفیق عطا فرمائے اور سلف صالحین کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یارب العالمین

مولابخش محمدی (نوکوٹ سندھ)

14/2/2011

❁❁❁❁

مصنفؒ کے مختصر حالات زندگی
اور
مقالات راشدیہ

نام ونسب:

محب اللہ والد گرامی کا نام، احسان اللہ دادا کا نام، رشد اللہ اور کنیت ابوالقاسم ہے۔ ابتدا میں شاہ صاحب نے اپنی کنیت ابوالروح اللہ رکھی تھی جو برائے اختصار ابوالروح لکھا کرتے تھے۔ روح اللہ شاہ صاحب کے بڑے بیٹے تھے جو تیرہ چودہ سال کی عمر میں کارحارثہ میں فوت ہوگئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد آپ نے اپنے چھوٹے بیٹے محمد قاسم کی پیدائش کے بعد اپنی کنیت ابوالقاسم رکھ لی، اس لیے بعد کی تحریرات میں شاہ صاحب رحمہ اللہ اپنی کنیت ابوالقاسم لکھا کرتے تھے جس طرح ان کی کتب پر ان کے دستخط اور دستاویزات اور مہر وغیرہ سے عیاں ہوتا ہے۔ [1]

آپ کا نسب نامہ کچھ اس طرح ہے:

محب اللہ بن احسان اللہ شاہ بن رشد اللہ شاہ بن رشید الدین شاہ بن محمد یاسین شاہ بن محمد راشد شاہ بن سید محمد بقا شاہ رحمہم اللہ۔

جھنڈے والے کہلانے کی وجہ:

سید محمد راشد شاہ صاحب رحمہ اللہ کے بہت سے بیٹے تھے لیکن سب میں جو دو بڑے تھے ایک سید محمد یاسین شاہ اور دوسرے سید صبغت اللہ شاہ رحمہ اللہ، سید محمد راشد شاہ رحمہ اللہ کے پاس ایک جھنڈا تھا کہا جاتا ہے کہ یہ جھنڈا افغانستان کے بادشاہ نے انہیں دیا تھا پھر یہ جھنڈا انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے سید محمد یاسین شاہ رحمہ اللہ کو دے دیا اور ان کی دستار (پگڑی) سید صبغت اللہ شاہ رحمہ اللہ کے پاس رہی، اس طرح سید صبغت اللہ شاہ رحمہ اللہ اور ان کی اولاد پگاڑا کہلائے اور سید محمد یاسین شاہ رحمہ اللہ اور ان کی اولاد جھنڈے والے کہلائے۔ [2]

پیدائش:

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی پیدائش ۲۹ محرم ۱۳۴۰ ہجری بمطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ عیسوی گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدرآباد میں ہوئی۔

---

[1] محدث العصر نمبر، ص: ۳٦.

[2] محدث العصر نمبر، ص: ۳.

آپ کا نام محب اللہ آپ کے جدامجد سید رشد اللہ شاہ رحمہ اللہ نے تجویز کیا تھا۔

تعلیم وتربیت:

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ نہایت صوم وصلاۃ کا پابند کتاب وسنت پر عامل اور تقویٰ وپرہیز کا ایک مثالی نمونہ تھا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم سے لے کر آخر تک اپنے گاؤں کے تاریخی مدرسہ دارالرشاد پیر جھنڈو میں حاصل کی۔ ناظرہ قرآن پڑھنے کے بعد آپ نے عربی فارسی اور انگریزی میں تعلیم حاصل کی آپ کے کُل اساتذہ کی تعداد ۱۸ تھی۔

شاہ صاحب نے جس فن کو بھی پڑھا اس میں مہارت تامہ حاصل کی یہاں تک کہ شعر شاعری میں بھی حصہ لیا، حالانکہ والد صاحب یونانی فلسفہ پڑھنے کے مخالف تھے لیکن والد صاحب کو مطمئن کر کے انہوں نے یہ علم بھی بفضلہ تعالیٰ حاصل کر لیا۔ شاہ صاحب کے کہے ہوئے چند اشعار ؎

یَـا عَـاشِـقَ الـدنیـا تُبـصـر انِهَـا
مِـثـل الیَـلامـع فـی مـلاع تـلـمع
فـالـمشتهـی فیهـا وان یك متـرفـا
لاشك فـی آل الـغـدا قـد یـمـلـح
فـاقـنـع بهـا یـا صـاح بـالـزاد الیسیر
ولا تـکـن فـی کـل واد تشـرع
واعـلـم بـانك راحـل عـنهـا الـی
بیـت یـحـض لـه شـجـاع اقـرع
واتـرك فـضـول الـقـول والـزم ذکـر من
مـا زال اردع فهـو ورد الـضـرع

اس دینی علوم کے ساتھ ساتھ آپ نے عصری تعلیم میں M.A ریلیجیر (مذاہب) سندھ یونیورسٹی سے ساٹھ کی دہائی میں کیا۔

اساتذہ کرام:

شاہ صاحب کے اساتذہ کی تعداد ۱۸ تھی چند کے اسماء گرامی یہ ہے، حافظ محمد امین، مولانا ولی محمد صاحب، مولانا محمد اسماعیل صاحب، مولانا محمد اکرم سندھی صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب، ان اساتذہ کرام سے آپ نے فارسی، ادب صرف، نحو، بلاغہ اور علم المعانی جیسے علوم میں مہارت تامہ حاصل کی جبکہ حدیث، شریف میں مولانا

عبدالوہاب صاحب مولانا عبدالحق بہاولپوری، مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی اور مولانا عطاءاللہ صاحب حنیف سے سند حدیث حاصل موخرالذکر تین اساتذہ کے پاس آپ نے صرف حدیث شریف پڑھی تھی۔

مشہور تلامذہ:

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنی عمر کا ایک طویل عرصہ مدرسہ دارالرشاد موجودہ درگاہ شریف میں درس تدریس میں گزارا، جو بھی طالب علم آپ کے پاس آتا، وہ آپ کے دامن سے موتی چن کے جاتا، آپ کے تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے جن میں چند یہ ہے۔

مولانا محمد ابراہیم اعوان صاحب، مولوی عبدالغنی بن الشیخ العلامہ اللہ بخش تسیو، پروفیسر مولانا بخش محمدی صاحب، شیخ یعقوب بن موسیٰ جنتی صاحب اور محترم ابواب ایوب ممدوح بن فتحی الکویتی وغیرہم ان کے علاوہ ملک بھر سے بے شمار علماء کرام نے آپ سے استفادہ کیا۔

خراج تحسین:

شیخ محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا تھا، آپ صرف نحو کے علاوہ تفسیر اور حدیث میں، امتیازی حیثیت کے حامل تھے یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے اور غیروں کی نگاہوں میں بھی بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، چند معاصرین علماء کی ان کے بارے میں آراء پیش کرتا ہوں (جبکہ تفصیلی مضمون مجملہ بحرالعلوم کا محدث العصر نمبر۲ میں ملاحظہ فرمائیں) جس سے ان کے علم وعمل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جماعت اہل حدیث کے عظیم محقق ومحدث مولانا ارشادالحق اثری صاحب حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

محب اللہ شاہ راشدی صاحب وہ ہستی ہیں کہ جن کے تذکرے کے بغیر تاریخ سندھ نامکمل ہے، آپ علم وفضل، ورع وتقویٰ تحمل و بردباری کا پہاڑ تھے۔ آپ کی زندگی بلاریب سلف نمونہ تھی۔ تواضع وانکساری، مہمان نوازی، صاف گوئی میں آپ جیسا کوئی نہ تھا، اکل حلال، صاف مقال اور اتباع سنت ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

آپ کا اوڑھنا بچھونا صرف کتابیں تھیں، آپ اس بات کے حقیقی مصداق تھے ؎

مریں گے کتابوں میں ورق ہوگا کفن اپنا

مولانا فیض الرحمٰن ثوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ھو عالم کبیر" ماہنامہ "الحدیث" حضرو جماعت کے عظیم عالم دین اور محقق اہل حدیث محترم حافظ زبیر علی زئی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"اگر مجھے رکن ومقام کے درمیان کھڑا کر کے قسم دی جائے تو یہی کہوں گا کہ میں نے شیخنا محب اللہ شاہ

سے زیادہ نیک، زاہد اور افضل اور شیخ بدیع الدین شاہ سے زیادہ عالم وفقیہ انسان کوئی نہیں دیکھا۔''
(ماہنامہ الحدیث حضرو)

مورخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''حضرت پیر سید محب اللہ شاہ صاحب علم وفضل کے اعتبار سے بڑے جامع الکمالات تھے، تمام علوم اسلامیہ پر ان کو مکمل دسترس حاصل تھی، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ تاریخ وسیر، اسماء الرجال، ادب، فلسفہ اور منطق میں ید طولیٰ حاصل تھا، علوم حدیث سے قلبی لگاؤ تھا اور اسماء الرجال پر ان کا وسیع مطالعہ تھا، تحقیق وتدقیق میں ان کو بہت زیادہ مہارت تھی۔'' (کاروان سلف)

وفات:

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی وفات ۹ شعبان ۱۴۱۵ ہجری بمطابق ۲۱ جنوری ۱۹۹۵ء حیدر آباد میں ہوئی۔ آپ کا جنازہ آپ کے برادر اصغر شیخ العرب والعجم ابو محمد بدیع الدین رحمہ اللہ نے پڑھایا اور اپنے آبائی گاؤں میں اسود خاک ہوئے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ.

مقالات راشدیہ:

مقالات راشدیہ دراصل شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تصانیف ومضامین کا وہ مجموعہ ہے جو مدت مدید سے غیر مطبوع اور مخطوط تھا، جس کو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بڑی عرق ریزی سے لکھا تھا، ان میں بعض تو عربی اور سندھی زبان میں تھے، جنہیں عوام کی ضرورت کے تحت اردو زبان میں ڈھالا اور بعض مضامین شاہ صاحب نے کسی کے استفسار پر تحریر کیے اور بعض پر تنقید فرمائی اور بعض کی تحقیق کی شاہ صاحب کی عادت مبارکہ تھی کہ وہ تمام جرائد کا دلجمعی سے مطالعہ کرتے تھے اور کوئی بھی مضمون یا تحقیق ان کو غیر سلیم نظر آئی تو فوراً اس پر نقد فرما کر ان جرائد کو روانہ کر دیتے تاکہ کلمۃ الحق اداء ہو سکے۔ ویسے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تصانیف کی کل تعداد ۵۷ ہے، جن میں بعض مطبوع بھی ہیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تصانیف کردہ کتب سے ۲۸ کتب کو مقالات راشدیہ کے نام سے جمع کر کے پیش خدمت ہے اور جو مضامین اور کتب رہ گئی ہے ان شاء اللہ اگلی جلدوں میں ان کو شائع کر دیا جائے گا۔

مقالات راشدیہ کے نام اور وجہ تصنیف:

آخر میں اپنے تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھ سے ہر قسم کا تعاون کیا خصوصاً شاہ صاحب رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند محترم قاسم شاہ راشدی حفظہ اللہ جنہوں نے شاہ صاحب رحمہ اللہ کا تمام علمی مواد مہیا کیا اور طبع کی اجازت دی، اس طرح میں پروفیسر مولا بخش محمدی حفظہ اللہ کا بے حد شکر گذار ہوں جنہوں نے بے پناہ مصروفیات کے باوجود اس کتاب پر ایک بہترین اور جامع مقدمہ تحریر فرمایا اور میری ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی،

اوراس طرح اس مقالات راشدیہ کے کلیدی کردارادا کرنے والے میرے شاگرد رشید محترم حافظ ثناء اللہ سندھی صاحب جنہوں کی توجہ اوراصرار سے اس طرف گامزن ہوااور پھرانہوں نے عرق ریزی سے اس کتاب کی تصحیح اور پروف کیااور طبع میں اہم کردارادا کیا اللہ تعالیٰ اس نوجوان کی عمراور عمل میں اضافہ فرمائیں۔آمین

اس کے علاوہ جامعہ بحرالعلوم السلفیہ میر پور خاص کے اساتذہ کرام خصوصاً مولانا عبداللہ سلیم، شیخ راشدالحسن صاحب، مولانا منیر احمد سلفی اور مولانا کاشف رضا صاحب جنہوں نے اس مقالات میں تصحیح کی اور آخر میں اگر میں محترم انور شاہ راشدی اور مولانا محمد خان محمدی صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں تو یہ زیادتی ہوگی کیونکہ ان دونوں صاحبوں نے مجھے حتی المقدور، شاہ صاحب کے علمی مواد کے حصول میں اہم کردارادا کیا اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطافرمائیں۔آمین

آخر میں عرض ہے کہ کمپوزنگ وغیرہ کی غلطیوں کی اصلاح حتی الوسع کردی گئی ہےلیکن بشری تقاضوں کے تحت غلطی کا احتمال ہے،لہٰذا مطالعہ کے بعد مطلع فرمائیں ان شاءاللہ،
آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کردی جائے گی۔

والسلام
افتخار احمد الازہری
جامعہ بحرالعلوم السلفیہ میر پورخاص
13/ 2/ 2011

❁❁❁❁

کیا عیسیٰ علیہ السلام کے والد تھے

یہ مضمون شاہ صاحب نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق پھیلائے جانے والے غلط شبہات کے رد میں لکھا تھا۔ جبکہ قرآن کریم کے نزول کے وقت عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں الوہیت، ابنیت، تثلیث کا عقیدہ رائج تھا۔ شاہ صاحب نے اس مضمون میں اس عقیدے کا بھرپور اور مدلل جواب اور اس عقیدے کی نفی کی ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش پر پہلی دلیل:

۱۔ قرآن کریم کے نزول کے وقت عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں الوہیت، ابنیت، تثلیث کا عقیدہ رائج تھا۔ وہ (عیسائی) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر والد کے پیدا ہونے کے قائل تھے اور اسی سے وہ ان کی الوہیت اور ابنیت کے قائل تھے۔ قرآن کریم نے ان کے اس عقیدہ کی تو جا بجا تردید فرمائی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود اللہ تھے یا اللہ کے بیٹے تھے، اسی طرح تثلیث کا بھی متعدد مواضع میں ابطال فرمایا لیکن کسی ایک جگہ پر بھی عیسیٰ علیہ السلام کے بن والد پیدا ہونے کی تردید نہیں کی حالانکہ عیسائیوں میں ابنیت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ کے عقیدہ کی بنیاد ہی ان کے بن والد پیدا ہونے والی بات تھی جیسا کہ عیسائی مذہب سے واقف حضرات بخوبی جانتے ہیں، لہٰذا اگر فی الواقع حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کوئی والد تھے تو اللہ تعالیٰ ان کے اس غلط عقیدہ کو صرف یہ چند الفاظ بیان فرما کر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تو فلاں والد تھا، جڑ سے اکھاڑ دیتا۔

ان کی الوہیت کے ابطال کے لیے دوسرے دلائل جو قرآن کریم میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں کے بیان کی چنداں ضرورت نہ پڑتی۔ کہیں بیان فرمایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اس کی والدہ کھانا کھاتے تھے۔

﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ (المائدة : ٧٥)

''وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔''

کہیں خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی اپنے بندہ ہونے کا اقرار مذکور ہے:

﴿قَالَ إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ﴾ (مريم : ٣٠)

''میں اللہ کا بندہ ہوں۔''

کہیں ان کا اپنی والدہ کے بطن سے پیدائش کا ذکر ہے:

﴿قَالَتْ رَبِّ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ (آل عمران : ٤٧)

''مریم کہنے لگی، میرے رب! میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا جبکہ مجھے کسی آدمی نے چھوا تک نہیں؟ اللہ نے جواب دیا، ایسا ہی ہوگا۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔''

وغیرہ وغیرہ، لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس نے ایک جگہ بھی ان کے والد کا ذکر نہ فرمایا حالانکہ ان کے والد کا ذکر ان سب سے زیادہ ان کی الوہیت کے ابطال کے لیے مؤثر اور وزنی دلیل ہوتا، کیا اس سے صاف طور پر واضح نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بنا والد پیدا ہونے سے قرآن کریم کو انکار نہیں؟

حکم ربی سے انکار کیوں؟

۲۔ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بہت سی جگہوں پر ذکر وارد ہے اور ہر جگہ 'حضرت مسیح ابن مریم'، ''عیسیٰ ابن مریم'' کہا گیا ہے۔ کہیں بھی المسیح ''بن فلاں یا عیسیٰ بن فلاں نہیں کہا گیا کیوں؟

حالانکہ قرآن کریم میں حکم ہے کہ:

﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (الاحزاب: ۵)

''یہی بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک انصاف کی بات ہے۔''

یعنی لوگوں کو ان کے اپنے باپوں کی طرف منسوب کرو۔

ادھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے پھر وہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہر جگہ ان کی والدہ محترمہ مریم علیہا السلام کی طرف ہی منسوب کرتا رہا ہے کیا، والد کی طرف منسوب کرنے میں کوئی قباحت تھی؟

اس کا جواب کسی عقلمند اہل علم کے پاس اس کے سوائے کچھ اور نہیں کہ چونکہ فی الواقع ان کا کوئی والد ہی نہ تھا اس لیے ان کو والدہ محترمہ کی طرف ہی منسوب کیا۔

حضرت جبریل امین علیہ السلام کی بشارت:

۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے واقعہ پر ایک نظر ڈال لیجئے (سورۃ مریم پ ۱۶) میں دیکھئے۔ حضرت جبریل، الروح الامین علیہ السلام مریم صدیقہ علیہا السلام کے پاس ایک کامل نوجوان انسان کی صورت میں تشریف لاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۝﴾
(مریم: ۱۷)

''اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ گئیں تو ہم نے اس کی طرف اپنی روح (فرشتہ) کو بھیجا جو ایک انسان کی شکل میں مریم کے سامنے آ گیا۔''

اب حضرت مریم علیہا السلام اپنی خلوت گاہ میں ایک نوجوان مرد کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئیں اور بولیں:

﴿قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا۝﴾ (مریم: ۱۸)

''وہ (مریم) بولی اگر تمہیں کچھ اللہ کا خوف ہے تو میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔''

تو اس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فرستادہ الروح الامین نے فرمایا کہ:

﴿قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا۝﴾ (مریم: ۱۹)

''(ڈرو نہیں) میں تو تیرے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں تا کہ تجھے (اللہ کے حکم سے) ایک پاکیزہ صورت وسیرت فرزند عطا کروں۔''

حضرت ابراہیم وحضرت زکریا علیہما السلام کا واقعہ:

آگے بڑھنے سے قبل اس بات پر بھی غور کیجئے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بھی عام انسانوں کی طرح ماں اور باپ سے ہوئی تھی تو اس کے لیے فرشتوں کا خاص طور پر اس خوشخبری کو لے کر ان کی والدہ محترمہ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس قسم کی خوشخبری کا فرشتوں کے واسطہ سے آنا قرآن کریم میں مریم صدیقہ علیہا السلام کے علاوہ صرف حضرت زکریا اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے پاس آنے کا ذکر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حضرت اسحٰق علیہ السلام کے پیدائش کی بشارت لے کر آئے تھے، اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام شیخوخۃ (بڑھاپے) کی حالت میں تھے اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ علیہا السلام بانجھ تھی۔ اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام کے پاس بھی فرشتے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیدائش کی بشارت لے کر آئے تھے۔ اور زکریا علیہ السلام بھی پیرانہ سالی کی آخری حد پر تھے اور ان کی زوجہ محترمہ بھی بانجھ تھی، تو ان حالات میں فرشتوں کا ان کے ہاں فرزند کے پیدائش کی بشارت لے کر آنا قرین عقل وقیاس معلوم ہوتا ہے، کیونکہ عام حالات میں اس عمر میں اور بانجھ پن کی حالت میں اولاد نہیں ہوا کرتی۔ لہٰذا یہ واقعات چونکہ محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ تھے، اس لیے اس بشارت کو فرشتے لے کر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں پیغمبروں نے اس بشارت پر تعجب کا اظہار کیا لیکن فرشتوں نے بتایا کہ یہ بشارت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے ہے اور اس کی قدرت کاملہ سے یہ کچھ بعید نہیں۔ ورنہ اگر عام حالات میں کسی عالی مرتبت ہستی کے تولد کی بشارت لے کر فرشتے بھی آتے رہتے تو قرآن کریم میں حضرت اسماعیل علیہ السلام جن کو ذبیح اللہ بننے کا شرف حاصل ہونا تھا اور جن کی ذریت سے خاتم النبیین جیسی بابرکت ہستی ﷺ کی ولادت باسعادت مقدر تھی، یعنی ایسے برگزیدہ اور صابر پیغمبر کی ولادت کی بشارت کا فرشتوں کے واسطہ سے ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے کا ضرور ذکر ہوتا۔

حضرت مریم علیہا السلام کا سوال؟

خلاصہ کلام! جبرئیل امین علیہ السلام کا خاص طور پر مریم صدیقہ علیہا السلام کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی بشارت لے کر پہنچنا واضح طور پر اس حقیقت کی طرف نشان دہی کررہا ہے، کہ اس بابرکت ہستی کا تولد عام انسانوں کی پیدائش اور اس سلسلہ میں جو اسباب وعلل عام حالات میں ہوتے ہیں یا ہونے چاہئیں اس سے بالکل مختلف ہوگا اور وہ محض اللہ کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہوگا اس نمایاں حقیقت سے کوئی صاحب عقل سلیم انکار نہیں کرسکتا۔

پھر آگے بڑھیے جبرئیل امین علیہ السلام کے جواب پر، پھر مریم صدیقہ علیہا السلام نے فرمایا:

﴿قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا﴾ (مریم: ۲۰)

''کہ مجھے فرزند کیسے ہوگا حالانکہ مجھے نہ کسی مرد نے چھوا ہے اور نہ ہی میں فاحشہ عورت ہوں۔''

اب آپ دیکھیں کہ الروح الامین نے اس کا جواب کیا دیا؟

مذکورہ بالا صفحات میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس سے قطع نظر صرف اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا گیا ہے وہی ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے اگر بالفرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کوئی والد ہوتے تو اللہ کا فرشتہ محترمہ بی بی صاحبہ علیہا السلام کو یہ جواب دیتا کہ بس اس طرح کہ تمہارا نکاح فلاں یا فلاں سے ہوگا، پھر اس سے اس مبارک فرزند کی ولادت ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فرشتے نے اس قسم کا جواب تو درکنار اس کی طرف اشارہ بھی نہ کیا بلکہ فرمایا:

﴿قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ لِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّاO﴾ (مریم: ۲۱)

''وہ بولے ہاں! ایسا ہی ہوگا، تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ میرے لیے یہ سہل ہے اور اس لیے بھی کہ ہم اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں اور یہ کام ہو کے رہے گا۔''

یعنی یہ بشارت میں اپنی طرف سے تھوڑی دے رہا ہوں، بلکہ میں تو فرستادہ دربار الٰہی ہوں اور ان ہی کا پیغام لے کر آیا ہوں اور اسی رب نے ہی یہ فرمایا ہے کہ میرے لیے یہ بالکل آسان ہے اور یہ اس لیے بھی کہ اس نومولود بابرکت ہستی کو اپنی قدرت کا ایک نشان بناؤں جو میری طرف سے میرے بندوں پر رحمت بنے گا اور یہ بات اللہ کے نزدیک طے شدہ ہے۔ ''یعنی اس میں تخلف کا امکان بھی نہیں'' اب اس جواب پر انصاف سے غور فرمائیں۔

اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش والد سے ہونا تھی تو جبریل امین کے اس جواب کی کیا ضرورت تک ہے؟

وہ تو فرما دیتے کہ بس! تمہارا نکاح ہوگا اور آپ کے ہاں یہ بابرکت بیٹا پیدا ہوگا۔ ان کا یہ فرمانا کہ یہ بشارت میں اللہ کی طرف سے لایا ہوں اور اللہ فرماتا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے وغیرہ کا یہاں کوئی مطلب نہیں بنتا۔

ماں اور باپ سے پیدا ہونا کوئی عجیب بات نہ تھی بے شمار ولا تعداد انسان اس طرح پیدا ہو چکے تھے اور یہ نمونہ حضرت مریم علیہا السلام بھی مشاہدہ کر چکی تھی۔ اس میں کونسا استبعاد تھا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یہ کہنا پڑے کہ یہ بات میرے لیے آسان ہے، ماں اور باپ سے سلسلہ تناسل تو ہزاروں سالوں سے چلا آ رہا تھا اس پر نہ تو خود حضرت مریم علیہا السلام کو تعجب ہوتا اور نہ ہی الروح الامین کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس پیغام دینے کی ضرورت ہوتی۔ اسی سورت میں اسی واقعہ سے قبل حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ مذکور ہے، ان کو بھی جب یہ خوشخبری ملی کہ ان کے ہاں بھی بیٹا ہونے والا ہے، تو انہوں نے بھی تعجب کا اظہار فرمایا کیونکہ وہ خود تو پیرانہ سالی کی آخری سرحد پر پہنچ چکے تھے۔

﴿وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّاO﴾ (مریم: ۸)

''اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں۔''

نیز ان کی زوجہ محترمہ بانجھ تھیں، لہٰذا ان کا تعجب کا اظہار بالکل برمحل ہے اور اس تعجب پر ملائکہ علیہم السلام نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ:

﴿قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ﴾ (مریم: ۹)

''اللہ نے فرمایا: ہاں ایسے ہی ہوگا، تیرا رب یہ کہہ رہا ہے کہ یہ میرے لیے سہل ہے۔''

یعنی ''یہ بشارت ہم اپنی طرف سے نہیں دے رہے بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہی ایسا فرمایا ہے کہ اس طرح ہوگا اور میرے لیے یہ آسان ہے۔'' یعنی بوڑھے اور بانجھ سے اولاد کی تخلیق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے کوئی مشکل بات نہیں گو ہمارے لیے یہ بات واقعتاً تعجب انگیز ہے، عام حالات میں ایسے بوڑھے اور بانجھ ماں باپ سے اولاد پیدا نہیں ہوا کرتی لیکن سبحانہ وتعالیٰ جو خلاق علیم ہے اس کے لیے اس میں کوئی مشکل نہیں۔

لہٰذا حضرت مریم علیہا السلام کو جبریل امین نے جو یہ بتایا کہ یہ بشارت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے ہے اور اس خالق بے مثل کے لیے یہ بالکل آسان ہے، یعنی وہ جس طرح ماں باپ سے اولاد پیدا کرتا ہے اسی طرح بغیر باپ کے پیدا کرنے پر بھی قادر ہے، پھر اس پر تعجب کیا اور حیرت کیسی؟

حضرت آدم علیہ السلام کی مثال:

اور یہی وجہ ہے کہ (سورۃ آل عمران: ۵۹) میں یہ آیت مذکور ہے:

﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۝﴾

''بلاشبہ اللہ کے ہاں عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے۔ جیسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اسے حکم دیا کہ ہو جا، تو وہ ہوگیا۔''

یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش (بن والد) اسی طرح ہے، جس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس کو کہا کہ تو انسان بن جا وہ انسان بن گیا۔

اس آیت کریمہ کا پس منظر نگاہ میں رکھیں تو حقیقت حال نمایاں ہو جائے گی۔ اصل بات یہ تھی کہ نجران کے عیسائی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقابلہ ومناظرہ کے لیے آئے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتا دیا کہ تم جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابنیت یا الوہیت کے قائل ہو، سو یہ بالکل غلط ہے اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ اس کا کوئی الوہیت میں شریک ہو یا مخلوق میں کوئی اس کا بیٹا ہو، ہاں تم جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بن والد پیدا ہونے کو اس کی ابنیت وغیرہ پر دلیل لاتے ہو تو یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ اگر اس طرح بن باپ پیدا ہونے والا الوہیت کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے، تو حضرت آدم علیہ السلام جو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تھے وہ بطریق الاولیٰ الوہیت کی سرحد میں داخل ہو جاتا حالانکہ آپ بھی انہیں مخلوق اور اللہ کا بندہ ہی قرار دیتے ہیں، تو جب ماں اور باپ کے بغیر پیدا ہونے والا اللہ

نہیں بن سکا تو جو صرف ماں سے پیدا ہوا وہ کیسے اللہ بن گیا؟ اب آپ سوچیں کہ اس موقعہ پر نجران کے عیسائیوں کی بالکلیہ زبان بندی کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا صرف یہ فرما دینا کافی ہوتا کہ تم تو ان کو ابن اللہ وغیرہ کہتے ہو لیکن وہ تو فلاں یا فلاں کا بیٹا تھا، پھر وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا بیٹا کیسے بنا۔

لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے گمراہی میں پڑے ہوئے ان عیسائیوں کو یہ قطعاً نہیں کہا بلکہ ان کی یہ بات تسلیم کی کہ وہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) فی الحقیقت بغیر والد کے پیدا ہوئے تھے، لیکن یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ تھی جس نے ان کو صرف ماں سے جنم دیا، اور یہ بعینہٖ اس طرح کہ ان سے ہزاروں برس پہلے اپنی قدرت کاملہ سے ابوالبشر آدم علیہ السلام کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا کر چکا تھا، جب آدم علیہ السلام کو ماں اور باپ کے بغیر پیدا ہونے پر تم کو کوئی تعجب لاحق نہیں ہوتا تو صرف ماں سے پیدا ہونے والے کے متعلق یہ تعجب وحیرانی کیوں؟

اب قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام ماں باپ دونوں سے پیدا ہوئے تھے، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ان کی پیدائش کو آدم علیہ السلام کی پیدائش سے تشبیہ کا کیا مطلب بنے گا؟ یہ تشبیہ تب ہی صحیح بن سکتی ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن والد محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ سے پیدا ہوئے جیسا کہ آدم علیہ السلام بغیر ماں و باپ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی قدرت سے پیدا ہوئے، ورنہ ماں اور باپ دونوں سے تولد کی آدم علیہ السلام کی پیدائش سے کوئی نسبت نہیں کیا یہ برہان قاطع نہیں اپنے مدعا پر؟

انصاف شرط ہے اور پھر اسی سورۂ آل عمران میں اسی آیت کریمہ کے بعد یہ فرمایا:

﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ۝﴾ (ال عمران: ٦١)

''پھر اگر کوئی علم (وحی) آ جانے کے بعد اس بارے میں آپ سے جھگڑا کرے تو آپ اسے کہیے، آؤ ہم اور تم اپنے اپنے بچوں کو اور بیویوں کو بلا لیں اور خود بھی حاضر ہو کر اللہ سے گڑگڑا کر دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو، اس پر اللہ کی لعنت ہو۔''

یعنی اس برہان قاطع کے بعد بھی یہ سیدھی راہ سے ہٹے ہوئے لوگ تم سے مباحثہ ومناظرہ کریں اور حق کے سامنے اذعان کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو انہیں کہو آؤ اب ہم دونوں فریق مباہلہ کریں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کریں کہ جھوٹے پر لعنت ہو۔ یہ مباہلہ کی دعوت سن کر وہ نجران کے عیسائی جزیہ دینے پر راضی ہو گئے اور بغیر مباہلہ کیے واپس ہو گئے۔

اگر در خانہ کس است یک حرف بس است

ضدی اور میں نہ مانوں کی رٹ لگانے والے کا کوئی علاج انسانوں کے پاس نہیں ہے۔

الروح الامین علیہ السلام کا پھونک مارنا:

۴۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام ماں باپ دونوں سے پیدا ہونے والے تھے، تو جبریل امین یہ بشارت دے کر چلے جاتے اور بعد میں ان کے نکاح کا ذکر آتا، لیکن ایسا ہرگز نہیں بلکہ اسی بشارت کے بعد متصل ہی مریم علیہا السلام کو حمل ہو گیا تھا اور اسی پر بشارت کے بعد متصل ہی یہ آیت کریمہ آتی ہے:

﴿فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا۝﴾ (مریم: ۲۲)

''چنانچہ مریم کو اس بچے کا حمل ٹھہر گیا تو وہ اس حالت میں ایک دور مکان میں علیحدہ جا بیٹھیں۔''

یعنی پھر اسی وقت مریم علیہا السلام نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے بطن میں اٹھا لیا یعنی ان کو حمل ہو گیا اور وہ اس حمل کو لے کر کہیں دور دور مکان کی طرف لے گئی۔ یہ اسی وقت کا ترجمہ اس سے نکلتا ہے کہ آیت کریمہ "فا" ﴿فَحَمَلَتْهُ﴾ داخل ہے اور علوم عربیہ کے قوانین کے بموجب (فاء) میں تراخی یا مہلت نہیں ہوا کرتی، صرف ترتیب ہوتی ہے، یعنی یہ حمل ترتیب کے لحاظ سے تو اس بشارت وسوال وجواب کے بعد ہوا لیکن یہ متصل ہی ہوا، اس میں کوئی زیادہ دیر یا مہلت نہ تھی، اگر نکاح کے بعد یہ قصہ ہوتا تو اس میں کافی مدت درمیان میں حائل ہوتی۔ اس پر یہ حقیقت بھی دلالت کرتی ہے کہ یہ حمل جبریل امین علیہ السلام کی پھونک سے جو انہوں نے مریم علیہا السلام کی جیب (گریبان) میں دی تھی ہوا تھا جیسا کہ تفاسیر کی روایات میں آتا ہے اور قرآن کریم میں سورۃ انبیاء میں تو اس طرح آتا ہے:

﴿وَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا﴾ الآية (الانبياء: ۹۱)

''اور وہ پاک دامن عورت جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی، پھر ہم نے اپنی روح سے ان کے اندر پھونکا۔''

یعنی اور جس نے پاک دامنی اختیار کی اس میں ہم نے اپنی روح پھونکی، اس آیت میں فِيْهَا میں جو ضمیر (ھا) ہے، یہ مریم علیہا السلام کی طرف لوٹتی ہے لیکن اس طرح نفخ روح تو سب مولودوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اس میں مریم علیہا السلام کی کوئی خصوصیت نہیں لیکن سورۃ التحریم میں یہ آیت اس طرح ہے۔

﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ الآية

(التحريم: ۱۲)

''اور مریم بنت عمران کی بھی (مثال ہے) جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، پھر ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی۔''

یہاں (فِيْهِ) کی ضمیر جیب کی طرف لوٹتا ہے اور جیب سے مراد گریبان ہے۔ احصان الجیب، کنایہ ہے پاک دامنی سے یعنی ایسی پاکباز عورت کہ اس نے اپنے گریبان تک بھی کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیا تھا۔ بہرحال تو

پھر ہم نے اس (مریم) کے گریبان میں اپنی روح پھونکی یہ آیت کریمہ واضح کر دیتی ہے کہ یہ تصرف (روح پھونکنا) جبریل امین علیہ السلام کی جانب سے تھا کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا خود کسی میں پھونک مارنے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ایسی باتوں سے پاک ہے ہاں نفخ کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف اس لیے ہے کہ جبریل امین نے یہ پھونک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے ہی ماری تھی اوراس کے بہت سے امثلہ ہیں مثلاً ''سورۂ ذاریات: ۳۲، ۳۳'' میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آئے ہوئے فرشتوں سے دریافت فرمایا کہ تمہارے آنے کا کیا مقصد ہے تو انہوں نے جواب دیا:

﴿اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ ۝ لِنُرۡسِلَ عَلَیۡہِمۡ حِجَارَۃً مِّنۡ طِیۡنٍ ۝﴾

ہم قوم کے مجرمین کے طرف بھیجے گئے ہیں تا کہ ان پر مٹی کے پتھر برسائیں لیکن دوسری جگہ اس فعل کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا۔ (ارشاد باری تعالیٰ ہے)

﴿فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہَا حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ مَّنۡضُوۡدٍ ۝﴾ (هود: ۸۲)

''پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اس آبادی کے اوپر کے حصہ کو نچلا حصہ بنا دیا۔ پھر ان پر کھنگر کی قسم کے تہہ بہ تہہ پتھر برسائے۔''

اسی طرح سورۂ حجر میں بھی اس فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۝﴾ (حجر: ۷٤)

''اور ان پر کھنگر قسم کے پتھر برسائے۔''

یہ اس لیے کہ فرشتوں نے جو پتھر ان پر برسائے وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم ہی سے برسائے تھے۔ مقصد یہ کہ یہ حمل جبریل امین کی پھونک سے قرار گیا جو انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے مریم علیہا السلام کی جیب (گریبان) میں پھونکی تھی، اور تفاسیر کی روایات صحیح ہو گئیں اور جبریل علیہ السلام کا یہ تصرف بھی اس پر وضاحت کے ساتھ دال ہے، کہ مریم علیہا السلام کا نکاح نہیں ہوا تھا، اگر نکاح ہوا ہوتا تو جبریل امین علیہ السلام کے اس نفخ روح کی کوئی ضرورت نہ تھی اور جبریل علیہ السلام کا یہ فرمانا:

﴿لِاَہَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا﴾ (مريم: ۱۹)

''میں اس لیے آیا ہوں کہ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک پاکیزہ صفت فرزند عطا کروں۔''

اگر یہ ان کا تصرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے نہ ہوتا تو ایسا فرمانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مریم علیہا السلام حمل قرار پا جانے کے بعد دور دراز مکان پر کیوں چلی گئی؟ کیا نکاح کرنا کوئی ناجائز بات تھی کہ جس کو چھپانے کے لیے کسی اور دوسری جگہ چلا جانا ضروری تھا۔ ہاں بغیر باپ (بچہ) پیدا ہونا یہ بات بظاہر قابل

اعتراض بات تھی اور اگر اسی حالت میں وہ اسی جگہ پر رہتی تو وہ لوگ اس کی زندگی ہی دوبھر کر دیتے اور ان کو وضع حمل تک وہاں چین کے ساتھ رہنا نصیب نہ ہوتا، کیا پتہ وہ لوگ کیا اقدام کرتے اس لیے یہ بالکل قرین عقل وقیاس نظر آتا ہے کہ ان کو بہر حال وضع حمل تک تو کہیں اور جگہ ان سے بالکل الگ تھلگ جا کر رہنا چاہیے تھا، تاکہ وضع حمل تو خیریت سے ہو، پھر جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مرضی ہوگی اسی طرح ہوگا۔

حضرت مریم علیہا السلام کی پریشانی:

۵۔ وضع حمل کے وقت جب مریم علیہا السلام نے آنے والے طوفان کا تصور کیا تو بہت پریشان ہوئیں اور کہا: کاش! میں اس سے پیشتر ہی مرجاتی اور بھولی بسری ہو جاتی تا کہ کوئی میری یہ حالت نہ دیکھ سکتا، اس پر بھی ان سے کہا گیا کہ تم نہ ڈرو اور نہ غم ہی کرو...... اگر کوئی آدمی ملے تو کہہ دینا کہ میں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے روزہ کی نذر کی ہے اس لیے آج کسی سے بات نہیں کروں گی۔ (یعنی باقی معاملہ کو ہم خود نمٹ لیں گے) اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد ہوتے تو نہ ہی مریم علیہا السلام کو اس قسم کی کوئی پریشانی لاحق ہوتی اور نہ ہی انہیں لوگوں کے کہنے پر خاموش رہنے کا امر ہوتا بلکہ انہیں امر ہوتا کہ وہ کہہ دے کہ کوئی بات نہیں لو یہ میرا شوہر ہے، میں نے کوئی غلط یا ناجائز بات نہیں کی۔ کیا یہ واضح دلیل نہیں اس بات کی کہ عیسیٰ علیہ السلام کے کوئی والد نہ تھے؟

یہودیوں کا بہتان:

۶۔ اب حضرت مریم علیہا السلام اپنے نومولد بابرکت بچہ کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی تو انہوں نے کہا:

﴿يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا۝﴾ (مریم: ۲۷۔ ۲۸)

''اے مریم تو نہایت سنگین اور بہت بڑی برائی لائی ہو، تمہارا والد تو برا آدمی نہ تھا اور نہ ہی تیری ماں فاحشہ تھی۔''

اس سے ظاہر ہے کہ مریم صدیقہ علیہا السلام پر ان کی قوم نے فاحشہ (زنا) کا الزام لگایا تھا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان کو اپنے مادر و پدر کا حوالہ دیا کہ وہ دونوں تو نہایت نیک تھے، انہوں نے تو کوئی برائی نہیں کی تھی تو اتنے سنگین کام کرنے پر کس طرح آمادہ ہوئی، یعنی جس کے خاندان کے سب افراد نیک اور صالح ہوں اور ان میں برائی نام کی بھی نہ ہو ان کی بیٹی اگر ایسا سنگین کام کرے تو بڑی عجیب وافسوس کی بات ہے۔ اور اسی کو سورۂ نساء میں اس طرح واضح فرمایا:

﴿وَ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا۝﴾ (النساء: ۱۵۶)

''اچھا تو اس الزام سے بچنے کے لیے مریم نے کیا کیا؟''

حضرت مریم صدیقہ علیہا السلام کا جواب:

قرآن عظیم فرماتا ہے: ﴿فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ﴾ الآیۃ (مریم: ۲۹) یعنی مریم علیہا السلام نے ان کی اس بات کا جواب اس طرح دیا کہ صرف بچہ کی طرف اشارہ کر دیا، انہوں نے کہا ایسے بچے سے ہم کیا بات کریں جو جھولے میں جھولنے والا ہو، یعنی بہت چھوٹا ہے (وہ تو بات کر بھی نہیں سکتا) ہر منصف مزاج یہ سوچ لے کہ اگر مریم علیہا السلام کا شوہر تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد تھے، تو بچہ کی طرف اشارہ کر کے جواب دینے کی کیا ضرورت تھی؟ بلکہ وہ صاف کہہ دیتی کہ مجھ پر فاحشہ کا الزام محض بہتان ہے۔ میں نے کوئی برائی نہیں کی بلکہ میں نے نکاح کیا ہے اور یہ میرا شوہر ہے اس سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے اور بات ختم ہو جاتی، اگر کوئی کہے کہ اس شوہر سے قوم کے افراد ناراض تھے اس لیے انہوں نے اس کو چھپایا، لیکن یہ بھی سراسر فضول اور باطل ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو بھی مریم علیہا السلام کو اپنے بہتان کے اظہار پر تو ضرور اپنے اس شوہر کو ظاہر کرنا چاہیے تھا اور قرآن کریم بھی اس کا ذکر کرتا اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ اگر قوم ان سے ناراض ہوتی تو مریم علیہا السلام سے بائیکاٹ کر لیتے ان کو اپنے کنبے سے نکال دیتے یا ان سے اپنے سارے تعلقات ختم کر دیتے، اور وہ پھر وہیں جا کر الگ تھلگ رہتی جہاں وضع حمل سے پہلے جا کر سکونت پذیر ہوئی تھی، لیکن ان پر جو بہتان عظیم لگایا گیا تھا وہ یک سر ختم ہو جاتا لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس انتہائی نازک موقعہ پر بھی محترمہ بی بی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد اپنے شوہر کا ذکر نہیں کرتی۔ بلکہ نوزائیدہ بچہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے اس کی قوم کو اور بھی تعجب ہوا کہ ہم تو ان سے اس سنگین بات کی صفائی طلب کر رہے ہیں اور یہ اس بچہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس میں گویائی کی کوئی طاقت نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باتیں کرنا:

۷۔ اس پر یہ بابرکت بچہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) بول پڑا۔ یہ نومولود بچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے بولنے تو لگا لیکن انہوں نے بھی اپنی پوری بات میں یہ نہیں کہا کہ آپ میری والدہ مطہرہ پر غلط اور ناروا الزام لگا رہے ہیں، میرا تو والد ہے، جس کا نام فلاں ہے اور وہ میری والدہ محترمہ کا جائز شوہر ہے، بلکہ انہوں نے اول تو اپنے متعلق یہ بتایا کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بندے ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو کتاب دی ہے اور ان کو نبی بنایا ہے۔ مجھے بابرکت بنایا ہے جہاں بھی ہوں اور مجھے نماز کی اقامت زکوٰۃ کی ادائیگی کی ہدایت کی ہے، جب تک زندہ رہوں۔

اگر ان کے والد تھے تو ان باتوں کے ساتھ اس کا بھی لازمی طور پر ذکر کرتے مگر اس کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا، آخر کیوں؟

جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اتنا عظیم الشان معجزہ دکھایا تو ساتھ ہی اس مبارک بچہ سے یہ بھی کہلوا لیتا کہ واقعتاً ان کے جائز والد ہے اس سے قطعی اعراض کس لیے؟

۸۔ پھر اس مبارک بچہ نے فرمایا: ﴿وَّ بَرًّا بِوَالِدَتِيْ﴾ الآیۃ" اور مجھے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی والدہ مطہرہ سے نیکی کرنے والا بنایا۔"

اگر ان کے والد ہوتے تو انہوں نے اپنے متعلق صرف والدہ مطہرہ سے نیکی کرنے پر اکتفاء کیوں کیا؟ کیا انبیاء کرام علیہم السلام اپنے آباء سے نیکی کرنے والے نہیں ہوتے؟ اسی سورۃ میں پہلے رکوع میں حضرت زکریا علیہ السلام کا قصہ ہے اس میں حضرت یحییٰ علیہ السلام (حضرت زکریا علیہ السلام کا فرزند کے متعلق یہ وارد ہے کہ ﴿وَّ بَرًّا بِوَالِدَيْهِ﴾ (مریم: ۱٤) یعنی یحییٰ علیہ السلام اپنے والدین (ماں باپ) سے نیکی کرنے والے تھے۔

لہٰذا اگر بالفرض عیسیٰ علیہ السلام کے والد تھے تو ان کو بالضرور یہ فرمانا چاہیے تھا۔

﴿وَّ بَرًّا بِوَالِدَيَّ﴾ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے اپنی ماں اور باپ دونوں سے نیکی کرنے والا بنایا ہے اور صرف والدہ محترمہ پر اکتفانہ فرماتے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا امر ﴿کن فیکون﴾:

۹۔ اس قصہ کو پورا کر کے آگے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس پر مختصر تبصرہ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ٥ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ٥﴾ (مریم: ۳٤۔ ۳۵)

یعنی"یہی ہے حضرت عیسیٰ کے متعلق وہ حق اور سچی بات جس کے بارے میں یہ شک کر رہے ہیں۔ اللہ کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے وہ ان سب خامیوں سے پاک ہے جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔"

یعنی اس سارے قصہ کا حاصل یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ تو اللہ تھے اور نہ اللہ کے بیٹے تھے، بلکہ اللہ کے بندہ اور نبی تھے، جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ سے بغیر والد صرف اپنی والدہ مریم علیہا السلام سے پیدا ہوئے اور اسی وجہ سے یہ گمراہ لوگ ان کے بارے میں شک میں پڑ گئے ہیں حالانکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، کسی بات یا چیز کے وجود میں آنے کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا"کــن" کا امر کافی ہے، لہٰذا اس نے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں بھی اپنی قدرت کاملہ سے کام لیا اور مریم علیہا السلام کی طرف اپنے اس کلمہ"کن" کو متوجہ کیا اور ان کے بطن میں حمل قرار پا گیا، اس لیے جس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ پر ایمان ہو اس کے لیے تو اس میں کوئی اچھوتی بات نہیں۔ اب ہر عقل سلیم والا آدمی سوچ سکتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت یا ابنیت والے عقیدہ کو ختم کرنے کے لیے صرف یہ کافی تھا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرما دیتا کہ"اے عیسائیو تم کدھر کو چلے جا رہے ہو، عیسیٰ علیہ السلام کے تو والد تھے، پھر وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بیٹے کس طرح بن گئے؟ لیکن اس مختصر سی بات (جو اصل گمراہی والے عقیدہ کو جڑ سے کاٹ دیتی) کے بجائے اتنا مفصل قصہ ان کی ولادت اور اپنی قدرت کاملہ کا اظہار وغیرہ وغیرہ کی طرف قرآن حکیم کا رخ ہمارے لیے

واضح دلیل اور قاطع برہان نہیں کہ فی الحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد نہ تھے؟ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیں کہ جب ابتداء میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا بھیجا ہوا فرشتہ مریم علیہا السلام کے پاس بشارت لے کر آیا تھا وہ اگر صرف ایک بابرکت ہستی کی پیدائش کی بشارت دینے آیا تھا، تو بس صرف یہ بشارت دے کر چلا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ مریم علیہا السلام کے دریافت کرنے پر کہ بن باپ فرزند کیسے ہوگا تو اس وقت بھی سبحانہ وتعالیٰ نے یہی الفاظ فرمائے تھے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں یہ آیت کریمہ ہے:

﴿قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ٥﴾

(آل عمران: ٤٧)

یعنی ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسی طرح اپنی قدرت سے پیدا کرتا رہتا ہے وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کو امر فرماتا ہے کہ ہو جا تو ہو جاتا۔''

اور یہاں سورۂ مریم میں قصہ کے اختتام پر بھی یہی فرمایا کہ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں وہ صرف ''کن'' سے امر کرتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے۔ اور جب نجران کے عیسائی مقابلہ کے لیے آئے تھے تب بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہی الفاظ ان کو سنانے کے لیے اتارے تھے، جیسا کہ اس سے پہلے یہ بات گزر چکی ہے۔ بہر حال قرآن کریم میں جس جگہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر آتا ہے یا ان کے بارے میں الوہیت یا ابنیت کے عقیدہ کا ابطال مقصود ہوتا ہے، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہی فرماتا ہے حالانکہ اگر بالفرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد تھے، وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بیٹے نہیں ہو سکتے اس کی بجائے ہر جگہ اپنی قدرت کاملہ کا ذکر نہ کیا جاتا، کیا اس سے بھی کوئی بات زیادہ واضح ہو سکتی ہے؟

حضرت عیسیٰ وحضرت مریم علیہما السلام کی معبودیت کا رد:

۱۰۔ (سورۂ مائدہ آیت نمبر ۱۱۶) میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن اللہ سبحانہ وتعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائے گا کہ:

﴿وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (المائدة: ١١٦)

''(اے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام)! کیا تو نے لوگوں کو (دنیا میں) کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو الٰہ (معبود) بنالو؟''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گمراہ لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی والدہ کو بھی الٰہ (معبود) بنالیا تھا۔ لہٰذا اگر ان کے شوہر تھے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے کلام پاک میں اس عقیدہ کو ضرور اس طرح رد کرتا کہ مریم کا تو شوہر تھا پھر جو عورت ایک مرد کے ماتحت ہو وہ معبود کیسے بن سکتی ہے لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایسا کہیں نہیں فرمایا حالانکہ مریم علیہا السلام کے بارے میں الوہیت کا عقیدہ بغیر شوہر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش والی بات سے نکلا تھا، لہٰذا

حالات کا یہی تقاضا تھا کہ اس عقیدہ کو بھی یہ کہہ کر جڑ سے کاٹ دیا جاتا کہ مریم کا تو شوہر تھا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن عظیم میں بہت سے دلائل سے ان دونوں ماں اور بیٹے کی الوہیت کا ابطال فرمایا لیکن کسی ایک جگہ بھی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے والد اور مریم کے شوہر کا ذکر نہیں ہے۔

﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾

اجماع امت:

ان براہین قاطعہ کے مدنظر پوری امت مسلمہ کا اس (بات) پر اجماع ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر والد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ سے صرف اپنی والدہ مطہرہ مریم علیہا السلام سے پیدا ہوئے۔ اور یہی سبیل المومنین (مومنوں کا راستہ) ہے۔ لہٰذا اس سے جو بھی انحراف کرے گا وہ مومن و مسلم ہرگز نہیں ہوسکتا، لہٰذا جو شخص ایسا عقیدہ رکھے وہ مسلمان نہیں اس لیے ان کی اقتدا میں نماز ہرگز جائز نہیں ہوسکتی۔

هذا ما عندی والعلم عند الله العلام وهو اعلم بالصواب وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين . وصلى الله على خير خلقه سيدنا محمد وآله واصحابه اجمعين وبارك وسلم .

وانا احقر العباد

محب الله شاه راشدی

❁❁❁❁

باب اوّل

عقائد 2

فرقہ قادیانیت کا سفید جھوٹ

دراصل یہ مقالہ سندھی زبان میں ہے، اس کو اردو زبان میں پہلی دفعہ شائع کیا جا رہا ہے، قادیانیوں نے شاہ صاحب کے پردادا سید رشید الدین شاہ صاحب العلم اللواء الثالث پر ایک جھوٹ باندھا تھا تو اس رسالہ میں اس کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لله وحده والصلوٰة والسلام على من لا نبي بعده . امابعد!

یہ بندہ حقیر پر تقصیر محب اللہ شاہ بن سید احسان اللہ شاہ تمام معتقدین کی خدمت میں عرض دار ہے کہ تقریباً تین چار سال پہلے ایک دوست کی طرف سے مجھے ایک رسالہ بنام (فیصلہ آسمانی معرفت عارف ربانی پیر آف جھنڈا) موصول ہوا۔ اور اس دوست کا تقاضا تھا کہ اس کا جواب دیا جائے، مگر دانستہ کچھ وقت لیت ولعل میں گزر گیا۔ کیونکہ اس رسالہ میں بالکل صاف وصریح بہتان ہمارے مرشد [1] پیر سائیں بیعت والے کے اوپر لگایا گیا۔ اس لیے کچھ وقت یہ خیال کیا کہ افتراء اور غلط بیانی قادیانیت کی امتیازی خصوصیت ہے جن کی ہمیشہ عادت رہی ہے کہ اہل اللہ پر جھوٹ باندھ کر اپنا اُلو سیدھا کیا جائے۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس لیے ان کے افتراء کا جواب دینے میں سوائے تضییع اوقات کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ علاوہ ازیں یہی بہتان سولہ، سترہ سال قبل قادیانیت کی طرف سے شائع ہوا تھا اور اس کا جواب بروقت والد ماجد اور مرشد کریم حضرت پیر سائیں احسان اللہ شاہ صاحب العلم الخامس رحمہ اللہ کی طرف سے رسالہ توحید میں جو اس وقت مولانا دین محمد وفائی رحمہ اللہ کی زیر نظر شائع ہوتا تھا، شائع بھی ہو چکا ہے۔ یہی مضمون رسالہ توحید جنوری ۱۹۳۵ء بمطابق شوال ۱۳۵۳ ہجری کے نمبر میں شائع ہوا۔ آج بھی کتنے لوگوں کے پاس یہ رسالہ موجود ہے اس میں دیکھا جا سکتا ہے کہ ہمارے والد کی طرف سے جواب دیا گیا ہے یا نہیں ہم بھی ان شاء اللہ یہ سارا مضمون اس رسالہ کے آخر میں نقل کریں گے۔ خیر اس جواب باصواب کے شائع ہونے کے بعد پھر سولہ سترہ سال کے طویل عرصہ بعد قادیانیت نے پھر چہرا ظاہر کیا ہے اور پھر وہی جھوٹ دنیا کے آگے پیش کر رہے ہیں اور دیدہ دانستہ سادہ لوگوں کی آنکھوں میں مٹی ڈال رہے ہیں۔

چہ دلاور است دزدی کہ بکف چراغ دارد

شاید ان کا یہ خیال کہ ان کی بدتمیزی کی قلعی کھولنے والا اب کوئی نہیں ہے، مگر قادیانی دجال کذب بیانوں کی قلعی کھولنے والوں کی کمی نہ کبھی کسی زمانے میں ہوئی ہے نہ بفضل خدا اس دنیا کی آخری گھڑی تک ہوگی۔

ہر دور میں ہمارے نبی کریم محمد ﷺ کی ختم نبوت پر جان دینے والے اور ان کے مخالف دجالوں کذابوں کے مکر اور خداع کی قلعی کھولنے والے ہوتے رہے ہیں اور ہمیشہ بفضلہ تعالیٰ ہوتے رہیں گے۔

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس بہتان کا جواب تو ہمارے مرشد کی طرف سے دیا گیا تھا لیکن کافی عرصہ گزرنے

---

[1] پیر سید رشید الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ صاحب العلم الثالث یہ حضرت محدث العصر علامہ سید محب اللہ شاہ صاحب راشدی رحمہ اللہ اور شیخ العرب والعجم سید بدیع الدین شاہ صاحب راشدی رحمہ اللہ کے والد گرامی علامہ سید احسان اللہ شاہ صاحب راشدی کے دادا لگتے تھے۔

کے سبب کئی دوستوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس صریح بہتان کا کوئی جواب دیا گیا ہے اس لیے کئی لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

اور ایک دوست نے تو مجھے خود یہ لکھا ہے کہ کیوں نہ ہم پیر سائیں مرحوم کے استخارہ کو صحیح سمجھیں (جو کہ قادیانی گروہ نے ذکر کیا ہے) اور اکثر دوستوں کا یہ جواب رہا کہ اس کا ازسرنو جواب دیا جائے تا کہ عوام میں جو غلط فہمی پھیل رہی ہے اس کو ختم کیا جائے۔ اس لیے یہ بندہ حقیر پر تقصیر قلیل البضاعۃ اپنے مالک حقیقی جل شانہ پر بھروسہ کر کے قلم ہاتھ میں لیتا ہے اور قادیانیت کے بہتان کی قلعی کھولنے کے لیے یہ رسالہ شروع کر رہا ہے۔ رسالہ کا نام القواطع الرحمانیہ لافتراء الفرقۃ القادینہ رکھا گیا اور سب دوستوں کو یہ عرض ہے کہ اس کو انصاف کے نظر سے دیکھیں۔ اور اس کو ہر جگہ جہاں ان کی سعی بلیغ چل سکے پہنچائیں اور بارگاہ الٰہی میں یہ دعا ہے کہ اس رسالہ کو مقبول خاص و عام کرے۔ آمین

اور اس کے ذریعہ قادیانی دجالوں کے فریبوں اور چالبازیوں سے تمام مسلمان بھائیوں کو مامون اور محفوظ رکھے اور اس بندہ سراپا تقصیر کو سرور کائنات وفخر موجودات محمد فداہ لہ ابی وامی وروحی واھلی ومالی سے قرب کا ذریعہ بنائے۔ وما ذالك على الله بعزيز ، وما توفيقى الا بالله عليه توكلت واليه انيب .

قادیانی کذاب کے متعلق عرض کرنے سے قبل اپنا عقیدہ صاف لفظوں میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ معلوم ہو کہ میرا عقیدہ ہے کہ سلسلہ نبوت کی ابتداء حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہوئی اور اس کی آخری کڑی فخر موجودات سرور کائنات ﷺ ہے۔ اور آپ ﷺ کے بعد کوئی بھی نبی خواہ نئی شریعت کے ساتھ خواہ سابقہ شریعت کے ماتحت ہرگز نہیں آنا ہے اور اگر کسی نے ایسا دعویٰ کیا یا کرے گا تو وہ دجال کذاب اور دائرہ اسلام سے خارج ہے کیونکہ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں۔ اور آخری نبی ہونے کی وجہ سے نئی نبوت بالکل بند ہے خواہ اصالتاً خواہ تبعاً کیونکہ نبی کا لفظ عام ہے جیسا کہ آگے ختم نبوت کے متعلق دلائل کے وقت ذکر کروں گا۔

مزید صریح الفاظ میں اپنے مالک حقیقی جل شانہ کو گواہ بنا کر عرض کرتا ہوں کہ محمد ﷺ کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا ہے۔ اس لیے مرزا غلام احمد قادیانی جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ دجال اور کذاب ہے اور اس کے پیروکار کافر مطلق ہیں۔ اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسے قادیانیوں سے اسلامی معاملات ہرگز ہرگز درست نہیں ہے۔ نہ ان سے نکاح جائز ہے کیونکہ میری نظر میں بلکہ عام مسلمانوں کی نظر میں یہ قطعاً مسلم نہیں ہیں۔ اللهم اشهد ، اللهم اشهد ، اللهم اشهد .

میں آخر میں پھر پیر آف جھنڈا والوں کو بالخصوص اور عام مسلمانوں کو بالعموم عرض کرتا ہوں کہ ہم جھنڈے والے مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا مسیح موعود یا مہدی تو کیا ایک مسلم بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہمارے دوستوں کو ان مکاروں کے مکر اور خداع میں نہیں آنا چاہیے۔

اور یقین رکھنا چاہیے کہ ایمان کا بچاؤ اس میں ہے کہ ان ختم نبوت کے دشمنوں سے ہر طرح سے اجتناب کریں۔ واللہ الموفق

اب یہاں سے ختم نبوت کے دلائل شروع کیے جاتے ہیں۔

پہلی دلیل: قرآن کریم کی سورت احزاب کے اندر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾

(الاحزاب: ٤٠)

یعنی محمد کریم ﷺ تم میں سے کسی کے باپ (والد) نہیں ہیں مگر اللہ کے رسول اور انبیاء کی آخری کڑی ہیں، جن کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نبی کا لفظ عام ہے خواہ اسے تبلیغ کا حکم ہو جسے رسول بھی کہا جاتا ہے، خواہ تبلیغ کا حکم نہ بھی ہو بلکہ سابقہ نبی کا تابع ہو، جس طرح مولانا علی قاری متن الجزریہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ((النبی انسان اوحی الیہ بشرع وان لم یومر بتبلیغہ والرسول انسان اوحی الیہ بشرع بتبلیغہ والنبی اعم منہ مطلقا اھـ)) یعنی نبی وہ انسان ہے جس کی طرف شریعت کی وحی کی گئی ہو اگرچہ تبلیغ کا حکم نہ ہو اور رسول وہ انسان ہے جس کی طرف شریعت کی وحی کی گئی ہو اور تبلیغ کا بھی حکم کیا گیا ہے۔ پھر نبی کا لفظ رسول کے لفظ سے عام ہے، تو پھر نبی ﷺ کے بعد ہر طرح کی نبوت بند ہو چکی! یہاں اگر قرآن کریم میں خاتم الرسل کے الفاظ ہوتے تو کسی بہادر مکابر کے جدل اور شعب کی گنجائش ہوتی۔ مگر یہ کلام اس پاک ذات عزوجل کا ہے جسے ہر چیز کا علم ہے جیسے معلوم ہے کہ ایسے بھی لوگ پیدا ہوں گے جو نبوت میں اصالت اور تبعیت کا فرق رکھیں گے، جس طرح قادیانی کبھی کبھار اس طرح بھی کہتے ہیں کہ غلام احمد اصالتاً نبی نہیں ہے مگر بالتبع ہے۔ لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر لحاظ سے ہر نئی، نبوت کی نفی کر دی خواہ اصالتاً ہو یا بالتبع اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل اسلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آخری وقت کے نزول کے قائل ہیں تو پھر نبوت کیسے بند ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئے نبی نہیں ہیں بلکہ پہلے کے نبی ہیں اور ان کا ورود مسعود بھی دین محمدی کے احیاء کے لیے ہوگا۔ جس طرح یہ بات احادیث میں صراحتاً بیان شدہ ہے کہ وہ نبی ﷺ کے دین کی ہی اتباع کریں گے اور انہیں کی شریعت کے پابند ہوں گے۔ باقی رہا یہ سوال کہ ان کو بھیجنے کی کیا حکمت ہے تو اس کا متعلق عرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں جو حکمتیں ہیں ان کا احصاء کرنا بشری طاقت سے باہر ہے، تاہم اس احقر کے فہم ناقص میں جو حکمت سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ عمران میں یہ فرمایا ہے کہ تمام انبیاء سے وعدہ لیا گیا کہ تمہارے ہوتے ہوئے اگر کوئی ایسا نبی آیا جو تمہاری کتاب اور جو کچھ تمہارے ساتھ ہے اس پر مصدق ہے تو تم نے اس نبی کی مدد بھی کرنی ہے اور ایمان بھی لانا ہے، پھر تمام انبیاء نے اس بات کا اقرار کیا۔ بہر حال پھر جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خاتم النبیین کے شرف کے ساتھ مبعوث کیا تو ساتھ یہ بھی شرف عطا کیا کہ سابقہ انبیاء میں سے کوئی نبی ان کے دین کی

اتباع کرے جو ایمان لانے کا دوسرا نام ہے اور اس کے دین کا احیاء کرے جو کہ دین میں مدد کرنے کے مصداق ہے۔ تو اس کام کے لیے حضرت عیسیٰ کو منتخب کیا گیا جن کی نبوت کا دور نبی ﷺ کی نبوت کے دور کے قریب تر ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ماسوائے خاتم النبیین وشفیع المذنبین ﷺ کے دور نبوت سے متصل ہے اور دوسرا یہ کہ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب توریت کے اندر بھی نبی کریم ﷺ کی بشارت ہے مگر اس خوشخبری دینے میں حضرت عیسیٰ بالکل پیش پیش تھے، اس لیے غالباً قرآن کریم میں ان کے متعلق خاص ذکر کیا گیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ سورۃ صف کے اندر ارشاد فرماتے ہیں۔

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ﴾ (الصف : ٦)

یعنی وہ وقت بھی یاد کرو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے رسول ہوں اور مجھ سے پہلے تورات اس کی تصدیق کرنے والا ہے اور میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمد ہوگا، میں اس کی خوشخبری سناتا ہوں۔ یہ اس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کا ہی ورود مبارک ہونا تھا۔

حاصل کلام کہ جس طرح حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کا وعدہ زبانی طور پر انبیاء کرام سے لیا گیا تھا جس کو عملی طور پر پورہ کرنے کے لیے بارگاہ الٰہی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انتخاب کیا۔ واللہ اعلم وعلمہ الحکم واتم

باقی غلام احمد اور اس کے حواری جو کہ اہل اسلام کے اس عقیدہ سے غلط اور ناجائز فائدہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مرزا بھی وہی مسیح موعود ہے جس کے انتظار میں اہل اسلام ہے۔ تو یہ اس قدر غلط ہے کہ ایک عالم کو تو چھوڑ و ایک جاہل تھوڑی سی بھی عقل وفہم رکھنے والا اس کو غلط سمجھے گا کیونکہ جس مسیح موعود کا اہل اسلام منتظر ہے اس کا نام عیسیٰ علیہ السلام ہے اور وہ فرزند مریم ہے اور یہ مرزا جس کا نام غلام احمد ہے اور ایک پنجابی کے گھر میں پیدا ہوا اور اس کا والد بھی ہے گو کچھ لوگوں نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن قرآن وحدیث کی مخالفت کی وجہ سے سراسر غلط اور ناقابل اعتبار ہے۔ کچھ ان احادیث سے جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ورود سعود کا تذکرہ ہے اس سے مراد مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام لیتے ہیں مگر یہ بات بھی بالکل واہیات اور ناقابل قبول اور غیر مقبول ہے۔ اول کہ خواہ مخواہ حدیث کو غلط مفہوم پر لے جانا ہوتا ہے جو کہ ہرگز ہرگز درست نہیں ہے ثانیاً کہ غلام احمد کسی بھی بات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مثل نہیں ہیں آخر وہ کون حسی مثلیت ہے جس کی وجہ سے ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مثیل قرار دیا جاتا ہے۔ وہ بیان کی جائے تاکہ اس پر بھی نظر رکھی جائے۔ بلکہ احادیث میں دجال کا قتل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ہونا مذکور ہے جو صاف بتا رہا ہے کہ مرزا احمد ہرگز ہرگز مسیح موعود نہیں ہے علاوہ ازیں

اس نے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شان کے برخلاف جو بکواس اپنے رسائل میں کی ہے اس سے کیا ظاہر ہوتا وہ ہر عقل سلیم رکھنے والے کو معلوم ہے، بہر حال مرزا غلام احمد نہ مسیح موعود ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا مستقل نبی بلکہ حضرت محمد ﷺ کے قول کے مطابق دجال وکذاب اور اس کے حواری دائرہ اسلام سے خارج کافر مطلق ہیں۔ باقی جو لوگ انہیں امام مہدی موعود کہتے ہیں، وہ اس لیے غلط ہے کہ جو آدمی انبیاء علیہم السلام کے شان مبارک میں بکواس کرتا ہے، وہ کبھی بھی امام مہدی نہیں ہوسکتا، جس طرح یہ بات بالکل ظاہر اور باہر ہے۔ واللہ الھادی الی سبیل الرشاد

اب یہاں سے ختم نبوت کے دلائل ملاحظہ کریں:

حدیث ۱- ((عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَثَلِي وَمَثَلُ الْاَنْبِيَاءِ كَمَثَلِ احسن بنيانه ترك منه موضع لبنة فطاف به النظار يتعجبون من حسن بنيانه الاموضع اللبنة فكنت انا سددت موضع اللبنة ختم بى البنيان وختم بى الرسل وفى رواية فانا اللبنة وانا خاتم النبيين)) [1] (متفق عليه)

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدنا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال اور دیگر انبیاء کی مثال ایک عمارت کی طرح ہے جس کی تعمیر نہایت عمدہ ہو اور اس کی بناء میں صرف ایک اینٹ باقی رہتی ہو پھر وہاں آنے والے اور اس عمارت کو دیکھنے والے اس تعمیر کی بہت تعریف کررہے ہوں سواء اس اینٹ کی جگہ کے (آپ ﷺ نے فرمایا) پھر میں نے آکر نبوت کی عمارت کی باقی ایک اینٹ کی جگہ پر کیا اور میرے ذریعے وہ قصر مکمل ہوئی اور مجھ پر رسولوں کا خاتمہ ہوا ایک دوسری روایت میں ہے کہ میں ہوں نبوت کی باقی اینٹ اور میں ہوں انبیاء کا اختتام ﷺ''

حدیث ۲- ((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ أُعْطِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ طَهُورًا وَّمَسْجِدًا وَّأُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ)) [2]

''آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے دیگر انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں میں فضیلت دی گئی ہے۔ (۱) مجھے جوامع الکلم دیئے گئے ہیں۔ (۲) اور رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے (یعنی کفار کے دلوں میں میرا رعب بٹھایا گیا ہے)۔ (۳) میرے لیے مال غنیمت حلال کیا گیا ہے۔ (۴) میرے لیے پوری زمین مسجد اور پاک کرنے والی بنائی گئی ہے۔ (یعنی اس سے وضو کی جگہ تیمم کیا جاسکتا ہے)۔ (۵) مجھ سے (میرے

---

[1] اخرجه الشيخان، صحيح بخارى كتاب المناقب باب خاتم النبيين رقم الحديث ٣٥٣٥، وصحيح، مسلم كتاب الفضائل باب ذكر كونه ﷺ خاتم النبيين رقم الحديث: ٥٩٥٩.

[2] اخرجه مسلم كتاب المساجد ومواضع الصلاة باب المساجد ومواضع الصلاة، رقم الحديث: ١١٦٧.

آنے سے) نبیوں کا سلسلہ ختم کیا گیا ہے (یعنی میرے بعد کوئی بھی نیا نبی نہیں آئے گا)۔(۶) مجھے کائنات کی تمام انسانیت کی طرف بھیجا گیا ہے۔''

حدیث ۳- ((وعن عرباض بن سارية عن رسول الله ﷺ انه قال انی عند الله مكتوب خاتم النبيين وان آدم لمنجدل فی طينته وساخبركم باول امری دعوة ابراهيم وبشارة عيسى ورؤيا امی التی رأت حين وضعتنی وقد خرج لها نور اضاء لها منه قصور الشام)) ❶ (شرح السنه)

''عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اللہ کے ہاں خاتم النبیین لکھا ہوا تھا جبکہ آدم علیہ السلام ابھی مٹی کی صورت میں زمین پر رکھا تھا (یعنی ابھی ان میں روح نہیں پھونکا گیا تھا) اور میں تمہیں اپنے اول الامر (یعنی میں تمہیں اپنی نبوت کے ظہور کی ابتداء واولیت) کی خبر دیتا ہوں میں ابراہیم علیہ السلام کی دعا (یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ اے اللہ تو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک عظیم الشان نبی بھیجنا) اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت (یعنی عیسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کے آنے کی بشارت وخوشخبری دی تھی) اور میری امی نے مجھے جنتے وقت ایک نور دیکھا تھا جس کی روشنی شام کے محلات پر پڑی۔''

حدیث ٤- ((وعن جابر بن عبدالله رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ قال انا قائد المرسلين ولا فخر وانا خاتم النبيين ولا فخر وانا اول شافع وشفيع ولا فخر)) ❷

''جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں تمام رسولوں کا قائد ہوں اور اس میں کوئی فخر نہیں (یعنی یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا) اور میں تمام انبیاء کا اختتام ہوں اور اس میں فخر کی کوئی بات نہیں اور میں پہلا ہوں جو شفاعت کروں گا اور وہ شفاعت قبول کی جائے گی اور اس میں فخر نہیں۔''

حدیث ٥- ((عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ إِنَّ لِي أَسْمَاءً أَنَا مُحَمَّدٌ وَأَنَا أَحْمَدُ وَأَنَا الْمَاحِي الَّذِي يَمْحُو اللّٰهُ بِيَ الْكُفْرَ وَأَنَا الْحَاشِرُ الَّذِيْ يُحْشِرُ النَّاسُ عَلَى قَدَمِي وَأَنَا الْعَاقِبُ وَالْعَاقِبُ الَّذِي لَيْسَ بَعْدَه نَبِي)) ❸

''جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میرے کافی نام ہیں میں

---

❶ رواه الامام البغوی فی شرح السنه كتاب الفضائل باب فضائل سيد الاولين والآخرين محمد صلوات الله وسلامه عليه وعلى آله اجمعين وشمائله رقم الحديث: ٣٦٢٦.

❷ اخرجه الدارمی فی سننه، باب ما اعطی النبی ﷺ من الفضل رقم الحديث: ٥٠.

❸ اخرجه الشيخان، صحيح بخاری، كتاب المناقب، باب ماجاء فی اسماء النبی ﷺ، رقم: ٣٥٣٢ وصحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب فی اسمائه، رقم: ٦١٦٦.

محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور میں ماحی ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے ذریعے کفر کو مٹا دے گا اور میں حاشر ہوں یعنی جس کے (قبر) سے اٹھنے کے بعد دیگر انسان اٹھیں گے اور میں عاقب ہوں اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی بھی نیا نبی نہیں آئے گا۔''

حدیث ٦- ((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَنْبَعِثَ دَجَّالُونَ كَذَّابُونَ قَرِيبٌ مِنْ ثَلاثِينَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ أَنَّهُ رَسُولُ اللّٰهِ قَالَ أَبُو عِيسَى وَفِي الْبَاب عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ وَابْنِ عُمَرَ وَهَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ)) ❶

''یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک ۳۰ کے قریب جھوٹے دجال ظاہر نہ ہوں ان میں سے ہر کوئی اللہ کے رسول ہونے کا دعویٰ کرے گا۔''

حدیث ۷- ((عن ثوبان قال قال رسول الله ﷺ لا تقوم الساعة حتى تلحق قبائل امتى بالمشركين وحتى يعبدو الاوثان وسيكون فى امتى ثلاثون كذابون كلهم يزعم انه نبى وانا خاتم النبيين لا نبى بعدى)) (اخرجه الترمذى وقال هذا حديث حسن صحيح) ❷

''ثوبان رضی اللہ عنہ روایت بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک میری امت کے بہت سارے قبائل مشرکین سے جا کر ملیں اور جب تک وہ بتوں کی عبادت نہ کریں اور میری امت میں عنقریب ۳۰ جھوٹے لوگ ظاہر ہوں گے ان میں سے ہر کوئی نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی بھی نبی نہ آئے گا۔''

اس باب میں دیگر بے شمار روایات موجود ہیں مگر طوالت کے سبب انہی پر اکتفاء کی جاتی ہے۔ ان شاء اللہ طالب حق کے لیے کافی وشافی ہوں گی۔

حاصل کلام کہ ختم نبوت کا مسئلہ تواتر سے ثابت ہے اور یہ ایک اہم مسئلہ ہے اس لیے اس کا منکر کافر ہے مولانا بشیر احمد صاحب عثمانی مرحوم اپنی کتاب فتح الملہم فی شرح المسلم کے صفحہ ا۱ پر لکھتے ہیں کہ:

((وقد ذكرت فى المقدمة ان احاديث ختم النبوة قد جمعها بعض فضلاء عصرنا فبلغت ازيد من مأة وخمسين منها نحو ثلاثين من الصحاح السته

---

❶ اخرجه الترمذى فى سنة كتاب الفتن، باب ماجاء لا تقوم الساعة حتى يخرج كذابون، رقم الحديث: ۲۲۱۸.

❷ اخرجه الترمذى، كتاب الفتن باب ماجاء لا تقوم الساعة حتى يتخرج كذابون، رقم الحديث: ۲۲۱۹.

واجمع علیه الامة المرحومة وکفروا من جحده))

یعنی میں مقدمہ میں ذکر کر آیا ہوں کہ ختم نبوت کے متعلق احادیث ہمارے دور میں کسی فاضل نے جمع کی ہیں جو اسانید کے اعتبار (۱۵۰) سے بھی زیادہ ہیں جن میں سے (۳۰) احادیث تو صحاح ستہ کی ہیں اور امت مرحومہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس (ختم نبوت) کا انکار کرنے والا کافر ہے۔ مولانا مرحوم کے اقتباس سے معلوم ہوا کہ ختم نبوت کے مسئلے پر امت کا اجماع و اتفاق ہے اور اس کا منکر کافر ہے اور اس بارے میں جو احادیث ہیں وہ تواتر کے درجہ کو پہنچتی ہیں اور اسی صفحہ پر امام شعرانی کی کتاب بواقیت سے یہ عبارت نقل کی ہے جو امام شعرانی نے امام ابن عربی سے نقل کی ہے کہ فان مکلفا ضربنا عنقه ولا ضربنا عنه صفحا، یعنی اگر نئی نبوت کا مدعی (جو محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرتا ہے) مکلف ہے (یعنی عاقل بالغ ہے) تو ہم اس کی گردن ماریں گے۔ (یعنی اس کی سزا قتل ہے) اگر مکلف نہیں تو ہم اس سے منہ موڑ لیں گے۔ اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی عاقل بالغ نبوت کا دعویٰ کرے گا وہ گردن زنی کے لائق ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبوت کا دعویٰ کرنے کے بعد وہ مرتد ہو گیا ہے اس لیے اس کے ارتداد کی وجہ سے وہ قتل کیا جائے گا۔ واللہ اعلم

اور شرح عقائد کی شرح نبراس میں ہے کہ:

((فی خلاف بعض الشیعة زعموا ان الائمة الاثنی عشرة انبیاء والیزدیة اتباع یزید بن انیسه فرقة من الخوارج زعمت انه یبعث من العجم نبی بکتاب وینسخ هذا الدین بدین الصابین هذا ضلل وکفر))

یعنی نبوت کے ختم ہونے کے متعلق بعض شیعوں کا آپس میں اختلاف ہے ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ (۱۲) بارہ ہی امام نبی ہیں اور خوارج کا ایک گروہ یزیدیہ جو یزید بن انیسہ کا متبع اور مقلد ہے کہتا ہے کہ عجم سے ایک نبی پیدا ہوگا اور اس کے ساتھ کتاب بھی ہوگی اور اس دین (دین اسلام) کو صائبین کے دین سے منسوخ کرے گا۔

صاحب نبراس کہتے ہیں کہ یہ بات (یعنی نبی کی بعثت کا عقیدہ) واضح ضلالت اور کفر ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ سیدنا رسول اللہ ﷺ کے بعد نئی نبوت کی بعثت کا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ اسی طرح بہاولنگر کے ڈسٹرکٹ جج خان صاحب محمد اکبر کے سامنے ایک مقدمہ آیا جس میں مدعیہ ایک عورت تھی اس کا دعویٰ تھا کہ اس کا شوہر چونکہ غلام احمد قادیانی کو نبی مانتا ہے اور یہ بات ختم نبوت کے برخلاف ہے جو کہ امت مسلمہ کا اجماعی مسئلہ ہے اس لیے اس کا شوہر مرتد ہو گیا ہے اس بناء پر اس کا نکاح فسخ کیا جائے کیونکہ ایک مسلم عورت ایک کافر کے نکاح میں نہیں رہ سکتی خان صاحب موصوف نے اس مقدمہ کا فیصلہ عورت کے حق میں کیا اور اس عورت کی طرف سے کئی علماء کرام شاہد تھے۔ جن میں مولانا انور شاہ کاشمیری بھی شامل تھا۔ ان تمام نے مدعیٰ علیہ یعنی اس عورت کے شوہر کا کفر ثابت

کیا۔ بالآخر اس عورت کا نکاح فسخ کیا گیا اور جج صاحب نے ڈگری اس عورت کے فائدہ میں نکالی یہ مقدمہ ایک رسالہ بنام مقدمہ بہاولپور میں شائع ہوا جو کتب خانہ عالیہ علمیہ میں موجود ہے۔ بہرحال قادیانی دجال کا کفر اور اس کے پیروکاروں کا اسلام سے خارج ہونا اظہر من الشمس ہے، اس تمہید کے بعد میں اصل بات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس کی وجہ سے یہ کتاب لکھنا شروع کی ہے کہ اس رسالہ فیصلہ آسمانی (مولفہ غلام احمد نرخ) میں جو کچھ ہمارے جد امجد کریم اور پیر بیعت والے کے متعلق لکھا ہے وہ بالکل سفید جھوٹ ہے ہمارے پاس پیر سائیں مرحوم کے ملفوظات اور ان کے فرزند رشید پیر خلافت والے مرحوم کے ملفوظات بھی موجود ہیں اور ان کی دیگر کئی کتب موجود ہیں لیکن کسی میں بھی ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے اور ابھی تک پیر سائیں کے کئی مریدین اور معتقدین موجود ہیں لیکن کسی سے بھی ایسی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی مذکورہ بالا مفتری صاحب کے رسالہ سے ایک یہ بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک دفعہ پیر صاحب مرحوم نے عصا ہاتھ میں پکڑ کر حاضرین مجلس کو با آواز بلند فرمایا کہ میں حضرت مرزا صاحب کو اپنے دعویٰ میں سچا سمجھتا ہوں، وغیرہ کیا یہ بات عقل سلیم کا مالک قبول کرنے کے لیے تیار ہوگا کہ اتنی بھری مجلس میں پیر سائیں بیعت والے جیسا مرد مجاہد جس کے معتقدین بے شمار ہیں اور آج بھی ان کا نام سن کر رو دیتے ہیں ایسی بات کہیں کہ اس کا علم سوائے نام نہاد عبداللہ عرب اور عبداللطیف کے علاوہ کسی کو نہ ہو؟ کیونکہ اگر واقعتاً انہوں نے یہ بات کہی ہوتی تو اور کوئی نہ سہی جو اس وقت حاضرین مجلس تھے وہ تو غلام احمد کے معتقد بن جاتے بلکہ اس رسالہ پر افتراء میں ان کے فرزند پیر سائیں خلافت والے کا موجود ہونا بھی مذکور ہے اور اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہمارے والد صاحب نے تصدیق کی ہے تو ہمیں بھی انکار نہیں؟ پھر کیوں نہیں پیر سائیں خلافت والے غلام احمد کے معتقد بنے؟ آخر اتنا سکوت کیوں؟ کہ ایسی کوئی بات نہ ان کے فرزند رشید پیر سائیں خلافت والے سے منقول ہے بلکہ ان سے تو ایک ایسی بات منقول ہے جو قادیانی کے دجال و کذاب ہونے پر دال ہے جیسا کہ ہم وہ بات حضرت مرشد کریم پیر سائیں احسان اللہ شاہ المعروف پیر سائیں سنت والے علیہ الرحمہ کا جواب نقل کرتے وقت ذکر کریں گے، جو رسالہ توحید میں شائع ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے پیر سائیں بیعت والے کے ہاں ایک بڑی جماعت رہتی تھی اور ان کے ساتھ ان کے مرید قاضی و مولی فتح محمد نظامانی مرحوم بھی رہتے تھے اور ان کے فرزند رشید حضرت پیر سائیں خلافت والے علیہ الرحمہ جو علم میں اپنی مثال آپ تھے پھر ان پر یہ بات کیونکر واضح نہ ہوئی؟ یہ کیا بات ہوئی کہ پیر سائیں مرحوم یہ قادیانی دجال کی تصدیق کی اور پیر سائیں خلافت والے خاموش رہے اور ان کی تصدیق پر اپنی تصدیق ثبت کر دی جبکہ ملفوظات پیر سائیں بیعت والے میں یہ بھی تو ہے کہ شہد میں چوہا مرا پڑا تھا، پیر سائیں بیعت والوں نے فقہی روایت کے مطابق اسے ابلوا کر پینا شروع کر دیا مگر ان کے فرزند سائیں خلافت والوں نے آ کر کہا کہ یہ شہد پاک نہیں پھر پیر سائیں بیعت والوں نے تحقیق کر کے وہ شہد انڈلوا دی یہ پورا قصہ ملفوظات میں مذکور ہے پھر جب شہد جیسی بات پر خاموش نہ ہوئے پھر اس اتنی بڑی بات پر کیسے خاموش

ہوئے اور خاموشی بھی ایسے ہوئے کہ اس بارے میں کوئی بھی بات چیت نہ ہوئی" نہایت ہی عجیب بات ہے۔ ٹھیک ہے جب پیر سائیں مرحوم نے مرزا کو مسیح موعود سمجھ لیا تھا اور اس کی تصدیق کی تھی تو پھر آپ کیوں نہیں اس کی طرف محوسفر ہوئے یا کم از کم اپنے فرزندوں میں سے کسی کو اس کی طرف بھیجتے یا اپنی جماعت کو باقاعدہ اس کی اتباع کا امر وتاکید کرتے۔ افسوس! قادیانی دجال وکذاب کے متبعین کا حال کتنا ہی عجیب ہے کہ وہ مرزا غلام احمد دجال وکذاب کو سچا ثابت کرنے کی خاطر کتنی ہی غلط بیانی سے کام لیتے ہیں اور کتنی ہی کذب بیانی کرتے ہیں۔ فلعنة الله على الكاذبين، میں دوبارہ تاکید کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ اگر پیر سائیں مرحوم نے یہ بات کہی ہوتی تو ضرور آپ بنفس نفیس یا اپنے فرزندوں میں سے کسی کو مرزا غلام احمد کی طرف بھیجتے اور جماعت کو بھی تاکید کرتے جب یہ بات ہے ہی نہیں بلکہ صرف نام نہاد عبداللہ عرب اور عبداللطیف کے علاوہ اور کسی کا نام ہی نہیں لیا جاتا جس سے یہ بات واضح وروشن ہے کہ یہ بات سراسر جھوٹی ہے اور اس میں ذرہ برابر صداقت نہیں۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ پیر سائیں رحمہ اللہ نے یہ بات فرمائی تھی تو پھر آپ نے اپنی جماعت کو مرزا کی اتباع کا امر کیوں نہیں فرمایا اور نہ ہی اپنے فرزندوں میں سے کسی کو بھیجا اور نہ ہی ان کے فرزند رشید پیر سائیں خلافت والوں سے (سجادہ نشینی کے وقت) ایسی کوئی بات منقول ہے بلکہ جو منقول ہے وہ اس کے سراسر برعکس ہے جو آگے ذکر کیا جائے گا۔ تو پھر کہا جائے گا کہ پیر سائیں کو دوبارہ جلد ہی معلوم ہو چکا تھا کہ پہلا کشف صحیح نہ تھا اور صحیح بات یہ ہی ہے کہ مرزا دجال کذاب اور دائرہ اسلام سے خارج ہے اس لیے جلد ہی آپ نے پہلی بات سے رجوع کر لیا اور جماعت کو بھی امر نہ فرمایا اور نہ ہی اپنے فرزندوں میں سے کسی کو اس کی طرف بھیجا آپ خود بھی اس کی طرف محوسفر نہ ہوئے ورنہ اس بات کا صادر ہونا پیر سائیں مرحوم جیسے اہل اللہ اور عالم ربانی سے بالکل بعید ہے کہ ایک بات کو صحیح سمجھیں اور اس پر عمل نہ کریں اور نہ ہی اپنی جماعت کو اس بارے میں کوئی امر فرمائیں۔ جو لکھا گیا وہ علی سبیل التنزل تھا ورنہ میں اپنے رب کو شاہد بنا کر کہتا ہوں کہ پیر سائیں رحمہ اللہ نے یہ بات قطعاً نہیں فرمائی بلکہ یہ بات ان کی ذات اقدس پر بالکل صاف اور صریح بہتان ہے۔ علاوہ ازیں جو اسماعیل آدم یا مرزا کے نام سے دکھلایا گیا ہے وہ سو فیصد جھوٹ ہے اور آپ کی طرز تحریر کے بھی خلاف ہے اور آپ کی سائن مبارک اس طرح نہ تھی جس طرح اس رسالہ میں دکھلائی گئی ہے۔ ہم قادیانی دجال کے چیلوں کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ اپنے افتراء کو مضبوط دلائل سے ثابت کریں وگرنہ اس غلط بیانی اور دروغ وبازی سے باز آ جائیں۔ اگر قادیانی دجال کے چیلے اس دعویٰ میں سچے تھے تو پیر سائیں مرحوم کا وہ خط بعینہٖ فوٹو کروا کر شائع کروا دیتے تا کہ ساری دنیا دیکھ لیتی اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ تحریر واقعتاً آپ ہی کی ہے۔ لیکن جھوٹ آخر کتنا چلے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا کے چیلوں کو پیر سائیں مرحوم کے شان کو داغدار کرنے کا خیال ہے کیونکہ بات ظاہر ہے کہ قادیانیوں کے افتراء کے مطابق جب آپ نے ایک بات کی تصدیق کی لیکن اس کی خبر کسی کو بھی نہ دی بلکہ چھپا دی اور حاضرین مجلس کو بھی اخفاء کا امر کیا کیونکہ حاضرین مجلس

میں سے کسی سے بھی اس بارے میں کوئی بات منقول نہیں تو کہا جائے گا کہ یا تو پہلے کشف غلط تھا یا دانستہ مرزا کو جھوٹا سمجھ کر بھی اس کی تصدیق کی پھر لوگوں کے بدظن ہونے کے سبب ان سے مخفی رکھا یا مرزا کو سچا سمجھتے لیکن عام علماء اور صلحاء کی مخالفت کے سبب اخفاء کیا کہ ہمارے اوپر کوئی فتویٰ نہ آ جائے بہرحال کوئی بھی احتمال مراد لیا جائے اس سے ان کی شان اقدس کو کافی نقصان پہنچتا ہے اور اس سے تو نعوذ باللہ یہ بات نکلے گی کہ پیر سائیں کے دشمنوں نے دانستہ تقیہ اختیار کیا اور حق کو چھپائے رکھا کیا اہل اللہ کی یہ صفت ہو سکتی ہے اور کیا اس صفت سے موصوف انسان کی تصدیق کو اپنی صداقت کی دلیل قرار دیا جائے گا۔ سبحانك هذا بهتان عظيم

قادیانی دجال کے چیلوں کو شرم آنی چاہیے اور اپنی افتراء بازی سے باز آنا چاہیے کیا صداقت کا منور چہرہ بھی کبھی افتراء بازی کی ظلمت میں چھپ سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ پیر سائیں بیعت والوں پر اس قادیانی دجال و کذاب کی حقیقت واضح تھی اس کا پردہ چاک کیا تھا جیسا کہ آگے ذکر کریں گے اس لیے اس دروغ گوئی سے وہ اپنی عداوت اور اندر کی جلن کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں۔ مگر جھوٹے کو کبھی راستہ نہ ملے گا۔ اللهم اهدنا سواء الصراط.

اور ایک اندرونی شہادت اس کے جھوٹے ہونے کی یہ ہے کہ اس رسالہ میں ہے کہ ''اور ان کے صاحبزادے نے کہا کہ جب میرے والد صاحب نے تصدیق کی ہے تو مجھے بھی انکار نہیں'' اس صاحبزادہ سے مراد کونسا صاحبزادہ ہے یہ بات بالکل واضح نہیں یہ بھی قادیانی دجال کے چیلوں کی چالاکی و عیاری ہے کہ مبہم صاحبزادہ کا ذکر کیا گیا ہے مگر تاہم ہم ان کے متعلق عرض کرتے ہیں کہ پیر سائیں بیعت والوں کے پانچ فرزند تھے ایک پیر سائیں خلافت والے رحمہ اللہ رسالہ مذکورہ کی ظاہری عبارت کی یہی تقاضا ہے کہ وہاں پر صاحبزادہ سے مراد پیر سائیں خلافت والے ہی ہیں کیونکہ آپ عالم دین تھے اور یہ بات کہ میرے والد صاحب نے جب تصدیق کر دی ہے تو ہمیں بھی انکار نہیں ایک عالم ہی کہہ سکتا ہے اگر واقعتاً اس سے مراد پیر سائیں خلافت والے ہیں تو یہ بات بالکل غلط اور سفید جھوٹ ہے کیونکہ ہمارے والد اور مرشد کریم مرحوم نے اپنے والد پیر سائیں خلافت والے سے پوچھا تھا انہوں نے پیر سائیں بیعت والوں سے اس کے برعکس نقل فرمایا وہ ہم آگے نقل کریں گے اور کوئی بات آپ نے نہ کہی اس لیے یہ بات بالکل جھوٹ ہے اور اگر صاحبزادہ سے مراد دوسرا فرزند پیر میاں امام الدین شاہ ہے تو یہ بات بھی جھوٹی ہے کیونکہ پیر صاحب مرحوم اکثر طور پر ٹھلاہ شریف رہتے تھے نہ کہ درگاہ پیر جھنڈہ میں لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اس وقت اتفاقاً پیر صاحب پیر سائیں کے پاس موجود تھا اور اس وقت ان سے یہ بات سن کر اس کی تصدیق کر دی لیکن یہ بات بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ پیر صاحب مرحوم بھی باعمل اور صالح تھے پھر جب واقعتاً پیر سائیں نے اس طرح کہا تھا اور پیر صاحب نے تصدیق کی تھی تو بالضرور پیر صاحب اس بات کو وہاں ٹھلاہ شریف میں اپنی جماعت میں عام کرتے اور وہاں ان کے بہت سے مؤید و معتقد ہیں مگر اس بات کا وہاں بھی

کوئی پتہ نہیں لگتا آخر یہ کیسا اسرار ہے کہ ایسی زبردست قابل اعتناء بات صرف دولفظوں سے تصدیق کردی اور پھر اسے ترک کردیا اور اس کے بعد کوئی بات نہ ہوئی۔ قادیانی دجال کے چیلوں کو اپنے ہوش کا علاج کروانا چاہیے کیا اس طرح کی باتیں کوئی ہوش والا انسان کرے گا؟ اور اگر صاحبزادہ سے مراد ان کے تیسرے فرزند پیر محمد حسین شاہ ہے تو یہ بھی جھوٹ ہے کیونکہ پیر صاحب کوئی عالم تو نہیں تھے کہ ان کی تصدیق پر اعتماد کیا جائے علاوہ ازیں پیر صاحب موصوف ابھی تک بقید حیات ہے ان سے اس بارے میں دریافت کیا جاسکتا ہے اگر کسی قادیانی دجال کے چیلہ کو شک ہو تو پیر صاحب سے روبرو پوچھ لے ناکامی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا اور اگر صاحبزادہ سے مراد پیر صاحب محبوب شاہ (ان کا چھوٹا فرزند) ہے تو یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ پیر صاحب مرحوم عالم نہ تھا اور دوسرے یہ کہ وہ اس وقت چھوٹے تھے تو پھر ایسی بات قادیانی دجال کی تصدیق کے لیے کیسے کہیں گے۔ رسالہ کی ظاہر عبارت سے تو ہر ذی عقل یہی سمجھے گا کہ اس کا کہنے والا کوئی عاقل، بالغ اور عالم ہے کہ اگر چہ اس کے پاس انکار کے اسباب موجود ہیں لیکن اپنے والد صاحب کی تصدیق کے بعد اپنے انکار کو ترک کررہا ہے کیا ایک چھوٹا بچہ جسے یہ خبر نہیں کہ انکار کے کونسے اسباب ہیں اور نہ ہی یہ معلوم کہ تصدیق کس بناء پر ہوتی ہے۔ اس طرح کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کرے گا اور یہ کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہے مگر چونکہ قادیانی دجال کے چیلوں کی دنیا ہی نرالی ہے اس لیے اگر ہم جیسوں کی سمجھ سے ان کی یہ بات بعید ہوئی تو کچھ تعجب نہیں اور اگر صاحبزادہ سے مراد ان کا پانچواں فرزند پیر اسماعیل شاہ مراد ہے تو یہ بات بالکل غلط اور جھوٹ کا پلندا ہے کیونکہ ایک تو پیر صاحب اس وقت چھوٹے تھے ایسی باتیں سمجھنے کا وقت ہی نہ آیا تھا دوسرے یہ کہ پیر صاحب عالم نہ تھے تیسرے یہ کہ ابھی آپ حیات ہیں کسی کو شک ہو تو ان سے دریافت کرسکتا ہے مگر ان تمام باتوں سے یہ بات قابل اعتناء ہے کہ جب پیر سائیں کا بڑا فرزند اور عالم دین اور باعمل اور ایک اہل اللہ شخص تھا اور پیر سائیں بیعت والوں رحمہ اللہ کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کا جانشین بھی وہی تھا اسے بھی یہ خبر نہ ہوئی بلکہ آپ اس سے برعکس نقل کررہے ہیں تو پھر نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ نے یہ بات اپنے دیگر فرزندگان میں سے کسی کو بتائی باقی اپنے جانشین اور خلف رشید کو اس کے متعلق کوئی بھی خبر نہ ہوسکی مگر یقینی بات ہے کہ جھوٹے کو کبھی ہدایت نہیں ملتی، آخر میں اتنا عرض دوبارہ کیا جاتا ہے کہ اسماعیل آدم کے متعلق جو خط رسالہ میں نقل کیا گیا ہے وہ سراسر جھوٹ ہے۔ اگر چہ اس کے متعلق پہلے کچھ عرض کیا ہے دوبارہ بھی کہتا ہوں کہ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں کہ پیر سائیں رحمہ اللہ نے ایک نام نہاد اسماعیل آدم کو تو خط لکھا اور انہیں فتویٰ دیا لیکن باقی دوسری پوری جماعت اور اپنے فرزندگان ارجمند میں سے کسی کو بھی نہ بتایا جن کا ان پر حق تھا اور ایسی قابل اعتناء بات سے ان کو واقف کرنا پیر سائیں کا اولین فرض تھا۔ یہ کیا کہ خود را فضیحت دیگران نصیحت۔ اللہ اکبر، پیر سائیں بیعت والوں کا مقام وشان اس سے بہت اعلیٰ وارفع تھا۔

قادیانی دجال کے چیلو! کچھ ہوش کے ناخن لو، بلاوجہ اللہ کے اولیاء پر بہتان باندھ کر عوام کو گمراہ کرنے کی

کوشش مت کرو ورنہ یادرکھو سیدنا وامامنا محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ((ان اللہ تعالیٰ قال من عادی لی ولیا فقد اذنتہ بالحرب))[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے میرے دوست سے دشمنی کی اس سے میرا اعلان جنگ ہے۔ مطلب ہے کہ ایسے بہتانوں سے صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کے ماسواء کچھ حاصل نہ ہوگا اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اگر واقعتاً پیر سائیں رحمہ اللہ نے اس طرح فرمایا ہوتا تو ضرور مرزا کی طرف سفر کرتے باقی امریکا جانے سے عبداللہ عرب اور دیگر دوستوں کے منع کرنے سے ان کا رک جانا سے (ان کے بزعم کیونکہ ہم تو اس پورے واقعہ کو جھوٹ سمجھتے ہیں) یہ دلیل لینا کہ پیر سائیں رحمہ اللہ کو اس کی طرف (مرزا کی طرف) جانے سے جماعت نے تکلیف سے بچنے کے سبب روکا تھا۔ یہ بھی غلط ہے کیونکہ مرزا کی طرف جانا اور امریکہ جانے میں زمین وآسمان کا تفاوت ہے اور اس لیے کہ ان کے زعم باطل کے مطابق جب انہوں نے مرزا کو مسیح موعود تسلیم کر لیا تھا تو پھر بالضرور پیر سائیں رحمہ اللہ کو اس کی طرف جانا چاہیے تھا پھر کیوں نہیں گئے؟ اگر آپ خود نہ گئے تھے تو اپنے کسی فرزند کو تو بھیج دیتے۔ اور جماعت کو با قاعدہ اس کی تبلیغ کرتے لیکن انہوں نے کچھ بھی نہ کیا آخر کیوں؟

ایک عرض دوسرا بھی کرتے ہیں کہ اسماعیل آدم بھی قادیانی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ رسالہ کا سیاق اس پر اچھی طرح دال ہے پھر اسی طرح کے شخص کی گواہی ان کے مخالف پر کیسے کارگر ہوگی۔ قادیانی دجال کے چیلوں کو یہ موٹی بات بھی سمجھ میں نہ آ سکی۔ اب میں اپنے رسالہ کو یہاں ختم کرتا ہوں اور اس کے بعد اب پیر سائیں مرشد کریم سنت والے رحمہ اللہ کا جواب نقل کیا جاتا ہے۔ جو انہوں نے قادیانی افتراء کی قلعی کھولنے کے لیے رسالہ توحید میں شائع کروایا تھا۔

حضرت پیر سید احسان اللہ شاہ راشدی کا جواب بنام قادیانی کذب:

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ، ہو عام وخاص مسلمان کو معلوم ہے کہ بڑے عرصہ سے قادیانیت کا فتنہ ہندوستان میں چل رہا ہے دو تین سالوں سے یہ منحوس تحریک اور دیسی خانہ ساز نبوت کی تبلیغ کے اثر نے سندھ میں آ کر اپنا دامن بچھایا ہے۔ پنجاب کے چند شر پسندوں اور بعض سندھی شکم بوکھوں نے چند ٹکوں کی خاطر ایمانی نعمت کو فروخت کر کے خزی الدنیا والاخرۃ کو قبول کر کے سادہ لوح عوام کے خزانہ ایمان کو لوٹنے کے لیے ایک مصنوعی نبی کی نبوت منوانے کے لیے تبلیغ کر رہے ہیں۔ چنانچہ ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۳ ہجری میں ایک ٹریکٹ ظہور امام مہدی الزمان کے نام سے ہمیں موصول ہوا اسے دیکھنے کے بعد ہم مجبور ہوئے کہ چند سطور نظر قارئین کریں تا کہ عام مسلمان اس میں سطور بہتان کی حقیقت سے باخبر ہوں اور جو جھوٹ ہمارے مرشدین رحمہم اللہ کے نام پر لگایا گیا ہے اس کی حقیقت سے واقف ہوں ٹریکٹ کے صفحہ نمبر ۲ میں سرخی ہے پیر رشید الدین صاحب

[1] اخرجه البخاری کتاب الرقاق باب التواضع، رقم الحدیث: ٦٥٠٢.

المعروف پیر سائیں جھنڈا والا کی گواہی۔ اور اس عنوان کے تحت سارا ڈیڑھ صفحہ صریح جھوٹ اور افتراء سے بھرا ہوا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر علی الاعلان لکھتے ہیں اور تمام مسلمانوں کو باخبر کرتے ہیں کہ جو بھی حقیقت اس ٹریکٹ کے صفحہ ۶، ۷، ۸ پر لکھی ہے وہ محض جھوٹی اور قادیانی امت کی بکواس ہے۔ حضرت مرشد کریم جدامجد رحمہ اللہ کے نام لکھا ہے کہ انہیں استخارہ میں قادیانی کاذب اور مردود کے نام از ماست در عشق مادیوان شدہ است اور وہ صادق تھا، وہ صادق تھا، وہ صادق تھا۔ کا الہام ہوا۔ جو محض بہتان ہے۔ سبحانك هذا بهتان عظيم

اور نہ ہی اسماعیل آدم کو مرشد کریم نے کوئی خط لکھا تھا اور نہ ہی آپ نے یہ گواہی دی اور نہ ہی آپ نے کبھی اس طرح فرمایا، جس طرح اس مسیلمہ کذاب کے ہم مذہب نے دوسرے کئی جھوٹ اور بہتان اور فحش گوئی اپنی کتابوں میں لکھی ہے انہی کی طرح یہ جھوٹ بھی ہمارے جدامجد نور اللہ مرقدہ پر اس کے حواریوں نے باندھا۔ ہم مرزائی امت کو چیلنج دیتے ہیں کہ جدامجد رحمہ اللہ کی جو سائن اس ٹریکٹ میں درج ہے وہ مصنوعی اور من گھڑت ہے جدامجد رحمہ اللہ کے سینکڑوں مکتوب آج بھی ان کے معتقدین کے پاس موجود ہیں اور کتنے مکتوب ہمارے مکتبہ علمیہ عالیہ میں موجود ہیں مگر کسی بھی خط میں آپ نے اس طرح سائن نہیں کیے اور نہ ہی ان کا سائن لکھنے کا یہ طریقہ تھا، آپ کا سائن لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ آپ کے سائن کے ساتھ آپ کی مہر مبارک بھی ہوتی تھی۔ ہمارے والد گرامی مرشد و مربی حضرت پیر سائیں رشد اللہ شاہ صاحب اللواء الرابع ہمارے جدامجد رحمہ اللہ کے فرزند رشید اور عالم باعمل اور ان کے مسند کے نشین تھے ان سے ہم نے اور عام جماعت نے کتنی ہی بار سنا تھا کہ وہ اپنے والد ماجد رحمہ اللہ سے نقل کرتے تھے کہ ہم نے قادیانی شخص مرزا غلام احمد کے لیے استخارہ کیا جس میں ہمیں سمجھایا گیا کہ اس مرزا سے مذاق ہوئی ہے اور اس نے اسے سچا سمجھ لیا ہے (خط کشیدہ الفاظ ناظرین کو انصاف کی نظر سے دیکھنے چاہئیں)
والله على ما اقول وكيل، اور آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ استہزاء کفار سے کرتا ہے جس طرح فرمایا:

﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ (البقرة: ١٥)

اور آپ کے استخارہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرزا سے شیطانی تلاعب ہوا ہے نہ کہ حقانی تناسب۔ پھر یہ اہل ایمان کے لائق ہے کہ مرزا اور اس کے پیروکاروں سے ایک طرف رہ کر اپنے ایمان کو محفوظ رکھیں کیونکہ ایسے لوگوں سے حذر واجب ہے۔ جس طرح قرآن مجید میں ہے:

﴿فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴾ (المنافقون: ٤)

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح قادیانی جماعت کا امام خال اور مستہزی بہ ہے اسی طرح اس کی جماعت پر استہزائیت غلبہ کر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے استہزاء کر رہے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ (التوبة: ٦٥) کے مصداق بن کر مخلوق خدا کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اے اہل ایمان ہوشیار ہو کر سنبھل کر چلو شیطانی چکروں میں اگر رحمت الٰہی سے محروم نہ بن جانا۔ ان قادیانیوں سے

کلام اور گفتگو مت کرو کیونکہ اس طرح کہ لوگوں سے مجلس کرنے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں منع فرمایا ہے جس طرح فرمایا:

﴿وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ (النساء: ١٤٠)

اس لیے ہمیں امید ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی ہوشیار ہو کر اپنے آپ کو ﴿وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ کے مصداق بنائیں گے اور ان قادیانیوں شیاطین الانس کے زخرف القول غرورا پر ہرگز غور نہ کریں گے۔

مقام غور ہے کہ جب حضرت جد امجد کو استخارہ میں (ٹریکٹ میں موجود جھوٹ کے مطابق) جواب ملا تھا تو پھر آپ نے مرزا کی بیعت کیوں نہ کی۔ اس کے بعد ان کے فرزندوں اور برادرز میں سے کسی نے بھی آج تک اس کی بیعت نہیں کی۔ ہمارے آباء و اجداد اور ہم آج تک اس عقیدہ پر ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی خادع اور کاذب اور غلط مدعی اور بڑا عیار و چالباز تھا اور دعویٰ نبوت میں مسیلمہ الکذاب سے نمبر لے گیا ہے اس کے الہام اور تحریر و تصنیف گوز شتر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ ان چند سطور کی تحریر پر فقط اس لیے مجبور ہوئے کہ قادیانی کذابین نے ہمارے بزرگوں پر جھوٹ و افتراء باندھ کر اپنی خانہ ساز نبوت کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہے چونکہ ہم اس وقت ان کی سند پر بیٹھے ہیں اس لیے ہمارے اوپر حق ہے کہ ان کے نام پر جو بھی جھوٹ باندھے گئے ہیں ان کی حقیقت سے مسلمانوں کو آگاہ کریں ہمارے مربی و محسن حضرت جد امجد رحمہ اللہ کو جن اشخاص نے دیکھا ہے وہ ان کے احوال سے بخوبی واقف ہیں کہ آپ تو ایک کٹر موحد اور پکے متبع سنت تھے۔ انہوں نے کسی طور پر بھی قادیانی دجال کو مسیح موعود نہیں کہا۔ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر بھی اس طرح کے شریر لوگوں کے افتراءات و اتہامات سے محفوظ نہ رہ سکے تو خود نبی آخر الزمان سید المرسلین و امام الانبیاء و خاتم الانبیاء کو بھی تو اس طرح کے شریر لوگوں کے افتراءات سے نہ بچ سکے۔ بلکہ آپ کو مجنوں وغیرہ کہا گیا تو جب آج ہمارے جد امجد پر اس قادیانی امت نے افتراءات و اکاذیب باندھے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم اسلامی جرائد کو پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہمیں شکریہ کا موقعہ دیں اور یہ ان کا احسان ہمارے اوپر رہے گا۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب، ونعوذبك من شر فتنة المسيح الدجال. منقول از رساله توحيد جنوری ١٩٣٥ء مطابق شوال ١٣٥٤هـ راقم الحروف العبد الحقير لعل محمد عفى الله عنه بحسب الحكم جناب مستطاب حضرت پیر سائیں احسان الله شاه صاحب اللواء الخامس.

اب میں اپنے اس رسالہ کو یہاں ختم کرتا ہوں اور اپنے تمام دوستوں اور معتقدوں کو پرزور استدعا کرتا ہوں کہ اس رسالہ کا انصاف کی نظر سے مطالعہ کریں اور قادیانی امت کے مکر وفریبوں میں آ کر اپنے خزانہ ایمان کو برباد نہ کریں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين .

اللهم فاطر السموات والارض وعالم الغيب والشهادت رب كل شيء ومليكه، اشهد ان لا اله الا انت وحدك لا شريك لك وان محمدا عبدك ورسولك ربنا آمنا بما انزلت واتبعنا الرسول فاكتبنا مع الشاهدين والصلاة والسلام على رسول الكريم وصفيه وخاتم النبين وشفيع المذنبين وعلى آله واصحابه اجمعين .

وانا العبد احقر العباد

ابو الروح سيد محب الله شاه الحسينى

❁❁❁❁

تین جھوٹ اور ان کی حقیقت

حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کے متعلق تین جھوٹ مشہور ہیں، جن میں بعض لوگ کچھ حد سے ہی زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ اس ضرورت کے تحت کہ اس پرفتن دور میں کہیں عام عوام ان کے لٹریچر کو پڑھ کر گمراہ نہ ہو جائیں ان کی راہنمائی کے لیے شاہ صاحب نے اس مضمون کو لکھا۔

(الازہری)

منکرین اسلام ہمیشہ انتظار میں رہتے ہیں کہ انہیں کوئی موقع ملے اور وہ قرآن وسنت کے خلاف زہرافشانی کریں، قرآن کریم نے جناب ابراہیم علیہ السلام سے متعلق شہادت دی ہے کہ ﴿اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ وہ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی تھے، معترضین ابراہیم خلیل اللہ کی تین باتوں پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں اور دین اسلام پر قدغن لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

آیئے! ذیل میں ہم ان باتوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ابراہیم علیہ السلام سے منسوب تین جھوٹ سے متعلق پردہ کشائی اور حقیقت حال سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔

تحقیقی جواب عرض کرنے سے پہلے یہ گزارش ہے کہ تضاد کا یہی اعتراض خود قرآن حکیم پر بھی وارد ہوسکتا ہے کیونکہ انہی تین کذبات میں سے دو تو قرآن مجید میں موجود ہیں:

۱۔ سورۃ انبیاء میں ارشاد ہے:

﴿قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ (الانبیاء: ٦٣)

یعنی یہ فعل (بتوں کو توڑنے کا کام) اس بڑے نے کیا ہے، یعنی اس بڑے بت نے چھوٹے بتوں کو توڑا ہے۔ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمانا بظاہر جھوٹ معلوم نہیں ہوتا؟

۲۔ سورۃ الصافات میں یہ آیتیں ہیں:

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ۝ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ۝﴾ (الصافات: ۸۸۔۸۹)

ستاروں کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں بیمار ہوں یہاں بھی جناب خلیل اللہ کا یہ فرمانا کہ میں بیمار ہوں بظاہر کذب ہی ہے کیونکہ اگر واقعتاً بیمار ہوتے تو بت خانہ میں جا کر ان کے بتوں کو نہ توڑ پھوڑ ڈالتے۔ اور اس واقعہ سے پہلے سورۃ انبیاء میں جناب ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول مذکور ہے کہ ﴿تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ﴾

یعنی اللہ کی قسم! تمہاری پیٹھ پیچھے تمہارے ان (بتوں) کی ضرور درگت بناؤں گا۔ اس سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ وہ بیمار نہیں تھے اور ان کے (بت پرستوں) کے جانے سے پہلے وہ ان بتوں کی درگت بنانے کا مصمم ارادہ فرما چکے تھے لیکن اس کام کے کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک ساتھ میلے پر نہ جاتے، لہٰذا انہوں نے اپنے نہ جانے کا عذر یہ پیش کیا کہ ﴿انی سقیم﴾ میں بیمار ہوں اور انہوں نے واقعتاً انہیں بیمار سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ پھر جناب ابراہیم علیہ السلام نے پیچھے سے ان کے بت خانہ کا سوائے ایک بت کے صفایا کر دیا، بہر حال بظاہر تو اس آیت کریمہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خلیل اللہ علیہ السلام نے جھوٹ کہا۔

اب تحقیقی جواب ملاحظہ فرمایئے یہ اعتراض یا حدیث، قرآن سے متضاد سمجھ میں آنا لغت عرب سے عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ لغت کی کتاب مثلاً تاج العروس وغیرہ میں لفظ کذب کے چند معانی لکھے ہیں، من جملہ ان معانی کے ایک معنی یہ بھی لکھا ہے کہ ایسی بات کرنا جس سے ظاہر صورت جھوٹ جیسا معلوم ہو گو واقعہ کے اعتبار سے وہ بالکل صحیح ہے یعنی اگر اولین مخاطب کلام کے تمام اسلوب و انداز سے ایسی بات سمجھ لے جو جھوٹ کے زمرہ میں آتا ہو حالانکہ جس سے مراد متکلم نے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں وہ واقعتاً صحیح ہوں اس لیے کہ متکلم نے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو ان کے معنی مراد کو بھی متضمن ہیں اگرچہ بظاہر وہی معنی سمجھا جائے جو مخاطب اولین نے سمجھا کیونکہ وہ متعارف زیادہ ہے یا لفظ ہی زوجین معنیین ہے اور جو معنی مخاطب نے سمجھا وہ اشہر و اعرف تھا اور متکلم نے جو معنی مراد لیا وہ بعید تھا جیسا کہ توریہ، ابہام اور تعریض وغیرہم میں ہوتا ہے اور یہ مقولہ تو مشہور ہے کہ:

"ان فی المعاریض لمندوحة عند الکذب"

یعنی کوئی متکلم جھوٹ بولے اس ایک سے اس کو تعریض میں زیادہ وسیع مجال اور بولنے کا میدان مل جاتا ہے۔ بہرحال تعریفیں جھوٹ نہیں ہوا کرتیں، اس لیے انبیاء علیہم السلام کے کلام میں تعریض کے کافی نمونے ملتے ہیں، اسی طرح اگر کسی مجادل اور مکار سے مناظرہ ہو رہا ہو تو وہاں بسا اوقات خصم کو انہی مسلمات سے پکڑنے کے لیے باطل کو فرض کرنا پڑتا ہے تاکہ اس پر حجت قائم ہو جائے جس کو اصطلاح مناظرہ میں (فرض الباطل مع الخصم حتی تلزمه الحجة) کہتے ہیں یہ سب صورتیں کذب نہیں ہوا کرتیں، گو مخاطب بظاہر اسے کذب سمجھ لیتا ہے تو وہ کذب نہیں ہے۔ اب ثلاث کذبات کو لیجئے پہلا کذب ﴿بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ تھا، ظاہر ہے کہ جناب خلیل اللہ علیہ السلام کے وقت کے بت پرستوں کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ بت ہم سے بات کرتے ہیں ہم کوئی کام کرنا چاہیں تو وہ ہمیں اس کے متعلق بتاتے ہیں اور راہنمائی کرتے ہیں، اللہ کے پیغمبر نے ارادہ کیا کہ میں نہ صرف ان کے بت ہی توڑ دوں بلکہ نظریہ کے لحاظ سے بھی انہیں شکست فاش دے دوں۔ اس لیے مناظرہ کی مذکورہ اصطلاح فرض الباطل مع الخصم حتی تلزمه الحجة کے مطابق انہوں نے تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیا کہ یہ بت کچھ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، جب طاقت رکھتے ہیں تو جناب ابراہیم علیہ السلام کی بات بھی درست تھی لیکن وہ بت پرست بھی جانتے تھے کہ بت بالکل عاجز ہیں اور اپنی جگہ سے حرکت تک نہیں کر سکتے، لہٰذا توڑنا، پھوڑنا کیسا، بس اس بات پر عاجز ہو گئے اور شکست کھا گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اس فرمان کے بعد جو قرآن میں مذکور ہے:

﴿فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ٥ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ٥﴾ (الانبیاء: ٦٤-٦٥)

اپنے نفسوں کی طرف رجوع کیا (ضمیر کی آواز معلوم کی) اور پھر منہ نیچے کیے ہوئے کہنے لگے کہ ابراہیم تم تو

جانتے ہی ہو کہ وہ بات کرتے ہی نہیں تو پھر ہم ان سے کیونکر پوچھیں۔ یعنی جناب ابراہیم علیہ السلام کی اس حکمت عملی اور مناظرہ کی ایک محکم اصطلاح نے ان بت پرستوں کو زک دے دی۔ انہوں نے خود ہی تسلیم کرلیا کہ یہ بت کچھ کرنے سے یا کلام کرنے سے عاجز ہیں، اس طرح وہ انفرادی طور پر بھی شکست کھا گئے گویا بتوں کو توڑ کر انہوں نے ان کو مادی اور خارجی شکست دی اور اس بات سے انہیں ذہنی طور پر دلیل و حجت اور مناظر کے میدان میں بھی شکست دے دی، لہٰذا واقعتاً جھوٹ تو نہیں صرف مناظرہ کی ایک اصطلاح کا استعمال کرنا تھا لیکن صرف الفاظ کو دیکھا جائے اور اصل حقیقت سے قطع نظر کیا جائے تو یہ کذب معلوم ہوتا ہے، لہٰذا چونکہ اس کی صورت کذب کی سی تھی اس لیے اس کو حدیث میں کذب کہا گیا ہے، اسی طرح انی سقیم کو ملاحظہ فرمائیں، اس لیے کہ سقیم سے جسمانی، ذہنی اور روحانی سقم بھی مراد ہوسکتا ہے اور درحقیقت جناب ابراہیم علیہ السلام جسمانی طور پر بیمار نہ تھے لیکن ان کی ذہنی پریشانی اور دماغی کوفت حد سے زیادہ تھی، اس لیے کہ وہ ایسے ماحول میں رہتے تھے جو ان کی طبع مبارک کے سراسر خلاف تھا۔ چاروں طرف بت پرستی اور مخلوق کی پوجا و عبادت کا دور دورہ تھا اور ظاہر ہے کہ جناب خلیل اللہ علیہ السلام جیسے موحد کی ایسے ناساز ماحول میں جو دکھی حالت ہوگی یا دماغی کوفت کی جو کیفیت ہوتی ہوگی جس کو ہر وہ آدمی بخوبی سمجھ سکتا ہے جسے کبھی ایسے ماحول میں رہنا پڑا ہو، جو اس کی ذہنی ساخت سے بالکل مخالف ہو یا پھر وہ لوگ جو ایسی جسمانی بیماری یا پریشانی سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے اس لیے اللہ کے پیغمبر علیہ السلام نے ان کو یہ الفاظ کہے گو ان کی مراد تو وہی تھی جو اوپر مذکور ہوئی، لہٰذا جس نیت سے انہوں نے یہ الفاظ کہے تھے وہ صحیح اور سچ تھے لیکن بت پرستوں نے جو جناب ابراہیم علیہ السلام کو میلہ پر لے جانے پر مُصر تھے اور زور دے رہے تھے اس لفظ "انی سقیم" کو جسمانی علالت پر محمول کیا اور انہیں وہیں چھوڑ کر چلے گئے اور کسی متضمن ذو معنیٰ لفظ کو اس طرح استعمال کرنا کہ مخاطب اس سے ایک معنی سمجھے جو ظاہر ہو لیکن متکلم اس سے دوسرا معنی جو غیر اعرف ہے مراد لے، معیوب ہے نہ ممنوع۔

لیکن یہ اس وقت ٹھیک ہوگا جب متکلم کا اس غیر معرف معنی مراد لینے میں کوئی صحیح مقصد ہوتا کہ مخاطب سے دھوکہ اور خداع کے باب سے نہ بن جائے، مثلاً ایک ظالم کسی مظلوم کے متعلق اس مقصد سے پوچھ رہا ہے کہ اس کا معلوم کرکے اس کو پھنسالے اور اس کو مار ڈالے یا اسے کوئی اذیت دے تو اس وقت جس آدمی سے اس مظلوم کے متعلق دریافت کیا گیا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اس کے بارے میں صحیح حقیقت بالکل نہ بتائے کہ وہ کیا ہے، کہاں مل سکتا ہے؟ کیونکہ اس طرح ایک غریب معصوم کا ناحق خون ہوگا یا اس کو بڑی تکلیف پہنچے گی لہٰذا ایسے وقت ایسے الفاظ کام میں لانا چاہیں جن سے وہ ظالم غلط فہمی میں پڑ جائے اور اس مظلوم کی جان بھی بچ جائے اور متکلم کا کہنا بھی صحیح ہو جائے۔ یعنی کوئی ایسا ذومعنیٰ لفظ کہے جس سے مظلوم بھی بچ جائے گا اور متکلم کو بھی جھوٹ نہ بولنا پڑے گا بعینہ اس طرح سمجھیں کہ جناب ابراہیم علیہ السلام کا مقصد محض بت پرستی اور شرک کا خاتمہ کرنا تھا، لہٰذا اگر وہ ان

کے ساتھ چلے جاتے تو یہ کام (بت شکنی) نہ ہو پاتا اور اگر صاف صاف کہہ دیتے کہ میں نہیں چلتا کیونکہ میں بت شکن نہیں بننا چاہتا ہوں تو وہ ہرگز ان کو نہ چھوڑتے، کچھ نہ کچھ تو افراد رہ جاتے تا کہ ان کو اس کام سے روکے رکھیں اور اگر کوئی دوسرا اعذر و بہانہ کرتے تو یہ صاف جھوٹ ہوتا جو ایک برگزیدہ نبی کے شایان شان نہ تھا، لہٰذا وہ ایسے لفظ کو کام میں لائے جو ذو معنیین تھا جس سے دونوں مقصد بدرجہ اتم حاصل ہو گئے اور جھوٹ محض بھی نہ ہوا۔ ہاں یہ صرف صورت جھوٹ کی سی تھی اس لیے کہ اس کے متعارف معنی جسمانی طور پر بیمار ہی ہے، اسی لیے تو وہ ان کو چھوڑ کر چلے گئے اور نبی خلیل اللہ کو موقع مل گیا اور بتوں کا ستیاناس کر دیا۔

باقی جناب ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کی طرف دیکھنا محض اتفاقی تھا جس طرح کوئی آدمی اثنائے گفتگو آسمان کی طرف بھی نظر کر لیتا ہے لیکن اس سے ان کے ذہنوں میں ایک ابہام پیدا ہو گیا اس لیے کہ ان کا ستاروں کے اثر وتاثیر اور نحس وسعد وغیرہ پر پکا اعتقاد تھا لہٰذا نبی محترم کی اس اتفاقی بات نے بھی ان کو چھوڑ جانے پر آمادہ کیا کیونکہ ستاروں کی طرف دیکھنے سے انہیں یقین ہو گیا کہ نبی محترم کو غالباً ستاروں سے یہ معلوم ہو گیا کہ انہیں کسی آئندہ تکلیف کا اندیشہ ہو گیا ہے، اس کو وہیں چھوڑ کر جانا ہی مناسب خیال کیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں خصوصاً انبیاء علیہم السلام کی ایسے نازک مواقع پر پوری رہنمائی کرتا ہے لہٰذا نبی مکرم کا محض اتفاقی ستاروں پر نظر ڈالنا بھی کافی کام دے گیا۔

اور تیسرا کذب جو حدیث مبارک میں مذکور ہے اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ خود اس حدیث میں اس کی وجہ بھی مذکور ہے کہ جناب ابراہیم علیہ السلام جب مصر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں کا بادشاہ ظالم ہے اور آنے والے مسافروں کے ساتھ جو حسین عورتیں ہوتی ہیں انہیں چھین کر اپنے پاس رکھ لیتا ہے اگر وہ آدمی جس کے پاس کوئی حسینہ ہوتی اور وہ اس کی زوجہ ہوتی تو وہ ظالم اس (مرد) کو مروا دیتا کیونکہ اس کے مروائے بغیر اس عورت پر قبضہ نہ کر سکتا تھا، لہٰذا جناب ابراہیم علیہ السلام کو خطرہ ہو گیا کہ اگر میں نے بتا دیا کہ یہ میری زوجہ ہے تو وہ مجھے مروا دے گا، لہٰذا ممکنہ اسباب کو کام میں لا کر انہوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ میری بہن ہے اور اسباب کو کام میں لانا انبیاء علیہم السلام کا فرض ہوتا ہے جو بھی ممکنہ صورت ہو یا جن وسائل وذرائع پر ان کی دسترس ہو ان کو ضرور کام میں لاتے ہیں چونکہ جناب ابراہیم علیہ السلام کی اپنی جان کی حفاظت کے سلسلہ میں یہی مکمل صورت تھی اور اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے اس وسیلہ (ذریعہ) کو کارگر سمجھتے ہوئے اپنی بیوی کو بہن کہہ دیا۔ ایک لحاظ سے یہ جھوٹ بھی نہیں کیونکہ اپنی بیوی بھی دین ومذہب کے لحاظ سے بہن ہے، قرآن مجید میں بھی اس طرح صراحت ہے کہ ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ مومن سب بھائی ہیں، لہٰذا جناب خلیل اللہ علیہ السلام کا اپنی زوجہ کو بہن کہنا صحیح ہوا گو وہ ان کی نسبی اور حقیقی بہن نہ تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زوجہ مطہرہ کو یہ کہا کہ دیکھ رہی ہو کہ اس ملک میں میرے اور تیرے سوا کوئی مومن نہیں، لہٰذا تم میری دینی بہن ہو۔

اس طرح انہوں نے حتی المقدور اپنی جان بچانے کا سامان کرلیا باقی رہا ان کی زوجہ مطہرہ کی عصمت اور ان کا اس ظالم سے محفوظ رہنا تو یہ اللہ جل شانہ کی قدرت کا کرشمہ تھا، اس بارے میں جناب خلیل اللہ کچھ نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا یہ معاملہ مافوق الطاقت ہونے کے سبب اللہ پر چھوڑ دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کی اور عصمت دری نہ ہونے دی۔ کسی قسم کی آنچ بھی انہیں نہیں آئی اور باعصمت و باعفت اپنے خاوند کے پاس واپس آ گئیں۔

بہرحال جو انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ اور بس میں ہوتا ہے اور اپنی دسترس کے مطابق اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے اور مافوق الطاقت کو اللہ کے سپرد کر کے اسی پر توکل کیا کرتے ہیں، جناب خلیل اللہ نے یہی کیا، تدبر و تفکر ان تینوں باتوں میں صریح کذب والی کوئی بات بھی نہیں لیکن صورتاً وہ کذب نظر آتا ہے جس سے اکثر آدمی لغت عرب سے ناواقفیت کی بنا پر تذبذب میں پڑ جاتے ہیں، حالانکہ شارع علیہ السلام نے بھی ایسے الفاظ ذومعنیین استعمال فرمائے ہیں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لفظ کذب کا اطلاق کر کے شارع علیہ السلام نے ہمیں یہ رہنمائی فرمائی ہے کہ ایسے مواقع اور ایسے حالات میں ہم اس لفظ کا استعمال کر سکتے ہیں جو صورتاً بظاہر کذب ہو لیکن متکلم کی مراد سے یا واقعہ بالکل صحیح ہونا چاہیے۔ ہاں متکلم کا مقصد اور غرض و غایت صحیح ہونی ضروری ہے۔

بسا اوقات اس طرح بہت سی الجھنوں سے بھی نجات مل جاتی ہے، بہرحال اس حدیث پر بالغ نظری کے بعد کوئی شبہ یا اعتراض باقی نہیں رہتا بلکہ اس سے بہت سے علوم و معارف حاصل ہوتے، ہیں ہاں دیدہ کور از حدیث نظر نہ آئیں تو اور بات ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

آنکھ والا تیری قدرت کا کرشمہ دیکھے
دیدہ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

❁❁❁❁
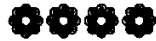
سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں

زمانہ قدیم سے علماء اہل حدیث اور علماء احناف کے مابین یہ اختلافی مسئلہ چل رہا ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ لازمی ہے یا نہیں تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز ہی نہیں۔

(الازہری)

جلیل القدر محترم المقام محترم برادرم ڈاکٹر سراج الدین صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ امابعد!

آپ کا مکتوب ملا۔ یاددہانی کا شکریہ!

آپ جس مسئلہ کے بارے میں تحقیق کے طلبگار ہیں اس کے متعلق عرض کرنے سے پہلے تمہیدی طور پر ایک اصولی حقیقت پیش خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ اصل مسئلہ تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے یہ تمہید نہایت ضروری ہے۔ یہ شاید کچھ طول بھی پکڑ جائے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ فائدہ سے خالی نہ ہوگی۔ اس لیے اصل مسئلہ کے جواب سے پہلے اس تمہید کو بغور وتدبر ملاحظہ فرمائیں۔

تقلید اور مقلد کی تعریف:

آپ نے شروع میں لکھا ہے کہ (آپ مقلد حنفی مذہب سے تعلق رکھنے والے ہیں) مجھے معلوم نہیں کہ آپ مقلد اور تقلید کے معنی اور مفہوم اور اس کے لوازمات سے واقف ہیں یا نہیں۔ لہٰذا اول آپ کے مسلک کی اصول فقہ کی کتاب میں سے تقلید کی تعریف (Definition) لکھنا لازم سمجھتا ہوں تا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ مقلد کے کیا معنیٰ ہیں۔ مقلد یعنی تقلید کرنے والا۔ جب تقلید کے معنیٰ اصول فقہ کے مطابق آپ کو معلوم ہوں گے تو آپ سمجھ جائیں گے کہ مقلد کے کیا معنی ہیں۔ تقلید کی تعریف کے بعد مجھے جو تمہیدی طور پر عرض کرنا ہے وہ لکھوں گا۔ اصول فقہ حنفی کی اکثر کتابوں میں تقلید کی تعریف موجود ہے لیکن میں ایک مستند کتاب ''مسلم الثبوت'' میں سے اس کی تعریف نقل کر رہا ہوں۔

"التقليد العمل بقول الغير من غير حجة ." (مسلم الثبوت مع شرح فواتح، الرحموت لبحر العلوم: ٦٢٤)

طبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۸ ہجری بھارت (الہند)۔ ''یعنی تقلید کہتے ہیں کسی دوسرے آدمی کے قول پر عمل کرنا (مگر) بغیر دلیل اور حجت کے۔'' اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ تقلید کا مطلب ہی یہ ہے کہ کسی دوسرے کی بات قول یا عمل کو (دلیل معلوم کیے بغیر) تسلیم کر لینا یا اس پر عمل کرنا۔ جب ایسا ہے تو پھر مقلد کے معنیٰ ہوئے کسی دوسرے کے قول وفعل پر بغیر دلیل کے عمل کرنے والا اور دلیل دین اسلام میں صرف اور صرف اللہ وسنت الرسول ﷺ کو ہی کہتے ہیں۔ تیسری چیز دلیل نہیں۔ بیان کی ہوئی تقلید کی تعریف کے مطابق کسی بھی مقلد کو اصلاً وہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی مسئلہ کے بارے میں دلیل یا حجت کا مطالب اور خواستگار بنے۔ بلکہ مقلد کا یہ ہی وظیفہ ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں اس طرح کہے کہ اس مسئلہ کے بارے صرف اس طرح عمل اس لیے کر رہا ہوں کہ میرے

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے (مثلاً) اس کے بارے میں ایسے فرمایا ہے اور ان کا اسی طرح عمل ہے نہ کوئی دلیل دے اور نہ ہی دوسرے سے دلیل لے کیونکہ اگر دلیل بازی کرتا ہے یا دلیل دیتا ہے یا دلیل لیتا ہے تو لازمی طور پر وہ مقلد نہیں رہ سکتا کہ دلیل بازی اور تقلید ایک دوسرے کے نقیض (Opposite or contrary) ہیں۔ اور دو نقیض ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر مل نہیں سکتے۔ ان کا ایک ہی وقت میں ملنا محال ہے۔ ایک شخص کا ایک ہی وقت میں عالم اور جاہل ہونا ناممکن ہے، لہٰذا جو شخص کہے کہ میں مقلد ہوں تو وہ زبان سے اقرار کرتا ہے کہ وہ عالم نہیں ہے۔ بلکہ بغیر دلیل اور حجت کے کسی دوسری شخصیت کے پیچھے چلتا ہے یا دوسرے الفاظ میں وہ گویا اس طرح کہتا ہے کہ میں جاہل ہوں۔ پھر اسی ہی لحہ اپنے عمل یا موقف پر دلیل جو پیش کر رہا ہے یا کسی دوسرے سے اس کا مطالبہ کرتا ہے تو اس کے معنیٰ کہ وہ علم کا دعویٰ بھی کر رہا ہے۔ یعنی پہلے اپنی جہالت کا اقرار پھر اسی ہی لحہ علم کا اثبات آخر یہ تناقض (Contradiction) جمیع عقلاء الدہر کے پاس (Impossible) محال ہے۔ اس کو مثالوں سے اور بھی زیادہ واضح کیا جا سکتا ہے لیکن اس طرح اور بھی زیادہ طول ہوگا۔ اس لیے اس بحث کو ترک کر کے میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے جس مسئلہ کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں اس وقت آپ کی پوزیشن کیا ہے۔ آیا بطور مقلد یا تقلید سے آزاد ہو کر؟

اگر مقلد ہو کر یہ بات آپ کو آپ کے مسلک کے تحت بھی جائز نہیں ہے، آپ کا دلیل سے کیا واسطہ؟ آپ تو صرف اس طرح کہیں کہ مجھے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی نہیں ہے۔ کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے مجھے دلیل یا حجت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں آپ کچھ وقت کے لیے تقلید سے آزاد ہو کر اور بالکل غیر جانب دار ہو کر نہ اہل حدیث کہلوائیں اور نہ ہی کسی دوسرے خاص مکتب فکر سے اپنا انتساب کریں اور پھر بلا شک ہر مسئلہ کی تحقیق کریں اور طرفین کے دلائل سنیں اور وزن کریں۔ ہمارے سب حنفی بزرگ اس اصولی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر کے اور ایک ہی وقت میں اپنے کو نہ صرف مقلد کہلوانا بلکہ اس کو فخر کا باعث تصور کر کے ایک ہی وقت میں مقلد بھی کہلواتے ہیں تو اپنے مسلک پر صحیح یا سقیم قوی یا ضعیف دلیل بھی دیتے رہتے ہیں۔

بوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بو العجبی است

''ہم تو دو نقیضوں کا اجتماع محال سنتے آرہے ہیں مگر ان لوگوں نے اس محال کو ممکن بنا دیا۔'' فیاللعجب

تقلید کی کرشمہ سازیاں:

یہاں پر میرا تقلید پر رد لکھنے کا ارادہ نہیں ہے لیکن آپ کے خط سے یہ ہی محسوس ہوتا ہے کہ کسی بھی طرح ہو لیکن آپ بہرحال تحقیق پسند ہیں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اس طرح تقلید جامد کے کونسے نقصانات ہیں اور اس کے کونسے المناک نتائج نکلتے ہیں اور نکل چکے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو تھوڑا بہت راقم الحروف کو علم عطا فرمایا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ کے سامنے چند امثال پیش کرتا ہوں اور مزید: فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ آپ اپنے ضمیر،

دل ودماغ سے پوری طرح سوچ کر جو پسند آئے وہ فیصلہ کریں۔

(الف) ایک حنفی بزرگ مولوی محمود الحسن دیوبندی المعروف بشیخ الہند نے حدیث کی کتاب جامع للامام الترمذی پر کچھ تقریریں کی ہیں ہمارے پاس بھی ان کا مجموعہ ہے۔ایک جگہ بیع خیار (یعنی مشروط واپسی......والا سودا یا بیوپار) کے مسئلہ پر حدیث لاکر پھر لکھتے ہیں۔

"فالحاصل ان مسئلة الخيار من مهمات المسائل وخالف ابوحنيفة فيه الجمهور وكثيرا من الناس من المتقد مين والمتاخرين وصنفوا رسائل فى ترديد مذهبه فى هذه المسئلة ورجح مولانا شاه ولى الله المحدث الدهلوى قدس سره فى رسائل مذهب الشافعى من جهة الاحاديث والنصوص وكذلك قال شيخنا مدظله بترجح مذهبه وقال الحق والانصاف ان الترجيح للشافعیؒ فى هذه المسئلة ونحن مقلدون يجب علينا تقليد امامنا ابى حنيفة والله اعلم." (التقرير للترمذی: ٦٥٠)

''حاصل کلام کہ مسئلہ بیع خیار اہم مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے،جس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جمہور (اکثر فقہاء علماء) کی مخالفت کی ہے اور پہلے کے اور بعد کے بہت سے علماء سے اختلاف کیا ہے اور ان علماء نے ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی تردید میں (اس مسئلہ کے بارے میں) کئی رسالے لکھے ہیں اور مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے اپنے کئی رسائل میں حدیثوں اور نصوص کی وجہ سے امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کو ترجیح دی ہے اور اسی وجہ سے ہمارے استاد مدظلہ نے بھی امام شافعی کے مذہب کو راجح کہا ہے اور انہوں نے (ہمارے شیخ) نے فرمایا کہ حق اور انصاف یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ترجیح مذہب شافعی کو ہے اور (مگر) ہم مقلد ہیں ہم پر واجب ہے کہ ہم اپنے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تقلید کریں۔''

کیا سمجھے! شیخ الہند کیا فرماتے ہیں؟

حق برابر احادیث اور نصوص کے مطابق شافعی کا مذہب ہے (زیر بحث مسئلہ میں) مگر ہم مقلد ہیں اس لیے ہم کو (حق کو چھوڑ کر) امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تقلید کرنا واجب ہے؟

انا لله وانا اليه راجعون. کیا اس سے بھی زیادہ کوئی ظلم ہوسکتا ہے؟

گستاخ رسول کو حنفیت کی چھوٹ:

(ب) علامہ ابن نجیم حنفی کتاب ''البحر الرائق شرح کنز الدقائق'' میں ذمیوں (یعنی وہ غیر مسلم جو جزیہ ادا کر کے مسلم حکومت کے ماتحت رہتے ہیں) کے احکام میں ایک مسئلہ ذکر کیا ہے،جس کا اصل متن کنز الدقائق میں اس

طرح ہے کہ اگر کوئی ذمی نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرے اور سب وشتم سے کام لے تب بھی اس کا عہد یا ذمہ نہیں ٹوٹے گا اور اس کو قتل کی سزا نہیں دی جائے گی اور یہ ہی حنفی بزرگوں کا مسلک ہے لیکن اسی سلسلے میں دوسرے ائمہ اور فقہاء اس کے بالکل برعکس گئے ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ کے گستاخ کے ذمہ کے نقض یا ٹوٹ جانے کے قائل ہیں اور ایسے ذمی کے لیے قتل کی سزا تجویز کرتے ہیں۔ اس پر علامہ ابن نجیم شرح میں فرماتے ہیں:

"نعم نفس المؤمن تميل الى قول المخالف فى مسئلة السب لكن اتباعنا للمذهب واجب." (ص ١٢٥، ج٥)

یعنی "ہاں مومن کا نفس سب کے (یعنی نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی والے) مسئلہ میں مخالف کے قول کی طرف مائل ہے (یعنی ایسے ذمی کا ذمہ وعہد ختم ہو گیا اور اس کو امن وامان نہیں ملے گا) مگر (کیا کریں) ہم کو اپنے مذہب کی اتباع واجب ہے۔"

علامہ ابن نجیم کی یہ عبارت اس قدر واضح ہے کہ اس پر مزید کسی تبصرہ کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن دو تین باتیں نوٹ کرنے کے قابل ضروری ہیں۔

۱۔ علامہ موصوف خود تسلیم کرتے ہیں کہ مومن کا نفس مخالف کے قول کی طرف مائل ہے اس کا لازمی مطلب یہ ہوا کہ جو ان کے مخالف جائے اس کے ایمان میں بھی نقص اور خلل ہے مگر اس کے باوجود بھی ایسے سنگین مسئلہ (یعنی بارگاہ رسالت کے گستاخ کے بارے میں اتنا تساہل یا مداہنت) میں مکمل اپنے مذہب سے چمٹے رہیں۔ اس طرز عمل کا نام آپ حنفی خود تجویز کریں۔

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

۲۔ لکھتے ہیں کہ: مگر ہم پر اپنے مذہب کا اتباع واجب ہے۔ راقم الحروف یہ معلوم کرنے کی جسارت کرنے میں حق بجانب ہے کہ یہ ایجاب (مذہب حنفی کی اتباع کا) آخر کس نے کیا ہے؟ کس کو فرض یا واجب قرار دینا یا حلال وحرام بنانا صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حق ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول اکرم ﷺ بھی اگر کسی چیز کو حرام یا واجب قرار دیتے ہیں تب بھی وحی کی روشنی میں نہ کہ محض اپنی مرضی سے۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰیo﴾ (النجم: ٣-٤)

"اور نہیں بولتا اپنے نفس کی طرف سے مگر جو کچھ اس کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔"

لہٰذا یہ بتایا جائے کہ آیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی کتاب مقدس میں امام ابوحنیفہ کے مذہب کی اتباع کو واجب قرار دیا ہے یا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول مقبول ﷺ نے اس قسم کا ارشاد فرمایا ہے؟

اگر ان دونوں دلیلوں کے سرچشموں میں ایسا حکم نہیں ہے اور یقیناً ہرگز ہرگز نہیں ہے تو پھر یہ حنفی مذہب کی

اتباع کو واجب قرار دینے والا دوسرا آخر کون ہے اور دوسرے کسی کو کونسا حق ہے کہ تشریعی اختیارات میں سے کوئی اختیار اپنے قبضہ میں کرے؟

لیکن کیا کریں اندھی اور جامد تقلید کا ایسا ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ برسر بازار کوئی غیر مسلم کھڑے ہو کر جو بھی دل کرے وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ کے برخلاف بکواس اور بیہودہ گفتگو کرے مگر اس کے ذمہ وعہد کو نہ کوئی خوف نہ کوئی خطرہ۔

دیوبند کے عظیم سپوتوں کے عظیم کارنامے

(ج) مولوی محمود الحسن جس کو شیخ الہند کا خطاب ملا ہوا ہے ایک کتاب بنام ''ایضاح الادلہ'' میں تقلید کے اثبات کے لیے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ (النساء: ۵۹)

میں ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ کے بعد ﴿وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ کے الفاظ بڑھا دیئے۔ وہ کتاب اس وقت کی طبع شدہ ہمارے پاس موجود ہے۔ آپ سوچیں کہ اپنے مسلک کو ثابت کرنے کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلام پاک میں بھی اپنی طرف سے ایسے بزرگ الفاظ بڑھا دیتے ہیں۔ کیا اس سے بھی بڑا کوئی گناہ تصور میں آ سکتا ہے؟

اس وقت کئی علماء کرام نے اس پر احتجاج کیا اور طابعین وناشرین کو اس عظیم غلطی کی طرف توجہ دلائی لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی اور آج تک وہ کتاب اس ہی الحاق بیجا اور اضافہ ناجائز سمیت موجود ہے۔ افسوس اس وقت نہ تو مصنف کو یہ خیال آیا کہ اپنی اس غلطی کی تلافی کرے اور نہ اس کے معتقدوں یا بہی خواہوں کو ہی اس بابت تدارک کرنے کا خیال ہی آیا۔ آج کل سننے میں آیا ہے کہ شاید اس کا دوسرا نسخہ تیار کر رہے ہیں اور وہ اضافی الفاظ نکالنا چاہتے ہیں، لیکن اب کیا ہوگا اس بابت تلافی کرنی تھی تو مصنف کی زندگی میں کی جاتی مگر اب کئی سال گذرنے کے بعد جو کام ہوگا اس کا وزن یا قیمت کیا ہوگی وہ ہر عقلمند جانتا ہے۔

(د) سورۃ النساء آیت ۷۷ کی ابتداء والی آیت کریمہ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ الآیۃ

(النساء: ۷۷)

یہ آیت آپ کسی بھی سندھی یا اردو ترجمہ وتفسیر میں دیکھیں اس کے ترجمہ ومطلب ومفہوم پر غور کریں، پھر خود ہی سوچیں کہ اس آیت کریمہ میں نماز میں رفع الیدین کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی نام ونشان بھی ہے۔

یعنی ہرگز اس آیت کریمہ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن آپ کے ہم مذہب ڈیروی صاحب نے ایک رسالہ شائع کیا اس میں یہ آیت کریمہ بھی غلط لکھی اور پھر اس کا ترجمہ بھی غلط کیا اور اس میں سے نماز میں ترک رفع الیدین کے اثبات کی سعی نامشکور کی پھر علماء کرام کی طرف سے اعتراضات ہوئے تو دوسرا رسالہ شائع کیا اس میں آیت کریمہ تو صحیح لکھی مگر ترجمہ وہی غلط اور استدلال بھی بالکل جاہلانہ۔ بھائی میرے جب آپ کے ہم مذہب تقلید کے نشہ میں اس قسم کی حرکت کر کے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلام پاک میں ہیر پھیر کرنے سے نہیں گھبراتے تو پھر ان میں اس سے بھی زیادہ کچھ کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں تحریف کا ذمہ دار کون؟

کراچی کے ادارہ [1] نے ہم سے ایک کتاب بنام ''مصنف ابن ابی شیبہ'' کا مخطوطہ حاصل کر کے اس کو چھپوا کر شائع کیا مگر اس میں دو جگہ پر اپنی طرف سے رسول ﷺ کی حدیثوں میں الفاظ بڑھا دیئے جو کہ اصل مخطوطہ میں بالکل نہیں ہیں بلکہ پاک وہند کے تمام مکتبوں میں اس کتاب کے جو مخطوطات ہیں ان سب میں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں یہ بھی کتاب پہلے حیدرآباد دکن پھر شاید بمبئی میں بھی چھپی لیکن ان کو بھی مخطوطات میں یہ الفاظ نظر نہیں آئے۔ اس لیے انہوں نے مطبوع میں یہ الفاظ نہیں چھاپے۔ حالانکہ حیدرآباد دکن والے بھی حنفی تھے مگر ان کراچی والوں نے تو حد کر دی اپنا الوسیدھا کرنے کے لیے احادیث میں بھی اپنی طرف سے الفاظ بڑھا دیتے ہیں۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا خوف بھی ان کو نہیں ہوتا کہ اس کی عدالت میں اس جسارت نامبارک کا کیا حشر ہوگا اور اس کا کتنا المناک انجام پیش آئے گا کیا یہ حدیث کی خدمت ہے یا انتہائی بددیانتی اور عظیم خیانت! فی الحال تو ہم کو ان صاحبان کی یہ دو سینہ زوریاں نظر آئیں ہیں مگر معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے دوسرے بھی کئی مقامات پر کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔

برادرم! یہ ہیں آپ کے حنفی مقلدوں کے کارنامے۔ اب ان کے برخلاف کتاب وسنت کی حمایت میں بچارے اہلحدیث آواز بلند کرتے ہیں تو انہی کو کوسا جاتا ہے حق کی حمایت خال خال ہی نظر آتی ہے۔ آپ کو اگر میرے لکھے ہوئے پر اعتبار نہ آئے تو آپ ہمارے ہاں تشریف فرما ہوں ہم نے جو لکھا ہے وہ سب حوالے کتاب سے نکال کر آپ کے سامنے رکھیں گے اور آپ خود ہی دیکھ کر اطمینان کر کے پھر تصدیق کریں بہرحال یہ مفاسد سب تقلید کا نتیجہ ہیں اب آپ خود ہی جو پسند آئے وہ راستہ اختیار کریں۔

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ۝﴾ (یونس: ۱۰۸)

سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز برباد:

بہرحال مجھے تمہیدی طور پر جو لکھنا تھا وہ لکھ دیا آگے آپ کے استفسار کیے ہوئے مسئلہ کی بابت عرض کروں گا۔

---

[1] ادارے کا نام ''ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ'' کراچی میں لسبیلہ چوک کے قریب ہے، جس کے سرپرست مولانا محمد تقی عثمانی ہیں۔

ان شاء اللہ العزیز!! مسئلہ مسئولہ بابت یہ گذارش ہے کہ اگر حق وانصاف مطلوب ہے اور کوئی واقعی اس بارے میں صدق دل سے بغیر کسی ذہنی استثنات (Mentalreservaion) تحقیق کا خواستگار ہے، تو میں اس کو بالکل شرح صدر اور یقین ووثوق سے عرض کروں گا کہ اس سلسلہ میں صحیح مسلک اور حق موقف صرف اور صرف یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کے سوائے کوئی بھی نماز ہرگز نہیں ہوگی۔ صرف ایک رکعت میں بھی نہیں پڑھی تو اس کی وہ رکعت نہیں ہوئی وہ نماز خواہ اکیلے پڑھے یا پڑھنے والا امام ہو یا مقتدی۔ سری نماز ہو یا جہری۔ سفر میں ہو یا حضر میں۔ عورت ہو یا مرد ہو، فرض نماز ہو یا نفل۔ رکوع وسجدہ والی نماز ہو یا بغیر رکوع وسجود، یعنی نماز جنازہ۔ بحرحال ان تمام صورتوں میں سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز بالکل نہیں ہوگی۔

مقلدین کی پہلی دلیل کا جواب:

اس کے دلائل ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ ذکر کروں گا لیکن پہلے اس آیت کریمہ کے بارے میں گذارشات پیش کرتا ہوں جس کی طرف آپ نے اپنے مکتوب میں توجہ دلائی ہے۔ اس آیت کریمہ سے آپ کی مراد شاید سورۃ اعراف کی آخری (۲۴) رکوع والی یہ آیت کریمہ ہے۔

﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝﴾ (الاعراف: ٢٠٤)

اس آیت کریمہ کے بارے میں علماء حق نے کئی مطولات کتاب تصنیف فرمائے ہیں۔ جنہوں نے اردو عربی وغیرہ میں اس کے کئی جوابات دیئے ہیں لیکن اس جگہ پر میں اختصار سے کام لیتے ہوئے آپ کے سامنے حقیقت حال کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا اگر آپ نے غور وتدبر سے کام لیا اور عدل وانصاف کے دامن کو نہ چھوڑا تو امید واثق ہے کہ ان شاء اللہ العزیز آپ مجھ سے اتفاق کریں گے۔

وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ.

ا......اس سورۂ مبارکہ کے اس آخری رکوع میں شروع سے لے کر کفار مشرکین سے مقابلہ ہے۔ اور ان کے شرک کی تردید ہے۔ آخر میں کچھ پہلے فرمایا گیا کہ:

﴿هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝﴾ (الاعراف: ٢٠٣)

یعنی یہ قرآنی آیات تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں اور عبرتیں ہیں اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہیں مگر ان میں سے ہدایت اور رحمت کیسے حاصل ہو اس کا جواب اسی زیر بحث آیت کریمہ میں دیا گیا ہے کہ جب قرآن کریم تبلیغ کے لیے تلاوت کیا جائے تو تم بالکل خاموش ہو کر توجہ سے سنو (تاکہ تمہارے دلوں پر اثر ہو اور تمہارے دلوں پر اثر ہوگا تو ہدایت حاصل ہوگی اور اس کا لامحالہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ) امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ یعنی اس جگہ پر آخر میں مسلمانوں کو خطاب کر کے سمجھایا گیا ہے کہ تم کفار کے برعکس قرآن کریم کی تبلیغ کے وقت تلاوت بالکل توجہ اور انہماک اور بالکل یہ خاموشی سے سنو! کیونکہ جیسے دوسری جگہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۝﴾

(حم السجده: ٢٦)

''یعنی کفار نے آپس میں کہا کہ جب قرآن مجید کی تلاوت ہوتو تم اس کو سنو تو نہیں مگر شور وغل کر و تا کہ تم غالب آ جاؤ گے۔''

ان کے مقابلہ میں یہاں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ تم ان کفار کے مقابلہ میں قرآن کریم کی تلاوت پاک کے وقت بالکل خاموش رہو اور توجہ سے سنو تو تم کو ہدایت اور رحمت حاصل ہو۔ اس آیت مبارکہ میں نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے یا نہ پڑھنے کی طرف کوئی بھی اشارہ تک نہیں ہے اس کو خواہ مخواہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کے لیے کھینچ تان کر استعمال میں لایا جاتا ہے۔

دوسرا جواب:

۲......نماز میں سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کا حکم مدینہ منورہ میں ہوا ہے۔ جیسا کہ اس کے راوی حضرت عبادہ بن صامت، سیدنا انس بن مالک، سیدنا ابو ہریرہ وغیرہم رضی اللہ عنہم سب مدینہ طیبہ کے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تو اسلام سے مشرف بھی ۶ ہجری میں ہوئے ہیں اور سورۂ مبارکہ اعراف مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ ہے۔ پھر یہ بات آخر کس طرح تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ایک آیت جو کہ کئی سال پہلے ایک حکم سے نازل ہوئی ہو وہ ناسخ یا مانع ایسے حکم کا حل بنے جو اس آیت مبارکہ کے نزول سے کئی سال بعد دیا گیا ہو۔ کیا آپ کی عقل وضمیر اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے؟

مکہ مکرمہ میں تو نماز میں ایک دوسرے سے بات کرنے اور ایک دوسرے کو کوئی کام کہنے کی بھی اجازت تھی مگر بعد میں مدینہ منورہ میں نماز میں ایک دوسرے سے بات کرنے کی بالکل یہ ممانعت آ گئی۔

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۝﴾ (البقرة: ٢٣٨)

اس طرح ابتدائے رکوع میں دونوں ہاتھ ملا کر گھٹنوں کے بیچ میں روکے جاتے تھے جس کو ''تطبیق'' کہتے ہیں۔ لیکن مدینہ منورہ میں حکم کیا گیا کہ رکوع میں ہاتھ گھٹنوں پر رکھو اور تطبیق منسوخ ہوگئی۔ بعینہ اسی طرح سورۂ فاتحہ نماز کا رکن ہونا اور اس کی قراءت کی فرضیت کا حکم بھی مدینہ منورہ میں ہوا ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ سورۃ اعراف والی اس آیت نے فاتحہ خلف الامام سے منع کیا یہ بات کیسے درست ہوسکتی ہے جبکہ وہ آیت، بہت زیادہ پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی۔ دراصل اس کا تعلق نماز سے تو ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو تبلیغ کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کے وقت خاموش رہنا اور پوری توجہ سے استماع اور تدبر و تامل سے سننے کا حکم ہے۔

پہلی دلیل کا تیسرا جواب:

۳......اس آیت کریمہ میں ''نماز'' کا تو لفظ بھی نہیں ہے، پھر آخر اس سے نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کی مخالفت کہاں سے نکالی جاتی ہے؟

اگر آپ مقتدی کی قراءت کی ممانعت آیت کریمہ کے الفاظ "واذ قــــری الــــقــــرآن" کے عموم (Prevalency or generality) سے لیں گے یعنی جب بھی یا جس وقت بھی قرآن مجید پڑھا جائے تو خاموش رہو۔ لہٰذا ان الفاظ "جب بھی" میں نماز بھی داخل ہے، اس لیے نماز میں امام قرآن مجید تلاوت کرے تو مقتدی خاموش رہیں۔ اس کے لیے اول تو یہ گذارش ہے کہ جس بات کا ابھی حکم ہی نہ ملا ہے کیونکہ فاتحہ کی قراءت کا حکم تو مدینہ منورہ میں ملا تھا، اس دوسرے اور کئی سال بعد میں ملے ہوئے حکم کو کئی سال پہلے نازل کی ہوئی آیت مبارکہ کیسے منع (منسوخ) کرے گی۔ اس آیت مبارکہ کے نزول کے وقت تو لوگوں کو نماز میں فاتحہ پڑھنے یا نہ پڑھنے کے بارے میں تو کوئی بھی علم نہیں تھا، پھر یہ آیت مبارکہ اس سے مانع (روکنے والی) آخر کیسے بن سکے گی؟

سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والوں سے چند سوالات:

ذرا دماغ پر زور دے کر سوچئے! بالفرض اگر ہم تسلیم کریں کہ آیت کریمہ میں واقعی ایسے عموم وشمول کی گنجائش ہے تو یہ معنی آپ کو بہت زیادہ مہنگے پڑیں گے کیونکہ اس صورت میں آیت کریمہ کے اوپر والے مذکورہ الفاظ میں خالص عموم یا (Pure prevalency all generality) کے معنی پیدا ہوں گے، جس کی وجہ سے کئی صورتیں ایسی سامنے آئیں گی جن کا کوئی بھی حل آپ کو سوائے اس کے دوسرا نہ مل سکے گا کہ آپ ان سب صورتوں کو آیت کریمہ کے ان الفاظ سے مستثنیٰ (Exclude) کریں مگر وہ بھی بغیر دلیل۔

ہے کوئی مقلد جو جواب دے؟

۱......مثلاً: گھر میں یا مسجد میں، دکان میں یا آفس میں، بازار میں بلکہ ہر جگہ آپ جہاں سے بھی گزریں یا وہاں آئیں اور وہاں پہلے سے ہی کوئی قرآن پڑھ رہا ہو یا ریڈیو پر قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی ہو تو ان سب صورتوں میں آپ پر یہ لازم ہو جائے گا کہ آپ خاموشی سے بیٹھ کر سنیں یہاں تک کہ وہ شخص خود خاموش ہو یا تلاوت بند ہو یا آپ مسجد میں آتے ہیں نماز کے لیے اور جماعت کی اقامت میں ابھی کچھ وقت ہے مگر وہاں پہلے سے ہی اس وقفہ کے دوران کوئی شخص قرآن مجید تلاوت کر رہا ہے تو آپ اس آیت کریمہ کے عمومی حکم کے باعث اس بات کے پابند ہیں کہ خاموشی سے بیٹھ کر اس کی تلاوت سنیں اور کچھ بھی نہ کریں حتیٰ کہ آپ نماز سے پہلے نفل یا سنت بھی پڑھ نہیں سکتے، کیوں قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی ہے۔ یا آپ مسجد میں داخل ہوئے تو کوئی شخص پہلے سے ہی نفل پڑھ رہا ہو اور قیام کی حالت میں ہو تو وہ ضرور اس میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہو گا، لہٰذا آپ کو یا تو وہ شخص جب تک مکمل نفل پڑھ کر فارغ نہ ہو یا کم از کم رکوع میں جب تک نہ جائے آپ کھڑے رہیں دوسرا کوئی کام نہ کریں کیونکہ قرآنی آیت کریمہ میں آہستہ یا زور سے (بلند آواز) کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ خالص عموم ہے (آپ کے دعویٰ کے مطابق) لہٰذا پڑھنے والا آہستہ پڑھ رہا ہو یا زور سے (بلند آواز میں) مگر آپ کو ہر دو حالات خاموش ہی رہنا ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص نہایت آخری صفوں میں ہو جہاں امام کی آواز بھی نہ سنے تب بھی آپ کے عالم

مقتدی کو یہ ہی فتویٰ دیں گے کہ تو قراءت نہ کر حالانکہ عمل اس کے بالکل برخلاف ہے ایک پہلے سے ہی قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے تو دوسرے آتے ہیں تو وہ بھی قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگتے ہیں خصوصاً جمعہ کے روز اس طرح کوئی پہلے سے ہی نماز پڑھ رہا ہے تو باہر سے دوسرے آتے ہیں وہ بھی نماز پڑھنے لگ جاتے ہیں آخر وہاں آیت کریمہ کے الفاظ کا عموم کہاں گیا۔ بتایا جائے کہ اس صورت کو آپ نے کون سی دلیل سے اس عموم سے خارج کیا ہے؟

دوسرا سوال:

۲......طلباء قرآن مجید پڑھتے رہتے ہیں ایک ہی وقت میں کئی شاگرد قرآن مجید پڑھ رہے ہیں حالانکہ آیت مزعومہ عموم کے مدنظر ایک پڑھے دوسرے خاموش ہو کر بیٹھیں، جب وہ خاموش ہو تو پھر دوسرا شروع کرے۔علی ہذا القیاس تیسرا چوتھا وغیرہ وغیرہ۔ صبح کے وقت میں عام طور پر مسجدوں میں کئی افراد ایک ہی وقت میں قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف ہوتے ہیں یہ اس طرح کے عمومی مفہوم کے سراسر خلاف ہے۔ ایسی دوسری بھی کئی صورتیں آپ کے سامنے آ سکتی ہیں، ان سب کو خود آپ کے علماء نے بھی اس عموم سے خارج کر دیا ہے لیکن دلیل پوچھو تو جواب نہ دارد۔

حنفی مذہب یا خواہشات نفس:

۳......آپ کے علماء فتویٰ دیتے ہیں کہ صبح کی نماز میں امام شروع ہے باہر سے کوئی شخص آتا ہے جس نے سنت نہ پڑھی ہو تو وہ ایک طرف ہو کر سنت پڑھے، پھر آ کر جماعت میں شامل ہو۔ یہ فتویٰ کتنا بڑا ظلم ہے جو نماز میں قرآن کریم پڑھا جا رہا ہے مگر آپ کے علماء اس کو نماز میں شامل ہو کر استماع اور انصات کرنے کے بجائے محض اپنی ھویٰ (خواہش) نفسانی کے مطابق بغیر دلیل یہ فتویٰ دے رہے ہیں کہ تو دو رکعتیں سنت ادا کر کے پھر آ کر فرض نماز میں شامل ہو، اگرچہ امام ایک رکعت مکمل پڑھ بھی لے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. آخر اس فتویٰ کی دلیل کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ میں سے کونسی ہے؟

احادیث رسول ﷺ کا انکار:

آپ کی آیت کریمہ کی عمومی الفاظ کی مخالفت سے اس فتویٰ کی وجہ سے جناب حضرت رسول اللہ ﷺ کے دو حکم مبارکہ سے بھی انحراف کیا جاتا ہے۔

۱......ایک تو صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ جب فرض نماز کی امامت ہو جائے تو دوسری کوئی بھی نماز نہیں ہوگی۔ (صحیح مسلم ص ۲۴۷)

۲......آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے جس بھی حالت میں دیکھو قیام میں، رکوع میں، سجدہ میں یا قعدہ میں تو اس

میں شامل ہو جاؤ مگر آپ کے مفتی صاحب ان دو حدیثوں کو بھی نظر انداز کر کے اپنی دلیلوں کی بھی مخالفت کر کے یہ فتویٰ دے رہے ہیں کہ ایک طرف ہو کر سنت پڑھو، پھر آ کر فرض میں شامل ہو۔ فیالعجب! برائے مہربانی یہ بتائیں کہ یہ سب صورتیں آپ نے قرآنی آیت کے عموم سے کس دلیل سے خارج کی ہیں؟ دلیل تو آپ کو کتاب وسنت سے نہیں ملے گی باقی اپنی ادھر ادھر کی باتیں کر کے جان چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ پھر کیا یہ عجب اور افسوس کی بات نہیں ہے کہ آپ تو اپنی مرضی سے آیت کریمہ کے عموم سے اتنی ساری صورتیں خارج کر سکتے ہیں مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ جن پر یہ کلام پاک نازل ہوا ہے وہ اس عموم سے سورۃ فاتحہ کو خارج کرنے کا حق نہیں رکھتے؟

کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول پاک کو آپ کے علماء سے بھی عربیت، عموم وغیرہ کا علم کم تھا؟ حاشا وکلاء کوئی بھی مسلم مومن ہرگز ایسے نہ کہے گا۔ لہٰذا اگر ہم تسلیم بھی کریں کہ آیت کریمہ زیر بحث میں عموم کلی ہے۔ نماز بھی اس میں شامل ہے تب بھی بات واضح ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول مقبول ﷺ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحی کی روشنی میں سورۃ فاتحہ کو اس انصات واستماع کے حکم سے خارج کیا اور آپ ﷺ کا ارشاد وحکم ہی آخری اتھارٹی ہے اور آپ کریم ﷺ سپریم کورٹ کے جج ہیں، لہٰذا آپ کے فیصلہ کے بعد کسی بشر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کے برخلاف چلے یا اس پر چہ مگوئیاں کرے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ نماز میں قرأت سے منع کرنے کے لیے ہی نازل ہوئی ہے۔ یعنی اس کی شان نزول یہ ہی ہے لیکن یہ دعویٰ محل نظر ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تو کوئی بھی روایت ایسی نظر نہ آئی جس میں یہ وضاحت ہو کہ یہ نماز میں قرأت سے منع کے لیے نازل ہوئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کی حقیقت:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ آیت نماز میں کلام کرنے سے منع کے لیے نازل ہوئی ہے۔ یعنی ابتدا میں نماز میں ایک دوسرے سے کلام کرتے تھے، پھر یہ آیت نازل ہوئی اور نماز میں ایک دوسرے سے کلام کرنا بند ہو گیا۔ مطلب کہ صحابی رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں بھی نماز میں قرأت سے منع کی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ تاہم یہ روایت بھی روایت ودرروایت صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں راوی ضعیف ہیں اور درایۃً اس لیے کہ نماز میں کلام کرنے سے منع مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے اور یہ زیر بحث آیت کریمہ مکی ہے۔ بحر حال صحابہ رضی اللہ عنہم سے شان نزول کے بارے میں اس آیت کی حنفی مسلک کے مطابق کوئی بھی روایت مجھے دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔

مجاہد رحمہ اللہ کے قول پر ایک نظر:

البتہ تابعین سے مثلاً: مجاہد وغیرہ سے ایسا قول منقول ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اولاً! کہ تابعی کا قول حجت نہیں ہے اور نہ ہی اس نے اپنے اس قول کی کسی صحابی کی طرف بھی نسبت کی، اس لیے

محض اس کے قول کی کیا اہمیت۔

ثانیاً: انہی مجاہد رحمہ اللہ سے دوسری روایت بھی ہے۔ اس میں فرماتے ہیں کہ یہ خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی جمعہ کے خطبہ میں خاموش رہو۔ قرآن کریم کا استماع کیا جائے اور یہ روایت ہمارے موقف کے مخالف نہیں ہے، تاہم یہ دونوں قول مضبوط اور قوی نہیں ہیں، اس لیے کہ نماز میں فاتحہ کا حکم مدینہ منورہ میں ہوا ہے اس طرح جمعہ کا خطبہ بھی مدینہ منورہ میں ہی شروع ہوا۔ مکہ مکرمہ میں تو جمعہ کے پڑھنے کی اس وقت کوئی بھی صورت نہیں تھی، پھر خطبہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرصورت شان نزول والی بات کسی بھی طرح وزنی نہیں ہے۔ خلاصہ کلام کہ اس آیت کریمہ کا نماز سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ نہ از روئے روایت اور نہ ہی درایت کے لحاظ سے اس میں صحیح مسلک کے مطابق تبلیغ کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کے وقت بالکل ہی خاموش رہنا اور توجہ سے استماع کا حکم ہے۔ اس لیے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کی وجہ اس آیت کریمہ کی مخالفت ہرگز لازم نہیں آتی۔

نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے دلائل:

اس کے بعد سورۃ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنے کے دلائل پیش کئے جاتے ہیں غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

۱......صحیح بخاری میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ .))

''جس نے بھی نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہ ہوگی۔''

اس حدیث مبارکہ میں صلوٰۃ پر 'لا' کا لفظ آیا ہے اور یہ 'لا' نفی جنس کی ہے، جس کی معنیٰ یہ ہوں گے، کہ ''جنس نماز کی'' سورۂ فاتحہ کے بغیر نہیں ہوگی۔ جنس نماز کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ نماز جس کو 'صلوٰۃ' کہہ سکیں وہ الحمد کے بغیر نہ ہوگی، اس لیے اس میں سب نمازیں داخل ہوگئیں۔ نفلی ہو یا فرض، سری ہو یا جہری، سفر میں ہو یا حضر میں، رکوع وسجود والی نمازیں ہوں یا بغیر رکوع وسجود کے (یعنی نماز جنازہ) اس طرح ''لِمَنْ'' میں لفظ مَنْ بھی عام ہے، یعنی جو بھی ہو خواہ مرد ہو خواہ عورت۔ وہ امام ہو یا ماموم ومقتدی اکیلا ہو یا جماعت سے بہرحال سورۂ فاتحہ کے بغیر کسی کی نماز نہ ہوگی یہ معنیٰ عربیت کے قوانین اور نحو (گرامر) کے قواعد کے مطابق ہیں۔ عربی زبان کے قوانین کے تحت اس کے معنیٰ جس طرح آپ کرتے ہیں صحیح نہ ہوں گے، یہ ہی وجہ ہے کہ ان حدیثوں پر امام المحدثین امام بخاری نے اس طرح باب منعقد فرمایا ہے۔

((باب وجوب القراءة للامام والمأموم فی الصلوت کلها فی الحضر والسفر وما یجهر فیها وما یخافت .))

یعنی قرأت امام ماموم (مقتدی) پر سب نمازوں حضر وسفر اور زور سے اور آہستہ قرأت والی نمازوں سب میں واجب اور فرض ہے۔''

صحیح مسلم شریف ونسائی کی روایت:

۲......صحیح مسلم شریف اور نسائی شریف میں ہے کہ ابوالسائب مولیٰ ہشام بن زہرہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا تو فرمار ہے تھے کہ:

((قال رسول الله ﷺ من صلى صلوٰة لم يقرا فيها بام القرآن فهى خداج فهى خداج فهى خداج غير تمام فقلت يا اباهريرة انى اكون احيانا وراء الامام قال! فغمز ذراعى وقال يا فارسى اقرابها فى نفسك فانى سمعت رسول الله ﷺ: قال الله عزوجل: قسمت الصلوٰة بينى وبين عبدى نصفين فنصفها لى ونصفها لعبدى ولعبدى ما سال قال رسول الله ﷺ اقروا يقول العبد اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ يقول الله حمدنى عبدى يقول العبد اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ يقول الله اثنى على عبدى يقول العبد مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ يقول الله مجدنى عبدى يقول العبد اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ فهذه الآية بينى وبين عبدى ولعبدى ماسال يقول العبد اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ o صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ o غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ o فهولاء لعبدى ولعبدى ما سال.))

''حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے کوئی بھی نماز پڑھی اور اس میں الحمد سورت نہ پڑھی تو وہ نماز ناقص ہے وہ نماز ناقص ہے وہ نماز ناقص ہے، غیر مکمل ہے ابوالسائب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے ابو ہریرہ! میں کبھی امام کے پیچھے ہوتا ہوں (پھر کیا کروں؟) کہا کہ اس پر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے میرے بازو کو دبایا اور فرمایا کہ اے فارسی اس سورۃ الحمد کو اپنے دل میں آہستہ سے پڑھ کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اور اپنے بندہ کے درمیان نماز تقسیم کی ہے، پھر اس کا آدھا میرے لیے اور آدھا میرے بندے کے لیے اور میرے بندے کے لیے وہ ہی ہے جو اس نے سوال کیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پڑھو! بندہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ نے میری حمد کی ہے۔ بندہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ نے میری تعریف و ثنا کی ہے، بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ نے میری بڑائی اور بزرگی بیان کی ہے بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو پھر یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان میں ہے (یعنی عبادت خاص میری کر اور مدد میں تیری کروں) اور بندہ کو وہ ملے گا جو اس

نے سوال کیا۔ پھر بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ o صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ o غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْن . تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ سب آیتیں بندہ کے لیے ہیں اور میرے بندہ نے جو مجھ سے ان میں سوال کیا ہے۔ وہ اس کو عنایت ہوگا۔''

اس حدیث مبارکہ کا معنی ومفہوم بالکل واضح ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی دلیل یا طرز استدلال بالکل صحیح اور عربیت کے قواعد کے تحت ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز بانٹی ہے اپنے اور بندہ کے درمیان آدھوآدھ لیکن تقسیم یا بٹائی ہوگئی الحمد کی۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ الحمد سورت ہی نماز ہے اگر الحمد اس میں نہیں ہے تو وہ نماز ہی نہ رہی آپ اس پر خود غور وفکر کریں۔

صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل:

۳...... امام بیہقی رحمہ اللہ کتاب القراءۃ میں فرماتے ہیں:

((اخبرنا ابو عبدالله الحافظ انا ابو علی الحسين بن علی الحافظ نا احمد بن عمير بن يوسف نا احمد بن عبدالواحد الدمشقی نامروان بن محمد نا الهيثم بن حميد اخبرنی زيد بن واقد عن مكحول وحرام بن حكيم عن نافع بن محمود بن الربيع الا نصاری قال كنت اغدوالی المسجد مع عبادة بن الصامت فابطا عبادة ذات يوم قال فجئنا وابو نعيم يصلی بالناس الصبح قال فصففنا خلفه فسمعت عبادة يقرا بفاتحة الكتاب فلما انصرف ابو نعيم قلت يا ابا الوليد رايتك تقرا مع الامام ولا ادری اتعمدته ام سهوت قال لم انسه ولكن تعمدته صلی بنا رسول الله ﷺ بعض الصلوت التی يجهر فيها بالقراة قال فالتبست عليه القراة فلما انصرف قال هل تقرؤن معی؟ قالوا: نعم قال فلا تفعلوا إلا بام القرآن فانه لا صلوة لمن لم يقرا بها .)) (ص: ٦٤)

''سند کے ترجمہ کی خاص ضرورت نہیں ہے۔ نافع بن محمود بن الربیع الانصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ صبح سویرے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد کی طرف (نماز کے لیے) جاتا تھا، ایک روز حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے کچھ دیر کی نافع نے کہا کہ پھر ہم (مسجد میں) آئے اس حال میں کہ ابونعیم لوگوں کو صبح کی نماز پڑھا رہا تھا، کہا کہ پھر ہم اس کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہوگئے پھر میں نے حضرت عبادہ کو سنا کہ سورۃ فاتحۃ الکتاب پڑھ رہے ہیں، پھر جب ابونعیم فارغ ہوئے تو میں نے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے ابو ولید (یہ حضرتؓ عبادہ رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) تمہیں دیکھا کہ امام کے ساتھ قرأت کررہے تھے اور مجھے خبر نہیں ہے کہ تم نے یہ کام جان بوجھ کر کیا یا سہواً اور بھول ہوگئی (اس پر)

حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں بھولا نہیں ہوں بلکہ میں نے جان بوجھ کر اس طرح کیا (کیونکہ) ہم کو رسول اللہ ﷺ نے جن نمازوں میں جہر کیا جاتا ہے ان میں سے کوئی نماز پڑھائی۔ کہا کہ پھر آپ ﷺ پر قرأت متلبس یا مختلط ہوگئی۔ پھر جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم میرے ساتھ قرأت کرتے رہتے ہو جواب دیا کہ ہاں۔ صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ (اس پر) آپ ﷺ نے فرمایا: ام القرآن یعنی سورۃ الحمد کے بغیر (جہری نماز میں) دوسرا کچھ نہ پڑھو (باقی الحمد اس لیے کہ) اس کے بغیر تو نماز ہی نہیں ہوگی۔ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد صحیح ہے اور اس کے سب راوی ثقہ اور پختہ ہیں۔ اسی طرح امام دارقطنی بھی فرماتے ہیں کہ اس کے راوی سب ثقہ ہیں۔ السنن للامام الدارقطنی وکتاب القراءۃ للبیہقی اور یہ حدیث امام ابوداؤد بھی اپنی سنن میں لائے ہیں۔ (باب ۱۲۱ استفتاح الصلوٰۃ) اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے (امام بھی کون! اللہ تبارک وتعالیٰ کے رسول ﷺ وہ بھی جہری نماز میں) بھی سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے اگر یہ سورۃ مبارکہ نہیں پڑھیں گے تو نماز نہیں ہوگی۔''

چوتھی دلیل:

۴...... امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب القرأۃ میں اس سے بھی زیادہ صریح صحیح الاسناد حدیث وارد ہے جو کہ یہاں ذکر کر رہے ہیں:

((اخبرنا ابو محمد عبدالرحمن بن محمد بن احمد بن بالویه المذکی ثنا ابوالحسن احمد بن الخضر الشافعی ثنا ابو احمد محمد بن سلیمان بن فارس ثنا محمد بن یحییٰ الصفار والد ابراهیم الصید لانی ح واخبرنا ابو عبدالله الحافظ ثنا ابوجعفر محمد بن صالح بن ها نی وابواسحق ابراهیم بن محمد بن یحیی وابو الطیب محمد بن احمد الذهلی قالوا ثنا محمد بن سلیمان بن فارس حدثنی ابو ابراهیم محمد بن یحییٰ الصفار وکان جارنا ثنا عثمان بن عمر عن یونس عن الزهری عن محمود بن الربیع عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: لا صلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب خلف الامام قال ابو الطیب: قلت لمحمد بن سلیمان خلف الامام قال: خلف الامام قال الامام البیهقی هذا اسناد صحیح .)) (ص: ۷۰)

''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے امام کے پیچھے بھی سورۃ فاتحۃ الکتاب نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔ ابوالطیب سند کا راوی محمد بن سلیمان سے جو

اس کے اس سند میں استاد ہیں ان سے یقین کرنے کی خاطر پوچھتے ہیں کہ کیا حضرت عبادہ نے خلف الامام (امام کے پیچھے) کے الفاظ کہے؟ محمد بن سلیمان نے جواب دیا کہ ہاں امام کے پیچھے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔''

راقم الحروف کہتا ہے کہ: اس حدیث کے متعلق ہم نے بھی تحقیق کی ہے کہ اس کی سند کے تمام راوی ثقہ اور معتمد علیہم ہیں۔ یہ حدیث صراحت سے بتا رہی ہے کہ امام کے پیچھے اگر سورۃ فاتحہ نہیں پڑھیں گے تو نماز نہیں ہوگی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت:

۵......امام بیہقی رحمہ اللہ اپنی کتاب میں اپنی سند سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث لاتے ہیں:

((اخبرنا ابو الحسن علی بن احمد بن عمر بن حفص المقرء ی ببغداد انا ابوبکر احمد بن سلمان الفقیه نا ابو الاحوص محمد بن الهیثم قراة علیه نا ابوتوبة الربیع بن نافع عن عبیدالله بن عمروح واخبرنا ابوالحسن علی بن احمد بن عبدان انا احمد بن عبید الصفر نا محمد بن الفضل بن جابر نا یحییٰ بن یوسف نا عبید الله بن عمرو عن ایوب عن ابی قلابة عن انس ان رسول الله ﷺ صلی باصحابه فلما قضی صلواته اقبل علی القوم بوجهه وقال اتقرؤن فی صلواتکم والامام یقرأ فسکتوا فقالها ثلاث مرات فقال قائل او قائلون انا لنفعل قال: فلا تفعلوا او لیقراء احدکم بفاتحة الکتاب فی نفسه .))

''ابوقلابہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی، پھر جب نماز مکمل فرمائی تو اپنے چہرہ مبارک سے قوم کے سامنے ہوئے اور فرمایا کہ کیا تم اپنی نماز میں قراءت کرتے ہو حالانکہ امام قرأت کر رہا ہے؟ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم خاموش رہے، پھر آپ ﷺ نے تین مرتبہ ایسے ہی فرمایا، پھر کسی کہنے والے یا کہنے والوں نے کہا کہ (ہاں) ہم بیشک ایسے ہی کرتے ہیں (اس پر) آپ نے فرمایا کہ ایسے نہ کریں۔ باقی سورت الحمد آہستہ ضرور پڑھو۔ یہ حدیث بھی صحیح الاسناد ہے اور اس کو امام بخاری رحمہ اللہ بھی اپنی کتاب جزء القرأۃ میں حجت اور دلیل کے طور پر لائے ہیں۔ اس کے راوی تمام کے تمام ثقہ ہیں۔ اس حدیث سے بھی صاف ظاہر ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے جب امام قرأت جہراً کر رہا ہو تو دوسری قرأت سے منع فرمایا مگر سورۃ الحمد کے بارے میں امر سے فرمایا کہ یہ آہستہ پڑھیں۔ امر اس لیے کہا کہ (ولیـــقـــراء) عربی زبان میں امر کا صیغہ ہے، یعنی آپ کریم ﷺ نے امام کے پیچھے بھی سورت فاتحہ پڑھنے کا امر اور حکم دیا۔''

امہات المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت:

٦...... ((عن عائشه زوج النبی ﷺ قالت سمعت رسول الله ﷺ من صلی صلوٰۃ لا یقرأ فیها بام القرآن فهی خداج)) (المسند للامام احمد والسنن لابن ماجه.)

''بی بی صاحبہ سیدتنا وامنا عائشہ صدیقہ آپ ﷺ کے حرم مطہرہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس بھی شخص نے کوئی بھی نماز پڑھی، اور اس میں ام القرآن (سورۃ فاتحہ) نہ پڑھی تو وہ ناقص اور غیر مکمل ہے۔ اس حدیث کے راوی بھی سب ثقہ ہیں اور سند بھی صحیح ہے۔

ساتویں دلیل:

٧...... حضرت رفاعہ بن رافع زرقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ یہ ایک لمبی روایت ہے، جس میں بیان ہے کہ:

ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں مسجد میں آ کر نماز پڑھی پھر آپ کے پاس آ کر سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دے کر فرمایا کہ جا کر نماز پڑھ تم نے نماز نہیں پڑھی اس طرح تین مرتبہ آپ ﷺ نے اس کو واپس بھیج کر نماز پڑھوائی آخر اس شخص نے عرض کی کہ اس سے زیادہ مجھ کو نماز پڑھنی نہیں آتی آپ ﷺ سکھائیں تب آپ نے فرمایا:

((اذا استقبلت القبلة فكبر ثم اقراء بام القرآن.)) (الحديث)

''جب تم قبلہ کے سامنے ہو تو تکبیر (اللہ اکبر) کہو، پھر سورت ام القرآن (الحمد) پڑھو۔''

اس طرح پوری نماز کی کیفیت اس کو سمجھائی اور اس سمجھانے میں صرف وہ باتیں اس کو سمجھائی جن کے بغیر نماز بالکل نہیں ہوتی۔ اسی لیے اس کو تین مرتبہ نماز واپس کر کے پڑھوائی۔ لہٰذا اس حدیث میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ سب نماز کے رکن اور فرض ہیں۔ ان کے بغیر نماز ہرگز نہیں ہوگی۔ ان میں سے ایک سورۃ فاتحہ پڑھنا بھی ہے جیسا کہ مندرجہ بالا حدیث کے حصہ میں ذکر ہوا کہ اس شخص کو الحمد کے پڑھنے کا حکم فرمایا: آپ ﷺ نے۔ لہٰذا نماز میں الحمد پڑھنا بھی فرض ہے۔ نہیں پڑھیں گے تو نماز بھی نہیں ہوگی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اس حدیث میں مطلق نماز کا بیان ہے لہٰذا کوئی سی بھی نماز ہو، کوئی بھی ہو اکیلا ہو یا جماعت سے ہو، امام ہو مقتدی وغیرہ۔ بہرحال الحمد ضرور پڑھنی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی روایتیں اور آثار ہیں جو امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ کی کتب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

آخری گذارش:

اس مختصر مضمون میں ان سب کا احصاء مشکل ہے۔ حق وانصاف صداقت اور سیدھی راہ کے طالب کے لیے یہ بھی کافی وشافی ہوں گی۔ مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ العزیز آپ کو ان احادیث مبارکہ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے رسول کریم ﷺ کے ان واضح ارشادات سے کلی اطمینان حاصل ہو گیا ہوگا اور زیر بحث مسئلہ کے بارے میں آپ

کو سیدھی راہ معلوم ہوگئی ہوگی۔

ان احادیث صحیحہ کے علاوہ چند روایتیں اور بھی ہیں جو حنفی بزرگ ان میں سے اپنے مسلک پر دلیل لیتے ہیں۔ ان میں ''اولاً'' تو خاص سورت فاتحہ کا نام لے کر منع نہیں کیا گیا ہے بلکہ مطلق عام قرأۃ سے منع ہے۔مثلاً کسی میں "واذا قراء فانصتوا" جس کا امام ہو تو اس کے امام کی قرأت اس کے لیے قرأت ہے۔ان روایتوں میں خاص فاتحہ سے منع نہیں ہے بلکہ عام قرأۃ سے منع ہے اور ادھر ہم جو بھی صحیح حدیثیں پیش کر کے آئے ہیں ان میں خاص طور پر فاتحۃ الکتاب کا نام لے کر حکم فرمایا گیا ہے کہ اور نہیں باقی یہ سورت تم کو بہر حال لازمی پڑھنی ہے یہ نہیں پڑھو گے تو تمہاری نماز ہی نہیں ہوگی اور اصولی قاعدہ یہ ہے کہ خاص عام سے مقدم ہوتا ہے، لہٰذا جن روایات میں امام کی قرأت سے مقتدیوں کو قرأت کی منع ہے ان سے مراد فاتحہ کے علاوہ دوسری سورت کی ممانعت ہے اور سورۂ فاتحہ اس سے مستثنیٰ (Excluded) ہے کیونکہ اس بارے میں احادیث صحیحہ میں خاص طور پر حکم آچکا ہے۔محدثین رحمہم اللہ کا بھی یہ اصول ہے کہ مختلف احادیث کو پہلے جمع کرنا ہے آپس میں تطبیق دلوانی ہے جو آپس میں اچھے نمونے سے جمع ہو جاتی ہے تو پھر ان کی بابت کوئی دوسرا طریقہ اختیار نہ کریں گے۔آپس میں بالکل جمع نہ ہو سکیں تو پھر کوئی دوسری صورت اختیار کی جائے گی اور ہم نے جو کہ مندرجہ بالا جمع و تطبیق کا طریقہ پیش کیا ہے، اس کے مطابق وہ سب روایتیں جمع ہو جاتی ہیں اور مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے، یعنی جب امام جہراً قرأت کر رہا ہو تو مقتدین کو سوائے سورت الحمد کے دوسری کوئی بھی سورت ہرگز نہیں پڑھنی چاہیے اس طرح دونوں روایتوں پر آسانی سے عمل ہو جاتا ہے۔اس پر خوب غور کریں ''ثانیاً'' وہ روایتیں جن میں قرأت کی ممانعت آئی ہے ان روایت میں کوئی بھی روایت محدثانہ اصول روایت کے مطابق اصولاً صحیح السند نہیں ہے بلکہ یہ سب کی سب ضعیف و منکر اور مردود و نامقبول ہیں اور اس طرف جو احادیث ہم نے پیش کی ہیں وہ صحیح السند ہیں جن میں کچھ تو صحیحین (بخاری و مسلم) جیسے پایہ کی کتب احادیث میں سے ہیں اور ان کی معنیٰ و مفہوم میں کوئی بھی پیچیدگی یا الجھاؤ بالکل نہیں ہے اور اپنے مقصد میں بالکل واضح اور سراسر ظاہر ہیں، پھر ان احادیث صحیحہ اور صریحہ کے مقابلہ میں وہ روایات ضعیفہ اور اپنے مفہوم میں غیر واضح بلکہ محتملہ کو پیش کرنا عقلمندی تو نہیں ہے بلکہ سراسر ہٹ دھرمی اور مسلکی حمیت اور فرقہ وارانہ تعصب و ضد جس کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔

اس مختصر مقالہ میں اس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں ہے، اگر آپ کو لمبی چوڑی کتابیں دیکھنی ہوں تو بتائیں ان کے بارے میں نشاندہی کریں۔اگر یہ مختصر گذارشات آپ نے کافی تصور کیں تو زہے عز و شرف۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا۝ (الکهف: ۱۷)

آخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه سيدنا وسيد ولد آدم محمد وآله واصحابه وازواجه وبارك وسلم.

❁❁❁❁

نیل الأمانی وحصول الأ مال بتحقیق ان الهیئة المسنونة للقیام بعد الرکوع هی الارسال

رکوع کے بعد قیام میں ہاتھوں کا چھوڑنا ہی مسنون ہے

چند سالوں سے اس مسئلہ پر بحث چل رہی ہے کہ رکوع کے بعد نماز میں ہاتھ چھوڑ دینے چاہئیں یا ان کو پہلے قیام کی طرح باندھ لینے چاہئیں اور اس بحث نے اتنا طول پکڑا ہے کہ طرفین سے اس سلسلہ میں تحریرات وتقریریں اور بحث ومناظرہ اور طعن وتشنیع تک نوبت پہنچ چکی ہے۔ اور اسی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے شاہ صاحب نے قرآن وحدیث سے ان دلائل کو اکٹھا کیا کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رکوع کے بعد قیام میں ہاتھوں کا چھوڑنا ہی مسنون ہے۔

((الحمد لله الذى ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله وكفى بالله شهيدا.

فارسله الى الناس كافة فمن اتبعه واقتفى اشارته كان سعيدا ومن عصاه واتبع غير سبيل المومنين فقد ضل ضلالا بعيدا.

والصلوٰة والسلام على سيدنا محمد النبى الامى الذى بلغ رسالة وبين للناس ما نزل اليهم بيانا شافيا وقال لهم قولا سديدا.

فاوضع لهم، بالتبليغ مباشرة وبالكتابة وارسال المبلغين انواع العبادات واوضاعها. وجميع الاداب والمعاملات ايضاحا تاما، فلم يتخلف عن اتباعه الامن كان جبارا اعنيدا وعلى اله واصحابه وازواجه وذريته واهل بيته الذى بلغوا عن نبينا كل شى ولو كان اية وا دوالامانة فلم يتركوا منه شيئا قليلا ولا كثيرا ولا كان منه وعدا ولا وعيدا.))

امابعد! چند سالوں سے اس مسئلہ پر بحث چل رہی ہے کہ رکوع کے بعد نماز میں ہاتھ چھوڑ دینے چاہئیں یا ان کو پہلے قیام کی طرح باندھ لینے چاہئیں اور اس بحث نے اتنا طول پکڑا ہے کہ طرفین سے اس سلسلہ میں تحریرات وتقریریں اور بحث ومناظرہ اور طعن وتشنیع تک نوبت پہنچ چکی ہے۔ دراصل مسئلہ کی صورت واضح تھی اور اگر انصاف سے کام لیا جاتا عدل کا دامن تھام لیا جاتا اور ضد وتعصب کو ترک کیا جاتا تو بات بالکل صاف ہو جاتی اور حق وباطل میں امتیاز ہو جاتا اور کسی کو کسی پر انگلی اٹھانے کی ضرورت قطعاً نہ پڑتی لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ اب صرف دو پارٹیوں کا ایک امتیازی خاصہ اور ان کے کاروبار کا ٹریڈ مارک بن گیا ہے، لہٰذا جو آدمی کسی ایک پارٹی کے ساتھ منسلک ہے وہ اسی طرح ہی کرتا رہتا ہے اگرچہ حقیقت میں اس کو اتنا علم وفہم بھی نہ ہو کہ وہ حسن امتیاز کر لیتا کہ یہ بات حق ہے محض اس بناء پر کہ ان کا اس پارٹی کے سربراہ کے ساتھ گہرا قلبی تعلق ہے اور اس کی بات کو کالنقش فی الحجر بلکہ مثل وحی کے تصور کر لیتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے ان کی تقلید کر لیتے ہیں اور دوسری طرف یا دوسرے فریق کے موقف کو سننے یا ان کی تحریروں کو مکمل طور پر پڑھنے سے بھی گریز کرتے ہیں بلکہ مقابل فریق کی تحریروں کو شجرہ ممنوع تصور کر لیتے ہیں اور اس بات پر یقین کر لیتے ہیں کہ بس حق وہی ہے جو فلاں کرتا ہے یا جس پر فلاں عامل ہے اس کے سوا حق اصل ہے ہی نہیں۔ فياللعجب وضيعة الادب.

اس سلسلہ میں راقم الحروف نے ایک کتاب سندھی زبان میں بنام ''التحقیق الجلیل'' لکھی تھی اور بہت سے عوام وخواص اور علماء وفضلاء نے اسے پسند فرمایا اور اپنی تقاریظ سے اس کو خراج تحسین پیش فرمایا۔ ہاں انسان کا کوئی کام غلطیوں سے مبرا نہیں ہو سکتا، لامحالہ دو تین غلطیاں مجھ سے بھی اس میں سرزد ہو گئی تھیں گو ان فروگذاشتوں سے نفس

مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا، تاہم ہم نے ایک ورقہ چار صفحات پر مشتمل لکھا ان میں ایک دو غلطیوں کا ازالہ کر لیا تھا لیکن مخالفوں نے اس کو بہت اچھالا اور ایک بات کو لے کر اپنے مقلدوں اور حواریوں کو یہ تاثر دینا شروع کیا کہ یہ کتاب ساری غلط ہے ان مقلدوں کا یہ حال ہے کہ وہ پوری کتاب دیکھتے بھی نہیں بس عوام کالانعام تو بکریوں کے ریوڑ کی طرح اپنے پیشوا کے پیچھے آمنا و صدقنا کہتے ہوئے، آنکھیں بند کر کے اس کتاب کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے لیکن بعض خواص بھی اس کتاب کا پورا مطالعہ نہیں کرتے اور اس کو فریق مقابل کے اقوال وتحریرات سے مقابلہ کرتے یا دیکھتے بھی نہیں کہ آخر کون سی بات حق ہے اور کیوں؟ اس لیے کہ جس کو انہوں نے اپنا امام بنا رکھا ہے وہ اس پر عامل نہیں اور اس کا یہ قول نہیں اور وہ اس کو صحیح نہیں سمجھے۔ فالی اللہ المشتکی

اس کے بعد میرے ایماء پر ہمارے مخلص دوست حضرت مولانا اللہ بخش مرحوم نے ایک رسالہ عربی زبان میں تحریر فرمایا جس کو پاکستان کے علاوہ حرمین شریفین کے چند علماء نے بھی بنظر استحسان دیکھا۔

کچھ عرصہ پہلے مجھے کراچی کے چند احباب نے کہا کہ اس مسئلہ پر آپ ایک رسالہ اردو زبان میں تحریر فرمائیں تاکہ جو حضرات سندھی زبان میں یا عربی میں لکھے ہوئے کتب سے استفادہ نہیں کر سکتے وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ میں نے وعدہ کر لیا لیکن بموجب لکل اجل کتاب مجھے چند مشاغل اور مصروفیات نے ایسا مشغول رکھا کہ فوراً احباب کے اس ارشاد کی تعمیل نہ ہو سکی اور پھر دو ماہ یا اس سے کم وبیش میں بیمار بھی رہا۔ لہٰذا اس رسالہ کی تحریر میں کافی تاخیر ہو گئی۔ اب الحمد للہ کافی صحت یاب ہو گیا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اس رسالہ کے تحریر کرنے کی طرف پیش قدمی کرنے کا خیال ڈالا اور پھر اس مالک الملک کی جناب میں استخارہ کیا اور قلم اٹھا کر بسم اللہ پڑھ کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے توفیق کا طالب ہوتے ہوئے رسالہ کا آغاز کر دیا اور اسی ذوالجلال والاکرام کے فضل عظیم سے ہی امید کرتا ہوں کہ وہ اس رسالہ کے تکمیل کی توفیق مرحمت فرمائے اور اس کے صحیح طور پر تحریر کرنے اور اس کے اتمام کے وسائل وذرائع بھی اپنے فضل وکرم سے عنایت فرمائے وما ذالك علی اللہ بعزیز، اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ ولا تجعلہ علینا ملبسہ واجعلنا للمتقین اماما۔

ناظرین کرام کو معلوم ہونا چاہیے کہ دلائل صحیح جو احادیث صحاح سے ثابت ہیں ان پر غور وفکر اور تامل وتدبر کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں حق یہی ہے کہ رکوع کے بعد والے قیام میں ارسال کرنا چاہیے یعنی ہاتھوں کو چھوڑ دینا چاہیے نہ کہ ان کو باندھنا چاہیے جیسا کہ ان شاء اللہ العزیز ذیل میں تحریر کیے ہوئے دلائل پر عدل وانصاف کا دامن تھام کر اور تعصب وفرقہ پرستی سے اجتناب کرتے ہوئے جو بھی نظر ڈالے گا اس کو بخوبی معلوم ہو جائے گا۔ واللہ الموفق

دلیل اول:

مسیئ الصلوٰۃ . (یعنی وہ آدمی جو نماز صحیح طور پر ادا نہیں کر رہا تھا اور نبی کریم ﷺ نے ان کو تین بار نماز لوٹانے کا امر فرمایا اور پھر اس کو صحیح طور پر نماز ادا کرنے کی تعلیم دی) والی حدیث میں رکوع کے بعد والے قیام کے متعلق نبی کریم ﷺ نے اس کو ان الفاظ میں امر فرمایا:

((فاذا رفعت راسك فاقم صلبك حتی ترجع العظام الی مفاصلها))

الحدیث

ان الفاظ مبارک کا مطلب یہ ہے کہ جب تم رکوع سے سر اٹھاؤ تو اپنی پیٹھ کو سیدھا کرو حتیٰ کہ تمہاری سب ہڈیاں اپنے جوڑوں کی طرف لوٹ جائیں۔ یہ حدیث امام احمد کے مسند میں جلد ۴ صفحہ ۳۴۰ پر موجود ہے اور اس کی سند جید وقوی ہے۔ اس کے سب رواۃ ثقہ وصدوق ہیں اور کوئی علت یا ضعف کی وجہ اس میں نہیں ہے۔ حدیث کے اس ٹکڑے سے معلوم ہوا کہ رکوع کے بعد والے قیام میں انسان کی سب ہڈیاں اپنے جوڑوں کی طرف لوٹنی چاہئیں کیونکہ اگر رکوع کے بعد والے قیام میں ہاتھ باندھے جائیں تو کہنیوں کی ہڈیاں جو رفع الیدین کی وجہ سے اپنے جوڑوں سے ہٹ گئی تھیں وہ اپنے جوڑوں کی طرف نہیں لوٹیں گی اس لیے یہ فعل نبی کریم ﷺ کے اس امر کے مخالف ہوا کہ اس قیام میں سب ہڈیوں کو اپنے جوڑوں کی طرف لوٹنا ہے اور نبی کریم ﷺ کے امر کی مخالفت بڑی سنگین گستاخی ہے اور اس کا مرتکب اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خطرہ میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۰﴾

(النور: ٦٣)

''پھر وہ لوگ جو نبی کریم ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے کہ ان کو یا تو دنیا میں فتنہ پہنچے گا یا آخرت میں دردناک عذاب ہوگا۔''

ہاں اگر ارسال ہو یعنی اس قیام میں اگر ہاتھوں کو چھوڑ دیا جائے تو یہ لازم نہیں آئے گا کیونکہ اس صورت میں کہنیوں کی ہڈیاں بھی اپنے جوڑوں کی طرف لوٹ جائیں گی۔ باقی ہاتھ باندھنے والے جو اس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ان ہڈیوں سے مراد صرف پیٹھ کی ہڈیاں ہیں۔ سو یہ ان کی بے جا جسارت ہے۔ حدیث پاک میں تو العظام کا لفظ ہے جس سے عربی کے اصول وقواعد کے بموجب سب ہڈیاں مراد ہیں اور اس طرح ہاتھوں اور کہنیوں کی ہڈیاں بھی اس میں شامل ہیں، اس کو اس لفظ سے مستثنیٰ کرنا یا اس سے خارج اور اس میں ان کو شامل نہ سمجھنا کسی دلیل کے بغیر قطعاً ممنوع ہے اور یہاں ہاتھ باندھنے والوں کے پاس ہاتھوں کہنیوں کی ہڈیوں کو العظام سے نکالنے کے لیے کوئی ایک دلیل بھی نہیں ہے، لہٰذا یہ محض زبردستی ہے اور اپنے مفروضہ کو بلا دلیل ثابت کرنے کی ایک غیر معقول سعی ہے۔

خلاصہ کلام: اس قولی حدیث سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ رکوع کے بعد والے قیام میں ہاتھوں کو چھوڑ

دینا چاہیے تاکہ ان ہاتھوں اور کہنیوں کی ہڈیاں بھی اپنے جوڑوں کی طرف لوٹ جائیں اور بھی نبی کریم ﷺ کی مذکور بالا حدیث کا تقاضہ ہے۔ واللہ اعلم

دوسری دلیل:

اس سے قبل آپ قولی حدیث سے ملاحظہ فرما چکے ہیں اب ایک اور دلیل فعلی حدیث، یعنی خود نبی کریم ﷺ کے فعل مبارک سے ارسال کا یعنی ہاتھ چھوڑنے کی دلیل ملاحظہ فرمائیے۔ صحیح بخاری میں حضرت حمید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ الفاظ مبارک موجود ہیں:

((قال ابو حمید النبی ﷺ فاستوی حتی یعود کل فقار مکانه)) (صحیح بخاری)

''اور برابر ہوکر کھڑے ہو جاتے تاکہ سب ہڈیاں، اپنی جسمانی جگہ پر لوٹ آئیں۔''

اس فعلی حدیث سے (جواصح الکتب بعد کتاب اللہ میں وارد ہے) بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ رکوع کے بعد سیدھے کھڑے ہوکر اتنا وقت کھڑے رہتے کہ آپ ﷺ کے جسم مبارک کی سب ہڈیاں اپنی جگہ پر لوٹ آئیں اور یہ ظاہر ہے کہ ہڈیوں کی جگہ سے مراد ہے جسمانی جگہ جیسا کہ پہلی حدیث مبارک میں اس جگہ کو مفاصل سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور مفاصل کے معنی جسم کے جوڑ ہیں اور یہی معنی یہاں بھی مراد ہے تاکہ نبی کریم ﷺ کی قولی وفعلی حدیث ایک دوسرے کے مطابق ہو جائیں، اس حدیث میں العظام کی جگہ کل فقار کے الفاظ آئے ہیں اور ان کی معنی ہے، ہر ہڈی یعنی سب کی سب ہڈیاں اپنی جگہ یعنی جوڑوں کی طرف لوٹ آتی تھیں اور فقار کی معنی کو صرف پیٹھ کی ہڈیوں تک محدود رکھنا عربی لغت مثلاً امام اصمعی کے اقوال کو ملاحظہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے سب ہڈیاں مراد ہیں اس حدیث فعلی سے بھی معلوم ہوا کہ رکوع کے بعد والے قیام میں اتنا وقت کھڑا ہونا ہے کہ اپنی جگہ یعنی جوڑوں کی طرف لوٹ آئیں اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ سب ہڈیوں میں ہاتھوں اور کہنیوں کی ہڈیاں بھی شامل ہیں اور ہاتھوں اور کہنیوں کی ہڈیاں تب ہی اپنی جگہ یعنی مفاصل یا جوڑوں کے طرف تب ہی لوٹ سکیں گی جب ارسال کیا جائے یا ہاتھوں کو چھوڑ دیا جائے ورنہ وضع کی صورت میں ہاتھوں اور کہنیوں کی ہڈیاں اپنے جوڑوں کی طرف جوان کی جگہ ہے لوٹ کر نہیں آسکیں گی اور یہ اس صحیح حدیث کے مفاد کے قطعاً خلاف ہے اور ہاتھ باندھنے والوں کے پاس ہاتھوں اور کہنیوں کی ہڈیوں کو کل فقار سے مستثنیٰ کرنے یا اس میں شامل نہ کرنے کے لیے کوئی ایک صحیح دلیل بھی نہیں، پھر آخر بلا دلیل ان ہڈیوں کو کل فقار کی شمولیت وعموم سے خارج کرنے کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟ بالکل نہیں اور ہرگز نہیں!! تو ان کو قطعاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان ہڈیوں کو محض اپنے مسئلے کے ثابت کرنے کے لیے اس عمومی لفظ سے خارج کر دیں، یہ بالکل ناجائز ہے اور جہاں تک ہم نے سمجھا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ کے تراجم ابواب پر غور وتدبر کیا ہے تو ہمیں بھی معلوم ہوا کہ حضرت امام المحدثین رحمہ اللہ نے بھی حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ کی حدیث کے اس ٹکڑے سے یہی سمجھا ہے اور یہی مطلب اخذ کیا ہے جو اوپر ہم عرض کر آئے ہیں۔

چنانچہ حضرت امام والا مقام رحمہ اللہ نے باب صفة الصلوة میں اولاً نماز شروع کرنے کے بعد قیام اول یعنی جس میں قرأت ہوتی ہے اس کی ہیئت بیان کرنے کے لیے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے قیام میں وضع کرنا ہے، یعنی ہاتھوں کو باندھنا ہے لیکن جب رکوع کے بعد والے قیام کا ذکر فرمایا تو اس حدیث کو وہاں ذکر نہیں کیا حالانکہ ان کا طریقہ اکثر یہ بھی ہے کہ ایک ہی حدیث کو مختلف ابواب میں الگ الگ مسائل کے اثبات کے لیے بار بار دہرا کر لاتے ہیں۔ لہٰذا امام عالی مقام رحمہ اللہ کے نزدیک رکوع کے بعد والے قیام میں بھی وضع یا ہاتھ باندھنے ہوتے تو وہ ضرور اس حدیث (حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ) کو اس باب میں رکوع کے بعد والے قیام کی ہیئت بیان کرنے کے لیے ذکر فرماتے لیکن انہوں نے اس حدیث کا ذکر تو نہیں کیا اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا بلکہ اس رکوع بعد والے قیام کی ہیئت بیان کرنے کے لیے حضرت حمید رضی اللہ عنہ کی حدیث کا وہی ٹکڑا ذکر فرمایا جو ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں اور باب کا عنوان یہ رکھا: (باب الطمانينة حين يرفع راسه من الركوع) پھر حضرت حمید رضی اللہ عنہ والی حدیث کا ٹکڑا ذکر کیا۔ یاد رہے کہ یہ ٹکڑا انہوں نے ترجمہ کے بعد متصل رکھا ہے اور اس کے بعد دوسری حدیث موصول ذکر فرمائی ہے اب اس میں صاف اشارہ ہے کہ امام والا مقام رحمہ اللہ کے نزدیک بھی رکوع کے بعد والے قیام میں ارسال ہے یا ہاتھوں کو چھوڑ دینا ہے اور اہل علم کے ہاں یہ بات مسلم ہے کہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کی فقاہت یا علمی فہم و فراست ان کے ابواب کے تراجم میں ہی ہیں، ہر محقق اور منصف مزاج تعصب وحمیت جاہلیہ سے بری۔ امام المحدثین بخاری رحمہ اللہ کے اس صنع سے ان شاء اللہ تعالیٰ وہی سمجھے گا جو ہم نے سمجھا ہے اور یہاں تک تحریر کیا ہے۔

خلاصہ کلام کہ اس حدیث فعلی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ رکوع کے بعد والے قیام میں آپ نے ارسال ہی فرمایا ہے اور ہاتھوں کو چھوڑ دینا ہی نبی کریم ﷺ کی سنت مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کا اتباع کرے۔ اور جو چاہے اپنے مفروض مسلک اور ہوائے نفسانی کا اتباع کرے۔ واللہ اعلم

تیسری دلیل:

امام بخاری رحمہ اللہ اپنی کتاب "جزء رفع الیدین" میں امام حسن بصری رحمہ اللہ جو بڑے جلیل القدر تابعی ہیں ان سے نقل فرماتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے:

((كان اصحاب النبي ﷺ كانما ايديهم المروح يرفعونها اذا ركعو واذا رفعو رؤسهم.))

"کہ نبی کریم ﷺ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نماز میں رکوع کی طرف جانے کے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع الیدین کرتے تھے اور ان کے ہاتھ ایسے دکھائی دیتے کہ گویا پنکھے ہیں جھلائے جا رہے ہیں۔"

اس روایت میں امام حسن بصری رحمہ اللہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے رکوع کے وقت اور اس سے سر اٹھاتے وقت ہاتھوں کو اٹھانے کے فعل کو پنکھے سے تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ تب ہی صحیح ہو سکتی ہے جب رکوع والے قیام میں ارسال ہو کیونکہ اس وقت یہ بجلی کے پنکھے تو نہیں تھے بلکہ وہی پنکھے تھے جو عام طور پر جہاں بجلی نہیں ہوتی اور وہاں ہاتھ کے بنے ہوئے پنکھے چلائے جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے پنکھے کا چلانا اس طرح نہیں ہوتا کہ صرف اس کو اوپر اٹھایا جائے بلکہ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ ایسے پنکھے کو پہلے اوپر اٹھایا جاتا ہے، پھر نیچے گرایا جاتا ہے۔ اس اوپر اور نیچے کی طرف تحریک سے ہوا لگتی ہے اور گرمی سے قدرے آرام ملتا ہے اس طرح بقول امام بصری رحمہ اللہ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھ بھی رفع الیدین کرتے ہوئے پنکھے نظر آئے یہ تب ہی ہوگا جب رکوع کے بعد والے قیام میں بھی ارسال ہو۔ اور امام حسن بصری رحمہ اللہ نے اس روایت میں ان دو مقامات کا ہی ذکر کیا ہے۔ یعنی رکوع سے قبل کا اور رکوع کے بعد کا یعنی ان کا مقصد یہ ہے کہ ان دونوں مقامات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھ رفع الیدین کی وجہ سے پنکھے معلوم ہوتے تھے اب رکوع میں تو بالکل گھٹنوں پر رکھے جاتے ہیں، بعینہٖ اس طرح رکوع کے بعد والے قیام میں بھی یہی تصور فرمائیں۔ یعنی سیدھا ہو کر پہلے ہاتھ اٹھاتے تھے اور پھر نیچے چھوڑ دیتے تھے اور یہی ارسال ہے الحمد للہ اس دلیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ سرور کائنات ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی رکوع کے بعد ارسال ہی کرتے تھے۔ فالحمد لله على ذالك .

چوتھی دلیل:

امام ابن ابی شیبہ اپنی تصنیف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کرتے ہیں:

((عن جرير الضبى قال كان على اذا قام فى الصلوة وضع يمينه على وضع يساره ولا يزال كذالك حتى يركع متى ماركع الا ان يصلح ثوبه او يحك جسد))

''جریر الضبی فرماتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ جب نماز میں کھڑے ہوتے تو اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے اس جوڑ پر رکھے رہتے جو ہتھیلی اور کلائی کے درمیان ہے، پھر اسی حالت میں اگر کپڑے کو ٹھیک کرنا ہوتا یا جسم کے کسی حصہ کو خارش کی وجہ سے رگڑنا ہوتا تو ہاتھ اٹھاتے ورنہ ہاتھ باندھے رہتے حتیٰ کہ رکوع کرتے۔''

اس روایت میں ہاتھ باندھنے کی غایت یا حد رکوع کرنے تک بیان کی گئی ہے۔ جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رکوع کے بعد والے قیام میں وضع نہیں کرتے تھے یا ہاتھ نہیں باندھتے تھے۔ ورنہ اگر رکوع کے بعد والے قیام میں بھی وضع ہوتا تو جریر الضبی (سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روای) اس کی حد صرف رکوع کرنے تک نہ بتاتے بلکہ اس طرح فرماتے کہ یـرکـع اور یسـجد یعنی کھڑے رہنے کے بعد ہاتھ باندھے رہتے حتیٰ کہ رکوع کرتے یا سجدہ کرتے اور اس طرح رکوع کے بعد والے قیام کو بھی یہ ہاتھوں کا باندھنا شامل ہو جاتا لیکن جیسا

کہ آپ نے دیکھا وہ باندھنے کی حد صرف رکوع کرنے تک کی بتاتا ہے اور اس سے ظاہر ہوگیا کہ رکوع کے بعد والے قیام میں وضع نہیں تھا اور یہی مطلوب ہے جو الحمد للہ ثابت ہوگیا۔

پانچویں دلیل:

رکوع کے بعد ارسال کرنا یا ہاتھوں کو چھوڑ دینا عمل متواتر ہے اور امت مسلمہ نبی کریم ﷺ سے لے کر اس دور تک جس میں ہم ہیں اس ارسال پر عمل پیرا رہا ہے کسی ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واضح طور پر عملی نمونہ ہرگز ہرگز پیش نہیں کیا جا سکتا جس سے واضح طور پر معلوم ہو کہ وہ رکوع کے بعد والے قیام میں وضع کرتے تھے۔

اب چند سال ہوئے ہیں کہ بعض علماء نے اس مسئلہ کو اٹھایا ہے ورنہ اس سے قبل سب کے سب کا عمل ارسال پر ہی تھا جیسا کہ مشہور محدث علامہ وحید الزمان جنہوں نے صحیح بخاری صحیح مسلم وغیرہما کتب حدیث کے تراجم کیے ہیں، وہ کتاب نزل الابرار من فقہ النبی المختار میں جلد ۱ صفحہ ۷۹ پر تحریر فرماتے ہیں:

((اذا لم ينقل فيه الوضع عن رسول الله ﷺ ولا عن اصحابه راه الناس في كل يوم خمس مرات ومن المحال ان الوضع فيه ولا يحكونه وقد رأيت مشائخنا من اهل الحديث والشوافع والحنابلة كلهم يرسلون ايديهم في هذا القيام وما رأيت احدا منهم يضع يمينه على شماله فيه.))

''جب کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس رکوع کے بعد والے قیام میں ہاتھوں کو باندھنا نقل نہیں کیا گیا، حالانکہ لوگوں نے آپ کو پانچ مرتبہ نماز پڑھتے دیکھا اور یہ محال ہے کہ اس اس قیام میں وضع مسنون بھی ہو۔ پھر بھی اس کو نقل نہیں کیا گیا ہو اور بے شک میں نے اپنے اہلحدیث شافعی اور حنبلی اساتذہ کو دیکھا کہ وہ سب کے سب اس قیام میں ہاتھوں کو چھوڑتے تھے ان میں سے ایک کو بھی میں نے اس قیام میں ہاتھ باندھتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

پھر وہی علامہ وحید الزمان اسی کتاب میں اسی صفحہ پر حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

((فالذي يقول بالوضع فيه كانه يخالف الاجماع ويحدث في الدين.))

''پھر جو شخص اس قیام میں ہاتھوں کو باندھنے کا قائل ہے وہ گویا امت کے اجماع کی مخالفت کرتا ہے اور دین میں احداث کرتا ہے، یعنی بدعت کا ارتکاب کرتا ہے۔''

اسی طرح علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ جو عالم عرب کے مشہور محقق وجید عالم ہیں وہ اپنی کتاب صفۃ صلوٰۃ النبی ﷺ کے صفحہ ۱۴۰ کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں:

((ولو كان له اصل لنقل الينا ولو من طريق واحد يويده انّ احدا من ائمة الحديث فيما اعلم ولست اشك في ان وضع اليدين على الصدر في هذا

القيام بدعة ضلالة .))

''اگر اس قیام میں ہاتھ باندھنے کا اصل (دلیل) ہوتا تو ہماری طرف نقل کیا جاتا اگر چہ ایک ہی طریقہ سے کسی ایک نے بھی یہ کام نہیں کیا اور جہاں تک میں جانتا ہوں حدیث کے ائمہ میں سے بھی کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا اور مجھے اس بات میں شک نہیں ہے کہ سینہ پر اس قیام میں ہاتھوں کو باندھنا بدعت گمراہی ہے۔''

اسی طرح علامہ عبدالقادر حصاری رحمہ اللہ اپنے رسالہ تائید مابعد الرکوع میں فرماتے ہیں، رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا کسی دلیل اور تعامل سلف وخلف سے ثابت نہیں ہے، اس لیے اس بدعت سے بچنا چاہیے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان نقول سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کا تعامل سلف سے لے کر خلف تک تواتر کے ساتھ رکوع کے بعد والے قیام میں ہاتھوں کا ارسال یا چھوڑ نا ہی ہے۔لہٰذا اس عمل تواتر کے خلاف کرنا بدعت کا اختراع ہے۔واللہ اعلم

چھٹی دلیل:

نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((صلوا كما رايتموني اصلي .)) (صحيح بخاری)

''نماز اسی طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھ رہے ہو۔''

نیز اس کے احادیث صحیحہ میں یہ وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ رکوع کے بعد والے قیام میں سیدھا ہو کر اتنا وقت کھڑے رہتے کہ مقتدیوں کو یہ خیال گذرتا کہ شاید آپ کو سجدہ کی طرف جانے کے خیال کا نسیان ہو گیا، اب آپ خود بھی سوچیں کہ اگر آج کبھی کوئی امام اس طرح پڑھا رہا ہو تو بعد میں اگر کوئی مقتدی آئے تو ہاتھ باندھنے کے صورت میں آخر کس طرح معلوم کرے کہ یہ کونسا قیام ہے آیا یہ پہلا قیام ہے، اس لیے اس میں ثنا پڑھے اور سورۂ فاتحہ بھی پڑھے یا یہ مابعد الرکوع والا قیام ہے، لہٰذا اس میں ربنا ولك الحمد وغیرہ کہے لیکن وضع کی صورت میں اس کا پتہ قطعاً نہیں چل سکتا اب اگر کوئی مقتدی آئے اور دیکھے کہ امام ہاتھ باندھے کھڑا ہے، خصوصاً اس صورت میں کہ امام ابھی ابھی ایک رکعت (مثلاً) پڑھ کر کھڑا ہوا ہے۔

اس لیے مقتدی نے یہ سمجھا کہ امام رکوع سے سیدھے ہوئے ہیں، لہٰذا اس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی کیونکہ اس نے یہی سمجھا کہ امام رکوع سے سیدھا ہوا ہے اور اس طرح اس کی یہ رکعت نہیں ہوئی کیونکہ سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی یا پھر امام تو رکوع کے بعد سیدھا ہوا تھا لیکن مسبوق مقتدی نے اس کو پہلا قیام قرأۃ والا تصور کر لیا اس لیے اس نے ثنا اور سورۂ فاتحہ پڑھنی شروع کی تو سنت اور نبی کریم ﷺ کے خلاف بات ہوئی کیونکہ احادیث صحیحہ میں مقتدیوں کو امر فرمایا گیا ہے کہ جب امام سمع الله لمن حمده کہے تو تم ربنا ولك الحمد الخ کہو، اس نے اس امر کے

خلاف سورۃ فاتحہ پڑھ لی اور یہ امر کے مخالفت کا محذور لازم کیوں آیا اس لیے کہ امام نے دونوں قیاموں میں ہاتھوں کو باندھا اور نہ اگر دونوں قیاموں میں وضع وارسال کا فرق ہوتا تو یہ محذور کبھی اور قطعاً لازم نہ آ تا مـا لا یخفی اور ہمیں یقین ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ مابعد الرکوع والے قیام میں بھی وضع کے عامل ہوتے تو آپ کے عہد مبارک میں بھی یہ مشکل ضرورت پیش آتی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کے لیے ضرور بارگاہ رسالت کی طرف رجوع فرماتے اور وہاں سے اس مشکل کا کوئی نہ کوئی حل حاصل کر لیتے۔ لیکن جب ایسی کوئی مشکل پیش ہی نہیں آئی اور نہ ہی اس کا حل منقول ہوا تو لامحالہ یہ ہی اس کا منطقی نتیجہ ہوگا کہ ان دونوں قیاموں میں وضع وارسال کا فرق تھا، اس لیے یہ اشکال پیش ہی نہ آیا، لہٰذا اس کے حل کی بھی ضرورت نہ رہی اور نہ وضع پر عمل کرنے والے اس اشکال کا کوئی صحیح حل پیش کر سکے ہیں اور نہ کر سکیں گے۔ ہاں کسی صاحب نے اگر کوئی حل پیش فرمایا تو ایسا کہ جو بدعت کے حدود میں داخل ہے اور نبی کریم ﷺ کے واضح امر وارشادات کے بالکل مخالف ہے۔ لہٰذا یہ حل اشکال تو نہ ہوا، البتہ اس کو آپ کے نفس کا اختراع اور احداث فی الدین کہا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

ساتویں دلیل:

ان دونوں قیاموں کے احکام میں فرق ہے مثلاً: پہلے قیام میں قرأت فرض ہے اور سورۂ فاتحہ لازمی طور پر پڑھنی ہے لیکن مابعد الرکوع والے قیام میں قرأۃ نہیں ہے بلکہ سمع الله لمن حمده ربنا ولك الحمد وغیرہ کے پڑھنے کا حکم ہے۔ اسی طرح پہلے قیام میں سورۂ فاتحہ پڑھنے سے مقتدی رکعت کو پائے گا لیکن مابعد الرکوع والے قیام میں سورۂ فاتحہ پڑھنی ہی نہیں ہے اور اگر کسی نے پڑھ لیا تو وہ رکعت کو پا لینے والا نہ ہوگا اس قسم کے احکام میں امتیاز کی وجہ سے یہی راجح اور اولیٰ، قوی اور حق ہے کہ ان دونوں قیاموں کی ہیئت میں بھی امتیاز ہونا چاہیے۔ کمالا یخفیٰ علی اولی الالباب واصحاب العلم.

اسی طرح اور بھی دلائل ہیں جو ہمارے دوست مولانا اللہ بخش مرحوم کے رسالہ تکمیل الخشوع عربی میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں اور ان کی اردو کتاب نـصـرة الـخليل (جو ابھی تک مخطوط ہے) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن حق کے طالب اور تعصب سے بری لوگوں کے لیے یہ سات دلائل جو ہم تحریر کر آئے ہیں، ان شاء اللہ کافی وشافی ہوں گے۔ لیکن جو مرغی کی ایک ٹانگ کو دہراتا رہے گا اس کے لیے تو بیسیوں دلائل بھی ناکافی ہوں گے۔ ایسے لوگوں سے اللہ ہی سمجھے۔

اب ہم ان دلائل کا ذکر کرتے ہیں جو وضع پر عمل کرنے والے پیش کرتے ہیں اور پھر ان کا اللہ کی توفیق سے جواب عرض رکھیں گے۔

ناظرین کرام! بغور وانصاف وتدبر تام کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں معلوم ہونا چاہیے کہ رکوع کے بعد والے قیام میں ہاتھ باندھنے والوں کے پاس سوائے دو حدیثوں کے اور کوئی دلیل نہیں ہے ایک حدیث نسائی شریف میں

حضرت وائل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے دوسری امام احمد کے مسند میں ہے۔ بس صرف یہی دو حدیثیں ہیں جن پر ان کا زور ہے ان دونوں روایتوں میں سے بھی سب سے زیادہ اعتماد اول روایت پر ہے، لہٰذا اولاً ہم اسی حدیث پر ذیل میں کلام کررہے ہیں جس سے قارئین کرام ان شاء اللہ العزیز اندازہ لگائیں گے کہ اس حدیث میں ان کے مسلک کی دلیل ہے ہی نہیں اور نہ ہی صحیح طور پر اس حدیث سے ان کے مفروضہ کا اثبات ہی ہوسکتا ہے۔

حدیث اول: ((عن علقمة بن وائل عن ابيه قال رأيت رسول الله ﷺ اذا كان قائما فى الصلوٰة قبض بيمينه على شماله .)) (سنن نسائی)

''حضرت علقمہ اپنے والد سیدنا وائل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب بھی آپ نماز میں کھڑے ہوتے تو اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑتے تھے۔''

اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ جب بھی نماز میں کھڑے ہوتے، یعنی قیام میں ہوتے تو اپنے ہاتھ باندھتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے ہر قیام میں ہاتھ باندھنے چاہئیں، کیونکہ مابعد الرکوع والا رکن بھی قیام ہی ہے اور اس کو بھی کھڑا ہونا کہا جاتا ہے نہ کہ بیٹھنا نہ سونا جب یہ ثابت ہوا کہ وہ کھڑا ہونا، یعنی قیام ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ فرمان کہ جب بھی کھڑے ہوتے تو وضع کرتے۔

لہٰذا مابعد الرکوع والے قیام کو بھی شامل ہوگا، لہٰذا اس میں بھی وضع ہونا چاہیے نہ کہ ارسال۔ یہ ہے ان کے اس دلیل کا خلاصہ اب آپ اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔ اس حدیث میں پہلے لفظ ''قـائـمـا'' آتا ہے اور اس سے یہ حضرات عام قیام مراد لیتے ہیں اور اس لیے مابعد الرکوع والے قیام کو بھی اس میں شامل سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں بلکہ اس قیام سے صرف قیام اول مراد ہے جس میں قرأت کی جاتی ہے نہ کہ مابعد الرکوع والا قیام اور ہمارے اس دعویٰ کے یہ دلائل ہیں۔

ا.....قیام اور قائماً وغیرہما صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وغیرہم کے یہاں پہلے قیام کے لیے اتنا مروج اور معروف ومشہور تھا کہ مطلق قیام کہہ کر اس سے پہلا قیام ہی مراد لیتے تھے، مثلاً صحیح بخاری کی حدیث جس میں رسول اللہ ﷺ کا نماز میں اطمینان کے ساتھ ارکان الصلوٰۃ کو ادا کرنے کا بیان ہے اس میں یہ الفاظ ہیں ماخلا القيام والقعود یعنی قیام اور بیٹھنے کے سوائے اور سب ارکان قریباً برابر ہوتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ اس قیام سے مراد پہلا قیام ہی ہے اور قطعاً مابعد الرکوع والا قیام مراد نہیں۔ دیکھئے قیام یہاں مطلق ہے اور عام رکھا گیا ہے لیکن مراد متفق طور پر پہلا قیام ہی ہے اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں یہ لفظ (قیام) پہلے قیام میں مروج اور عام طور پر مشہور نہ ہوتا تو صحابی رضی اللہ عنہ اس کو اس طرح مطلق نہ چھوڑتے بلکہ یہ فرماتے کہ:

((ما خلا القيام الذى قبل الركوع يا ماخلا القيام الذى فيه القرأة))

''یعنی اس قیام کے سوائے جو رکوع سے پہلے ہے یا اس قیام کے سوائے جس میں قرأت ہے۔''

لیکن صحابی رضی اللہ عنہ نے اس طرح کی تشریح نہیں فرمائی بلکہ مطلق چھوڑ دیا اور اس سے مراد پہلا قیام لیا جیسا کہ ظاہر ہے۔ اس طرح حضرت امام بخاری رحمہ اللہ اپنی کتاب ''جزء القرأۃ'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل ہے کہ:

((عن ابی هريرة رضي الله عنه قال لا يجزيك الا ان تدرك الامام قائما.))

(جزء القرأة ص ٣٥)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رکعت کے ادراک کے لیے تمہیں ضروری ہے کہ امام کو کھڑے ہونے کی حالت میں (قیام میں) پالو۔''

یعنی اگر قیام کی حالت میں تم نہ ملے تو تمہاری رکعت نہ ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ اس قیام سے مراد بھی عندالطرفین پہلا ہی قیام مراد ہے اگر بعد والا قومہ بھی قیام ہے تو رکوع کے بعد ادراک رکعت درست ہے۔ مقصد یہ تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ قائماً (صفت کا صیغہ ہے) یا قیام پہلے ہی قیام میں مروج ومشہور تھا۔ اس لیے اس لفظ کو اسی معنی ہی میں استعمال اور اطلاق کرتے رہتے تھے۔ لیکن ایسی کوئی دلیل ہاتھوں کے باندھنے والوں نے پیش نہیں فرمائی جس میں اس طرح قیام کو یا قائماً کو مطلق چھوڑا گیا ہو۔ اور اسی سے مراد دوسرا قیام یعنی مابعد الرکوع والا قیام لیا ہو جس طرح پہلے قیام پر اس لفظ کا اطلاق اور اس معنی میں اس کا استعمال مروج ومعروف تھا۔ کیا یہ اس پر دلیل نہیں ہے کہ اس قیام مطلق (جو سنن نسائی کی حدیث میں ہے) سے بھی مراد پہلا قیام ہے آخر عرف بھی ایک لفظ کی معنی کے متعین کرنے میں معاون ہوتا ہے گو اصل لغت میں وہ لفظ دوسرے کسی فرد کو بھی شامل ہوتا ہے مثلاً عربی زبان میں دابة کا لفظ ہر اس چیز یا جانور پر بولا جاتا ہے جو زمین پر چلتا ہے لیکن عرف میں یہ عموماً سواری والے جانور پر اطلاق کیا جاتا ہے اگر کوئی کہے اشتر لی دابة میرے لیے دابہ خرید لو۔ تو یہاں اصل لغوی معنی کو مد نظر رکھتے ہوئے کوئی مرغی یا بکری یا کتا وغیرہ خرید لائے اور اپنے خیال میں سمجھے کہ میں نے امر کو پورا کر دیا کیونکہ اصل لغت کے اعتبار سے تو کتا وغیرہ سب دابة میں داخل ہیں اور بولنے والے نے بھی اس کو مطلق رکھا ہے لیکن یہ صحیح نہ ہوگا بلکہ یہاں عرف کی وجہ سے دابة سے مراد گھوڑا، گدھا، بھینس، گائے اور اس قسم کا کوئی اور جانور جو سواری یا بار برداری کے کام آتا ہو مراد۔ بعینہ اسی طرح گو قیام اصل لغت کے لحاظ سے تو عام ہے اور قبل الرکوع و مابعد الرکوع دونوں قیاموں کو شامل ہے لیکن جب عرف صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین میں یہی ہے کہ اس سے مراد اول قیام ہے تو زیر بحث حدیث میں بھی قائماً سے مراد قیام کی وہ حالت مراد ہے جو قیام اول، یعنی قرأت والے قیام میں ہے، تعصب کو چھوڑ کر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں تو بات واضح ہو جاتی ہے۔

ب: حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی یہ زیر بحث حدیث مجمل ومختصر ہے اور جو مفصل حدیث علقمہ کے واسطے سے حضرت

وائل رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم وغیرہ میں مروی ہے اس میں صاف بیان ہے یہ وضع یا قبض قیام اول میں ہی ہے اور اس مفصل حدیث میں اس اول قیام میں وضع کا ذکر تو فرمایا لیکن قیام بعد الرکوع میں صرف رفع الیدین کا تو ذکر کیا اور وضع کا بالکل نہ کیا جس سے ظاہر ہے کہ اس مختصر و مجمل حدیث میں بھی صحابی رضی اللہ عنہ کی مراد قائماً سے پہلے قیام کی ہی حالت ہے ورنہ اگر اس سے دونوں قیام ہوتے تو مفصل حدیث میں بھی یا مابعد الرکوع والے قیام کے لیے بھی رفع الیدین کے بعد ہاتھوں کے باندھنے کا صراحت کے ساتھ ذکر فرماتے صرف قیام اول پر اکتفاء نہ فرماتے جب صحابی رضی اللہ عنہ جو اس زیر بحث حدیث کا راوی ہے۔ وہی اس سے قیام اول مراد لیتا ہے اس لیے مفصل حدیث میں مابعد الرکوع والے قیام کا ذکر نہیں کرتا تو پھر ہمیں کس طرح جائز ہوسکتا ہے کہ ہم اس کو عموم پر رکھ کر دونوں قیاموں کو اس میں شامل کردیں کیونکہ یہاں خود نبی کریم ﷺ کے یہ الفاظ نہیں ہیں، یعنی یہ نہیں کہ:

((قال رسول الله ﷺ اذا كنت قائما فى الصلوٰة اقبض شمالى يمينى .))

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو ہاتھوں کو باندھتا ہوں۔''

یعنی اس طرح کے الفاظ ہوتے ہیں تو صحابی رضی اللہ عنہ کا فہم یا فعل حجت نہ رہتا کیونکہ اس وقت یہ ان کا اپنا فہم ہوتا اور ان کا اپنا فہم دوسروں پر حجت نہ ہوتا لیکن یہاں وہ نبی کریم ﷺ کا قول نہیں بتاتا بلکہ آپ ﷺ کا فعل مبارک جو اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کو اپنے الفاظ میں نقل فرما دیا، لہٰذا اگر اسی گراں قدر صحابی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کو دوسرے قیام (مابعد الرکوع والے قیام) میں بھی وضع کرتے دیکھا تھا تو مفصل حدیث میں بھی لازمی طور پر اس کو ذکر کرتا، آخر اس کے بیان کو ترک کیوں فرمایا؟ وضع کرنے والے حضرات کے مطابق گویا عمومی طور پر اس لفظ (قائماً) قائماً میں دونوں قیاموں کو سمو دیا لیکن تفسیر کے موقع پر دوسرے قیام کو بالکل ترک کر دیا ہے اگر انہوں نے یہ کام عمومی لفظ سے لیا ہوتا تو مفصل حدیث میں بھی وہی عموم کا حامل لفظ لاتے، لیکن ایسا نہیں کیا بلکہ تفصیل کے وقت صرف قیام اول کا ذکر کیا دوسرے کا نہ کیا نہ اس کو اس قیام میں شامل ہی کیا اس سے ظاہر ہے کہ اس گرامی قدر صحابی رضی اللہ عنہ نے اس حکم (وضع) کو اپنی سمجھ سے پہلے قیام کے ساتھ مختص ہی سمجھا بلکہ اسی طرح نبی کریم ﷺ کہ آپ صرف پہلے ہی قیام میں وضع کرتے تھے اور قیام ثانی میں نہ وضع کرتے دیکھا اور نہ اس کا ذکر کیا۔

اگر کوئی سوال کرے کہ جس طرح صحابی رضی اللہ عنہ نے قیام ثانی میں وضع نہیں کیا اسی طرح ارسال کا بھی ذکر نہیں کیا، پھر اس سے ارسال کس طرح ثابت ہوا۔ تو اس کے لیے یہ گذارش ہے کہ انسان کی اصل ہیئت سے اس میں ارسال ہی ہے، یعنی اگر آدمی کہیں کھڑا ہوتا ہے تو ہاتھوں کو چھوڑ کر ہی کھڑا ہوتا ہے کیونکہ قدرت نے اس کو اسی طرح ہی بنایا ہے۔ یعنی جسم کے اعضاء کی یہی حالت ہے کہ جب کبھی آدمی کھڑا ہو تو ہاتھ نیچے جائیں گے ہاں (وضع باندھنے) کے لیے انسان کو الگ عمل کرنا پڑے گا۔ یعنی اس اصل اور فطری حالت سے اٹھا کر پھر وضع کر دے گا۔

لہٰذا جہاں یہ عمل ہوگا اس کا بیان ہوگا اور جہاں یہ عمل کرنا نہ ہوگا وہاں اس کا ترک، یعنی عدم ذکر ہی کافی ہے، یعنی وہاں جسم کے اعضاء اپنی فطری ہیئت پر رہیں گے۔

لہٰذا اس گرامی قدر صحابی رضی اللہ عنہ کو دوسرے قیام میں وضع یا ارسال کے ذکر کی ضرورت ہی نہ رہی۔ یعنی اس دوسرے قیام میں اس مصلی (نماز پڑھنے والے) کے اعضاء اصلی ہیئت پر رہیں گے، لہٰذا دوسرے قیام میں عدم ذکر خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں وضع نہیں ارسال ہے۔ واللہ اعلم

ج: حضرت امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث میں ''قائما'' کے لفظ کو صرف پہلے قیام کے لیے ہی سمجھا ہے دوسرے قیام کو اس میں شامل نہیں سمجھا، اس لیے اپنی سنن میں زیر بحث حدیث کو باب صفۃ الصلوٰۃ میں صرف پہلے قیام کی ہیئت بیان کرنے کے لیے لائے ہیں اگر وہ اس لفظ کو دونوں قیاموں پر دلالت کرنے والا سمجھتے تو رکوع کے بعد والے قیام کی ہیئت بیان کرتے وقت دوبارہ اس حدیث کو لاتے جیسا کہ ان کا طریقہ ہے کہ وہ ایک ہی حدیث کو مختلف مسائل کے بیان کے لیے یا ارکان الصلوٰۃ کے ہیئات بیان کرنے کے لیے بار بار لوٹا کر مختلف ابواب میں ذکر فرماتے ہیں ان کے اس طریقہ پر ان کی ''مجتبیٰ'' شاہد عدل ہے۔ جب امام نسائی جو زیر بحث حدیث کو اپنی سنن میں لائے ہیں وہ بھی اس سے پہلا قیام ہی سمجھتے ہیں تو ان کا فہم ہما شما کے فہم سے بہر حال مقدم ہے اور اس کے فہم پر کافی دلائل بھی موجود ہیں۔ کچھ تو مذکور ہوئے اور کچھ ابھی ذکر کیے جا رہے ہیں۔ واللہ اعلم

دوسری دلیل:

اس بات پر کہ ''قائما'' سے مراد قیام اول ہی ہے یہ ہے کہ یہ حدیث اگر اپنے عموم پر رکھی جائے تو یہ صحیح بخاری کی حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ والی حدیث (یعنی دلائل ارسال میں مذکور حدیث کے معارض ہوگی کیونکہ حدیث حضرت حمید رضی اللہ عنہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رکوع کے بعد والے قیام میں نبی کریم ﷺ ارسال فرماتے تھے جیسا کہ گذر چکا اور ظاہر ہے کہ تعارض کی صورت میں صحیح بخاری کی حدیث بہر صورت مقدم ہوگی لہٰذا بالکل ترک سے اولیٰ بھی ہے کہ ان دونوں کو جمع کیا جائے۔ یعنی نسائی والی حدیث میں ''قائما'' سے پہلے قیام والی حدیث مراد لی جائے۔ اس طرح دونوں میں سے مخالف باقی نہ رہے گا۔

تیسری دلیل:

یہ ہے کہ یہ حدیث اگر اپنے عموم پر ہوگی تو وہ اس حدیث قولی کے مخالف ہو جاتی ہے جس میں مسیء الصلوٰۃ کو آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جب رکوع سے سر اٹھاؤ تو کھڑے رہو اپنی پیٹھ کو سیدھا رکھو حتیٰ کہ تمہاری سب ہڈیاں اپنے اپنے جوڑوں کی طرف لوٹ آئیں۔ اور اس سے رکوع کے بعد ارسال ثابت ہوتا ہے۔ یعنی اس قولی حدیث کی اقتضاء تو یہ ہے کہ رکوع کے بعد ارسال کیا جائے اور زیر بحث حدیث (جو فعلی ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ علی زعم الواضعین کہ اس میں وضع کرنا ہے اور یہ مسلم ہے کہ قول و فعل میں تعارض کے وقت اگر جمع نہ ہو سکے تو قول ہی مقدم

ہوتا ہے۔ کما لا یخفی علی اصحاب العلم.

لہٰذا یا تو اس فعلی حدیث کے مقابلہ میں چھوڑنا پڑے گا یا جمع کرنا ہوگا اس طرح قولی حدیث میں چونکہ یہ وضاحت ہے کہ یہ امر خصوصی طور پر رکوع کے بعد والے قیام کے بارے میں وارد ہے اور سنن نسائی والی حدیث میں جو قائماً لفظ ہے وہ مطلق ہے، اس لیے اس سے مراد صرف پہلا قیام مراد ہوگا کیونکہ دوسرے قیام کی ہیئت تو خود قولی حدیث سے معلوم ہوگئی اور یہی طریقہ بہتر و مسلم ہے کیونکہ اس طرح کسی حدیث کو ترک کرنا لازم نہیں آئے گا۔ واللہ اعلم

چوتھی دلیل:

یہ ہے کہ اس حدیث کو اگر عموم پر رکھا جائے گا تو یہ اس صحیح حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے معارض ومخالف ہوگی جو صحیح بخاری میں موجود ہے۔

((عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال رأیت رسول الله ﷺ اذا قام فی الصلوٰة رفع یدیه.))

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب بھی نماز میں کھڑے ہوتے یا جب بھی قیام کرتے تو ہاتھ مبارک اٹھاتے تھے۔''

اس دلیل کا مطلب یہ ہے کہ رکوع بعد والے قیام میں وضع کرنے والے حضرات فرماتے ہیں کہ حدیث میں اذا کا لفظ وارد ہے جس کی معنی جب بھی اور "قام" یا "کان قائما" کے لفظ عمومی معنی پر وارد ہیں، لہٰذا جب بھی یا جب بھی قیام ہوگا تو اس میں وضع یا قبض بھی ہوگا، یعنی ان کے نزدیک اس قسم کی ترکیب یعنی اذا کان قائما یا اذا قام (مثلاً) ہمیشہ عموم پر دلالت کرتا ہے۔

حالانکہ اس قسم کی تراکیب کی عموم پر ہمیشہ دلالت اولاً تو مسلم نہیں ہے جیسا کہ قواعد عربیہ ونحو کی کتب پر تحقیق کی نظر رکھنے والے اور ان علوم کی مزاولت رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں چونکہ یہ مسائل اہل علم سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کا ذکر یہاں نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ کتاب متوسط درجہ کے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے تحریر کی جارہی ہے، لہٰذا ایسے مسائل کا تحریر کرنا بے فائدہ ہوگا جن کو وہ سمجھ بھی نہ سکیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اولاً تو یہ مسلم نہیں کہ اس قسم کی ترکیب ہمیشہ عموم وشرط کے لیے آئی ہے بلکہ جس طرح عموم وشروط کے لیے آتی ہے اس طرح کبھی اس معنی میں نہیں بھی آتی، لہٰذا جو ترکیب اس عموم پر نص نہ ہو اس کو بغیر برہان کے بنیاد بنا کر محض اپنی مرضی سے ہر جگہ اور ہر وقت عموم پر محمول کرنا صحیح نہ ہوگا لیکن اگر ہم تسلیم کرلیں کہ اس قسم کی ترکیب ہر جگہ اور ہمیشہ عموم کے لیے آتی ہے تو زیر بحث حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی صحیح حدیث مخالف اور معارض ہو جائے گی کیونکہ بموجب واضعین حضرات کے مسلک اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ نبی

کریم ﷺ جب بھی نماز کھڑے ہوتے تو اپنے ہاتھ اٹھاتے۔ اب یہ الفاظ اور یہ ترکیب اپنے عمومی معنی کے لحاظ سے ہر قیام کو شامل ہے۔ پہلے قیام کو بھی دوسرے، تیسرے، چوتھے اور مابعد الرکوع کے قیام کو بھی شامل ہے، یعنی سب قیاموں میں ہاتھوں کو اٹھانا سنت ہے لیکن پہلے قیام کے متعلق اور احادیث صحیحہ میں صراحتاً اور وضاحتاً کے ساتھ بیان آگیا ہے کہ اس قیام میں تو آپ ہاتھ اٹھا کر پھر سینہ پر ہاتھ باندھ لیتے تھے لیکن مابعد الرکوع والے قیام کے لیے ایسی صراحت وارد نہیں ہے۔

لہٰذا واضعین کو چاہیے کہ اس صحیح بخاری والی حدیث کو مقدم رکھتے ہوئے اس کے عموم کو بحال رکھ کر (جیسا کہ ان کا مسلک ہے) اس پر عامل ہوں، یعنی مابعد الرکوع والے قیام میں بھی ہاتھ اٹھا کر ان کو اٹھائے کھڑے رہیں یہاں تک کہ سجدہ کے لیے نیچے جائیں کیونکہ جب قیام اول کا حکم احادیث صحیحہ کے مطابق مستثنیٰ ہوگیا یعنی ہاتھ اٹھانے کے بعد ان کو باندھنا چاہیے تو قیام بعد الرکوع میں چونکہ نہ تو وضع کی صراحت ہے نہ ارسال کی، لہٰذا ان کو اٹھانے کے بعد ان کو اسی حالت میں اٹھائے رکھنا چاہیے حتیٰ کہ سجدہ کے لیے نیچے ہونا پڑے۔ اس لیے کہ یہی اس صحیح حدیث کی اقتضاء ہے جو اس ترکیب کو ہر جگہ اور ہمیشہ عموم پر رکھنے سے لازم آتی ہے۔

اب واضعین حضرات یا تو صحیح بخاری کی اس حدیث کو مقدم رکھ کر مابعد الرکوع قیام میں ہاتھ اٹھائے رکھیں یا جس طرح پہلے قیام کے لیے دوسری نص اور واضح حدیث آچکی ہے کہ اس میں رفع الیدین کے بعد وضع ہے ایسی کوئی صحیح حدیث سے واضح دلیل لائیں جس میں یہ دلالت واضحہ اور صریحہ ہو کر آپ نے اس میں بھی وضع کیا ہے، تو پھر یہ قیام بھی اس عموم سے خارج و مستثنیٰ ہو جائے گا لیکن ایسی کوئی صحیح وصریح اور واضح دلیل آج تک وہ نہ پیش کر سکے ہیں۔

اگر اس حدیث صحیح کے عموم کو اس زیر بحث حدیث سے خاص کریں گے تو یہ قواعد علمیہ کے لحاظ سے قطعاً غلط طریقہ کار ہوگا کیونکہ یہ تو ان کی دلیل ہے جس پر بحث چل رہی ہے اور اس سے دوسرے (مابعد الرکوع قیام) کے لیے بھی وضع کا اثبات ابھی تک محتاج ثبوت و برہان ہے، پھر جو چیز ابھی تک ثابت ہی نہیں ہوئی اس کو دلیل بنا کر کس طرح صحیح بخاری والی حدیث کو خاص کیا جائے گا۔ یا کس طرح اس میں تخصیص کی جائے گی؟

بہر حال یہ ترکیب اگر ہر جگہ علی الدوام عموم پر دلیل ہے تو صحیح بخاری کی مذکور حدیث ان پر وارد ہوتی ہے۔ انہیں اس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے (کیونکہ بخاری کی احادیث دوسرے کتب کی احادیث پر مقدم ہیں) رکوع کے بعد والے قیام میں ہمیشہ ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جانا چاہیے تا کہ سجدہ کے لیے جھکیں۔

دوسری چیز اس صحیح حدیث سے ان لوگوں پر وارد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس صحیح بلکہ اصح حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ ہر قیام میں یعنی جب بھی قیام کرتے تو ہاتھ اٹھاتے اب اس عموم کا یہ تقاضا ہے کہ دوسری رکعت میں چوتھی رکعت میں وتر کے پانچویں چھٹی ساتویں آٹھویں اور نویں رکعت میں بھی ہاتھ اٹھائیں بلکہ جب بھی نماز میں

سجدہ تلاوت کر کے اٹھیں تو گو وہ پہلی رکعت ہی ہو (جس طرح یوم الجمعۃ میں ہوتا ہے) تب بھی سجدہ کے بعد اٹھ کر ہاتھ اٹھا کر پھر باندھنے چاہئیں۔

حالانکہ ان حضرات کا اس پر بھی عمل نہیں ہے گو کوئی ایسی دلیل بھی پیش نہیں کرتے جس سے ان مواضع میں ہاتھ اٹھانے کی نفی معلوم ہوتی ہو۔ نہ کوئی ایسی دلیل ہے۔ حدیث میں تو صرف رکوع کی طرف جانے کے وقت اور رکوع سے سر اٹھانے کے وقت ابتدا نماز میں شروع کرتے وقت اور دوسری رکعت پوری کر کے تیسری رکعت کی طرف اٹھ کر رفع الیدین نہ کیا کرو اور نہ ہی یہ بیان آیا کہ نبی کریم ﷺ ان مواضع میں رفع الیدین نہیں کیا کرتے تھے، جب ایسی کوئی دلیل قولی یا فعلی حدیث میں وارد نہیں ہے تو آخر ان لوگوں کو کیا حق ہے کہ عدم ذکر کو عدم وجود پر دلیل قرار دے کر اس عموم کو خاص کر لیتے ہیں۔ اور ان مواضع میں رفع الیدین نہیں کرتے حالانکہ ان کے طرز استدلال پر یہی لازم اور واجب ہے کہ وہ یا تو ان سب مواضع میں بھی رفع الیدین کریں یا ان کو خارج کرنے کے لیے کوئی واضح قولی یا فعلی دلیل پیش کریں ورنہ ایسی ترتیب کی ہر جگہ اور عموم پر دلالت سے دست بردار ہو جائیں اور اگر اس ترتیب سے ایسی دلالت والی بات سے ہمیشہ دست بردار ہو جائیں گے تو پھر جو حدیث اپنے مسلک کے اثبات کے لیے پیش کرتے ہیں اس میں بھی عموم پر دلالت قطعی نہ رہے گی۔ اور انہیں اس بات کے اثبات کے لیے کہ اس جگہ، یعنی اس حدیث میں اس ترکیب دلالت عموم پر ہے اس کے لیے الگ دلیل پیش کرنا ہوگا، صرف اس ترکیب پر اکتفا درست نہ ہوگا لیکن کوئی دلیل ابھی تک پیش نہیں کی گئی ہے اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث کو حضرت امام بخاری رحمہ اللہ صرف ابتدائی قیام میں ہاتھ اٹھانے کے لیے لائے ہیں یعنی امام والا مقام نے اس حدیث یعنی "اذا قام فی الصلوٰۃ رفع یدیه" صرف ابتدائی قیام کے لیے سمجھا ہے۔ لہٰذا یہ اپنے عموم پر نہ رہی تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہوگی کیونکہ جس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے "اذا قام" الخ کو ابتدائی قیام کے لیے سمجھا ہے، بعینہٖ ہی طرح آپ کی پیش کردہ حدیث "اذا کان قائما فی الصلوٰۃ" الخ کو امام نسائی نے اپنی سنن میں صرف پہلے قیام، یعنی جس میں قرأت ہوتی ہے کے لیے ہی سمجھا ہے اور اسی کی ہیئت بیان کرنے کے لیے یہ حدیث لائے ہیں، پھر آپ صاحبان کیوں یہاں امام نسائی کے فہم کی قدر نہیں کرتے، بلکہ ان کے فہم و تحقیق کو پس پست ڈالتے ہوئے اس کو عموم پر رکھتے ہوئے اور اس میں علی رغم فهم النسائی دونوں قیاموں کو شامل سمجھتے ہو۔ کیا یہ انصاف ہے؟ اگر امام نسائی رحمہ اللہ کے فہم و تحقیق کو نہ لینا آپ اپنا حق سمجھتے ہیں تو دوسروں کو یہ حق مرحمت کرنے کے لیے کیوں آپ تیار نہیں؟ لہٰذا کوئی ایمان والا مقام امام بخاری رحمہ اللہ کی تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے اس "اذا قام" الخ سے عمومی معنی لے لیے تو اس میں کونسی علمی یا فنی خرابی ہے اور یہ معنی آپ کے مسلک کو مدنظر رکھتے ہوئے کس طرح غلط ہے اس کی وجہ تفریق بیان ضرور کریں ورنہ اس ہٹ دھرمی سے باز آ جائیں اور انصاف عدل کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیں بموجب فرمان "واجب الاذعان" ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ

بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ﴾(النساء: ۱۳۵)

مزید گذارش یہ ہے کہ اگر ہم امام بخاری رحمہ اللہ کے فہم وتحقیق کو صحیح سمجھ لیں اور واقعتا ان کی تحقیق ہے بھی صحیح تو اس سے ایک اور مزید دلیل اس بات کا ایک محدث مجتہد وفقیہ سے یہ مل جاتی ہے کہ قیام مطلق سے مراد ان کے نزدیک پہلا قیام ہی ہے اور اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین اور محدثین عظام رحمہم اللہ سے ❶ قیام اول ہی مراد ہے نہ کہ ثانی جو مابعد الرکوع ہے۔ اب ان سب کے اجماع اور فہم وتحقیق انیق کو نظر انداز کر کے آپ حضرات اپنی مرغی کی ایک ٹانگ کہنے پر مصر رہیں تو آپ جانیں ہمیں تو ان سلف صالحین رحمہم اللہ کا طریقہ کار ہی صحیح نظر آتا ہے۔ اس پر ہم کاربند ہیں اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ یارب العالمین ہمارا حشر بھی ان کے زمرے میں ہو۔ آمین

پانچویں دلیل:

کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر "اذا کان قائما" الخ کے عموم سے دونوں قیاموں کی ہیئت معلوم ہوتی ہے تو پھر بتایا جائے کہ جو آدمی بیٹھ کر نماز پڑھے مثلاً: نوافل یا عدم الاستطاعت کی وجہ سے فرائض میں وہ کونسا طریقہ اختیار کرے، اس لیے کہ قائما کا مفہوم تو یہ ہے کہ یہ حکم قیام والی حالت میں ہے نہ کہ بیٹھنے کی صورت میں جب ہر قیام کے لیے آپ نے وضع تجویز کیا ہے تو مہربانی فرما کر بتائیں کہ جو بیٹھ کر نماز پڑھے وہ کون سی ہیئت اختیار کرے، واضعین حضرات کو تو ہم دیکھتے ہیں کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں بھی رکوع سے پہلے خواہ بعد وضع پر عامل ہیں لیکن اگر ان سے اس کی دلیل پوچھی جائے تو جواب ندارد۔

ایک دوست سے میں نے پوچھا کہ بھائی یہ آپ بیٹھ کر نماز پڑھنے کی حالت میں بھی وضع کرتے ہیں اس کی دلیل کیا ہے؟ تو جھٹ بول اٹھے کہ ہم اس کو قیام والی حالت قیاس کرتے ہیں۔ تعجب ہے! کیسی ستم ظریفی ہے کہ قیاس ان حضرات کے ہاں باطل ہے اور قیاس کو صحیح نہیں جانتے لیکن یہاں محض اپنی بات کی لاج رکھنے کی خاطر باطل چیز کا ہتھیار لے کر میدان میں آجاتے ہیں۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد!

کیا حق پرستی اسی کا نام ہے؟ کہ ایک غیر صحیح چیز اور باطل بات کو آپ دلیل کے طور پر محض اس لیے پیش کرتے ہیں کہ اس سے آپ کے مفروضہ کا اثبات ہوتا ہے اور دوسروں کو زبردستی اپنے ریوڑ میں داخل کرنا چاہتے ہیں اگر ہم ان کے بات رکھنے کی خاطر ان کی اپنی قیاسی بات کو مان لیں تب بھی یہ بات قطعاً غلط ہے اس لیے کہ ان کا قیاس نص کے برخلاف ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

---

❶ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ان سب کے ہاں مطلق قیاس ہے۔

((ان رسول الله ﷺ کان اذا جلس فی الصلوٰة وضع یدیه علی رکبتیه ورفع اصبعه الیمنی التی تلی الابهام فدعابها ویده الیسری علی رکبته باسطها علیها .)) (صحیح مسلم)

''بیشک نبی کریم ﷺ جب بھی نماز میں بیٹھتے تھے تو دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھتے اور دائیں ہاتھ کی وہ انگلی جوانگوٹھے کے متصل پہلے اس کو اٹھا کر دعا کرتے رہتے اور بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر کھلا ہوا رکھتے۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ جب بھی نماز میں بیٹھتے تو اس بیٹھنے کی کیفیت وہیئت وہی رہتی جو اس حدیث میں بیان فرمائی گئی ہے اور واضعین حضرات کے مسلک کے مطابق یہ ترکیب عموم کی متقاضی ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں شروع سے لے کر بیٹھنے کی سب حالتوں میں انہیں ہاتھوں کو چھوڑ کر گھٹنوں پر رکھنے چاہئیں کیونکہ جب آدمی اللہ اکبر کہتا ہے تو وہ نماز میں داخل ہو جاتا ہے لہٰذا اللہ اکبر کہنے کے بعد وہ نماز میں ہے اور نماز میں بیٹھنا ہے، لہٰذا اس صحیح حدیث کے مطابق مصلی جالس کو اللہ اکبر کہہ کر ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ دے لیکن یہ حضرات اس صحیح پر بھی عمل نہیں کرتے بلکہ اپنے گھڑے ہوئے قیاس کو مقدم رکھ کر صحیح حدیث سے اعراض کر کے ہاتھوں کو باندھے رہتے ہیں حالانکہ یہاں بھی اذا قـام قـائـمـا ، کی طرح عمومی ترکیب وارد ہے یعنی اذا جلس فی الصلوٰة پھر اس سے اعراض کیوں بڑھتا جارہا ہے اور یہاں صحیح حدیث کے حکم کو نظر انداز کیوں کیا جاتا ہے۔ کیا ان حالتوں یعنی ابتدائی جلوس اور رکوع کے بعد والے جلوس کو نکالنے کے لیے اور اس کے لیے وضع کا کوئی صحیح دلیل ہی نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے۔ تو پھر اس پر آپ عامل کیوں نہیں بنتے؟ اچھا پھر ان حضرات سے یہ سوال ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھے اس کے ٹانگوں کی کیا ہیئت ہونی چاہیے۔ آیا اس کو متربعا (یعنی چوزانوں) بیٹھنا چاہیے یا تشہد (التحیات) کے وقت بیٹھنے والی ہیئت یا کوئی اور اختیار کرنا چاہیے؟

ہم نے بعض حضرات سے پوچھا کہ جناب بیٹھ کر نماز پڑھنے کی حالت میں ٹانگوں کی کیا ہیئت ہونی چاہیے؟ تو جواب ملا کہ وہی ''تشہد'' والی ہیئت اگر پھر پوچھا جاتا ہے کہ اس کی کیا دلیل تو جواب ملتا ہے کہ صحیح مسلم کی حدیث جو اوپر تحریر کر آئے ہیں، اللہ اکبر! اللہ اکبر!! جب آپ ٹانگوں کی ہیئت کے لیے مذکور حدیث کو دلیل بناتے ہیں تو ہاتھوں کی ہیئت وکیفیت کے لیے بھی اس دلیل کو کیوں دلیل نہیں بناتے اور اس کو دلیل قرار دے کر ہاتھوں کو بھی رانوں یا گھٹنوں پر کیوں نہیں رکھتے؟ اس طرح پوری حدیث پر عمل ہوتا لیکن آپ کا طرز عمل بتاتا ہے کہ حدیث کے ایک حصہ پر عمل ہے اور ایک حصہ پر بالکل نہیں بلکہ اس کو آپ حضرات نسیا منسیا کر دیتے ہیں۔

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (البقرة: ٨٥)

''تو کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر تو ایمان لاتے ہو اور بعض حصہ سے کفر کرتے ہو۔''

بہر حال اس قسم کی ترکیب کو ہر جگہ اور ہمیشہ عموم پر محمول کرنے سے کیا کیا مفاسد وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ

ناظرین حضرات بخوبی سمجھ گئے ہوں گے ان سب باتوں سے ہمیں تو یہ علم حق الیقین کے درجہ پر ہوگیا ہے کہ اس حدیث یعنی اذا کان قائما فی الصلوٰۃ کے قیام سے مراد قیام اول ہے جس طرح کہ محدثین کرام حضرات نے بھی اس ترکیب سے سمجھا ہے اور یہی مسلک امام نسائی کا اور یہی طریقہ امام ہمام بخاری رحمہ اللہ کا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا صفات میں وضاحت سے عرض کر آئے ہیں اور اس طریقہ سے سب کی سب احادیث میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے اور ان میں باہمی تعارض وتخالف بھی نہیں رہتا اور کسی کو ترک کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اور نماز کے سب ارکان کی ہیئت وکیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے، بہرکیف امید ہے کہ قارئین کرام نے ہمارے ذکر کردہ دلائل واضح اور اچھی طرح جان لیا ہوگا کہ واضعین حضرات کی پیش کردہ دلیل اول ان کے مسلک کو کوئی تقویت نہیں پہنچاتی۔

بلکہ اس کے برعکس ان کے موقف کو اور بھی کمزور کر دیتی ہے اور یہ کہ اذا کان قائما فی الصلوٰۃ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ومحدثین عظام کے طریقہ پر صرف پہلا قیام ہی مراد ہے اور اس قیام میں وضع کے ہم بھی قائل ہیں اور اس پر ہم بھی عامل ہیں۔

قیام مابعد الرکوع میں وضع کے قائلین کی پہلی دلیل پر الحمد للہ کلام تام ہوا اب آگے ان کی دوسری دلیل پر معروضات پیش خدمت ہیں:

((عن وائل بن حجر قال رأیت النبی ﷺ حین کبر رفع یدیه حذاء اذنیه ثم حین رکع ثم حین قال سمع الله لمن حمده رفع یدیه ورایته ممسکا یمینه علی شماله فی الصلوٰة .)) (المسند لإمام احمد: ۲/ ۳۱۸)

''حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ جب تکبیر تحریمہ کہی تو ہاتھ اٹھائے، پھر جب رکوع کیا تب بھی اور جب سمع الله لمن حمده کہا تب بھی ہاتھ اٹھائے اور میں نے آپ کو دیکھا کہ نماز میں اپنے بائیں ہاتھ کو دائیں سے پکڑ رکھا تھا۔''

اب وضع کے قائلین حضرات فرماتے ہیں کہ اس روایت میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ رکوع کے بعد جب نبی کریم ﷺ سیدھے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کو بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ سے پکڑے ہوئے دیکھا، اس سے ثابت ہوا کہ اس قیام میں بھی وضع ہے۔

ناظرین کرام! اب آپ واضعین حضرات کی پیش کردہ اس حدیث کے بارے میں میرے معروضات کو بنظر انصاف وتدبر کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں:

اولاً: یہ حدیث شاذ ہے اس لیے کہ یہ نہ تو صحیح ہوسکتی ہے اور نہ حسن کیونکہ صحیح اور حسن حدیث میں یہ شرط ہے جیسا کہ اصول حدیث کی کتب میں مصرح ہے کہ وہ شاذ بھی نہ ہو لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہوئی اور احادیث ضعیفہ سے

استدلال کرنا اہل علم کی شان سے بمراحل بعید ہے۔ شاذ حدیث کی تعریف جس کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ معتمد بحسب الاصطلاح قرار دیتے ہیں وہ یہ ہے:

((ان الشاذ ما رواہ المقبول مخالفا لمن ھو اولی منه .))

(شرح نخبة الفکر للحافظ ابن حجرؒ)

''شاذ وہ ہے کہ ایک مقبول (غیر ضعیف) راوی اپنے سے زیادہ ثقہ یا احفظ یا اپنے سے زیادہ رواۃ کے مخالف کوئی روایت کرے۔''

مطلب یہ ہے کہ راوی اگرچہ ضعیف نہ ہو صدوق وثقہ ہو لیکن اگر وہ کوئی روایت ایسی کرتا ہے جو اس سے زیادہ ضابطہ وحافظ کی روایت سے مخالف ہو یا اپنے سے زائد چند ثقہ رواۃ کی روایت کردہ حدیث کے مخالف ہو تو وہ شاذ کہلاتی ہے (اور شاذ حدیث بھی احادیث ضعیفہ کی اقسام میں سے ہے)

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ حدیث جو بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کس طرح ہے۔ میں اس حدیث کی سند ذکر کرتا ہوں۔ امام احمد فرماتے ہیں:

((عبداللہ بن الولید حدثنی سفیان عن عاصم بن کلیب عن ابیه عن وائل بن حجر قال رأیت النبی ﷺ الخ))

اس زیر بحث روایت میں امام احمد بن رحمہ اللہ کے شیخ عبداللہ بن ولید ہیں جو عدنی ہے اور اس کے متعلق خود امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((کان ربما اخطا فی الاسماء)) (التھذیب: ٦/٧٠)

''یہ راوی بسا اوقات رواۃ کے ناموں میں غلطیاں کرتا ہے۔''

اور ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((یکتب حدیثه ولا یحتج به .)) (التھذیب: ٦/٧٠)

''اس کی حدیث لکھی تو جائے گی لیکن اس کو حجت نہیں بنایا جاسکتا۔''

اور آگے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((نقل الساجی ان ابن معین ضعفه)) (التھذیب: ٦/٧٠)

''امام ساجی نے امام یحییٰ بن معین سے اس راوی کی تضعیف نقل کی ہے۔''

چند اور محدثین نے ان کی توثیق بھی کی ہے۔ اس کی تعدیل کے لیے الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جن سے یہ نمایاں ہوتا ہے کہ یہ ثقہ وثبت تو ہیں لیکن زیادہ سے زیادہ صدوق بنتا ہے اور اس کے باوجود وہ غلطیاں بھی کرتا تھا۔ دیکھئے! تہذیب التہذیب ٦/٧٠۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان کے متعلق تقریب التہذیب میں فرماتے

ہیں: صدوق ربما اخطاء ، عبداللہ بن الولید العدنی صدوق ہیں بسا اوقات غلطیاں کر جاتا تھا۔

اب آپ نے اس روایت میں امام احمد رحمہ اللہ کے شیخ عبداللہ بن ولید ہے اس کا حال کیا ہے وہ معلوم کر لیا۔ اور یہی عبداللہ بن ولید ہے جس نے اسی سیاق والی روایت یعنی "ورایت ممسکا یمینه علی شماله فی الصلوٰة" کا ٹکڑا رکوع کے بعد ذکر کیا ہے حالانکہ امام احمد رحمہ اللہ کے مسند میں اسانید صحیحہ سے اور بھی چند روایات موجود ہیں جن کے رواۃ تمام کے تمام ثقہ ہیں اور ان روایات میں امام احمد رحمہ اللہ کے شیوخ بھی سب کے سب ثقہ وثبت اور حفاظ ہیں۔ لیکن ان سب ثقات شیوخ نے اس وضع کا ذکر صرف پہلے ہی قیام میں کیا ہے کسی ایک نے بھی بعد الرکوع اس قطعہ کو ذکر نہیں کیا۔

لیجئے! ہم یہ تمام روایات مسند احمد سے یہاں نقل کرتے ہیں آپ انہیں ملاحظہ فرما کر خود ہی فیصلہ دیں۔ ان روایات کے نقل میں ہم امام احمد رحمہ اللہ کے شیخ سے ابتدا کریں گے ناظرین نوٹ فرمالیں:

۱...... ثنا یونس بن محمد ثنا عبدالواحد ثنا عاصم بن کلیب عن ابیه عن وائل بن حجر الحضرمی قال اتیت النبی ﷺ فقلت لا نظرن کیف یصلی قال فاستقبل القبلة فکبر ورفع یدیه حتی کانتا حذو منکبیه قال ثم اخذ شماله بیمینه قال فلما اراد ان یرکع رفع یدیه حتی کانتا حذو منکبیه فلما رکع وضع یدیه حتی کانتا حذو منکبیه فلما سجد وضع یدیه من وجهه بذالك الموضع فلما قعد افترش رجله الیسری ووضع یده الیسری علی رکبة الیسری ووضع حد مرفقه علی فخذه الیمینی وعقد ثلاثین وحلق واحدة واشار با صبعه السبابة .)) (مسند احمد: ٤/ ٣١٩)

اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے ان احادیث کا ترجمہ نہیں دیا کیونکہ یہاں پوری حدیث کا ترجمہ دینا مطلوب نہیں صرف یہ دکھانا ہے کہ اسی روایت میں وضع کا ذکر پہلے قیام ہی میں آیا ہے اور یہ بھی نوٹ فرمالیں کہ اس روایت میں بھی عاصم بن کلیب ہے۔

اس روایت کے سب رواۃ ثقات ہیں اور اس میں امام احمد رحمہ اللہ کا شیخ یونس بن محمد ہے۔ جو المؤدب ہے اور اس کے متعلق حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں فرماتے ہیں: ثقة ثبت ، یہ ثقہ اور ثبت ہیں یہ الفاظ تعدیل کے اعلیٰ مراتب میں سے ہیں۔

۲...... ((ثنا عفان قال ثنا همام ثنا محمد بن حجادة قال حدثنی عبدالجبار بن وائل عن علقمة بن وائل مولی لهم انهما حدثا عن ابیه وائل بن حجر انه رای النبی ﷺ رفع یدیه حین دخل فی الصلوٰة کبر وصف همام حیال اذنیه

ثـم التـحف بثـوبـه ثـم وضع يده اليمينى على اليسرى فلما اراد ان يركع ، اخـرج يـديـه من الثوب ثم رفعهما كبر فرفع فلما قال سمع الله لمن حمده رفع يديه فلما سجد سجد بين كفيه......)) (مسند احمد: ٤/ ٣١٧-٣١٨)

دیکھو! اس میں بھی وضع پہلے قیام ہی میں مذکور ہے۔ اس روایت کے بھی سب رواۃ ثقات ہیں اور امام احمد رحمہ اللہ کا شیخ عفان بن مسلم ہے اس کے بارے میں التقریب میں ہے ثقہ ثبت ثقہ وثبت ''پختہ'' ہے۔

٣...... ((ثـنا عبدالصمد ثنا زائدة ثنا عاصم بن كليب اخبرنى ابى ان وائل بن حـجـر الحضرمى اخبره قال قالت لانظرن الى رسول الله ﷺ كيف يصلى قـال فـنـظرت اليه قام فكبر ورفع يديه حتى حاذتا اذنيه ثم وضع يده اليمنى ظهـر كـفه اليسرى والرسغ والساعد ثم قال لما اراد ان يركع رفع يديه مثلها ووضـع يديه على ركبتيه ثم رفع راسه فرفع يديه مثلها ثم سجد فجعل كفيه بـحـذاء اذنيه ثم قعد فافترش رجله اليسرى فوضع كفه اليسرى على فخذه وركبتـه اليسـرى وجـعل حد مر فقه الايمن على فخذه اليمنى ثم قبض بين اصـابـعـه فـحلق حلقة ثم رفع اصبعه فرايته يحركها يدعوبها ثم جئت بعد ذالك فى زمان فيه برد فرأيت الناس عليهم الثياب تحريك ايديهم من تحت الثياب من البرد .)) (مسند احمد: ٤/ ٣١٨)

اس روایت کے رواۃ بھی تمام کے تمام ثقات ہیں اور امام احمد کا شیخ عبدالصمد یہ ابن عبدالوارث بن سعید العنبری ہیں وہ تہذیب التہذیب میں دیکھے جاسکتے ہیں اور التقریب میں ہے۔ صـدوق ثبت فى شعبة ، یہ راوی صدوق ہے اور جب امام شعبہ سے روایت کرے تو ثبت ہے۔

حافظ صاحب نے ان کے متعلق یہ نہیں لکھا ہے کہ وہ غلطیاں کرتا تھا جیسا کہ عبداللہ بن ولید کے بارے میں فرمایا ہے۔ اس روایت میں بھی وضع کا ذکر قیام اول میں ہی ہے۔

٤ ...... ((ثـنـا اسـود بن عامر ثنا زهير بن معاويه عن عاصم بن كليب ان اباه اخبـره ان وائـل بـن حـجر اخبره قال قلت لانظرن الى رسول الله ﷺ كيف يـصـلـى فـقام فرفع يديه حتى حاذتا اذنيه ثم اخذ شماله بيمينه ثم قال حين ارادان يـركـع رفـع يـديه حتى حاذتا اذنيه ثم وضع يديه على ركبتيه ثم رفع فـرفع يديه مثل ذلك ثم سجد فوضع يديه حذاء اذنيه ثم قعد فافترش رجله اليسـرى ووضـع كـفه اليسرى على ركبته اليسرى فخذه فى صفة عاصم ثم

وضع حد مرفقه الايمن على فخذه اليمنى وقبض ثلاثا وحلق حلقة ثم رأيته يقول هكذا واشار زهير بسبابة الاولى وقبض اصبعين وحلق الابهام على السبابة الثانيه قال زهير وقال عاصم وحدثنى عبدالجبار عن بعض اهله ان وائلا قال اتيته مرة اخرى وعلى الناس ثياب فيها البرانس وفيها الاكسية فرئيتهم يقولون هكذا تحت الثياب .)) (مسند احمد: ۳/ ۳۱۸-۳۱۹)

اس حدیث میں بھی وضع پہلے قیام میں ہی مذکور ہے اور رواۃ سند کے سب کے سب ثقات ہیں اور امام احمد رحمہ اللہ کا شیخ اسود بن عامر جس کا لقب شاذان ہے۔ اس کے متعلق التقریب میں ہے۔ ثـقة ، یہ ثقہ ہیں اور ''ثقہ'' صدوق سے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں۔

۵...... ((ثنا اسود بن عامر ثنا شعبه عن عاصم بن كليب قال سمعت ابى يحدث عن وائل بن حجر الحضرمى انه رأى رسول الله ﷺ فذكره وقال فيه ووضع يده اليمنى على اليسرى قال وزاد فيه شعبة مرة اخرى فلما كان فى الركوع وضع يديه على ركبتيه وجافى فى الركوع .)) (مسند احمد: ۳/۳۱۹)

اس روایت میں بھی امام احمد کا شیخ اسود بن عامر ہے لیکن اس میں عاصم بن کلیب سے راوی امام شعبہ ہیں، اسی لیے اس شیخ سے دوبارہ روایت ذکر کی گئی ہے۔

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ امام احمد رحمہ اللہ کے چار شیوخ عبداللہ بن الولید سے بدر جہا بلند ہیں۔ اس وضع کو پہلے ہی قیام کے لیے ذکر کیا ہے صرف ایک عبداللہ بن ولید نے اس ٹکڑے کو رکوع کے بعد ذکر کیا ہے۔ اور اس سیاق کے سوق میں وہی منفرد ہیں اور ان کے متعلق ائمہ جرح وتعدیل نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ وہ بھی گذشتہ صفحات میں مذکور ہوا لہٰذا جب صدوق راوی بسا اوقات غلطیاں بھی کیا کرتا ہو اپنے سے بدر جہا اوپر کے ایک راوی نہیں بلکہ چار ثقات راوۃ کی مخالفت کرے تو وہ روایت کیسے صحیح یا حسن ہو سکتی ہے۔ بلکہ وہ اصول حدیث کے قواعد کے تحت شاذ ہوگی اور شاذ احادیث ضعیف کے اقسام میں سے ہے۔ بہر حال یہ حدیث جو مابعد الرکوع میں وضع کے قائلین نے پیش فرمائی ہے وہ شاذ ہے۔ لہٰذا ضعیف اور احتجاج کے درجہ سے ساقط ہوگی۔

نوٹ: شذوذ سند میں بھی ہوتا ہے تو متن میں بھی اور یہاں متن میں شذوذ ہے۔ فتدبروا

ثانیاً: اس روایت میں دراصل راوی کا مقصد نبی کریم ﷺ کے نماز کی ہیئات فی الجملہ بیان کرنا تھا یعنی یہ باتیں، بھی نماز میں ہیں ان باتوں میں سے ایک ''وضع الیدین علی الصدر'' بھی ہے جس کی جگہ پہلا قیام ہے لیکن

اس جگہ چونکہ ان باتوں کا فی الجملہ بیان کرنا تھا نہ کہ اس کی ترکیب اس لیے یہ کہہ دیا کہ "ورأيته ممسكا يمينه على شماله في الصلوٰة" یعنی میں نے آپ کو نماز میں ہاتھ باندھے دیکھا اور نماز کی جگہ اس موضع پر بیان نہیں کی، مطلق یہ بیان کیا کہ یہ چیز بھی میں نے نماز میں دیکھی لیکن کہاں اس کی اس جگہ کوئی وضاحت نہیں یہ دوسری حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔

اور ''واؤ'' عطف میں ترتیب بالکل نہیں جیسا کہ اس کی تحقیق ہم نے اپنے کتاب ''التحقیق الجلیل'' میں کافی وشافی کردی ہے بلکہ یہ مطلق جمع کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی چیز جو ہے تو مقدم لازم نہیں آتی کیونکہ یہاں ترتیب تو ہے نہیں جو اس قسم کا محذور لازم آتا اور رواۃ اس قسم کے تصرفات کرتے آئے ہیں۔ رواۃ کے اس قسم کے تصرفات کی پانچ مثالیں میں نے ''التحقیق الجلیل'' میں ذکر کی ہیں یہاں صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے۔

((كان سجود النبی ﷺ وركوعه وقعوده بين السجدين قريبا من السواء))

''جناب رسول اللہ ﷺ کا سجدہ اور رکوع اور دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا تقریباً برابر تھے۔''

ان ہی الفاظ سے اور انہی صحابی رضی اللہ عنہ سے اسی روایت کو امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں بیہقی نے سنن کبریٰ میں لائے ہیں۔

دیکھئے! یہاں راوی نبی ﷺ کے سجدہ کو رکوع سے پہلے ذکر کرتا ہے حالانکہ اس کا مقام رکوع کے بعد ہے۔

۲۔ امام احمد کے مسند میں یہ روایت ہے:

((عن وائل قال صلى بنا رسول الله ﷺ فلما قرأ غير المغضوب عليهم ولا الضالين قال آمين واخفى بها صوته وضع يده اليمنى على يده اليسرىٰ وسلم عن يمينه وعن يساره.)) (مسند احمد: ٤/ ٣١٦)

ملاحظہ فرمایئے! یہاں وضع الیدین کا ذکر آمین کے بعد آیا ہے۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فاتحہ پڑھ کر آمین بھی کہی اور بعد میں ہاتھ باندھے۔ ہرگز نہیں یہ مطلب قطعاً نہیں ہے لیکن یہاں بھی راوی نے نبی کریم ﷺ کی نماز کی چند باتیں بلاقصد ترتیب ذکر کردی ہیں اس کا مقصد صرف یہ بیان کرنا تھا کہ یہ باتیں بھی نماز میں ہیں۔ ان کی ترتیب دوسری مفصل احادیث سے معلوم ہوتی ہے۔ اس میں کیا خرابی ہے؟ اس قسم کی اور مثالیں ''التحقیق الجلیل'' میں ملاحظہ فرمائیں جب معلوم ہوا کہ رواۃ اس قسم کے تصرفات متون روایات میں کرتے آئے ہیں اور نماز کی ہیئات اور ارکان کے بیان میں تقدیم وتاخیر کرتے آئے ہیں تو یہاں بھی کیوں نہ یہ کہنا چاہیے کہ راوی سے جو ہیئت پہلے قیام کی تھی اس کا ذکر رکوع کے بعد کرلیا کیونکہ انہیں نماز کی چند باتیں فی الجملہ بیان کرنی تھی۔ یعنی یہ اور وہ باتیں بھی نماز میں ہیں۔

چونکہ، اس ہیئت کی جگہ دوسری احادیث میں متعین ہوگئی ہے اوران رواۃ سے روایتیں لینے والے بھی اس کو خوب جانتے تھے۔ اس لیے کہ نماز کا طریقہ متواتر تھا اس میں کسی التباس یا اس سے کسی غلط فہمی کی کوئی وجہ نہیں تھی، لہٰذا تقدیم وتاخیر سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ بہرحال اس روایت میں راوی کا مقصد بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں امساک بھی ہے لیکن کس جگہ وہ دوسری احادیث صحیحہ سے معلوم ہوجاتا ہے اور پھر آپ کے اس جلوس بیٹھنے کا ذکر آ گیا ہے اوراس کو فلما جلس کے الفاظ سے شروع کیا ہے اور''فاء'' میں مہلت یا تراخی نہیں ہوتی، تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ رکوع کے بعد والے قیام کے بعد متصل ہی نبی کریم ﷺ بیٹھ گئے تھے اور سجدہ نہیں کیا تھا؟ ہرگز نہیں یہ مطلب قطعاً نہیں۔ اور راوی کو یہاں سب کی سب باتیں نماز کی بھی بیان کرنی نہیں تھیں بلکہ چند اور وہ بھی بلاترتیب بیان کرنی تھیں اس لیے بعض باتیں بیان فرمائیں اوران کی ترتیب کو ملحوظ نہ رکھا۔ اس طرح یہ روایت جوضعیف ہے دوسری روایات سے متفق ہوجائے گی اوراس کو بالکلیہ ترک کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

ثالثاً: اگر بالفرض علی زعم المستدلین بهذا الحدیث . اس ٹکڑے سے مراد مابعدالرکوع والے قیام کی ہیئت بیان کرنی تھی تو صحابی رضی اللہ عنہ اہل لسان تھے، کسی طرح بھی اس طرح کے الفاظ نہ فرماتے کہ''میں نے آپ کو نماز میں ہاتھ باندھے دیکھا۔'' کیونکہ ان کو بیان کرنا تو مابعدالرکوع والے قیام کی ہیئت تھی جو خاص تھا لیکن انہوں نے یہ فرمادیا کہ میں نے نماز میں یہ ہیئت دیکھی یعنی''نماز میں'' کے الفاظ تو عام ہیں ان سے یہ تو ظاہر نہیں ہوتا کہ نماز کے کس رکن میں یہ ہیئت دیکھی بلکہ اس صورت میں انہیں اس طرح کہنا چاہیے تھا۔

((ثم حين قال سمع الله لمن حمده رفع يديه ووضعهما على الصدر او رفع يديه فامسك او امسك شمالهما بينهما .))

''پھر جب سمع الله لمن حمده کہا تو ہاتھ اٹھاتے اوران کو سینہ پر رکھا یا پھران دونوں ہاتھوں میں سے بائیں کو دائیں سے پکڑا۔''

قارئین کرام! آپ سوچیں کہ اگر یہاں صحابی کا مقصد وہ ہوتا جو مستدلین حضرات لیتے ہیں تو عبارت اسی طرح ہونی چاہیے تھی جس طرح اوپر ہم نے لکھی ہے ورنہ یہ موجود عبارت اوراس سے مقصود وہ جو یہ حضرات لیتے ہیں تو اس عبارت کو وضاحت وبلاغت سے گرادیتی ہے۔

اگر یہ فرمایا جائے کہ صحابی رضی اللہ عنہ نے اس جگہ''فی الصلوٰۃ'' کے الفاظ فرما کر دونوں قیاموں کو اس میں شامل فرما لیا ہے تو یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہوگی کہ یہ بات کہ''فی الصلوٰۃ'' میں فی الواقع عموم ہے اوراس لیے دونوں قیاموں کو شامل ہے خود ابھی تک مجوث فیہ ہے۔

ہمیں ان الفاظ کا اس جگہ عموم مسلم نہیں اور مدعیوں کی طرف سے ابھی تک کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کی گئی جس سے''فی الصلوٰۃ'' میں اس جگہ عموم کا اثبات ہوتا ہو۔ لہٰذا جب تک ایسا کوئی واضح اور قطعی دلیل اپنے اس دعویٰ پر

پیش نہیں فرماتے تب تک اس ''فی الصلوٰۃ'' سے عموم صحیح نہیں ہوگا اور نہ ہی علمی بات ہوگی۔

خلاصہ کلام! یہ حدیث اولاً: شذوذ کی وجہ سے ضعیف ہے، ثانیاً: ان کی مدعی پر نص نہیں۔ ثالثاً: زیادہ سے زیادہ اس میں بھی فی الجملہ نماز میں ہاتھ باندھنے کا اثبات ہوتا ہے جس کے ہم منکر نہیں ہیں باقی اس سے مابعد الرکوع والے قیام میں وضع یا امساک ثابت نہیں ہوتا کیونکہ من جملہ دوسرے وجوہ کے اس طرح یہ عبارت فصاحت وبلاغت سے گر جاتی ہے، ایک اہل لسان صحابی رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی سوظنی کے ہم تو قطعاً روادار نہیں ہیں۔

بہرصورت اس حدیث سے بھی مابعد الرکوع والے قیام میں وضع وقبض کے قائلین کے لیے کوئی دلیل نہیں۔

یہی وہ دو حدیثیں تھی جو عام طور پر یہ حضرات پیش فرماتے ہیں اور ہم نے بھی الحمد للہ ثم الحمد للہ ان پر اپنے مبلغ علم کے مطابق تحقیقی کلام کرکے سامنے پیش کر دیا ہے۔

اب وہ عدل وانصاف کی دامن تھامتے ہوئے تعصب وجانب داری سے اجتناب کرتے ہوئے فیصلہ فرمائیں کہ حق کس جانب ہے اور کہاں تک اصلی مسئلہ کی تحقیق میں راقم الحروف کامیاب ہوا ہے اس کے بارے میں بھی ہمارے مہربان قارئین کرام ہی اپنی رائے دے سکتے ہیں۔ ان دو حدیثوں کے علاوہ بھی ان حضرات کی جانب سے کچھ اور دلائل بھی زمانہ ماضی بعید میں پیش کیے تھے جس کا بالا حصہ میں نے بھی ''التحقیق الجلیل'' میں ذکر کرکے ان پر بفضل اللہ وحسن توفیقہ کافی وشافی کلام کیا تھا۔

لیکن درحقیقت ان کو دلیل کہنا بھی درست نہیں۔

لہٰذا ان کا ذکر کرکے ان پر کلام کرنا قیمتی وقت کا ضیاع ہوگا ویسے بھی یہ مختصر رسالہ ایسی تطویل لاطائل کا متحمل نہیں ہوسکتا، اس لیے ان کی طرف کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔

العاقل تكفيه الاشارة .

''عقل مند آدمی کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔''

اللہ تعالیٰ سبحانہ کے فضل وکرم سے یہ مقالہ مسـمـاة نيل الاماني وحصول الامال بتحقيق ان الهيئته المسنونة القيام بعد الركوع هي الارسال .

اپنے اختتام کو پہنچا۔

والحمد لله اولًا وآخرا وظاهرا وباطنًا وصلى الله على خير خلقه سيد ولد آدم خـاتـم الـنبيين محمد وآله واصحابه وازواجه وذريته واهل بيته وبارك وسلم تسليما كثيرا .

❁❁❁❁

باب دوم

مسائل 3

اجتماعی دعا

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنے میں پاک و ہند کے علماء کا اختلاف رہا ہے، بعض اس کے ممانعت کے قائل ہیں، جبکہ احادیث کی روشنی میں فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنے کا ثبوت ملتا ہے اور اسی پر ہمارے بعض سلف صالحین کا جن میں بالخصوص مبارکپوری صاحب کا جواز کا فتویٰ ہے اسی لیے شاہ صاحب نے اس مسئلہ کی وضاحت اور عوام الناس کی سہولت کے لیے یہ مضمون لکھا۔

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم اما بعد!

۱۔ کیا ہاتھ اٹھا کر دعا کی جا سکتی ہے؟

۲۔ کیا نماز فرض یا نفل کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے؟

۳۔ اگر امام دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دے تو کیا مقتدی بھی اس کے ساتھ ساتھ اٹھا سکتے ہیں، یعنی اجتماعی طور پر دعا کر کر سکتے ہیں؟

(۱) پہلی بات سے متعلق تو اتنی احادیث صحیحہ آئی ہیں کہ اگر ان کو تواتر معنوی کا حکم دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

(۲) اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد دعا مقبول ہوتی ہے جبکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ فرض نماز کے بعد دعا مقبول ہوتی ہے تو اس سے امت کو رغبت دلانا ہے تا کہ صلواۃ مکتوبہ کے بعد خصوصی طور پر دعا کریں۔ اب دعا بغیر ہاتھ اٹھائے بھی کی جا سکتی ہے اور اگر کوئی ہاتھ اٹھا کر دعا کرے تو وہ بھی جائز اور ٹھیک ہے کیونکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہاتھ اٹھانا دعا کے آداب میں سے ہے۔ (نہ کہ لوازمات سے) جیسا کہ حدیث نبوی ان الله حي كريم . [1] وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، پھر اگر کوئی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہے اور اس بارے میں یہ تصور نہیں رکھتا کہ یہ فرض یا واجب ہے یا نماز کے لوازمات و شرائط وغیرہا میں سے ہے تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے اور نہ یہ بدعت کے تحت آ سکتی ہے۔ جو بات رسول اللہ ﷺ سے قولاً (في الترغيب والترهيب) ثابت ہے اس کا بھی وہی مقام ہے جو آپ کے فعل کا ہے، اسی طرح تقریر کا حکم ہے۔ جب قول سے نماز فرض کے بعد دعا کرنے کا ثبوت ملتا ہے تو اگر نبی کریم ﷺ سے فعل نہ بھی ثابت ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی یہ بدعت کہلائے گی بلکہ یہ فعلاً بھی آپ سے ثابت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز سے فراغت کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے تھے۔ اس میں نماز کا لفظ عام ہے جو نفلی و فرضی کو شامل ہے، اس کے متعلق علامہ ہیثمی مجمع الزوائد میں لکھتے ہیں: رجاله ثقات اور علامہ مبارکفوری نے تحفۃ الاحوذی میں اس کو بحال رکھا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث قابل استناد و حجت ہے اور اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ آپ ﷺ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے تھے۔

علامہ مبارکپوری نے آخر میں لکھا ہے کہ میرے نزدیک قول راجح یہی ہے کہ نماز کے بعد فرضی و نفلی میں ہاتھ

[1] اخرجه الترمذي، كتاب الدعوات، باب ان الله حي كريم، رقم الحديث: ٣٥٥٦۔ قال ابو عيسى هذا حديث حسن غريب، وابو داود رقم الحديث: ١٤٨٨۔ وابن حبان في صحيحه: ٨٧٣.

اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جب یہ ثابت ہوا کہ نماز کے بعد آپ ﷺ ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے تھے تو گو آپ نے اس پر مداومت نہ کی ہو لیکن اس کو کرتے رہنا مسنون ہوگا نہ کہ بدعت۔ صحیح مسلم میں صلوٰۃ کسوف کے باب میں ایک روایت ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہے اس میں یہ الفاظ ہیں:

((ثم (ای بعد الخطبة) رفع یده فقال اللهم هل بلغت)) [1]

اور خطبہ نماز کسوف کے بعد ہی ہوا تھا اس میں نماز کے بعد ہاتھ اٹھانے کا ثبوت ہے اور یہ الفاظ اس روایت کے بعد لائے ہیں جس میں یہ امر ہے کہ جب کسوف ہو تو نماز پڑھا کرو اور دعا کرو اور اس طرح قولاً وفعلاً نماز کے بعد ہاتھ اٹھانے کا ثبوت ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں کتاب الدعوات میں اسی صحیح مسلم والی روایت کو دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے کے ثبوت میں پیش فرمایا ہے۔

ملحوظہ ۱: بعض احباب عہد حاضر کے ایک عالم کا حوالہ دے کر سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں لیکن یہ نہایت عجیب بات ہے کیونکہ سیدنا عبداللہ بن زبیر والی حدیث تو طبرانی کی معجم کبیر میں ہے اور یہ کتاب ان مولانا نے ابھی تک دیکھی ہی نہیں، پھر اس کی سند کے کسی راوی پر کیسے کلام کر سکتے ہیں یا اس کی کس طرح تضعیف فرماتے ہیں؟ یہ خود جناب سوچیں ہم نے تو حافظ ہیثمی کے کہنے پر اعتماد کیا ہے (جو مجمع الزوائد میں فرمایا ہے) اور معجم کبیر حافظ ہیثمی کے سامنے یقیناً تھی اس لیے ان کی توثیق تو سمجھ میں آتی ہے اور اس پر اعتماد بھی کرتے ہیں لیکن حضرت مولانا نے دیکھا ہی نہیں۔ لہٰذا ان کی تضعیف کا کیا مطلب؟ یہ کتاب پاکستان میں ہے لیکن ڈیرہ نواب صاحب کے کتب خانے میں اور وہ دکھاتے تک نہیں۔

ملحوظہ ۲: صحیح مسلم والی حدیث کے متعلق اگر کوئی یہ کہے کہ اس میں تو دعا نہیں ہے صرف "هل بلغت" کے الفاظ ہیں لہٰذا یہ دعا کیسے ہوئی؟ اس کے لیے یہ گذارش ہے کہ اس حدیث میں دونوں ہاتھوں کے اٹھانے کا ذکر ہے اگر یہ دعا نہ تھی تو کیا چیز تھی؟ باقی رہا الفاظ "هــل بــلــغــت" کے تو بعض ادعیہ ڈائریکٹ ہوتی ہیں اور بعض ان ڈائریکٹ وہ اس طرح کہ جیسے کوئی کہے کہ "جئت لا سلم علیك" مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے کچھ دلوایئے۔ جیسا کہ علم البلاغہ میں تعریض کے مسئلہ کے بیان میں اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری اپنی صحیح میں یہ باب منعقد فرماتے ہیں:

((بــاب الدعاء بعد الصلوة)) اور پھر اس میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث لاتے ہیں جس میں یہ الفاظ ہیں:

((قالوا یا رسول الله ذهب اهل الدثور بالدرجات والنعیم المقیم قال کیف ذالك قــالــوا صــلــوا کــمــا صلینا وجاهدوا کما جاهدنا وانفقوا من فضول

---

[1] اخرجه مسلم فی صحیحه کتاب، الکسوف باب صلاة الکسوف: ۲۰۹۰.

اموالهم وليست لنا اموال قال افلا اخبركم بامر تدركون من كان قبلكم وتسبقون من جاء بعدكم ولا ياتيها احد بمثل ماجئتم الا من جاء بمثله تسبحون فی دبر كل صلواة عشرا وتحمدون عشرا وتكبرون عشرا)) ❶

امام المحدثین نے اس پر باب تو دعاؤں کا منعقد فرمایا لیکن اس میں دعا (بمعنیٰ مروجہ) کا کہاں ذکر ہے؟ اس میں تو تسبیح تحمید، تکبیر کا ذکر ہے لیکن دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ اس تسبیح، تحمید و تکبیر میں جو منافع ہیں اور ان کے پڑھنے کا جو اجر وثواب ہے اس کے حصول کی طمع ورجاء قاری کے قلب میں ہوتی ہے، یعنی قاری پڑھ تو رہا ہے۔ سبحان اللہ وغیرہ لیکن دراصل ثناء وتحمید وتقدیس ہے وہ اللہ تعالیٰ سے اس کا اجر وثواب بھی مانگ رہا ہے۔ اس طرح یہ بجاطور پر دعائیں ہیں۔ امام سفیان بن عیینہ سے نبی کریم ﷺ کی عرفہ کے دن والی اس دعا: ((لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ)) کے متعلق پوچھا گیا کہ اس میں توحید وثناء ہے اس میں دعا نہیں ہے تو امام ابن عیینہ نے جواب میں ایک شاعر کے دو شعر پڑھے:

أ اذكر حاجتي ام قد كفاني
ثنائي ان شيمتك الحياء
اذا اثنى عليك المرء يوما
وكفاه من تعرضه الثناء

بس اسی طرح سمجھئے کہ نبی کریم ﷺ نے امت کو سمجھانے کے بعد اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! جب میں نے امت کو تیرے احکام پہنچا دیے تو اب تو ہم پر مہربانی کرتے ہوئے یہ مصیبت دور فرما اور یہ اس لیے کہ کوئی نیک کام کر کے اس کے بعد دعا کرنا قبولیت کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں تین آدمی غار میں جب محصور ہو گئے تھے تو اللہ کی جناب میں اپنے اچھے اعمال پیش کر کے پھر دعا کی تھی کہ یہ مصیبت ہم سے دور کی جائے۔ بس یہ بات بھی اسی طرح سمجھئے اور صحیح مسلم میں تو وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ جب کسوف وغیر ہو تو نماز ودعا کی طرف متوجہ ہو جاؤ بس اسی قول کا یہ عملی نمونہ ہے کہ پہلے نماز پڑھی پھر ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔

ملحوظہ ۳: اوپر عرض کیا گیا کہ فرضی نماز کے بعد دعا زیادہ مستجاب ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں یہ حدیث ہے جو جامع الترمذی میں (کتاب الدعوات) میں سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (مرفوعاً) کہ دعا زیادہ تر مقبول دو وقتوں میں ہوتی ہے۔ ایک جوف الليل الاخر اور دوسری دبر الصلوات المكتوبات (فرض نمازوں کے بعد) اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں اور امام ترمذی نے اس حدیث کی تحسین فرمائی ہے اور علامہ مبارکپوری نے اس کو بحال رکھا ہے اور یہ حدیث امام نسائی نے بھی عمل اليوم والليلة میں ذکر فرمائی۔

❶ اخرجه البخاري في كتاب الدعوات، باب الدعاء بعد الصلاة، رقم الحديث: ٦٣٢٩.

ملحوظہ ۴: اور پھر یہ بھی عرض ہے کہ 'دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا' یہ بھی دعا کے آداب میں سے ہے، اس بات کی دلیل میں بہت سی احادیث مرویہ ہیں۔ ان اللہ حی کریم الخ وغیرہ لیکن میں یہاں خصوصیت سے ایک حدیث نقل کرتا ہوں جس سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ اٹھانا دعا کے خصوصی آداب میں سے ہے۔ یہ روایت بیہقی نے سنن کبریٰ میں روایت کی ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے اس کی سند ومتن یہ ہے:

((وقد اخبرنا ابو عبدالله الحافظ هو الحاكم صاحب المستدرك، انباء ابوبكر بن اسحاق انباء الحسن بن علي بن زياد ثنا عبدالعزيز بن عبدالله حدثني سليمان بن بلال عن عباس بن عبدالله بن معبد عن ابن عباس ان رسول اللهﷺ قال هكذا الاخلاص يشير باصبعه التي تلي الابهام وهذا الدعاء فرفع يديه حذو منكبيه وهذا الابتهال فرفع يديه مدا)) [1]

اس حدیث کا ترجمہ بالکل واضح ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ دعا کا خصوصی طریقہ رفع ایدی کے ساتھ ہے گو بلا رفع ایدی دعا کا بھی ثبوت ہے لیکن اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھانا (دعا میں) بہر حال بہتر اور مستحب ہے کیونکہ خود نبی کریم ﷺ نے دعا کا یہ طریقہ بتایا ہے۔

اب ان دونوں حدیثوں کو ملا لیجیے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ فرض نماز کے بعد زیادہ مستجاب ہوتی ہے اور دعا کا طریقہ ہاتھ اٹھانے سے ہے لہٰذا فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بدعت یا معیوب وناپسندیدہ فعل نہیں بلکہ اچھا اور مستحب ومندوب بلکہ مسنون فعل ہے، یعنی مسنون قول (صرف ان احادیث کے بموجب) لیجیے ایک اور حدیث کا ذکر کرتا ہوں جس سے خصوصی طور پر فرضی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا نبی کریم ﷺ کے فعل مبارک سے ثابت ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیے:

((حدثنا سليمان بن احمد بن ايوب (هو الامام الطبراني) ثنا علي ابن الصقر ثنا عفان بن مسلم ثنا سليمان بن المغيرة عن ثابت البناني قال ذكر انس بن مالك سبعين رجلا من الانصار، الحديث. وفيه فما رايت رسول اللهﷺ وجد على سرية وجده عليهم لقد رايت رسول اللهﷺ كلما صلى الغداة رفع يديه يدعو عليهم)) [2]

اس حدیث کی بھی امام حاکم نے تصحیح کی ہے اور حافظ ذہبی نے اس کو بحال رکھا ہے۔ ہاں صرف امام دارقطنی نے اس کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ "لیس بالقوی" لیکن یہ جرح ایک تو غیر مفسر ہے۔ لہٰذا توثیق کے مقابلہ میں معتبر نہ ہوگی۔ (ثانیاً) ائمہ فن کا کسی کے متعلق یہ فرمانا کہ "لیس بالقوی" اور کسی کے متعلق "لیس بقوی"

---

[1] السنن الكبرى للبيهقي: ١٣٣/٢.

بغیر لام التعریف ان دونوں میں فرق ہوتا ہے۔علم الرجال پر تحقیقی نظر رکھنے والے مانتے ہیں اورانہوں نے بتادیا ہے کہ "لیس بالقویٰ (یعنی معرف باللام) انما تنفی الدرجة الکاملة من القوة (التنکیل بما فی تعلیقات الکوثری من الاباطیل ص ۲۳۲ ج۱ للعلامة الیمانی) یعنی یہ کلمہ اس کے متعلق بولتے ہیں جوقوت حافظہ کے اعتبار سے کاملہ درجہ پر نہ ہو۔

اسی طرح علامہ امیرعلی"التذنیب للتقریب" میں فرماتے ہیں: "لیس بالقوی (معرف باللام) بمعنی الصدوق''اورصاحب فوزالکرام نے علامہ سیوطی کی"التعقبات"اورالنکت البدیعات سے نقل کیاہے کہ: ان من قیل فیه: انه لیس بالقوی لا تنزل روایته عن درجة الحسن . ان محققین کی تصریحات اورعلم الرجال پر محققانہ نظر رکھنے والوں کی ان وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ علی بن الصقر صدوق اورکم ازکم حسن الحدیث ہے اور یہ ان کی تحقیق اصول حدیث کے بھی بالکل موافق ہے۔اصول حدیث کی ابتدائی کتاب جو عام طور پر سب مدارس میں زیردرس ہوتی ہے اس میں صحیح حدیث کی تعریف کے بعد حافظ صاحب فرماتے ہیں:

((اذا خف الضبط ای مع وجود بقیة الشروط المذکورة فی تعریف الصحیح ، فهو الحسن لذاته))

یعنی راوی میں اگر ضبط کی کمی کے سوا دوسرے سب اوصاف جوصحیح کی تعریف میں مذکور ہیں پائی جائیں تو یہ حدیث حسن لذاتہ ہوتی ہے اوراوپر یہ معلوم ہوا کہ لیس بالقوی قوة حافظہ کے کاملہ درجہ کی نفی کرتا ہے اورمآل اس کا وہی ہوا کہ اس میں ضبط کی کمی ہے اوراصول حدیث میں مذکورحسن لذاتہ حدیث کی تعریف سے بھی معلوم ہوا کہ اس میں جو راوی ہوتے ہیں وہ حفظ میں کمال درجہ نہیں رکھتے بلکہ ضبط کی ان میں قدرے کمی ہوتی ہے۔اگرغورفرمائیں تو وہی بات معلوم ہوگی جوہم نے عرض کی کہ علی بن الصقر حسن الحدیث اور صدوق ہے اور جب ان کی حدیث حسن ہوتی تووہ بھی شقیق الصحیح فی الاحتجاج ہے۔لہٰذا یہ حدیث حسن ہے اوراس سے استدلال صحیح ہے سند تحقیق کے بعد۔

متن حدیث:

اس حدیث کے متن سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ صبح کی نماز کے بعد کافی عرصہ تک ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے رہے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ یہ حدیث ان احادیث کے مخالف ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نماز میں ان پر بددعا کرتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ان کے مخالف نہیں ہے بلکہ بآسانی ان میں تطبیق ہو جاتی ہے۔جب دوحدیثوں میں تطبیق کی صورت پیدا ہوسکتی ہے تو ترجیح یا ترک کی طرف بالکل رجوع نہیں کیا جائے گا جیسا کہ اصول حدیث میں محقق ہو چکا ہے۔محدثین سب سے اول تطبیق کو ہی کام میں لاتے ہیں اور جب وہ کسی

---

❶ حلیة الاولیاء للحافظ ابی نعیم الاصبهانی : ۱/ ۱۲۳۔۱۲۴ . سند کے اورتوسب رواۃ ثقہ ہیں لیکن علی بن الصقر صدوق.

طرح نہیں بنتی تو دوسرے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اسی وجہ سے امام الائمہ ابن خذیمہ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی بھی میرے پاس دو حدیثیں صحیحہ لے آئے شرط یہ ہے کہ دونوں جید ہوں اور کوئی ایک ضعیف نہ ہو۔ جو بظاہر متعارض معلوم ہوتی ہوں تو میں ان میں تطبیق دے دوں گا۔ اب دیکھنا ہے کہ ان دونوں روایتوں میں تطبیق کی کیا صورت ہے؟ درحقیقت یہ حدیث ان روایات کے مخالف ہی نہیں بلکہ اس سے مزید ایک بات معلوم ہوئی یعنی اس روایت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نماز کے اندر دعا قنوت کے ساتھ نماز سے فراغت کے بعد بھی ان پر بددعا کیا کرتے تھے کیونکہ یہ بڑا سنگین معاملہ رونما ہوا تھا یعنی ستر قراء شہید کر دیئے گئے تھے اور اس واقعہ پر آپ ﷺ کو دکھ بھی بے حد پہنچا تھا۔ جس پر یہ الفاظ: "فما رایت رسول اللهﷺ وجد علی سریه وجده علیهم" دلالت کرتے ہیں۔ اس لیے دونوں طرح نماز میں بھی اور نماز سے فراغت کے بعد بھی ان پر دعا فرماتے ہیں اس کا نظیر ایک اور بھی ملتا ہے مثلاً نبی کریم ﷺ نماز میں ایک دعا جس میں عذاب قبر وغیرہ سے استعاذہ ہے پڑھا کرتے تھے۔ [1]

لیکن نبی کریم ﷺ کی جو دعائیں استعاذہ وغیرہ نماز کے بعد کی احادیث صحیحہ میں وارد ہیں ان میں عذاب القبر سے استعاذہ موجود ہے، یعنی نماز میں بھی یہ دعا مانگی اور بعد نماز بھی اسی طرح اگر اس دردناک معاملہ کے وقوع پر بڑے درد اور دکھ کی وجہ سے آپ نے نماز میں اور نماز سے فراغت کے بعد ان پر دعا کی ہو تو یہ بعید نہیں بلکہ عین قرین قیاس ہے۔ بہرحال اس روایت حسنہ سے بھی معلوم ہوا کہ فرضی نماز کے بعد بھی آپ ﷺ ہاتھ اٹھا کر دعا کیا کرتے تھے۔ جب آپ کے اسوہ حسنہ سے یہ بات ثابت ہوگئی تو اب اس کو بدعت کہنا کیسے درست ہوگا؟ بلکہ یہ تو عین مسنون ومندوب ہے اور مستحب ہوا۔ بہرحال ان قولی وفعلی احادیث سے نماز نفلی خواہ فرضی کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت ہوا۔ وهو المطلوب

ملحوظہ: میں صحاح ستہ کے علاوہ دوسری کتب سے بھی دلائل پیش کرتا رہتا ہوں اور یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ سلف سے خلف تک علماء وفضلاء محدثین وفقہاء ان صحاح ستہ کے علاوہ کتب حدیث سے دلائل پیش فرماتے رہتے۔ یہی بات صرف مدنظر ہونی چاہیے کہ ایک تو ان کی سند صحیح (جید) ہو اور دوسرے یہ کہ وہ روایت مشہور ومتداولہ کتب حدیث خصوصاً صحیحین کے مخالف نہ ہو۔ مخالف بھی ایسی کہ بغیر تکلف وتصنع کے ان میں تطبیق نہ ہو سکے، جب یہ دونوں باتیں موجود ہوں تو وہ روایت قبول کر لینی چاہیے بلکہ لازمی طور پر قبول کرنی ہوگی بلکہ یہ اللہ کا دین ہے جو محفوظ ہے اور مختلف کتب میں باتیں بکھری پڑی ہیں کہیں کوئی ملتی ہے کہیں کوئی۔

اب اوپر کی تحقیق سے درج ذیل چند اہم نکات معلوم ہوئے:

(الف) فرض نماز کے بعد دعا زیادہ مستجاب ہوتی ہے اور اس میں امت کو ترغیب ہے کہ وہ خصوصی طور پر فرائض

---

[1] رواه البخاري في صحيحه.

کے بعد دعا کرے کیونکہ نیک عمل کے بعد دعا مقبول ہوتی ہے اور فرائض سے زیادہ کوئی عمل زیادہ صالح نہیں ہوتا۔

((وما تقرب الی عبدی بشیء احب الی مما افترضت علیه الحدیث))

(اخرجه البخاری عن ابی هریرة رضی الله عنه))

(ب) دعا میں ہاتھ اٹھانا یہ دعا کے خصوصی آداب میں سے ہے۔ اسی لیے دعا کے لیے اس ادب کو کسی خاص موقعہ یا محل کے ساتھ مخصوص نہیں فرمایا گیا ہے بلکہ اس کو عام رکھا گیا ہے، یعنی جب بھی انسان دعا کرے جس موقعہ پر کرے، خواہ نماز سے قبل یا نماز کے بعد، نفلی نماز ہو یا فرضی ہو ان سب صورتوں میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا مستحب ومسنون ہیں۔

(ج) نبی کریم ﷺ سے عمومی طور پر نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا عملاً ثابت ہے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوا۔

(د) خصوصی طور پر فرض نماز کے بعد بھی نبی کریم ﷺ سے عمومی طور پر نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا عملاً ثابت ہے جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گذر چکا ہے جو حلیۃ الاولیاء سے منقول ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابتداء میں جو تنقیح طلب تین امور ذکر کیے تھے ان میں سے دو امور پر تو کافی لکھ چکا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اپنی ہیچ میدانی اور تقاضا بسری سے کوئی پہلو مجھ سے اوجھل رہ گیا ہو لیکن بہر کیف اپنے مبلغ علم کی حد تک تو جو کچھ سمجھ میں آیا تحریر کر دیا۔ اب تیسرا امر رہ جاتا ہے اور وہ اجتماعی ہیئت سے دعا کرنا۔ اب ذیل میں اس پر اپنی معروضات پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

قولی حدیثیں:

۱۔ ((عن سلمان الفارسی رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ ما رفع قوم اکفهم الی الله عزوجل یسالونه شیئا الا کان حقا علی الله عزوجل ان یضع فی ایدهم الذی سالوا)) [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اجتماعی طور پر دعا کی جاسکتی ہے اور یہ حدیث اپنے عموم کی وجہ سے نماز کی جماعت کو بھی شامل ہے۔

۲۔ اخبرنا الشیخ الامام ابوبکر بن اسحاق نا بشر بن موسی ثنا ابو عبدالرحمن المقرئ ثنا ابن لهیعة قال حدثنی ابوهبیرة (عبدالله بن هبیرة المصری ثقة) عن حبیب بن مسلمة الفهری وکان مستجاب الدعوات انه امر علی جیش فدرب الدروب فلما اتی العدو قال سمعت رسول الله ﷺ

[1] رواه الطبرانی فی المعجم الکبیر، قال فی مجمع الزوائد رجال هذا الحدیث ثقات.

یقول: لا یجتمع ملاء فیدعو بعضهم ویومن البعض الا اجابهم الله)) [1]

سند کی تحقیق:

اس حدیث کی سند کے جملہ رواۃ حاکم کے شیخ سے لے کر صحابی سیدنا حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ تک سب کے سب ثقہ وصدوق ہیں عبداللہ بن لہیعہ بھی صدوق ہے۔ گو وہ احتراق کتب کے بعد مختلط ہو گیا تھا لیکن کتب رجال حدیث میں ائمہ فن کی تصریحات ملتی ہیں کہ ابن لہیعہ سے روایت کرنے والے جب عبداللہ بن وہب، عبداللہ بن المبارک، عبداللہ بن یزید ابو عبدالرحمٰن المقری، عبداللہ بن مسلمہ القعنبی اور ولید بن مزید بیروتی (والد العباس) ہوں تب ان کی روایات صحیح ہوتی ہیں کیونکہ ان حضرات نے ابن لہیعہ سے احتراق کتب سے قبل سماع کیا تھا اور چونکہ اس روایت میں بھی ابن لہیعہ سے راوی ابو عبدالرحمٰن المقری، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہے اس لیے یہ روایت صحیح ہے اور سند بے غبار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور حافظ ذہبی نے اس پر اپنی صاد کر دی۔

متن حدیث:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی اجتماع ہو اور اس میں کوئی دعا کر رہا ہو اور کچھ لوگ اس پر آمین کہہ رہے ہوں تو ان کی دعا اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے۔

یہ عمومی الفاظ حدیث کے ہر اجتماع کو شامل ہیں کوئی اجتماع جو وعظ ونصیحت کا ہو، جنگ وجہاد کا ہو نماز کے لیے ہو، ان سب کو شامل ہے۔ آپ ﷺ نے اس کو کسی خاص اجتماع سے مخصوص نہیں فرمایا اور نہ کسی خاص اجتماع مثلاً نماز وغیرہ کی دعا کو اس سے مستثنیٰ ہی کیا، لہٰذا جب یہ معلوم ہوا کہ فرض نماز کے بعد استجابت دعا کا زیادہ موقع ہوتا ہے اور اجتماعی صورت اور بھی زیادہ قبولیت کا موجب ہوتی ہے تو کیوں نہ فرضی نماز کے بعد اجتماعی طور پر دعا کی جائے؟ عمومات کتاب وسنت سے ساری امت اور ہر مکتب فکر کے لوگ علماء وفضلاء سلف سے خلف تک حجت لیتے آئے ہیں اگر یہاں بھی اس عموم سے استدلال کیا جائے تو اس سے کونسا محذور لازم آئے گا؟ بعض ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے ترغیب تو دی ہے لیکن کسی حدیث میں خود آپ ﷺ کا فعل اس کے مطابق نظر نہیں آتا۔ مثلاً آپ ﷺ کا ارشاد "بین کل اذانین صلوٰۃ" [2] اور یہ عموم ارشاد سب فرضی نمازوں کو شامل ہے اس لیے اہل حدیث وغیر اہلحدیث عشاء کی نماز سے پہلے بھی دوگانہ ادا کرتے ہیں اور ان کو مسنون (قولی) ومستحب اور اجر وثواب کا کام جانتے ہیں ہم اس پر عمل کرتے ہیں لیکن کسی صحیح حدیث میں یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی عشاء سے پہلے کبھی کچھ پڑھا ہے عدم نقل کے باوجود ساری امت اس پر عمل کرتی ہے، اس لیے کہ اس پر قولی دلیل عمومی وارد ہے اور جید سند سے آپ ﷺ کا مغرب سے پہلے دو رکعت ادا کرنا ثابت ہے گو یہ بھی کوئی ایک مرتبہ۔ اگر اللہ کے رسول مقبول ﷺ سے کسی عمل کے متعلق ترغیب صحیح طور پر وارد ہے تو اس پر عمل کرنا مسنون ومندوب ہے اور اجر وثواب کا کام ہے اگرچہ خود آپ ﷺ کی ذات مطہرہ سے

---

[1] المستدرك للحاكم: ٣٤٧/٣.

اس کے موافق فعل صحیح حدیث میں نہ بھی وارد ہو کیونکہ محققین کے نزدیک قول فعل سے راجح، مقدم اور اہم ہے، لہٰذا جب قولی حدیث سے اجتماعی دعا کا ثبوت ملتا ہے اور وہ اپنے عموم کی وجہ سے نماز کی اجتماعی ہیئت کو بھی شامل ہے تو پھر اس کو روکنے کا کیا مطلب اور اس کو بدعت سمجھنا کیا معنیٰ وارد؟

یہ عجیب معاملہ ہے کہ اس اجتماعی دعا کے متعلق بعض احباب فرماتے ہیں کہ: ''بدعت کے اندیشہ سے کسی بات کا چھوڑ دینا اس کو کرنے سے بہتر ہے اور احوط ہے۔'' لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ جب عمومی دلیل موجود ہے اور شارع بارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے کسی اجتماع کو مستثنیٰ بھی نہیں کیا گیا تو یہ بدعت نہیں ہوا کرتی۔ اگر اس طرح ہر بات کو بدعت ہی قرار دیا جاتا ہے تو فرمایئے یہ ہمارے مدارس موجودہ ہیئت کذائی کے لحاظ سے بدعت نہیں ہیں۔ ہمارے دینی پروگرام کا آغاز کلام پاک کی تلاوت سے ہوتا ہے۔ پھر وعظ وارشاد شروع ہوتا ہے لیکن بتایئے کہ کس حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ بھی دینی اجتماعات اور تبلیغی جلسے اس طرح کیے کرتے تھے۔ قرآن حکیم کی تلاوت یقیناً خیر وبرکت کا باعث ہے لیکن ان حضرات کے کہنے کے مطابق اس میں بدعت کا اندیشہ ہے کیونکہ کسی حدیث مرفوع صحیح بلکہ موضوع میں بھی یہ نہیں آیا کہ آپ ﷺ نے پہلے کسی دوسرے سے تلاوت شروع کروائی اور پھر وعظ نصیحت کا آغاز فرمایا ہو تو کیا ان کے ارشاد کے مطابق یہ بدعت نہیں؟ اور پھر ہم آپ سب اجتماع کے اختتام پر اجتماعی طور پر دعا کرواتے ہیں کیا یہ اجتماعات دینی حیثیت کے حامل نہیں؟ لیکن اگر ان اجتماعات کی اجتماعی دعا کو یہ حضرات مذکورہ بالا جیسی حدیث سے ثابت کریں گے تو یہ صحیح ہوگا اور بدعت نہ رہے گا لیکن اس صورت میں پھر نماز کے اجتماع کو باہر نکالنے اور اس کو اس سے مستثنیٰ کرنے کے لیے ان کو ایک مستقل دلیل کتاب وسنت سے پیش فرمانا ہوگی۔ ویسے ہی اپنے خیال سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان عمومات کو محض اپنے کسی خیال یا اندیشہ کی وجہ سے مخصوص کر دے اگر یہ طریقہ چل نکلا تو پھر بے دین لوگ بہت سی عام باتوں کو مخصوص (کسی خاص آدمی کے ساتھ یا کسی مخصوص عمل وموقع کے ساتھ) کریں گے اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا وہ بخوبی جانتے ہیں۔

اب ایک اور صحیح حدیث پیش خدمت ہے جو صحیح بخاری میں کتاب الاستسقاء میں تحت باب ''رفع الناس ایدیھم مع الامام فی الاستسقاء'' میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((قال (ای انس رضی اللہ عنہ) اتی رجل اعرابی من اھل البدو الی رسول اللہ ﷺ یوم الجمعة فقال یا رسول اللہ ھلکت الماشیة، ھلکت العیال، ھلکت الناس فرفع رسول اللہ ﷺ یدیه یدعو ورفع الناس ایدیھم مع رسول اللہ ﷺ یدعون)) [1]

---

[1] اخرجه البخاری فی صحیحه، کتاب الاذان، باب بین کل اذانین صلاة لمن شاء، رقم الحدیث: ٦٤٧.

[1] اخرجه البخاری، فی صحیحه، کتاب الاستسقاء باب، رفع الناس ایدیھم مع الامام فی الاستسقاء، رقم الحدیث: ١٠٢٩.

اس اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جب آپ ﷺ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تھے تو لوگ بھی آپ کے ساتھ ہاتھ اٹھا لیتے تھے اور حدیث کے ظاہر سیاق سے یہی صحابہ کا معمول ہوتا ہے۔ یہ حدیث گو استسقاء کے موقع پر وارد ہے لیکن اس کے متعلق میری چند گذارشات ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ اعرابی جو آیا تھا اس نے رسول اللہ ﷺ کو ہی دعا کے لیے عرض کیا تھا اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو نہیں کہا تھا کہ آپ بھی میرے لیے دعا کریں۔

۲۔ نبی کریم ﷺ نے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو امر نہیں فرمایا کہ تم بھی ہاتھ اٹھاؤ کیونکہ اس کے متعلق حدیث میں ایک لفظ بھی نہیں۔

۳۔ یہ دعا عمومی نہیں تھی، یعنی عام طور پر سب لوگوں نے بارش کے لیے دعا طلب نہیں کی تھی بلکہ یہ صرف وہ اعرابی رسول لے کر حاضر ہوا تھا اور پھر جب ایک ہفتہ تک بارش پڑتی رہی تو وہی آ کر پھر اس کی بندش لیے دعا کا طالب ہوا تھا ورنہ عمومی حالت میں جیسا کہ روایات میں آتا ہے کہ آپ لوگوں کو لے کر عیدگاہ جاتے دوگانہ ادا کرتے تحویل ردا کرتے اور دعا بھی فرماتے چونکہ یہ عامۃ الناس کے تقاضا سے تھا، لہٰذا اس وقت اگر سب لوگ ہاتھ اٹھا لیتے ہوں۔ تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سب اپنے لیے دعا کرتے ہیں لیکن یہاں یہ صورت نہیں، نہ ہی عامۃ الناس سے دعا کروائی تھی بلکہ دعا کرانے والا صرف ایک بدوی تھا۔ اور اس بدوی نے اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ لوگوں کو ہاتھ اٹھانے کے لیے نہیں کہا تھا لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے تو اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا معمول تھا کہ جب آپ ﷺ ہاتھ اٹھاتے تو وہ بھی ساتھ ہی اٹھاتے۔

اسی لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے۔ لبیان اتباع المامومین الامام فی رفع الیدین ۔ یعنی اس میں یہ بیان ہے کہ امام کے اتباع میں مقتدی ہاتھ اٹھا سکتے ہیں اور اوپر یہ حدیث پیش کر چکا ہوں کہ نبی کریم ﷺ فجر کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا فرماتے رہے اور ابن الزبیر والی عام حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کے بعد آپ ﷺ ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے تھے۔ جب آپ ہاتھ اٹھاتے ہوں گے اگرچہ یہ منقول نہیں اور عدم نقل وعدم ذکر عدم وجود کو مستلزم نہیں یہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ کا دین ہے جو من وعن موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون فرمایا۔ نزلنا القرآن الخ نہ فرمایا یعنی قرآن بمع تشریح وتفصیل (حدیث) کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہوئی ہیں جن کی نقل ابھی تک ہمیں نہیں ملی اور کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو ہمارے اسلاف کو نہ ملیں لیکن ہمیں مل گئیں۔ اسی طرح وہ باتیں جو ہم کو نہیں مل سکیں ممکن ہے کہ مستقبل میں ان کے متعلق بھی ہمیں نقل صحیح مل جائے۔ وما ذالك علی اللہ بعزیز ۔ مثلاً نماز میں رکوع کے بعد وضع کرنا چاہیے یا ارسال؟ لیکن اس مسئلہ کے متعلق کوئی نص

صریح تو بہر حال کسی کی جانب نہیں ہے اگر نص صریح ہوتی تو کم از کم اہل حدیث میں تو اختلاف نہ ہوتا بہر صورت نص صریح نہیں اور جس نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ اگرچہ احادیث نبوی پر مبنی ہے لیکن ان سب کی حیثیت استنباط و اجتہاد کی ہے حالانکہ علماء بخوبی جانتے ہیں کہ نماز کے متعلق ایک ایک جزء منقول ہوتا ہے۔ کچھ باتیں پہلے معلوم نہ تھیں۔ کتب حدیث (مزید) سامنے آئیں تو وہ معلوم ہوگئیں ابھی کئی کتب حدیث ہم سے غائب ہیں۔ ممکن ہے ان میں اس مسئلہ پر بھی کوئی نص صریح ہو۔ بہر حال عرض صرف یہ کرنا ہے کہ ایسی باتیں بھی ہیں جن کی نقل صحیح نہیں ملی لیکن پھر بھی ہم یہ خیال رکھتے ہیں کہ نقل ضرور ہوگا۔ ہمیں ابھی تک نہیں ملا۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ نماز کے بعد اجتماعی حیثیت سے دعا کے متعلق بھی کوئی نص ہو۔ گو وہ اب تک ہم تک نہیں پہنچ سکی اور اگر معاملہ اجتہاد تک پہنچ گیا ہے تو پھر ہمیں بھی گنجائش ہے، اور اس کے متعلق آگے عرض کر رہا ہوں۔

اس مسئلہ پر پھر ایک طرح سے غور فرمائیں۔ بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کی صراحت کتاب و سنت میں نہیں ہے اور اس کے لیے شریعت نے اجتہاد و استنباط کی اجازت مرحمت کی ہے جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا کہ اگر کوئی بات کتاب و سنت میں صراحتاً تم کو نہ ملے تو کیا کرو گے؟ تو سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اجتہاد کروں گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا۔ اور اسی اجتہاد و استنباط کی وجہ سے آج تک علماء محققین پیش آمدہ مسائل کا حل پیش فرماتے رہے بلکہ قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ جتنے کچھ نئے مسائل امت کو درپیش ہوں گے ان کا وجود کتاب و سنت سے ملتا رہے گا۔ صراحتاً نہیں تو استنباطاً۔ لہٰذا کیوں نہ ہم بھی مسئلہ زیر بحث پر اجتہاد و استنباط کریں؟ تو آپ جانتے ہیں کہ احادیث میں یہ تو نہیں آتا کہ فرضی نماز کے بعد اجتماعی ہیئت میں دعا نہ کیا کرو اور نہ ہی یہ وارد ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میمون میں صحابہ رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اجتماعی طور پر دعا نہیں کیا کرتے تھے۔ صرف اس کے متعلق سکوت ہے، یعنی نہ اثبات اور نہ نفی۔ اب اگر ہم احادیث کی روشنی میں اس مسئلہ پر اجتہاد کریں تو اس میں کیا قباحت ہے؟ البتہ یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ اجتہاد قواعد علمیہ کے مطابق ہے یا نہیں اور کتاب و سنت کو سامنے رکھ کر ان کے اشارات، اقتضاءات، عبارات، عمومات، اطلاقات وغیرہم سے استنباط کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر یہ باتیں ہیں تو وہ اجتہاد صحیح ہے اب اس بات کو ذہن میں رکھ کر میری اوپر ذکر کی ہوئی گذارشات پر مکرر سہ کرر اور بہ دقت نظر کسی جانب میلان سے خالی ہو کر پھر فیصلہ فرمائیں کہ کیا میں نے جو استنباط کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟ اگر قواعد علمیہ کے مطابق اس میں کوئی غلطی ہے تو اس کا اظہار فرمائیں اگر صحیح ہے تو پھر اس کو بدعت کہنے سے رجوع فرمالیں اور اس کو مندوب و مستحب سمجھیں۔

مزید ایک حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

امام مسلم اپنی صحیح میں سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث لائے ہیں:

((قالت امرنا رسول اللهﷺ ان نخرجهن في الفطر والاضحى العواتق والحيض وذوات الخدر فاما الحيض فيعتزلن الصلوات ويشهدن الخير ودعوة المسلمين)) ❶

اس میں واضح طور پر عورتوں کو بھی مسلمانوں کی اجتماعی دعا میں شرکت کرنے کی ترغیب ہے کیونکہ حیض والیاں جو مصلی میں حاضر ہوں گی وہ نماز تو نہیں پڑھیں گی۔ (فیعتزلن الصلواة) باقی دعوۃ المسلمین کیا رہی؟ بس یہی کہ وہ بھی ان کے ساتھ دعا کرنے میں شریک ہوں۔ باقی رہا ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ تو پہلے صحیح حدیث پیش کر چکا ہوں کہ دعا کے آداب میں سے ہاتھ اٹھانا بھی ہے۔ کوئی شاید کہے کہ یہ احادیث تو پہلے سے موجود ہیں لیکن سلف میں سے کسی نے یہ مسئلہ نہیں نکالا اور آج بھی عام اہل حدیث کا یہی خیال ہے کہ یہ کام مسنون نہیں، پھر آپ کے استنباط کی کیا حقیقت ہے؟ کیا تم سلف صالحین سے علم میں بڑھے ہوئے ہو؟ تو اس کے بارے میں یہ گذارش ہے کہ راقم الحروف اپنے آپ کو حاشا وکلا۔ سلف صالحین بلکہ موجودہ صالحین علماء سے بھی علم میں زیادہ تصور نہیں کرتا لیکن یہ اللہ کا دین ہے کسی کی سلف میں سے ہو یا خلف میں سے میراث نہیں۔ ہر ایک کو بشرطیکہ اس میں اس کی کچھ اہلیت ہے یہ حق ہے کہ اس سے مستفید ہو اور کتاب وسنت کی روشنی میں استخراج واستنباط کرے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ:

گاہ باشد کہ کودک نادان
بغلط برہدف زند تیرے

اگر ایک بات سلف کے خیال میں نہیں ائی اور خلف میں سے کسی کو وہ بات سمجھ میں آ گئی تو اس پر یہ لازم نہیں آ تا کہ وہ سلف سے علم وفضل میں زیادہ ہو گیا اور نہ ہی یہ مناسب ہوگا کہ یہ بات چونکہ خلف میں سے کسی نے کہی ہے اور سلف میں سے کسی نے اس سے تعرض نہیں کیا، لہٰذا وہ مسترد و باطل ہے اگر چہ وہ قواعد شرعیہ وعلمیہ کے ماتحت ہو۔ بلکہ حدیث (فرب مبلغ اوعى من سامع) میں خلف کی ایک گونہ منقبت نکلتی ہے یعنی خلف میں بھی ایسے ہوں گے جو کتاب وسنت کے ارشادات عالیہ سے زیادہ مستفید ہوں گے اور ان سے کافی ووافی استخراج مسائل واستنباط نوازل کا کریں گے، پھر اس میں کیا خرابی ہے کہ اس احقر العباد نے اگر ایک بات مستخرج کی اور وہ صحیح استنباط ہے گو وہ سلف میں سے کسی نے پیش نہ کی ہو۔

ایک بات اور اس سلسلہ میں سامنے آتی ہے کہ آیا اس کام پر دوام کرنا درست ہے یا نہیں؟ تو اس کے متعلق بھی راقم الحروف کی یہ تحقیق ہے کہ اگر اس کو نماز کے لوازمات یا شرائط میں سے نہ تصور کرے اور نہ کرنے والے پر نکیر، یا طعن وتشنیع نہ کرے اور نہ کرنے کو برا سمجھے تو وہ اس پر مداومت کر سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ رمضان

---

❶ اخرجه البخاري في كتاب العيدين، باب خروج النساء والحيض الى المصلى، رقم الحديث: ٩٧٤۔ مسلم في صحيحه، كتاب صلاة العيدين، رقم الحديث: ٢٠٦١.

المبارک میں تراویح باجماعت پر ساری امت کا ہمیشہ سے عمل رہا ہے۔ مقلدین وغیر مقلدین اہل حدیث وغیر اہلحدیث، یعنی ساری دنیا میں ہر رمضان المبارک میں اس پر عمل ہوتا ہے اور اس کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ اور اجر وثواب کا کام سمجھا جاتا ہے لیکن احادیث صحیحہ کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف دو تین راتیں اس قیام اللیل کو باجماعت ادا فرمایا ہے۔ پھر نہیں کیا، لیکن جب باجماعت ثبوت ہوگیا گوایک دومرتبہ ہی سہی تو وہ کام مسنون ہے۔ اس پر مداومت بھی جائز بلکہ مستحب ہے لیکن اگر کوئی قیام رمضان باجماعت کو لازمی وفرض وواجب قرار دے تو یہ احداث فی الدین ہوگا۔ مندوبات ومستجاب کو استحباب پر ہی رکھنا چاہیے اس سے اٹھا کر وجوب اور لزوم تک لے جانا تجاوز عن حدود اللہ ہے۔ لہٰذا صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ضروری باتوں کو مدنظر رکھ کر اگر کوئی اس فعل پر مداومت کرتا ہے تو یہ درست ہے اور مندوب ومسنون ہے اگر کوئی کبھی کرتا ہے کبھی نہیں کرتا تو وہ بھی صحیح طریقہ پر ہے۔ اگر کوئی بالکل ہی نہیں کرتا تو وہ بھی غلط طریقہ پر نہیں کیونکہ یہ چیز مستحبات میں سے ہے لزومی نہیں، لہٰذا اگر اس کے تارک پر یا استمرار نہ کرنے والے پر کوئی نکیر کرتا ہے یا اس پر طعن وتشنیع کی زبان کھولتا ہے، اس کو برا بھلا کہتا ہے یا اس کے متعلق ناگوار الفاظ نکالتا ہے تو یہ ناجائز فعل کرتا ہے اور جو چیز لازم اور واجب نہ تھی اس کو واجب قرار دینے کی وجہ سے وہ مبتدع ہے۔ بہرکیف اس مبحث پر مزید لکھنے سے اجازت چاہتا ہوں میں اس تحقیق میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں یہ فیصلہ علماء وفضلاء کو کرنا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

ایک بات رہ گئی وہ بطور تذنیب یا (P.S) عرض کرتا ہوں۔ صحیح بخاری کی حدیث کے متعلق یہ سوال ہوسکتا ہے کہ امام المحدثین نے تو اس پر باب "رفع الناس ایدیھم مع الامام فی الاستسقاء" باندھا ہے۔ گویا انہوں نے بھی اس کو استسقاء کے موقعہ سے مخصوص سمجھا؟ اس کے بارے میں یہ گذارش ہے کہ امام ہمام نے فی الاستسقاء کے الفاظ اس لیے باب میں داخل کیے کہ اس حدیث میں استسقاء کے موقعہ کا ہی ذکر ہے۔ اگر صرف "رفع الناس ایدیھم مع الامام" لکھتے تو یہ باب کتاب الاستسقاء میں لانے کی کوئی وجہ نہ ہوتی۔ غور فرمائیں باقی رہا اس سے مزید استنباط تو یہ دوسروں کا کام ہے۔ امام والمقام اس استنباط کے منکر نہیں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام بخاری باب منعقد کرکے ایک حدیث اس کے تحت لاتے ہیں، پھر شرح اس حدیث کو ترجمۃ الباب سے مناسبت کی توجیہ کرکے ترجمۃ الباب کے علاوہ بہت سے مسائل اور فوائد اس حدیث سے مستنبط کرتے ہیں، لہٰذا یہ کوئی معیوب نہیں یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کے متعلق حافظ صاحب نے جو فتح الباری میں استنباط کیا ہے وہ اوپر گذر چکا ہے اور میں نے جس طرح اس سے مسئلہ زیر بحث سے متعلق استخراج کیا ہے وہ بھی گذر چکا ہے۔ وللہ الحمد

۴۔ مسند احمد والی حدیث جس میں 'رات' کی قید ہے اس کی سند صحیح ہے۔ امام احمد کا شیخ ہاشم۔ یہ ابن القاسم ابوالنضر ہیں اور یہ ثقہ ہیں۔ اس کا شیخ لیث ہیں اور یہ ابن سعد ہیں جو امام فقیہ ثقہ ہیں ان کے شیخ جعفر بن ربیعہ ہیں وہ بھی ثقہ ہیں۔ پھر عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج ہیں وہ بھی ثقہ ہیں پھر سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں سند

بہرحال صحیح ہے۔

۵۔ بیہقی کا اثر (سعید بن جبیر کا) اس کی سند کے اور تو سب رواۃ ثقہ ہیں صرف حاکم کے شیخ کا شیخ یعقوب بن یوسف الاخرم کا پوری طرح سے ترجمہ تا حال نہ مل سکا۔ صرف اتنا معلوم کر سکا ہوں کہ یہ مشہور امام اور حافظ ابوعبداللہ محمد بن یعقوب کے والد ہیں اور تذکرۃ الحفاظ میں ذہبی نے حافظ ابوعبداللہ محمد بن یعقوب کے والد ہیں اور تذکرۃ الحفاظ میں ذہبی نے حافظ ابوعبداللہ محمد بن یعقوب بن یوسف الاخرم کے ترجمہ میں اتنا لکھا ہے کہ "یعرف ابوہ بابن الکرمانی" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معروف ہیں مجہول نہیں۔ اس سے زیادہ ابھی تک کچھ تحقیق نہیں ہو سکی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی سند جید ہوگی۔ امام بیہقی کا شیخ حاکم ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ روایت مستدرک میں شاید ہو لیکن ابھی تک ملی نہیں۔ میں تلاش کر رہا ہوں اگر مستدرک میں مل گئی اور حاکم کی طرف سے اس کی تصحیح اور حافظ ذہبی کی اس پر صاد مل گئی تو ان شاء اللہ عرض کر دوں گا۔

۶۔ میمون المکی کے متعلق تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ اس سے راوی صرف عبداللہ بن ھبیرۃ السبائی المصری ہے اور کسی امام سے جرح وتعدیل نقل نہیں کی۔ لہٰذا وہ مجہول ہی ہے اور یہی کچھ حافظ ذہبی میزان میں فرماتے ہیں۔ میمون المکی (وعن ابن عباس) التہذیب میں مزید ابن الزبیر کا بھی ذکر ہے۔

((لا یعرف تفرد عنه عبدالله بن هبیرة سبائی))

باقی رہا ابن جوزی، زیلعی اور علامہ الکھنوی کا سکوت اور مجرد سکوت سے کسی راوی کی توثیق وتعدیل نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات اس کے لیے بھی سکوت اختیار کر لیا جاتا ہے کہ وہ روایت شواہد ومتابعات میں ہوتی ہے اور شواہد ومتابعات میں جو تسامح کیا جاتا ہے وہ اصول میں نہیں کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک بات صحیح طور پر ثابت ہے۔ اب اگر اس کی مزید کوئی اور روایت جو نسبتاً کمزور ہے ضعیف ہے یا اصالۃً احتجاج کے قابل نہیں موجود ہے تو اس اصل حدیث کے لیے بطور شاہد پیش کرنے میں کوئی خرابی نہیں۔ رفع الیدین کے بارے بھی بہت سی صحیح روایات موجود ہیں۔ لہٰذا اس کی تائید میں اگر کوئی دوسری ضعیف روایت بھی ذکر کی گئی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لہٰذا اس پر سکوت کر لیا۔

والله اعلم وعلمه اتم واحکم وهو اعلم بالصواب
وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

❁❁❁❁

پردہ اور اسلام

اس وقت اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ہمارے معاشرہ میں ایک مغرب زدہ طبقہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جس نے یہی ٹھان لی ہے کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنے مغربی ماسٹروں کو ضرور ہی راضی کرے گا۔ اور اسی طبقہ کے دیکھا دیکھی ہماری نوجوان نسل سے غیرت نام چیز کا جنازہ نکل چکا ہے اور اس مضمون میں پردے کی اہمیت اور پردے کی دیگر جز کو قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے تاکہ ہماری نوجوان نسل اسے پڑھ کر کفار کے پروپیگنڈہ سے بچ سکے۔

عنوان بالا پر پہلے ہی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس وقت اس پر قلم اٹھانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ہمارے معاشرہ میں ایک مغرب زدہ طبقہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جس نے یہی ٹھان لی ہے کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنے مغربی ماسٹروں کو ضرور ہی راضی کرے گا۔ اسی لیے اسلام کے احکامات واضح اور قرآن کریم کی آیات بینات میں تحریف وتبدیل تک کا ارتکاب کرنے میں ان کو ذرہ بھر بھی پس و پیش نہیں ہوتا، ویسے اس طبقہ کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ جناب حضرت رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو دین میں حجت نہیں تسلیم کرتا لیکن ایسے حضرات جب کوئی ایسی حدیث پا لیتے ہیں جو بظاہر ان کے ہوائے نفسانی کی مؤید ہو تو انتہائی ڈھٹائی سے اس کو لے کر معرض استدلال میں پیش کر دیتے ہیں گو وہ پایۂ اعتبار سے کتنی ہی کیوں نہ گری ہوئی ہو۔ اسی مسئلہ (پردہ) کو ہی لے لیجئے یہ مسئلہ کتاب عزیز میں بالکل واضح شکل میں موجود ہے۔ اس کا مقصد اور اس کے حدود کا تعین قرآن مجید سے واضح طور پر ہو جاتا ہے لیکن ان متجددین کے زعم باطل کے بموجب یہ ارشادات عالیہ چونکہ ان کی نام نہاد نئی روشنی کے مخالف تھے یا پھر یوں کہیے اس فرمان الٰہی کی تعمیل سے ان کی ندیدا آنکھوں کے لیے ضیافت کا سامان مہیا نہیں ہوتا تھا اور یہ احکام (بانیہ) ان کی ہوا و ہوس کی تسکین کی راہ میں زبردست سنگ راہ تھے لہٰذا انہوں نے اس فرمان واجب الاذمان سے پہلو تہی کرنے کے لیے چور دروازے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ کافی تگ و دو کے بعد آخر انہوں نے دو حدیثیں ابوداؤد اور تفسیر ابن جریر طبری سے نکال لیں۔ اب ان کی خوشی کی حد نہ رہی اور لگے بغلیں بجانے کیونکہ ان حدیثوں کی رو سے عورت کو منہ کھلے رکھنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ پھر کیا تھا ان صاحبوں نے کتاب کی آیات کا ترجمہ وتفسیر بھی اسی رنگ وڈھنگ پر بیان کرنا شروع کر دیا حالانکہ عورت کو اگر منہ کھولے رکھنے کی اجازت ہو تو پردہ والے حکم کا مقصد بالکلیہ فوت ہو جاتا ہے اور یہ ارشاد ربانی بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہ عورت کا چہرہ ہی جسم کا وہ حصہ ہے جو سارے فتنوں کا باعث ہوتا ہے کیا کبھی آپ نے سنا کہ فلاں آدمی کسی عورت کے کنگن یا انگشتری کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گیا یا کبھی یہ بھی سننے میں آیا کہ ایک مرد نے کسی صنف نازک کے لباس کو دیکھ کر اس پر اپنے دل کو نچھاور کر دیا، یا کبھی آپ کی آنکھوں کے سامنے سے ایسی خبر گزری ہے جس میں یہ مرقوم ہو کہ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے نے محض نسوانی ہاتھ اور پاؤں پر لٹو ہو کر اپنا سب کچھ تباہ کر دیا، ان سب سوالات کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ آپ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ اس عشق فسق اور فتنہ وفساد کی ابتداء آنکھوں سے ہی ہوتی ہے اور آنکھیں قدرت نے چہرہ ہی میں رکھی ہیں۔

اور اس حقیقت سے بھی کسی عقل سلیم رکھنے والے انسان کو انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ جنس کثیف (مرد) کی جملہ فتنہ سامانیاں پیدا کرنے والے اہم عناصر یہی جنس لطیف کے چہرہ کے خدوخال ہی ہیں۔ اس صورت میں اگر عورت کو

جسم کے اسی حصہ کو کھلا رکھنے کی رخصت مل جائے جو اصل طوفان و ہیجان کا باعث ہے تو پردہ کے حکم سے کیا حاصل۔

ان دو حدیثوں پر سنداً و متناً کلام تو بعد میں آئے گا سر دست عرض یہ کرنا تھا کہ ان متجددین حضرات کی کیسی عجیب و متضاد حالت ہے کہ یا تو حدیث کے نام سے ہی بدکتے ہیں یا پھر جب ان کو اپنے مطلب کی کوئی روایت مل جاتی ہے تو شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر اسی روایت پر جھپٹ پڑتے ہیں اور اس کو لے کر میدان میں آجاتے ہیں دراصل ان کو نہ کتاب اللہ سے واسطہ ہے اور نہ سنت الرسول ﷺ سے کچھ سروکار۔ انہوں نے تو اپنی ہوائے نفسانی کو ہی معبود بنا رکھا ہے۔ اس لیے اگر کبھی بھول کر بھی کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہ بھی محض اپنی خواہشات نفسانیہ کے لیے وجہ جواز تلاش کرنے کے لیے حق وصحیح بات کی جستجو تو ان کے مدنظر ہوتی ہی نہیں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا۝﴾ (الفرقان: ٤٣)

''اے نبی کیا تو نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے، جس نے اپنی خواہشات نفسانیہ کو خدا بنالیا ہو، کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو۔''

اب میں پہلے قرآن حکیم سے چند آیات پیش کرتا ہوں جن سے زیر بحث موضوع اچھی طرح نکھر کر سامنے آجائے گا۔ اس کے بعد نئی ظلمتوں کے علمبرداروں کے دلائل ذکر کر کے ان کا، بفضل اللہ وحسن توفیقہ پوری طرح تجزیہ کروں گا۔ وما توفیقی الا باللہ علیه توکلت والیه انیب.

دلیل نمبر ۱:

اٹھارویں پارہ میں سورۃ نور میں یہ آیت وارد ہے:

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ....﴾ الآیة (النور: ٣١)

''یعنی اے نبی (ﷺ) مومنہ عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی (غیر مردوں سے) حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کیا کریں، بجز اس کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں سے بکل مارا کریں اور اپنی زینت (سنگھار وغیرہ) نہ ظاہر کریں مگر (ان لوگوں کے سامنے) شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے وغیرہ۔''

اس آیت کریم میں زینت کا لفظ نہایت اہم اور قابل غور ہے ایک سطحی آدمی اس سے صرف بالائی سنگھار یا زیورات وغیرہ مراد لے گا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہاں زینت سے مراد پیدائشی خواہ مصنوعی دونوں سنگھار مراد نہیں، یعنی عورت کی ہر وہ چیز یا عضوہ جو مرد کے لیے کشش کا باعث ہو وہ زینت میں داخل ہے مثلاً منہ، چھاتی، باہیں،

ٹانگیں، بلکہ ہاتھوں اور پاؤں کے سوا عورت کا سارا جسم جنسی کشش (Sex appeal) کا ایک بڑا گودام ہے اسی طرح مصنوعی سنگھار بھی اسی ربانی ممانعت کے تحت آ جاتا ہے۔ یعنی پف پاؤڈر، لپ اسٹک، سرمہ و کاجل میک اپ، کان کے اسرنگ، ٹاپس، ناک کا ہیرا، گلے کا ہار وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے اس دعویٰ پر ذیل کے دلائل ملاحظہ ہوں:

ا۔ آیت کریمہ میں زینت کا لفظ وارد ہے اس کا اطلاق خلقی (پیدائشی) اور مصنوعی سنگھار دونوں پر ہوتا ہے۔'' اس لیے اس لفظ کو انگشتری، چھلے کے لیے مخصوص کرنے کا حق نہیں ہے، جب خود رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کو کسی مخصوص سنگھار میں محدود نہیں کیا تو اوروں کو اس کا حق کیسے پہنچتا ہے۔

۲۔ یہ احکامات جنسی بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لیے دیے جا رہے ہیں۔ اور یہ بالکل ظاہر و باہر ہے کہ عورت کی اسی چیز کو پردہ میں رکھنا ہے جو اسی جنس بے راہ روی کا موجب بن رہی ہو۔ اب خدارا انصاف کیجئے کہ انگشتری چھلے وغیرہ میں کون سی جنسی کشش ہے جس کو چھپانے کے لیے یہ ارشاد ہو رہا ہے، بلکہ جنسی کشش کے اصلی اسباب تو عورت کے جسم کے وہ نقوش ہیں جن پر نظر پڑتے ہی مردوں کے ہوش و حواس گمراہ ہو جاتے ہیں مثلاً منہ، چھاتی وغیرہ پھر یہ کتنی تعجب کی بات ہے کہ جو چیز اشتعال انگیز ہے اس کو تو ظاہر کرنا منع نہ ہو لیکن ان چیزوں کو چھپانے کا امر ہو رہا ہے جن کا ان خرابیوں کے وجود میں لانے میں کوئی واسطہ ہی نہ ہوا۔

۳۔ اس آیت کریمہ میں ایماندار عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ فلاں وفلاں لوگوں کے سوائے دوسروں پر اپنی زینت ظاہر نہ کریں اب غور طلب یہ بات ہے کہ اگر زینت سے مراد چہرہ وغیرہ نہیں ہیں اور ان کے چھپانے کا حکم نہیں ہے تو پھر جن لوگوں کے سامنے عورت کو اپنی زینت کا اظہار کرنے کی اجازت اس آیت کریم میں مرحمت فرمائی جا رہی ہے۔ ان لوگوں اور دوسروں میں کیا فرق رہا، کیا ان محرم لوگوں کے سامنے عورت بالکل ننگی ہو سکتی ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر جن اعضاء کو وہ عورت محرم لوگوں کے سامنے کھلا رکھ سکتی ہے یعنی چہرہ وغیرہ اگر وہی غیر محرم لوگوں (اجانب) کے سامنے بھی کھلا رکھ سکتی ہے تو محرم غیر محرم کا تفاوت کیا ہوا۔ اور اس صورت میں یہ اجازت (محرم لوگوں کے سامنے اظہار زینت) نعوذ باللہ، بالکل مہمل ہو جاتی ہے اور اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں رہتا، اس پر خوب غور کریں اصل بات تو یہ ہے کہ عورت کا پیدائشی حسن نہ کہ مصنوعی ہار و سنگھار ہی فتنہ کا باعث ہوتا ہے۔ حسین عورت کتنا ہی سادہ لباس میں ملبوس ہو اور مصنوعی سنگھار سے بالکل عاری ہو لیکن اس کا خداداد حسن وہ قیامت برپا کر سکتا ہے جس کی حد ہی نہیں۔ خارجی و مصنوعی سنگھار اور زیب و زینت اصل خلقی حسن میں اضافہ کا سبب تو ہوتا ہے لیکن ان خرافات میں مبتلا ہونے کا اصلی سبب ان ہی کو قرار دینا اپنی عقل کا دیوالیہ نکالنا ہے اس کے باوجود اگر کسی کو زینت سے مصنوعی سنگھار مراد لینے پر اسرار ہے تو پھر لپ اسٹک، کاجل، ناک کا ہیرا، کانوں کے ٹاپس، سر کے بالوں کے بکل اور ان میں گلاب کے پھول کیا یہ بھی سنگھار اور زینت سے خارج ہیں، اگر نہیں تو ان کو کیسے چھپایا جائے گا، بغیر پردہ اور نقاب کے یہ سنگھار کی چیزیں کیسے چھپائی جا سکتی ہیں، ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب وہ

اجنبی کے سامنے آئے تو یہ چیزیں اتار لے لیکن اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ اصل چیز جو فتنہ سامانی کا باعث ہیں وہ یہی ہیں حالانکہ یہ حقیقت اور واقعہ سے دور کی بات ہے۔ یا پھر آپ یہ کہیں کہ اسلام نے ان چیزوں کے چھپانے کا امر اس لیے کیا کہ یہ زیورات وغیرہ دیکھ کر کوئی چھین نہ لے یا چوری نہ کرے کیونکہ یہ چیزیں جنسی کشش کا اصلی باعث تو ہیں نہیں جس کے لیے یہ احکامات دیئے جا رہے تھے لیکن اس کا تو یہ مطلب ہوگا کہ شریعت مطہرہ کو عورت کی عصمت و پاکدامنی تو بد نظر نہیں تھی البتہ اس کے زیورات کو چوری سے بچانے کا انتظام کر لیا اور ایسا خیال وہی کر سکتا ہے جس کو اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

دلیل نمبر۲:

اسی سورۃ نور میں آگے چل کر یہ آیت کریمہ ملتی ہے:

﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَهُنَّ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ٥﴾

(النور: ٦٠)

''اور بڑی بوڑھی عورتیں جو نکاح کی امیدوار نہ ہوں اگر وہ اپنے کپڑے (نقاب وغیرہ) اتار دیں تو ان پر گناہ نہیں (بشرطیکہ) زیب و زینت کو ظاہر نہ کریں اور اس سے بھی احتیاط رکھنا ان کے لیے بہتر ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

ہر وہ انسان جو عقل سلیم سے بہرہ ور ہے وہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ اس آیت کریمہ میں کپڑے اتارنے سے مراد نقاب وغیرہ ترک کرنا ہے نعوذ باللہ یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ ایسی عمر رسیدہ عورتیں اپنے سارے کپڑے اتار کر سراسر ننگی ہو کر چل سکتی ہیں بلکہ صرف اسی پردہ کو ترک کرنے کی رخصت مرحمت فرمائی جا رہی ہے جو ان عورتوں کے لیے لازمی و حتمی تھا۔ اب غور کا مقام ہے کہ اسلامی احکام کے بموجب اگر جوان عورت کے لیے منہ ڈھانکنا ضروری نہیں ہے تو اس آیت کریمہ نے سن رسیدہ عورتوں کو کون سے کپڑے اتارنے کی اجازت دی ہے، اگر جوان عورتیں (اسلام میں) چہرہ تو چھپانے سے آزاد ہیں تو ان بیچاری بوڑھی عورتوں کو اس اجازت سے کیا حاصل ہوا؟ اور ان کو اس زبانی رخصت سے کیا ملا، کیونکہ جب ایسی عورتیں جو اپنے ساتھ قیامت کی فتنہ سامانیاں لیے ہوئے ہوں وہ بھی اس حکم سے سبکدوش ہیں تو یہ بوڑھی عورتیں خود بخود اس حکم سے مستثنیٰ ہو جاتی ہیں پھر اس قرآنی اجازت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ بات ایک معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ حکم تھا ہی جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لیے اور یہ خرابی چونکہ جوان عورتوں کے بے پردہ، منہ کھولے، گھومنے سے وجود میں آتی ہے اس لیے شریعت اسلامی جس کی رات بھی دن کی طرح ہے (لیلها كنهارها) نے ان پر پابندی لگا دی۔ اور اس کے باوجود ان عمر رسیدہ عورتوں کو اپنے زیب و زینت، بناؤ سنگھار

کے اظہار سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ابھی تک وہ جوانی والی چنگاڑی موجود ہے اور جنسی خواہشات بالکلیہ مردہ نہیں ہوئیں یا کہ گو وہ خود تو نکاح سے بے رغبت ہیں لیکن بموجب اس مثل کے (ساقط لقط، ہر گری ہوئی چیز کو کوئی نہ کوئی اٹھانے والا ہوتا ہے) ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسا بھی ہو جو محض اپنی خواہش سے ان پر دباؤ ڈالے۔ آیت کے اخیر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عمر رسیدہ عورتیں بھی اگر پردہ کو ترک نہ کریں تو ان کے لیے بہتر ہے اس سے بخوبی سمجھ میں آتا ہے کہ جب بوڑھی نکاح سے متنفر عورتوں کے لیے بھی پردہ بہر حال بہتر ہے تو نوجوان دوشیزاؤں کے لیے اس کی کیا اہمیت ہونی چاہیے۔

دلیل نمبر۳:

بائیسویں پارہ میں سورۃ الاحزاب میں یہ آیت کریمہ وارد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝﴾

(الاحزاب: ۵۹)

’’اے نبی (ﷺ) اپنی بیویوں بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ (باہر نکلتے وقت) اپنے اوپر بڑی بڑی چادریں ڈال دیں اس سے ان کی پہچان ہوسکے گی (کہ یہ شریف زادیاں ہیں) تو ان کو کسی نوع کی تکلیف نہ ہوگی اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘

اس آیت کریمہ میں يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ کے الفاظ آئے ہیں یدنین جمع مونث غائب کا صیغہ ہے اور یہ باب افعال سے ہے استعمال اور محاورہ میں بولا جاتا ہے کہ ”ادنى عليه جلبابه“ یعنی اس نے اپنے اوپر چادر ڈال دی اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ مسلمان عورتیں باہر نکلنے کے وقت اپنے اوپر بڑی چادریں ڈال لیا کریں اس حکم وارشاد مبارک کی تعمیل مروج برقعہ سے بوجہ اتم اور احسن طریقہ پر ہو جاتی ہے اور یہ بات بھی اس آیت کریمہ سے صاف طور، معلوم ہو رہی ہے کہ یہ حکم عورت کو باہر نکلتے وقت کے لیے دیا جا رہا ہے۔ جس پر ذالك ادنى ان يعرفن کے الفاظ دال ہیں اور اس لیے بھی کہ گھر کے اندر تو ان بڑی چادروں کے ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ ان کا گھر میں کام ہی نہیں اس لیے کہ ضروری کپڑوں سے تو کوئی شریف زادی اور نیک طینت بلا اشد ضرورت اپنے گھر میں بھی عاری نہیں ہوا کرتی، بہر کیف ضروری کپڑے تو ان پر ہوتے ہی ہیں اب اور چادریں ڈالنے کی کیا ضرورت، اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم ان کو باہر نکلتے وقت کے لیے دیا جا رہا ہے، اب اس حکم کا مقصد اگر یہ نہ ہو کہ اس طرح عورت اپنے چہرہ اور سارے بدن کو ڈھانک لے تو پھر بتایا جائے کہ ان چادروں سے وہ جسم کے کس حصے کو ڈھانکے گی۔ ضروری حصہ تو پہلے ہی ڈھکا ہوا تھا پھر اس حکم نے کون سا نیا فائدہ دیا؟ یہ ہر عقل سلیم رکھنے والے انسان کے سوچ کی بات ہے، یقیناً اگر دماغ میں مغربی تہذیب کی اندھی تقلید بس

نہیں گئی تو اس کا مطلب پردہ (برقعہ نقاب وغیرہ) کے سوائے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن حکیم نے اس ارشاد کی حکمت بھی ساتھ ہی بیان فرما دی کہ اس طرح اپنے آپ کو اچھی طرح ڈھانپ کر چلنے سے لوگوں کو پتہ چلے گا کہ یہ شریف زادی ہے یہ پاکدامن ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ کوئی چھیڑ خوانی نہیں کی جائے گی گو یہ صحیح ہے کہ اخـذو بـطش (حملہ) مردوں کی طرف سے ہوتا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس کی ابتداء عورتوں ہی کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ

ہیچ عاشق خود نباشد وصل جو
تانہ معشوقش بود جویائے او

کیونکہ دستور یہی ہے کہ جب کوئی عورت اپنے جسم کی بے جا نمائش کرتی ہے تب ہی ایسے لوگوں کو جن کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے، ان کو ستانے اور ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اکثر یہی ہوتا ہے۔ اب اگر ایک پاک طنیت عورت اپنے آپ کو اچھی طرح ڈھانپ کر اور اسلام کے احکام بجالا کر جا رہی ہے پھر بھی کوئی ایسا خبیث باطن آدمی اس سے برائی کے ارادہ سے تعرض کرتا ہے تو اس کے لیے اسلام نے وہ سزا تجویز کی ہے جو دوسروں کے لیے بھی عبرت کا سامان مہیا کرے گی۔

اب یہ تینوں آیتیں اپنے مطالب بیان کرنے میں بالکل واضح ہیں ہاں اگر کوئی شب پر چشمہ روز روشن میں بھی اندھا بنا رہنا چاہتا ہے تو اس کا علاج ممکن نہیں۔ ان آیات کریمہ کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ کی صحابیات رضی اللہ عنہن کا کیا حال ہوا اور انہوں نے ان ارشادات گرامیہ کی کیسے تعمیل کی اس کے متعلق احادیث وسیرت کی کتب کا مطالعہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ کتابیں ان کے احوال مبارکہ سے بھری پڑی ہیں۔ ان کے تو پردہ کا یہ عالم تھا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حج کے موقع پر بھی جب کہ عورتوں کو منہ کھلا رکھنا پڑتا ہے جب بھی کوئی سوار ان کے نزدیک آ کر گزرتا تو وہ اپنے دوپٹے کا پلو منہ پر ڈال دیتی تھیں (جیسا کہ یہ روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے وارد ہے)

اب میں ان حضرات کے دلائل ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جو پردہ کو ختم کر کے شرم وحیاء غیرت وشرافت، عفت وعصمت کا جنازہ نکالنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مردوں کو امر فرمایا ہے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اگر عورتوں کا منہ کھلا نہ ہوتا تھا تو نظروں کو نیچی کرنے کے کیا معنی اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ مبارک میں بھی پردہ کا رواج نہیں تھا۔

اس کے متعلق اولاً تو یہ گذارش ہے کہ پردہ کا حکم واضح اور منصوص علیہ ہے جیسا کہ اوپر ہم قرآن حکیم کی آیات سے اچھی طرح ثابت کر کے آئے ہیں۔ اور بے پردگی کی دلیل صرف نظروں کے نیچے رکھنے کے حکم سے نکالی جا رہی ہے جو منصوص نہیں ہے لہٰذا منصوص علیہ کے مقابلہ میں غیر منصوص کو پیش کرنا اصولی طور پر بالکل غلط ہے۔

ثانیاً: یہ کہنا بھی غلط ہے کہ بے پردگی کے سوائے نظروں کو نیچے رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ چند باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ ہوسکتا ہے کہ ایک پردہ کی پابند عورت مردوں کی نظروں کے سامنے آ جائے۔ مثلاً ایک عورت ابھی گھر سے نکلی ہے نقاب چڑھا تو لیا ہے لیکن ابھی منہ پر نہیں ڈالا اتفاقاً گھر سے نکلتے ہی کوئی مرد اس کے سامنے آ گیا تو ایسی، صورت میں بھی گو عورت پردہ کی پابند ہے لیکن صورت اتفاقاً ایسی بن گئی کہ اس میں نہ عورت کا قصور ہے اور نہ مرد کا۔ اب اس حالت میں بھی مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ فوراً اپنی نظریں نیچی کر لے، دوسری صورت کوئی عورت کسی جگہ پر اکیلی بیٹھی ہے اس لیے اس نے اپنا منہ کھول رکھا ہے اچانک وہاں کسی مرد کا گزر ہوا اور اس عورت سے سامنا ہو گیا، تیسری صورت فرض کیجئے کسی عورت نے نقاب تو ڈال لیا ہے لیکن چلتے چلتے ہوا لگنے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے نقاب کھل گیا یا منہ سے ہٹ گیا اور پھر کسی مرد کی اس پر نظر پڑ گئی۔ بہر صورت اور بھی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ایک پردہ کی پابند عورت بھی بسا اوقات مردوں کی نظروں کی زد میں آ جاتی ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کم عقلی ہے کہ نظروں کو جو نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اس لیے ہے کہ منہ کو نہیں ڈھانکا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں نگاہیں نیچے رکھنے کا حکم صرف اسی صورت میں ہی نہیں ہے یعنی جس وقت کوئی عورت کھلے منہ سامنے آ جائے اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اگر عورت پردہ میں ہو یا برقعہ پوش ہو۔ تو اب مرد کو اجازت ہے کہ وہ اس پردہ پوش عورت کو بلا خوف و خطر اچھی طرح دیکھتا رہے اور پردہ کے اوپر سے اپنی نظروں سے اس کا طول وعرض ناپتا رہے کیونکہ اگر آدمی غور سے کسی عورت کو دیکھتا ہے (گو وہ برقعہ پوش ہو) تو اس کی نظریں اس محفوظ عورت کو پردہ کے اندر سے بھی پا لیتی ہیں) حقیقت یہ ہے کہ عورت سراپا ''عورت'' ہے اس لیے پردہ کی حالت میں بھی اس کی طرف گھور کر دیکھنا جائز نہیں ہے۔ ایک شریف انسان کا یہی شیوہ ہوتا ہے کہ جب کوئی عورت آ جاتی ہے خواہ پردہ میں ہو یا نہ ہو۔ تو وہ فوراً اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا اور نگاہیں نیچی کر لیتا ہے۔ البتہ کوئی اتفاقی نظر پڑ جائے تو معاف ہے لیکن اتفاقاً نظر پڑ جانے کے بعد پھر جو دوبارہ نظر ڈالے گا تو وہ دامنتہ اور بالا رادہ ہوگی جو سراسر ناجائز اور گناہ ہے بہر حال مومنوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم اس لیے تھا کہ نامحرم عورتوں، سے ان کو بالکلیہ محفوظ رکھا جائے نہ کہ مردوں کی نگاہیں، نیچی کرنے کا حکم یہ ہے کہ عورتوں کو کھلی چھٹی دینی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں بے پردہ گھومتی رہیں۔

دلیل نمبر دوم: کہا جاتا ہے کہ ابن جریر اپنی تفسیر میں ایک روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے لائے ہیں اس کے یہ الفاظ ہیں:

((دخلت علی ابنة اخی لامی عبدالله بن الطفیل مزینة فدخل النبی ﷺ فاعرض فقالت عائشة یا رسول الله انها ابنة اخی وجاریه فقال اذا عركت المرأة لم يحل لها ان تظهر الا وجهها والامادون هذا وقبض على ذراع

نفسه فترك بين قبضة وبين الكف مثل قبضة اخرى)) (تفسیر ابن جریر تفسیر النور)

اس روایت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس میری ماں کی طرف سے بھائی کی بیٹی آئی پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ادھر تشریف لے آئے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اپنا منہ مبارک پھیر لیا اس پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ تو میری بھتیجی ہے، اور چھوٹی لڑکی ہے (اس سے آپ نے منہ کیوں پھیر لیا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی عورت سن ماہوار کو پہنچ جائے (یعنی سن بلوغت کو پہنچ جائے) تو اس کو اپنے منہ اور ہاتھوں کے سوائے اپنے جسم کے دوسرے حصوں کو ظاہر کرنا حلال نہیں ہے یعنی اس پر غالباً باریک کپڑے تھے جن سے اس کے جسم کے خدوخال ظاہر ہو رہے تھے۔ اس لیے آپ نے یہ ارشاد فرمایا: اس روایت سے معلوم ہوا کہ عورت کو ہاتھ اور منہ ڈھانکنا ضروری نہیں۔

اس رویت کے متعلق یہ گذارش ہے کہ ہم جب اس کی سند کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرنے والا ابن جریج ہے اور اس راوی کی ملاقات جناب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی یا صحابیہ سے نہیں ہوئی جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب التہذیب کی ابتداء میں طبقات کے بیان کے سلسلے میں تحریر فرمایا ہے، حافظ صاحب لکھتے ہیں:

((السادسة طبقة حاصروا الخامسة لكن لم يثبت لهم لقاء احد من الصحابة كابن جريج))

یعنی چھٹے طبقے کے رواۃ وہ ہیں جوانہوں نے اگر چہ پانچویں طبقہ کا محاصرہ تو کر لیا ہے، لیکن ان کی کسی صحابی سے ملاقات ثابت نہیں ہوئی (اسی راوی نے ان سے کچھ نہیں سنا) جیسا کہ ابن جریج کی کسی صحابی سے ملاقات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی اور نہ ہی ان سے کچھ سنا ہے تو ان کا سماع حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہ ہوا۔ انہوں نے ضرور یہ روایت کسی دوسرے آدمی سے سنی ہوگی اور اس واسطہ کا اس روایت کی سند میں ذکر نہیں اس لیے یہ روایت منقطع ہوئی جو احادیث ضعیفہ کی اقسام میں سے ہے اور آئمہ حدیث نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ ابن جریج جب کسی واسطہ کو (جس سے اس نے بلا واسطہ سنا) گنواتا ہے تو وہ واسطہ نہایت مجروح ہوتا ہے۔ اس کا حاصل مطلب یہ نکلا کہ اس روایت کی سند میں ابن جریج اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان جو واسطہ ہے وہ مذکور نہیں ہے اور آئمہ حدیث کی تصریح کے مطابق وہ ضرور مجروح ہوگا تو یہ حدیث ضعیف ہوگئی اور ایسی ضعیف اور ساقطہ عن حد الاعتبار حدیث سے استدلال کرنا کس طرح درست ہوگا، علاوہ ازیں اس روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بھتیجی کا ذکر ہے اور حضرت عائشہ ان کی پھوپھی تھی اور شریعت نے عورت اور اس کی پھوپھی کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بھتیجی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محرمات میں سے تھی اور محرم مردوں کے سامنے بھی ہاتھ اور منہ کے سوائے جسم کے دوسرے حصوں کو اکھاڑنے کی اجازت نہیں ہے اور چونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی بھتیجی کا

جسم باریک کپڑوں کی وجہ سے ظاہر ہورہا تھا اس لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب عورت بلوغت کو پہنچ جائے تو منہ اور ہاتھوں کے سوائے اس کے جسم کا کوئی دوسرا حصہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے یعنی یہ محرم مردوں کے سامنے کا حکم ہے نہ کہ ہر اجنبی کے سامنے اس کو منہ کھولنے کی اجازت ہوگئی۔ اور پھر حدیث صحیح بھی نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں قرآنی نصوص کو چھوڑ کر اس ضعیف روایت کے متعلق خواہ مخواہ تکلیف میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔

دلیل نمبر۳:

ابوداؤد میں ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

((عن عائشة رضي الله عنها ان اسماء بنت ابی بکر رضي الله عنهما دخلت علی رسول الله ﷺ وعليها ثياب رقاق فاعرض عنها رسول الله ﷺ وقال يا اسماء وان المراة اذا بلغت المحيض لم يصلح لها ان يرى منها الا هذا و هذا اشار الى وجهه وكفيه))

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور اس نے باریک کپڑے پہن رکھے نبی کریم ﷺ نے ان سے منہ پھیر لیا اور فرمایا اے اسماء جب عورت ماہواری کی حالت (سن بلوغت) کو پہنچ جائے تو اس کو اپنے منہ اور ہاتھوں کے سوائے اپنے دوسرے جسم کے اعضاء کو ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔''

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو منہ اور ہاتھوں کو کھولنے کی اجازت ہے یہی ہے وہ ساری پونجی جس پر یہ مغربیت زدہ طبقہ بغلیں بجاتا ہے۔ ذلك مبلغهم من العلم

اب اس روایت پر ہمارا تنقیدی جائزہ ملاحظہ فرمایا جائے۔ یہ حدیث سنداً خواہ متناً صحت کے درجے سے بالکل ساقط ہے ایسی روایت سے دلیل یا تو وہ آدمی پکڑتا ہے جو حدیث کے علم سے سراسر نابلد ہے۔ یا پھر وہ جو حق کو سمجھنے کے بعد بھی زبردستی حق بات سے چشم پوشی کرنا چاہتا ہے۔ اولاً اس روایت کی سند کو ملاحظہ کیا جائے، اس حدیث کی سند اس طرح ہے:

((حدثنا يعقوب بن كعب الانطاكي ومومل بن الفضل الحراني قالا نا الوليد عن سعيد بن بشير عن قتادة عن خالد قال يعقوب ابن دريد عن عائشه رضي الله عنها)) الخ

اس حدیث کی سند میں چار راوی ایسے ہیں جن کی وجہ سے یہ حدیث بالکل ضعیف اور حد احتجاج سے گر گئی ہے، اول راوی ولید ہے جو ابوداؤد کے دونوں شیخوں کا استاذ ہے اور یہ ولید بن مسلم دمشقی ہے جو فی نفسہ ضعیف نہیں ہے لیکن یہ تدلیس کرتا ہے اور حدیث کے نقاد نے یہ تصریح کی ہے کہ ولید کی تدلیس شر التدلیس ہوتی ہے اور وہ ان ہی کو گراتا ہے جو سخت مجروح اور نہایت ضعیف ہوتے ہیں اور ولید کی تدلیس، تدلیس کے مراتب میں سے چوتھے

مرتبے میں ہے (دیکھو طبقات المدلسین للحافظ ابن حجر) محدثین تدلیس کے تیسرے مرتبہ والے رواۃ کی بھی روایت تب تک نہیں قبول کرتے جب تک وہ اپنے استاد یا شیخ سے اس کے سماع کی تصریح نہ کرے مثلاً حدثنا حدثنی سمعت وغیرہا کے الفاظ کہے اور ولید تو تدلیس کے چوتھے مرتبہ میں ہے اس لیے اس کی روایت قطعاً اور اتفاقاً مقبول نہیں ہوسکتی حتیٰ کہ وہ اپنے شیخ سے سماع کی تصریح کرے اس حدیث میں ولید اپنے شیخ سے سماع کی تصریح نہیں کرتا بلکہ عن سعید بن بشیر کہتا ہے اور عن کے لفظ کی سماع پر واضح دلالت نہیں ہے، چنانچہ یہ بات اصول حدیث کے جاننے والے سے مخفی نہیں ہے اور ولید میں ایک عیب اور بھی تھا وہ یہ کہ وہ اپنے شیخ کے بارہ میں بھی تدلیس سے کام لیتا تھا (جس کو اصطلاحاً تدلیس التسویہ کہتے ہیں) یعنی اگر خود اپنے شیخ سے سماع کی تصریح کر بھی دیتا تھا تو اپنے شیخ کے متعلق تدلیس کو کام میں لاتا تھا، لہٰذا جب تک ولید کا شیخ بھی اپنے شیخ سے سماع کی تصریح نہیں کرتا۔ تدلیس کا احتمال رہتا ہے۔ اس روایت میں ولید کا شیخ سعید اپنے شیخ قتادہ سے سماع کی تصریح نہیں کرتا اس لیے یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ ولید نے یہاں بھی تدلیس سے کام لیا ہو مطلب یہ ہے کہ اس روایت کی سند میں ولید کی طرف سے دو جگہوں پر تدلیس کا احتمال ہے اس لیے جب تک وہ دنوں جگہوں پر سماع کی تصریح نہیں کرتا اس کی روایت ناقابل اعتبار رہے گی۔

دوسرا راوی ولید کا استاذ سعید بن بشیر ازدی ہے وہ رجال کی کتب کے مطابق ضعیف ہے (دیکھو تقریب التہذیب وغیرہ)

تیسرا راوی قتادہ ہے یہ راوی ثقہ ہے لیکن مدلس ہے اور اس کی تدلیس تیسرے مرتبہ میں ہے۔ ایسے رواۃ کی روایت بھی جب تک سماع کی تصریح نہ کریں قابل قبول نہیں ہوتی (طبقات المدلسین للحافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو ملاحظہ کیا جائے) محققین ائمہ حدیث کا یہی مسلک ہے اور صحیح بھی یہی ہے جیسا کہ اصول حدیث کے ماہر بخوبی جانتے ہیں اس روایت میں قتادہ اپنے شیخ خالد سے سماع کی تصریح نہیں کرتا۔ بلکہ عن خالد کہتا ہے جو سماع پر دال نہیں ہے۔

چوتھا راوی خالد بن دریک ہے جس کے متعلق خود ابوداؤد نے اس روایت کے آخر میں فرمایا ہے کہ "هذا مرسل، خالد بن دريك لم يدرك عائشه" یہ حدیث مرسل ہے (کیونکہ) خالد بن دریک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے زمانے کو نہیں پہنچا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان سے پہلے وفات پاگئیں لہٰذا خالد کا سماع حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہ ہوا۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی ضعیف دو مدلس جنہوں نے اپنے شیخ سے سماع کی تصریح نہیں کی اور ایک راوی وہ ہے جس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا زمانہ نہیں پایا۔ پھر ایسی حدیث جس کی سند کی یہ حالت ہو۔ کس طرح صحیح ہوسکتی ہے؟ حدیث کی صحت کا بڑا مدار سند پر ہی ہوتا ہے جب سند ہی بالکل ساقط ہو تو اس حدیث کی صحت قطعاً باقی نہیں رہتی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایسی ضعیف حدیثوں کو لے کر میدان میں آجاتے ہیں کیا طرفہ

تماشا ہے کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار نہیں۔ خیر اب اس حدیث کے متن پر نظر ڈالیں۔

حدیث کا سیاق:

حدیث کا سیاق بتلا رہا ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے پیش آیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت نبی کریم ﷺ کے گھر میں تھیں یعنی مدینہ منورہ میں اور اس روایت سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا تازہ بلوغت کو پہنچی تھیں چنانچہ حدیث کے الفاظ اس طرف اشارہ کر رہے ہیں، لیکن یہ بات واقعات کے سراسر خلاف ہے، کیونکہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ میں ہی بلوغت کو پہنچ چکی تھیں بلکہ ہجرت سے پہلے ہی حاملہ تھیں اور مدینہ منورہ میں آنے کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ان کو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تولد ہوئے، چنانچہ یہ حقیقت صحیح حدیث میں بیان کی گئی ہے (دیکھو الاصابۃ فی معرفۃ الصحابۃ وغیرہ) اور حضرت اسماء کی بلوغت بلکہ اس کے وضع حمل تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے گھر میں نہیں آئی تھیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مدینہ میں آنے کے کافی عرصہ بعد آپ کے گھر آئی تھیں، مقصد یہ کہ روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں ان کے سامنے پیش آیا حالانکہ ہم بتا چکے ہیں کہ اس وقت تک وہ حضور اکرم ﷺ کے گھر میں آئی ہی نہیں تھیں۔ اس طرح یہ دونوں واقعات آپس میں مطابقت نہیں رکھتے یہ تو تب ہوسکتا تھا جب کہ حضرت اسماء مدینہ منورہ میں آنے کے بعد سن بلوغ کو پہنچی ہوئیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی نبی کریم ﷺ کے گھر میں آ چکی ہوئیں۔ اگر کہا جائے کہ یہ واقعہ مکہ مکرمہ میں پیش آیا یعنی یہ حکم آپ نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو مکہ مکرمہ میں ہی دیا تو اس صورت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اس موقعہ پر موجود ہونا صحیح نہ ہوگا۔ حالانکہ ظاہر حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس موقعہ پر موجود تھیں ورنہ اگر یہ بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے ہی معلوم ہوئی تھی تو وہ یہ واقعہ اس طرح ہرگز بیان نہ فرمائیں بلکہ اس طرح کہیں کہ مجھ سے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اس طرح واقعہ بیان کیا، لیکن اس صورت میں بھی مطلب یہ ہوگا کہ یہ واقعہ مکہ مکرمہ میں پیش آیا اور اس کی خبر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کی لیکن یہ احتمال کافی بعید ہے کیونکہ پردہ وستر وغیرہ کے احکام مدینہ منورہ میں دیئے گئے تھے نہ کہ مکہ مکرمہ میں۔ اگر ظاہر حدیث سے قطع نظر کرلیں اور یہ کہیں کہ یہ واقعہ مکہ مکرمہ میں ہی پیش آیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ اپنا مشاہدہ نہیں۔ بلکہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا سنایا ہوا واقعہ بیان کر رہی ہیں تو اس سے بھی زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوگا کہ مکہ مکرمہ میں اجنبی مرد سے منہ کو چھپانا ضروری نہیں تھا لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اجازت یا یہ حکم مدینہ منورہ میں آنے کے بعد بھی باقی رہا، بہت سی باتیں مکہ مکرمہ میں ممنوع نہیں تھیں، لیکن مدینہ منورہ میں آنے کے بعد وہ ممنوع ہوگئیں۔ لہٰذا ممانعت ہو جانے کے بعد بھی اگر کوئی مکی زندگی والی رخصت کو دلیل بنا کر اس کو جائز کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو اپنے عقل اور سمجھ پر ماتم کرنا چاہیے اس طرح زیر بحث مسئلہ میں بھی اگر فرض کرلیا جائے کہ مکہ مکرمہ میں (اس ضعیف حدیث کی رو سے) پردہ کا امر نہیں تھا تو اس

اجازت کو دلیل بنا کر مدنی زندگی میں بھی پردہ نہ کرنے کو صحیح سمجھنا قطعاً غلط ہوگا اس لیے کہ پردہ کا حکم مدنی سورتوں، سورۂ نور، سورۂ احزاب میں نازل ہوا ہے اور یہی حکم محکم اور مضبوط ہے کیونکہ وہ بعد میں آیا ہے اور مکہ مکرمہ میں جو پردہ نہ کرنے کی اجازت تھی وہ منسوخ ہوگئی پھر کیا کوئی عقلمند جو اپنے ہوش وحواس کو بجا رکھتا ہے منسوخ شدہ حکم کو بحال و برقرار سمجھے گا اگر کہا جائے کہ یہ معاملہ مدینہ منورہ میں ہی پیش آیا یعنی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو سن بلوغت کو پہنچے ہوئے کافی عرصہ گذر چکا تھا اور وہ صاحب اولاد ہو چکی تھیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سرور کائنات ﷺ کے گھر میں بھی آ گئی تھیں۔ اس وقت کا یہ معاملہ ہے تو اس کے لیے یہ گذارش ہے کہ یہ معاملہ ظاہر حدیث کے مخالف ہونے کے باوجود اس لیے بھی درست نہیں کہ دریافت طلب امر یہ ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا باریک کپڑے پہن کر حضور اکرم ﷺ کے سامنے آنا قرآن حکیم کے اس حکم سے کہ عورتیں اپنی چھاتیوں وغیرہ پر چادریں ڈال دیں، پہلے تھا یا بعد میں۔ اگر آپ کہیں گے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا یہ فعل اس ربانی ارشاد سے پہلے کا تھا تو اس صورت میں یہ رخصت پہلے کی تھی جو قرآن حکیم کے نزول کے بعد منسوخ ہوگئی، اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ واقعہ الٰہی فرمان واجب الاذعان کے بعد رونما ہوا تو اس سے عجیب بات اور کوئی نہیں ہوسکتی اس لیے کے سورۂ نور کے نزول کے بعد صحابیات رضی اللہ عنہن کا طرز عمل کیا ہوگیا تھا وہ بھی احادیث کی کتب میں موجود ہے۔ پھر کیا یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا جیسی پرخلوص صحابیہ ان الٰہی ارشادات کے نزول کے بعد بھی ایسے باریک کپڑے پہنتیں، جس سے اس کا جسم ظاہر ہو رہا ہو، حاش وکلا

ہمیں نبی اکرم ﷺ کے صحابہ اور صحابیات رضی اللہ عنہم اجمعین کو اپنے دور سے مردوں اور عورتوں پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ ان کا تو ربانی ارشادات کی تعمیل میں مستعدی کا وہ عالم تھا جو ہمارے تصور سے بھی بہت بالاتر ہے اگر یہ کہا جائے کہ ہوسکتا ہے کہ حضرت اسماء کو اس وقت تک ان احکام کا علم ہی نہ ہوا ہو تو یہ بھی درست نہ ہوگا۔ اس لیے کہ حضرت اسماء، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں اور اس سارے خاندان کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات گرامیہ کے انجام دینے میں جو ممتاز حیثیت تھی وہ ہر سچے مسلمانوں کو معلوم ہے۔ دین میں جو پوزیشن اور مرتبہ ان کا تھا وہ بھی اظہر من الشمس ہے ہر الٰہی فرمان پر یہی خاندان سب سے پہلے عمل پیرا ہوتا تھا۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دوسری بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سید الاولین والآخرین ﷺ کے گھر میں تھی اس لیے اہم احکام اس خاندان کے افراد سے کیسے مخفی رہ سکتے تھے؟ اور حضرت اسماء کسی دور دراز ملک میں رہنے والی بھی نہیں تھیں کہ اس سے یہ حکم مخفی رہ گیا بلکہ وہ بھی مدینہ منورہ میں ہی رہتی تھیں، بہرکیف اس حدیث پر جس پہلو سے بھی نظر ڈالی جائے وہ ناقابل حجت اور استناد سے گری ہوئی نظر آئے گی۔

خلاصہ یہ حدیث (ابوداؤد والی حدیث) سند اور متن دونوں کے اعتبار سے بالکل ضعیف ہے اور ناقابل حجت ہے ایسی کمزور اور ناقابل اعتبار حدیثوں سے قرآنی نصوص کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ ابوداؤد والی حدیث کے سند کا

ضعف اور اس کے متن کی نکارت اس پر شاہد ہیں کہ یہ حدیث حضرت رسول اللہ ﷺ کی حدیث نہیں ہے اور دین کے معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول مقبول ﷺ کے سوائے اور کسی کا قول حجت نہیں ہوسکتا۔

پردہ کے خلاف جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان کا جواب بحمد للہ کافی وشافی دیا گیا ہے۔ ان ادلہ کے علاوہ بھی چند دلائل دیئے جاتے ہیں لیکن ان ادلہ کا چونکہ کتاب وسنت سے کوئی تعلق نہیں اس لیے سر دست ان کے جواب کی طرف متوجہ ہونا ضروری نہیں کیونکہ ہمارے اس مقالہ کا یہ موضوع نہیں تھا کہ ''آیا'' پردہ عقلاً ونقلاً ضروری ہے یا نہیں، بلکہ اس مضمون سے ہمارا مقصد کتاب وسنت یا اسلام سے پردہ کا اثبات کرنا تھا وہ ثابت ہوگیا اور اس کے خلاف جو کتاب وسنت سے نام کے دلائل پیش کیے جارہے تھے ان کی بھی قلعی کھول دی گئی اس لیے مزید ضرورت نہیں رہی لیکن اگر ضرورت پڑی تو ان شاء اللہ العزیز نقلا وعقلا اس مسئلہ کو ثابت کیا جائے گا اور اس سلسلہ میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ پھر اہل انصاف کو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں کتنا دم وخم ہے۔ میری صمیم قلب سے دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب مسلمانوں کو کتاب وسنت کی روشنی عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين.

❁❁❁❁

حالت احرام کے علاوہ ننگے سر رہنے کا حکم

دراصل ہمارے معاشرہ میں یہ بات زبان زد عام میں کہ فرضی نمازوں میں یا اس کے علاوہ عام حالت میں ننگے سر رہنا گناہ کا کام ہے، جبکہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ شاہ صاحب نے لوگوں کے اس خیال کو بدلنے کے لیے قرآن وحدیث سے یہ بات ثابت کی ہے کہ حالت احرام کے علاوہ بھی ننگے سر رہنے میں کوئی گناہ نہیں، چاہے وہ فرضی نماز ہو یا نفلی۔
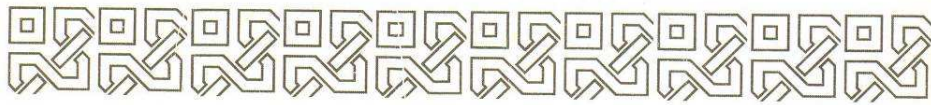
جہاں تک ننگے سر نماز ہو جانے کی حد تک بات ہے تو اس میں دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں۔

یہ کہنا کہ سر ڈھانپنا پسندیدہ ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا اس سے راقم الحروف کو اختلاف ہے، احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے اکثر و بیشتر اوقات رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سر پر یا تو عمامہ باندھے رہتے یا ٹوپیاں ہوتیں اور راقم الحروف کے علم کی حد تک سوائے حج وعمرہ کے کوئی ایسی صحیح حدیث دیکھنے میں نہیں آتی جس میں یہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ ننگے سر گھومتے پھرتے تھے یا کبھی سر پر عمامہ وغیرہ تھا لیکن مسجد میں آ کر عمامہ وغیرہ اتار کر رکھ دیا اور ننگے سر نماز پڑھنا شروع کی کسی محترم کی نظر میں ایسی کوئی حدیث ہو تو ہمیں ضرور مستفید کیا جائے۔

ذیل میں چند احادیث لکھتا ہوں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

((رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَمْسَحُ عَلَى عِمَامَتِهِ وَخُفَّيْهِ)) ❶

''میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ اپنے عمامہ اور موزوں پر مسح کرتے تھے۔''

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے ضرور عمامہ سے ہی نماز پڑھی ہوگی کیوں کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ عمامہ پر مسح تو کیا ہو لیکن اسی عمامہ جس پر مسح کیا اس کو اتار کر نماز پڑھی ہو۔ یہ حدیث سفر وحضر دونوں کو شامل ہے۔

۲۔ سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز فجر سے پیشتر قضائے حاجت کے لیے نکلے، قضا حاجت کی، پھر لوٹے پھر جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے پانی ڈالا اور آپ ﷺ نے وضو کیا، پھر اس میں یہ الفاظ ہیں:

((وَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعَلَى الْعَمَامَةِ)) ❷

''اپنی پیشانی مبارک اور عمامہ پر مسح کیا۔''

۳۔ سیدنا عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَلَى الْمِنبَرِ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ قَدْ أَرْخَى طَرَفَيْهَا بَيْنَ كَتِفَيْهِ)) ❸

''گویا کہ میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں ان کے (سر پر کالی) پگڑی تھی جس کا ایک ٹکڑا پیچھے

---

❶ صحيح البخاري، كتاب الوضوء باب المسح على الخفين: ٢٠٤ـ٢٠٥.

❷ صحيح مسلم كتاب الطهارة باب المسح على الناصية: ٦٣٣، ٢٧٤ـ جامع الترمذي.

❸ صحيح مسلم كتاب الحج باب النهي عن حمل السلاح بمكة من غير حاجة: ٣٣١٢، ١٣٥٩ـ سنن ابن ماجة: ٢٨٢١.

دونوں کندھوں کے درمیان چھوڑ دیا تھا۔‘‘

۴۔ صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ دَخَلَ مَکَّۃَ وَقَالَ قُتَیْبَۃُ دَخَلَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّۃَ وَعَلَیْہِ عِمَامَۃٌ سَوْدَآءُ بِغَیْرِ اِحْرَامٍ)) ❶

’’نبی اکرم ﷺ فتح مکہ کے دن مکہ مکرمہ میں حالت احرام کے بغیر داخل ہوئے اور آپ کے سر مبارک پر کالی پگڑی تھی۔‘‘

بعض علماء نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح بخاری کی اس حدیث کے معارض ہے جو سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس میں یہ ہے رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک پر مغفر (خود) تھا۔

لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ پہلے پہلے جب آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر پر خود تھا، پھر اس کو اتار لیا (جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے) اس کے بعد عمامہ پہن لیا تھا اس طرح ہر کسی نے جو دیکھا وہی بیان کر دیا۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جو صحیح مسلم میں عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((خَطَبَ النَّاسَ وَعَلَیْہِ عِمَامَۃٌ سَوْدَآءُ))

’’رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو خطبہ دیا اس حال میں کہ آپ کے سر مبارک پر کالا عمامہ تھا۔‘‘

یہ خطبہ خانہ کعبہ کے دروازے کے نزدیک ہوا تھا اور یہ دخول کے تمام ہونے کے بعد ہوا بعض نے ان دونوں روایتوں کو اس طرح بھی جمع کیا ہے کہ عمامہ خود کے اوپر یا خود کے نیچے بندھا ہوا تھا تاکہ خود کے لوہے سے سر مبارک کو محفوظ رکھے۔ ❶

۵۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا اعْتَمَّ سَدَلَ عِمَامَتَہٗ بَیْنَ کَتِفَیْہِ))

’’رسول اللہ ﷺ جب بھی عمامہ باندھتے تو پیچھے دونوں کندھوں کے درمیان اس کا ٹکڑا چھوڑ دیتے۔‘‘

مشکوٰۃ ۴۷۵ بحوالہ ترمذی امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ❷

۶۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الحج باب دخول مکة بغیر احرام: ۱۳۵۸، ۳۳۱۰۔ جامع الترمذی: ۱۷۳۵۔ سنن ابن ماجة: ۲۸۲۲.

❶ فتح الباری طبع دارالسلام ۴/۸۰.

❷ سنن الترمذی کتاب اللباس باب سدل العمامة بین الکتفین رقم: ۱۷۳۶ قال الالبانی اسناده صحیح، الصحیحه: ۷۱۶.

((عَمَّمَنِی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَسَدَلَھَا بَیْنَ یَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ)) ❶

''رسول اللہ ﷺ نے مجھے پگڑی باندھی میرے سامنے اور میرے پیچھے اس کا تھوڑا ٹکڑا چھوڑ دیا۔''

۷۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ اَلشُّھَدَآءُ أَرْبَعَۃٌ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ جَیِّدُ الْإِیْمَان لَقِیَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰہَ حَتّٰی قُتِلَ فَذٰلِکَ الَّذِی یَرْفَعُ النَّاسُ اِلَیْہِ أَعْیُنَھُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ھٰکَذَا وَرَفَعَ رَأْسَہٗ حَتّٰی وَقَعَتْ قَلَنْسُوَتُہٗ قَالَ فَمَا أَدْرِیْ أَقَلَنْسُوَۃَ عُمَرَ أَرَادَ أَمْ قَلَنْسُوَۃَ النَّبِیِّ ﷺ)) ❷

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا شہداء چار ہیں ایک ان میں سے وہ آدمی ہے جو عمدہ ایمان والا مومن ہے، وہ دشمن کی طرف آیا تو اس نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ (کے اجر وثواب) کی تصدیق کی اور لڑتا رہا حتیٰ کہ قتل ہو گیا تو یہ وہ شخص ہے جس کی طرف لوگ اپنی آنکھیں اٹھائیں گے اور اس طرح اپنا سر اٹھایا حتیٰ کہ ٹوپی گر گئی (راوی کہتا ہے) مجھے معلوم نہیں اس ٹوپی سے مراد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ٹوپی تھی یا رسول اللہ ﷺ کی۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اے اللہ کے رسول! اس وقت ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔

۸۔ ابوالشیخ نے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ:

((اخبرنا ابن الباغندی، نا ابن مصفی، نا محمد بن خالد، عن مفضل بن فضالۃ، عن ھشام بن عروۃ، عن ابیہ، عن خالتہ عائشۃ رضی اللہ عنھا: ان النبی ﷺ کان یلبس من القلانس فی السفر ذوات الآذان، وفی الحضر المشمرۃ، یعنی الشامیۃ))

''نبی کریم ﷺ سفر میں کانوں والی ٹوپیاں پہنا کرتے تھے اور حضر میں مضمر، یعنی شامی ٹوپیاں پہنتے تھے۔'' ❸

لوامع العقول میں لکھا ہے:

---

❶ سنن ابی داود کتاب اللباس باب فی العمائم: ۴۰۷۹۔ وشعب الایمان للبیھقی الرقم: ۶۲۵۳۔ علامہ البانی نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے ملاحظہ فرمائیں: ضعیف ابی داود: ۸۸۳.

❷ سنن الترمذی فضائل الجھاد باب ماجاء فی فضل الشھداء: ۱۶۴۴۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے ملاحظہ فرمائیں: ضعیف سنن الترمذی للالبانی: ۲۷۹۔ ۷۱۱۔ الضعیفۃ: ۲۰۰۴.

❸ اخلاق النبی لابی الشیخ الاصبھانی الرقم: ۳۱۴۔ طبع دارالمسلم للنشر والتوزیع.

علامہ عراقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ٹوپیوں کے بارے میں یہ حدیث بہت عمدہ سند والی ہے۔ ❶

۹۔ مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق میں اسی طرح امام حسن بصری سے بھی روایت ہے کہ:

((اِنَّ أَصْحَابَ النَّبِيِّ يَسْجُدُوْنَ وَأَيْدِيهِمْ فِي ثِيَابِهِمْ ، وَيَسْجُدُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ عَلٰى عِمَامَتِهٖ))

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں سجدہ کرتے اس حال میں کہ ان کے ہاتھ کپڑوں میں ہوتے اور ان میں سے کوئی آدمی اپنی ٹوپی اور کوئی اپنی پگڑی پر سجدہ کرتا تھا۔ ❷

۱۰۔ امام بخاری رحمہ اللہ صحیح بخاری کی کِتَابُ اللِّبَاسِ میں بَابُ الْبَرَانِسِ کے تحت سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث لائے ہیں کہ ایک آدمی نے پوچھا:

''اے اللہ کے رسول! (ﷺ) احرام والا کونسے کپڑے پہن سکتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: نہ قمیص پہنے اور نہ پگڑیاں اور نہ شلوار اور برانس اور نہ ہی موزے۔ ❸

بَـرَانِـسُ: بَرْنَسٌ کی جمع ہے یہ ایک قسم کی ٹوپی ہے، پھر آگے صفحہ ۲۷۳ پر باب العمائم منعقد فرما کر اس کے تحت یہی حدیث سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ والی لائے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں لوگ اکثر و بیشتر ٹوپیاں اور عمامے پہنا کرتے تھے ورنہ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہ اکثر و بیشتر چلتے پھرتے یا نماز ادا کرتے ہوئے ننگے سر ہی ہوتے تو خاص طور پر ان چیزوں کی ممانعت احرام کی حالت میں نہ بیان کی جاتی جیسا کہ عورتیں تمام اوقات میں اجنبی مردوں کے سامنے نقاب اوڑھے ہی رہتی تھیں، اس لیے احرام کی حالت میں ان کو حکم ہوا کہ وہ منہ پر نقاب نہ ڈالیں الا یہ کہ کوئی اجنبی سامنے آ گیا تو چادر کا پلو چہرے پر ڈال لیا کریں۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور دیگر محدثین جو کِتَـابُ اللِّبَـاس وغیرہ ذکر کر کے اس کے تحت یہ احادیث لائے ہیں تو اس سے مقصد ان باتوں کی اقتدار اور اتباع تھا، ورنہ ان باتوں کے ذکر سے کیا فائدہ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''تمہارے لیے (تبارک وتعالیٰ) کے (رسول اللہ ﷺ) کی ذات اطہر بہترین نمونہ ہے۔''

یہ ارشاد عبادات ومعاملات وغیرہا سب کو شامل ہیں۔

ہوسکتا ہے ہمارے محترم مولانا نعیم الحق صاحب طعام اور شراب اور لباس کے متعلق یہ رائے رکھتے ہوں کہ ان میں سے جن اشیاء یا امور کے متعلق کوئی امر رغبت دلانے والا صیغہ وارد نہیں ہوا وہ مندوب ومستحب نہیں لیکن راقم الحروف ان سے اتفاق نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کا پسندیدہ معمول نہ ہوتا تو جس طرح سر پر

---

❶ اس روایت کی سند میں مفضل بن فضالہ ضعیف ہے ملاحظہ کریں: الكامل في ضعفاء الرجال: ٦/٤٠٩.

❷ مصنف ابن ابی شیبة: ١/٢٦٦ طبع الدار السلفية الهندية القديمة: مصنف عبدالرزاق: ١/٤٠٠.

❸ صحيح البخاري، كتاب اللباس باب: البرانس: ٥٨٠٣.

عمامہ یا ٹوپی کا ثبوت مل رہا ہے اسی طرح ننگے سر نماز پڑھنے کے متعلق بھی احادیث ضرور موجود ہوتیں جو کہ میرے علم میں نہیں آئیں۔ جب سر پر ٹوپی یا پگڑی رکھنا رسول اللہ ﷺ کا پسندیدہ معمول ہوا تو یہ عمل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو بھی پسند ہوگا۔ لہٰذا استحباب یا ندبیت کا انکار مناسب معلوم نہیں ہوتا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تو یہ حال تھا کہ لباس وطعام میں سے جو چیز آپ ﷺ کو پسند ہوتی وہی پسند کرتے تھے۔

صحیح البخاری کتاب اللباس باب النعال السبتیة وغیرھا کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ عبید بن جبیر سے روایت لائے ہیں کہ انہوں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ چار باتیں ایسی ہیں کہ میں آپ ہی کو وہ کرتے دیکھتا ہوں، آپ کے دوسرے اصحاب ان پر عمل نہیں کرتے ان میں سے ایک چیز یہ ذکر کی کہ تم سبتیہ نعال (بغیر بالوں کی جوتیاں) پہنتے ہو تو انہوں نے جواب دیا:

((وَأَمَّا النِّعَالُ السِّبْتِيَّةُ فَإِنِّي رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَلْبَسُ النِّعَالَ الَّتِيْ لَيْسَ فِيهَا شَعَرٌ وَيَتَوَضَّأُ فِيهَا فَأَنَا أُحِبُّ أَنْ أَلْبَسَهَا)) [1]

''سبتیہ جوتی کے بارے میں تو نے پوچھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ وہ جوتیاں پہنتے جس کے بال نہیں ہوتے اور ان ہی میں وضو بھی کرتے، لہٰذا میں بھی پسند کرتا ہوں کہ ایسی جوتیاں پہنا کروں اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا سنت کے اتباع میں جو مقام ہے وہ کسی اہل علم سے مخفی نہیں۔''

اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح کے کتاب الاطعمہ میں باب الدباء کے تحت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث لائے ہیں:

((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَتَى مَوْلًى لَهُ خَيَّاطًا، فَأُتِيَ بِدُبَّاءٍ، فَجَعَلَ يَأْكُلُهُ، فَلَمْ أَزَلْ أُحِبُّهُ مُنْذُ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يَأْكُلُهُ))

''بے شک رسول اللہ ﷺ ان کے غلام جو کپڑا سینے والا تھا کے پاس آئے، پھر وہ آپ ﷺ کے لیے کدو لے آیا آپ اس کو کھانے لگے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ کو کدو کھاتے دیکھا تب سے میں اسے پسند کرتا ہوں۔'' [2]

کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رسول اللہ ﷺ کی مرغوب اشیاء کو پسند کرنا باعث اجر وثواب نہ تھا؟ اگر تھا تو یہ ندب واستحباب کی علامت ہے اس لیے سر ڈھانپ کر چلنے پھرنے یا نماز وغیرہ پڑھنے کو پسندیدہ قرار نہ دینا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم نے بڑے بڑے علماء وفضلاء کو دیکھا کہ اکثر وبیشتر سر ڈھانپ کر چلتے ہیں اور نماز

---

[1] صحیح البخاری: ٥٨١٥ـ ١٦٦، ١٥٥٢، ١٦٠٩، ٢٨٦٥ـ ترقیم دارالسلام.

[2] صحیح البخاری واطرافه فی: ٢٠٩٢، ٥٣٧٩، ٥٤٢٠، ٥٤٣٥، ٥٤٣٧، ٥٤٣٩.

پڑھتے ہیں یہ آج کل جو نئی نسل خصوصاً جماعت اہل حدیث کے بعض متشدد افراد نے یہ معمول بنا رکھا ہے اسے مروجہ فیشن کی اتباع تو کہا جا سکتا ہے لیکن مسنون قرار نہیں دیا جا سکتا، کیا کسی فعل کے جائز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مندوبات و مستحبات کو بالکل ہی ترک کر دیا جائے؟

جواز کے اظہار کے لیے کبھی کبھی اتفاقاً ننگے سر رہنے پر عمل کیا جا سکتا ہے لیکن آج کل معمول سے تو ظاہر ہو رہا ہے کہ کتب احادیث میں جو مندوبات و مستحبات سنن ونوافل کے ابواب موجود ہیں یہ سراسر فضول ہیں ہمیں تو صرف جواز اور رخصتوں پر عمل کرنا ہے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہمارے محترم نعیم الحق نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہمارے بعض پر جوش اہل حدیث کی طرف سے بعض متشدد حنفیوں کی باتوں کی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھنے کے جواز کا اس طرح جواب دیا جا تا رہا ہے۔

یہ بات افہام وتفہیم سے بھی ہو سکتی ہے، انہیں معقول دلائل پیش کیے جائیں اور اگر وہ پھر بھی اسی پر جمے رہیں اور حق کی طرف نہ آئیں تو ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ان کے لیے ہم مستحبات کا خاتمہ ہی کر دیں اور ننگے سر نماز پڑھنے کو دائمی معمول بنا لیں، پھر اگر یہی مقصود ہے تو گھر سے ہی ننگے سر آئیں اور نماز پڑھ لیں لیکن یہ عجیب طرفہ تماشا ہے کہ بعض متشدد لوگ گھر سے تو سر پر ٹوپی وغیرہ رکھ کر آتے ہیں لیکن مسجد میں داخل ہو کر ٹوپی وغیرہ اتار کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور نماز شروع کر دیتے ہیں۔ مولانا نعیم الحق کی تحریر کے مطابق ننگے سر نماز پڑھنے کا جواز تو ضرور معلوم ہو جاتا ہے لیکن اس سے بڑی غلط فہمی جو عوام میں پھیل جاتی ہے اور واقعی پھیل رہی ہے تو اس کی جانب بھی توجہ مبذول کرانا اشد ضروری ہے۔ اب عوام میں یہ غلط فہمی پھیلتی جا رہی ہے کہ گھر سے ٹوپی وغیرہ سر پر رکھ کر آنا چاہیے لیکن مسجد میں آ کر اس کو اتار دینا چاہیے اور ننگے سر ہی نماز پڑھنی چاہیے کیونکہ یہی سنت رسول اللہ ﷺ ہے اور اہل حدیث جماعت کے بہت سے افراد کا اس پر عمل ہے۔

اب آپ ہی سوچیں کہ یہ کتنی بڑی غلطی ہے اور یہ محض اہل حدیثوں کے طرز عمل سے پیدا ہو رہی ہے حالانکہ صحیح تو کجا مجھے تو ایسی ضعیف روایت بھی نہیں ملی جس میں یہ ہو کہ نبی ﷺ گھر سے اس حال میں نکلے کہ سر پر عمامہ وغیرہ تھا لیکن مسجد میں آتے ہی اسے اتار لیا اور ننگے سر نماز پڑھی، پھر اس طرح اس کو دائمی و مستمرہ معمولات میں سے بنانے کی وجہ سے لوگوں کو کیا یہ خیال نہ گزرتا ہوگا کہ یہی نبی ﷺ کی سنت ہے؟ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کیا یہ اہم و پسندیدہ بات نہیں کہ اکثر و بیشتر سر ڈھانپ کر رکھا جائے، خواہ نماز میں یا اس سے باہر تا کہ یہ غلط فہمی رفع ہو جائے۔

ننگے سر نماز پڑھنے والے دلیل کے طور پر ایک روایت ذکر کرتے ہیں جسے ابوالشیخ الاصبہانی نے اپنی کتاب اخلاق النبی ﷺ کے صفحہ ۱۱۵ میں ذکر کیا ہے وہ سنداً بالکل ضعیف ہے لیکن ہو سکتا ہے کوئی صاحب اس روایت کو لے کر میرا معارضہ یا تعاقب شروع کر دے اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر یہ روایت مع سند و متن اور اس کی سند پر

کلام کے ساتھ پیش کر رہا ہوں تاکہ کوئی صاحب اس کو لے کر میدان میں نہ آ جائے وہ روایت یہ ہے:

((حدثنا محمد بن عمران بن الجنید، نا احمد بن عیسی المقانعی، وسلیمان بن داود السلال، نابشر بن یحیی المروزی، نا سلم بن سالم، عن العرزمی، عن عطاء، عن ابن عباس، قال: کان لرسول اللهﷺ ثلاث قلانس: قلنسوة بیضاء مضربة، وقلنسوة برد حبرة، وقلنسوة ذات آذان، یلبسها فی السفر، وربما وضعها بین یدیه اذا صلی))

''رسول اللہ ﷺ کے پاس تین ٹوپیاں تھیں ایک سفید رنگ کی اور ایک ٹوپی یمنی دھاری دار کپڑے کی اور ایک ٹوپی کانوں والی جسے سفر میں پہنا کرتے تھے اور کبھی کبھار نماز پڑھتے وقت اسے آگے بھی رکھ دیا کرتے تھے۔''

اس روایت میں ابو الشیخ الاصبہانی کے استاذ اور ان کے دو شیوخ احمد بن عیسیٰ المقانعی اور سلیمان بن داؤد السلال کے حالات ہمارے پاس مصادر و مراجع میں سے کسی میں بھی نہیں۔ آگے چوتھے نمبر پر بشر بن یحییٰ المروزی آتے ہیں۔

ان کا تذکرہ بھی سوائے الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم کے اور کسی کتاب میں نہیں ہے اور الجرح والتعدیل میں بھی صرف یہ ہے کہ کان صاحب الرای یہ الفاظ توثیق و تعدیل کے نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ بھی مجہول الحال ہی ہوا پھر مسلم بن سالم کا نمبر آتا ہے، یہ بلخی ہیں، متروک اور وضاع ہیں۔ جملہ ائمہ محدثین اس کی تضعیف پر متفق ہیں۔ پھر العرزمی ہیں جو غالب یقین کے قریب یہ بات ہے کہ محمد بن عبید اللہ ابن ابی سلیمان العرزمی ہیں اور یہ متروک ہیں اس کے بعد عطاء ہیں یہ ابن ابی رباح ہیں اور یہ ثقہ ہیں تفصیل کے لیے دیکھیں۔ (تقریب التهذیب، المیزان واللسان) اب ایسی روایت جس کی کل اسناد ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا مصداق ہو، اس سے استناد (استدلال) کوئی جاہل کرے تو کر سکتا ہے لیکن جس کو اللہ تعالیٰ نے حدیث کے علم سے نوازا ہے وہ اس سے استدلال کی جرأت نہیں کر سکتا۔

بعض حضرات اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں یہ وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی اور اس میں ٹوپی و پگڑی داخل نہیں ہے، یعنی بغیر سر ڈھانپے نماز پڑھی۔

اولاً: یہ اس وقت کی بات ہے جب کپڑوں کی تنگی تھی اور اتنی فراوانی نہ ہوتی تھی جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ پر ایک کپڑے میں نماز پڑھنے پر اعتراض کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں ہم میں سے ایک کے پاس دو تین کپڑے نہ تھے۔

اس طرح صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ سے کسی نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: کہ کیا تم میں سے کسی

کے پاس دو کپڑے ہیں؟

اس سے جو بات نکھر کر سامنے آتی ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔

ثانیاً: میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے جواز کے ثبوت سے اس کا نزلہ یہ حضرات صرف ٹوپی و پگڑی پر ہی کیوں گرانے پر مصر ہیں۔ اگر ننگے سر نماز پڑھنے کے مسنون ہونے کا مدار آپ حضرات ایک کپڑے میں نماز پڑھنے والی حدیث پر ہی رکھتے ہیں تو بسم اللہ آپ گھر سے ہی کریں کہ ایک کپڑے کے سوا سب کپڑے اتار کر پھر مسجد آیا کریں اور اس طرح نماز بھی پڑھ لیں۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ گھر سے تو قمیص، شلوار اور کوٹ وغیرہ پہن کر آتے ہیں اور مسجد میں داخل ہونے کے بعد صرف پگڑی یا ٹوپی اتار کر نماز پڑھنی شروع کر دیتے ہیں۔

کیا آپ حضرات کے نزدیک اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ اور تو سب کپڑے پہنے ہونے چاہئیں صرف ٹوپی کو اتار دیا جائے لیکن یہ مطلب سراسر غلط ہے۔

شاید کچھ لوگ کہنے لگیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم ہے کہ مسجد میں زینت پکڑو یعنی لباس پہنو اور جب کپڑوں کی فراوانی ہے تو ہم یہ سارا لباس زیب تن کرتے ہیں لیکن سر کو ننگا رکھتے ہیں ہم ان لوگوں کی خدمت میں باادب عرض کرتے ہیں کہ اگر دوسرے کپڑے زینت میں داخل ہیں تو ٹوپی وغیرہ کو کس دلیل سے اس زمرہ سے نکال کر باہر کر رہے ہیں اوپر صفحات میں ہم یہ ثابت کر آئے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا اکثر و بیشتر معمول سر ڈھانپنا ہی تھا۔ لہٰذا ٹوپی وغیرہ سے سر ڈھانپنے کے زینت ہونے پر اور کیا ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کا پسندیدہ معمول اعلیٰ درجہ کی زینت بھی ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں پسندیدہ بھی۔

بہر حال ان وجوہات کی بنا پر مجھے تو نماز کی حالت میں اور عام حالات میں بھی سر ڈھانپنا ہر حال میں بہتر و اولیٰ اور مستحب و مندوب نظر آتا ہے۔ اگر کسی اہل علم نے اس پر تعاقب فرمایا کہ میری اس کاوش کو غیر صحیح ثابت کر دیا اور بات سمجھ میں آ گئی تو ان شاء اللہ تعالیٰ رجوع کر لوں گا۔

الحمد لله وبنعمته تتم الصالحات

❁❁❁❁

اسلام میں تصویر کشی کا حکم؟

ازالة نقاب التزوير عن وجه مسئلة التصوير، یعنی مسئلہ تصویر کشی؟'' شاہ صاحب رحمہ اللہ ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر انیس احمد صاحب ڈائریکٹر ''الدعوۃ'' اسلام آباد کی دعوت پر اسلام آباد کانفرنس کے لیے تشریف لے گئے اور وہاں میٹنگ میں تصویر کشی کے جواز پر بحث ہوئی، شاہ صاحب رحمہ اللہ ثقل سماعت کی وجہ سے کما حقہ مستفید نہ ہو سکے، جس میں اکثر علماء کرام نے تصویر کشی کو کسی حد تک جائز قرار دیا تو شاہ صاحب سمجھے کہ شاید اخبارات میں یہ خبر شائع ہو جائے کہ فلاں فلاں علماء کرام نے جواز کا فتویٰ دیا ہے تو انہوں نے اس موقف سے بیزاری کرتے ہوئے ایک مقالہ تیار کر کے ڈائریکٹر صاحب کو ارسال کر دیا کہ تصویر کشی حرام ہے، میں ان علماء میں سے نہیں ہوں جو جواز کے قائل ہے۔ (الازہری)
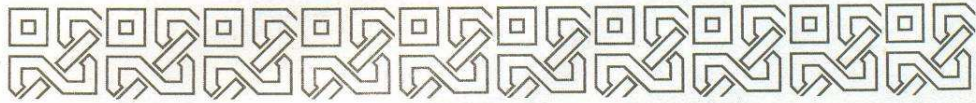
حامدًا و مصليا و مسلما، من جانب محب الله الراشدي حفظه الله ووفقه لما يحبه ويرضاه.

بخدمت جناب محترم المقام ڈاکٹر انیس احمد صاحب ڈائریکٹر "الدعوۃ" السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ امابعد!

راقم الحروف کو پہلی مرتبہ آں جناب کی بلائی ہوئی میٹنگ جو حال ہی میں اسلام آباد میں منعقد ہوئی، شرکت کرنے کا موقعہ ملا۔ میں جناب اور محترم ڈاکٹر بالپوٹہ صاحب کے درمیان بیٹھا ہوا تھا اس لیے جو کچھ آں جناب فرما رہے تھے یا محترم ڈاکٹر صاحب موصوف وہ تو میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن دوسرے حضرات مجھ سے قدرے دور تھے اور میں ثقل سماعت میں مبتلا لہٰذا ان کی باتیں اچھی طرح سمجھ نہ سکا اور اس وجہ سے میٹنگ میں دوسرے حضرات کی طرح گفتگو میں زیادہ حصہ لے نہ سکا۔ پہلے جو کچھ آں جناب نے فرمایا ان کے متعلق کسی اختلاف کا مظاہرہ مجھے ضروری نظر نہیں آیا۔ لیکن تصویر کشی کے مسئلہ پر خصوصاً نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ اور آپ کی سیرت مبارکہ اور اسلامی احکام کی تبلیغ کے لیئے تصویر کشی اور ان کو فلمانے یا ٹی۔ وی، پر پیش کرنے کے مسئلہ پر مجھے شدید اختلاف تھا، لیکن ابتداء میں آں جناب نے صراحتاً فرمایا تھا کہ صرف مقامات مثلاً طائف وغیرہا کی تصاویر دے کر اور آیات قرآنی پیش کیے جائیں بغیر کسی آدمی کی تصویر کے گو اس سے بھی مجھے اختلاف تھا۔ (اس کی وجہ آگے ذکر کروں گا) لیکن ذی روح اشیاء کی تصویرات سے بہرحال اس میں سنگینیت کم تھی اس لیے میں نے آں جناب کو عرض کیا کہ یہ بات آپ پورے تفصیل سے شائع کروائیں اور پھر ہر مکتب فکر کے علماء سے اس سلسلہ میں رائے لیں اس کے بعد کسی حتمی فیصلہ پر پہنچیں، اس سے میرا یہ بھی مقصد تھا کہ اس طرح مختلف علماء کی گراں قدر آراء سامنے آ جائیں گی اور (یقیناً یہ تحریک ماند پڑ جائے گی۔ لیکن اس وقت اگر ہم بات کریں گے تو لامحالہ فیصلہ ہمارے خلاف ہوگا۔ کیونکہ محفل کا جو رنگ دیکھا تھا اس سے اندازہ یہی ہوتا تھا کہ ہم جو دو تین افراد اس مسئلہ سے اختلاف رکھتے ہیں ان کی آواز در نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے" کے مصداق بن جائے گی۔ کیونکہ آج کل بات کی حقانیت پر توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ البتہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ زیر بحث بات میں حاضرین مجلس میں سے اکثر افراد کس جانب ہیں پھر اکثریت کو ہی اہم تصور کر کے فیصلہ انہیں کے حق میں صادر کیا جاتا ہے۔ (افسوس کہ ہوا بھی آخر اس طرح) یعنی آں جناب نے میرے اٹھائے ہوئے سوال کا جواب یہ مرحمت فرمایا کہ "جہاں تک علماء سے رائے لینے کا تعلق ہے تو ملک کے چوٹی کے علماء جو یہاں موجود ہیں انہوں نے فتویٰ دے دیا ہے (یعنی مزید علماء سے پوچھنے کی کیا ضرورت) ان الفاظ پر میرا ماتھا ٹھنکا میں سوچ ہی رہا تھا کہ "فتویٰ دے دیا ہے" کیا مطلب؟ کس چیز کے متعلق؟ یہ اس لیے کہ آن جناب کے "ان چوٹی کے علماء" صاحبان کے ارشادات میں تو سن ہی نہ سکا تھا۔ علاوہ

ازیں آپ نے جو یہ پوائنٹ پیش کیا تھا کہ نماز وغیرہ کے بارے میں بھی اس قسم کا لٹریچر شائع کیا جائے جو با تصویر ہو جیسا کہ حال ہی میں کچھ کتابچے اس قسم کے شائع ہوئے ہیں جن میں تصاویر کے ذریعہ نماز کی عملی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں بھی تصویر کا مسئلہ الجھا ہوا تھا یہ بحث بھی طویل الذیل بحث کی متقاضی تھی۔ میں ابھی کچھ کہنے جا ہی رہا تھا کہ صدر مجلس نے مختصر الفاظ میٹنگ کے اختتام کا اعلان فرما دیا۔ اب مزید کہنے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ میں اس وقت تو خاموش رہا لیکن دل میں بے حد تڑپ تھی کہ کسی طرح معلوم ہو جائے کہ ان ''چوٹی کے علماء گرامی مقدار'' کی آراء عالیہ کا ما حصل کیا تھا۔ اسی سلسلہ میں رات کو میں محترم ڈاکٹر ہالیپوتہ سے اور دوسرے دن علی الصباح محترم پروفیسر اسلامیات خالد محمود (لاہور) سے ملا ان سے جو باتیں معلوم ہوئیں ان سے بے حد افسوس ہوا۔ اب میرے سامنے دو باتیں تھیں (۱) زیر بحث مسئلہ میں کلمہ حق کا اظہار اور جو بات میں حق الیقین کے درجہ تک صحیح تصور کرتا ہوں اس کی تبلیغ اور (۲) اگر اس میٹنگ کی کارروائی اخبارات یا کسی اور ذریعہ سے منظر عام پر آ جائے تو عوام وخواص میرے متعلق کیا اندازہ لگائیں گے؟ ان کو تو یہی تاثر ہوگا کہ فلاں (میں) بھی زیر بحث مسئلہ میں ان سے متفق ہے اور اس قسم کا تاثر میرے لیے قطعی طور پر نا قابل برداشت ہے۔ اس لیے میں نے احباب سے مشورہ لیا۔ انہوں نے یہی مشورہ دیا اور مجھے بھی وہ پسند آیا۔ کہ میں آں جناب کو اس سلسلہ میں ایک مدلل اختلافی نوٹ ارسال کر دوں پھر اگر اخبارات وغیرہا میں یہ میٹنگ کی پروسیڈنگس آ جائیں تو آپ اس اختلافی نوٹ کا حوالہ دے کر اپنی پوزیشن صاف کر سکتے ہیں اور اس مکتوب کا ایک فوٹو اسٹیٹ اپنے پاس رکھ لیں۔ گوٹھ پہنچ کر کچھ ناگریز مصروفیات میں منہمک رہا اب ان سے فارغ ہو کر اللہ کا نام لے کر جناب کی خدمت میں چند گذارشات عرض کر رہا ہوں۔

۱۔ تصویر کشی کا حرام ہونا اب تک کے تمام مکاتب فکر کے علماء وفقہاء کے ہاں مسلم ہے۔ اور اسے قانون اسلامی کی ایک دفعہ قرار دیتے آئے ہیں۔ مقلدین وغیر مقلدین سب کے سب اب تک اس کو حرام سمجھتے رہے ہیں اس سلسلہ میں ''عمدة القاری'' للعلامة بدرالدين العینی: ۱۰/ ۳۰۹ اور شرح الصحیح للامام مسلم'' للامام النووی قابل تعریف ہے۔

۲۔ ان علماء وفقہاء کا یہ فتویٰ کتاب اللہ کے ارشادات اور نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ پر مبنی ہے۔

۳۔ کتاب اللہ کے متعلق تو آگے مذکور ہوگا لیکن نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ جو اتنی اسانید ومختلف طرق سے مرویہ ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اتنے کثیر تعداد سے یہ احادیث صحیحہ مرویہ ہیں کہ ان کے متواتر المعنی ہونے میں کسی اہل علم کو شک وشبہ قطعاً نہ ہوگا نہ ہونا ہی چاہیے، ان احادیث کثیرہ میں سے چند احادیث درج ذیل ہیں۔

۱۔ ((عن عائشة رضي الله عنها ام المومنين ان ام حبيبة و ام سلمة رضي الله عنهما ذكرتا كنيسة راينها بالحبشة فيها تصاوير فذكرتا للنبى ﷺ فقال ان اولئك اذا كان فيهم

الرجل الصالح فمات بنوا علی قبرہ مسجدا وصوروا فیہ تلك الصور فاولئك شرار الخلق عند اللہ یوم القیامۃ)) ❶

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما دونوں نے ایک کلیسا کا ذکر کیا جسے انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا اس میں مورتیں (تصویریں تھیں انہوں نے اس کا تذکرہ نبی کریم ﷺ سے بھی کیا۔ آپ نے فرمایا ان کا یہ قاعدہ تھا کہ اگر ان میں کوئی نیکوکار شخص مر جاتا تو وہ لوگ اس کی قبر پر مسجد بناتے اور اس میں یہی تصویریں بنا دیتے ہیں یہ لوگ اللہ کی درگاہ میں قیامت کے دن تمام مخلوق میں برے ہوں گے۔''

۲۔ ((عن ابی زرعۃ قال دخلت مع ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ دارا بالمدینۃ فرأی اعلاما مصورا، یصور قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ومن اظلم ممن ذھب یخلق کخلقی فلیخلقوا حبۃ ولیخلقوا ذرۃ)) ❷

''ابوزرعہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ منورہ میں (مروان بن حکم کے گھر میں) گیا تو انہوں نے چھت پر ایک مصور کو دیکھا جو تصویر بنا رہا تھا انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا (اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے) اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو میری مخلوق کی طرح پیدا کرنے چلا ہے اگر اسے یہی گھمنڈ ہے تو اسے چاہیے ایک دانہ پیدا کرے، ایک چیونٹی پیدا کرے۔''

۳۔ ((عن ابی جحیفۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ لعن المصور)) ❸

''ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے تصویریں بنانے والے پر لعنت فرمائی۔''

٤۔ ((عن ابی محمد الھذلی عن علی رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ ﷺ فی جنازۃ فقال ایکم ینطلق الی المدینۃ فلا یدع بھا وثنا الا کسرہ ولا قبرا الا سواہ ولا صورۃ الا لطخھا فقال رجل انا یا رسول اللہ فانطلق فھاب اھل المدینۃ فرجع فقال علی انا انطلق یا رسول اللہ قال فا نطلق فانطلق ثم رجع فقال یا رسول اللہ لم ادع بھا وثنا الاکسرتہ ولا قبرا الاسویتہ ولا صورۃ الا لطختھا ثم قال رسول اللہ ﷺ "من عار لصنعۃ شیء من ھذا فقد

---

❶ الصحیح البخاری، کتاب الصلوٰۃ وصحیح مسلم، کتاب المساجد و...... فی کتاب المساجد ایضاً.

❷ صحیح البخاری، کتاب اللباس۔ مسلم ومسند احمد کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ مروان کا گھر تھا۔

❸ صحیح البخاری، کتاب البیوع، کتاب الطلاق و کتاب اللباس.

کفر بما انزل علی محمد"ﷺ"))❶

''سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک جنازہ میں شامل تھے وہاں آپ نے فرمایا کون ہے کہ جو مدینہ جا کر وہاں جو بھی بت ہوں ان کو توڑ ڈالے اور کوئی بھی قبر ہو اسے برابر کر دے، اور جو بھی تصویر ہو اسے مٹا ڈالے۔ ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ میں جاتا ہوں، وہ گیا اور اہل مدینہ سے خوف زدہ ہو کر واپس آ گیا پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ میں جاتا ہوں آپ ﷺ نے فرمایا جائیں علی رضی اللہ عنہ گئے پھر جب واپس آئے اور کہا اے اللہ کے رسول ﷺ میں نے وہاں جو بھی بت پایا اسے توڑ دیا اور ہر قبر کو برابر کر دیا جو بھی تصویر دیکھی اسے مٹا دیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا ان چیزوں میں سے کسی کو بھی اگر کوئی پیشہ بناتا ہے تحقیق اس نے محمد (ﷺ) کی شریعت کا کفر کیا۔''

۵۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ ...... ومن صور صورة عذب وكلف ان ينفخ فيها وليس بنافخ))❷

''سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس نے بھی کوئی تصویر بنائی اسے (قیامت کے دن) عذاب دیا جائے گا اور اس میں روح پھونکنے کا اسے مکلف بنایا جائے گا اور وہ ایسا نہ کر سکے گا۔''

٦۔ ((عن سعيد بن ابی الحسن قال كنت مع ابن عباس رضی اللہ عنہما اذ اتاه رجل فقال يا ابا عباس انی انسان انما معيشتی من صنعة يدی وانی اصنع هذه التصاوير فقال ابن عباس لا احدثك الا ما سمعت رسول الله ﷺ يقول سمعته يقول من صور صورة فان الله معذبه حتی ينفخ فيها الروح وليس بنافخ فيها ابدا فربا الرجل ربوة شديدة فاصفر وجهه فقال ويحك ان ابيت الا ان تصنعفعليك بهذا الشعر كل شی ليس فيه روح))❸

''سعید بن ابی الحسن سے روایت ہے کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا کہ اے ابن عباس رضی اللہ عنہما میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کی روزی اپنے ہاتھوں کی صنعت پر موقوف ہے اور میں یہ تصویریں بناتا ہوں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس پر فرمایا میں تمہیں صرف وہی بات بتلاؤں گا جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے۔ انہوں نے کہا میں نے آپ کو یہ فرماتے سنا

❶ المسند للامام احمد، مسلم كتاب الجنائز والنسائی فی كتاب الجنائز ايضاً.

❷ صحيح البخاری كتاب التعبير۔ الترمذی ابواب اللباس، نسائی كتاب الزينة ومسند احمد.

❸ الصحيح للبخاری، كتاب البيوع، مسلم كتاب اللباس، نسائی كتاب الزينة ومسند احمد.

تھا ''جس نے بھی کوئی تصویر بنائی تو اللہ تعالیٰ اسے اس وقت تک عذاب کرتا رہے گا جب تک وہ شخص اپنی بنائی ہوئی تصویر میں جان نہ ڈال دے اور وہ کبھی اس میں جان نہیں ڈال سکتا۔'' (یہ سن کر) اس شخص کا سانس چڑھ گیا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا افسوس اگر تم تصویریں بنانا ہی چاہتے ہو تو ان درختوں کی اور ہر اس چیز جس میں جان نہیں ہے بنا سکتے ہو۔''

۷۔ ((عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه قال سمعت النبی ﷺ یقول ان اشد الناس عذابا عند الله یوم القیامة المصورون)) [1]

''ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا آپ فرما رہے تھے کہ اللہ کے پاس قیامت کے دن تصویر بنانے والوں کو سخت تر عذاب ہوگا۔''

۸۔ ((عن عبدالله بن عمرو رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ قال ان الذین یصنعون هذه الصور یعذبون یوم القیامة یقال لهم احیوا ما خلقتم)) [2]

''ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں انہیں قیامت کے دن عذاب ہوگا اور ان سے کہا جائے کہ جسے تم نے بنایا ہے اب اس میں جان بھی ڈالو۔''

۹۔ ((عن عائشة رضی الله عنها انها اشترت نمرقة فیها تصاویر فقام النبی ﷺ بالباب ولم یدخل فقلت اتوب الی الله مما اذنبت قال ماهذه النمرقة قلت لتجلس علیها وتوسدها قال ان اصحاب هذه الصور یعذبون یوم القیامة یقال لهما حیوا ما خلقتم وان الملائکة لا تدخل بیتا فیه الصورة)) [3]

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک گدا (بستر) خریدا جس پر تصویریں تھیں، رسول اللہ ﷺ (اسے دیکھ کر) دروازے پر کھڑے ہو گئے اور اندر تشریف نہیں لائے میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے جو غلطی کی ہے اس سے میں اللہ سے معافی چاہتی ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے کہا یہ گدا کس لیے ہے؟ میں نے کہا آپ کے بیٹھنے کے لیے اور اس پر ٹیک لگانے کے لیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ان تصویروں کے بنانے والوں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا جو تم نے پیدا کیا اسے زندہ بھی کر کے دکھاؤ اور فرشتے اس گھر میں نہیں داخل ہوتے جس میں تصویر ہو۔''

---

[1] صحیح البخاری، کتاب اللباس، مسلم کتاب اللباس، نسائی کتاب الزینة ومسند احمد.

[2] صحیح البخاری، کتاب اللباس، مسلم کتاب اللباس نسائی کتاب الزینة ومسند احمد.

[3] الصحیح البخاری، کتاب اللباس، مسلم کتاب اللباس، نسائی کتاب الزینة، ابن ماجة کتاب التجارات موطا کتاب الاستیذان.

١٠۔ عن عائشة رضی الله عنها قالت دخل علی رسول الله ﷺ وانا مستترة بقرام فيه صورة فتلون وجهه ثم تناول الستر فهتكه ثم قال ان من اشد الناس عذابا يوم القيامة الذين يشبهون بخلق الله)) ❶

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ تشریف فرما ہوئے اور گھر میں ایک پردہ لٹکا ہوا تھا جس پر تصویریں تھیں، نبی کریم ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا پھر آپ نے پردہ پکڑا اور اسے پھاڑ دیا۔ ام المومنین نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ان لوگوں کو سب سے زیادہ عذاب ہوگا جو یہ تصویریں بناتے ہیں۔''

١١۔ ((عن عائشة رضی الله عنها قالت قدم رسول الله ﷺ من سفر وقد سترت علی بابی درنوكا فيه الخيل ذوات الاجنحة فامرنی فنزعته)) ❷

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں، رسول اللہ ﷺ سفر سے تشریف لائے میں نے اپنے دروازے پر ایک منقش پردہ لٹکایا تھا، جس پر پردار گھوڑوں کی تصویریں تھیں، آپ نے حکم دیا میں نے اسے پھاڑ دیا۔''

١٢۔ عن جابر رضی الله عنه قال نهی رسول الله ﷺ عن الصورة فی البيت ونهی ان يصنع ذلك)) ❸

''سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھر میں تصویر لگانے اور تصویر بنانے سے منع فرمایا۔''

١٣۔ عن ابن عباس عن ابی طلحة عن النبی ﷺ قال لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا صورة)) ❹

''سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔''

١٤۔ ((عن عبدالله بن عمر رضی الله عنه قال وعد النبی ﷺ جبريل فراث عليه حتی اشتد علی النبی ﷺ فخرج النبی ﷺ فلقيه فشكا اليه ما وجد فقال له انا لا ندخل بيتا فيه صورة ولا كلب)) ❺

---

❶ مسلم كتاب اللباس۔ بخاری كتاب اللباس۔ نسائی كتاب الزينة.

❷ مسلم كتاب اللباس۔ نسائی كتاب الزينة.

❸ الترمذی ابواب اللباس.

❹ صحيح البخاری، كتاب اللباس.

❺ صحيح البخاری، كتاب اللباس.

''سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک وقت جبرئیل علیہ السلام نے نبی ﷺ کے یہاں آنے کا وعدہ کیا لیکن آنے میں دیر ہوئی۔ وقت پر نہیں آئے تو نبی کریم ﷺ سخت پریشان ہوئے پھر آپ باہر نکلے تو جبریل سے ملاقات ہوئی نبی کریم ﷺ نے ان سے شکایت کی تو انہوں نے کہا ہم ''فرشتے'' کسی ایسے گھر میں نہیں جاتے جس میں تصویر یا کتا ہو۔''

١٥۔ عن ابی الھیاج الاسدی قال لی علی الا ابعثك علی ما بعثنی علیه رسول الله ﷺ ان لا تدع تمثالا الا طمسته ولا قبرا مشرفا الا سویته ولا صورة الا طمستها)) [1]

''ابوالہیاج الاسدی بیان کرتے ہیں کہ مجھے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا میں آپ کو اس کام پر نہ بھیجوں جس کام سے مجھے نبی ﷺ نے بھیجا تھا؟ کہ تو ہر تصویر کو مٹا دے اور ہر اونچی قبر کو برابر کردے۔'' اور کوئی شبیہ نہ چھوڑ کہ اسے توڑ دے۔

١٦۔ عن ابی هریرة ﷺ عن النبی ﷺ اتانی جبریل فقال: اتیتك البارحة فلم یمنعنی ان اکون دخلت الا انه کان علی الباب تماثیل وکان فی البیت قرام ستر فیه تماثیل وکان فی البیت کلب فمر برأس التمثال الذی علی باب البیت یقطع فیصیر کهیئة الشجرة، ومر بالستر فلیقطع فلیجعل منه وسادتان منبوذتان توطان ومر بالکلب فلیخرج ففعل رسول الله ﷺ)) [2]

''سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبرئیل آئے اور کہا میں کل آپ کے پاس آیا تھا اور صرف اس لیے گھر میں داخل نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر تصویریں (مورتیاں) تھیں اور گھر میں ایک کپڑا تھا جس میں تصویریں تھیں اور گھر میں ایک کتا تھا، تو آپ حکم کریں کہ جو تصویریں دروازے پر ہیں ان کا سر کاٹ ڈالا جائے تاکہ وہ درخت کی طرح ہو جائیں اور پردہ کے لیے حکم کریں کہ اس کو کاٹ کر دو تکیے بنائے جائیں کہ وہ ٹھہرے رہیں اور ان کو روندا جائے اور حکم کریں کہ کتے کو نکال دیا جائے پس آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔''

ان احادیث مبارکہ میں کہیں مصور پر لعنت آئی ہے کہیں آخرت میں ان کے اشد العذاب میں گرفتار ہونے کا بیان ہے۔ کہیں ایسے کام پر کفر بما انزل علی محمد ﷺ کا اطلاق آیا ہے اور یہ سب کی سب احادیث صحیحہ ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سی احادیث اس سلسلہ میں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن اصل مقصود ان سے بھی بوجہ اتم

[1] مسلم کتاب الجنائز۔ نسائی کتاب الجنائز.

[2] رواہ اصحاب السنن و صححه الترمذی و ابن حبان.

حاصل ہو جاتا ہے۔

ان نبوی اطلاقات اور ارشادات عالیہ سے ایک اہل علم بخوبی جان سکتا ہے کہ تصویر کشی کبیرہ گناہ، اس کا مرتکب ملعون اور آخرت میں شدید عذاب کا مستحق ہے اور یہ صاف علامت اس کی ہے کہ یہ فعل محض مکروہ تنزیہی نہیں بلکہ حرام ہے اگر اس کام کو کوئی حلال قرار دیتا ہے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ اور میرا حسن ظن تو یہی ہے کہ آں جناب بلکہ سب حاضرین مجلس کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات کے ہوتے ہوئے ان ''چوٹی کے علماء کو اس کے حلت کی فتوی کی جرأت کس طرح ہوئی دراں حالیکہ انہیں کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ کے برخلاف فتوی صادر کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے بھی اجتہاد کیا ہے۔ مثلاً شراب کی سزا نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں مقرر و معین نہ تھی۔ کبھی (اس شراب پینے والے کو) جوتیوں سے مرمت کی جاتی، کبھی ہاتھوں سے مکوں سے، کبھی کھجور کی چھڑیوں سے وغیرہ۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی حد چالیس کردی پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسی کردی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کو اختیار فرمایا، لہٰذا اگر ہم بھی آج کے دور کی حالت کو مدنظر رکھ کر اس مسئلہ میں اجتہاد کر کے موجودہ ضروریات کو مدنظر رکھ کر تصویر کشی کو جائز کردیں تو کیا حرج ہے؟ اور پھر ہماری نیت اسلام کی تبلیغ ہے۔ لیکن اولاً تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین اسلام کامل دین ہے اور ابدی ہے یا ناقص ہے۔ اور اس کے اوامر و نواہی صرف اس عہد کے لیے ہی تھے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدة: ٣)

اور......

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ۝﴾ (التوبة: ٢٩)

نیز فرمایا:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝﴾ (النساء: ٦٥)

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ.....﴾ الآية (آل عمران: ١٩)

اور بہت سی دوسری آیات کریمہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی صحیح معنی میں مسلم یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ دین اسلام کو غیر کامل ناقص یا ارشادات اللہ سبحانہ وتعالیٰ و رسول اللہ ﷺ کو کسی خاص وقت کے لیے قرار دے۔ ہاں کوئی منکر

سنت ہو تو وہ اس قسم کے ہفوات نکال سکتا ہے لیکن الحمد للہ آپ حضرات کی صورت و سیرت یہی گواہی دیتی ہے کہ آپ سنت رسول اللہ ﷺ کے منکر نہیں ہیں۔

بہرحال جب اسلام کے احکام ابدی ہیں تو پھر کسی کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے۔ کائنا من کان، کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات و فرامین پر اپنے اجتہاد کی قینچی چلانی شروع کر دے۔

ثانیاً: جو مثال خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی پیش کی ہے اول تو اس پر کافی بحث کی گنجائش ہے، پھر یہ مثال فیما نحن فیه سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس مثال کے پیش کرنے والے خود معترف ہیں کہ شراب کی حد نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں متعین نہیں تھی۔ جب حد متعین تھی ہی نہیں تو اگر خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق اس میں تعین فرما دیا تو یہ منصوص علیہ حکم کی قطعاً تبدیلی نہیں ہے۔ مثلاً مفقود الخبر کے متعلق کتاب و سنت میں یہ وضاحت نہیں کہ اس کی زوجہ کتنا انتظار کرے اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کی مدت چار سال معین فرما دی اور اس طرح کسی منصوص علیہ حکم کی مخالفت نہیں کی۔ بحث تو اس پر ہے کہ کوئی حکم، امر یا نہی، کتاب و سنت میں منصوص ہے۔ آیا اس کو بھی زمانہ کے نام نہاد تقاضوں کے بموجب بدلا جا سکتا ہے یا نہیں اور ان شاء اللہ ایسی کوئی مثال خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم تو کیا کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے ایسی کوئی روایت پیش نہیں کی جا سکتی کہ اس نے نبی کریم ﷺ کا فرمان بھی سنا یا اس کو معلوم تھا لیکن اس نے اس صریح و منصوص حکم کو اپنے دور کے تقاضوں سے مجبور ہو کر بدل لیا۔

بلکہ ایسے امثلہ موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اگر کسی وقت عدم علم یا عارضی ذہول کی وجہ سے کسی امر میں کوئی فتویٰ صادر بھی فرمایا تو جیسے ہی ان کو علم ہو جاتا کہ یہ فتویٰ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشاد کے برخلاف ہے تو اسی وقت رجوع فرما دیتے۔ حتیٰ کہ اگر کسی عورت نے بھی انہیں کسی بات پر ٹوکا تو اس کی بات پر بھی اپنے موقف سے ہٹ جاتے طوالت کی وجہ سے یہ امثلہ تحریر نہیں کر رہا۔ جناب جیسے اہل علم سے یہ مخفی نہیں ہوں گے۔ لہٰذا زیر بحث مسئلہ میں شراب کی حد کی تعین کو دلیل بنا کر پیش کرنا اصولی طور پر صحیح نہیں اور نہ ہی یہ کوئی علمی بات ہے۔

تصویر کشی کے متعلق نبی کریم ﷺ کے واضح ارشادات موجود ہیں اب ان کے برخلاف اجتہاد کیسے جائز ہوگا۔ علماء حقہ نے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں فرمایا لیکن ہر کہ ومہ کو بھی اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی، بلکہ اس کو جو اس کا اہل ہو اور مجوزین اجتہاد نے یہ بھی تصریح فرما دی ہے کہ یہ اجتہاد منصوصہ علیہا احکام کتاب و سنت میں قطعاً جائز نہ ہوگا باقی رہی بات آج کل کے تقاضوں کی یا ضرورت کی یا جس طرح آں جناب نے ارشاد فرمایا کہ ''جس طرح حال ہی میں کچھ کتابچے شائع ہوئے ہیں جن میں تصاویر سے نماز کی تعلیم دی گئی ہے یہ کتابچے میرے پاس بھی ہیں میں نے بھی دیکھے ہیں۔ لیکن اولاً تو میں یہ گذارش کروں گا کہ یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ ہم خواہ مخواہ ایک چیز کو۔ جو گو وہ

حرام بھی ہو تب بھی۔ ہم خود ہی ایک ضرورت بنا لیں اور پھر اضطرار و مجبوری کی بات سامنے لاکر کتاب وسنت کے احکام میں تبدیلی کرنے لگ جائیں اور حرام سے حلال بنانے کی فکر میں غلطاں ہو جائیں اس سے بڑا اور ظلم کیا ہو سکتا ہے؟ اس طرح تو کوئی حرام حرام نہ رہے گا۔ مثلاً آج کل سود جس طرح ہر ملک میں رواج پا چکا ہے اور اس سے اپنے آپ کو بچانا نہایت مشکل ہو گیا ہے۔ تو کیا اس کو ضرورت بنا کر یہ فتویٰ داغ دیا جائے کہ یہ اب حلال ہے؟ اس طرح رشوت کی۔ اس وقت جو گرم بازاری ہے وہ مخفی نہیں حتیٰ کہ اگر اسلحہ کے لائسنس رینیوئل کے لیے لے جاتے ہیں تو کلرک صاحبان برملا کہتے ہیں کہ رینیوئل فیس کے علاوہ ہماری مٹھائی پہلے ٹیبل پر رکھو پھر بات کرو تو کیا اس مجبوری اور ضرورت کو دیکھ کر رشوت کے حلت کا فتویٰ صادر کیا جائے؟ آج کل عورت جس مقام پر کھڑی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور معاشرہ میں اس کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

موجودہ خصوصاً مغرب زدہ خواتین نے مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کے لیے جو کچھ منصوبے بنا رکھے ہیں وہ ان کی ان کارستانیوں سے عیاں ہیں جو انہوں نے ماضی قریب میں دیت میں سے مرد سے آدھے حصہ ملنے پر اور شہادت میں بھی ان کی شہادت مرد سے نصف پر ہونے پر کی ہیں۔ لہٰذا ان خواتین کو راضی کرنا بھی بہت سے سنجیدہ تک لوگوں کے لیے ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ اب اگر مستقبل میں خواتین یہ سوال اٹھائیں کہ ہمیں ورثہ وترکہ میں بھی مرد سے آدھا حصہ ملتا ہے۔ (مثلاً اولاد میں، للذکر مثل حظ الانثیین) اور شوہر کو یا آدھا ملتا ہے یا ربع لیکن زوجہ کو یا ربع ملتا ہے یا ثمن وغیرہ۔ لہٰذا وہ عہد گذر گیا اب ہماری ضروریات گوناگوں ہو گئی ہیں اور وہ دور نہیں رہا کہ باہر کے سارے کام مرد ہی کیا کرتے تھے اب ہم (خواتین) بھی ہر شعبہ زندگی میں۔ دروں خانہ یا بیرون خانہ حصہ لیتی ہیں لہٰذا ہمیں اب مرد جتنا ہی حصہ ورثہ میں سے ملنا چاہیے۔ اس طرح کے بہت سے مسائل پیش آ سکتے ہیں۔ تو کیا ان حالات میں قرآنی نصوص کو بھی بدل کر لوگوں کی رضا حاصل کی جائے گی؟ میرا تو یہی خیال ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا اور (ہونا بھی یہی چاہیے اور اگر خدانخواستہ ثم خدانخواستہ ان سب باتوں میں لوگوں کی رائے کو مقدم سمجھا جائے گا اور کتاب وسنت کے نصوص کو نام نہاد ضرورت و مجبوری کی وجہ سے پس پشت ڈال دیا جائے گا تو باقی اسلام کی کونسی بات بچے گی یا اسلام کا کونسا حکم باقی رہے گا جس کی تعمیل کی دعوت دی جائے گی۔

باقی جناب کا یہ فرمانا کہ ''تصاویر کے ذریعہ نماز وغیرہ کی تعلیم بہترین طریقہ پر دی جا سکتی ہے اور اس قسم کے کتابچے حال ہی میں منظر عام پر آئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو گذارش یہ کہ یہ بات آپ جیسی ہستی سے سن کر مجھے جتنا کچھ تعجب ہوا اس سے زیادہ افسوس ہوا۔ جناب والا کے سامنے اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ ہے کیا اس بیسویں کے اس اخیری حصہ سے قبل کبھی بھی کسی مسلمان کو عقائد و اعمال میں سے کسی عقیدہ و عمل۔ مثلاً نماز وغیرہ کے سلسلہ میں کسی تصویر کی ضرورت پیش آئی؟ کروڑہا مسلمانوں میں سے لاکھوں نہیں تو ہزاروں مسلمان نمازیں ادا کرتے آئے ہیں اور آج تک ادا کرتے رہتے ہیں، کیا یہ سب تصاویر کو دیکھ کر اپنی نمازیں درست کرتے آئے ہیں یا

درست کر رہے ہیں؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا اور اس وقت تبلیغی جماعت پاکستان کے علاوہ فارین کنٹریز، یورپ، امریکہ، افریقہ وغیرہا ممالک میں تبلیغی خدمات انجام دے رہی ہے اور ان کی بےلوث خدمات اور اخلاص کی وجہ سے ہزاروں مسلمان صحیح طور پر مسلمان ہو چکے ہیں اور مختلف ممالک کے لیے مسلمانوں کی جماعتیں ہمارے پاکستان میں آئی ہیں جن کو آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ عقیدہ و عملاً مسلمان ہو گئے ہیں اور گو اس سے پیشتر انہوں نے کبھی اپنی پیشانی اللہ کے حضور زمیں پر نہیں رکھی تھی لیکن اب وہ پکے نمازی بن گئے ہیں اور اسی طرح نماز پڑھتے ہیں جس طرح اور سب مسلمان پڑھتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ تصاویر کا کرشمہ ہے؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ تصویر کشی تو ان کے ہاں قطعی طور پر ناجائز ہے۔ گو ہم مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کے اجتماعات میں ان کے علماء وغیرہم کی تصاویر لی جاتی ہیں اور وہ خاموش رہتے ہیں لیکن تبلیغی جماعت کے کسی اجتماع میں فوٹوگرافر کی شکل بھی دیکھنے میں نہیں آتی اور نتیجہ یہ ہے کہ ہزاروں مسلمان صحیح طور نمازی بن رہے ہیں اور بحمد للہ جماعت میں روز بروز ترقی ہوتی رہتی ہے۔ جب یہ امثلہ ہمارے سامنے موجود ہیں تو اب آخر ایسی کونسی ضرورت لاحق ہوئی ہے کہ اب نماز کی تعلیم کے لیے ہم ایسے کام کی طرف رجوع کریں جو اسلامی شریعت کی تعلیم کے لیے ہم ایسے کام کی طرف رجوع کریں جو اسلامی شریعت میں حرام ہے۔ بےشک مضطر کے لیے میتہ وغیرہا حلال ہو جاتا ہے تاکہ اس کی زندگی بچ جائے۔ لیکن فوٹوگرافی کو قیاس کرنا علمی بات نہ ہوگی کیونکہ یہاں واللہ باللہ کوئی اضطرار ہے ہی نہیں بلکہ ہم خود ہی ایک کام کرتے کرتے اس کے عادی بن جاتے ہیں پھر اس کو ایک ضرورت بنا دیتے ہیں اور یہ خودساختہ ضرورت ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ﴾ الآیۃ کے تحت قطعاً نہیں آسکتی ہوسکتا ہے کہ کہا جائے کہ آج کل کے علماء بھی کچھ کتابچے تصنیف فرما رہے ہیں جن میں تصاویر ہوتی ہیں اور ان کے ذریعہ شرعی احکام کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس سلسلہ میں ہوسکتا ہے کہ عرب ممالک کا بھی حوالہ دیا جائے لیکن اس کا جواب گو طویل بھی ہوسکتا ہے لیکن میں چند مختصر الفاظ میں عرض کرلوں کہ ہمارا ایمان ہم سے کیا تقاضا کرتا ہے؟ اس کا واضح اور دوٹوک جواب صرف یہ ہوسکتا ہے کہ اگر ایک سائیڈ میں اگر پوری دنیا ہے جس میں علماء وفضلاء وعوام وخواص سب ہوں اور دوسرے سائیڈ میں اللہ تعالیٰ یا اس کا رسول مقبول ﷺ ہو تو ایک سچا مسلمان تو یہی اور صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ صحیح بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے آئی ہے باقی پوری دنیا غلطی پر ہے ان کا موقف قطعاً صحیح نہیں اور ان سب سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں سوال ہوگا۔ قیامت کے دن بھی یہی سوال ہوگا کہ تم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی یا نہیں یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نے فلاں وفلاں عالم وفاضل جو اپنے عہد کا چوٹی کا فاضل شمار ہوتا تھا اس کے نقش قدم پر چلے یا نہیں۔ لہٰذا اگر چند علماء عملاً تصویر کشی کو جائز قرار دے رہے ہیں یا عرب ممالک بھی اس رو میں بہہ گئے ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے وہ یقیناً عظیم غلطی اور سنگین خطا کے مرتکب ہیں۔ ہم نے ان علماء یا فضلاء یا عربوں صرف من حیث العرب ہونے کے کلمہ نہیں پڑھا بلکہ ہم نے کلمہ محمد

رسول اللہ ﷺ پر پڑھا ہے اور انہیں پر ایمان لائے اور انہیں کی اطاعت ہم پر فرض عین ہے لہٰذا کسی دوسرے عالم یا ملک کا حوالہ سراسر بے محل ہوگا۔ اس سلسلہ میں آں جناب نے یہ بھی فرمایا کہ آج کل ہر گھر سینما بن چکا ہے۔ ہر گھر میں وی۔ سی۔ آر یا ٹی۔ وی وغیرہا موجود ہیں لہٰذا اگر ہم سیرت طیبہ کو فلما کر پیش کریں یا شرعیہ احکام کو ان ذرائع کے واسطہ سے ان کے سامنے لائیں تو اس طرح ان کو اسلامی احکام کی آسانی سے عملی تعلیم مل جائے گی وغیرہ وغیرہ لیکن راقم الحروف کی یہ گذارش ہے کہ ممالک عرب بمعہ شمولیت سعودی عرب کے متعلق تو غالباً جناب کا یہ کہنا درست ہے کہ ان کا ہر گھر سینما گھر بنا ہوا ہے کیونکہ ان ممالک کے عوام وخواص حتیٰ کہ علماء وشیوخ تک کے مکانات و گھر و محلے ٹی۔ وی سے خالی نہیں لیکن پاکستان کا معاملہ ایسا نہیں یہاں بہت سے علماء اور خواص بلکہ عوام بھی ایسے ہیں جو ٹی۔ وی کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ اس میں بھی تصویر کشی الجھی ہوئی ہے اور بھی بہت سی خرابیاں اس میں ہیں اور لن سے ہمارے گھر جس بداخلاقی سے بھر گئے ہیں اور ان کی وجہ سے جو اسلامی غیرت وشرم وحیا کا فقدان ہوا ہے اس کا اندازہ ہمارے مغرب زدہ اور یورپین تہذیب سے مرعوب افراد لگا بھی نہیں سکتے لہٰذا ان کے گھروں میں اس قسم کی چیزوں کا نام ونشان بھی نہیں۔ بلکہ ان کے گھروں میں اگر ناگریزطور پر ایسے رسائل وغیرہا آ جاتے ہیں جن میں تصاویر کی بھرمار ہو تو وہ ان تصاویر کے سروں کو کالا کر کے یا سر کاٹ کے رکھ دیتے ہیں۔ باقی جن کے گھروں میں یہ البلیٰ موجود ہے وہ خود اپنی طرز عملی کے ذمہ دار ہیں ہمیں ان کی تقلید قطعاً نہیں کرنی اگر ہمارے معاشرہ کے بعض یا اکثر افراد ایک غلط راہ پر گامزن ہو چکے ہیں تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہے کہ ہم بھی آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے لگ جائیں بلکہ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کی اصلاح کی فکر کریں اور انہیں اس بے راہ روی سے باز لانے کی سعی جمیل کریں، علاوہ ازیں حیات طیبہ وسیرت مبارکہ کو فلمانے اور اس کو ٹی۔ وی وغیرہ پر پیش کرنے میں۔ گو اس میں جانداروں کی تصاویر نہ ہوں اور صرف مقامات مثلاً طائف وغیرہا (جیسا کہ آں جناب نے فرمایا) کی تصاویر ہوں تب بھی اس میں ایک اتنا بڑا مفسدہ ہے جو دوسرے سب وجوہات سے زیادہ سنگین ہے اور مجھے افسوس ہے اور تعجب ہے کہ اس پوائنٹ کی طرف حاضرین مجلس علماء کی توجہ کیوں منعطف نہ ہوئی۔ پردہ سیمین پر جو کچھ دیکھا جاتا ہے یا دکھایا جاتا ہے اور جو لوگ اس کو دیکھتے ہیں اور اسی طرح ٹی۔ وی وغیرہ پر جو پروگرام نشر ہوتے ہیں ان کا مقصد محض تفریح اور انٹرٹینمینٹ لطف اندوزی اور تماشاہی ہوتا ہے ایک سینما گھر بھی اس لیے نہیں بنایا گیا ہے کہ اس میں جا کر لوگ نصیحت حاصل کریں یا اپنے اعمال درست کریں بلکہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر ان خرافات کے بنانے والے اگر ان کو اسی نقطہ نظر سے بنانا شروع کریں اور اس میں اکثر عنصر اصلاحی چیزوں کا ہو تو کوئی بھی ایسی فلمیں دیکھنے کی زحمت نہیں اٹھائے گا بلکہ بنانے والوں کو فائدہ تو درکنار رأس المال بھی حاصل نہیں ہو سکے گا کیا کوئی ایسی مثال۔ واحد ہی سہی۔ پیش کی جا سکتی ہے کہ فلاں آدمی فلم دیکھ کر یا ٹی۔ وی کا پروگرام مشاہدہ میں لا کر متقی بن گیا یا باعمل پکا مسلمان بن گیا؟ لہٰذا اگر آج کل کے مغرب سے مرعوب حضرات اس قسم کی جرأت کر کے مثلاً: نبی

کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کو فلمالیں گے۔ تو ان کا دیکھنا محض ایک تفریح یا انجائمنٹ یا ٹھٹھہ وتماشا بن جائے گا اور یہ اتنا سنگین گناہ ہوگا جس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے اور اس کے مرتکب یقیناً اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے تحت آ جائیں گے کہ:

﴿الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ الآية (الاعراف: ٥١)

اور ﴿قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ۝﴾ (التوبة: ٦٥)

یہ کتنی افسوس کی بات ہے کہ اس دور میں ماڈرن بننے کے شائقین اور نام نہاد نئی روشنی کے دلدادہ مغربیت سے مرعوب حضرات اپنی قیمتی روایات کو نظر انداز کر کے اور کتاب وسنت کی رسک پر اسلام کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر کے اس کو دین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اگر اسی اسلام (نئے ایڈیشن والے اسلام) کی طرف دعوت اور اس کی تبلیغ کے لیے ہی سب دردسری ہے تو معاف فرمائیے اسی اسلام پر تو دنیا بلا دعوت وتبلیغ کے عمل کر رہی ہے پھر ہماری دعوت کا مصرف کیا ہوا؟ ہمارے آج کل کے لوگ حتیٰ کہ بعض علماء وفضلاء بھی مغرب سے اتنا مرعوب ہو چکے ہیں جو بعض ایسی باتوں سے ہی دست بردار ہو جاتے ہیں جو اسلام میں جائز ہیں گویا ان میں اتنی جرأت بھی نہ رہی کہ اپنی چیز کو اپنا کہہ سکیں کیوں؟ محض اس لیے کہ بدقسمتی سے مغرب ان کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا اور بہت سی ایسی اشیاء کو اپنا لیتے ہیں جو اسلام میں قطعی طور پر ناجائز ہیں کیوں؟ اس لیے کہ خوش فہمی سے مغرب ان کو بنظر استحسان دیکھتا ہے اور پھر ان کے جواز کی سند لانے کے لیے کتاب وسنت میں تاویل بلکہ تحریف سے بھی اجتناب نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات ان کو ترک بھی فرما دیتے ہیں۔ فیاللعجب ویضعة الادب

اور اس پر طرہ یہ کہ اس کا احساس بھی جاتا رہا
وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

ضرورت کے سلسلہ میں بہت دور نکل گیا ہوں لیکن کیا کروں لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں تو تصویر کشی کی قطعی کوئی ضرورت ومجبوری نہیں۔ البتہ بات صرف یہ ہے اگر گستاخی معاف ہو۔ ہم آج ہر بات میں ہر معاملہ میں تہذیب وثقافت میں مغرب کے ساتھ شانہ بشانہ چلنا چاہتے ہیں اور یہی جذبہ ہے جو ہماری سب تگ ودو میں اہم عنصر بن چکا ہے۔ اگر یہی جذبہ ہے اس زیر بحث مسئلہ میں تو بخدا اس جذبہ کو ہرگز ہرگز نیک جذبہ ونیک نیتی کا نام نہیں دیا جا سکتا اس سے قطعی کوئی اجر وثواب حاصل نہ ہوگا اور نہ ہی ہم تبلیغ ودعوت کا مقدس فریضہ ان ناجائز باتوں سے انجام دے سکیں گے۔

ڈاکٹر ہالیپوتہ صاحب سے معلوم ہوا کہ بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ تصاویر وہ منہی عنہا ہیں۔ جو اسٹیشنری ہوں موجودہ فوٹوگرافی یا مووِیز ممنوع نہیں ہیں۔ اسٹیشنریز سے مراد ان حضرات کی یا تو یہ ہوگی کہ وہ بتوں کی طرح مجسمے

ہوں یا پھر ان سے مراد غیر متحرک ہوں لہٰذا جو مووویز ہیں وہ جائز ہیں تو ان کی خدمت میں باادب۔ یہ عرض رکھتا ہوں کہ ابتداء میں جو احادیث مبارکہ تحریر کر آیا ہوں ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو اس مہم پر ارسال فرمایا کہ جو وثن (بت) دیکھیں اس کو توڑ دیں (کسرتہ) اور جو تصاویر دیکھے ان کو مٹا دے (لطخت، طمست) اس حدیث میں وثن مجسمے کے لیے آیا ہے اور تصاویر کا لفظ ان تصاویر کے لیے بولا گیا ہے جو گڑھی ہوئی ہوں یا چھپی ہوئی ہو یا دیواروں پر منقش ہوں لہٰذا یہ تفریق صحیح نہیں اور اس حدیث مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حکم صرف نبی کریم ﷺ کے گھر مبارک کے ساتھ مخصوص نہ تھا کیونکہ اس حدیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ کی طرف بھیجا گیا تا کہ جو بھی تصویر دیکھے اس کو مٹا دے یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ابوالہیاج اسدی کو بھی اسی فریضہ کو انجام دینے کے لیے بھیجا تھا جیسا کہ ابتداء میں گذر چکا۔
اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو امر فرمایا کہ اس پردہ کو پھاڑ دے جس میں تصاویر تھیں ظاہر ہے کہ یہ کچھ مجسمے تو تھے نہیں اسی طرح بعض روایات میں آتا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے کعبہ کی دیواروں پر جو تصاویر بنی ہوئی تھیں ان کو پانی منگوا کر مٹا ڈالا۔ یہ سب روایات باعلی نداء پکار رہی ہیں کہ مجسمے وغیر مجسمے کی تفریق طبع زاد ہے۔

رہی مووویز وغیرہ مووویز کی تفریق تو یہ تصاویر پر اصل میں تو ساکن ہی ہیں اور غیر متحرک، حرکت تو ہم خود انہیں دیتے ہیں لہٰذا یہ تفریق غیر معقولی ہے۔ پھر یہ تفریق نبی کریم ﷺ کی جانب سے تو نہیں ہے اور دوسرے کسی کو یہ حق قطعاً نہیں ہے کہ وہ کتاب وسنت کے عمومات کو کتاب وسنت سے حجت لائے بغیر ان کو مخصوص کر دے یا ان سے کچھ افراد اپنی رائے سے مستثنیٰ کر دے۔

بہرصورت، اسٹیشنری غیر اسٹیشنری کی تفریق ہمارے مہربانوں کی طبع زاد ایجاد ہے جس پر انہوں نے کوئی دلیل نہیں پیش فرمائی لہٰذا اس کا علمی دنیا میں کوئی وزن نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے بتایا کہ بعض لوگ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور دوسرے کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ان کی انگشتریوں پر شیر یا کسی اور جانور کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اگر یہ جائز نہ ہوتیں تو یہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کس طرح ایسی انگشتریاں پہنتے جن پر تصاویر بنی ہوئی ہوں؟

جواب یہ ہے کہ اولاً تو ان باتوں کا حوالہ مطلوب ہے لہٰذا کسی معتمد علیہ کتاب سے ان روایات کو بمع ان کی اسانید کے پیش فرمایا جائے تا کہ ہم ان کی سندی حیثیت معلوم کر سکیں محض یہ کہہ دینے سے کہ فلاں فلاں صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ منقول ہے کوئی چیز قابل توجہ نہیں ہو سکتی اور ان کی اسانید صحیحہ پیش کرنا بھی کارے وارد ہے۔

ثانیاً: اصولاً یہ بالکل غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول اکرم ﷺ کے فرمان واجب الاذعان کے مقابلہ میں کسی دوسرے کا قول یا فعل پیش کیا جائے گو وہ جلیل القدر صحابی ہی کیوں نہ ہو کیونکہ بعض باتیں جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم

سے بھی کبھی کبھی مخفی رہتی تھیں کیونکہ انہوں نے یہ بات اتفاقاً جناب رسالت مآب ﷺ سے نہ سنی ہوں۔

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جن کا افضل الصحابہ ہونا اہل سنت کے ہاں مسلم ہے لیکن ان کے دور خلافت میں ایک عورت آتی ہے اور انہیں عرض کرتی ہے کہ میرا پوتا مر گیا ہے میں اس کی دادی ہوں مجھے اس کے ترکہ سے کیا حصہ ملے گا؟ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ کتاب اللہ میں تیرا حصہ نظر نہیں آتا اور نہ ہی سنت الرسول میں تیرا کچھ حصہ مجھے معلوم ہے، ہاں ٹھہرو میں دوسرے لوگوں سے پوچھوں اگر ان کے پاس اس کے متعلق علم ہوا تو اس پر عمل کروں گا پھر دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا دو صحابیوں رضی اللہ عنہما کی شہادت پیش ہوئی کہ نبی کریم ﷺ نے دادی کو سدس (چھٹا حصہ) دلایا تھا پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کے مطابق فیصلہ کر دیا اسی طرح چند واقعات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھی ہیں جب ان جیسی ہستیوں سے نبی کریم ﷺ کے چند فرامین وارشادات مخفی رہ سکتے ہیں تو جو ان سے مرتبہ وفضیلت میں کم ہیں ان سے کیوں چند ارشادات نبویہ ﷺ مخفی نہیں رہ سکتے؟ لہٰذا اگر انہوں سے (بالفرض) مسئلہ کے متعلق عدم علم کی بنا پر ایسی انگشتریاں پہن رکھی ہوں جن پر تصاویر تھیں تو اس سے یہ کب لازم آیا کہ یہ کام جائز ہے؟ آخر ان دونوں میں کیا تلازم ہے؟ ہاں صحابی اپنے قول یا فعل پر کتاب وسنت سے صریح دلیل لائے یا کتاب وسنت سے ایسی تصریحات پیش فرمائے جن سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مخالفت یا امر پہلے تھا لیکن بعد میں یہ بات منسوخ ہوگئی تو اور بات ہے لیکن ایسی صریح دلیل کتاب وسنت سے آج تک مجوزین حضرات نے پیش نہیں فرمائی۔

ثالثاً: ہوسکتا ہے کہ ان کی انگشتریوں پر یہ تصاویر اتنی چھوٹی ہوں کہ ان گرامی قدر صحابہ کو اچھی طرح نظر نہ آسکی ہوں اور انگشتریوں کی ظاہری شکل بہت اچھی ہو اور انہوں نے خرید کر پہن لی ہوں۔

اب جب تک یہ بات ان روایات سے نقل نہیں کی جاتی کہ ان انگشتریوں پر جو تصاویر بنی ہوئی تھیں وہ دیکھ کر دوسرے لوگوں نے ان کو متنبہ بھی کیا لیکن وہ پھر بھی پہنے رہے۔ جب اس قسم کی تصریح ان روایات سے نہیں لائی جاتی تب تک اس سے استدلال ناقص ہے۔ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال.

ہمارے مہربان اگر برا نہ مانیں تو عرض کروں یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ کے ارشاد عالی کا وزن واہمیت، قدر ومنزلت کما حقہ ہمارے دلوں میں نہیں رہی ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہمارے سامنے ہوتا کہ

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا٥﴾ (الاحزاب: ٣٦)

تو اس قسم کی باتیں ہم کبھی نہ کرتے اور بارگاہ رسالت کے فرمان واجب الاذعان سے روگردانی یا اس کی تعمیل سے پہلوتہی کرنے یا اس سے راہ فرار تلاش کرنے کی کوشش کبھی نہ کرتے۔ اللھم اھدنا الی سواء السبیل

اس سلسلہ میں ایک حدیث حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی جو صحیح بخاری میں ہے بھی پیش کی جاتی ہے۔

((عن زيد بن خالد عن ابى طلحة صاحب رسول الله ﷺ قال ان رسول الله ﷺ قال ان الملائكة لا تدخل بيتا فيه صورة قال بسر (هو ابن سعيد الراوى عن زيد بن خالد) ثم اشتكى زيد فعدنا فاذا على بابه ستر فيه صورة فقلت لعبيد الله الخولانى ربيب ميمونة زوج النبى ﷺ الم يخبرنا زيد عن الصور يوم الاول فقال عبيدالله الم تسمعه حين قال الا رقما فى ثوب)) [1]

اس کے بارہ میں یہ گذارش ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں لفظ ''صورۃ'' تھا جو ذی روح وغیر ذی روح دونوں پر اطلاق کیا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ بالا صفحات ۵ حدیث نمبر ۱۳ میں حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے راوی بسر بن سعید نے اس لفظ کو غالباً عام ہی سمجھا اور یہی خیال کیا کہ ذی روح ہو یا غیر ذی روح بہرحال وہ ممنوع ہے اس لیے انہوں نے جب حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کے گھر میں پردہ دیکھا جس پر نقش و نگار تھے اور غیر ذی روح اشیاء کی تصاویر دیکھیں تو اس عموم کو نظر میں رکھ کر یہ اعتراض کیا لیکن دوسرے ساتھی نے اسے بتادیا کہاں صور سے وہ صور مستثنیٰ ہیں جو اس قسم کے نقش و نگار ہوں، اور غیر ذی روح اشیاء کی صورتیں ہوں اس لیے انہوں نے لفظ ''الا رقما فى ثوب'' کہا اور نہ وہ یہ فرماتے ''الا صورة فى ثوب''.

اور رقم کی معانی جو لغت کی کتابوں میں لکھی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد نقش و نگار اور مزین ورنگ برنگ خطوط وغیرہا ہیں۔

حاصل جواب یہ ہوا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے پردہ میں جاندار اشیاء کی تصاویر نہ تھیں بلکہ غیر جاندار اشیاء کی تصاویر اور نقش و نگار تھے اور یہ ممنوع نہیں ہیں جیسا کہ ان احادیث سے واضح ہوتا ہے جس میں یہ وارد ہے کہ قیامت کے دن ان مصورین کو حکم دیا جائے گا کہ ان میں روح پھونکو حالانکہ وہ روح پھونک نہیں سکیں گے اس سے معلوم ہوا کہ جن تصاویر کے بنانے پر انہیں عذاب ہوگا وہ جاندار اشیاء کی تصاویر تھیں اور پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بھی یہ وضاحت ہے کہ غیر جاندار اشیاء کی تصاویر بنانے کی رخصت ہے (یہ حدیث بھی اوپر ذکر کی جا چکی ہے) اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی حضرت جبریل علیہ السلام کا ارشاد مذکور ہے کہ تصاویر کے سر کاٹ دو تا کہ وہ شجرۃ کے مانند ہو جائیں۔ (وقد مر هذا الحديث ايضا) ان احادیث سے معلوم ہوا کہ غیر ذی روح اشیاء کی تصاویر بنانے کی اجازت ہے لہٰذا حضرت زید رضی اللہ عنہ والی حدیث سے یہ استدلال صحیح نہیں کہ جب کپڑے میں تصاویر ہونے سے روکا نہیں گیا تو اوراق یا فلمز پر ان کی مخالفت کیوں ہو؟

[1] صحيح البخارى كتاب اللباس باب من كره القعود على الصور.

اور یہ بھی ہوسکتا ہے اگر ہم نیچے اتر کر تسلیم کر لیں کہ رقم سے مراد ذی روح کی تصاویر ہیں۔ کہ یہ اذن ابتداء میں ہو کیونکہ یہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ قدیم الاسلام ہیں ہوسکتا ہے کہ اس بارہ میں اس وقت تک شدت نہ آئی ہو لیکن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بعد میں غالباً چھٹے سنہ میں اسلام لائے اور وہ اس صحیح روایت کے راوی ہیں جس میں ایسی جاندار اشیاء کی تصاویر کے متعلق سر کے کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا بعد والا حکم ہی محکم ہوتا ہے پہلا منسوخ ہوا۔

خلاصہ کلام کہ ایسی محتمل روایت سے تصویر کشی کی حلت پر استدلال کرنا اور ان سب احادیث کثیرہ کو نظر انداز کرنا جو اپنے مفہوم میں بالکل واضحہ ہیں اور ان سے یہ کام ناجائز اور حرام معلوم ہوتا ہے علماء کی شان سے بمراحل بعید ہے۔ واللہ اعلم

اس سلسلہ میں بعض حلقوں کی طرف قرآن کریم کی ایک آیت کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔

﴿يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ﴾

(السباء: ۱۳)

کہا جاتا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے یہ تصاویر پر (تماثیل) بنائی جاتی تھیں اور اس فعل پر قرآن کریم نے کوئی نکیر بھی نہیں کیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں تو یہ چیز اس شریعت میں کیوں ممنوع ہونا چاہیے۔ یہ حضرات اگر منکرین سنت ہیں۔ تو ان کے لیے تو آگے گذارش آرہی ہے اگر وہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہیں تو ان کو اس آیت کو پیش کرتے ہوئے یہ خیال کیوں نہ آیا کہ بہت سی باتیں پہلی شریعتوں میں جائز تھیں لیکن وہ اس شریعت محمدیہ میں حرام ہو چکی ہیں لہٰذا منسوخ شدہ باتوں سے استدلال کے کیا معنی؟ دراصل ان حضرات کو تماثیل کے لفظ سے اشتباہ ہوا ہے یہ لفظ تمثال کی جمع ہے اور ان حضرات نے عجلت میں اس لفظ کو جاندار اشیاء کی تصاویر پر محمول کر لیا حالانکہ تمثال عربی زبان میں اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قدرتی شئے کے مشابہ بنائی جائے (قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا حیوان) کوئی درخت ہو یا پھول یا دریا یا کوئی دوسری بے جان چیز۔

((التمثال اسم للشيء المصنوع مشبها بخلق من خلق الله))

لسان العرب اور علامہ زمخشری اپنی مشہور تفسیر کشاف میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

((التمثال كل ماصور على صورة غيره من حيوان وغير حيوان))

ان ائمہ لغت کی تصریحات سے معلوم ہوا کہ تمثال ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی قدرتی چیز کے مشابہ بنائی جائے۔ عام ازیں کہ وہ جاندار ہو یا غیر جاندار جب تمثال جاندار کے لیے مخصوص نہیں تو آخر کونسی ضرورت لاحق ہوئی ہے کہ اس آیت کریمہ میں جو لفظ "تماثیل" وارد ہوا ہے اس کو خواہ مخواہ جاندار اشیاء کی تصاویر پر محمول کیا جائے بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ پھول پتیاں اور قدرتی مناظر اور مختلف قسم کے نقش و نگار ہوں جن سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے

اپنی عمارتوں کو آراستہ کرایا ہو۔ خصوصاً اس صورت میں کہ ''توراۃ'' میں بار بار بصراحت یہ حکم ملتا ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسمے قطعاً حرام ہیں۔

ملاحظہ ہو:

۱۔ ''تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔'' (خروج، باب:۲۰، آیت:۴،۷)

۲۔ ''تم اپنے لیے بت نہ بنا اور نہ تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو۔'' (احبار۔باب:۲۶، آیت:۱)

۳۔ نہ ہو کہ تم بگڑ کر کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مورت اپنے لیے بنالو جس کی شبیہ کسی مرد یا عورت یا زمین کے کسی حیوان یا ہوا میں اڑنے والے کسی پرند یا زمین کی رینگنے والے جاندار یا مچھلی سے جو زمین کے نیچے پانی میں رہتی ہے، ملتی ہو۔'' (استثناء۔باب:۴، آیت:۱۶۔۱۸)

۴۔ ''لعنت اس آدمی پر جو کاریگری کی صنعت کی طرح کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی صورت بنا کر جو خداوند کے نزدیک مکروہ ہے اس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔'' (استثناء۔باب:۱۷، آیت:۱۵)

ان صاف اور صریح احکام کے بعد یہ بات کیسے مانی جاسکتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے انبیاء اور ملائکہ کی تصویریں یا ان کے مجسمے بنانے کا کام جنوں سے لیا ہوگا اور یہ بات آخر ان یہودیوں کے بیان پر اعتماد کر کے کیسے تسلیم کر لی جائے جو حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنی مشرک بیویوں کے عشق میں مبتلا ہو کر بت پرستی کرنے لگے تھے۔ (سلاطین، باب:۱۱)

حالانکہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں ان کے متعلق یہ بدگمانی آخر کیسے گوارا کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے توراۃ کے صریح احکام کے خلاف ورزی کرتے ہوئے انسانوں یا جاندار اشیاء کی تصاویر بنانے کا حکم دیا ہو اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء کرام علیہم السلام بھی آئے ہیں وہ سب توراۃ کے پیرو تھے اور ان میں سے کوئی نبی مکمل نئی شریعت نہ لایا تھا جو توراۃ کے پورے قانون کی ناسخ ہوتی، لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ الزام بالکل غلط ہے کہ انہوں نے جاندار اشیاء، انبیاء، و ملائکہ وغیرہم کے مجسمے یا ان کی تصاویر بنانے کا حکم دیا تھا۔ اگر بعض مفسرین نے یہ بات اپنی تفاسیر میں لکھی ہے تو یہ بات انہوں نے اسرائیلیات سے لی ہے جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام پر نہایت غلیظ اور شرمناک الزامات لگائے گئے ہیں۔

لہٰذا یہ باتیں قطعاً نامقبول ہیں۔ اگر پہلی امتوں میں جاندار اشیاء، انسان وغیرہ کی تصاویر جائز ہوتیں تو نبی کریم ﷺ ان اہل کتاب کو جو انبیاء کی تصاویر بنا کر آویزاں کر دیتے تھے ان کو ((اولئك شرار الخلق

عـنـد الله يو م القيامة)) کا خطاب کیوں دیتے (یہ حدیث ابتداء میں گذر چکی ہے) اب ظاہر ہے کہ جو چیز جائز تھی اس کا مرتکب عنداللہ شریر کیسے ہوسکتا ہے؟ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے قیامت کے دن۔ وہ معجزات لانے کا ذکر کیا ہے جو دنیا میں انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیے گئے تھے تو وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مٹی سے پرندہ بنا کر اس میں پھونک دینے سے اڑتے ہوئے پرندہ کے بن جانے کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے نفس مٹی سے پرندہ بنانے کے متعلق بھی فرمایا کہ یہ کام تو میرے اذن اور اجازت سے ہی کرتا تھا۔

﴿وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ﴾ الآية (المائدة: ١١٠)

اب مٹی سے بنائے ہوئے پرندہ کی ہیئت یا مجسمہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پھونکنے سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جان پڑ جائے اور وہ اڑ جائے یہ بات تو سمجھ میں آ جاتی ہے لیکن مٹی سے پرندہ کی ہیئت کی چیز بنانا اس میں اللہ تعالیٰ کے اذن کا کیا مطلب یہ تو ہر ایک بنا سکتا ہے اور آج تک لوگ بناتے رہتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اگلی امتوں میں خصوصاً بنی اسرائیل میں جاندار اشیاء کی تصاویر بنانے کی مخالفت تھی (جیسا کہ اوپر توراۃ کی تصریحات میں مذکور ہوا) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی متبع توراۃ تھے۔ لہٰذا جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی ہوئی کہ نبی علیہ السلام کو یہ معجزہ مرحمت فرمائے تو انہیں اجازت بھی دے دی کہ وہ پرندہ کی ہیئت کی چیز بنا کر اس میں پھونک دے اور وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ مالک ہے جس وقت چاہے جس چیز کے متعلق چاہے اجازت دے سکتا ہے اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾ (الانبياء: ٢٣)

بہر حال یہ اجازت وقتی تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی تا کہ وہ یہ معجزہ دکھا سکیں۔ ورنہ اگر یہ کام جائز ہوتا تو پرندہ کی ہیئت بنانے کے ساتھ ''باذنی'' کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور قرآن کریم میں ایک لفظ بھی فضول یا غیر ضروری نہیں یہ ہمارا ایمان ہے۔ اب معلوم ہوا جن حضرات نے قرآن کریم میں وارد لفظ ''تماثیل'' سے تصاویر بنانے کی حلت پر استدلال کیا تھا وہ عدم یا قلت تدبر یا عجلت پر مبنی تھا۔

اوپر مذکورہ احادیث میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے پردہ چاک کر دیا اور اس سے تکیے بنا دیئے اس سے بھی یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ اگر کسی نہ کسی صورت میں یہ کام جائز نہ ہوتا تو تکیے کے لیے بھی اس کو کیوں روا رکھا گیا سو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ ایک حکم تو ہے تصاویر بنانے کے متعلق وہ ان احادیث مبارکہ نے واضح کر دیا کہ قطعی حرام ہے باقی رہی یہ بات کہ اگر کسی نے کوئی ایسی چیز مسئلہ کا علم نہ ہونے کی وجہ سے خرید لی ہے جس میں تصاویر ہوں، تو اس کے متعلق کیا حکم ہے تو ان روایات نے یہ بھی واضح

کر دیا کہ ایسی چیز کو بالکلیہ ضائع یا برباد کر دینے سے بہتر یہی ہے کہ اس سے ایسی چیزیں بنالی جائیں یا ان کو اس طرح کام میں لایا جائے کہ وہ حقیر و پامال ہو جائے علاوہ ازیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں جبریل علیہ السلام کا امر مذکور ہے کہ ان تصاویر کے سروں کو کاٹ دیا جائے، لہٰذا غالب ظن یہی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا پردہ کو پھاڑ دینے کے بعد ان تصاویر کے سر بھی پھٹ گئے ہوں گے لہٰذا وہ اب تصاویر ہی نہ رہیں، اس طرح اضاعۃ المال بھی نہ ہوا اور شرعی حکم کی تعمیل بھی ہو گئی۔

بعض لوگ فوٹو اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ شریعت بجائے خود تصویر کو حرام کرتی ہے نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقے کو۔ فوٹو اور دستی تصویر میں تصویر ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے، ان کے درمیان جو کچھ بھی فرق ہے وہ طریق تصویر سازی کے لحاظ سے ہے اور اس لحاظ سے شریعت نے احکام میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام میں تصویر کی حرمت کا حکم محض شرک و بت پرستی کو روکنے کی خاطر دیا گیا تھا، اور اب اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے، لہٰذا یہ حکم باقی نہ رہنا چاہیے۔ لیکن یہ استدلال بالکل غلط ہے، اول تو احادیث میں کہیں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ تصاویر صرف شرک و بت پرستی کے خطرے سے بچانے کے لیے حرام کی گئی ہیں، دوسرے یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ اب دنیا میں شرک و بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ آج خود برصغیر ہندو پاکستان میں کروڑوں بت پرست مشرکین موجود ہیں، دنیا کے مختلف خطوں میں طرح طرح سے شرک ہو رہا ہے۔ عیسائی اہل کتاب بھی حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہما السلام اور اپنے متعدد اولیاء کی تصاویر اور مجسموں کو پوج رہے ہیں، حتیٰ کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی مخلوق پرستی کی آفتوں سے محفوظ نہیں ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے بعض مسلمانوں کو دیکھا ہے کہ جب کسی بڑے پیر صاحب کا فوٹو آویزاں دیکھتے ہیں تو ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر اس کو سلام کرتے ہیں کیا یہ فعل شرک و مخلوق پرستی کی طرف نہیں لے جاتا؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہئیں جن کو معبود بنالیا گیا ہو باقی دوسری تصویروں اور مجسموں کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے دراصل شارع کے احکام و ارشادات سے قانون اخذ کرنے کے بجائے آپ ہی اپنے شارع بن بیٹھتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تصویر بہت سے فتنوں کی موجب بھی بنی ہے اور بن رہی ہے۔ تصویر ان بڑے ذرائع میں سے ایک ہے جن سے بادشاہوں ڈکٹروں اور سیاسی لیڈروں کی عظمت کا سکہ عوام الناس کے دماغوں پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تصویر کو دنیا میں شہوانیت پھیلانے کے لیے بھی بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے اور آج یہ فتنہ ہر زمانے سے زیادہ برسر عروج ہے، تصاویر قوموں میں نفرت اور عداوت کے بیج بونے، فساد ڈلوانے اور عام لوگوں کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کے لیے بھی بکثرت

استعمال کی جاتی رہی ہیں اور آج سب سے زیادہ استعمال کی جارہی ہیں اس لیے یہ سمجھنا کہ شارع نے تصویر کی حرمت کا حکم صرف بت پرستی کے استیصال کی خاطر کیا ہے اصلاً غلط ہے شارع نے مطلق جاندار اشیاء کی تصویر کو روکا ہے ہم اگر خود شارع نہیں بلکہ شارع کے متبع ہیں تو ہمیں علی الاطلاق اس سے رک جانا چاہیے ہمارے لیے کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی علت حکم خود تجویز کر کے اس کے لحاظ سے بعض تصویروں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دینے لگیں۔ بعض لوگ چند بظاہر بالکل بے ضرر قسم کی تصاویر کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ آخر ان میں کیا خطرہ ہے یہ تو شرک اور شہوانیت اور فساد انگیزی اور سیاسی پروپیگنڈے اور ایسے ہی دوسرے مفسدات سے قطعی پاک ہیں پھر ان کے ممنوع ہونے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے اس معاملہ میں لوگ پھر وہی غلطی کرتے ہیں کہ پہلے علت حکم خود تجویز کر لیتے ہیں اور اس کے بعد یہ سوال کرتے ہیں کہ جب فلاں چیز میں یہ علت نہیں پائی جاتی تو وہ کیوں ناجائز ہے۔ علاوہ بدین یہ لوگ اسلامی شریعت کے اس قاعدے کو بھی نہیں سمجھتے کہ وہ حلال اور حرام کیدرمیان ایسی دھندلی اور مبہم حد بندیاں قائم نہیں کرتی جس سے آدمی یہ فیصلہ نہ کرسکتا ہو کہ وہ کہاں تک جواز کی حد میں ہے اور کہاں اس حد کو پار کر گیا ہے بلکہ ایسا واضح خط امتیاز کھینچتی ہے جس سے ہر شخص روز روشن کی طرح دیکھ سکتا ہو۔ تصاویر کے درمیان یہ حد بندی قطعی واضح ہے کہ جانداروں کی تصویریں حرام اور بے جان اشیاء کی تصویریں حلال ہیں اس خط امتیاز میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے جسے احکام کی پیروی کرنی ہو وہ صاف صاف جان سکتا ہے کہ اس کے لیے کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز لیکن اگر جانداروں کی تصاویر میں سے بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھہرایا جاتا تو دونوں قسم کی تصاویر کی کوئی بڑی سے بڑی فہرست بیان کردینے کے بعد بھی جواز وعدم جواز کی سرحد کبھی واضح نہ ہو سکتی اور بے شمار تصویروں کے بارے میں یہ اشتباہ باقی رہ جاتا ہے کہ انہیں حد جواز کے اندر سمجھا جائے یا باہر یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے شراب کے بارے میں اسلام کا یہ حکم کہ اس سے قطعی اجتناب کیا جائے ایک صاف حد قائم کر دیتا ہے لیکن اگر یہ کہا جاتا کہ اس کی اتنی مقدار استعمال کرنے سے پرہیز کیا جائے جس سے نشہ پیدا ہو تو حلال اور حرام کے درمیان کسی جگہ بھی حد فاصل قائم نہ کی جاسکتی اور کوئی شخص بھی فیصلہ نہ کرسکتا کہ کس حد تک وہ شراب پی سکتا ہے اور کہاں جا کر اسے رک جانا چاہیے۔

خلاصہ کلام کتاب اللہ کے ارشادات اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات عالیہ جو متواتر المعنی ہیں ان سے ایک منصف مزاج اور سچے مسلمان کے سامنے یہ حقیقت روز روشن کی طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ شریعت اسلامی میں جاندار اشیاء، خواہ انسان ہوں یا کوئی اور چیز۔ بہر حال اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اب اگر ہمارا مقصد اس اسلام کی طرف دعوت دینا ہے جو کتاب وسنت میں محفوظ ہے تو ہمیں لامحالہ اس کے حصول کے ذرائع اور اس میں کامیابی کے لیے طریقہ کار بھی وہی اختیار کرنا پڑے گا، جس کی طرف ان دوسر چشموں میں ہماری رہنمائی فرمائی گئی

ہے۔ کیونکہ جو کام بھی کرنا ہے اس کے متعلق تین باتوں کا خیال اشد ضروری ہے۔

أ: وہ کام نیک ہو کیونکہ اگر وہ کام ہی نیک نہیں تو اس کے لیے قدم اٹھانا بھی جائز نہیں۔

ب: پھر اس میں نیت بھی خالص ہو یعنی صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا جوئی مطلوب ہو۔ کوئی دنیاوی غرض نہ ہو، نہ ریا وسمعۃ، نام ونمود اور شہرت مقصود نہ ہو ورنہ اگر کوئی کام کتنا ہی نیک ہو لیکن نیت میں اخلاص نہ ہو تو بیکار ہے۔

ج: اس کام کے حصول کا طریقہ کار بھی صحیح ہو اور صحیح سمت میں ہو ورنہ اگر کوئی آدمی حج جیسے عمل صالح کا ارادہ کرتا ہے اور اس کی نیت میں بھی اخلاص ہے یعنی وہ یہ اہم وافضل عمل محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرنا چاہتا ہے لیکن اس نے جو راہ اختیار کی ہے وہ کعبہ کی طرف نہیں بلکہ کہیں اور سمت میں جا رہی ہے تو اس آدمی کی نیت کا اخلاص بھی اس کو کبھی کعبہ تک نہیں پہنچائے گا۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو مے روی بتر کستانست

اسلام کی طرف دعوت وشرعیہ احکام کی تبلیغ کے کام کے نیک ہونے میں کوئی شبہ نہیں بلکہ یہ تو امت مرحومہ پر فرض ہے، رہی نیت تو ہمیں کوئی وجہ نہیں کہ ہم آں جناب یا اس کام میں شریک حضرات صاحبان کی نیتوں کے متعلق سوء ظنی سے کام لیں ہمارا حسن ظن یہی ہے کہ اس کار خیر میں آپ کی نیت میں اخلاص ہے اور یہ کام آپ خالصۃ لوجہ اللہ کر رہے ہیں۔

اب تیسری بات رہ جاتی ہے یعنی دعوت وابلاغ تفہیم وارشاد کے ذرائع ووسائل کیا ہوں اور اس گوہر مقصود کو حاصل کرنے کے لیے کونسا طریقہ کا اختیار کرنا چاہیے؟ میری ساری طول کلامی وسمع خراشی اسی تیسری بات کے گرد گھومتی ہے اگر صحیح اسلام کی تبلیغ کرنی مطلوب ہے اور کتاب وسنت والے اسلام کی طرف دعوت دینا مقصود ہے تو ہمیں اس کے ذرائع ووسائل بھی وہی اختیار کرنے پڑیں گے جن کی طرف ان دونوں سرچشموں نے رہنمائی کی ہے اور طریقہ کار بھی وہی اپنانا پڑے گا جو انہی سے معلوم ہوتا ہے اور جس کے کامیاب طریقہ کار ہونے پر اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ شاہد عدل ہے اور وہ سورۃ نحل کے آخری رکوع میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے۔

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ....﴾ الآية (النحل: ١٢٥)

اور ان سب ذرائع ووسائل سے قطعی وکلی اجتناب کرنا پڑے گا جو از رو کتاب وسنت ناجائز وحرام ہیں اس لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے وہ اس کام مقدس میں تصاویر، فلمز وغیرہا کی سب باتوں کو ترک کرنا پڑے گا۔ اسلام ہم سے چاہتا ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی اور اس کے جملہ شعبہائے میں اللہ کے ارشاد وامر ونواہی کو سامنے رکھیں اسلام

اس بات کی بالکل اجازت نہیں دیتا کہ کچھ تو کتاب وسنت کے احکام پر عمل کرو اور کچھ دوسری ثقافتوں یا تہذیبوں سے لے کر ان پر عمل پیرا ہو۔ ارشاد باری ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً....﴾ الآية (البقرة: ۲۰۸)

آدھا تیتر آدھا بٹیر یہ اسلام نہیں۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میٹنگ میں یہ جو باتیں میرے کان میں کہیں پڑیں اس میں غالباً یہی حکمت ربانیہ تھی کیونکہ اگر اس وقت میں حاضرین صاحبان کی پوری باتیں سن لیتا تو ان کے جواب میں یہ سب پوری کی پوری باتیں بیان کرنی اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور تھیں اور پھر اس بحث وجدال سے اس دوستانہ ماحول کا مکدر ہو جانا بھی لازمی تھا بہرحال جو کچھ ہوا وہ بہتر ہی ہوا۔

آخر میں۔ راقم الحروف اپنے متعلق بھی ایک گذارش کرتا ہے وہ یہ کہ میری اس طول کلامی وسمع خراشی کا برانہ منایا جائے بلکہ اس کو اس جذبہ کو سامنے رکھ کر ملاحظہ فرمایا جائے جو اس تحریر کے لکھنے کا باعث ہوا میرا اس تحریر سے مقصد ایک تو یہ تھا کہ بطور شریک مجلس مجھ پر جو فرض عائد ہوتا ہے اس کو انجام دوں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کروں اور یہ کہ اس طرح اپنی پوزیشن بھی صاف کروں تا کہ مجھے تصاویر کے مجوزین حضرات کی فہرست میں شامل نہ کیا جائے امید ہے کہ آں جناب اسی جذبہ کو سامنے رکھ کر میری اس خامہ فرسائی کو ملاحظہ فرمائیں گے۔

دوسری بات یہ کہ جب میں ہفتہ کے دن واپس آ رہا تھا تو ایئرپورٹ کی طرف آتے ہوئے راستہ میں میں نے محترم محمد الیاس صاحب سے سنا کہ وہ میرے بچے محمد راشد شاہ کو کہہ رہے تھے کہ ''آئندہ اس سے بھی بڑے پیمانے پر کانفرنس کرنے کا خیال ہے اور پیر صاحب کو ہم اس میں دعوت دیں گے اور میں تحریر قلمبند ہی کر رہا تھا تو آں جناب کا ایک عربی مکتوب بھی موصول ہوا جس میں جناب والا نے مجھ سے اس کار خیر میں تعاون کرنے اور اس سلسلہ میں جدوجہد کرنے کا ارشاد فرمایا ہے۔

یہ ارشاد میرے سر آنکھوں پر اور میں اس سلسلہ میں حتی المقدور اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں اور اسی وجہ سے میں نے میٹنگ میں بھی آں جناب سے ایک سوال کیا تھا پتہ نہیں آں جناب کا اس کی طرف خیال گیا یا نہیں۔ خیر میں ایسے کار خیر میں اگر خادم بن سکتا ہوں تو یہ میرے لیے انتہائی خوش قسمتی ہوگی لیکن......

ایک بات میں پہلے ہی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کانفرنسوں میں میٹنگ میں زیر بحث مسئلہ یا کوئی ایسا مسئلہ جو کتاب وسنت کے ارشادات واوامر ونواہی کے قطعاً مخالف اور احکامات شرعیہ متصادم نہ ہو ایسے کسی مسئلہ کو نہ تو ایجنڈا پر رکھا جائے اور نہ اس پر اس دوستانہ پرسکون ماحول میں خیال آرائی یا بحث وتمحیص کے لیے پیش کیا جائے جب اسلام کی طرف دعوت مقصود ہے تو اس کے احکام کی خلاف ورزی کیوں کی جائے۔

اگر یہ بات آں جناب کی طرف سے شرف قبولیت حاصل کر لے گی تو آں جناب جب بھی مجھے بلائیں گے۔

ان شاء اللہ حاضر خدمت ہو جاؤں گا جو خدمت اس سلسلہ میں مطلوب ہوگی وہ بسر وچشم بجالاؤں گا۔ اگر خدانخواستہ میری یہ گذارش شرف قبولیت حاصل کرنے سے قاصر رہی تو مجھے معذور تصور فرما کر مجھے ایسی میٹنگوں میں شرکت کی دعوت کے لیے زحمت بھی نہ اٹھائی جائے۔

وما علينا الا البلاغ

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين وصلى الله على سيدنا محمد وآله واصحابه اجمعين وبارك وسلم تسليما كثيرا.

آپ کا مخلص

احقر العباد محب اللہ شاہ عفی اللہ عنہ

۲/۵/۱۴۰۵ ہجری

۳۱/۱۰/۱۹۸۴ء

❁❁❁❁

باب دوم

مسائل 7

اہل حدیث کی امتیازی خوبیاں

''۱۹۶۷ء میں آل پاکستان اہل حدیث کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی اس وقت کے امیر محترم جناب محمد اسماعیل سلفی صاحب آف گوجرانوالہ اور التعلیقات السّلفیہ کے مصنف مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ صاحب نے کانفرنس کی صدارت پیر محبّ اللہ شاہ صاحب کے سپرد کی، اس کانفرنس میں شاہ صاحب نے جو خطبہ صدارت پیش کیا جو کہ ''اہل حدیث کی امتیازی خوبیاں'' کے نام سے پیش خدمت ہے۔'' (الازہری)
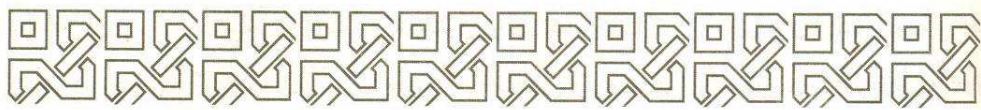
الحمد لله رب العالمين o الرحمن الرحيم o مالك يوم الدين o والصلوة والسلام على سيدنا وسيد المرسلين محمد ن النبى الامى الذى ارسل الى الناس كافة وارسل رحمة للعالمين وعلى اله واصحابه اجمعين .
امابعد فاعوذ بالله السميع العليم من الشيطن الرجيم من همزه ونفخه ونفسه بسم الله الرحمن الرحيم ، ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًاo﴾ (النساء: ٥٩)

معزز حضرات!

قبل اس کے کہ میں اس تادیلات کردہ آیت کریمہ کے متعلق کچھ گذارش کروں یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ بندہ حقیر پر تقصیر کو اس عظیم الشان اجماع کو خطاب کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے، سچ ماہیے کہ میں اس جلیل الشان کانفرنس (جس کی مسند صدارت کو مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ جیسی چوٹی کی ممتاز ہستیاں زینت بخش چکی ہوں اور جس کی کرسی صدارت کو شرف عطا کرنے کے لیے اس وقت بھی بحمد اللہ تعالیٰ بہت سی شخصیتیں موجود ہوں) کی صدارت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور یہ کسر نفسی نہیں ہے بلکہ امر واقع ہے کیونکہ من آنم کہ من دانم۔ میں تو جماعت اہل حدیث کا خادم ہوں اور ویسے بھی اگر مجھے دعوت مل جاتی تو ان شاء اللہ العزیز ضرور حاضر ہو جاتا۔ لیکن میرے کرم فرما محترم مولانا محمد اسماعیل امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان اور ان کے معزز رفقائے کار نے اس بھاری بوجھ کو اٹھانے کے لیے اس بندہ بے بضاعت کے ناتواں کندھوں کو تجویز فرمایا یقیناً یہ میری انتہائی عزت افزائی ہے جس کے لیے میں ان محترمین کا خصوصاً اور پوری جماعت اہل حدیث کا عموماً مرہون منت ہوں۔ فجزاهم الله احسن الجزاء

اور ساتھ ہی میں عرض پرداز بھی ہوں کہ میری ٹوٹی پھوٹی زبان کو نظر انداز فرمائیے۔ مجھے آپ کے اخلاق کریمانہ سے امید واثق ہے کہ میری علمی و عملی کوتاہیوں کو درگذر کیا جائے گا اور ساتھ ہی یہ گذارش بھی ہے کہ میرے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کی جناب میں دعا فرمائیں کہ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی مجھے توفیق عطا فرمائے اور اتنی طاقت دے کہ میں ہمیشہ کے لیے جماعت اہل حدیث کی خدمات بوجہ احسن انجام دے سکوں، اس کے بعد جو آیت کریمہ آپ کی خدمت میں تلاوت کی گئی اس کے متعلق عرض کرتا ہوں، اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول (علیہ الصلوٰۃ

والسلام) کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے (مسلمانوں سے) صاحب امر ہوں (حاکم وامیر وغیرہ) اس کی بھی اطاعت کرو، لیکن حکام وامراء کی اطاعت مشروط ہے، یعنی جب تک ان کا حکم یا امر، اللہ اور اس کے رسول ﷺ (یعنی بالفاظ دیگر کتاب وسنت) کے ماتحت ہو اور اگر ان کا امر اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات گرامیہ کے مخالف ہو جس کی وجہ سے تم میں تنازع ہو جائے تو پھر ان کی اطاعت ختم ہے اب اس سارے معاملہ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ (کتاب وسنت) کی طرف لوٹایا جائے اگر مسلمانو! تم کو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان ہے تو اس ارشاد کی تعمیل میں کوتاہی نہ کرو یہ بات تمہارے لیے اچھی ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔''

بس یہی جماعت اہل حدیث کا نصب العین ہے اور یہی مقصد حیات اور یہی بنیادی چیز ہے جو جماعت اہل حدیث کو دنیا کی سب دوسری جماعتوں اور فرقوں سے ممتاز بناتی ہے، یعنی ان کا اصل الاصول یہی ہے کہ:

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفےٰ برجان مسلم داشتن

جماعت اہل حدیث کی ہر نقل وحرکت، ان کا ہر قول وفعل اور ان کے عبادات اور معاملات بس ایک ہی محور کے گرد گھوم رہے ہیں، یعنی ہر بات وہر معاملہ ہیں ان کی نظر کتاب وسنت پر رہتی ہے اور ان دوسر چشموں کے مخالف جو بات بھی ہو جائے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی ہستی سے مل رہی ہو اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے امراء کی اطاعت بھی فرض جانتے ہیں۔ لیکن جب تک وہ کتاب وسنت کی مخالف نہ ہو ایک اہل حدیث ہر معاملہ میں ہر مسئلہ میں اول کتاب وسنت پر نظر ڈالے اور ان سے جو معلوم ہو اس کو اپنا مسلک بنائے۔ پھر اگر کوئی دوسری ذی علم ہستی بھی اس کے موافق ہوئی تو بہتر ورنہ وہ یہی کوشش کرے گا کہ اس ہستی کے عمل کا صحیح محل تلاش کرے اور حسن ظن کی بنا پر اگر اس کی کوئی تاویل ہو سکتی ہے تو کرے گا اور اگر توجیہ نہ ہو سکتی ہو تو اس معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے گا لیکن اہل حدیث سے یہ امید رکھنی فضول ہے کہ وہ ان شخصیتوں کی وجہ سے کتاب وسنت میں تاویل وتحریف کا مرتکب ہو۔ بخلاف اس کے دوسرے جتنے فرقے ہیں وہ اپنی ہر بات اور ہر معاملہ میں اصل الاصول اس کی بات کو بناتے ہیں جس کو انہوں نے مدعی سست گواہ چست کے مطابق زبردستی اپنا غیر مشروط مقتدا بنا رکھا ہے حالانکہ ان ائمہ کرام اور فقہاء عظام نے اپنی تقلید سے خود منع فرما دیا ہے۔ یعنی ہوتا یہ ہے کہ پہلے پہلے بجائے کتاب وسنت کی طرف دیکھنے کے دیکھتے یہی ہیں کہ اس بات میں ان کے خود ساختہ غیر مشروط امام کی کیا رائے ہے۔ جب یہ معلوم کر لیتے ہیں تو اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ ان کی اس رائے کے موافق کتاب وسنت میں بھی مواد موجود ہے یا نہیں، اگر ہے تو فبہا ورنہ یا تو کتاب وسنت میں ہی تاویل القول بما یرجنی به قائله کے مرتکب ہوتے ہیں اور اگر تاویل کرتے نہیں بنتی تو یہ کہہ کر وہ آخر کچھ تو بات ہو گی جس کی وجہ سے ہمارے امام نے اس پر عمل نہیں کیا۔ ایک قلم کتاب وسنت کے منصوصات کو نظر انداز کر دیتے ہیں گویا اصل الاصول ان کے ہاں ان کے ائمہ کی بات ہے اور

کتاب وسنت کو ضرور ان کے ائمہ کی رائے کے مطابق ہونا چاہیے یا زبردستی ان دونوں کو ائمہ کی آراء کے تابع کر دینی چاہیے۔ حالانکہ یہ الٹی بات ہے۔

حضرات! صاف گوئی کی معافی چاہتے ہوئے میں عرض کروں گا کہ اس وقت امت مسلمہ جو کسی وقت فرد واحد کی طرح تھی اور وہ اس رشتہ اتحاد واتفاق میں منسلک تھی جس کو خداوند تعالیٰ نے ان الفاظ مبارک:

﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (ال عمران: ۱۰۳)

میں اپنی جلیل القدر نعمت قرار دیا تھا اور جس اتفاق کے متعلق اللہ تعالیٰ دوسری جگہ پر فرماتا ہے کہ

﴿وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ﴾ (انفال: ٦٣)

زمین میں جو خزانہ ہے وہ خرچ کردیتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت نہیں ڈال سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے (اپنی مہربانی سے) ان کے دلوں میں الفت ومحبت ڈال دی، امت مسلمہ آج کئی فرقوں میں منقسم ہوگئی ہے اور افتراق وانتشار کا وہ عالم کہ تعجب ہوتا ہے اور یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا یہ وہی امت مسلمہ ہے جس کے متعلق یہ ربانی ارشاد ہے کہ:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (ال عمران: ۱۱۰)

بہرکیف میں عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ اس افتراق وانتشار کی وجہ بھی یہی ہے کہ امت مسلمہ نے اپنے مرکز کتاب وسنت سے ہٹ کر اپنے دامن اوروں سے وابستہ کر لیے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ تنازعہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو، اس کو گو لفظاً تو تلاوت کرتے رہے ہیں لیکن عملاً اس کو بالکل ترک کر دیا گیا ہے بلکہ عملاً قصہ الٹا ہی چلتا ہے، یعنی تنازعہ کی صورت میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کتاب وسنت اس بات کا کیا فیصلہ دیتے ہیں بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس معاملے میں فلاں امام کی کیا رائے ہے۔ مقصد یہ کہ خدا تعالیٰ نے حق فرمایا کہ خدا اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو، لیکن ہمارے بھائیوں نے کہا کہ نہیں ہم تو اپنے فلاں امام کی طرف رجوع کریں گے۔ اب ہر فرقہ اپنے امام کی طرف رجوع کرنے لگا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ وہی جو نکلنا چاہیے تھا۔ وہی افتراق اور انتشار اگر ہر معاملہ میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کیا جاتا تو اس فرقہ بندی وکشیدگی کا نام ونشان تک نہ رہتا۔ کیونکہ سب کی ایک بات ہوتی اور سب کا کلمہ واحدہ ہوتا بہرصورت اہل حدیث جماعت کا یہی امتیازی خاصہ ہے کہ وہ اپنے سارے معاملات میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتی ہے اور جب حق معلوم ہوجاتا ہے تو اس پر مضبوط چٹان کی طرح غیر متزلزل ہوکر کھڑی ہوجاتی ہے اس کے بعد اگر ساری دنیا بھی ان کی مخالف ہوجائے تو ان کی ذرہ بھر پرواہ نہیں کرتی یا مختصراً الفاظ میں اس طرح سمجھیے کہ جماعت اہل حدیث اللہ تعالیٰ

اوراس کے رسول ﷺ کے مقابلے میں کسی دوسری ہستی کے عملاً حریف بنانے کی قطعاً متحمل وروادار نہیں ہوسکتی۔ اب یہی چیز ہے جس کی وجہ سے ہمارے بھائی ہم سے برہم اور خفا ہیں اور ہماری جماعت کومختلف طریقوں سے بدنام کیا جاتا ہےاور کئی قسم کے بے بنیاد اتہامات سے نوازا جاتا ہے۔کوئی وہابی کہتا ہےکوئی ان کواہل جدید (دنیا کا پیدا کیا ہوا فرقہ) کے لقب سے یاد کرتا ہےاور بعض غالی اور مسرف حضرات اس سے بھی برے القاب سے یاد کرتے ہیں۔(واللہ المستعان علی ما یصفون)

اگرنظر غائر ڈالی جائے تو اہل جدید تو وہی فرقے بنتے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کوکسی نہ کسی امام سے وابستہ کر رکھا ہے کیونکہ اہل حدیث جماعت جس چیز پربعون اللہ وحسن توفیقہ کاربند ہےوہ تو جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک سے ہی موجود ہے۔البتہ ان فرقوں کے وجود تک حتی کہ ان کے ائمہ کے زمانہ میں بھی موجود نہ تھا۔یہ دھڑے بندیاں بعد میں پیدا ہوئیں اور یہ بات بالکل ظاہر ہےخود ان کے مقلد بھی اس سے انکار کی گنجائش نہیں رکھتے۔اس لیے یہی فرقے اس کے مستحق ہیں کہ ان کواہل جدید کہا جائے۔رہا وہابی کا لفظ تو اس کے متعلق کچھ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والےعوام کے نزدیک وہابی وہ ہے جوصرف اللہ تعالیٰ کو مانتا ہو۔یعنی جو خالص توحید پر کاربند ہو وہ وہابی ہےلیکن اس سے آگے وہابی کے لفظ کے کیا معنی ہیں یا اس کی نسبت کس چیز کی طرف ہےاوراس سے جماعت اہل حدیث کا کیا تعلق ہے؟اس سے یہ عوام بالکل ناواقف ہیں۔ان کواس بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے اگر ان کی معلومات میں کچھ تھوڑا بہت اضافہ ہوا تو بس یہی کہیں گے کہ یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کے پیرو ہیں لیکن اس سے زیادہ سفید جھوٹ نہیں ہوسکتا کہ جماعت اہل حدیث کوشیخ کا مقلد قرار دیا جائے گو جس مقصد کے لیے شیخ رحمہ اللہ کھڑے ہوئے تھے، جماعت اہل حدیث کا بھی وہی مقصد ہے یعنی اصولی لحاظ سے دونوں کے مقاصد ایک ہیں چونکہ شیخ بھی اپنے ملک میں خالص توحید کو رائج کرنا چاہتے تھے، اس لیے جو بھی یہی مقصد لے کر کھڑا ہوتا ہے اس کو ان کی طرف نسبت کر دیتے ہیں کہ یہ محمد بن عبدالوہاب کا پیرو یا مقلد ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اس کا پس منظر کیا ہے کہ ''وہابی'' کی ''اصطلاح'' کو بدنام کرنے کے لیے اختیار کیا گیا اور کس نے اس کو برصغیر میں رواج دیا؟ تو اس کے لیے یہ گذارش ہے کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، یہ ساری سازش انگریزوں کی ہے۔وہ جب برصغیر میں اپنے پاؤں جمانے لگے تو ان کے سامنے دو قومیں تھیں، ہندو اور مسلمان...... ہندوؤں سے ان کو چنداں خطرہ نہیں تھا۔البتہ مسلمانوں سے وہ کافی ڈر رہے تھے اور مسلمانوں میں بھی جماعت موحدین یا اہل حدیث جماعت ان کی نظر میں خار تھی کیونکہ یہی ایک جماعت ہے جو ان کے ناپاک عزائم کا خاتمہ کرسکتی ہےاور حق کی کما حقہ مدافعت کرسکتی تھی۔انگریز یہی چاہتے تھے کہ ان کو کسی طرح بدنام کیا جائے۔اس سلسلے میں انہوں نے عام مسلمانوں میں انتشار پھیلانے کے لیے قادیانی جماعت کو کاشت کیا اورابھی تک ان کا لگایا ہوا پودا انگریزوں کا ایجنٹ بنا ہوا ہےاور اپنے آقاؤں کا حق نمک خوب ادا کر رہا ہے، ان کی

ایک بڑی کوشش یہ تھی کہ جماعت اہل حدیث کو بدنام کیا جائے، وہ جانتے تھے کہ متحدہ ہندوستان کے لوگوں میں بزرگوں کی طرف زیادہ اعتقاد پایا جاتا ہے، اگر کسی طرح جماعت اہل حدیث کو بزرگوں سے پھری ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کو نہ ماننے والی ثابت کر دیا جائے تو لامحالہ عوام ان سے بدظن ہو جائیں گے اور ان کا مقصد پورا ہو جائے گا...... اسی ناپاک مقصد کے لیے انہوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ یہ لفظ ''وہابی'' عوام میں پھیلانا شروع کر دیا۔ علاوہ ازیں اس وہابی لفظ کو پھیلانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگر اس ملک کی کسی شخصیت کو منتخب کیا جاتا تو وہ اتنا کامیاب نہ ہوتا کیونکہ اپنے ملک کی شخصیتوں کا تھوڑا بہت علم ملک کے باشندوں کو ہوتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے ایسی شخصیت کا انتخاب کیا، جو اس ملک ہی کی نہ تھی۔ خصوصاً عوام تو اس شخصیت کو اچھی طرح جانتے بھی نہیں ہیں اور نہ ان کے مقاصد وعزائم سے ہی واقف ہیں حالانکہ اس لفظ کو رواج دینے والے اچھی طرح جانتے ہیں اور ہمارے مسلم عوام سے بھی زیادہ جانتے ہیں کہ وہابی کیا ہے اور وہابیوں کے عزائم اور مقاصد کیا ہیں۔ ذیل میں چیمبرز ٹوئنٹیتھ سنچری ڈکشنری Chamber,s twentieth century dictionary سے وہابی کے معنیٰ کی نقل کی جاتی ہے۔ معزز حاضرین بغور ملاحظہ فرمائیں WAHABI: one of the see of..................!!

اس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہابی مسلمانوں کے ایک فرقہ کا نام ہے جس کی بنیاد عبدالوہاب نامی ایک آدمی نے وسطی عرب میں رکھی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو اپنی ابتدائی صورت میں بحال کر دیا جائے۔ دوسری ڈکشنریوں نے بھی قریب قریب یہی معنیٰ وہابی کے لکھے ہیں۔

معزز قارئین! آپ نے دیکھا کہ انگریزوں کے نزدیک وہابی کون ہے؟ وہی جو یہ چاہتا ہے کہ اسلام کو بدعات وغیرہ کی آلائشوں سے پاک اور صاف کر کے اسی شکل میں بحال کر دیا جائے جس میں وہ اپنے ابتدائی دور (یعنی خیر القرون والے زمانہ) میں جلوہ گر ہوا تھا۔ اب آپ ہی سوچئے کہ کیا یہ مقصد برا ہے؟ اور کیا ہر سچے مسلمان کا یہی نصب العین یا مقصد زندگی نہیں ہونا چاہیے؟ پھر یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ کسی جماعت یا فرد کو جو ایسا بلند مقصد پیش نظر رکھتا ہو اسی اعلیٰ مقصد ہی کی وجہ سے تختہ مشق بنایا جائے اور اس کے بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے گویا جو خالص اسلام...... خیر القرون والا اسلام اختیار کرنا چاہتا تھا اور جس کی قدر مسلم قوم کو بجا طور پر کرنی تھی۔ اسی کو ان چالاک انگریزوں نے جان بوجھ کر ان سے ہم مذہب مسلمانوں کے سامنے ان کی انہی چیزوں کو مسخ کر کے پیش کرنا شروع کر دیا۔ جن کو وہ خود بھی ان کی خوبی جانتے تھے۔ مگر افسوس! مسلمانوں میں سے جو اپنے دین وایمان کو فروخت کر کے ان انگریزوں کے ایجنٹ بن چکے تھے، انہوں نے سادہ لوح عوام کو گمراہ کرنا شروع کر دیا اور حق پرست جماعت اہل حدیث کے بدنام کرنے پر کمر کس کر کھڑے ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز جب تک اس ملک میں رہے ان کی نظر التفات بدعتی لوگوں، دوست نما اسلام دشمن عناصر پر زیادہ رہی کیونکہ یہی ان کے ناپاک عزائم کے انجام دینے میں ان کے آلہ کار بنے رہے اور اب بھی اگرچہ انگریز جا چکے ہیں لیکن اپنے

ایجنٹ چھوڑ گئے ہیں جو''اہل قرآن'' کا خوش نما لیبل لگا کر رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور اسوۂ حسنہ کی بیخ کنی کی ناپاک مساعی میں رات دن منہمک ہیں اور اس حدیث دشمنی کی وجہ سے جماعت اہل حدیث کے بھی یہ لوگ پکے دشمن ہیں۔ خلاصہ کلام جماعت اہل حدیث کے دشمنوں کی ذہنیت کا پوسٹ مارٹم کیا جائے اور ان کی ہسٹری کا ابتدا سے لے کر انتہا تک اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ہر جگہ (خصوصاً ہمارے ملک میں) ان چالاک انگریزوں ہی کی کارستانی نظر آئے گی۔

میرے محترم! اب تک میں نے جماعت اہل حدیث کے بلند مقاصد اور اعلیٰ عزائم کا ذکر کیا، اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ان کو بدنام کرنے میں کس کا ہاتھ تھا لیکن جماعت اہل حدیث کا شان دار ماضی اور مضبوط و مستحکم حال اس پر شاہد عدل ہیں کہ اس کو ان چیزوں کی قطعاً پرواہ نہیں ہے۔ جماعت اہل حدیث کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ وہ جملہ مصائب، ابتلاء اور اتہامات سے بے نیاز ہو کر ہمیشہ حق کی حمایت کرتی رہی، اس نے اپنے تصورات واعتقادات، عبادات ومعاملات اقتصادی اور سیاسی مسائل غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کتاب وسنت کو پیش نظر رکھا اور اس معاملہ میں قطعاً مداہنت سے کام نہیں لیا اور نہ ہی حق کے معاملہ میں کسی لومۃ لائم کا خوف کیا، جس کو کتاب وسنت کی روشنی میں حق سمجھا اس کا ڈنکے کی چوٹ پر اظہار کیا۔ حق کی راہ میں ناقابل برداشت اذیتیں جھیلیں، ذاتی مفادات وشخصی اغراض لالچ وطمع، حرص وہوائے نفسانی کو اپنے ٹھوس موقف سے ایک انچ بھی ہٹا نہ سکی۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے رشتہ وناطہ جوڑا اور ان کے مقابلہ میں اور جو بھی رشتے ہی کیوں نہ ہوں ان سب کو چھوڑ دیا۔ الغرض کہ ان کی منشا یہی رہی جو قرآن حکیم کے ان الفاظ مبارکہ میں بیان ہوا ہے:

﴿وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (التوبة : ٦٢)

یعنی ''مومن وہی ہیں جو ہر بات میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کو مقدم رکھتے ہیں۔''

ماضی بعید صحابہ کے دور کے بعد حضرت امام احمد، امام بخاری، امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ وغیرہم کی زندگیاں ہمارے لیے درخشندہ ستاروں کی طرح ہیں اور ماضی قریب میں بھی بہت سی ایسی ہستیاں گذر چکی ہیں جن کی زندگیاں ہمارے لیے یقیناً مشعل راہ ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی رحمہم اللہ وغیرہم نے جس طرح کتاب وسنت کی اشاعت میں حصہ لیا، جس جرأت سے حق کی مدافعت کی، جس طرح اپنے صحیح موقف پر غیر متزلزل پہاڑ کی طرح جمے رہے اور جنہوں نے حق کے اظہار میں بلا کسی چیز کی ذرہ بھر پرواہ کیے جس بے باکی کا اظہار کیا وہ ہمارے لیے روشن مینار کا کام دیتی ہے اور جماعت اہل حدیث کے لیے بجا طور پر فخر کا باعث ہیں اور اس کے گذرے دور میں بھی۔ الحمد للہ ایسی حق پرست اور عالم باعمل شخصیتیں موجود ہیں جو اپنی بساط کے مطابق اور حتی المقدور کتاب وسنت کی اشاعت میں نمایاں حصہ لے رہی ہیں اور ان کا اوڑھنا بچھونا اور ان کی ساری نقل وحرکت کتاب وسنت کی روشنی

میں ہی ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے آمین۔

ہاں اگر ہمارے محترم حضرات برانہ مانیں تو میں ایک عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں وہ یہ کہ کچھ عرصہ سے جماعت اہل حدیث کی دو جماعتوں میں کچھ شکر رنجی چلی آتی ہے اور بسا اوقات یہ چیز اتنا طول پکڑ لیتی ہے کہ اخبارات میں ایک دوسرے کے مخالف بیانات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔یقین مانیے یہ چیز اہل حدیث جماعت کے لیے انتہائی ذہنی کوفت کا باعث ہے اور اس سے اہل حدیث جماعت کے بدخواہوں کو خواہ مخواہ نقصان پہنچانے کا موقع مل جاتا ہے۔ پھر جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہم تو دوسرے فرقوں کے افتراق وانتشار کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تو یہ سوال خود بخود سامنے آ جاتا ہے کہ پھر ایسی چیز کے ہم خود کیوں روادار بن گئے ہیں جب ہم سب اہل حدیثوں کے سارے معاملات کی بنیاد کتاب وسنت پر ہی ہے تو یہ افتراق وانتشار کیوں؟ ہمیں تو یہی چاہیے تھا کہ ہم اپنے سب اختلافات کو چھوڑ دیتے اور ساری جماعت فرد واحد کی طرح بن جاتی۔ ورنہ میرے محترم بزرگو! آپ اس ربانی ارشاد کو یاد رکھیے:

﴿وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾ (الانفال: ٤٦)

یعنی ''آپس میں جھگڑے نہ کرو (ورنہ) پھر تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا بھی اکھڑ جائے گی۔''

اگر کچھ اختلافات ہوں تو ان کے تصفیہ کا یہ طریقہ نہیں ہے جو ہم اختیار کیے ہوئے ہیں۔ بلکہ بموجب آیت کریمہ جو اس خطبہ کے ابتداء میں ذکر کی گئی ہے ہمیں آپس میں سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور ہر بات کو کتاب وسنت سے فیصلہ کرالینا چاہیے لیکن اس سے بڑھ کر بیان بازی پر اتر آنا یقیناً مناسب نہیں ہے اور کسی صورت میں بھی ایسی بات نہ ہونی چاہیے بلکہ ان چیزوں کو سرے سے ابھرنے کا موقع ہی نہ دینا چاہیے، مجھے امید کامل ہے کہ میری ان گزارشات پر جو صحیح قلب سے نکلی ہیں ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔اس کے بعد میں اپنے معزز حاضرین کی خدمت میں ''الجامعۃ السلفیہ'' لائل پور (فیصل آباد) کا ذکر کرتا ہوں جماعت کے اور بھی تعلیمی ادارے ہیں لیکن جہاں تک میرا علم کام کرتا ہے، پاک و ہند میں جماعت کا ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے جہاں اس طرح بڑے پیمانے پر دینی و دنیاوی، منقول ومعقول کی تعلیم دی جاتی ہو اور جہاں کتاب وسنت کی اعلیٰ پیمانے پر تعلیم کے ساتھ ساتھ مروجہ علوم حاضرہ مثلاً: تاریخ جغرافیہ، حساب، انگریزی، وغیرہم کا بھی انتظام ہو گویا یہ ادارہ مجمع البحرین۔ہے یا اس سے زیادہ مناسب الفاظ میں جامع المشرق والمغرب ہے یعنی مشرقی ومغربی علوم کا جامعہ ہے اور ہر سال اس ادارہ سے بہت سے طلباء فارغ التحصیل ہو کر ملک کے کونہ کونہ میں علم کی خدمت بجا لاتے اور کتاب وسنت کی اشاعت کا فرض ادا کرتے رہتے ہیں۔ میں ۱۹۶۳ء میں پہلی مرتبہ لائل پور گیا تھا وہاں جامعہ سلفیہ میں بھی حاضری دی اور اپنے تاثرات بھی قلم بند کیے تھے جو اس وقت اخبار ''الاعتصام'' میں بھی شائع ہوئے تھے لیکن اس کے بعد گو مجھے وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔تاہم اس ادارے کے متعلق مجھے معلومات ہوتی رہتی ہیں۔اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ ادارہ تدریجاً

ترقی پر گامزن ہے اور میری یہ دعا ہے کہ دینی تعلیم کا یہ مرکز اور بھی دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا رہے۔
وماذالك على الله بعزيز

ابھی اس تعلیمی گہوارہ کے متعلق بہت سے منصوبے باقی ہیں اور بہت سے کام تشنہ تکمیل ہیں۔ جماعت اہل حدیث ہمیشہ سے خیر کے کاموں میں پیش پیش رہی ہے۔ یہ علم کا یہی فرض ہے کہ اس کی بہترین و بہبودی اور ترقی کے لیے اپنے جمیع وسائل جو ہماری مقدر میں ہوں، سے کام لیں اور میں اس امید رکھنے میں حق بجانب ہوں کہ میری یہ گذارش رائیگاں نہیں جائے گی۔ اب میں اس طول کلامی اور تفصیل کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ وہ ہماری جماعت کے عوام وخواص کو اپنے حبیب سید المرسلین ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا متبع بنائے، کتاب وسنت کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ان کو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلائے اور ساری جماعت اہل حدیث کو اتحاد واتفاق کے اعتبار سے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنادے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

❁❁❁❁

باب دوم

مسائل 8

کیا بیس رکعات تراویح پڑھنا سنت ہے؟

ضلع میر پور خاص کے علاقہ جمس آباد میں علماء بریلوی کی طرف سے ایک اشتہار شائع کیا گیا، جس میں انہوں نے ۲۰ رکعات تراویح کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ضعیف وموضوع روایات کے ذریعہ سعی کی ہے تو اہلیان میر پور خاص نے شاہ صاحب کی خدمت میں یہ اشتہار روانہ فرمایا اور اس کا جواب طلب کیا جس کا شاہ صاحب نے علمی تعاقب کیا اور احادیث صحیحہ سے ثابت کیا کہ آٹھ رکعات پڑھنا ہی سنت ثابتہ ہے۔
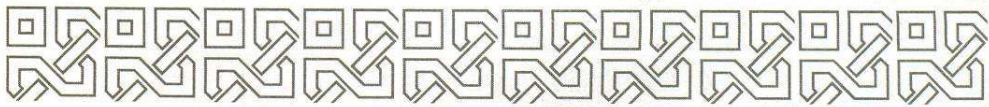
الحمد لله الذی یقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا هو زاهق ویحق الحق بکلماته ولو کره المجرمون والذی یبعث فی کل عصر رجالا سعداء لینفوا عن دینه القیم تحریف الغالین وانتحال المبطلین الذین لا یعلمون والصلوٰة والسلام علی محمد سید الانبیاء والمرسلین الذی تم به قصر النبوة فمن اتبعه واقتضی آثاره فاولٓئك فی جنات مکرمون وعلی آله واصحابه الذین اهتدوا بهدیه الشریف واتبعوا اسوته الحسنة وصاروا یسعون فی اشاعتها باللیل والنهار وهم لا یسأمون ربنا فارزقنا اتباعهم واحشرنا یوم القیامة فی زمرتهم ولا تجعلنا مع الذین هم منها عمون .

وجہ تالیف:

امابعد! اس ماہ مبارک رمضان میں ایک محترم دوست نے ایک اشتہار لاکر دیا جو جیمس آباد کی بریلوی جماعت کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ اور مجھ سے باصرار تام متقاضی ہوئے کہ میں اس کا جواب لکھوں۔ میں نے جواب اثبات میں دیا۔ بعد میں جو اشتہار کو غور سے دیکھا تو بے انتہا افسوس ہوا کہ ان لوگوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عدالت میں کھڑے ہونے کا بھی خوف دامن گیر نہیں ہوتا اور بے دھڑک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ پر بھی جھوٹ باندھنے سے نہیں چوکتے اور اس اشتہار کی ابتدا ہی ایک موضوع حدیث سے کی ہے۔ بہر حال میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے تحقیق شروع کی۔ چند روز کی جدوجہد کے بعد یہ تحقیق پیش خدمت ہے۔ ناظرین کرام بنظر انصاف ملاحظہ فرمائیں:

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ولا تجعله علینا ملتبسا واجعلنا للمتقین اماما .

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت پر ایک نظر:

قارئین کرام اشتہار کی ابتدا میں (ا) کے تحت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح روایت نقل کی گئی ہے۔

((ان النبی ﷺ کان یصلی فی رمضان عشرین رکعة سوی الوتر وزاد البیهقی فی غیر جماعة))

اس کا ترجمہ سامنے اس طرح کیا گیا ہے۔

''بیشک نبی ﷺ رمضان شریف میں بیس رکعت پڑھتے تھے وتر کے علاوہ بیہقی نے یہ زیادہ فرمایا کہ بغیر جماعت تراویح پڑھتے تھے۔''

پھر لکھتے ہیں:

''ان احادیث سے معلوم ہوا کہ خود حضور انور ﷺ بیس رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے۔''
حدیث تو ایک یہ نقل کی ہے لیکن لکھتے ہیں:
''ان احادیث'' یعنی جمع کا صیغہ استعمال کیا اس طرح قارئین کو دھوکہ دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے بیس رکعت تراویح بہت سی احادیث میں مذکور ہے۔ دیکھئے کتنا بڑا دھوکہ دیا جا رہا ہے، بہرحال اس روایت کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ذیل میں ہماری گذارشات ملاحظہ فرمائیں:
یہ روایت امام ابن ابی شیبہ اپنے مصنف میں، طبرانی کبیر میں اور بیہقی سنن کبریٰ میں لائے ہیں۔ اس روایت کی سب سے چھوٹی سند ابن ابی شیبہ کی ہے اس کی سند اس طرح ہے:

((حدثنا يزيد بن هارون قال انا ابراهيم بن عثمان عن الحكم عن مقسم عن ابن عباس رضي الله عنهما ان رسول الله ﷺ كان يصلى فى رمضان عشرين ركعة والوتر.)) (۳۹٤/۲)

امام بیہقی نے بھی اسی روایت کو اپنی سند سے اسی ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ عن الحکم عن مقسم عن ابن عباس ذکر کی ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

((كان النبى ﷺ فى شهر رمضان فى غير جماعة بعشرين ركعة والوتر.))

(سنن الكبرى: ٤٩٦/٢)

''بہرکیف یہ ایک ہی روایت ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی گئی ہے۔ الفاظ میں بھی کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ ناظرین آپ دیکھیں کہ ان سب کتب میں اس روایت کی سند میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان العبسی الکوفی ہے اور یہ راوی سخت ضعیف ہے۔ خود امام بیہقی نے اس روایت کے آخر میں یہ لکھا ہے کہ

((تفردبه ابو شيبة ابراهيم بن عثمان العبسي الكوفى وهو ضعيف.))

(سنن الكبرى ٢/ ٤٩٦)

یعنی بیس رکعت کی اس روایت کو بیان کرنے میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان عبسی کوفی اکیلے ہیں (یعنی ان کا کوئی متابع نہیں) اور وہ ضعیف ہے۔
افسوس اشتہار شائع کرانے والوں نے اس روایت کے متعلق بیہقی کا حوالہ تو دیا لیکن امام موصوف نے جو اس پر تبصرہ کیا اس کو شیر مادر تصور کر کے ہضم کر لیا۔
اب ناظرین کرام! ذیل میں، ہم اس راوی (ابراہیم بن عثمان) کے متعلق ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال خود حنفی بزرگوں کی زبانی پیش کرتے ہیں اور پھر آپ انصاف کریں ایسے وہی راوی کی راویت کو حجت کے طور پر پیش کرنے میں یہ بریلوی حضرات کہاں تک حق بجانب ہیں۔

حافظ زیلعی کا بیان:

ا......حافظ زیلعی حنفی نصب الرایہ میں لکھتے ہیں:

((وهو معلول بابى شيبة ابراهيم بن عثمان جد الامام ابى بكر بن ابى شيبة وهو متفق عليه ضعفه ولينه ابن عدى فى الكامل ثم انه مخالف للحديث الصحيح عن ابى سلمة بن عبدالرحمن انه سال عائشة كيف كانت صلواة رسول الله ﷺ فى رمضان قالت ما كان يزيد فى رمضان ولا فى غيره على احدى عشرة ركعة)) (۱۵۳/۲)

"یعنی یہ حدیث ضعیف ہے ابراہیم بن عثمان کی وجہ سے اور یہ (ابوشیبہ) ائمہ جرح وتعدیل کے اتفاق سے ضعیف ہیں۔ امام ابن عدی نے "الکامل" میں ان کی تضعیف کی ہے، پھر یہ روایت اس حدیث صحیح کے بھی مخالف ہے جو ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ نبی کریم ﷺ کی نماز رمضان مبارک میں کس طرح ہوتی تھی۔ (یعنی رمضان مبارک میں رکعات وغیرہا زائد ہوتی تھیں یا نہیں) تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں فرمایا کہ نبی کریم ﷺ رمضان میں خواہ غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ (یعنی آٹھ رکعت تراویح اور تین وتر) شیخ زیلعی کا کلام پورا ہوا۔"

علامہ نیموی حنفی کی تحقیق:

۲......علامہ نیموی حنفی اپنی کتاب آثار السنن کی تعلیق میں لکھتے ہیں:

((وقد اخرجه عبد بن حميد الكشى فى مسنده والبغوى فى معجمه والطبرانى فى معجمه الكبير والبيهقى فى سننه كلهم من طريق ابى شيبة ابراهيم ابن عثمان جد الامام ابى بكر بن ابى شيبة وهو ضعيف انتهى تعليق آثار السنن.)) (صفحه ۲۰۶)

اس روایت کو عبد بن حمید کشی نے اپنے مسند میں بغوی نے اپنے معجم میں، طبرانی نے اپنے معجم کبیر میں اور بیہقی نے سنن میں ذکر کیا ہے۔ ان سب نے اس روایت کو ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان جو امام ابوبکر بن ابی شیبہ کا دادا تھا کے طریق سے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے، امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس روایت کے اخراج کے بعد فرمایا کہ اس روایت میں ابوشیبہ ابراہیم عثمان متفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔

آگے پھر علامہ نیموی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((وقال المزى فى تهذيب الكمال قال احمد ويحيى وابوداود ضعيف وقال يحيى ايضا ليس بثقة وقال النسائى والد ولابى متروك الحديث وقال ابو

حاتم ضعيف الحديث سكتوا عنه وتركوا حديثه وقال صالح ضعيف لا يكتب حديثه ثم قال المزى ومن مناكيره حديث انه ﷺ كان يصلى فى رمضان عشرين ركعة والوتر انتهى قلت وهكذا فى الميزان قال الحافظ ابن حجر فى التقريب متروك الحديث انتهى .))

(تعليق آثار السنن: ٢٠٧، مكتبه امداديه ملتان ص٢٥٤)

یعنی ''اس راوی (ابراہیم بن عثمان) کے متعلق حافظ ابوالحجاج مزی تہذیب الکمال میں فرماتے ہیں کہ امام احمد، یحییٰ اور ابوداود نے ان کو ضعیف کہا ہے۔ نیز یحییٰ نے فرمایا وہ ثقہ نہیں ہے (معلوم ہونا چاہیے کہ "ليس بثقة" جروح شدیدہ کے الفاظ میں سے ہے) اور نسائی ودولابی نے فرمایا کہ یہ متروک الحدیث ہے (یہ بھی جروح شدیدہ کے الفاظ سے ہے) اور ابوحاتم رازی نے فرمایا یہ حدیث میں کمزور ہے اور محدثین نے ان سے روایت لینے سے سکوت اختیار کیا ہے اور اس کی حدیث کو چھوڑ دیا ہے اور صالح نے فرمایا کہ وہ ضعیف ہے اور ایسا ضعیف جس کی روایت لکھی بھی نہ جائے پھر حافظ مزی نے فرمایا کہ اس راوی کی مناکیر روایات میں سے یہ روایت بھی ہے، یعنی زیر بحث روایت (بیس رکعات والی حدیث) حافظ مزی کا کلام پورا ہوا۔''

پھر نیموی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ میزان الاعتدال حافظ ذہبی میں بھی اسی طرح سے ہے اور حافظ ابن حجر تقریب میں فرماتے ہیں متروک الحدیث۔ یعنی ابوشیبہ کی احادیث کو ترک کر دیا گیا ہے۔ یہاں تعلیق آثار السنن کی عبارت کا ترجمہ تمام ہوا۔

اصول حدیث سے مس رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ متروک راوی کی روایت کو نہ تو اصالتاً واحتجاجاً لیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کو شواہد ومتابعات میں ہی پیش کیا جا سکتا ہے، لہٰذا ایسے راوی کی روایت کو معرض استدلال میں پیش کرنا ان بریلوی حضرات کا ہی حصہ ہے۔

شیخ ابن ہمام حنفی کی رائے:

شیخ ابن ہمام حنفی اپنی کتاب فتح القدیر (ہدایہ کی شرح) میں اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

((ضعيف بابى شيبة ابراهيم بن عثمان جد الامام ابى بكر بن ابى شيبة متفق على ضعفه مع مخالفته للصحيح انتهى .)) (١/ ٣٣٣)

یہ حدیث ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان امام ابوبکر بن ابی شیبہ کے دادا کی وجہ سے ضعیف ہے، ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان کے ضعیف ہونے پر سب ائمہ فن متفق ہیں اور پھر یہ روایت صحیح حدیث کے بھی مخالف ہے (یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے) اور علامہ عینی حنفی عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں یہ حدیث لا کر لکھتے ہیں:

((وابو شيبة هو ابراهيم بن عثمان العبسي الكوفي قاضي واسط جد ابي بكر بن ابي شيبة كذبه شعبة وضعفه احمد وابن معين والبخاري والنسائي وغيرهم واورد ابن عدي هذا الحديث في الكامل في مناكيره انتهى .))

''اس روایت کی سند میں جو ابوشیبہ ہے وہ ابراہیم بن عثمان عبسی کوفی ہے جو واسط کا قاضی تھا اور امام ابوبکر بن ابی شیبہ کا دادا ہے اس کو امام شعبہ نے جھوٹا قرار دیا ہے اور امام احمد یحییٰ بن معین امام بخاری نسائی اور دوسرے ائمہ فن نے اس کو ضعیف بتایا ہے اور حافظ ابن عدی نے اپنی کتاب ''الکامل'' میں اس حدیث کو ان کی منکرات روایت میں ذکر کیا ہے۔

قارئین کرام! آپ نے اس روایت اور اس کے راوی ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان کے متعلق علماء احناف ❶ کی عبارات ملاحظہ فرمائیں اور حدیث کے امام اور فن جرح وتعدیل کے ماہروں نے اس راوی کے حق میں جو کچھ کہا وہ بھی آپ نے ملاحظہ فرمالیا اور ان ائمہ نے جو حدیث کے نقادوں میں سے ہیں اس روایت کو منکر قرار دیا ہے

---

❶ (۱) فخر الاحناف مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن ابی شیبہ نے جو اپنے مصنف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیس رکعت پڑھنا نقل کیا ہے اگرچہ وہ روایت ضعیف ہے۔ الرائی النجیح فی عدد التراویح ص۱۲ مؤلف مولانا رشید احمد گنگوہی، ناشر، میر محمد، کتب خانہ آرام باغ کراچی

(۲) احناف کے علامہ کبیر محدث شہیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی صاحب اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

اس حدیث (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کی طرف اشارہ) کی اسناد میں ایک راوی ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان واقع ہے اور وہ مجروح راوی ہے، اس لیے اس کی یہ روایت ضعیف قرار دی گئی ہے، اس کو ضعیف کہنے والوں میں ابن حجر سیوطی، ابن ہمام اور عینی وغیرہم شامل ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ ابراہیم بن عثمان پر سخت جرحیں نقل کی گئی ہیں۔

مزید آگے رقم طراز ہیں کہ: بہر حال ہم کو اتنا تسلیم ہے کہ ابراہیم ضعیف راوی ہے اور اس کی وجہ سے یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔ رکعات تراویح مناظرہ، مؤلف حبیب الرحمٰن الاعظمی مشمولاً: نادر مجموعہ رکعات تراویح صفحہ ۵۶ مطبوعہ میر محمد کتب خانہ کراچی

(۳) دیوبندیوں کے حکیم الامت کے خلیفہ مجاز اور استاذ العلماء مولانا خیر محمد جالندھری صاحب بعینہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے الفاظوں کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: بہر حال ہم کو اتنا تسلیم ہے کہ ابراہیم ضعیف راوی ہے اس کی وجہ سے یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔ الخ

خیر المصابیح فی عدد التراویح، تالیف، مولانا خیر محمد جالندھری ص۴۱ ناشر، ادارۃ نسر الثقافۃ النعامانیہ ناظم آباد کراچی

(۴) عصر حاضر کے نامور غالی مقلد اور دیوبندوں کے شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب اکابرین علمائے دیوبند کے اقوال کی تصدیق پر مہر ثبت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں آتا ہے کہ آپ نے رمضان میں بیس رکعتیں پڑھیں مگر اس کی سند ضعیف اور کمزور ہے۔ الخ

رسالہ تراویح مع ترجمہ ینابیع، مترجم: مولانا سرفراز خان صفدر ص۶، ناشر: انجمن اسلامیہ گکھڑ منڈی، ضلع گوجرانوالہ

(۵) ڈاکٹر حافظ شاہد اقبال ازہری صاحب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: ⇦⇦⇦

پھر بھی یہ بریلوی حضرات اپنی مرغی کی ایک ٹانگ کہتے رہیں تو اس کا علاج ہمارے پاس نہیں۔

ہم نے ابتداء میں لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان کو امام شیبہ بن الحجاج نے جھوٹا قرار دیا ہے اور جھوٹے کی حدیث موضوع ہی ہوتی ہے ورنہ اس روایت کے سخت ضعیف ہونے میں تو کوئی خلاف نہیں، لہٰذا اس کو بطور حجت پیش کرنا جہالت کا ثبوت دینا ہے۔

حدیث ثانی پر گزارشات ہماری:

دوسرے نمبر پر امام بیہقی کی کتاب ''معرفۃ السنن والآثار: ۲/ ۳۰۰۵'' سے ایک روایت حضرت ابن یزید یعنی السائب بن یزید) سے نقل کی ہے لکھتے ہیں کہ اس کی اسناد صحیح ہے وہ روایت یہ ہے:

((قال كنا نقوم فی عهد عمر بعشرين ركعة والوتر))

''ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمر فاروق کے دور میں بیس رکعت اور وتر پڑھتے تھے۔''

ہماری گذارشات: اس روایت کی سند تو ٹھیک ہے لیکن اس روایت کی معارض وہ حدیث ہے جو امام سعید بن منصور اپنے سنن میں لائے ہیں۔

علامہ سیوطی اپنی فتاویٰ المسماۃ ''الحاوی'' میں ایک رسالہ بنام ''المصابیح فی صلوٰۃ التراویح'' رکھا ہے، اس میں سنن سعید بن منصور سے اس طرح حدیث نقل کرتے ہیں۔

((حدثنا عبدالعزيز بن محمد حدثنى محمد بن يوسف سمعت السائب ابن يزيد يقول كنا نقوم فی زمان عمر بن الخطاب باحدى عشرة ركعة)) (ج۱/ ۳۴۹)

''حدیث (بیان) کی ہمیں عبدالعزیز بن محمد نے (اس نے کہا) حدیث (بیان) کی مجھے محمد بن یوسف

⇦⇦⇦ اس روایت کی سند کمزور ہونے کے سبب محدثین اسے قابل اعتبار نہیں سمجھتے ان کا مسلک یہ ہے کہ سنت تو آٹھ رکعتوں کا پڑھنا ہی ہے لیکن اس سے زائد جو رکعتیں پڑھی جائیں گی وہ صحیح اور مستحب ہوگی۔

نماز تراویح کی حقیقت، مولف، ڈاکٹر حافظ شاہد اقبال، از ہری صفحہ ۴۵، ناشر: ادارہ شہادت حق، نارتھ ناظم آباد، کراچی

(٦) علامہ مفتی عبدالمجید خاں سعیدی رضوی بریلوی صاحب بیان کرتے ہیں کہ:

روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما در بارہ بیس رکعات مرفوعاً صریح تو ہے مگر از روئے سند اس میں سقم پایا جاتا ہے۔ الخ

تحقیق رکعات تراویح، مصنف: مفتی عبدالمجید خان سعیدی بریلوی ص ٦، ناشر: قادریہ پبلشرز کراچی

مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہوں:

انوار مصابیح بجواب رکعات تراویح، تالیف: مولانا نذیر احمد رحمانی اعظمی رحمہ اللہ ص ۱٦۷ تا ۲۰۳۔

نماز تراویح، مؤلف: محقق العصر علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ مترجم: مولانا محمد صادق خلیل مدظلہ ص ۳۵ تا ۳۷۔ (نعیم)

نے (اس نے کہا) میں نے سنا حضرت سائب ابن یزید سے جو فرماتے تھے کہ ہم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔''

ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث کو امام بیہقی والی حدیث پر ترجیح ہے، لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ اس روایت میں گیارہ رکعات کا ذکر ہے نہ کہ بیس کا وجوہ ترجیح حسب ذیل ہیں:

۱۔ سنن سعید بن منصور کی روایت کی سند بالکل چھوٹی ہے اور امام بیہقی والی روایت کی سند اس سے کافی لمبی ہے سعید بن منصور کی روایت میں امام سعید بن منصور اور سیدنا سائب بن یزید رضی اللہ عنہ تک صرف دو واسطے ہیں بخلاف امام بیہقی والی روایت کے کہ اس کی سند میں امام بیہقی اور سیدنا سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کے درمیان چھ واسطے ہیں۔ (دیکھو معرفۃ السنن والآثار (مخطوطہ) ۱/ ۳۶۷، وفی المطبوع ۲/ ۳۰۵)

اور وسائط کا کم ہونا بھی ترجیحات کے وجوہ میں شمار ہوتا ہے۔

۲۔ امام بیہقی والی روایت شاذ ہے کیونکہ ان کی روایت میں حضرت سائب ابن یزید سے راوی یزید بن حفصہ ہیں ان کے متعلق حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں ''ثقہ'' یعنی یہ ہیں لیکن سنن سعید بن منصور والی روایت میں حضرت سائب بن یزید سے راوی محمد بن یوسف ہیں ان کے متعلق حافظ صاحب التقریب میں لکھتے ہیں کہ:

''ثقة ثبت'' یعنی محمد بن یوسف یزید بن حفصہ سے ثقاہت میں ایک مرتبہ بڑھا ہوا ہے، پھر اس بات کو بھی دھیان میں رکھا جائے کہ سائب ابن یزید محمد بن یوسف کے نانا ہیں اس لیے ان کا تعلق اپنے نانا سے اوروں سے زائد ہوگا اور یہ محمد بن یوسف اپنی روایت میں ''احدی عشرة'' یعنی گیارہ رکعت کا ذکر کرتے ہیں لیکن یزید بن حفصہ بیس رکعت کا ذکر کرتے ہیں جو اس کے مخالف ہے، لہٰذا محفوظ وہی روایت ہے جو محمد بن یوسف سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے کرتے ہیں اور یزید بن حفصہ والی روایت شاذ اور غیر محفوظ ہوگی جو لوگ اصول حدیث کو جانتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ شاذ اس حدیث کو کہا جاتا ہے کہ ایک ثقہ راوی اپنے سے زیادہ ثقہ یا احفظ یا اپنے سے زائد رواۃ کے خلاف کرے اور یہاں بھی یہی معاملہ ہے۔ ابن حفصہ (بیہقی والی روایت میں) جو ثقہ ہے اپنے سے زائد وثبت، یعنی محمد بن یوسف سے خلاف کیا ہے، یعنی محمد بن یوسف تو گیارہ رکعت نقل کرتے ہیں، یعنی حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے اور ابن حفصہ بیس رکعت نقل کرتے ہیں، لہٰذا اپنے سے زیادہ ثقہ کی مخالفت کی وجہ سے یہ روایت شاذ ہوئی اور شاذ حدیث بھی ضعیف حدیث کی اقسام میں سے ہے، لہٰذا یہ روایت ضعیف ہوئی اس لیے ناقابل احتجاج۔

۳۔ یہ بیس رکعات والی روایت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خود اپنے حکم کے بھی خلاف ہے، چنانچہ موطا مالک صفحہ ۹۴ اور سنن کبریٰ ۲/ ۴۰۵ وغیرہ میں صحیح سند سے امام مالک کے طریق سے اس طرح روایت ہے:

((مالك عن محمد بن يوسف ابن اخت السائب عن السائب بن يزيد انه قال امر عمر بن الخطاب رضي الله عنه ابى بن كعب وتميم الدارى ان يقوما للناس باحدى عشرة ركعة)) (موطا مالك: ٩٤، طبع بيروت)

یعنی ”حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم بن اوس الداری کو امر فرمایا کہ وہ رمضان المبارک میں لوگوں کو گیارہ رکعات تراویح مع الوتر پڑھائیں۔“

یہ سند اصح الاسانید ہے:

نوٹ: اس روایت میں محمد بن یوسف کو سائب بن یزید کا بھانجا لکھا ہے، یہ تھوڑا سا محدثین کا اختلاف ہے بعض نے سائب بن یزید کو محمد بن یوسف کا نانا اور بعض نے ماموں بتایا ہے بہرصورت محمد بن یوسف کا سائب بن یزید سے خاص رشتہ وناطہ اور تعلق ہے اور محمد بن یوسف سے گیارہ رکعات والی روایت کرنے میں امام مالک منفرد بھی نہیں ہیں بلکہ امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن سعید القطان نے بھی محمد بن یوسف سے اسی روایت کرنے میں امام مالک کی متابعت کی ہے جیسا کہ امام ابن ابی شیبہ اپنے مصنف میں سند صحیح ذکر کرتے ہیں، دیکھئے المصنف المطبوع فی کراتشی ۲/۳۹۱،۳۹۲۔

اسی طرح امام سعید بن منصور سے بھی یہ روایت ذکر کی ہے اس میں عبدالعزیز بن محمد، محمد بن یوسف سے یہی روایت کرتے ہیں، یعنی عبدالعزیز بن محمد نے بھی امام مالک کی متابعت کی ہے۔ (الحاوی: ۱/۳۵۰)

لہٰذا جب ثابت ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی وتمیم الداری رضی اللہ عنہما کو حکم فرمایا کہ وہ گیارہ رکعات لوگوں کو پڑھائیں تو بیہقی کی وہ روایت جو اشتہار (المعرفہ) سے نقل کی گئی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے امر کے خلاف ہونے کی وجہ سے مرجوح ہے۔

اہل علم ونظر اگر انصاف کا دامن تھام لیں گے تو اسی روایت کو ترجیح دیں گے جو ہم نے سنن سعید ابن منصور نے نقل کی اور جس میں سائب ابن یزید رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں گیارہ رکعات پڑھنے کا بیان کرتے ہیں۔

پھر یہاں یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ جو روایت یہ حضرات پیش کرتے ہیں اس میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا امر نہیں ہے اور نہ ہی ان کے اپنے فعل کا بیان ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان تو وہ ہے جو موطا میں امام مالک رحمہ اللہ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں یحییٰ بن سعید القطان اور سنن سعید بن منصور میں عبدالعزیز بن محمد، محمد بن یوسف سے اور وہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں جس میں واضح طور پر بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان گیارہ رکعت تھا۔

ہاں بیہقی والی روایت میں صرف یہ بیان ہے کہ:

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کچھ لوگ بیس رکعات بھی پڑھا کرتے تھے۔“ چونکہ یہ نفلی عبادت ہے، اس لیے اس میں اضافہ کرنا جائز ہے مگر مسنون صرف گیارہ رکعات ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان بھی گیارہ رکعات کا تھا“ کما مر

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں رکعات تراویح:

اب ہم صحیح اسانید سے نقل کرتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں بیس تو کیا چالیس اکتالیس اور اس سے کم

دبیش لوگ پڑھتے رہتے تھے کیونکہ یہ نفلی عبادت تھی جس میں کوئی خاص حد بندی نہیں ہے، البتہ اس کو مسنون نہ سمجھ لیا جائے اور اسی کو ہی صحیح تصور نہ کیا جائے، ورنہ پھر یہ بدعت وناجائز ہوگا۔

لیجئے! امام ابوبکر بن ابی شیبہ اپنے مصنف میں یہ روایات ذکر کرتے ہیں ہم یہاں ان کی سندوں کے ساتھ تحریر کرتے ہیں:

۱...... ((حدثنا حفص (يعنى ابن غياث) عن الحسن بن عبيدالله قال كان عبدالرحمن بن الاسود (هو النخعى) يصلى بنا فى رمضان اربعين ركعة ويوتر بسبع .)) (المصنف المطبوع: ۲/ ۳۹۳)

''حدیث (بیان) کی ہم سے حفص نے (یعنی غیاث کے بیٹے نے) اس نے روایت کی حسن بن عبیداللہ سے اس نے کہا عبدالرحمٰن ابن الاسود ہم کو رمضان میں چالیس رکعات تراویح اور سات رکعات وتر پڑھاتے تھے۔''

اس روایت کے سب رواۃ ثقہ ہیں اور عبدالرحمٰن بن الاسود بڑے جلیل القدر تابعی ہیں۔ تہذیب التہذیب (للحافظ ابن حجر) میں ہے۔

((ادرك عمرو روى عن ابيه وعم ابيه علقمة بن قيس وعائشة وانس وابن الزبير وغيرهم .)) (التهذيب: ۱۲۷/۶، طبع لاهور)

''(عبدالرحمٰن بن الاسود) نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا اور اپنے باپ اسود بن یزید باپ کے چچا علقمہ بن قیس، عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، انس، ابن زبیر رضی اللہ عنہما وغیرہم سے روایت کرتا ہے۔''

حافظ مزی نے تہذیب الکمال میں بھی یہی لکھا ہے کہ:

اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا۔ لہٰذا اگر بیہقی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کچھ لوگ بیس رکعات تراویح پڑھتے تھے تو اس روایت سے معلوم ہوتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یا اس کے بعد خلفاء راشدین کے عہد مبارک میں کچھ لوگ چالیس رکعات تراویح بھی پڑھا کرتے تھے اور حضرت عبدالرحمٰن ابن یزید جلیل القدر تابعی ان کی امامت کراتے تھے۔

۲...... ((حدثنا ابن مهدى عن داود بن قيس قال ادركت الناس بالمدينة فى زمن عمر بن عبدالعزيز وابان ابن عثمان يصلون ستة وثلاثين ركعة ويوترون بثلاث .)) (ابن ابى شيبة: ۲/ ۳۹۳)

''حدیث (بیان) کی ہم سے عبدالرحمٰن بن مہدی نے اس نے روایت کی داؤد بن قیس سے وہ فرماتے تھے کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز اور ابان ابن عثمان کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں لوگوں کو پایا کہ وہ چھتیس

رکعات تراویح اور تین رکعت وتر یعنی انتالیس رکعات پڑھتے تھے۔''

اس روایت کی سند بھی جید ہے:

عمر بن عبدالعزیز اور ابان بن عثمان کے زمانے میں بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔

۳...... ((حدثنا محمد بن فضيل عن وقاء قال كان سعيد بن جبير يؤمنا رمضان فيصلى بنا عشرين ليلة ست ترويحات فاذا كان العشر الآخر اعتكف في المسجد وصلى بنا سبع ترويحات.)) (المصنف: ۲/ ۳۹۳،٤٩٤)

''حدیث (بیان) کی ہم سے محمد بن فضیل نے اس نے روایت کی وقاء سے وہ فرماتے تھے کہ مشہور تابعی سعید بن جبیر ہمیں رمضان میں بیس راتوں تک چھ ترویحات یعنی چوبیس رکعات پڑھاتے، پھر جب آخری دھاکا آتا تو مسجد میں معتکف ہو جاتے اور ہمیں سات ترویحات یعنی اٹھائیس رکعات تراویح پڑھاتے تھے۔''

اس روایت کے اور تو سب رواۃ ثقہ ہیں صرف وقاء (ابن ایاس) میں تھوڑا سا ضعف ہے، چند ائمہ جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی مثلاً سفیان ثوری۔ ابو حاتم الرازی (جو متشددین میں سے ہے) حافظ ابن عدی، ابن حبان اور یعقوب ابن سفیان نے ان کی توثیق کی ہے اور یحییٰ بن سعید القطان یہ بھی متشددین میں سے ہیں۔ دیکھئے الرفع والتكميل، علامہ عبدالحی لکھنوی۔

امام نسائی یہ بھی متشددین میں سے ہیں دیکھئے کتاب مذکور ساجی اور ابو احمد الحاکم نے ان کی تلیین کی ہے، ان میں سے کسی نے کوئی جرح مفسر نہیں کیا، البتہ ان کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حافظہ زیادہ قوی نہ تھا، ایسے راوی کی روایت حسن کے درجہ سے کم نہیں ہوتی ملاحظہ ہو۔ اصول حدیث کی کتب بہرحال اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت سعید بن جبیر جو مشہور تابعی ہیں اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا تلمیذ رشید تھے، رمضان المبارک میں پہلے بیس راتوں تک چوبیس رکعات اور عشرآخر میں اٹھائیس رکعات پڑھاتے تھے۔ ان جیدہ روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں صرف بیس رکعات پر ہی اکتفاء نہیں کی گئی بلکہ بعض چالیس بعض چھتیس بعض چوبیس واٹھائیس بھی پڑھا کرتے تھے اور یہ اس لیے کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ نوافل تھے اور نفلی عبادت کی صحیح مسلک کے مطابق حد بندی نہیں کی گئی، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اس کو مسنون نہ تصور کرلیا جائے اور نہ ہی اس پر مداومت کو لازم قرار دیا جائے اور اس کے ترک کو ناجائز سمجھا جائے، چنانچہ عصر حاضر کے علماء احناف کا طرز عمل بھی ہے تو اس صورت میں یہ بدعت ہوگا۔ اللهم ارزقنا اتباع السنة واجتناب البدعة، اٰمین

بیس رکعات تراویح اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ:

ناظرین کرام! آپ نے دیکھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک عہد میں لوگوں نے تراویح کی رکعات میں صرف بیس پر اکتفاء نہیں کیا۔ اگر بعض نے بیس پڑھیں تو دوسروں نے چالیس وغیرہ پڑھیں پھر یہ حنفی حضرات خواہ مخواہ بیس پر زور کیوں دیتے ہیں اور ان پر زور دینے کی وجہ کیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو نہ قولاً نہ فعلاً بیس رکعات ہرگز ثابت نہیں جیسا کہ صفحات بالا میں اس کی تحقیق گذر چکی۔ اگر بیہقی کی روایت کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں کچھ لوگ بیس رکعات پڑھتے تھے تو عبدالرحمٰن بن الاسود والی روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں یا حضرت عثمان وغیرہ رضی اللہ عنہم کے دور میں چالیس رکعات بھی پڑھی گئیں، لہٰذا بیس رکعات کی کوئی خاص اہمیت یا وجہ ترجیح اصلاً موجود نہیں باقی یہ حنفی حضرات جو اپنے تقاریر و تحریرات میں بے دھڑک کہتے اور لکھتے رہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس رکعات تراویح پڑھنے کا امر فرمایا یا انہوں نے خود بھی بیس رکعات پڑھیں اس کا ثبوت ان کے پاس کوئی نہیں یہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر اتہام ہے کوئی ایسی صحیح سند والی روایت آج تک پیش نہیں کی گئی انہیں ایسے اتہام سے ڈرنا چاہیے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کھڑے ہونے کا اندیشہ ہر وقت رہنا چاہیے۔ وما عليّ الا البلاغ

باقی یہ لوگ جو حرمین الشریفین وغیرہ ممالک اسلامیہ کا حوالہ دیتے ہیں تو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ ایک بات جو چل پڑتی ہے تو وہ چلتی ہی رہتی ہے اور اس کے چلتے رہنے سے یہ بات قطعاً اخذ نہیں کی جاسکتی کہ یہ جائز یا مسنون ہے۔ دیکھئے ربیع الاول کے ماہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا جشن منایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا ثبوت کتاب وسنت سے تو درکنار خیرالقرون بلکہ چھٹی صدی تک اس کا پتہ نہیں چلتا ساتویں صدی میں یہ چیز نکلی ہے اور اب تک چل رہی ہے اور حنفی (بریلوی) حضرات زور و شور سے اس کو مناتے ہیں تو کیا ہم اس بدعت سیۂ کے جواز یا مندوب کا سرٹیفکیٹ دے دیں؟ پھر حرمین الشریفین میں کافی طویل عرصہ سے حرم کعبہ میں چار مصلے قائم تھے اور کئی صدیوں تک یہ بدعت سیۂ قائم رہی ہم نے خود پہلے حج کے موقعہ پر یہ چار مصلے دیکھے تھے لیکن بعد میں سعودی خاندان کے مرد مجاہد نے اس بدعت کو ختم کر دیا ہوسکتا ہے کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی اور مرد مجاہد اٹھے اور وہ تراویح میں بھی مسنون طریقہ جاری فرمادے۔ وما ذلك على الله بعزيز

بعض حضرات نے مصنف ابن ابی شیبہ کی یہ روایت بھی پیش کی ہے:

((حدثنا وكيع عن مالك بن انس عن يحيى بن سعيد ان عمر ابن خطاب رضي الله عنه امر رجلا يصلي بهم عشرين ركعة .))

''حدیث (بیان) کی ہم سے وکیع نے اس نے امام مالک بن انس سے روایت کی انہوں نے یحیٰی بن سعید سے روایت کی کہ بیشک عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو امر فرمایا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھائیں۔''

لیکن اس روایت کی سند میں یحییٰ بن سعید ہے وہ انصاری ہے اور کتب رجال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سوائے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اور کسی صحابی سے نہیں سنا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تو دور بھی انہوں نے نہیں پایا اور نہ ہی خلفاء راشدین میں سے کسی کا دور پایا۔ لہٰذا ان کے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان واسطہ موجود ہے اور وہ واسطہ معلوم نہیں۔ اس لیے یہ اثر منقطع ہے اور منقطع روایت ضعیف ہوتی ہے اور اس اثر کے منقطع ہونے کو شیخ نیموی حنفی بھی تسلیم کرتے ہیں، دیکھئے آثار السنن۔

لہٰذا ایسے ضعیف آثار سے بات نہیں بن سکتی ہمارا مطالبہ ہے کہ کوئی صحیح اور متصل سند سے اثر پیش کیا جائے جس میں وضاحت ہو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس رکعات پڑھانے کا حکم دیا یا خود بیس رکعات پڑھیں ورنہ ایسے ضعیف اور ناقابل حجت آثار پیش کرنے میں وقت کا ضیاع تو ہوگا لیکن حاصل کچھ نہ ہوگا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حکم:

پھر تیسرے نمبر پر اشتہار میں سنن کبریٰ بیہقی سے یہ روایت نقل کی ہے:

((عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی رضی اللہ عنہ قال دعا القراء فی رمضان فامر منهم رجلا یصلی بالناس عشرین رکعة قال وکان علی رضی اللہ عنہ یوتربهم .))

''کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رمضان شریف میں قاریوں کو بلایا، پھر ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت پڑھاؤ حضرت علی رضی اللہ عنہ انہیں وتر پڑھایا کرتے تھے۔''

افسوس یہ حضرات عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کسی روایت کی سند نقل کرنا بھی گوارا نہیں کرتے کیونکہ اگر سند ذکر کرتے ہیں تو ان کا پول کھل جاتا ہے۔ بہر کیف ہم اس روایت کی سند ذکر کرتے ہیں پھر اس کی سند پر کلام کریں گے جس سے قارئین کرام اندازہ لگالیں گے کہ یہ حضرات کتنا بڑا دھوکا دینے کے عادی ہیں۔

((اخبرنا ابوالحسن بن الفضل القطان ببغداد انبا محمد بن احمد بن عیسیٰ بن عبدك الرازی ثنا ابو عامر عمرو ابن تمیم ثنا احمد بن عبدالله ابن یونس ثنا حماد بن شعیب عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی رضی اللہ عنہ .)) (السنن الکبری: ۲/ ٤٩٦)

اس روایت کی سند میں دو راوی ہیں جن پر کلام ہے (۱) حماد بن شعیب اس راوی کے متعلق ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ ان کے متعلق جو کچھ ائمہ جرح وتعدیل اور نقاد حدیث نے فرمایا ہے وہ ہم کتاب "لسان المیزان" حافظ ابن حجر سے یہاں نقل کر رہے ہیں ناظرین بانصاف ملاحظہ فرمائیں۔

((حماد بن شعیب الحمانی الکوفی عن ابی الزبیر وغیره ضعفه ابن معین وغیره فقال یحییٰ مرة لا یکتب حدیثه وقال البخاری فیه نظر وقال النسائی

ضعيف وقال ابن عدى اكثر حديثه مما لا يتابع عليه...... وقال ابو حاتم ليس بـالـقوى وقال ابو زرعة ضعيف ونقل ابن الجارود عن البخارى انه قال فيه منكر الحديث وفى موضع آخر تركوا حديثه وقال الساجى فيه ضعف .))

(لسان الميزان : ۲/ ۳٤۸)

''حماد بن شعیب حمانی کوفی ابوزبیر وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، امام یحییٰ بن معین وغیرہ نے ان کی تضعیف کی ہے ایک مرتبہ یحییٰ بن معین نے فرمایا کہ اس کی حدیث لکھی بھی نہ جائے اور امام بخاری نے فرمایا اس میں "نـظـر" ہے، امام نسائی نے فرمایا کہ یہ ضعیف ہے اور حافظ ابن عدی نے فرمایا کہ ان کی اکثر حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی متابعت نہیں ملتی اور ابو حاتم رازی نے فرمایا یہ قوی نہیں ہے اور ابوزرعہ رازی نے کہا یہ ضعیف ہے اور ابن الجارود نے امام بخاری سے نقل کیا کہ وہ فرماتے تھے کہ یہ منکر الحدیث ہے اور دوسری جگہ امام موصوف فرماتے ہیں کہ محدثین نے ان کی حدیثوں کو چھوڑ دیا ہے اور امام ساجی فرماتے ہیں کہ اس میں ضعف ہے۔''

مذکورہ بالا ائمہ جرح وتعدیل سے آپ نے معلوم کرلیا کہ کسی نے بھی ان کی تعدیل نہیں کی سب کے سب ان کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کے متعلق "فيه نظر ، منكر الحديث" اور "تركوا حديثه" کے الفاظ فرمائے ہیں۔ فن رجال سے ممارست رکھنے والے اور اصول حدیث کے جاننے والے جانتے ہیں کہ جس راوی کے متعلق امام بخاری "فيه نظر" کہے اس سے حجت پکڑنا جائز نہیں۔

شیخ ابن ہمام حنفی اپنی کتاب التحریر میں لکھتے ہیں:

((اذا قال البخارى للرجل "فيه نظر" فحديثه لا يحتج به و لا يستشهد به و لا يصلح للاعتبار)) (نقل عن تحفة الاحوذى شرح الترمذى، ج ۲/ ۷۵، ملتان)

''جب امام بخاری کسی آدمی کے بارے میں یہ فرمائیں کہ اس میں "نظر" ہے تو اس کی حدیث سے نہ تو حجت پکڑی جاسکتی ہے اور نہ اس سے استشہاد ہی کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی حدیث میں اعتبار کی ہی صلاحیت ہوتی ہے۔''

ناظرین! آپ انصاف کریں کہ ایسے ناکارہ رواۃ کی روایات کو لے کر معرض استدلال میں پیش کرنا صرف ان بریلوی حضرات کا کام ہے جن کی جھولی میں کوئی صحیح دلیل ہے ہی نہیں۔

افسوس!

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اس روایت کی سند میں دوسرا راوی عطاء بن سائب ہے یہ گو ثقہ تھا لیکن آخر میں اس کا حافظہ خراب ہو گیا اور اختلاط کا شکار ہوا، لہٰذا جن رواۃ نے ان سے اختلاط سے قبل روایت سنی وہ حجت ہے لیکن جن راویوں نے اختلاط کے بعد سنی یا جن کے متعلق کچھ پتہ نہیں کہ اس نے ان سے اختلاط سے قبل یہ روایت سنی یا بعد میں تو ایسے راویوں سے جو روایت عطاء سے ہوگی وہ مقبول نہیں ہو سکتی فن رجال کی کتب مثلاً: تہذیب التہذیب وغیرہ میں اختلاط سے قبل جن رواۃ نے عطاء سے حدیث سنی ان کے ناموں میں حماد بن شعیب نہیں ہے، لہٰذا اس نے یا تو یہ روایت عطاء بن السائب سے اختلاط کے بعد سنی ہے یا اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں بہر حال یہ روایت دو وجہ سے سخت ضعیف ہے۔

۱۔ حماد بن شعیب کی وجہ سے جو متروک الحدیث و منکر الحدیث ہے۔

۲۔ عطاء ابن السائب کے اختلاط کی وجہ سے خلاصہ کلام یہ روایت بھی سخت ضعیف ہے، اس کو دلیل میں پیش کرنا جہالت ہے یا تجاہل عارفانہ۔

اللهم اهدنا الى سواء الصراط .

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا:

پھر چوتھے نمبر پر لکھا ہے:

بیہقی نے حضرت ابوالحسناء سے روایت کی:

((ان علی بن ابی طالب امر رجلا ان یصلی بالناس خمس ترویحات عشرین رکعة .))

''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ تو لوگوں کو پانچ ترویحات، یعنی بیس رکعت پڑھائیں۔''

قارئین کرام! اس روایت کے نقل کرنے میں بھی ان حضرات نے بددیانتی کا ثبوت دیا ہے، بیہقی سے روایت تو نقل کی لیکن آخر میں امام بیہقی نے اس روایت کے متعلق جو کچھ لکھا اس کا ذکر نہیں کیا امام موصوف فرماتے ہیں:

((فی هذا الاسناد ضعيف)) (سنن الکبری: ۲/ ۴۹۷)

''اس کی اسناد میں ضعیف ہے۔''

آیئے ہم آپ کو اس کے ضعف کی وجہ بتاتے ہیں:

امام بیہقی کی سند میں ابوسعد بقال ہے جس کا نام سعید بن المرزبان ہے، جو ضعیف بھی ہے اور مدلس بھی ہے اور اس نے اس روایت میں سماع کی تصریح نہیں کی۔ لیکن ابوبکر بن ابی شیبہ کے مصنف میں یہ راوی نہیں ہے بلکہ دوسرا ہے۔ لیکن اس روایت کے ضعیف ہونے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس اثر کا مدار ہر جگہ ابوالحسناء پر ہے وہ غیر معروف ہے اس کے متعلق کچھ بھی پتہ نہیں، اس لیے حافظ ذہبی ان کے متعلق اپنے میزان میں فرماتے ہیں:

"لا یعرف"یعنی یہ راوی ابوالحسناء غیر معروف ہے۔

جب ابوالحسناء کی عدالت کے متعلق کچھ بھی پتہ نہیں تو یہ مجہول الحال ہوا اور جہالت بھی جروح شدید میں سے ہے، لہٰذا اس روایت میں جب ایک غیر معروف اور مجہول الحال راوی موجود ہو تو یہ اثر بھی قطعاً صحیح نہیں ہے اور احتجاج کے درجہ سے ساقط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نیموی حنفی نے بھی اپنی کتاب "آثار السنن: ۲۵۵) کی تعلیق میں تحریر کیا ہے:

"وفی هذا الاسناد ضعف ."یعنی اس کی سند میں ضعف ہے پھر آگے لکھتے ہیں:

((مدار هذا الاثر علی ابی الحسناء وهو لا یعرف .))

اس اثر کا مدار ابوالحسناء پر ہے اور وہ معروف نہیں ہے۔"

ایسے مجاہیل اور غیر معروف رواۃ کے آثار یا روایات سے وہ لوگ دلیل پکڑتے ہیں جن کے پاس صحیح دلیل صفر کے درجہ پر ہو جیسا کہ کہا گیا ہے کہ:

((الغریق یتشبث بالحشیش .))

"جو ڈوب رہا ہو وہ گھانس دیکھتا ہے تو اس پر بھی ہاتھ مارتا ہے تا کہ اس طرح ڈوبنے سے بچ جائے۔"

یزید ابن رومان کی روایت کی حقیقت:

پانچ نمبر پر لکھا ہے کہ:

امام مالک نے یزید ابن رومان سے روایت کی:

((کان الناس یقومون فی زمن عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث وعشرین رکعة .)) (موطا مالك: ۹٦)

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ۲۳ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔"

ہماری گذارش! اس روایت میں یزید ابن رومان ہے جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور نہیں پایا، لہٰذا یہ اثر منقطع ہے اور منقطع روایت ضعیف ہوتی ہے، لہٰذا اس سے استدلال قطعاً صحیح نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نہ تو حکم ہے اور نہ ان کے فعل کا ذکر ہے۔ بلکہ اس میں تو یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں کچھ لوگ بیس رکعات بھی پڑھا کرتے تھے اور اس کے متعلق ہم سیر حاصل بحث مذکورہ بالا صفحات میں کر آئے ہیں اس کی طرف ناظرین مراجعت فرمائیں:

میرے محترم قارئین یہ ہے ان بریلوی حضرات کی کل کائنات میں جس کے بل بوتہ پر ایک لاکھ انعام دینے کا ڈھنڈھورا پیٹا جا رہا ہے اور عوام و جہلاء کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ناپاک سعی کی گئی ہے اور ہم نے بفضلہ تعالیٰ وحسن توفیقہ ان سب کی حقیقت قارئین کرام کے سامنے کھول دی ہے اب انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے۔

مذکورہ بالا تحقیقات سے آپ نے دیکھ لیا کہ ان حضرات کے پاس پانچ حدیثیں تو کیا ایک روایت یا اثر بھی ایسا نہیں جو صحیح اور متصل السند ہو اور اس میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اپنا حکم یا اپنا فعل ہو ایسی کوئی صحیح و متصل روایت پیش نہیں کی گئی۔ محض عوام کو گمراہ کرنے کے لیے یہ چند روایات شدید ضعیفہ اور منقطعہ لکھ دی ہیں اور ان کی اتنی جرات بڑھی کہ سرور کائنات رسول اللہ ﷺ پر ایک گھڑی ہوئی روایت بھی تحریر کر دی اور اللہ تعالیٰ کا خوف بھی ان کو دامن گیر نہ ہوا۔ فانا لله وانا اليه راجعون

امام ترمذی رحمہ اللہ کا قول:

اشتہار میں پھر امام ترمذی کا قول جامع الترمذی سے نقل کیا گیا ہے کہ:

((واكثر اهل العلم على ماروى عن علي وعمر وغيرهما من اصحاب النبي ﷺ عشرين ركعة .)) (تحفة الاحوذی: ۲/ ۷٤)

''اکثر اہل علم بیس رکعات پر عامل ہیں اس بنیاد پر کہ حضرت علی و عمر اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیس کی روایات مروی ہیں۔''

قارئین کرام! اول تو امام ترمذی نے اس جگہ لفظ روی کا استعمال کیا ہے جو فعل ماضی مجہول ہے اور اس لفظ سے ہی اس کا ضعیف و کمزور ہونا نمایاں ہے۔

ثانیا: حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے جتنے آثار مرویہ تھے، ان کی حقیقت ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ ان میں سے ایک بھی صحیح اور قابل حجت نہیں ہے باقی رہے دوسرے صحابہ تو مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک روایت تو ابی بن کعب کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

((كان ابيّ بن كعب يصلي بالناس في رمضان بالمدينة عشرين ركعة و يوتر بثلاث .)) (المصنف لابن ابی شيبة: ۳۹۳/۲)

''ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مدینہ میں لوگوں کو رمضان میں بیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھاتے تھے۔''

لیکن حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ناقل عبدالعزیز بن رفع ہیں دیکھئے ''المصنف'' اور یہ صاحب حضرت ابی کے دور کو نہ پا سکے دیکھئے کتب الرجال التھذیب وغیرہ لہٰذا یہ اثر منقطع ہے اور اس لیے حجت کے قابل نہ رہا اور اس کے منقطع ہونے کا نیموی حنفی کو بھی اعتراف ہے۔ دیکھئے آثار السنن وتعلیقہ: ۳۵۳۔ پھر یہ اثر اس صحیح السند اثر کے بھی خلاف ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم الداری کو امر فرمایا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو گیارہ رکعت پڑھائیں اس صحیح السند اثر کے مخالف ہونے کی وجہ سے یہ منقطع اثر کسی کام کا نہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر:

اسی طرح امام محمد بن نصر مروزی نے اپنی کتاب ''قیام اللیل'' میں یہ اثر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے

روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

((زید بن وهب كان عبدالله بن مسعود يصلي بنافي شهر رمضان فينصرف وعليه ليل قال الاعمش كان يصلي عشرين ركعة ويوتر بثلاث .))

(قيام الليل : ۹۱)

''زید بن وہب فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما رمضان کے مہینہ میں ہمیں نماز پڑھاتے پھر فارغ ہو کر جاتے اور رات ابھی باقی ہوتی۔ اعمش نے کہا، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما بیس رکعت پڑھاتے اور وتر تین رکعات پڑھاتے۔''

اس اثر کے متعلق ہماری گذارشات:

اولاً: تو امام محمد بن نصر نے زید بن وہب سے سند ذکر نہیں کی جب تک زید بن وہب تک بقیہ سند مذکور نہیں ہوتی تب تک اس کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا، یعنی یہ اثر معلق ہے اور معلق بھی ضعیف حدیث کے اقسام سے ہے۔

ثانیاً: یہ بیس رکعت والی بات اعمش (سلیمان بن مہران) کا قول ہے اور اعمش حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے زمانے کو نہیں پا سکا، لہٰذا یہ اثر معلق ہونے کے باوجود منقطع بھی ہے اس لیے حجت کے قابل نہیں رہا۔

محمد بن کعب قرظی کا بیان:

اسی طرح امام ابن نصر نے قیام اللیل میں محمد بن کعب قرظی سے بایں الفاظ ایک اثر نقل کیا ہے:

((قال محمد بن كعب القرظي كان الناس يصلون في زمان عمر بن الخطاب رضي الله عنه في رمضان عشرين ركعة يطيلون فيها القراء ة ويوترون بثلاث .)) (قيام الليل للمروزي: ۹۱)

''محمد بن کعب قرظی نے کہا حضرت عمر کے زمانہ میں رمضان میں لوگ بیس رکعات تراویح پڑھتے جن میں قراءت کو لمبا کرتے اور وتر تین رکعت پڑھتے۔''

اس اثر کے بارے میں بھی **اولاً:** یہ گذارش ہے کہ امام ابن نصر نے محمد بن کعب تک اپنی سند ذکر نہیں کی، لہٰذا یہ اثر معلق ہے۔

ثانیاً: محمد بن کعب قرظی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور ہی نہیں پایا وہ تو (جیسا کہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں ہے) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اخیر میں سن ۴۰ چالیس ہجری کو پیدا ہوا اور حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں ان کے ترجمہ میں لکھتے ہیں ''ولد سنة اربعين على الصحيح'' صحیح بات یہ ہے کہ وہ (محمد کعب بن القرظی) سن ۴۰ چالیس میں تولد ہوا۔

لہٰذا ان کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور پانا ناممکن تھا اس طرح یہ اثر معلق ہونے کے باوجود منقطع بھی ہے، اس لیے

ضعیف ہے۔اس لیے اس کو معرض استدلال میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ بہرصورت ناظرین کرام! آپ نے دیکھ لیا کہ کسی صحابی سے بیس رکعت کا اثر صحیح اور متصل سند سے ثابت نہیں ہوا یہی وجہ ہے کہ امام ترمذی نے اس کے ضعف کی طرف روی (فعل ماضی مجہول) سے اشارہ کر دیا اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ امام ترمذی نے اسی جگہ جامع ترمذی میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ''مدینہ والوں کا عمل چالیس رکعات پر ہے۔''

جس سے معلوم ہوا سب اہل علم کا عمل بیس رکعات پر نہ تھا بلکہ بہت سے چالیس رکعات بھی پڑھتے تھے، لہٰذا بیس رکعات پر اجماع کا قول بالکل باطل ہے۔ خلاصہ کلام اگر بیس رکعات کے پڑھنے کا ثبوت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں ملتا ہے تو چالیس وغیرہ کا بھی ثبوت ملتا ہے، پھر حنفی حضرات کا بیس پر ہی اصرار کوئی معنی نہیں رکھتا امام محمد بن نصر نے ''قیام اللیل'' میں حسن بن محمد بن صباح زعفرانی سے نقل کیا ہے کہ:

((عن الشافعی رایتُ الناسَ یَقُوْمُون بالمدینة تسعا وثلاثینَ رکعة قال وَاَحَب اليّ عِشْرُونَ قَال وکذلك یَقُومُوْنَ بِمَكَّةَ قَالَ وَلَيْسَ فِی شَیءٍ، من هذا ضیق ولاحَدٌّ ینتهی الیهِ لانّه نَافِلَة .)) (قیام اللیل: ۹۲)

''امام شافعی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا میں نے مدینہ میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ انتالیس ۳۹ رکعات پڑھتے ہیں اور امام شافعی نے فرمایا کہ مجھے بیس رکعات پسند ہیں فرمایا اور اسی طرح مکہ معظمہ میں کرتے ہیں یعنی بیس رکعات پڑھتے ہیں اور فرمایا کسی بات میں بھی مضائقہ یا تنگی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی حد بندی ہی کی جاسکتی ہے کیونکہ یہ نفلی عبادت ہے۔''

محترم قارئین! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ رکعات تراویح بیس یا چالیس وغیرہ کے متعلق جو بات ہم نے مذکورہ بالا صفحات میں عرض رکھی تھی امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی وہی بعینہٖ فرمائی ہے: فنعم الوفاق وحبذا الاتفاق

ملا علی قاری حنفی کے بیان پر ایک ناقدانہ نظر:

پھر اشتہار میں ملا علی قاری کی ایک عبارت ان کی کتاب ''شرح وقایہ'' سے نقل کی ہے۔

نوٹ: اشتہار میں تو عبارت میں چند غلطیاں ہیں لیکن ہم نے عبارت کو صحیح کر کے لکھا ہے:

((فصار الاجماع بماروی البیهقی باسناد صحیح انهم کانوا یقومون علی عهد عمر بعشرین رکعة وعلی عهد عثمان وعلی مثله .))

''پھر ہوگیا اجماع بیس رکعات پر اس روایت کی بناء پر جو بیہقی نے صحیح سند سے روایت کی یعنی لوگ حضرت عمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم کے دور میں بیس رکعات تراویح پڑھتے۔''

راقم الحروف عرض پیرا ہے کہ یہ شیخ ملا علی قاری کی فاحش غلطی ہے یا انتہائی سنگین سہو کیونکہ امام بیہقی کی کتابیں، سنن کبریٰ، معرفۃ السنن والآثار وغیرہ ناپید نہیں ہیں، ہر جگہ ہر عالم کے پاس موجود ہیں لیکن ان کی اس روایت میں

کسی کتاب میں بھی "وعلی عهد عثمان وعلی مثله" کے الفاظ ہرگز ہرگز نہیں ہیں ہم ان بریلوی حضرات کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ یہ زائد الفاظ "وعلی عهد عثمان وعلی مثله" امام بیہقی کی ان کتب سے دکھادیں ورنہ اپنی ان افتراپردازیوں سے باز آ جائیں ورنہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کی بڑی بری گرفت ہوگی۔ اور یہی وجہ ہے کہ شیخ نیموی حنفی کو بھی اپنی کتاب آثار السنن: ۲۵۲ کی تعلیق میں اس حق بات کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، چنانچہ لکھتے ہیں:

((لا يخفى عليك ان مارواه السائب من حديث عشرين ركعة قد ذكره بعض اهل العلم بلفظ انهم كانوا يقومون على عهد عمر بعشرين ركعة وعلى عهد عثمان وعلى مثله قوله مدرج لا يوجد في تصانيف البيهقي))

''تم پر مخفی نہ رہے کہ جو روایت سائب (ابن یزید) نے بیس رکعت کے متعلق روایت کی اس کو بعض اہل علم نے اس لفظ سے ذکر کیا ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بیس رکعت تراویح پڑھتے اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی اسی طرح بیس رکعت پڑھتے تھے اور اس لفظ کی نسبت امام بیہقی کی طرف تو یہ الفاظ اصل روایت میں مدرج (داخل) ہو گئے ہیں۔ کیونکہ یہ الفاظ امام بیہقی کی تصانیف میں نہیں پائے جاتے۔''

شیخ نیموی کی عبارت میں بعض اہل العلم سے مراد یہی شیخ علی قاری ہیں۔

بہر کیف یہ عجیب طرف تماشا ہے کہ اپنی طرف ڈھٹائی سے کام لے کر روایت میں خود اپنی طرف سے الفاظ کا الحاق کر کے، پھر میدان بحث ومباحثہ میں آ جاتے ہیں۔

﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ.﴾ (الشعراء: ۲۲۷)

اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بیان میں:

پھر اس روایت سے اجماع کا دعویٰ سراسر لغو اور باطل ہے، ہم اوپر تفصیل سے عرض کر آئے ہیں کہ ایک صحابی سے بھی صحیح ومتصل سند سے بیس رکعات کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ پھر امام شافعی رحمہ اللہ جیسے ثقہ کا بیان گذر چکا کہ اہل مدینہ انتالیس رکعات پڑھتے ہیں پھر خود ہی سوچئے کہ اجماع کہاں رہا۔ نیز چالیس وغیرہ رکعات کا ثبوت بسند صحیح ہم پہلے پیش کر چکے، ہیں لہٰذا اجماع کی بات مجنون کی بڑ کے سوا کچھ نہیں۔

آگے پھر اشتہار میں لکھا ہے، علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((اجماع الصحابة على ان التراويح عشرون ركعة.))

''تمام صحابہ کا اتفاق ہے کہ تراویح بیس رکعت ہیں۔''

اولاً: تو اشتہار چھپانے والوں نے یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ ابن حجر کون سے ابن حجر ہیں اور پھر یہ ''اندھیرے

میں تیر پھینکنے'' کے مصداق ایسے مجہول حوالے علمی شان کے سراسر خلاف ہے ایسے تو جاہلوں کے کرتوت ہوتے ہیں حالانکہ مشتہرین صاحبان تو اپنے آپ کو بڑا عالم ظاہر کر رہے ہیں۔ فیاللعجب والضعیة الادب

ہم بار بار بتا چکے ہیں کہ بیس رکعت کی روایت ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے بھی بسند صحیح و متصل اب تک پیش نہیں کی گئی لہٰذا اثبت العرش ثم انقش کے مطابق پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایسی صحیح سندوں سے اور متصل احادیث پیش کی جائیں، پھر کوئی بات بن سکتی ہے اگر بالفرض کوئی ایک یا دو روایتیں پیش بھی کی جائیں تو اس سے آخر کس طرح اجماع کا ثبوت ملے گا؟

کاش یہ لوگ حقیقت پسندانہ طرز عمل اختیار کرتے تو ان کو اس طرح بلاوجہ ٹامک ٹوئیاں مارنے کی زحمت اٹھانی نہ پڑتی مگر حقیقت پسندانہ طرز عمل بریلوی حضرات کی فطرت ہی میں نہیں ہے۔

بریلوی سوالات کے وہابی جوابات:

پھر اشتہار میں ''وہابیوں سے سوالات'' کے عنوان سے ایک ہیڈنگ لگائی گئی ہے جس کے تحت چند سوالات ہیں:

۱۔ بتاؤ حضرت عمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم نے بیس رکعت کا حکم کیوں دیا؟ کیا اس سنت کی ان کو خبر نہ تھی آج تقریباً چودہ سو سال بعد تم کو پتہ لگا؟

جواب: ہم دلائل سے ثابت کر آئے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس کا حکم ہرگز نہیں دیا بلکہ انہوں نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو گیارہ رکعت پڑھانے کا حکم دیا۔

رہی بیہقی والی روایت تو اولاً تو وہ شاذ ہے۔ ثانیاً اس روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم نہیں ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ ان کے عہد میں کچھ لوگ بیس رکعت پڑھا کرتے تھے اس سے کیسے لازم آیا کہ ان کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا اور صحیح سند سے ہم ثابت کر آئے ہیں کہ صحابہ کے دور میں لوگ چالیس رکعات پڑھا کرتے تھے تو کیا ان کو بھی چالیس کا حکم خلفاء راشدین سے ملا تھا؟ آپ ہوش کی دوا کریں۔ باقی رہے حضرت عثمان وعلی رضی اللہ عنہما تو ہم یہ بدلائل ثابت کر آئے ہیں کہ سائب بن یزید کی روایت میں ''وعلی عهد عثمان وعلی مثله'' کے الفاظ مدرج ہیں جو آپ کے بھائی بندوں نے اس روایت میں اپنی طرف سے بڑھائے ہیں، لہٰذا یہ کوئی دلیل نہیں۔ باقی حضرت علی رضی اللہ عنہ والا اثر جو ابوعبدالرحمٰن السلمی اور ابوالحسناء کے واسطے سے آپ نے لکھا ہے وہ شدید ضعیف ہے تحقیق اوپر گذر چکی، لہٰذا ان سے استدلال صحیح نہیں۔ جب ان تینوں خلفاء راشدین سے بیس رکعت پڑھنے کا حکم ثابت ہی نہیں تو اس کا جواب ہم دیں تو کیا دیں؟

المرام یہ سوال بالکل لغو ہے:

۲۔ دوسرا سوال بھی خلفاء راشدین کے بیس رکعت کے حکم پر مبنی ہے اور ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم سے ایسا حکم قطعاً ثابت نہیں لہٰذا یہ سوال بھی بے کار ہے اور مزید برآں کسی صحیح و متصل سند

سے کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے نام کی تصریح سے بھی ایسی روایت نہ مل سکی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ بیس رکعت پڑھا کرتے تھے، ہاں ان کے دور میں لوگ بیس پڑھتے تھے تو چالیس بھی۔

بہر حال یہ سوال بھی لغو ہے۔

۳۔ تیسرا سوال بھی اسی مفروضہ پر مبنی ہے اور جب بالتحقیق ثابت ہوا کہ یہ مفروضہ صحیح نہیں تو اس پر مبنی سوال بھی کالعدم ہوگیا، ہاں اس سوال میں سیدتنا وامنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اسم گرامی بھی بڑھایا گیا ہے حالانکہ ان حضرات نے ایسی کوئی روایت پیش نہیں کی جس میں یہ ہوتا کہ محترمہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیس رکعت پڑھتی تھیں یا پڑھواتی تھیں یا پڑھنے والوں کو دیکھ کر خاموش رہتی تھیں کیا یہ حواس باختی کا ثبوت نہیں کہ ان حضرات کو جھوٹ بولنے میں اتنا استغراق ہے کہ بموجب دروغ گوراحافظہ نہ باشد ان کو یہ یاد بھی نہ رہا کہ آیا وہ سیدنا صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کوئی روایت اس قسم کی پیش بھی کر چکے ہیں یا نہیں۔ فالی اللہ المشتکی ہاں جب یہ صاحبان اس قسم کی کوئی روایت حدیث کی کتب سے پیش کریں گے تو پھر اس کے جواب کی طرف ہم بھی ان شاء اللہ العزیز متوجہ ہوں گے۔

اسی تیسرے سوال میں پھر حرمین شریفین کے متعلق بھی سوال اٹھایا ہے حالانکہ اس کا جواب ہم پہلے دے آئے ہیں مزید براں یہاں یہ گذارش بھی کی جاتی ہے کہ حرمین شریفین میں سے مدینہ منورہ میں تو چالیس یا انتالیس رکعت پڑھا کرتے تھے جیسا کہ ہم پہلے امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کر آئے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ نقل کرنے میں ثقہ ہیں تو معلوم ہوا کہ ابتداء امام شافعی کے عہد تک مدینہ منورہ میں انتالیس رکعت پڑھی جاتی تھیں یہ بہت بعد کی پیداوار ہے کہ وہاں بھی بیس رکعت کا رواج ہوگیا جو آج تک چلتا رہتا ہے لیکن ہم پہلے یہ تحریر کر آئے ہیں کہ نفلی عبادت پر محققین کے نزدیک حد بندی نہیں کی جاسکتی بشرطیکہ اس کو مسنون اور لازم اور دائمی امر نہ تصور کر لیا جائے اور ہمیں حرمین شریفین کے عوام وخواص وعلماء صلحاء سے یہی حسن ظن ہے کہ وہ گیارہ سے زائد محض نفلی عبادت کے طور پر پڑھتے ہیں اس کو لازمی یا نبی کریم ﷺ کی سنت تصور نہیں کرتے۔ [1]

---

[1] سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم اور عالم اسلام کی ہر دلعزیز شخصیت الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ اپنے موقف کی ترجمانی بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

قیام رمضان کے متعلق کوئی حد متعین نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے اس کے متعلق کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا۔ بس قیام رمضان کے متعلق شوق ہی دلایا ہے اور نہ ہی رکعات کی تعیین کی ہے اور جب آپ ﷺ سے قیام اللیل کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا دو دو پڑھی جائیں، جب صبح کا ڈر ہو تو ایک رکعات پڑھ کر تمام رکعات کو وتر بنا دیا جائے۔ اس سے رکعات کے متعلق توسیع معلوم ہوتی ہے۔ پس جو شخص بیس پڑھ کر تین وتر پڑھتا ہے تو بھی مضائقہ نہیں جیسا کہ دس رکعات اور تین وتر پڑھے، وہ بھی درست ہے اور جو کمی بیشی کرتا ہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن افضلیت نبی کریم ﷺ کے فعل میں ہے۔ آپ ﷺ نے آٹھ رکعت اور تین وتر نہایت خشوع وخضوع سے پڑھے ہیں۔ الخ ⇦⇦⇦

اور جب وہ گیارہ سے زائد رکعات محض تطوعاً پڑھتے ہیں تو ہم انہیں بدعت سیئہ کا مرتکب نہیں سمجھتے اور نہ انہیں بدعتی کہتے ہیں الحمد للہ ہم تو حرمین شریفین کے ائمہ کی اقتداء میں جب بھی حرمین شریفین جاتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے رہتے ہیں اگر ہم ان کو بدعتی سمجھتے تو قطعاً ان کے پیچھے نمازیں نہ پڑھتے یہ تو آپ لوگوں کا شیوہ ہے کہ آئے دن حرمین شریفین کے ائمہ وعلماء اور سعودیہ خاندان کے افراد کے حق میں یاوہ گوئی سے باز نہیں آتے احادیث شریف کا غلط مطلب نکال کر ان کو قرن الشیطان کا مصداق بناتے رہتے ہو آپ کی تحریرات میں ان بزرگوں کے حق میں اتنی بدگوئیاں موجود ہیں کہ ان کو اگر جمع کیا جائے تو ایک کتاب بن جائے۔ اس کے باوجود جب اپنے مطلب کی بات سامنے آئی تو حرمین شریفین کے ائمہ وغیرہم کی طرف سے وکیل بن کر میدان میں آ رہے ہو اور بلا وجہ محض جھوٹ و افترا پردازیوں سے ہم اہل حدیثوں کو ان کی نظروں میں گرانا چاہتے ہو کیا یہی دیانت داری ہے؟ کیا یہی حق پرستی ہے؟ ہمارے دلوں میں حرمین شریفین کے ائمہ وعلماء کی وہ عزت ہے جو آپ کے دلوں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں بلکہ آپ کے دلوں میں تو ان کے لیے ذرہ بھر عزت واحترام نہیں ہے، پھر ان بزرگوں کا آپ نام کیوں لیتے ہیں؟

سوال کے آخر میں جو یہ حدیث لکھی ہے کہ: "اتبعوا السواد الاعظم" تو **اولاً**: یہ حدیث سنداً ضعیف ہے، لہٰذا یہ استدلال کے لائق نہیں۔ **ثانیاً**: اس میں "السواد الاکثر" نہیں ہے تاکہ جہاں زیادہ بھیڑ ہو اس کا پیچھا کیا جائے حالانکہ قرآن کریم فرماتا ہے: ﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (الانعام: ۱۱۶) "یعنی تم اگر زمین میں اکثریت کے پیچھے لگو گے تو وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے بلکہ اس روایت میں "السواد الاعظم" کا لفظ ہے جو صفات اور خوبیوں کی عظمت کی طرف رہنمائی کرتا ہے، یعنی ایسی جماعت کا اتباع کرو جو حقانیت واتباع حق کی صفت میں سب سے بڑھی ہوئی ہو اور یہ صفت بفضلہ تعالیٰ جماعت اہل حدیث پر صادق آتی ہے، کیونکہ یہی جماعت ہے جو کتاب وسنت کے سوا اور کسی کا اتباع نہیں کرتی ان کا اوڑھنا بچھونا کتاب وسنت ہے لہٰذا سواد اعظم بھی جماعت اہل حدیث ہے فالحمد لله على ذالك، خلاصہ کلام ہم

⇐⇐ رمضان المبارک اور قیام اللیل کے مسائل، تالیف: الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ، مترجم: عبدالمالک مجاہد صفحہ ۱۷، ناشر دارالسلام

(۲) سعودی عرب کے ایک اور ممتاز عالم دین فضیلۃ الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الجبرین حفظہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ:

تراویح کی سنت تعداد: سنت یہ ہے کہ گیارہ رکعت نماز دو دو کر کے ادا کی جائے اس لیے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا کہ آپ کی رمضان المبارک میں نماز کیسی تھی تو انہوں نے فرمایا:

((ما كان يزيد فى رمضان ولا فى غيره على احدىٰ عشرة ركعة.))

"اللہ کے رسول ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہ پڑھتے تھے۔" (بخاری ومسلم)

موطا امام مالک میں محمد بن یوسف سے روایت ہے۔ یہ بقیہ ثبت (زیادہ معتبر ہیں، وہ روایت کرتے ہیں سائب بن یزید سے (یہ صحابی ہیں) کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ لوگوں کو گیارہ رکعت نماز پڑھائیں۔

فتاویٰ الصیام، مؤلفین: الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ، الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الجبرین حفظہ اللہ صفحہ ۳۴۔ ناشر: دارالسلام۔

(نعیم)

نے آپ کے ان لغوسوالات کا جواب بھی دے دیا۔

آخر میں ''ہمارا مطالبہ'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل بیکار ہے صحیح بخاری و مسلم اور صحاح ستہ میں رمضان مبارک میں تراویح وغیرہ پڑھنے پر بھی ''قیام'' کا لفظ آیا ہے حتیٰ کہ صحیح حدیث میں بھی یہ الفاظ وارد ہیں "من قام رمضان" یا "من قام ليلة القدر ايمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه" ''لفظ تراویح'' بعد کی پیداوار ہے، لہٰذا اس کو لے کر مطالبہ کرنا طفل تسلی تو ہوسکتی ہے لیکن علمی و تحقیقی میدان میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

آٹھ رکعت تراویح کا ثبوت:

ذیل میں ہم صحیح بخاری وغیرہ سے صحیح حدیث پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ نبی کریم ﷺ رمضان المبارک میں بھی آٹھ رکعت سے زائد نہیں پڑھتے تھے۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے۔

((عن ابی سلمة بن عبدالرحمن قال سالت عائشة رضي الله عنها كيف كانت صلوٰة رسول الله ﷺ فی رمضان فقالت ماكان رسول الله ﷺ يزيد فی رمضان ولا فی غير رمضان على احدى عشرة ركعة .))

''حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں، میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کی نماز رمضان میں کیسی ہوتی تھی (آیا رکعات وغیرہ میں اضافہ کرتے تھے یا نہیں) تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ رمضان خواہ غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔''

اس اصح حدیث سے ثابت ہوا کہ رمضان المبارک میں بھی نبی کریم ﷺ نے آٹھ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھی۔ محقق علماء حنفیہ نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے جیسا کہ حافظ زیلعی نے نصب الرایہ میں، شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں اور سید انور شاہ کاشمیری نے العرف الشذی وغیرہ میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔

بہرحال صحیح بلکہ اصح الاحادیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ رمضان المبارک میں بھی آٹھ رکعت اور تین وتر سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، جب اللہ کے رسول اللہ ﷺ کی سنت صحیحہ معلوم ہوگئی تو دوسروں کا ئنا من کان کے اقوال و افعال کو دیکھنا مومن کامل کی شان سے بعید ہے۔

آٹھ رکعت تراویح کی دوسری دلیل:

دوسری حدیث (۲) امام ابن حبان اپنی صحیح میں یہ حدیث لائے ہیں:

((اخبرنا عبدالله بن محمد الازدی قال حدثنا اسحق بن ابراهيم قال اخبرنا ابوالربيع الزهرانی قال حدثنا يعقوب القمی قال حدثنا عيسیٰ بن جارية عن جابر بن عبدالله قال صلى بنا رسول الله ﷺ فی شهر رمضان ثمان ركعات

و اوتر)) (صحیح ابن حبان : ٥/ ٦٢)

''خبر دی ہم کو عبداللہ ابن محمد ازدی نے اس نے کہا حدیث (بیان) کی ہم سے اسحٰق بن ابراہیم نے انہوں نے کہا خبر دی ہم کو ابو الربیع الزہرانی نے اس نے کہا حدیث (بیان) کی ہم کو یعقوب (ابن عبداللہ) القمی نے اس نے کہا حدیث (بیان) کی ہم کو عیسیٰ بن جاریہ نے اور وہ روایت کرتے ہیں حضرت جابر بن عبداللہ سے وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ماہ رمضان میں آٹھ رکعت تراویح اور وتر پڑھایا۔'' (الحدیث)

اس حدیث کے اور تو سب رواۃ ثقہ وصادق ہیں لیکن عیسیٰ بن جاریہ [1] میں تھوڑا سا کلام ہے۔

اس کی امام ابوزرعہ رازی نے "لا بـــاس بــه" کہہ کر توثیق کی۔ ابن حبان نے اس کو اپنے ''ثقات'' میں ذکر کیا۔

اور یہی روایت بعینہ امام ابن خزیمہ اپنی صحیح میں لائے ہیں ملاحظہ ہو۔ (صحیح ابن خزیمہ ۲/ ۱۳۸)

اور اس سے معلوم ہوا کہ یہ راوی امام ابن خزیمہ کے نزدیک بھی ثقہ ہے۔

یہ صحیح ابن خزیمہ مصطفیٰ اعظمی کی تحقیق سے طبع ہوئی ہے وہ فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں ''اسناد حسن'' یعنی اس کی سند حسن ہے اور اس پر محقق عصر علامہ ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ نے کوئی تعاقب نہ کیا، یعنی اس کو صحیح قرار دیا۔ اسی طرح حافظ ابن حجر اپنی کتاب ''الاصابہ'' میں شریک غیر منسوب کے ترجمہ میں ایک روایت جس کی سند میں عیسیٰ بن جاریہ ہے کے متعلق فرماتے ہیں ''رجالہ ثقات'' اس سند کے سب رواۃ ثقہ ہیں۔

ہاں اس کی چند دوسرے ائمہ مثلاً ابوداؤد، ابن معین ساجی، عقیلی اور ابن عدی نے تضعیف بھی کی ہے لیکن کسی کی جرح مفسر نہیں۔ ایسا راوی جس میں اس طرح ائمہ جرح وتعدیل مختلف ہوں اور جارحین میں سے کسی نے مفسر جرح نہ کی ہو تو وہ راوی حسن الحدیث ہوتا ہے جیسا کہ اصول حدیث سے ممارست رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ "فیه لین" اس میں معمولی کمزوری ہے اور یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں اس سند کے متعلق فرماتے ہیں "اسـنـاد وسط" اس روایت کی اسناد درمیانی ہے۔ (المیزان ترجمہ عیسیٰ بن جاریہ: ۳/ ۳۱۱)

یعنی نہ تو بالکل ضعیف ہے اور نہ اعلیٰ درجہ کی بلکہ درمیانی جس کا ماحصل بھی یہی ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو رمضان المبارک میں آٹھ رکعات تراویح اور وتر پڑھایا۔ اس سے بصراحت باجماعت آٹھ رکعات کا ثبوت ملتا ہے۔

---

[1] عیسیٰ بن جاریہ کے متعلق مفصل معلومات کے لیے دیکھئے انوار مصابیح بجواب رکعات تراویح، مؤلف مولانا نذیر احمد رحمانی اعظمی رحمہ اللہ ص: ۱۱۱-۱۵۲ (نعیم)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت:

۳۔ تیسری حدیث امام ابن حبان اپنی صحیح میں یہ حدیث ذکر کرتے ہیں:

((اخبرنا احمد بن علی بن المثنی قال حدثنا عبدالاعلیٰ بن حماد قال حدثنا یعقوب القمی قال حدثنا عیسیٰ بن جاریة حدثنا جابر بن عبدالله قال جاء ابی بن کعب الی النبی ﷺ فقال یا رسول الله انه کان فی اللیلة شیء یعنی فی رمضان قال وماذاك یا ابی قال نسوة فی داری قلن انا لا نقرا القرآن فنصلی لصلوتك قال فصلیت بهن ثمانی رکعات ثم اوترت قال فکان شبه الرضا ولم یقل شیئا.)) (صحیح ابن حبان: ۵/ ۱۱۱)

''خبر دی ہم کو احمد بن علی ابن المثنیٰ نے اس نے کہا حدیث (بیان) کی ہم کو عبدالاعلیٰ ابن حماد نے اس نے کہا حدیث (بیان) کی ہم کو یعقوب القمی نے اس نے کہا حدیث (بیان) کی ہم کو عیسیٰ بن جاریہ نے اس نے کہا حدیث (بیان) کی ہم کو جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے انہوں نے کہا آئے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس پھر کہا اے اللہ کے رسول آج رات مجھ سے ایک بات ہوئی ہے، یعنی رمضان میں۔ تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: وہ کیا بات ہے۔ اے ابی! ابی بن کعب نے جواب دیا کہ ہمارے محلّہ کی عورتوں نے مجھ سے کہا ہم تو قرآن نہیں پڑھتیں (ہم چاہتی ہیں) کہ آپ نماز پڑھیں ہم آپ کی اقتداء میں نماز پڑھیں پھر میں نے انہیں آٹھ رکعت نماز پڑھائی پھر وتر پڑھا راوی کہتا ہے کہ اس پر نبی کریم ﷺ نے ان سے کچھ نہ کہا اور آپ ﷺ کی خاموشی رضامندی کے مشابہ ہوئی۔''

یہ حدیث بھی حسن ہے اس کے سب رواۃ ثقہ ہیں صرف ایک عیسیٰ بن جاریہ ہے، جس کے متعلق تحقیق دوسری حدیث کی تحقیق میں گذر چکی۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنے محلّہ کی عورتوں کو رمضان میں آٹھ رکعت تراویح اور وتر پڑھایا اور جب یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ خاموش رہے اور صحابی کے اس فعل پر اپنی رضامندی ظاہر فرمائی۔

حضرات احناف بھی اس طرح کوئی واضح حدیث دکھائیں جس میں بیس رکعت تراویح کا ذکر ہو بشرطیکہ وہ حدیث صحیح یا حسن اور متصل ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا امر:

۴۔ چوتھی حدیث موطا امام مالک صفحہ ۹۴ میں یہ حدیث اس سند سے وارد ہے:

((مالك عن محمد بن یوسف ابن اخت السائب عن السائب بن یزید انه

قال امر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ابی بن کعب و تمیم الداری ان یقوما للناس باحدی عشرة رکعة))

''امام مالک محمد بن یوسف سائب بن یزید کے بھانجے سے روایت کرتے ہیں وہ حضرت سائب بن یزید سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم (ابن اوس) داری کو امر فرمایا کہ وہ دونوں لوگوں کو گیارہ رکعت تراویح بمع وتر پڑھائیں۔''

سنداً یہ حدیث بالکل صحیح بلکہ اصح ہے اس میں واضح طور بیان ہوا ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دو صحابیوں ابی بن کعب و تمیم ابن اوس داری کو حکم دیا کہ وہ دونوں لوگوں کو آٹھ تراویح اور تین وتر پڑھائیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا صحیح حکم یہی ہے اس کے سوا کوئی حکم بیس رکعت وغیرہ کے متعلق صحیح اور متصل سند سے ہرگز ہرگز ثابت نہیں ہوا اگر کسی روایت کو صحیح مان لیا جائے تو اس میں بھی لوگوں کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بیس رکعت پڑھنے کا بیان ملے گا لیکن خود سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نہ تو امر اس میں ملے گا اور نہ ہی ان کا خود کا عمل لہٰذا حضرات احناف کو اپنی ضد سے باز آ جانا چاہیے اور فراخ دلی سے تسلیم کر لیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ صرف گیارہ رکعت کا امر وارد ہے بیس یا اس سے زیادہ کا حکم ان سے صحیح طور پر قطعی طور پر وارد نہیں لیکن اب بھی وہ اپنی بیجا ضد پر قائم رہیں تو ان سے اللہ سمجھے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس امر کی روایت محمد بن یوسف سے کرنے میں امام مالک منفرد نہیں بلکہ محمد بن یوسف سے اس روایت کرنے میں یحییٰ بن سعید القطان جو امام الجرح والتعدیل ہیں، نے بھی امام مالک کی متابعت کی ہے، چنانچہ امام ابن ابی شیبہ اپنے ''المصنف'' میں یہ روایت لائے ہیں:

((ثنا ابوبکر (ای ابن ابی شیبة) قال ثنا یحییٰ بن سعید القطان عن محمد بن یوسف ان السائب اخبره ان عمر جمع الناس علی ابیّ و تمیم فکانا یصلیان احدی عشرة رکعة.)) (المصنف: ۲/ ۳۰۱، ۳۹۲)

''امام ابوبکر بن ابی شیبہ فرماتے ہیں حدیث (بیان) کی ہم سے یحییٰ بن سعید القطان نے انہوں نے روایت کی محمد بن یوسف سے کہ بیشک سائب بن یزید نے انہیں خبر دی کہ بیشک سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ابی و تمیم کے پیچھے نماز تراویح پڑھنے کے لیے جمع کر لیا تو وہ دونوں ان لوگوں سے گیارہ رکعات پڑھتے تھے۔''

یہ اسناد بھی نہایت درجہ کی صحیح ہے۔

اسی طرح امام سعید بن منصور نے اپنی سنن میں امام مالک کا متابع ''یعنی محمد بن یوسف سے روایت کرنے میں ''عبدالعزیز بن محمد الدراوردی بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب ''الحاوی للفتاویٰ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

((فانہ رواھا کما رواھا مالك عن عبدالعزیز بن محمد عن محمد بن یوسف شیخ مالك)) (الحاوی للفتاویٰ: ۱/ ۳۵۰)

''کیونکہ بیشک اس نے (یعنی سعید بن منصور نے) بھی اس روایت کو اس طرح روایت کیا ہے جس طرح کہ امام مالک نے روایت کیا وہ (سعید بن منصور) عبدالعزیز بن محمد سے اور وہ محمد بن یوسف سے جو امام مالک کا شیخ ہے یہی روایت کرتے ہیں۔''

اس روایت کے بھی سب رواۃ ثقہ ہیں، لہٰذا صحیح طور پر ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم بن اوس داری کو یہی امر فرمایا تھا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعت تراویح پڑھائیں۔

وھذا ھو الحق فماذا بعد الحق الا الضلال

امام مالک رحمہ اللہ کا محبوب عمل:

ان حضرات کے اجماع کی حقیقت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ علامہ سیوطی اسی کتاب الحاوی میں علامہ جوزی سے اس طرح نقل کرتے ہیں:

((وقال الجوزی من اصحابنا عن مالك انه قال: الذی جمع علیه الناس عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ احب الی وھو احدی عشرۃ رکعة وھی صلوۃ رسول الله ﷺ قیل له احدی عشرۃ رکعة بالوتر؟ قال نعم وثلاث عشرۃ قریب قال ولا ادری من این احدث ھذا الرکوع الکثیر.)) (الحاوی: ۱/۳۵۰)

''جوزی ہمارے اصحاب میں سے (یعنی شافعیہ میں سے) نے فرمایا کہ امام مالک سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے وہی بات محبوب ہے جس پر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا اور وہ ہیں گیارہ رکعتیں اور یہی تعداد رکعات نبی کریم ﷺ کی نماز تھی امام مالک کو کہا گیا گیارہ رکعت وتر کے ساتھ؟ فرمایا ہاں اور تیرہ رکعات بھی اس سے قریب ہیں اور پھر امام مالک نے فرمایا: مجھے معلوم نہیں کہ یہ رکعات کی کثرت کہاں سے ایجاد کی گئی۔''

اس روایت سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ گیارہ یا تیرہ رکعت سے زیادہ رکعات کو امام مالک محدثہ سمجھتے تھے اور ان کو زیادہ محبوب یہی تھا کہ تراویح گیارہ رکعت پڑھی جائیں اور اسی تعداد پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا اور یہی نبی کریم ﷺ کی نماز تھی۔

جب امام مالک جیسی ہستی بھی گیارہ رکعت کو محبوب تر تصور کرتی ہے تو بیس پر اجماع کا قصہ محض ایک افسانہ رہ جاتا ہے اور بس۔

آخری گذارش:

میرے محترم قارئین! الحمدللہ اس احقر العباد نے بریلوی حضرات کے اشتہار کے جملہ مندرجات کا جواب بتوفیق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کافی وشافی دے دیا ہے۔ اور دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ مسنون طریقہ صرف گیارہ رکعات ہیں اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بھی صحیح ومتصل سند سے یہی ثابت ہے کہ انہوں نے گیارہ رکعات کا حکم دیا تھا اور بیس نہیں اب حق وباطل کا امتیاز ہو گیا جو نفوس سعیدہ حق پرست وحق جو یا ہوں گے وہ میری اس تحقیق کو پسند کریں گے اور حق کی ہی اتباع کریں گے۔ ہاں جو اپنی مرغی کی ایک ٹانگ کہے جائیں گے ان کو تو اللہ ہی ہدایت دے سکتا۔

﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشَاوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ (الجاثية: ۲۳)

وما علينا الا البلاغ المبين وهذا آخر ما تيسر لنا فی هذا لمقام والعلم عند الله العلام، وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين وصلى الله علىٰ خير خلقه سيدنا محمد وآله واصحابه اجمعين وبارك وسلم تسليما كثيرا.

❁❁❁❁

باب سوم

تحقیق و تنقید 1

نبی کریم ﷺ کے خون مبارک چوسنے والی روایت پر ربانی صاحب کی نگارشات اور اس کے متعلق ہماری گذارشات

جماعت اہل حدیث کے عظیم محقق مولانا مبشر احمد ربانی صاحب نے ''مجلّہ الدعوۃ'' کے اندر دو روایات کی تحقیق پیش کی تھی تو شاہ صاحب نے ان کی تحقیق پر ایک مفصل مضمون لکھ کر ان کو ارسال فرمایا کہ ان میں سے جو آپ کی دوسری رائے ہے اس سے مجھے اختلاف ہے اور اس اختلاف کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے۔

(الازہری)
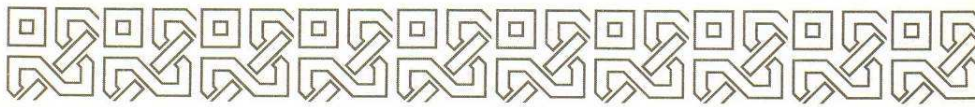
حضرت الفاضل محترم المقام امیر احمزہ (ایڈیٹر ''مجلہ الدعوۃ'')

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ امید ہے کہ مزاج عالی بخیریت تامہ ہوگا۔ امابعد! راقم الحروف ''مجلہ الدعوۃ'' کا بے حد اشتیاق وانہماک سے پڑتا ہے۔ اوراس کے مندرجات مجھے بے حد پسند آتے ہیں۔ اوراس کے ذریعہ جو آں محترم کتاب وسنت کی اشاعت اوران کی صحیح ترجمانی کی جو خدمات عالیہ بجالارہے ہیں ان پر آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ جزاکم اللہ خیرا فی الدنیا والعقبی اللھم آمین

اس وقت خامہ فرسائی کی ضرورت اس لیے پیش آئی ''مجلہ الدعوۃ'' شمارہ نمبر۲ ۱۹۹۲ء میں صفحہ ۱۸ پر ایک صاحب محترم مبشر احمد ربانی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں ماہر القادری کی پیش کردہ روایات پر تنقید فرمائی گئی ہے۔ جہاں تک نبی کریم ﷺ کے بول پینے والی روایت کا تعلق ہے تو وہ یقیناً ضعیف ومنکر ہے اور آپ ﷺ کے خون مبارک کے پینے کے بارے میں جو دوروایتیں پہلے مذکور ہیں یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ اور سنن سعید بن منصور سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی گئی ہے وہ بھی واہی اور منکر ہے۔ لیکن ابن ہشام نے جو روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل فرمائی ہے وہ میرے نزدیک حسن الاسناد ہے اس کو ضعیف قرار دینا تحقیق کے خلاف ہے۔ ابن ہشام کی یہ روایت میں ابن سید الناس کی کتاب ''عیون الاثر ج ۲'' سے نقل کررہا ہوں:

((قال ابن هشام وذكر لى ربيح بن عبدالرحمن بن ابى سعيد الخدرى عن ابيه عن ابى سعيد الخدرى ان عتبة بن ابى وقاص رمى رسول الله ﷺ يومئذ فكسر رباعيته اليمنى السفلى وجرح شيفته السفلى وان عبدالله بن شهاب الزهرى شجه فى وجهه وان ابن قمئة جرح و جنته فدخلت حلقتان من المغفر فى وجنته ووقع رسول الله ﷺ فى حضرة من الحفر التى عمل ابو عامر ليقع فيها المسلمون وهم لا يعلمون فاخذ على بن ابى طالب بيد رسول الله ﷺ ورفعه طلحة بن عبيدالله حتىٰ استوى قائما ومص ملك بن سنان ابو ابى سعيد الخدرى الدم من وجهه ثم ازدرده فقال رسول الله ﷺ من مس دمى دمه لم تصبه النار))

اس میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ابن ہشام نے لفظ ذکر لی سے ربیح بن عبدالرحمن بن ابی سعید الخدری سے سماع کی تصریح کردی ہے۔ اب ربیح بن عبدالرحمٰن بن ابی سعید خدری کا نمبر آتا ہے۔ میری تحقیق میں یہ صدوق ہے۔ تہذیب التہذیب، المیزان وغیرہ میں ابوزرعہ الرازی سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں

نے اسے ''شیخ'' کہا ہے اور یہ بھی توثیق کی آخری مراتب میں سے ہے اور ابوزرعہ رازی جیسے متشدد سے ''شیخ'' کا لفظ صدوق سے کم نہیں۔ پھر امام ابن عدی سے نقل فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا "ارجو انه لا باس به" یہ الفاظ بھی توثیق وتعدیل کے ہیں کمالا یخفی اور ابن حبان نے بھی ان کو اپنی الثقات میں ذکر کیا ہے، لہٰذا یہ راوی کم از کم صدوق ہونا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ التھذیب وغیرہ میں لکھا ہے کہ امام ترمذی نے امام بخاری سے یہ نقل فرمایا ہے کہ وہ ربیع کے متعلق فرماتے ہیں: ''منکر الحدیث'' بلاشبہ یہ الفاظ جروح شدیدہ میں سے ہیں لیکن میرے نزدیک ربیع کے متعلق ان الفاظ کے اطلاق کی نسبت امام والا مقام بخاری رحمہ اللہ کی طرف صحیح نہیں ہے کیونکہ امام موصوف رحمہ اللہ کی کتاب التاریخ الکبیر کے جلد ۴، ق ۲، ص ۳۰۲۔۳۰۳ پر ربیع بن عبدالرحمٰن کا ترجمہ موجود ہے۔ لیکن اس میں یہ الفاظ ''منکر الحدیث'' بالکل نہیں ہیں۔ یہ بات امام ترمذی نے سہواً کہہ دی ہے۔ ان کی سہوؤں کی اور بھی امثلہ ہیں۔

لگے ہاتھوں ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ امام ترمذی علل کبیر ۱/۵۴۲ پر فرماتے ہیں: ((سالت محمد (ای البخاری) عن علقمه بن وائل هل سمع من ابیه؟ فقال انه ولد بعد موت ابیه بستة اشهر)) اب پھر امام ترمذی اپنی علل کبیر کے ۲/۶۱۹ میں فرماتے ہیں: امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: ((عبدالجبار (ای ابن وائل بن حجر) لم یسمع من ابیه ولد بعد موت ابیه)) تو کیا یہ صحیح ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں ہی فرزند اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ خصوصاً علقمہ کے متعلق بستة اشهر کے الفاظ کو مدنظر رکھ کر آپ فیصلہ فرمائیں کہ کیا یہ دونوں قول صحیح ہوسکتے ہیں؟ حالانکہ ان دونوں قولوں کی نسبت امام ترمذی امام بخاری کی جانب ہی فرما رہے ہیں۔ اب لازمی طور پر ان دونوں قولوں میں سے ایک غلط یا سہواً ہوگا ادھر جب التاریخ الکبیر للامام بخاری کو دیکھتے ہیں تو وہ علقمہ کے متعلق تصریح فرماتے ہیں کہ "سمع اباه" لہٰذا صحیح قول یہی ہے اور علقمہ نہ بلکہ عبدالجبار ان کا بھائی اپنے والدؓ کی وفات کے بعد تولد ہوا غالباً یہی وجہ ہے کہ علل کے دوسرے جز میں امام ترمذی نے یہی قول (یعنی عبدالجبار کا والد کی وفات کے بعد تولد) نقل کر کے پہلی جزء میں جو سہواً قول نقل کیا تھا اس کی تلافی کر دی۔ امام بخاری کی جانب ان الفاظ منکر الحدیث کے غلط انتساب کی ایک دوسری مثال۔ التھذیب وغیرہ میں مؤمل بن اسماعیل (جو صحیح ابن خزیمہ میں وضع الیدین علی الصدر والی حدیث کے راوی ہیں) کے متعلق لکھا ہے کہ امام بخاری نے انہیں ''منکر الحدیث'' قرار دیا ہے حالانکہ یہ غلط ہے یہی وجہ ہے کہ علماء اہل حدیث خصوصاً علماء عصریہ۔ مثلاً مولانا فیض الرحمٰن الثوری، مولانا ارشاد الحق الاثری وغیرہما نے اس کا نوٹس لیا اور اس انتساب کو غلط قرار دیا ہے کیونکہ التاریخ الکبیر امام بخاری میں مؤمل بن اسماعیل کے متعلق ''منکر الحدیث'' کے الفاظ بالکل نہیں ہیں۔ ہاں مؤمل بن اسماعیل کے متصل مؤمل بن سعید کا ذکر ہے اس کے بارے میں امام والا مقام فرماتے ہیں ''منکر

الحدیث'' جلد۴، ق۲، ص۴۹ گو ناسخ کی نظر ابن اسماعیل کا ترجمہ لکھتے وقت نظر ابن سعید پر جاپڑی اور جو الفاظ ان کے متعلق لکھتے تھے وہ ابن اسماعیل کے ترجمہ میں ٹھونس لیے۔ فیاللعجب

بہر حال آپ نے دیکھا کہ حافظ ابن حجر تک موسیٰ بن اسماعیل کے متعلق ''منکر الحدیث'' کے الفاظ کا انتساب امام بخاری کی طرف کرتے آئے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہ تھا اب امام والا مقام کی کتاب التاریخ الکبیر نے فیصلہ کر دیا کہ موسیٰ بن اسماعیل نہیں بلکہ موسیٰ بن سعید ''منکر الحدیث'' ہیں لا یضل و لا ینسی یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شان ہی ہے انسان کتنا ہی بڑا صاحب علم وفضل ہو کتنے بڑے مرتبہ ومقام پر فائز ہو لیکن اس سے بہر حال نسیان، خطا، سہو اور غلطیاں صدور میں آتی رہی ہیں اور آتی ہی رہیں گی۔ اسی طرح زیر بحث راوی کے متعلق جب خود امام بخاری کی کتاب التاریخ الکبیر میں یہ الفاظ (منکر الحدیث) نہیں ہیں تو صحیح بات یہی ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ سے سہو ہو گیا ہو گا اور جب ایسا ہے تو تین ائمہ حدیث۔ ابوزرعۃ رازی، ابن عدی وابن حبان کی توثیق بحال رہی اس لیے یہ راوی کم از کم صدوق وحسن الحدیث ہیں۔ حافظ ابن حجر نے التقریب میں انہیں ''مقبول'' لکھا ہے لیکن یہ انہوں نے جو امام بخاری کے الفاظ منکر الحدیث نقل فرمائے ہیں ان کے لحاظ سے ان کو مقبول کہا ہے لیکن جیسا کہ ہم ثابت کر آئے ہیں کہ یہ انتساب امام بخاری کی طرف صحیح نہیں، لہٰذا صحیح یہی ہے کہ یہ راوی (ربیح بن عبدالرحمٰن) صدوق ہے۔ واللہ اعلم

ربیح کے بعد ان کے والد عبدالرحمٰن بن ابی سعید خدری ہے اور یہ ثقہ ہے دیکھئے التھذیب والتقریب۔ اس کے بعد حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ صحابی ہے۔ بہر کیف یہ سند حسن ہے کم نہیں ہے۔ لہٰذا یہ واقعہ صحیح وثابت ہے۔ حضرت مالک بن سنان والد حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے چہرہ مقدس کا خون مبارک چوسا اور پھر اس کو نگل لیا۔ ایک روایت میں اس طرح بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا کہ یہ خون جو تو نے چوسا ہے اس کو زمین پر پھینک دو لیکن انہوں نے فرمایا اللہ کی قسم میں اس کو زمین پر نہیں پھینکوں گا اور اس کو نگل لیا۔ یہ اس صحابی رضی اللہ عنہ کی نبی کریم ﷺ سے بے انتہاء محبت وتعظیم واحترام کی وجہ سے ہوا یعنی انہوں نے سوچا آپ ﷺ کا خون مبارک کلی کر کے زمین پر کیسے پھینک دوں اس لیے اسے اپنے پیٹ میں ہی بھیج دیا۔ اس قسم کی احترام وتعظیم کی وجہ سے جو امر کی انحرافی (بظاہر) نظر آتی ہے وہ گناہ نہیں سمجھی جاتی بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کو ذلت ولغزش ہی کہا جاسکتا ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار نے اصرار کیا کہ محمد (ﷺ) کے آگے رسول اللہ کی بجائے ابن عبداللہ لکھا جائے اس پر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ (جو کتابت کر رہے تھے) سے فرمایا کہ ''رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا ڈالو۔ لیکن انہوں نے اپنے ہاتھ سے ان الفاظ کو مٹانا مناسب نہ سمجھا اور نہ ہی ان کو مٹایا۔ پھر آپ ﷺ نے خود کاغذ لے کر اس سے یہ الفاظ مٹا ڈالے۔ آپ سوچیں کیا اس واقعہ میں حضرت

علی رضی اللہ عنہ کا آپ ﷺ کے امر سے انحراف ہوا یا نہیں؟ یقیناً ہوا لیکن نہ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو ڈانٹا اور نہ ہی کسی قسم کے غصہ کا اظہار فرمایا کیوں؟ اس لیے کہ یہ امر کی انحرافی ایمان کامل وعقیدہ راسخہ نبی کریم ﷺ کے اللہ کے سچے رسول ہونے پر مبنی تھی بس...... یہی وجہ یہاں بھی تصور فرمالیجئے۔ مضمون نگار نے یہ اچھی ستم ظریفی کی کہ خون اور پیشاب کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اگر آپ نے خون یا پیشاب پینے سے جنت کی خوشخبری دی ہوتی تو پھر کون بدنصیب ہوگا جو جنت کا آرزو مند نہ ہو...... محترم نے یہ نہ سوچا کہ پیشاب کو نجس العین ہے دراں حالیکہ خون نجس العین نہیں ہے اگر یہ نجس العین ہوتا تو مسلمان زخموں سے خون بہنے کے باوجود نمازیں نہ پڑھتے رہتے کیونکہ ان کے کپڑے تو خون سے ضرور شرابور ہوگئے ہوں گے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ذکر فرمایا ہے اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک اور روایت بھی ذکر کی ہے کہ دو آدمیوں کو آپ ﷺ نے ایک جگہ پر متعین فرمایا تھا ایک نوافل پڑھنے کے لیے کھڑے ہوگئے دور سے دشمن نے تیر تین مرتبہ پھینکے جو اس صحابہ رضی اللہ عنہم کو جا لگے اور ان سے خون کافی بہا حتیٰ کہ جو صحابی سویا ہوا تھا گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ واقعہ آپ ﷺ کو بھی ضرور معلوم ہوا ہوگا اگر ان کی نماز نہ ہوئی ہوتی تو آپ انہیں اس پر متنبہ فرماتے۔ بہرحال خون نجس العین نہیں۔ لہٰذا اہل حدیث وغیرہ محققین کا مسلک صحیح یہی ہے کہ خون لگے کپڑوں میں نماز ہو جاتی ہے اور اس کے بہنے سے (صحیح مسلک کی رو سے) وضو بھی نہیں ٹوٹتا۔ ہاں اس (خون) کا کھانا و پینا حرام ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا خون مبارک اس سے مستثنیٰ ہو اور یہ آپ ہی کی خصوصیات میں سے ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ مسجد میں تھوکنا یا بلغم نکال کر پھینکنا یا ناک کی غلاظت کو مسجد میں پھینکنا گناہ ہے۔ حالانکہ قریش کے ایلچی نے صلح حدیبیہ کے موقع پر خود دیکھا (جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہے) کہ آپ ﷺ جب تھوکتے تھے تو وہ بھی کسی صحابی کے ہاتھی یا بازو پر پڑتی تھی اور جب وضو فرمایا تو اس کے پانی (جس میں آپ کی مضمضہ والا پانی اور ناک کی غلاظت بھی شامل تھی) کو لوگوں نے پیا اور اپنے چہروں وغیرہ پر مل دیا۔ بہرحال یہ خصوصیت نبی کریم ﷺ کی تھی ورنہ اگر ہم میں سے کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کے منہ تو کیا ہاتھ پاؤں پر ہی تھوک دے تو وہ اس چراغ پا ہونے سے نہیں رہ سکتا۔

اگر مضمون نگار اللہ کے رسول ﷺ کے خون مبارک کو خصوصیت کا فائدہ دینے کے لیے بھی تیار نہ ہوں تو یہ زیادہ سے زیادہ اس صحابی رضی اللہ عنہ کی ایک لغزش ہوئی جو بے حد محبت اور تعظیم عقیدت مندی سے صدور میں آئی جو بہرحال قابل عفو و درگزر رہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ صحابی بعد میں اسی جنگ احد میں شہید بھی ہوگیا اور شہید کے سب گناہ خون کے قطروں کے گرنے سے پیشتر ہی معاف ہو جاتے ہیں، چنانچہ مستند کتب سیرت سے معلوم ہوتا ہے جب نبی کریم ﷺ زخمی ہوگئے اور کفار زور لگا رہے تھے کہ کسی نہ کسی طرح وہ اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچ

جائیں اور انہیں شہید کر دیں اور یہی وہ وقت ہے یہ مالک بن سنان آپ ﷺ کا خون مبارک چوس کر نگل گیا۔ اسی طرح حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی اس موقعہ پر آپ ﷺ کے پاس تھا بعد میں کفار کا زور دیکھ کر وہ ان کی طرف لپکے اور یہ دونوں صحابی مالک بن سنان اور مصعب بن عمیر شہید ہو گئے اب اتنی بات کو مضمون نگار صاحب نے بتنگر بنا دیا اور ایک طوفان اٹھالیا چہ خوش! اور پھر اس طرح گل افشانی فرماتے ہیں، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بدر جہا متمنی اور بشدت کے آرزومند تھے پھر آخر ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ ارشاد سن کر آپ کا خون اور پیشاب پینے کی تمنا نہ کی۔ آخر کیوں؟ مضمون نگار صاحب اتنا بھی سوچنے کی زحمت نہ اٹھا سکے کہ خون پینے کی تمنا آخر کی بھی کیسے جاتی ہے کیا خون بھی ہر وقت پیشاب کی طرح بہتا رہتا ہے؟ انا لله وانا اليه راجعون

باقی رہا پیشاب تو وہ وقتاً فوقتاً بہتا رہتا ہے لیکن وہ نجس العین ہے لہٰذا اس کے پینے کی تمنا کون کرے گا؟ اور جو روایت پیشاب کے پینے کے بارے میں ہیں وہ واقعتاً ضعیف ومنکر ہیں لہٰذا اس کو خون کے ساتھ ملا کر جو نتیجہ مضمون نگار صاحب نے نکالا ہے میں اس پر کسی تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں اہل علم وانصاف خود فیصلہ فرما لیں۔ آگے پھر ص ۲۱ کالم ۳ پر رقمطراز ہیں: باقی صحابہ اسلام کے دور میں یہ خون پینے والے نہ تھے۔ ورنہ آپ کا خون ہی پی کر آپ کا بھی خون کر دیتے'' انا لله وانا اليه راجعون

مضمون نگار کی یہ نگارشات ان کے علمی شان سے بمراحل بعید ہیں۔ گستاخی معاف! میں تو اس کو ان کے ہفوات میں شمار کروں گا۔ یہ تو ایک اتفاقی واقعہ ہوا تھا جس میں آپ ﷺ مجروح ہوئے تھے، اور خون بھی کافی بہا تھا اور اس لیے ایک صحابی نے اسے چوسا اور زخم کو صاف کیا اور وہ چوسا ہوا خون مبارک زمین پر تھوکنے کی طرح پھینکنے سے گریز کرتے ہوئے نگل گیا اور چونکہ محبت واحترام اور تعظیم کی وجہ سے ہوا تھا اس لیے آپ نے یہ فرمایا ''من مس دمی دمه لم تصبه النار'' اس میں گو لفظ ''من'' عام ہے لیکن اصل مقصود اس سے وہی مالک بن سنان مراد ہے کیونکہ سیاق وسباق اس پر دال ہے لہٰذا اس کو عموم کا رنگ دے کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ کے خون کے پیاسے بنا دینا یا ایسے الفاظ تحریر فرمانا جس کا مفہوم بہر حال یہی ہے ایک ایسی عجیب جسارت ہے جس کا توقع محترم مضمون نگار سے نہ تھا اگر آپ اس کے عموم پر مصر ہیں تو یہ تب صادق آتا جب کہ دوسرے مرتبہ بھی خدانخواستہ کوئی ایسا واقعہ پیش آتا اور آپ ﷺ اتنے زخمی ہوتے کہ اسی طرح (جنگ احد کی طرح) خون بہنے لگتا پھر کوئی صحابی پینے کی تمنا کرتا۔ لیکن نہ ایسا کوئی واقعہ پیش آیا اور نہ ہی ایسی وہمی آرزو کی ضرورت ہوئی۔ یہ مضمون نگار نے انتہائی بے انصافی کی ہے ایک اتفاقی واقعہ کو عمومی رنگ دے کر خود ہی ایک مفروضہ بنایا پھر لگے اعتراض کرنے۔ فیاللعجب

ولضيعة الادب غلط بات پر بیشک تنقید فرمایئے اور ضرور فرمایئے کیونکہ اس میں حق کا اظہار ہے لیکن اس

کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ایک صحیح وثابت واقعہ کو محض اپنے ایک مفروضے کی بنا پر غلط قرار دے کر اس پر بے جا اعتراضات کیے جائیں اور اس میں آدمی اتنا دور تک نکل جائے کہ عدل وانصاف کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ میں خوامخواہ تنقید کا عادی نہیں ہوں لیکن اگر کوئی ناگریز صورتحال پیدا ہو جاتی ہے تو اس پر مجبوراً قلم اٹھاتا بھی ہوں۔

مراد ما نصیحت بود گفتیم
حوالت با خدا کردیم رفتیم

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين وصلى الله على سيدنا محمد وآله واصحابه وبارك وسلم،

وانا احقر العباد اخوكم
ابو القاسم محب الله شاه عفى الله عنه
١٤١٣/ ٢٨/ ١٤١٣هـ
٩٢/ ١١/ ٢٤ء

اتحاف السادة الكرام
بتحقيق
ان اول صلوة المسبوق هو ما ادركه مع الامام

مسبوق کی امام کے ساتھ رکعت پہلی ہے یا وہی جو امام پڑھ رہا ہے؟

اتحاف السادة الكرام بتحقيق ان اول صلاة المسبوق هو ما ادركه مع الامام،
یعنی مسبوق کی امام کے ساتھ رکعت پہلی ہے یا وہی جو امام پڑھ رہا ہے؟

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ جمہور کا موقف ہے کہ مسبوق (بعد میں آنے والا نمازی) امام کو جس رکعت میں بھی پائے وہ اس کی اول رکعت ہوگی اور یہی مسلک سلف خلف علماء کا ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے مقلدین اس طرف گئے ہے کہ مسبوق کی نماز کا وہ حصہ جو امام کے ساتھ اس کو ملا ہے وہ اس کی نماز کا آخری حصہ اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد جو کچھ وہ ادا کرے گا وہ اس کی اول نماز ہے۔

اس مسئلہ کی اہمیت کی وجہ سے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر ایک سیر حاصل بحث کی اور عقلی ونقلی دلائل سے جمہور کے مسلک کو راجح قرار دیا ہے۔ بقول شیخ ارشاد الحق صاحب حفظہ اللہ یہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس پر مستقل مقالہ رقم فرمایا ہے، ورنہ ہر ایک نے جزوی طور پر بحث کی ہے۔ (الازہری)

نحمده ونصلى على رسوله الكريم .

امابعد! آج کل اس مسئلہ پر خاصی بحث کی جا رہی ہے کہ مسبوق امام کے ساتھ جس رکعت میں شامل ہوتا ہے وہ اس کی پہلی رکعت شمار ہوگی یا جو رکعت امام پڑھ رہا ہے؟

جمہور کا مسلک یہ ہے کہ مسبوق نے امام کو جس رکعت میں بھی پایا وہ اس کی اول رکعت ہی سمجھی جائے گی، اس پر ایک وہ حدیث بھی ہے، جسے محدثین کرام نے مختصراً ومفصلاً روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ صبح کی نماز میں کسی ضروری کام کی وجہ سے دیر سے پہنچے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔ ایک رکعت پڑھا چکے تھے نبی اکرم ﷺ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ دوسری رکعت میں ملے۔ آپ نے ایک رکعت عبدالرحمٰن بن عوف کی اقتداء میں ادا کی اور سلام پھیرنے کے بعد دوسری رکعت پڑھی۔ اکثر وبیشتر احادیث میں ہے کہ آپ نے اتمام کیا۔ بلکہ ایک روایت میں اس طرح بھی ہے کہ آپ نے آخری رکعت پڑھی جو واضح اور ٹھوس دلیل ہے کہ بقیہ نماز آخری ہے اول نہیں ہے۔ نیز اس کے لیے اور بھی بہت سے دلائل کتب احادیث میں مل سکتے ہیں۔

اس مسئلہ کی اہمیت کی پیش حضرت علامہ ابوالقاسم السید محب اللہ شاہ صاحب راشدی متعنا اللہ بطول حیاتہ نے "اتحاف السادة الكرام بتحقيق ان اول صلوٰة المسبوق هو ما ادركه مع الامام" رسالہ لکھا جس میں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مسبوق جس رکعت میں شامل ہوتا ہے وہ اس کی پہلی رکعت ہوگی۔ نیز مصنف علام نے اس رسالہ میں معترضین کے اعتراضات کے مدلل جوابات بھی دیئے ہیں۔ فجزاه الله خير الجزاء

اہل علم حضرات سے استدعاء ہے کہ حضرت علامہ موصوف کے اس رسالہ کا بغور مطالعہ کریں تاکہ حق مسئلہ معلوم ہو جائے۔

الراقم الاثیم محمد ایوب صابر حفظہ اللہ

الحمد لله الذى يسبح له فى بيوته بالغدو والآصال رجال لا تلهيهم من ذكره تجارة ولا بيع فى حال من الاحوال . فهم يعمرون مساجد الله دائبين ويتمون ما فاتهم من الاعمال والصلوٰة والسلام على سيد نا محمد خاتم النبيين وصاحب لواء الحمد فى يوم لا بيع فيه ولا خلال ، الذى علم عبادالله كيفيات عبادات ربهم وهنيئا تها فلم يبق لاحد كائنا من كان فيها بحال للقيل ولا شىء من القال: وعلى آله واصحابه الذين سبقونا بالايمان واتبعوا اسو ة النبى الامى فى العبادات والمعاملات وفى جميع الاقوال

والافعال: فهم السابقون بالخيرات باذن الله فحصل لهم رضوانه وفازوا بالنعيم المقيم الذی لا نفاد له ولازوال۔ امابعد!

سلف سے لے کر عصر حاضر تک اس مسئلہ میں اختلاف چلا آ رہا ہے کہ مسبوق کو جس قدر نماز امام کے ساتھ ملی، آیا وہ اس کی آخری نماز ہے یا اول؟

جمہور محدثین وفقہاء، (جیسا کہ فتح الباری سے ظاہر ہوتا ہے) کا یہی مسلک ہے کہ مسبوق نے جتنی نماز امام کے ساتھ پڑھی یہ اس کی اول نماز ہے اور امام شافعی، امام ابن المنذر، امام بیہقی، حافظ ابن حزم، حافظ ابن حجر رحمہم اللہ اور سلف وخلف کے جمہور علماء اسی طرف گئے ہیں لیکن بعض محدثین اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اس کے مقلدین اس طرف گئے ہیں کہ مسبوق کی نماز کا وہ حصہ جو امام کے ساتھ اس کو ملا ہے وہ اس کی نماز کا آخری حصہ ہے اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد جو کچھ وہ ادا کرے گا وہ اس کی اول نماز ہے۔ راقم الحروف نے بھی اس مسئلہ کے متعلق تحقیق کی ہے۔

متقدمین ومتاخرین کی کتب دیکھیں طرفین کے دلائل پر غور وتدبر کیا اور بالآخر حق الیقین کے درجہ پر واضح ہوگیا کہ اس مسئلہ میں صحیح مسلک وہی ہے جو جمہور محدثین وغیرہم کا ہے لہٰذا محض احقاق حق کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توفیق سے قلم اٹھایا اور یہ رسالہ تحریر کرنا شروع کر دیا۔ واسئل الله تعالیٰ ان يوفقنی لاتمامها كما وفقنی بفضله للشروع فيها وهو حسبی ونعم الوكيل.

جمہور کے مسلک کے دلائل:

۱۔ صحیح بخاری وکتب حدیث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((سمعت رسول الله ﷺ يقول: اذا اقيمت الصلوٰة فلا تا توها تسعون ايتوها تمشون عليكم السكينة فما ادركتم فصلوا وما فاتكم فاتموا)) [1]

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرماتے تھے کہ جب نماز کی اقامت ہو تو تم دوڑتے ہوئے مت آیا کرو (بلکہ) اپنے معمول کے مطابق چلتے ہوئے آیا کرو تم سکون وآرام کو لازم کرلو پھر جس قدر نماز کو پہنچ جاؤ وہ پڑھ لو اور جو حصہ فوت ہو جائے اس کو پورا کرو۔''

امام بیہقی رحمہ اللہ اور دوسرے محدثین کرام نے اسی حدیث سے زیر بحث مسئلہ پر استدلال کیا ہے۔

---

[1] سنن الكبرى للبيهقی: ۲/ ۲۹۷.

اس حدیث سے وجہ استدلال:

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ نماز کے لیے آرام وسکون سے آیا کرو، پھر جتنا حصہ امام کے ساتھ مل جائے وہ تو ان کے ساتھ پڑھ لو اور جس قدر فوت ہو گیا ہو اس کو پورا کرو۔

حدیث میں "فاتموا" کا لفظ آیا ہے جس کی معنیٰ حافظ ابن حجر وغیرہ شراح حدیث نے "فاکملوا" سے کیا ہے یعنی فوت شدہ حصہ کو کامل یا پورا کرو۔

اور اسی سے ہی حافظ صاحب نے فتح الباری میں اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسبوق امام کے ساتھ جس قدر نماز پڑھ سکا وہ اس کی اول نماز ہوگی۔ اس لیے کہ یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کو کمال تک پہنچانا یا اس کو پورا کرنا اسی وقت متصور ہو سکتا ہے، جب اس کی ابتداء ہو۔ اور جس کی ابتداء ہی نہیں ہے اس کو پورا کرنا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ﴾ (المائدة: ٣)

''آج میں نے تمہارے لیے دین کامل کر دیا۔''

اس آیت سے پیشتر بھی دین کافی نازل ہو چکا تھا یعنی اس اکمال سے پیشتر دین کے نزول کی ابتداء ہو چکی تھی اور اس آیت کریمہ سے اس کے کامل ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔

﴿وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّةَ....﴾

یعنی روزوں کی تعداد پوری کرو۔ اس سے قبل اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بیمار ہو یا سفر پر ہو (اور روزہ چھوڑ دے) تو ان چھوڑے ہوئے روزوں کی گنتی دوسرے دنوں میں پوری کر لو۔ اب اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

١۔ رمضان مبارک کے ابتداء ہی سے مرض وغیرہ کی وجہ سے روزے نہیں رکھے تو جب دوسرے دنوں میں روزہ رکھے گا تو لامحالہ اس کی ابتداء ہوگی اور پھر جب گنتی پوری ہو جائے گی تو روزوں کی گنتی کامل ہو جائے گی۔

٢۔ ابتداء میں تو روزے رکھے لیکن بعد میں مریض ہو گیا اس لیے روزے ترک کر دے تو اس صورت میں بھی جب دوسرے دنوں میں رہے ہوئے روزے پورے کرے گا تو گنتی پوری ہو جائے گی۔ بہر حال دونوں صورتوں میں ابتداء ہے۔

اس طرح حدیث صحیح میں آتا ہے کہ "فاکملوا العدة ثلاثین" پھر مہینہ کی گنتی پوری تیس کرو۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی ماہ کی ابتداء ہے اور آخری تیسویں دن کو پورا کرنے کا حکم ہے۔

اسی طرح لفظ "اتمام" پر بھی غور فرمائیں۔

قرآن حکیم میں جہاں کہیں ''اتمام'' اور اس کے مشتقات وارد ہیں وہاں ان کے دو ہی معانی بن سکتے ہیں۔

أ: کسی چیز کو ابتدا سے شروع کر کے پورا کرنا۔

ب: جس چیز کا ابتدائی حصہ گزر چکا ہو اس کو پورا کرنا۔

لیجئے چند امثلہ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ ﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ الآیة (البقرة: ۱۹٦) اور حج و عمرہ کو پورا کرو۔ یعنی ان کو شروع کر کے پورا کرو۔

۲۔ ﴿وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ﴾ الآیة (یوسف: ٦) یعقوب علیہ السلام اپنے فرزند یوسف علیہ السلام کو فرماتے ہیں کہ تم پر بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی نعمت پوری کرے گا جیسا کہ اس سے پیشتر وہ تمہارے دادوں، ابراہیم واسحاق علیہما السلام پر پوری کر چکا ہے اور اس سے قبل یہ الفاظ ہیں کہ ﴿وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ....﴾ اور اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ تجھے اپنے لیے منتخب کرے گا اور تجھے تاویل الاحادیث کی تعلیم دے گا۔

گو جو نعمت اجتباء اور تعلیم تاویل الاحادیث سے شروع ہوئی اس کو پورا فرمائے گا۔

۳۔ ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ (البقرة: ۱۸۷) یعنی جو روزہ طلوع فجر سے پہلے رکھ چکے ہو اس کو طلوع فجر کے بعد رات آنے تک پورا کرو۔

۴۔ ﴿وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ (المائدة: ۳) یعنی جس طرح اپنے دین کو نازل فرما کر تمہارے لیے کامل کر دیا تم پر اپنی نعمت بھی پوری کر دی۔

۵۔ ﴿وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ﴾ (البقرة: ۱۵۰) یعنی جس طرح تحویل قبلہ وغیرہ کے ساتھ میں نے تم پر نعمت کی ہے تم پر اس نعمت کو پورا کرنا چاہتا ہوں۔

٦۔ ﴿وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ (البقرة: ۱۲٤) یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام کے رب نے چند باتوں سے ان کو آزمایا تو انہوں (ابراہیم) نے وہ سب باتیں پوری کر دیں۔

۷۔ ﴿وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ﴾ (التوبة: ۳۲) یعنی یہ یہود ونصاریٰ اور کفار چاہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نور کو اپنے دہنوں سے گل کر دیں (لیکن) اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے انکار کرتا ہے اور وہ اپنے نور (وحی، ذکر، دین) کو پورا کر کے رہے گا۔

اور سورۃ الصف میں "والله متم نوره" آیا ہے اور ماحصل ایک ہی ہے۔

۸۔ ﴿رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا﴾ (التحریم: ۸) "اس سے پیشتر یہ ہے کہ قیامت کے دن انبیاء کرام علیہم السلام اور جو ان پر ایمان لائے ان کے آگے اور دائیں ان کے ساتھ ان کا نور چلتا رہے گا، تو مومنین یہ دعا کریں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر۔ الخ

یعنی نور تو ان کے ساتھ ابتداء ہی سے تھا لیکن اس کے اتمام کی دعا کی۔

ان امثلہ اور ان جیسی دوسری امثلہ پر غور کرنے سے واضح طور پر معلوم ہوگا کہ ان سب میں مذکورہ بالا دو معانوں میں سے کوئی معنیٰ ہے۔ یعنی یا تو کسی چیز یا امر یا عمل کو شروع کر کے اس کو پورا کرنے کا حکم ہے یا اس کا ابتدائی حصہ ہے اور آخری حصہ کو پورا کرنے کا حکم ہے، کسی ایک جگہ بھی یہ لفظ (اتمام) اس معنیٰ میں نہیں آیا کہ کسی عمل کا آخری حصہ ہو اور اس کے ساتھ اس کے ابتدائی حصہ کو ملا کر پورا کرنے کی معنیٰ میں وارد ہوا ہو۔

پھر ہمارے بعض کرم فرما بزرگوں نے جو اس لفظ (فاتموا) سے یہ معنیٰ نکالی ہے کہ اس آخری حصہ نماز کے ساتھ اس کا ابتدائی حصہ لگا کر اس کو پورا کرو یہ انتہائی زبردستی ہے اور اس پر مستہزاء ستم ظریفی یہ کہ ان بزرگوں نے یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ ''آخر'' تو نسبی امور سے ہے۔ آخر تو وہ ہوتا ہے، جس کا اول ہوا گر ان حضرات کے کہنے کے مطابق مسبوق کو جو حصہ نماز امام کے ساتھ ملا ہے وہ آخری ہے تو لامحالہ اس سے قبل اس کا اول بھی ہونا لازمی ہے، بغیر اول کی موجودگی کے آخر کا تصور بھی مشکل ہے اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ اول تو اس کا فوت ہو گیا اور وہ ہے ہی نہیں تو پھر یہ آخر کیسے بنا؟

بہرحال امام بیہقی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے لفظ ''فاتموا'' سے یہی سمجھا ہے کہ مسبوق جس حصہ نماز کو امام کے ساتھ ادا کر چکا ہے وہ اس کا اول حصہ ہے اور مزید براں مخالفین نے بھی اس لفظ ''فاتموا'' کی معنیٰ ہرگز وہ نہیں کی جو آج کل کے بزرگ اس سے زبردستی استخراج کر رہے ہیں بلکہ وہ اپنے موقف پر دوسرے لفظ ''فاقضوا'' وغیرہ سے استدلال کرتے ہیں (اس کا جواب آگے آرہا ہے ان شاءاللہ تعالیٰ) لہٰذا ہم عصر بزرگون کا اپنے موقف پر اس لفظ ''فاتموا'' سے استدلال صحیح نہیں۔ رہی یہ بات کہ بعض روایات میں ''فاتموا'' کی جگہ ''فاقضوا'' وغیرہ آیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسبوق کی نماز کا اول حصہ نہیں ہے جس کو قضا کرنے کا حکم ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام بیہقی رحمہ اللہ سنن الکبریٰ: ۲/ ۲۹۷ سے لے کر ۲/ ۲۹۸ تک اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری: ۲/ ۱۱۸ سے ۲/ ۱۱۹ تک (طبع دار نشر الکتب الاسلامیۃ لاہور پاکستان) میں تفصیل سے یہ وضاحت فرما دی ہے کہ جن روایات میں لفظ ''فاتموا'' آیا ہے وہ بہت زیادہ ہیں اور جن میں ''فاقضوا'' آیا ہے وہ بہت تھوڑی ہیں اور قاعدہ یہی ہے کہ جو لفظ بہت قلیلہ روایات میں وارد ہے اس کو اس لفظ کے مطابق بنایا جائے جو اکثر روایات میں وارد ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ مخرج ایک ہو اور یہاں یہی بات ہے۔ لہٰذا اس قاعدہ کے مطابق ہمیں لفظ ''فاقضوا'' کو لفظ ''فاتموا'' کے مطابق بنانا چاہیے اور اس کی ایسی معنیٰ کی جائے جو ''فاتموا'' کے ساتھ جمع ہو جائے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں:

((اذا كان مخرج الحديث واحدا واختلف فى لفظة منه وامكن رد

الاختلاف الی معنی واحد کان اولی وھذا کذلك لان القضاء وان کان یطلق علی الفائت غالبا لکنه یطلق علی الاداء ایضا ویرد بمعنی الفراغ کقوله تعالی "فاذا قضیت الصلوٰة فانتشروا" ویرد بمعان اخر فیحمل قوله فاقضوا علی معنی الاداء او الفراغ فلا یغایر قوله فاتموا فلا حجة فیه لمن تمسك بروایة فاقضوا علی ان ما ادرکه الماموم هو آخر صلواته...... بل هو اولها وان کان آخر صلوٰة امامه لان الآخر لا یکون الاعن شیء تقدمه)) ۲/۱۱۹.

''جب کہ حدیث کا مخرج ایک ہی ہے اور اختلاف اس کے صرف ایک لفظ میں ہے اور اس اختلاف کو ایک ہی معنیٰ کی طرف راجع کرنا ممکن بھی ہو تو یہی اولیٰ وانسب ہے (یعنی دونوں کا معنیٰ ایک ہی کیا جائے گا) اور یہاں ایسا ہی ہے کیونکہ لفظ قضاء اگرچہ اس کا اطلاق غالباً فوت ہو جانے والے پر ہوتا ہے، لیکن اس کا اطلاق ادا کرنے پر بھی ہوتا ہے اور فارغ ہو جانے کے معنیٰ میں بھی وارد ہوتا ہے جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے ''جب نماز (جمعہ) ادا ہو جائے یا اس سے فراغت ہو جائے تو تم زمین میں منتشر ہو جاؤ'' اس کے سوا اور معانی بھی اس کے آتے ہیں (تو یہاں بھی) فاقضوا کو ادا کرنے یا فارغ ہو جانے کے معنیٰ پر حمل کیا جائے گا۔ تو اس (فاقضوا) کی (فاتموا) سے مغایرۃ نہ رہے گی۔ لہٰذا اس لفظ فاقضوا میں اس آدمی کے لیے حجت نہ ہوگی جو اس لفظ سے متمسک ہو کر یہ کہتا ہے کہ جو کچھ مقتدی کو امام کی نماز سے ملا ہے وہ اس کی آخر نماز ہے...... بلکہ (جو حصہ نماز کا امام کے ساتھ اس کو ملا ہے) وہ اس کی نماز کا اول ہے اگرچہ امام کی یہ آخر نماز ہے۔ کیونکہ آخر ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس سے پہلے کوئی چیز نہ ہو۔''

تھوڑی سی وضاحت: حافظ صاحبؒ نے "فاقضوا" کو اس کی معانی میں سے ایسی معنیٰ پر محمول فرمایا جس سے وہ "فاتموا" کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے لیکن "فاتموا" کی ایسی معنیٰ نہیں کی جس سے وہ "فاقضوا" کی اس معنیٰ کے ساتھ جمع ہو جائے جس میں اس کا اطلاق غالباً ہوتا ہے یہ کیوں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی دو وجہ ہیں:

۱۔ قضاء کے تو ایسے معانی آتے ہیں جن کے لینے سے یہ لفظ اتمام کے ساتھ آسانی سے جمع ہو جاتا ہے لیکن اتمام کی ایسی معنیٰ نہیں ملتی جو قضاء کی اغلبی معنیٰ کے ساتھ جمع ہو سکے۔ چنانچہ اس کے امثلہ اوپر گزر چکے لہٰذا اگر فاتموا کو زبردستی وہ معنیٰ پہنانے کی سعی کی جائے گی تو لامحالہ اس میں دوراز کار تاویلیں کرنی پڑیں گے جو ہرگز مناسب نہیں یا فاتموا کو مرجوح قرار دے کر اس کو بالکلیہ ترک کر کے۔ "فاقضوا" ہی کو لے لیا جائے، حالانکہ یہ سراسر قلب حقیقت ہے اس لیے کہ مرجوح تو لفظ "فاقضوا" ہے کیونکہ وہ بہت قلیلہ

روایات میں وارد ہے اور ان روایات میں سے بعض پر تو محدثین نے کلام کیا ہے چنانچہ امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "التمییز" میں سفیان بن عیینہ کی زہری سے روایت (جس میں فاقضوا ہے) پر ابن عیینہ کے وہم کا حکم لگایا ہے ملاحظہ ہو سنن الکبری للامام البیہقی اور فتح الباری للحافظ ابن حجر۔

اس طرح یہ روایات اقل قلیل رہ جاتی ہیں اور اس کے برعکس جن روایات میں "فاتموا" کا لفظ ہے وہ اکثر ہیں لہٰذا اگر ترجیح کی طرف ہی جانا ہے تو "فاتموا" والی روایات کو ترجیح دی جانی چاہیے تھی اور "فاقضوا" والی روایات کو مرجوح قرار دے کر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ علاوہ ازیں یہ طریقہ محدثین کے طرز عمل کے خلاف ہے کیونکہ ان کے یہاں ترجیح کی طرف تو تب ہی رجوع کیا جاتا ہے جب ان مختلف الفاظ میں جمع وتطبیق کی کوئی صورت نہ بنتی لیکن فیما نحن فیہ میں جمع وتطبیق بآسانی وباحسن وجوہ ممکن ہے کما مر تو ترجیح کے اختیار کرنے کی ضرورت ہی کب ہے؟

۲۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ جو لفظ تھوڑی روایات میں وارد ہو اس کو اس لفظ کے مطابق بنایا جاتا ہے جو روایات کثیرہ میں وارد ہے کیونکہ ایک دو رواۃ سے وہم بھی ہو جاتا ہے لیکن بڑی جماعت سے یہ احتمال کافی بعید ہوتا ہے۔ بس یہی وجہیں ہیں کہ حافظ صاحب رحمہ اللہ نے "فاقضوا" کی وہ معنیٰ اختیار کی ہے جو سہولت کے ساتھ "فاتموا" کی معنیٰ سے جمع ہو جاتی ہے۔ فلله دره

خلاصہ کلام: اس مرفوع اور صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ امام کے ساتھ جتنا کچھ حصہ نماز مقتدی کو مل گیا وہ اس کی اول نماز ہے گو امام کی وہ آخر ہے یہی وجہ ہے کہ محدثین مثلاً امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر اس طرح باب منعقد فرمایا ہے "باب ما ادرك من صلوة الامام فهو اول صلوٰته"

ملحوظہ! مخالفین حضرات کی جانب سے اپنے موقف پر دلیل کے طور پر "فاقضوا" والی روایت کے سوا کوئی اور مرفوع صحیح حدیث پیش نہیں کی گئی یا کم از کم ہمیں دوسری صحیح مرفوع روایت کا علم نہیں ہو سکا۔

اب ہماری جانب سے دوسری دلیل ملاحظہ فرمائیں۔

دلیل نمبر ۱: صحیح مسلم اور نسائی شریف میں صحیح سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت مروی ہے۔ یہاں یہ روایت ہم نسائی شریف مع التعلیقات السلفیہ سے نقل کر رہے ہیں:

((عن انس انه قال كان رسول الله ﷺ يصلى بنا اذجاء رجل فدخل المسجد وقد حفزه النفس فقال الله اكبر الحمد لله حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه))(الحدیث: ۱/۱۰۷)

"حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک آدمی آیا پھر مسجد میں داخل ہوا اس حال میں کہ اس کا سانس پھولا ہوا تھا (تو صف میں پہنچ کر) اللہ اکبر (تکبیر تحریمہ کہہ کر) الحمد لله حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه کہا" الحدیث

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ اس آنے والے صحابی رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ (الحمد للہ الخ) کو بطور دعا استفتاح والی دعا کے پڑھا یہی وجہ ہے کہ اس حدیث پر امام نسائی رحمہ اللہ اس طرح عنوان منعقد فرماتے ہیں:

"نوع آخر من الذكر بعد التكبير"

یہی روایت امام مسلم رحمہ اللہ بھی اپنی صحیح میں لائے ہیں اور اس پر باب اس طرح منعقد فرمایا ہے:

"باب ما يقال بين تكبيرة الاحرام والقراءة" [1]

صحیح مسلم میں فدخل الصف (پھر صف میں داخل ہوا) کے الفاظ بھی ہیں۔ اور استفتاح کے الفاظ ''الحمد للہ حمدا کثیرا'' الخ سے شروع ہوتے ہیں جس سے واضح ہوگیا کہ نسائی والی روایت میں جو اللہ اکبر کے الفاظ ہیں وہ نماز میں دخول کے لیے بطور تکبیر تحریمہ تھے، جیسا کہ ہم نے ترجمہ میں بین قوسین اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس حدیث سے زیر بحث مسئلہ پر استدلال کی تشریح:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابی رضی اللہ عنہ نے صف میں داخل ہوتے ہی مذکورہ الفاظ بطور دعاء استفتاح پڑھے چونکہ یہ الفاظ جہراً پڑھے تھے اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ الفاظ کس نے کہے، پڑھنے والے نے جب بتایا کہ میں نے پڑھے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا درجہ وفضیلت اجر وثواب تو بیان فرمایا لیکن دعاء استفتاح کے پڑھنے سے منع نہ فرمایا۔ اور ظاہر ہے کہ دعاء استفتاح پہلی رکعت ہی میں پڑھی جاتی ہے اگر بعد میں آنے والے مقتدی کو جو نماز امام کے ساتھ ملی ہے وہ اس کی اول نماز نہ ہوتی تو آنے والا آتے ہی صف میں داخل ہو کر یہ دعاء نہ پڑھتا۔

یہی وجہ ہے کہ جو بعد میں آنے والے مقتدی کی نماز کو آخر نماز قرار دینے والے دعا استفتاح بعد میں جب پہلی رکعت قضاء کرے گا تو تب یہی پڑھنے کا حکم دیتے ہیں لہٰذا چونکہ آنے والے صحابی رضی اللہ عنہ نے نماز میں داخل ہوتے ہی (دعاء استفتاح) پڑھ لی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اس کو اول نماز سمجھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو بحال رکھا۔

حدیث میں یہ استفصال نہیں ہے کہ یہ رکعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کونسی رکعت تھی لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ رکعت آنے والے صحابی رضی اللہ عنہ کی پہلی رکعت تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آنے والا وہ صحابی رضی اللہ عنہ آتے ہی نماز میں داخل نہ ہو جاتا بلکہ منٹ آدھا منٹ غور وفکر کرتا تاکہ معلوم ہوجائے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کونسی رکعت ہے جب یقین ہو جاتا کہ یہ پہلی رکعت ہے تو دعاء استفتاح پڑھتا حالانکہ ایسا نہیں ہوا وہ مسجد میں داخل ہوتے ہی صف میں پہنچ گیا اور ابھی سانس پھولا ہوا تھا کہ یہ دعا پڑھ لی جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آنے والے کی ملی ہوئی نماز اول ہی شمار کرتے تھے۔ یا پھر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرماتے کہ تم نے آتے ہی نماز میں داخل ہو کر دعاء

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووی ١/ ٢١٩ طبع اصح المطابع کراچی.

استفتاح کیوں کر پڑھی اور یہ بھی نہ سوچا کہ ہماری یہ اول رکعت ہے یا دوسری یا تیسری وغیرہ ہے۔

لہٰذا بارگاہ رسالت کا صحابی کی طرف عمل کو بحال رکھنا اس پر کچھ بھی مواخذہ نہ کرنا یا اس کی تصحیح کی طرف توجہ نہ دینا اس پر دال ہے کہ آنے والے کی اول نماز وہی ہوتی ہے جس کو آتے ہی ملا ہے علاوہ ازیں جو حضرات مقتدی کی اس نماز کو آخر نماز قرار دیتے ہیں ان پر دو محذور لازم آتے ہیں۔

أ: باہر سے آدمی آیا دیکھا کہ امام کھڑا ہے یعنی قیام اول میں ہے اب اس آنے والے کو کیسے معلوم ہو کہ یہ امام کی کونسی رکعت ہے پہلی ہے یا دوسری وغیرہ اس کا حل لامحالہ یہ حضرات ان کو یہ بتائیں گے کہ تم اجتہاد کرو پھر جس پر یقین ہو اس کے مطابق کرو اب ضروری ہے کہ اس مقتدی کو آدھا منٹ یا کم وبیش ٹائم اس اجتہاد میں لگے، اس اجتہاد میں اس کو۔ ہو سکتا ہے کہ اتنا وقت لگ جائے کہ امام رکوع میں چلا جائے اور اس کی رکعت فوت ہو جائے حالانکہ یہ رکعت اگر ان کی پہلی رکعت یا اول نماز ہوتی تو سوچنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی بلکہ وہ فوراً نماز میں داخل ہو کر چھوٹی سی دعاء استفتاح مثلاً وہ دعاء جو اس حدیث میں مذکور ہے پڑھ کر سورۃ فاتحہ پوری کر لے گا اور اس کو رکعت مل جائے گی لیکن ان حضرات کے کہنے کے مطابق رکعت کے فوت ہو جانے کے اندیشہ کے علاوہ اس سے نبی کریم ﷺ کے ارشاد مبارک سے بھی انحراف لازم آئے گا۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ تم جس حالت میں مجھے ملو اس میں شامل ہو جاؤ اگر میں قائم ہوں تو تم بھی قیام کرو اگر میں راکع ہوں تو تم بھی رکوع میں داخل ہو جاؤ اگر ساجد ہوں تو تم بھی سجدہ میں شامل ہو جاؤ۔ لہٰذا آنے والا جب مسجد میں آیا تو امام کو قیام کی حالت میں دیکھا لہٰذا اس کو اسی وقت اس قیام میں داخل ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس کے برعکس یہ حضرات اس کو امر کریں گے کہ تم اجتہاد کرو پھر جو صورت حال نظر آئے اس طرح کرو لہٰذا یہ بیچارہ کچھ سوچتا رہا اور امام رکوع میں چلا گیا اس طرح اس کی رکعت بھی فوت ہوئی اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول اکرم ﷺ کے ارشاد مبارک سے انحراف بھی اس کو لازم آیا۔

ب: ان حضرات کے کہنے پر عمل کرنے سے کئی بار مسنون طریقہ کے خلاف نماز پڑھنی لازم آئے گی، ان حضرات کے موقف پر مسنون طریقہ یہ ہے کہ دعاء استفتاح کو اس رکعت میں پڑھے جو امام کے سلام پھیرنے کے بعد قضاء کرے۔ لہٰذا اگر کوئی مقتدی آتا ہے اور امام کو قیام میں پاتا ہے اس نے سوچا اور یہی سمجھا کہ یہ اول رکعت امام کی ہے اس لیے اس نے دعاء استفتاح پڑھی حالانکہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ امام کی دوسری یا تیسری رکعت تھی۔ یا اس نے یہ سمجھا کہ یہ امام کی دوسری وغیرہ رکعت ہے اس لیے اس نے دعاء استفتاح نہ پڑھی بعد میں معلوم ہوا کہ یہ امام کی رکعت اولیٰ تھی تو اس طرح اس سے دعاء استفتاح مسنونہ فوت ہو گئی۔ اور یہ دونوں صورتیں ان حضرات کے موقف پر غیر مسنونہ طریقہ پر واقع ہیں۔ یہ

دونوں محذور لازمی طور پر پیش آئیں گے۔ اس تحقیق سے قارئین کرام اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ آنے والے کی اول نماز وہی ہوگی جو آتے ہی اس کو مل گئی ہے کیونکہ اس طرح اس قسم کے محذور لازم نہیں آئیں گے۔ واللہ اعلم

دلیل نمبر ۳: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں:

((واستدل ابن المنذر لذلك ايضا على انهم اجمعوا على ان تكبيرة الافتتاح لا تكون الافى الركعة الاولى)) (۲/ ۱۱۹)

''امام ابن المنذر نے جمہور کے مسلک پر اس سے بھی دلیل لی ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ افتتاح (شروع کرنے) کی تکبیر نہیں ہوتی مگر پہلی رکعت میں۔''

توضیح: نماز میں داخل ہونے کے لیے بموجب حدیث صحیح "تحریمها التکبیر" یہ ضروری ہے کہ تکبیر کہی جائے اور اس پر اجماع ہے کہ یہ افتتاحی تکبیر پہلی رکعت ہی میں ہوتی ہے لہٰذا اس سے بھی معلوم ہوا کہ بعد میں آنے والے کی اول نماز وہی ہوتی ہے جس کو آتے ہی پالیا ہے اس پر مستزاد یہ بھی ہے کہ جو حضرات جمہور کے مسلک کے خلاف ہیں وہ بھی نماز میں داخل ہونے کے لیے افتتاحی تکبیر بھی کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ہاتھ بھی اٹھاتے ہیں فرض کیجئے جس وقت بعد میں آنے والا مقتدی نماز میں داخل ہوا اس وقت امام دوسری رکعت میں تھا تو یہ حضرات یہی فرماتے ہیں کہ اس آنے والے کی بھی یہ دوسری رکعت ہے اور یہ حضرات بھی نماز کی ابتداء، رکوع کو جاتے وقت، رکوع سے سر اٹھانے کے بعد اور تیسری رکعت میں کھڑے ہونے کے بعد رفع الیدین کے قائل ہیں دوسری یا چوتھی میں رفع الیدین کے قائل نہیں ہیں پھر یہاں دوسری یا چوتھی رکعت میں رفع الیدین کیوں؟ یہ رکعت تو ان کے ہاں پہلی ہے ہی نہیں لہٰذا انہیں چاہیے کہ ایسی حالت میں دوسری یا چوتھی رکعت میں رفع الیدین بالکل نہ کریں اور صرف اللہ اکبر کہہ کر نماز میں داخل ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ایسی حالت میں بھی انہیں اجتہاد کرنا پڑے گا کہ یہ رکعت امام کی کونسی ہے آیا پہلی یا تیسری ہے تو رفع الیدین کریں اگر دوسری یا چوتھی ہے تو نہ کریں پھر اس اجتہاد کے باوجود اگر انہوں نے پہلی یا تیسری رکعت سمجھ کر رفع الیدین کیا لیکن وہ دوسری یا چوتھی رکعت نکلی تو ان کا یہ فعل (ان کے ہاں بھی) غیر مسنون طریقہ پر ہوا۔ اگر انہوں نے دوسری یا چوتھی سمجھ کر رفع الیدین نہ کیا اور وہ نکلی پہلی یا تیسری تب بھی ان کا یہ فعل مسنون طریقہ کے خلاف ہوا اس سے ان کو کوئی مفر نہیں۔

ثانیاً: اگر وہ دوسری اور چوتھی رکعت میں رفع الیدین کے قائل بھی نہیں ہوتے اور بعد میں آنے والے کی نماز کے اس حصہ کو جو آتے ہی اس کو امام کے ساتھ ملا آخری بھی کہتے رہیں اور ساتھ ہی امام کے دوسری اور چوتھی رکعت میں داخل ہوتے وقت رفع یدین کے قائل اور فاعل بھی بنے رہتے ہیں تو وہ عجیب وغریب تناقض میں مبتلا ہیں۔ واللہ الموفق

مزید برآں امام کی رکعت معلوم کرنے کے لیے جولحہ اجتہاد میں صرف کریں گے اس سے جو محذور لازم آئے گا وہ مذکورہ بالا صفحات میں تحریر کر آیا ہوں۔اس کے بجائے اگر ہم بعد میں آنے والے کی اول نماز وہی قرار دیں جوآتے ہی اس کو مل گئی ہے۔تو ان محذورات میں سے کوئی لازم نہیں آئے گا۔واللہ اعلم

دلیل نمبر ٤: مسبوق کو جو کچھ حصہ نماز امام کے ساتھ ابتداء ملا ہے اگر وہ آخری ہے تو اس کو اپنی رہی ہوئی نماز قضاء کرنے کے بعد تشہد (التحیات) کے اعادہ کی ضرورت نہ ہوتی۔حالانکہ نماز کے آخر میں تشہد ان پر ہر حال میں واجب ہے اور جمہور کے مخالف یہ حضرات بھی تشہد وغیرہ پڑھ کر ہی سلام پھیرتے ہیں اور یہ بھی عجیب تناقض ہے اس لیے کہ یہ تشہد وہ اس لیے پڑھتے ہیں کہ نماز کو ختم اس کے سوا کیا ہی نہیں جا سکتا۔تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس وقت سلام پھیرتے ہیں وہ ان کی نماز کا آخر ہوا ادھر ساتھ ہی یہ رٹ بھی لگاتے جاتے ہیں کہ جی نہیں! یہ حصہ اس کی اول نماز ہے۔فیاللعجب

اگر وہ یہ کہیں کہ ہے تو یہ اس کی اول نماز لیکن ہم تشہد اس لیے پڑھتے ہیں کہ سلام سے پہلے تشہد ضروری ہے، لیکن یہ دلیل بھی تام نہیں کیونکہ ایسی صورتیں ہیں کہ نماز میں سلام سے پہلے ان میں تشہد نہیں ہے۔مثلاً مصلی کو نماز میں سہو ہو گیا اس نے تشہد وغیرہ پڑھا اور پھر سلام سے پہلے دو سجدے سہو کے دیئے پھر بلا تشہد سلام پھر دیا (یہی صحیح مسلک ہے) اگر کہا جائے کہ یہاں تو تشہد پہلے کر چکا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس تشہد اور سلام کے درمیان دو سجدے متخلل ہو گئے، لہٰذا تشہد کا پھر اعادہ کرنا چاہیے تھا۔

دوسری مثال سا ہی نے سلام پھیر کر پھر سجدے سہو کے دیئے تو اس صورت میں بھی اکثر محدثین یہی فرماتے ہیں کہ اس کو بھی دو سجدے دے کر بلا تشہد سلام پھیر دینا چاہیے کیونکہ سلام پھیر کر پھر سجدے سہو کے ادا کرنے والی اکثر روایات میں تشہد کا ذکر نہیں ہے صرف ایک روایت میں تشہد کا ذکر ہے لیکن اکثر محدثین نے اس پر شذوذ کا حکم لگایا ہے (دیکھئے تحفۃ الاحوذی شرح احادیث سجود السہو) لہٰذا جو مسبوق کی نماز جو اس نے قضا کی ہے اول قرار دیتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اس قعدہ میں تشہد نہ پڑھیں کیونکہ ان کی تشہد والی آخری رکعت تو گذر چکی یہ اول ہے اس میں تشہد کیسا؟

میں پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ جمہور کے خلاف مسلک رکھنے والے (ہمارے ناقص علم کے مطابق) سوائے اس روایت کے جس میں لفظ "فاقضوا" وارد ہے اور جس کے بارے میں مذکورہ بالا صفحات میں بحث گذر چکی ہے کوئی دوسری مرفوع حدیث اپنے موقف کے اثبات میں پیش نہیں کرتے ہاں کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کے آثار اور کچھ دوسری باتیں اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ذیل میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توفیق سے ان سب باتوں کا جواب ہم دے رہے ہیں۔ملاحظہ فرمائیے۔

اس سلسلہ میں پہلا اثر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مصنف ابن ابی شیبہ ١/٣٢٤ سے دو سندوں سے نقل کیا

جاتا ہے۔

پہلی سند والی روایت میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ہیں:

((ما ادركت مع الامام فهو آخر صلواتك))

''جو حصہ نماز کا تجھے امام کے ساتھ ملے وہ تمہاری آخری نماز ہے۔''

لیکن یہ روایت منقطع ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ نقل کرنے والے ابراہیم نخعی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کو تابعین کے طبقہ خامسہ (پانچویں) میں شمار کیا ہے جن کو ایک دو صحابہ کے سوا کسی سے ملاقات بھی حاصل نہیں ہے اور رجال کی سب کتب اس پر متفق ہیں کہ ابراہیم نخعی کا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں ہے لہٰذا جب سند میں انقطاع ہے تو یہ روایت ضعیف ہے۔

دوسری سند سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول اس طرح مروی ہے:

((اجعل آخر صلواتك ما ادركت من صلواتك)) [1]

''(امام کے ساتھ) جتنا حصہ نماز تجھے مل جائے اس کو تم اپنی نماز کا آخری حصہ بناؤ۔''

یہ روایت بھی دو علتوں کی وجہ سے ضعیف ہے۔ (۱) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے راوی محمد بن سیرین ہے اس نے ۱۱۰ ہجری میں وفات کی اور اس وقت اس کی عمر ۷۷ برس کی تھی۔ [2] اس حساب سے ابن سیرین کی ولادت ۳۳ ہجری بنتی ہے۔ اور فن رجال کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ۳۲ یا ۳۳ میں وفات پائی، لہٰذا ابن سیرین کا ان سے ملنا ناممکنات میں سے ہے۔ بہر کیف اس روایت میں ایک علت تو انقطاع کی ہے دوسری علت یہ ہے کہ ابن سیرین سے راوی قتادہ ہیں اور وہ تیسرے مرتبہ کے مدلس ہیں اور یہاں روایت عن سے کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہ سند انقطاع اور تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے لہٰذا اس سے استدلال صحیح نہیں۔ اس کے معارضہ میں ہم، جید سند سے اسی مصنف ابن ابی شیبہ سے ہی ایک روایت نقل کرتے ہیں۔ ص: ۴۹۰ پر ایک روایت اس طرح ہے:

((حدثنا ابومعاوية عن الاعمش عن ابراهيم قال ادرك مسروق وجندب ركعة من المغرب فلما سلم الامام قام مسروق فاضاف اليها ركعة ثم جلس وقام جندب فيها جميعا ثم جلس فى آخرها فذكر ذلك لعبد الله فقال كلاهما قد احسن و افعل كما فعل مسروق احب الى))

''ابراہیم نخعی فرماتے ہیں: مسروق اور جندب کو نماز مغرب کی امام کے ساتھ صرف ایک رکعت ملی جب

---

[1] مصنف ابن ابی شیبة: ۲/ ۳۲٤. [2] التهذيب ۹/ ۲۱٦.

امام نے سلام پھیرا تو مسروق اٹھا اور اس ایک رکعت کے ساتھ ایک اور رکعت ملا کر پھر بیٹھا اور (تشہد کر کے) پھر اٹھا (یعنی تیسری رکعت کے لیے) اور جندب نے دو رکعتیں اکٹھی پڑھیں اور آخری رکعت میں جا کر بیٹھا۔ یہ بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بتائی گئی تو فرمایا دونوں نے اچھا کیا (لیکن) مجھے تو یہ زیادہ پسند ہے کہ اس طرح کروں جس طرح مسروق نے کیا۔"

امام ابن ابی شیبہ نے اسی واقعہ کو ابراہیم سے دوسری سند سے بھی اسی صفحہ میں ذکر کیا ہے، اس اثر کے سب رواۃ ثقہ ہیں، اس میں بھی ابراہیم نخعی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتا ہے کہ انہوں نے مسروق کے فعل کو اپنے ہاں پسندیدہ قرار دیا ہے۔ مسروق نے مغرب کی ایک رکعت جو اس کو امام کے ساتھ ملی تھی اس کو اول نماز قرار دیا یہی وجہ ہے کہ جب امام نے سلام پھیرا تو وہ اٹھا اور ایک رکعت پڑھ کر پھر بیٹھ گیا تھا۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ابراہیم نخعی کو یقیناً سماع حاصل نہیں لیکن اس جگہ وہ مسروق کا واقعہ نقل کر رہا ہے اور مسروق سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا تلمیذ رشید اور ابراہیم کا شیخ واستاد ہے ابراہیم نے ان سے بہت سی روایات لی ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ یہ واقعہ ابراہیم مسروق سے سن کر بیان کر رہا ہے۔ لہٰذا یہ اثر متصل ہوا منقطع نہ ہوا اس طرح یہ اثر سنداً بہت قوی ہے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاں نماز کا وہ حصہ جو امام کے ساتھ ملے اس کو اول سمجھنا زیادہ پسندیدہ تھا اس لیے فرمایا کہ کیا تو دونوں نے ٹھیک ہے لیکن مسروق کا فعل مجھے زیادہ محبوب ہے۔

اب قارئین کرام خود ہی فیصلہ کریں کہ اس متصل صحیح اثر کو ترجیح ہونی چاہیے یا سابقہ منقطع اثر کو جو مخالفین پیش فرما رہے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے دوسرا اثر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بھی مصنف ابن ابی شیبہ سے نقل کیا جاتا ہے۔

((انه كان يجعل ما ادرك مع الامام آخر صلواته)) [1]

"یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اس نماز کو جو امام کے ساتھ اس کو ملی ہے اپنی آخری نماز بناتا تھا۔"

اس اثر کی سند جید ہے، لیکن امام بیہقی رحمہ اللہ نے صحیح سند سے اس کا معارض ذکر فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

((قال واخبرنا عبدالوهاب انبا سعيد يعني ابن ابي عروبة عن ايوب عن نافع عن ابن عمر مثله)) [2]

"اور یحییٰ بن ابی طالب نے کہا اور مجھے خبر دی عبدالوہاب نے انہوں نے کہا خبر دی سعید یعنی ابن ابی عروبہ نے انہوں نے ایوب سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا اس سے پہلی روایت کے مثل۔"

اس سے پہلی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی صفحہ میں ہے اس کے یہ الفاظ ہیں:

[1] مصنف ابن ابی شیبہ: ۲/ ۳۳٤۔ [2] سنن کبری: ۲/ ۲۹۸۔

((قال ما ادركت فهو اول صلواتك))

''یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو نماز تجھے امام کے ساتھ ملی وہ تیری اول نماز ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اثر کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرنے والے حارث بن عبداللہ الاعور الہمدانی ہیں اور وہ ضعیف ہیں۔ لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ والے اثر کی سند صحیح ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اثر سے معلوم ہوا کہ وہ بھی بعد میں آنے والے کے اس حصہ نماز کو جو اس کو امام کے ساتھ ملا ہے اول نماز قرار دیتے تھے۔ اب اگر ان دونوں اثروں میں محدثانہ اصول کے مطابق تطبیق دی جائے تو اس کے تطبیق کی بہتر صورت یہی ہے کہ جس اثر میں امام کے ساتھ ملنے والی نماز کو اول قرار دیا گیا ہے اس سے مراد یہ لی جائے کہ فوت شدہ رکعات کی ادائیگی اس طرح ہونی چاہیے جس طرح ابتداء میں ملنے والا ادا کرتا ہے اور جس اثر میں قراءت کے اعتبار سے اس نماز کو جو امام کے ساتھ ملی ہے اس کو آخر سمجھو یعنی جس طرح عام طور پر آخری رکعتوں میں صرف فاتحہ پر اکتفاء ہوتی ہے اسی طرح اس حصہ نماز میں جو امام کے ساتھ ملے اس میں بھی فاتحہ پر اکتفاء کرو۔ اور بقیہ آخری رکعتوں کو اس لحاظ سے (یعنی قراءت کے اعتبار سے) اول سمجھو یعنی اس میں فاتحہ کے علاوہ اور سورتیں بھی پڑھو اس جمع و تطبیق پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے دو اثر بھی دلالت کرتے ہیں جو امام ابن ابی شیبہ نے ''المصنف'' میں ذکر کیے ہیں۔

١۔ ((عن نافع عن ابن عمر انه كان اذا ادرك مع الامام لم يقرا فاذا قام يقضى قرأ)) ❶

''نافع سے روایت ہے اور وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں کہ وہ (ابن عمر رضی اللہ عنہ) جب امام کے ساتھ ملتے تو اس میں فاتحہ سے زیادہ قراءت نہ کرتے اور جب اٹھ کر بقیہ قضاء کرتے تو ان میں فاتحہ سے زیادہ بھی پڑھتے۔''

اس اثر کا یہی معنیٰ وہ حضرات بھی کرتے ہیں جو امام کے ساتھ ملنے والے کی نماز کو آخری قرار دیتے ہیں، اسی طرح دوسرا اثر جو تحریر کیا جا رہا ہے اس کی جو معنیٰ ہم یہاں تحریر کریں گے وہ بعینہٖ ان حضرات کی کردہ ہے۔

٢۔ ((عن نافع عن ابن عمر انه قال اقرأ فيما تقضى)) ❷

''نافع سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جو رکعت تم اٹھ کر قضاء کرو اس میں فاتحہ کے بعد بھی قراءت کیا کرو۔''

اہل علم ناظرین غور فرمائیں کہ ان دو اثروں میں تطبیق کی یہ صورت بہتر ہے یا نہیں؟ اگر جمع و تطبیق کو چھوڑ کر ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس صورت میں جو اثر ہم نے معارضہ میں پیش کیا ہے وہ راجح ہے کیونکہ اس طرح

---

❶ المصنف: ٢/ ٣٢٤. ❷ المصنف: ٢/ ٣٢٤.

یہ اثر ان احادیث مرفوع کے مطابق ہو جائے گا جو مذکورہ بالا صفحات میں ذکر کر آئے ہیں۔ اگر ترجیح کو بھی قابل عمل نہ سمجھا جائے تو اس صورت میں یا تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے قول کے مطابق اس میں توقف کرنا چاہیے یا پھر دوسروں کے مسلک کے مطابق "اذا تعارضا تساقطا" دونوں کو ہی ختم ہو جانا چاہیے اس طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اثر دلیل بننے کے قابل نہ رہا۔ واللہ اعلم

مخالفین کی جانب سے دوسرے کسی صحابی کا قول یا فعل ذکر نہیں کیا گیا لیکن ہم اپنے موقف کی تائید میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک اثر پیش کر رہے ہیں۔

یہ اثر مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن کبریٰ بیہقی میں موجود ہے۔ اس جگہ یہ اثر ہم مصنف عبدالرزاق سے نقل کر رہے ہیں۔

((عبدالرزاق عن معمر عن قتادة ان عليا قال ما ادركت مع الامام فهو اول صلوتك واقض ما سبقك به من القراء ة)) [1]

''عبدالرزاق معمر سے وہ قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ بیشک علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو کچھ امام کے ساتھ تجھے ملے تو وہ تمہاری اول نماز ہے اور جو کچھ امام تم سے پہلے قراءۃ کر چکا ہے اس کو بعد میں قضا کر لینا۔''

امام بیہقی نے بھی اسی اثر کو عبدالرزاق ہی کے طریق سے ذکر کیا ہے۔ [2]

یہ روایت بھی گو منقطع ہے اس لیے کہ قتادہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں لیکن ابراہیم نخعی سے تو بہر حال وہ اقدم ہے ابراہیم کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے طبقہ خامسہ میں شمار کیا ہے اور قتادہ کو طبقہ رابعہ کا صدر قرار دیا اور یہ طبقہ ثالثہ طبقہ سے قریب ہے جس کے رواۃ کا سماع علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے پھر اس کے موافق وہ اثر بھی ہے جو امام بیہقی نے حارث الاعور عن علی نقل کیا ہے۔ ۲/ ۲۹۸

گو یہ سند حارث کی وجہ سے ضعیف ہے لیکن قتادہ والے اس اثر کی قدرے اس سے تائید ہوتی ہے۔ پھر اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام ابوبکر بن ابی شیبہ اپنے مصنف میں لائے ہیں۔

((حدثنا ابوبكر قال حدثنا هشيم قال اخبرنا منصور عن الحسن عن علي انه كان يقول من ادرك مع الامام ركعتين قال يقرأ فيما ادرك)) (۲/ ۳۲۳)

''حدیث کی ہمیں ابوبکر (ابن ابی شیبہ) نے انہوں نے کہا حدیث کی ہم سے ہشیم نے انہوں نے کہا خبر دی ہمیں منصور نے اور وہ حسن بصری سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے جو آدمی امام کے ساتھ دو رکعت پا لے تو اسے چاہیے کہ ان دو رکعت (جو امام کے

[1] مصنف عبدالرزاق: ۲/ ۲۲۶.
[2] سنن کبری: ۲/ ۲۹۹.

ساتھ اسے ملی ہیں) میں بھی (فاتحہ کے سوا) مزید قراءت کرے۔''

اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی نماز کے اس حصہ کو جو امام کے ساتھ ملا ہے اول نماز قرار دیتے ہیں کیونکہ اس مدرک کو وہ فاتحہ سے زائد بھی قراءت کرنے کا امر فرماتے ہیں۔ کما لا یخفی

اس اثر کی سند پر بحث:

اس اثر کی سند کے سب کے سب رواۃ ثقہ ہیں لیکن محدثین کے مابین اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت حسن بصری کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سماع حاصل ہے یا نہیں؟

ہمارے نزدیک ان محدثین کی بات صحیح ہے جو سماع کے مثبت ہیں۔ علامہ جلال الدین السیوطی نے بھی حسن بصری کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سماع کے اثبات میں ایک رسالہ تحریر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سماع کے ثبوت کے دلائل میں سے یہ بھی ایک وزنی دلیل ہے کہ امام ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں ایک روایت ذکر فرمائی ہے جس میں حسن بصری کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سماع کی تصریح موجود ہے اس روایت کے سب رواۃ ثقہ ہیں اور حوثرۃ بن اشرس کے سوائے سب التہذیب کے رجال ہیں۔ اور یہ حوثرۃ بن اشرس بھی ثقہ ہے اس کو ابن حبان نے اپنے ''الثقات'' میں ذکر کیا ہے اور حافظ ذہبی نے ''سیر اعلام النبلاء'' میں اس کو صدوق قرار دیا ہے۔ جب اس جید سند سے ثابت ہو گیا کہ حسن بصری کا سماع حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ تو جو اثر ہم نے مصنف ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے وہ سنداً صحیح ہوا۔

الحمدللہ ہم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے آثار بھی جید سندوں کے ساتھ ہدیہ قارئین کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد مخالفین کی جانب سے چند تابعین کے آثار بھی نقل کیے جاتے ہیں ان میں سے ابراہیم نخعی، عامر الشعبی اور محمد بن سیرین کے جو آثار تحریر کیے جاتے ہیں ان میں یہ مذکور ہے کہ یہ حضرات جو رکعتیں رہ گئی ہیں ان میں فاتحہ سے زائد قراءت کرنے کے قائل تھے لیکن اس کے متعلق ہم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اثر کے تحت اپنی گذارشات تحریر کر آئے ہیں، وہاں کی مراجعت کی جائے۔ رہا عمرو بن دینار تو اس کے اثر میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ وہ اس بقیہ رکعات کو اول نماز قرار دیتے تھے۔ اب صرف مجاہد اور ابو قلابہ کے اثر رہ جاتے ہیں جو مخالفین کی تائید کرتے ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں ہم یہاں چند تابعین کے آثار ذکر کرتے ہیں جن سے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ نماز کا جو حصہ امام کے ساتھ ملے وہ اول نماز ہے۔

((۱۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ: عن عمرو بن مهاجر قال سمعت عمر بن عبدالعزيز يقول اجعله اول صلواتك)) [1]

''عمرو بن مہاجر کہتے ہیں میں نے عمر بن عبدالعزیز سے سنا وہ فرماتے تھے جو حصہ نماز کا امام کے ساتھ

[1] مصنف ابن ابی شیبة: ۲/ ۳۲۳.

ملے اس کو اول نماز بنا۔''

اس اثر کی سند حسن ہے۔

۳،۲۔سعید بن المسیب اور حسن بصری۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں قتادہ کے طریق سے ابن المسیب اور حسن بصری سے روایت ہے:

((قال ما ادرکت مع الامام فهو اول صلواتك)) (۲/ ۳۲۳)

''یہ دونوں تابعی فرماتے تھے کہ جو حصہ نماز کا تجھے امام کے ساتھ ملے وہ تیری اول نماز ہے۔''

یہ اثر صرف ابن المسیب سے مصنف عبدالرزاق میں بھی ہے۔ج ۲،ص:۲۲۶ دونوں کی سند جید ہے۔

اس کی تائید مصنف ابن ابی شیبہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جو جلد۲ ص ۴۹۰ میں موجود ہے۔ یہ روایت امام زہری کے طریق سے ابن المسیب سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

((هل تعلمون صلوٰة يقعد فيها كلها فقال رجل رجل ادرك من المغرب ركعة فيقعد فيهن جميعا))

''ابن المسیب نے فرمایا کیا تمہیں ایسی نماز کا علم ہے جس کی ہر رکعت میں بیٹھا جائے؟ تو ایک آدمی نے کہا کہ جو آدمی مغرب کی نماز کی صرف ایک رکعت امام کے ساتھ پاتا ہے تو وہ سب رکعات میں بیٹھے گا۔''

یہی اثر امام بیہقی رحمہ اللہ سنن کبریٰ میں زہری ہی کے طریق سے اس طرح ذکر کرتے ہیں:

((ثنا سعيد بن المسيب ان السنة اذا ادرك الرجل ركعة من صلوٰة المغرب مع الامام ان يجلس مع الامام فاذا سلم الامام قام فركع الثانية فجلس فيها وتشهد ثم قام فركع الركعة الثالثة فتشهد فيها ثم سلم الخ)) (۲/ ۲۹۹)

''زہری فرماتے ہیں ہم سے ابن المسیب نے حدیث کی کہ بیشک سنت ایسے آدمی کے بارے میں جس کو مغرب کی نماز کی صرف ایک رکعت امام کے ساتھ ملی ہے، یہ ہے کہ وہ امام کے ساتھ (آخری رکعت میں) بیٹھ جائے پھر جب امام سلام پھیر دے تو وہ اٹھے اور دوسری رکعت پڑھ کر بیٹھ جائے اور اس میں تشہد (التحیات) پڑھے، پھر کھڑا ہو جائے اور تیسری رکعت پڑھ کر بیٹھے اور اس میں تشہد پڑھے پھر سلام پھیر دے الی اٰخرہ۔''

اس روایت کی سند بھی صحیح ہے۔

۴۔ عطاء بن ابی رباح۔

مصنف عبدالرزاق میں صحیح سند سے ابن جریج عطاء بن ابی رباح سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (عطاء) بھی ابن المسیب کی طرح نماز کے اس حصہ کو جو امام کے ساتھ ملے اول نماز سمجھتا تھا۔ (جلد۲ ص ۲۲۶)

ملحوظہ !ابن جریج جب عطاء سے روایت کرتا ہے تو تدلیس نہیں کیا کرتا تھا جیسا کہ فن رجال کی کتب سے معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح مصنف عبدالرزاق ۲/۲۲۹ پر ابن جریج کا یہ قول بھی مذکور ہے۔

((قلت لعطاء ارایت لو فاتتنی رکعتان من العشاء الآخرة فقمت اجهر بالقراء ة حینئذ؟ قال بل خافت بها))

''یعنی میں نے عطاء سے پوچھا کہ اگر مجھ سے نماز عشاء کی دو رکعتیں فوت ہوجائیں تو کیا جب میں بقیہ دو رکعتوں کے ادا کرنے کے لیے اٹھوں تو ان دو بقیہ رکعتوں میں قراءت جہر سے پڑھوں؟ تو عطاء نے جواب دیا (نہیں) بلکہ آہستہ پڑھو۔''

اس روایت سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ عطاء نماز کے اس حصہ کو جو امام کے ساتھ ملے اول نماز سمجھتا تھا ورنہ ابن جریج کو بقیہ رکعات میں قراءت کے جہر کرنے سے نہ روکتا، یہ بالکل واضح ہے۔ ان تابعین عظام کے آثار سے نمایاں طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ مسبوق کی نماز کے اس حصہ کو اول نماز سمجھتے تھے جو امام کے ساتھ ملے مخالفین کی جانب سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے جد امجد سید ابوتراب رشد اللہ شاہ راشدی اور ان کے والد سید رشید الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ کا مسلک بھی یہی تھا ان کی تحقیق بھی یہی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ ہمارے جد امجد رحمہ اللہ کا یہی مسلک تھا لیکن یہ بات کوئی دلیل نہیں جب کہ ہمیں احادیث مرفوعہ صحیحہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ صحیح مسلک دوسری جانب ہے لہٰذا یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ ہم دلائل کو نظر انداز کر کے ایک مسلک محض اس لیے اختیار کریں کہ وہ ہمارے آباء واجداد کا تھا۔ اصل اعتبار تو دلیل کو ہوتا ہے نہ کہ مخصوص اشخاص کو کائنا من کان ، خود یہ حضرات بھی متعدد باتوں میں ہمارے جد امجد رحمہ اللہ کی مخالفت کرتے ہیں کیوں؟

اس کا جواب ان حضرات کی جانب سے یہی دیا جائے گا اور یہی دیا جا سکتا ہے کہ ان امور میں دلیل چونکہ دوسری جانب ہے اس لیے ہم ان باتوں میں ان کی پیروی نہیں کرتے۔

بس یہی جواب ہماری طرف سے زیر بحث مسئلہ میں بھی آپ سمجھ لیں۔

ان آثار کے علاوہ مخالفین اور بھی کچھ دلائل ذکر کرتے ہیں ان کا جواب بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توفیق سے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

أ: کہا جاتا ہے کہ ''مسبوق'' کو مسبوق ہی اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے کچھ حصہ نماز فوت ہو گیا ہے، اگر امام کے ساتھ جو حصہ نماز کا اسے ملا ہے وہ اس کی اول نماز ہے تو اس سے کچھ فوت ہوا ہی نہیں۔''

یہ بھی نہایت عجیب وغریب استدلال ہے درحقیقت بعد میں آنے والے کو ''مسبوق'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ صف میں پہنچنے سے پہلے اس نماز کا کچھ حصہ گذر چکا لیکن اگر کسی سے نماز کا کچھ حصہ فوت ہو گیا ہے مثلاً اس کو چار

رکعتیں پڑھنی تھیں دو یا ایک یا زائد اس سے پہلے گذر چکی ہیں اب اس کو دو یا ایک یا تین وغیرہ پڑھنی ہیں تو اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ اس سے بعد میں آنے والے کی یہ نماز جو امام کے ساتھ اس کو ملی ہے وہ اس کی آخری نماز ہے؟ نماز کا کچھ حصہ تو یقیناً اس سے فوت ہو گیا ہے لیکن اس فوت ہو جانے والی بات کی دلالت ثلاثۃ۔ مطابقی، تضمنی، التزامی۔ میں سے کونسی دلالت اس بات پر ہے کہ یہ پہنچ جانے والا نماز کا حصہ اس کا آخری ہے؟ ظاہر ہے اس لفظ ''سبق'' یا ''مسبوق'' کی دلالت اس کے آخری ہونے پر تو عقلاً ہے اور نہ ہی نقلاً اور سبق اور اس کے مشتقات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس مقتدی سے نماز کا کچھ حصہ پہلے گزر چکا ہے جس کو بعد میں امام کے سلام پھیرنے کے بعد پورا کرے گا لیکن جو حصہ اس کو ملا ہے اس کے آخری ہونے پر اس لفظ یا اس کے مشتقات کی دلالت نہ تو لغتہً ہے نہ التزاماً، ومن يدعی ذلك فعليه البيان بالبرهان.

یہی وجہ ہے کہ صحیح مسلم، سنن کبریٰ کی ایک روایت میں حضرت ابوقتادہ کی مرفوع روایت کے یہ الفاظ ہیں:

((فما ادركتم فصلوا وما سبقتم فاتموا)) [1]

''یعنی نماز کے جس حصہ کو پہنچ جاؤ وہ تو پڑھ لو اور جو حصہ تم سے پہلے گذر چکا ہے اس کو پورا کرو۔''

ابتداء میں ہم دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ "اتمام" اس بات امر یا چیز کے پورا کرنے کو کہتے ہیں جس کا اول ہوا اور یہی وجہ ہے کہ جمہور محدثین رحمہم اللہ اسی لفظ "فاتموا" سے اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ مسبوق نماز کے جس حصہ کو پہنچ جاتا ہے وہ اس کا اول ہے لہٰذا جب اس صحیح حدیث میں "سبقتم" کے ساتھ فاتموا آیا ہے تو معلوم ہوا کہ "سبقتم" سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حصہ نماز اس کا آخری حصہ ہے ورنہ پھر "سبقتم" اور "فاتموا" میں منافاۃ ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ "سبق" یا "مسبوق" سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے نماز کا کچھ حصہ گذر چکا ہے باقی اس حصہ کا اول ہونا یا آخری تو اس پر اس لفظ کی مطلقاً دلالت نہیں۔ لہٰذا یہ دلیل قطعاً ناتمام ہے۔ واللہ اعلم

ان حضرات کی جانب سے دلیل کے طور پر کچھ اور صورتیں بھی پیش کی جاتی ہیں جو نہایت شاذ و نادر پیش آتی ہیں ایسی شواذ و نوادر پر اصولاً دلائل کی بنیاد نہیں رکھی جاتی تاہم ہم یہ صور بھی یہاں ذکر کر کے اللہ کے فضل و کرم سے ان کا جواب عرض رکھیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ب: کہا جاتا ہے جمعہ کے دن فجر کی نماز میں نبی کریم ﷺ ہمیشہ پہلی رکعت میں سورۃ الم السجدہ اور دوسری رکعت میں سورۃ ''الدھر'' پڑھا کرتے تھے اگر ایک آدمی صبح کی نماز میں اس وقت پہنچا کہ امام پہلی رکعت ختم کر چکا تھا اور اس مسبوق کو صرف دوسری رکعت ملی لہٰذا یہ مسبوق امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی رہ جانے والی رکعت کو ادا کرنے کے لیے اٹھا ہے اور اس کو سورۃ السجدہ یاد بھی ہے اور وہ مسنون طریقہ پر نماز

---

[1] سنن کبریٰ: ٢/ ٢٩٨.

ادا کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا یہ بقیہ رکعت اگر اس کی رکعت اولیٰ ہوگی پھر تو یہ سورۃ الم السجدہ اپنی مسنون جگہ پر رہتی ہے یعنی پہلی رکعت میں رہتی ہے لیکن اگر یہ آخری رکعت ہے تو اس آخری رکعت میں سورۃ السجدہ پڑھنا غیر مسنون ہے لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ یہ رہ جانے والی رکعت ہی اس کی اولیٰ رکعت ہے۔

جواباً گذارش ہے کہ ایسی صورتیں شاذ ونادر ہی وقوع میں آتی ہیں کیونکہ اکثر لوگوں کو یہ سورتیں یاد نہیں ہوتیں لہٰذا ایسی نادر صورت کو لے کر اس کو اس بات کی دلیل بنانا کہ یہ مقتدی کی آخری رکعت ہے علمی شان سے بعید معلوم ہوتی ہے۔ ثانیاً یہ بھی ضروری نہیں کہ لازمی طور پر یہی سورۃ مبارک پڑھے کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے امر تو نہیں فرمایا کہ جب تم اپنی رہی ہوئی نماز پوری کرنے لگو تو اس میں سورۃ بھی وہی پڑھو جو امام پہلے پڑھ چکا ہے، جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ کا حکم نہیں صرف دو ایک تابعین کا قول ہے تو اس بات کو لازمی بنانے والے ہماو شما کون ہوتے ہیں، اس لیے اس رہ جانے والی رکعت میں اگر کوئی فاتحہ سے زائد کوئی اور سورۃ پڑھ لے یا پھر فاتحہ پر ہی اکتفا کرے تو بھی نماز پوری ہو جائے گی۔ جو باتیں نماز میں ضروری ہیں ان کا بیان بارگاہ رسالت سے ہو چکا ہے اس لسٹ میں کسی دوسرے کو اپنی طرف سے اضافہ کی قطعی اجازت نہیں۔

ثالثاً: مسبوق کی یہ رہ جانے والی رکعت (فجر نماز کی دوسری رکعت) آخری بھی ہو پھر بھی اس میں سورۃ السجدۃ پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور نہ ہی اس کو خلاف مسنون قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ اضطراری حالت ہے لہٰذا جس طرح فجر کی نماز سے جس آدمی کو ایک رکعت نہیں ملی وہ بھی ایک رکعت پر تشہد میں بیٹھتا ہے حالانکہ فجر کی نماز میں بیچ میں تشہد نہیں پھر بھی امام کی اقتداء کی وجہ سے اس کو بیٹھنا پڑتا ہے۔ ویسے اگر کوئی فجر نماز میں ایک رکعت پڑھ کر تشہد میں بیٹھ جائے تو یہ خلاف مسنون ہوگا اگر عمداً کیا ہے تو اس کی نماز فاسد ہوگی اگر نسیاناً ایسا ہوا ہے تو اسے دوسری رکعت پڑھ کر سجدہ سہو ادا کرنا پڑتا ہے لیکن امام کے ساتھ جو بیچ میں تشہد کرتا ہے تو وہ خلاف مسنون بھی نہیں اور نہ ہی اسے سجدہ سہو ہی دینا پڑے گا۔ لہٰذا یہ سب کچھ امام کی اقتداء کی وجہ سے اضطراراً ہوا ہے اور اس میں اس کے عمد کا کوئی دخل نہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة: ٢٨٦)

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ١٦)

اس لیے جب اس مسبوق سے سورۃ السجدۃ پہلی رکعت کے رہ جانے سے پہلی رکعت میں پڑھی نہ جا سکی تو وہ اپنی استطاعت کے موجب اس کو دوسری رکعت میں ادا کر لیتا ہے۔ یعنی یہ دونوں سورتیں مبارکہ جمعہ کے دن فجر نماز میں پڑھنی ہیں اگر کسی سے مجبوراً پہلی رکعت میں یہ نہ ہو سکا تو دوسری رکعت میں اس کی تلافی کر لی اور یہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم ہے کیونکہ اب اس کی وسع واستطاعت میں کوئی اور صورت ہے بھی نہیں تعجب ہے! یہ حضرات اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے قلب حقیقت پر بھی آمادہ ہیں اور آخر کو اول، اول کو آخر بنا دیتے ہیں حالانکہ

آخر کا تصور اول کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا اور ایک چیز کا سر تو پیچھے کر لیتے ہیں اور دم کو آگے کر لیتے ہیں۔ اور یہ سراسر غیر معقول ہے جیسا کہ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وكقولهم في ان الركعة الثانية من صلوٰة من يقضي صلوٰة ادرك منها ركعة مع الامام: هي قبل الاولى والثالثة قبل الثانية و هذا كما ترى لا يعقل)) ❶

''ان کی غیر معقول و باطل باتوں میں سے یہ بات بھی ہے کہ جس آدمی کو امام کے ساتھ صرف ایک رکعت ملی ہے جب وہ ان کو قضا کرتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ اس کی دوسری رکعت پہلی سے پہلے ہے اور تیسری دوسری سے پہلے ہے اور یہ جیسا کہ دیکھ رہے ہو غیر معقول ہے۔''

یعنی معقول تو یہ ہے کہ اولیٰ پہلے ہو ثانیہ بعد میں اور ثالثہ ثانیہ کے بعد لیکن یہاں پورا قلب حقیقت کرنے پر یہ حضرات آمادہ ہو گئے ہیں اور وہ بھی اس بناء پر نہیں کہ ان کے اس موقف پر کوئی نص صریح اور واضح دلیل ہے بلکہ محض ایک بات کو انہوں نے صحیح تصور فرما لیا اور اب اس پر بنیاد رکھ کر اتنی غیر معقول باتیں کرنے سے بھی نہیں گھبراتے۔

بہر حال جب وہ ایک غیر معقول بات کو مان رہے ہیں اور دم کو آگے سر کو پیچھے کرنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے وہ بھی محض اس لیے کہ یہ رکعت چونکہ امام کی دوسری یا تیسری ہے لہٰذا مسبوق کی بھی یہی دوسری یا تیسری ہوگی یعنی امام کی وجہ سے انہیں یہ مجبوری لاحق ہوئی ہے (حالانکہ امام و ماموم کے اتحاد نیت کے وہ بھی قائل نہیں اور کوئی واضح نص بھی نہیں) تو پھر یہ حضرات اس پر کیوں آمادہ نہیں ہوتے کہ جس آدمی سے جمعہ کے دن فجر نماز کی ایک رکعت فوت ہوگئی ہے تو اس کی دوسری رکعت جو امام کے ساتھ ملی ہے اس کو رکعت اولیٰ قرار دیں اور سورۃ السجدہ دوسری رکعت میں پڑھنے کو غیر مسنون نہ کہیں کیونکہ یہ بھی امام کی اقتداء کی وجہ سے اضطرار ہوا ہے۔ اس صورت میں اتنا تو فائدہ ہوتا ہے کہ نماز کی صورت میں بلا وجہ کوئی بے جا تقدم و تاخر برداشت نہیں کرنا پڑتا اور نہ ہی یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس نماز کی دم تو ابتداء میں ہے۔ سر آخر میں، صرف سورتوں کا تقدم و تاخر ہو گیا ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو قلب حقیقت کا موجب ہو اور وہ بھی مجبوری کی وجہ سے ہوا ہے اس لیے یہ معاف بھی ہے اور غیر مسنون بھی نہیں۔

لیجئے اس سلسلہ میں، ہم ایک اور مثال بھی پیش کر دیتے ہیں!

جمعہ کے دن فجر کی نماز امام نے شروع کی اتفاق سے اسے نسیان وذہول ہو گیا اور وہ بجائے سورۃ السجدہ کے پہلی رکعت میں سورۃ الدہر پڑھ بیٹھا پیچھے سے کسی نے ان کو لقمہ بھی نہ دیا جب امام پہلی رکعت پوری کر کے دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا تو اس کو یاد آ گیا کہ اس نے تو پہلی رکعت میں سورۃ الدھر پڑھی ہے حالانکہ اسے سورۃ السجدۃ پڑھنی تھی، آپ ہی بتائیں کہ اس آدمی کو کیا کرنا چاہیے؟ آپ انہیں یہ فتویٰ تو دے ہی نہیں سکتے کہ تمہاری

❶ الاحکام فی اصول الأحکام: ۱/ ۲۱۵.

نماز ہی نہیں ہوئی۔ لہٰذا یا تو آپ اسے یہ فرمائیں گے کہ چلو اس دوسری رکعت میں ہی سورۃ السجدہ پڑھ لو سنت ادا ہو جائے گی کیونکہ تم سے نسیان ہوا ہے اور نسیان اللہ کے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق معاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((ان الله تجاوزلی عن امتی الخطا والنسيان وما استكر هوا عليه)) [1]

''بیشک اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے میری امت کی غلطی، بھول اور جو چیز اکراہ ومجبوری سے کریں ان سے درگذر فرمایا ہے۔''

لہٰذا جب امام سے نسیان ہو گیا تو وہ معاف ہے۔ اب اس کا تدارک اس کے بس میں صرف یہ رہ گیا ہے۔ کہ وہ اس سورۃ مبارکہ کو دوسری رکعت میں پڑھ لے۔ اور اس کو غیر مسنون نہ کہیں گے کیونکہ یہاں نسیان ہو گیا ہے اسی طرح جو آدمی دوسری رکعت میں آ کر ملا ہے وہ بھی مجبوری کی وجہ سے اس سورۃ مبارکہ کو جو اولیٰ رکعت میں پڑھنی تھی، دوسری رکعت میں پڑھے تو اس نے بھی غیر مسنون کام نہیں کیا کیونکہ جس طرح نسیان معفو ہے مجبوری بھی معفو ہے یا پھر آپ ان سے یہ فرمائیں گے کہ اب اس رکعت میں تم جو چاہو پڑھ لو لیکن (کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں) کہ آپ اس کو ایسا فتویٰ نہیں دیں گے اس لیے کہ اس طرح تو مسنون طریقہ کا بالکلیہ ترک لازم آتا اور یہ مقولہ مسلم ہے کہ مالا يدرك كله لا يترك كله فافهم . بہر حال یہ صورت جو ان حضرات نے اپنے موقف کی تائید میں پیش فرمائی ہے وہ کوئی وقیع نہیں ہے۔ واللہ اعلم

ج: کہا جاتا ہے عیدین کی نماز میں بارہ تکبیریں ہیں اگر کسی سے پہلی رکعت فوت ہو گئی ہے اور وہ دوسری رکعت میں آ کر ملا ہے تو اگر یہ رکعت ان کی اولیٰ رکعت ہے تو اس رکعت میں پانچ تکبیریں ہیں اور جب یہ آدمی اپنی دوسری رکعت پوری کرے گا تو اس میں بھی پانچ تکبیریں کہے گا کیونکہ یہ اس کی دوسری رکعت ہے اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں ہیں اس طرح اس آدمی کی دس تکبیرات بنتی ہیں حالانکہ نماز عید میں مسنونہ تکبیرات بارہ ہی ہیں۔

ہماری گذارش ہے یہ صورت بھی نادرہ ہونے کے علاوہ اس بات پر مبنی ہے کہ چونکہ اس دوسری رکعت میں امام پانچ تکبیریں کہتا ہے لہٰذا مسبوق کو بھی ضرور ہی پانچ تکبیروں پر اکتفاء کرنا ہے حالانکہ یہ قطعی مسلم نہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ رکعت جب ان کی اولیٰ رکعت ہے لہٰذا وہ پانچ نہیں سات تکبیریں کہے گا اور دوسری آخری رکعت میں پانچ اس طرح بارہ تکبیریں بن جاتی ہیں پھر دس تکبیرات کیسے ہوئیں؟ باقی یہ کہنا کہ امام تو پانچ تکبیریں کہتا ہے اور یہ سات تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ امام تو دوسری رکعت میں کھڑا ہو گیا ہے اور یہ مسبوق جو آیا ہے انہیں ان تکبیرات خمسہ کے علاوہ تکبیر تحریمہ بھی تو کہنی ہے لہٰذا مزید دو تکبیریں اور بھی پڑھ لے۔ کسی حدیث میں یہ وارد نہیں

[1] حديث حسن، رواه ابن ماجة والبيهقى و غيرهما قاله النووى فى الاربعين.

کہ عید کی دوسری رکعت میں ملنے والا پانچ تکبیروں سے زائد نہ پڑھے اگر امام تکبیرات خمسہ ختم کر کے فاتحہ پڑھ کر دوسری سورت شروع کر چکا ہے اور پھر کوئی آدمی آ کر ملا تو آپ بھی اس کو یہ نہیں کہیں گے کہ بس اب تم صرف فاتحہ پڑھ کر خاموش ہو جاؤ بلکہ اس کو بھی آپ اپنے موقف کے مطابق تکبیرات خمسہ کہنے کا امر فرمائیں گے بس اسی طرح ہم بھی ایسے مسبوق کو یہ کہتے ہیں کہ وہ سات تکبیرات کہے اس لیے کہ ہمارے ہاں یہ اس کی رکعت اولیٰ ہے۔ اور فاتحہ پڑھ کر خاموش ہو جائے بتائیے اس میں کونسا محذور لازم آتا ہے۔ اگر امام نماز میں فاتحہ ختم کر کے دوسری سورت پڑھ رہا ہے تو آپ آنے والے کو یہ نہیں کہیں گے کہ تم فاتحہ نہ پڑھو کیونکہ امام دوسری سورت پڑھ رہا ہے اس کی مخالفت نہیں کرنی بلکہ آپ انہیں فاتحہ پڑھنے کا امر فرمائیں گے کیونکہ فاتحہ بہر حال ماموم کو پڑھنا ہی ہے اسی طرح دوسری رکعت میں پہنچنے والے کی یہ رکعت چونکہ پہلی ہے لہٰذا انہیں سات تکبیریں کہنی ضروری ہیں لہٰذا امام اگرچہ پانچ تکبیریں کہے گا لیکن یہ سات اس میں کونسا محذور لازم آتا ہے؟ اگر امام پہلی رکعت میں ہی ہے لیکن مسبوق اس وقت پہنچا کہ امام تکبیرات ختم کر کے فاتحہ پڑھ کر دوسری سورۃ شروع کر چکا ہے۔

اس کو امر کریں گے کہ وہ اپنی سات تکبیریں کہے۔ بس اسی طرح ہم بھی کہتے ہیں کہ یہ مسبوق دوسری رکعت میں جو اس کی پہلی رکعت ہے اس میں بھی سات تکبیرات کہے۔ فافھم

بہرکیف یہ صورت بھی ان حضرات کے موقف کی دلیل بننے کے قابل نہیں۔ واللہ اعلم

د: کوئی آدمی مغرب کی تیسری رکعت میں آملا ہے اگر یہ اس کی پہلی رکعت ہے تو جب وہ اپنی بقیہ رکعتوں کو پورا کرنے کے لیے اٹھے گا تو ایک رکعت پڑھ کر انہیں پھر قعدہ کرنا پڑے گا اور تیسری رکعت میں پھر قعدہ کرنا ہوگا اس طرح تین قعدے بن جاتے ہیں حالانکہ مغرب نماز میں تین قعدے نہیں ہیں اسی طرح یہ صورت عام قاعدہ کے بھی خلاف ہے کیونکہ عام قاعدہ کے مطابق ایک رکعت پر قعدہ نہیں۔

ہماری گذارش! یہ صورت بھی لا یسمن ولا یغنی من جوع ، اس لیے کہ اس صورت میں تین قعدے جو بنتے ہیں، وہ امام کی اقتداء کی وجہ سے بنتے ہیں ورنہ اصل نماز میں تین قعدے نہیں ہیں اگر امام کی اقتداء کی وجہ سے اس قعدہ کو مزید قعدہ قرار دیتے ہیں اور اس کو ناجائز سمجھتے ہیں تو بتائیے ایک آدمی مغرب نماز کی دوسری رکعت میں آ کر ملا تو لامحالہ وہ امام کے ساتھ دوسری رکعت کے قعدہ اولیٰ میں بھی بیٹھے گا اور پھر تیسری رکعت میں بھی امام کے ساتھ قعدہ کرے گا اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد جب وہ تیسری رکعت ادا کرے گا تو بھی لامحالہ اس کو قعدہ کرنا پڑے گا کہیے۔ مغرب کی نماز میں آپ کے ہاں بھی تین قعدے ہو گئے یا نہیں؟ آپ اس کا جواب صرف یہی دیں گے کہ یہ تیسرا قعدہ امام کی اقتداء کی وجہ سے اسے کرنا پڑا تو بس ہمارا بھی یہی جواب ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ یہ صورت عام قاعدہ کے بھی خلاف ہے یہ بھی محض مغالطہ ہے۔ اگر کوئی نماز وتر صرف ایک رکعت پڑھتا ہے

تو وہ ایک رکعت پر ہی قعدہ کرے گا اسی طرح جو آدمی فجر کی نماز کی دوسری رکعت میں آ کر ملا ہے اس کو بھی لامحالہ امام کی اقتداء میں ایک رکعت پر قعدہ کرنا پڑے گا۔ بعد میں اس کو پھر ایک رکعت آخری پڑھ کر قعدہ کرنا پڑے گا۔ بتایئے آپ کا یہ عام قاعدہ کہاں گیا؟ آپ جانتے ہیں کہ نماز فجر میں تو بیچ میں قعدہ قطعی طور پر نہیں ہے اگر کوئی عمداً اس طرح کرے تو نماز اس کی فاسد ہوگی اگر نسیاناً کیا ہے تو اس کے لیے سجدہ سہو دینا پڑے گا تاہم جو امام کے ساتھ صرف ایک رکعت پا سکا ہے اس کو بیچ میں قعدہ کرنا پڑا ہے اور یہ امام کی اقتداء ہی کی وجہ سے ہے بس اسی طرح مغرب والی تیسری رکعت میں ملنے والے کو جو تین قعدے کرنے پڑے اس کو بھی اسی طرح سمجھ لیجئے۔

الحمدللہ ثم الحمدللہ ہم نے مخالفین کے سب دلائل کا جواب پیش کر دیا ہے اب انصاف ناظرین کرام کے ذمہ ہے۔ اخیر میں ہم بھی چند صورتیں پیش کرتے ہیں، جن میں یہ حضرات مسنونہ طریقہ کے خلاف کرتے ہیں۔

ا: ثلاثی اور رباعی نمازوں میں دو قعدے ہوتے ہیں احادیث صحیحہ کی رو سے ان دونوں قعدوں کی ہیئت میں فرق ہے پہلے قعدہ میں بائیں قدم پر چڑھ کر بیٹھنا ہے اور دوسرے میں تورک مسنون ہے۔ جو حضرات مسبوق کے اس حصہ نماز کو جو امام کے ساتھ اس کو ملا ہے آخری کہتے ہیں ان کو اس سلسلہ میں مسنون طریقہ کی مخالفت لازم آتی ہے، مثلاً ایک آدمی مغرب کی تیسری رکعت میں آ کر ملا ہے تو اس کو امام کے اس آخری قعدہ کی طرح تورک کرنا پڑے گا کیونکہ ان کے ہاں یہ ان کی آخری رکعت ہے۔ لہٰذا ھیئات وغیرہا میں امام سے موافقت لازم ہے جیسا کہ وہ دعاء استفتاح وغیرہ کے بارے میں بھی یہی کہتے ہیں کہ مسبوق کو یہ دعا اس وقت پڑھنی ہوگی جب وہ اپنی بقیہ نماز کو ادا کرے گا کیونکہ جو حصہ امام کے ساتھ ملا وہ اس کا آخری حصہ تھا۔ لیکن جب مغرب کی نماز کا بقیہ حصہ دو رکعت اکٹھی ادا کرے گا تو پھر جب قعدہ کرے گا تو اس کو تورک کرنا پڑے گا کیونکہ حدیث میں آچکا ہے کہ جس رکعت میں سلام ہوگا اس میں تورک ہوگا۔ اس طرح ان حضرات کو دو قعدوں میں جو ھیئات کا تفاوت تھا اس کی تعمیل کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ اسی طرح چو رکعتی نماز میں کوئی آدمی امام سے تیسری رکعت میں آ کر ملا تو وہ بھی دو رکعت پر بھی امام کے ساتھ تورک کرے گا اور جب اپنی بقیہ دو رکعتیں ادا کرے گا تب بھی اسے اخیر میں تورک ہی کرنا پڑے گا اور یہ مسنون طریقہ کے خلاف ہے۔ یہ صرف نظریاتی بات نہیں ہم نے ان حضرات کو آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ ان صورتوں میں دونوں قعدوں میں تورک کرتے ہیں اگر یہ رکعت یا رکعات جو مسبوق کو امام کے ساتھ مل گئیں وہ اس کی اول نماز ہوتی تو یہ خلاف سنت محذور ہرگز لازم نہ آتا۔ واللہ اعلم

ب: ایک آدمی مسافر ہے وہ ظہر یا عصر یا عشاء کی نماز میں امام مقیم سے اس وقت آ کر ملتا ہے کہ امام دو رکعت پڑھ چکا ہے تو یہ حضرات اس کو یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ یہ بھی امام کے ساتھ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے۔

یہ عجیب منطق ہے جب آپ اس کی اس نماز کو آخری قرار دے رہے ہیں تو امام کے ساتھ دو رکعت پر سلام پھیرنے میں کونسی معقولیت ہے؟ جب یہ آخری نماز ہے تو لازمی طور پر اس کا اول بھی ہونا چاہیے اور یہاں اول تو ہے ہی نہیں یعنی سر تو ہے نہیں صرف دم کو کافی سمجھ لیا گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ مسافر اس سے مستثنیٰ ہے تو اس استثناء کی دلیل؟ اگر یہ فرمائیں کہ مسافر کو تو صرف دو رکعت پڑھنی ہیں تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ یہ آخر نماز ہے اس کے لیے اول ہونا لازمی ہے ورنہ یہ آخر بن ہی نہیں سکتی۔

ثانیا: اس پر یہ سوال بھی وارد ہوتا ہے کہ جب آپ مسافر کے لیے صرف دو رکعت ہی بتا رہے ہیں تو جو مسافر نماز کے شروع سے مقیم امام کی اقتداء کر رہا ہو اس کو امر فرمائیں کہ بس دو رکعت امام کے پیچھے پڑھ کر بیٹھ جائے اور بقیہ رکعات میں امام کی اقتداء ہی نہ کرے حالانکہ آپ ایسے فتویٰ ہی نہیں دیتے تو اس صورت میں جب کہ وہ صرف دو رکعتیں پاتا ہے اور وہ حصہ اس کا آخری حصہ نماز بھی ہے۔ (آپ حضرات کے ہاں) تو بطریق اولیٰ اس کو یہ فتویٰ نہیں دینا چاہیے تھا کہ وہ ان دو رکعت پر ہی اکتفاء کرے۔ واللہ اعلم

ج: نماز وتر کی جماعت ہو رہی ہے ایک آدمی باہر سے آیا اس وقت امام دوسری رکعت میں تھا تو آپ کے ہاں اس مسبوق کی بھی یہ دوسری رکعت ہوگی لہٰذا امام جب تیسری رکعت پڑھے گا تو اس کی بھی یہ تیسری رکعت ہوگی امام قنوت پڑھے گا آپ کے ہاں اس کو بھی پڑھنا پڑھے گی لیکن امام سلام پھیرے گا تو آپ اس کو حکم دیں گے کہ اب پہلی رکعت ادا کرا اور یہ صرف ایک رکعت میں ہوگی جو پڑھ کر یہ مسبوق بھی سلام پھیر لے گا۔ اب آپ ہی بتائیں اس مسبوق کی تیسری رکعت تو یہی ایک رکعت ہونی چاہیے یا پہلی؟ جب ایک رکعت پر سلام ہوا تو تیسری تو یہ ہوئی یہی عام قاعدہ ہے لیکن آپ کے مسلک کے مطابق یہ ایک رکعت آخری رکعت نہیں بلکہ اولیٰ ہے اور یہ بالکلیہ معکوس امر ہے اور سراسر غیر معقول اور اس طرح آپ کے مسلک کے بموجب اس مسبوق کی دعاء قنوت بیچ میں آ گئی حالانکہ یہ وتر کی آخری رکعت میں پڑھنی پڑتی ہے۔ اسی طرح اگر ایک آدمی وتر کی تیسری رکعت میں آ کر ملا ہے تو آپ کے ارشاد کے مطابق یہ اس کی آخری رکعت ہے لہٰذا اس کو دعاء قنوت بھی پڑھنا پڑے گی اور اب یا تو امام کے ساتھ سلام پھیر کر پھر اسے دو رکعت پڑھنے کا حکم ہوگا یا امام کے ساتھ سلام پھیرے بغیر اسے دو رکعت پڑھ کر سلام پھیرنے کا حکم دیں گے اور ان دونوں صورتوں میں یہ کیسا وتر ہوا کہ دو رکعت (شفع) پر ختم ہوا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ آپ ایسے آدمی کو فرمائیں گے کہ تم اس تیسری رکعت کے متعلق صرف ایک رکعت وتر کی نیت کر لو پھر جب امام سلام پھیر لے تو تم بھی سلام پھیر لو تمہارا بھی وتر ہو گیا۔ یہ تو صحیح ہے لیکن اس صورت میں تو یہ ایک رکعت

اس کی اول وآخر ہوئی۔ابتداء کے لحاظ سے اول اور جب سلام پھیرا تو یہ آخری حصہ ہوا اس طرح آپ کا قاعدہ بری طرح منتقض ہوا۔کیونکہ آپ تو اس کو امام کی آخری رکعت کی وجہ سے اس مسبوق کی بھی آخری رکعت قرار دیتے ہیں حالانکہ اس صورت میں یہ اس کی قطعاً آخری رکعت (ابتداء ہی سے نہیں ہے اگر کوئی اس پر بھی یہ کہے جائے کہ ہو نہ ہو یہ اس کی آخری رکعت ہے تو وہ عقلاء کی فہرست سے نکل کر مجانین کی لسٹ میں داخل ہو جائے گا۔واللہ اعلم

د: ایک آدمی وتر با جماعت میں اس وقت شامل ہوا جب کہ امام تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے قراءت سے فارغ ہو کر دعا قنوت شروع کر چکا ہے بتایئے یہ مسبوق کیا کرے (آپ کے ہاں تو یہ اس کی آخری رکعت ہے اس لیے اس کو اس رکعت میں دعا قنوت بھی پڑھنی ہے) اگر یہ امام کے ساتھ دعا قنوت پڑھتا ہے تو فاتحہ نہیں پڑھ سکتا اس طرح اس سے رکعت فوت ہو جائے گی۔اگر فاتحہ پڑھتا ہے تو دعا قنوت فوت ہو جاتی ہے اب بتایئے یہ بیچارا کیا کرے؟

ہ: امام رباعی نماز میں بھول کر پانچویں رکعت میں اٹھ گیا بعد میں ایک آدمی آیا اور وہ نماز میں داخل ہو گیا آپ کے ہاں تو یہ اس کی آخری رکعت ہے اب فرمایئے یہ اس مسبوق کی پانچویں رکعت ہے یا چوتھی اگر کہیں کہ اس کی بھی پانچویں ہے تو کیا آپ انہیں بھی بقیہ چار رکعات پڑھنے کا امر فرمائیں گے؟ اگر یہ فرمائیں کہ یہ اس کی چوتھی رکعت ہے تو یہ بالبداہت غلط ہے۔اسی طرح مغرب اور فجر نماز میں بھی اگر بھول کر امام ایک زائد رکعت پڑھ لیتا ہے اور اسی رکعت میں آکر مسبوق ملتا ہے تو اس صورت میں بھی مذکورہ سوالات آپ پر لازمی طور پر وارد ہوں گے۔

اس کے برعکس اگر ہم مسبوق کے اس حصہ نماز کو جو امام کے ساتھ اس کو ملا ہے اول قرار دیں تو ان میں سے کوئی ایک محذور بھی لازم نہیں آئے گا۔فتدبروا

اگر کوئی کہے کہ جس آدمی سے امام کے ساتھ چورکعتی نماز کی صرف ایک رکعت فوت ہوئی ہے تو آپ کے مسلک کے مطابق اس کو تیسری رکعت پر اٹھنے کے بعد رفع الیدین کرنی ہوگی حالانکہ وہ امام کی چوتھی رکعت ہے اور اس سے پہلے امام قعدہ نہیں کرتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی مثال بھی موجود ہے مثلاً امام چورکعتی نماز میں دو رکعت پڑھ کر نسیانا بیچ والا قعدہ نہیں کیا اور اٹھ کر تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا۔عین اسی وقت اس کو یاد آ گیا کہ میں تیسری رکعت کے لیے اٹھا ہوں اور قعدہ نہیں کیا تو اس کو بھی رفع الیدین کرنی ہوگی اور قعدہ کے لیے دو سجدہ سہو کے ادا کرنے ہوں گے۔یعنی اس صورت میں بھی گو تیسری رکعت سے پہلے قعدہ نہیں ہوا پھر بھی اس کو رفع الیدین کرنی ہوگی۔بس اسی طرح آپ کی مسئولہ صورت کو بھی سمجھ لیجئے۔

ہم مانتے ہیں کہ ان مذکورہ صور میں سے بعض صورتیں نادرہ ہیں لیکن جب مخالفین حضرات بھی ایسی شواذ ونوادر صور پیش فرماتے رہتے ہیں تو ہمیں بھی حق ہے کہ ہم اس قسم کی صور جو معقول ہوں ان کو پیش کریں۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

اس مسئلہ پر جو کچھ راقم اثیم کو تحریر کرنا تھا وہ تحریر کر دیا۔

فالحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات وعلی نبینا ازکی الصلوٰۃ والتسلیمات وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ المطھرات الطیبات الی یوم لا ینفع فیہ مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم والاعمال الصالحات والقربات انما انا قاسم واللہ یعطی.

وانا احقر العباد

محب اللہ شاہ الراشدی عفی اللہ عنہ

۱۴۱۰/۴/۲۷ ہجری

۱۹۸۹/۱۱/۲۷ء

❀❀❀❀

باب سوم

3 تحقیق و تنقید

تشہد اول میں بھی درود پڑھنے کا ثبوت

''محترم جناب حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ ہماری جماعت کے معروف مفسر اور مصنف ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار انعامات سے نوازا ہے اور وہ تحقیق کے میدان میں بھی کسی سے کم نہیں۔ ۱۹۸۹ کو ہفت روزہ الاعتصام میں مضمون بنام ''چار رکعت میں پہلے تشہد کے ساتھ درود شریف پڑھنا'' تحریر کیا اور مسند ابی یعلیٰ کی حدیث کو مدنظر رکھ کر اور دیگر دلائل سے ثابت کیا ہے کہ پہلے تشہد میں صرف تشہد (التحیات) ہی پڑھنا چاہیے اس کے ساتھ درود شریف پڑھنے کی ضرورت نہیں۔'' تو اس کے جواب میں پیر محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ صاحب نے ان کی اس رائے سے اختلاف کیا اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ درمیانے تشہد میں بھی درود شریف پڑھنا چاہیے۔''

(الازہری)
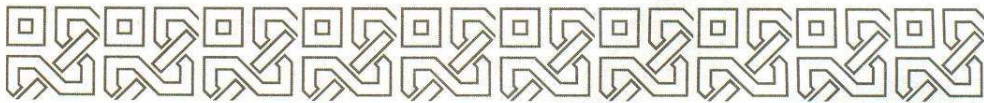
مولانا حافظ صلاح الدین یوسف صاحب حفظہ اللہ حضرت الفاضل محترم المقام حبی فی اللہ واخی فی الاسلام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ امید ہے کہ آپ کا مزاج عالی مع المنیر ہوگا۔ امابعد!

۵ ستمبر کے ''الاعتصام'' میں آپ محترم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں آں محترم نے یہ ثابت کرنے کی سعی فرمائی ہے کہ قعدہ اولیٰ میں صحیح بات یہ ہے کہ اس میں تشہد کے ساتھ صلوٰۃ نہ پڑھی جائے۔ افسوس کہ اس مسئلہ میں راقم الحروف آں محترم کے ساتھ اتفاق نہیں کرسکا، عصر حاضر کے صرف علامہ البانی رحمہ اللہ ہی پہلے قعدہ میں صلوٰۃ پڑھنے کے قائل نہیں بلکہ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مولانا عبدالقادر حصاری رحمہ اللہ نے بھی ایک مضمون شائع کرایا تھا۔ اس میں بھی انہوں نے دلائل سے ثابت کیا تھا کہ پہلے قعدہ میں بھی تشہد کے ساتھ صلوٰۃ پڑھنی چاہیے اور صحیح بات بھی ان شاء اللہ یہی ہے۔

آں محترم نے اپنے موقف کی دلیل میں ایک حدیث تو مسند ابی یعلی کی ذکر فرمائی ہے اور علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ یہ روایت ابوالحویرث سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتا ہے اور وہ ثقہ ہے۔ مسند ابی یعلی کا مکمل مخطوطہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں یہ حدیث بھی (ج ۲ ص ۴۲۶ میں) موجود ہے لیکن سیدہ صدیقہ ام المومنین رضی اللہ عنہا سے راوی ابوالحویرث نہیں، ابوالجوزاء ہے۔ اور ائمہ محدثین کی تحقیق کے مطابق ابوالجوزاء کا چند صحابہ رضی اللہ عنہم جن میں سیدتنا وامنا عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں، سے سماع ثابت نہیں۔ دیکھئے تہذیب التہذیب وغیرہ۔ لہٰذا یہ روایت تو انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔

دوسری روایت جو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کی سند حسن وجید ہے لیکن اس سے مسئلہ زیر بحث پر استدلال راقم الحروف کے نزدیک صحیح نہیں۔ اس لیے کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سابقین میں سے ہیں اور قدیم الاسلام ہیں، لہٰذا جو واقعہ وہ اس حدیث میں بیان فرمارہے ہیں وہ پہلے کا تھا اور پہلے قعدہ میں تشہد کے ساتھ صلوٰۃ پڑھنا بعد کا ارشاد ہے۔ اس لیے پہلا حکم بعد میں آنے والے حکم کا رافع نہیں ہوسکتا۔

اب آپ ذیل کی حدیثیں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ حدیث مسند احمد، سنن کبریٰ، بیہقی وغیرھا میں اسانید جیاد سے مروی ہیں۔ اس کی اسانید مسند وغیرہ میں دیکھی جائیں:

۱۔ ((عن ابی مسعود عقبة بن عمرو رضی اللہ عنہ قال اقبل رجل حتی جلس بین یدی رسول اللہ ﷺ ونحن عنده فقال یا رسول الله اما السلام علیك فقد عرفناه فكیف نصلی علیك اذا نحن صلینا فی صلواتنا صلی الله علیك قال فصمت رسول الله ﷺ حتی احببنا ان الرجل لم یساله فقال اذا انتم صلیتم علیّ فقولوا اللهم صل علی الخ))

اس حدیث میں جو سائل ہے وہ بشر بن سعد ہے جیسا کہ دوسری حدیث میں آیا ہے اور اس حدیث میں واضح ہے کہ صلوٰۃ کے متعلق سوال نماز میں تشہد کے وقت پڑھنے کے بارے میں تھا اور ''سلام'' جو صحابہ رضی اللہ عنہم نے پہلے جان لیا تھا وہ وہی ہے جو تشہد میں پڑھا جاتا ہے اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سوال مدینہ منورہ میں آنے کے بعد بھی کافی عرصہ بعد میں ہوا تھا۔ اس کی وضاحت مزید دوسری حدیث میں آ رہی ہے۔

۲۔ یہ حدیث بھی سیدنا ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور جید سند سے امام احمد کی مسند میں موجود ہے:

((وعنه قال اتانا رسول الله ﷺ فی مجلس سعد بن عبادة فقال له بشر بن سعد امرنا الله ان نصلی علیك یا رسول الله فكیف نصلی علیك قال فسكت رسول الله ﷺ حتی تمنینا انه لم یساله ثم قال قولوا اللهم صلی علی محمد...... والسلام كما قد علمتم))

''اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ سوال اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ کے نزول کے بعد ہوا تھا اور یہ آیت سورۂ احزاب کی ہے جو ۵ ہجری میں نازل ہوئی تھی۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مومنوں کو اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ پر صلوٰۃ وسلام پڑھنا چاہیے اور یہ حکم بعد کا ہے، تشہد کا حکم اس سے کافی عرصہ پہلے ہو چکا تھا۔ اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس تشہد کا حوالہ دیتے ہوئے عرض کیا کہ سلام تو ہم پہلے معلوم کر چکے ہیں، یعنی تشہد میں اور اس دوسری حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بھی اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی تکمیل میں صلوٰۃ تو سکھلائی لیکن سلام کے متعلق اسی تشہد والے سلام کی طرف ''والسلام كما قد عرفتم'' سے اشارہ فرمادیا۔ اس سے بالکل واضح ہو گیا کہ تشہد کا حکم کافی عرصہ پیشتر ہو چکا تھا اور اس وجہ سے اس وقت نبی کریم ﷺ صرف اسی پر اکتفا فرماتے تھے لیکن جب سورۂ احزاب کی مذکورہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی دریافت پر آپ نے صلوٰۃ بھی بتادی اور یہ نماز ہی میں پڑھنے کے متعلق سوال تھا جیسا کہ پہلی حدیث سے واضح ہے۔

سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مسند احمد اور سنن کبریٰ للبیہقی میں اس کے موافق حدیث صحیح سند سے موجود ہے۔

لہٰذا سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے پہلے قعدہ میں تشہد پر اکتفا کے لیے استدلال میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

علاوہ ازیں ان دونوں حدیثوں کو اس طرح بھی جمع کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی حدیث میں جو صرف تشہد کا ذکر ہے تو اس سے مراد تشہد مع الصلوٰۃ ہے اور عربی زبان میں چند اشیاء کے مجموعہ کی طرف ایک اہم جزو سے اشارہ کیا جا سکتا ہے مثلاً ((مَنْ قَامَ رَمَضَانَ الخ)) میں ذکر تو قیام ہی کا ہے لیکن مراد پوری نماز ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے امثلہ موجود ہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح سمجھئے کہ اللہ کا حکم تو صلوٰۃ وسلام دونوں کا ہے اور سلام صرف تشہد میں ہی مذکور ہے، لہٰذا صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل صرف صلوٰۃ کے پڑھنے سے ہی ہو سکتی ہے لہٰذا

جب نماز میں مصلی قعدہ کرے گا تو اللہ کے ارشاد کی تکمیل میں یہ دونوں پڑھے گا گویا تشہد، جس میں سلام ہے اور صلوٰۃ، آپس میں لازم وملزوم ہیں اور صرف تشہد کے ذکر سے جو کہ اہم جزو ہے کیونکہ اس میں سلام کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اللہ کی ثناء وتعظیم، شہادتین وغیرہ تو اس کے ذکر سے دوسرے جز۔ (یعنی صلوٰۃ کی جانب بھی اشارہ ہوگیا) اس طرح سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے قعدے (وسط صلوٰۃ) میں اگر ہوتے تو صرف تشہد یعنی مع الصلوٰۃ (کیونکہ اللہ کے ارشاد میں دو چیزیں ہیں اور صرف تشہد میں ایک ہی چیز مذکور ہے) پر اکتفا فرماتے۔ اس میں کوئی خرابی نہیں، یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں۔ ایک کے ذکر سے دوسرے کا ذکر ہو ہی جائے گا۔ باقی سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو یہ الفاظ ہیں کہ ((وان كان فی اخرها دعا بعد تشهده بماشاء الله ان يدعو)) اس کو تشہد وصلوٰۃ کے علاوہ اور جو ادعیہ وارد ہیں۔ مثلاً ((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ الخ ، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا كَثِيْرًا . الخ)) ان پر محمول کیا جائے، اس میں کوئی قباحت نہیں۔ بہرصورت اس مسئلے میں مجھے ان ائمہ کرام (امام شافعی وغیرہم رحمہم اللہ) کا موقف صحیح نظر آتا ہے جو پہلے قعدہ میں بھی صلوٰۃ کے پڑھنے کو مشروع جانتے ہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

ملحوظہ ۱: مزید برآں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو "وسط الصلوٰۃ" کے الفاظ ہیں، ان سے مراد اگر نماز کا ٹھیک ٹھیک بیچ مراد ہے تو یہ مغرب کی نماز سے منقوض ہے کیونکہ اس صورت میں مغرب کی نماز میں تشہد کے ساتھ صلوٰۃ پڑھنی جائز ہوگی۔ کیونکہ اس میں پہلا قعدہ ٹھیک ٹھیک بیچ میں نہیں ہے اور اگر وسط سے مراد آخری قعدہ سے پہلے کا قعدہ ہے۔ خواہ ٹھیک وسط و بیچ میں ہو جس طرح چار رکعت نماز میں یا ٹھیک بیچ میں نہ بھی ہو تو پھر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے وسط میں (یعنی دوسرے معنی کے لحاظ سے) تشہد کے ساتھ صلوٰۃ پڑھنی ثابت ہے۔ سعد بن ہشام، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام اللیل کا ذکر کرتے ہوئے)

((فقالت كنا نعد لرسول الله ﷺ سواكه وطهوره فيبعثه الله ماشاء ان يبعثه من الليل فيتسول ويتوضا ثم يصلی تسع ركعات لا يجلس فيهن الاعند الثامنة فيدعوربه ويصلی علی نبيه ثم ينهض ولا يسلم ثم يصلی التاسعة فيقعد ثم يحمد ربه ويصلی علی نبيه ويدعو ثم يسلم تسليمة يسمعنا)) الخ [1]

پھر اسی صفحہ پر امام بیہقی فرماتے ہیں: رواه مسلم فی الصحيح عن ابی بكر بن ابی شيبة اس حدیث کی سند بالکل صحیح ہے۔ رواۃ سب کے سب ثقات ہیں اور سند میں ابن ابی عروبہ اور قتادہ دونوں نے "ثنا"

[1] سنن الكبرى للامام البيهقی: ۲/ ۵۰۰.

کہہ کر سماع کی تصریح بھی کر دی ہے۔ لہٰذا تدلیس کا شبہ بھی نہ رہا۔ دیکھئے (سنن کبریٰ: ج ۲/۴۹۹) اور یہی حدیث بعینہٖ صحیح ابی عوانہ میں بھی موجود ہے۔ [1] اس صحیح حدیث سے بالوضاحت معلوم ہو گیا کہ خود نبی کریم ﷺ نے وسط الصلوٰۃ میں اخیری قعدہ سے پہلے قعدہ میں صلوٰۃ پڑھی اور مسئلہ مزید واضح ہو گیا۔ فللہ الحمد و له المنة و له الفضل و له الثناء الحسن.

اس روایت میں پہلے قعدہ میں جو "فیدعو ربه" وارد ہے اس سے مراد وہی ہے جو نویں رکعت میں "ثم یحمد ربه" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی تشہد (التحیات)۔

مقصد یہ کہ وتر کے درمیانی اور اخیری دونوں قعدوں میں صلوٰۃ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔

ملحوظہ ۲: مسند ابو یعلیٰ کی روایت مزید سندی تحقیق:

اگر بالفرض سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے راوی ابوالجوزاء نہیں بلکہ ابوالحویرث ہو۔ جیسا آں محترم نے حافظ ہیثمی کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ ابوالحویرث کون ہے؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ التقریب میں ''کنی'' کے ابواب میں ''حاء'' مہملہ کی فصل میں لکھتے ہیں: "ابو الحویرث عن عائشة ان لم یکن الذی قبله والا فمجهول من الثالثة" اور اس سے قبل جو ''ابوالحویرث'' ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں: بالتصغیر الزرقی اسمه عبدالرحمن بن معاویة . اب عبدالرحمٰن بن معاویہ کا ترجمہ نکالتے ہیں تو ان کا ترجمہ اس طرح ملتا ہے۔

((عبدالرحمن بن معاویة بن الحویرث بالتصغیر الانصاری الزرقی ابوالحویرث المدنی المشهور بکنیته صدوق سیئی الحفظ رمی بالارجاء من السادسة))

اب آپ ان تراجم پر غور فرمائیں کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے راوی ابوالحویرث عبدالرحمٰن بن معاویہ بن الحویرث ہے تو وہ سیئ الحفظ ہونے کے علاوہ طبقہ سادسہ سے ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب کی ابتداء میں یہ تصریح فرما دی ہے کہ طبقہ سادسہ کے رواۃ کا کسی صحابی سے سماع ثابت نہیں اور حالت یہ ہے کہ سیدہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم سے تو طبقہ خامسہ و رابع کا بھی سماع نہیں بلکہ طبقہ ثالثہ یا ثانیہ کا ہو تو ان سے سماع ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جو راوی طبقہ ثالثہ سے ہی نہیں، تین طبقہ نیچے کا ہوا۔ اس کا سیدہ رضی اللہ عنہا سے سماع کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی یہ روایت ضعیف ہوئی کیونکہ ایک تو اس میں راوی۔ سیئ الحفظ ہے اور دوسری وجہ سند میں مابین السیدہ رضی اللہ عنہا اور ابوالحویرث کے انقطاع ہے۔ لہٰذا یہ روایت بھی ضعیف ہوئی اگر یہ ابوالحویرث ''عبدالرحمٰن بن معاویہ'' ہیں تو وہ مجہول ہے جیسا کہ حافظ صاحب نے فرمایا: ((وقد مرت عبارته)) اور جہالت بھی ائمہ حدیث اور محققین کے نزدیک جرح شدید ہے۔ لہٰذا اس صورت میں بھی یہ روایت ضعیف ہوئی۔ واللہ اعلم

❁❁❁❁

[1] سنن نسائی میں بھی یہ حدیث ہے۔ ج ۱ ص ۲۰۲ مع التعلیقات السلفیه (ص۔ی)

اذان عثمانی کی حقیقت

علماء اہل حدیث اور علماء احناف کے درمیان اذان عثمانی کے بارے میں ایک عرصہ سے اختلاف چلا آ رہا ہے کہ یہ سنت ہے یا بدعت؟ تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ایک بہترین تجویز دی ہے کہ اس کو بدعت کہنا زیادتی ہے۔

(الازہری)

الحمد لله الذی فضل یوم الجمعة علی سائر ایام الاسبوع، وامر عباده ان یذروا البیع اذا نودی للصلوٰة فی مدا الیوم ویسعوا الی ذکره المشروع، والصلوٰة والسلام علی سیدنا محمد الذی ارسله الله الی الناس کافة بالحنیفیة السمحة البیضاء التی لیلها کنهارها فبین لهم بالقول والفعل جمیع الاصول والفروع وخصهم علی التمسك بسنته وسنة خلفائه الراشدین المهدیین وامرهم ان یعضوا علیها بالنواجذ وحذرهم عن محدثات الامور قبل الوقوع وعلی آله واصحابه الذین استنوا بسنته واهتدوا بجمیع سمته وهدیه سواء کان من قبیل المرئی او من قبیل المسموع امابعد!

کافی عرصہ پہلے بھی یہ مسئلہ چل نکلا تھا کہ جمعہ کے دن سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک اذان جوشروع کرائی تھی وہ اب بھی جائز ہے یا نہیں؟ بعض جواز یا مندوب کے حق میں تھے، بعض اس کو بدعت قرار دے کرنا جائز سمجھتے تھے۔

حال ہی میں مولانا ثناء اللہ مدنی نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، جو''الاعتصام''میں شائع ہوا ہے، اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا عبیداللہ عفیف کا مقالہ اسی''الاعتصام''میں چار قسطوں میں شائع ہوا، مولانا کی رائے اس کے مطلق جواز کے خلاف ہے۔ ان کے مقالہ سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہ بدعت ہے۔ راقم اثیم کو حضرت مولانا کے مقالہ میں چند مواخذات نظر آئے اور نظر غائر ڈالنے سے صاف طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ مولانا نے اس مقالہ میں کوئی ایسی مستحکم اور مدلل بات بیان نہیں فرمائی جس سے جواز یا ندب کے حامیوں کا موقف بالوضاحت کمزور نظر آئے۔

اس لیے محض احقاق حق کی نیت سے راقم الحروف نے ارادہ کیا کہ وہ بھی اس موضوع پر کچھ خامہ فرسائی کرے اس لیے قلم اٹھایا اور یہ مقالہ تحریر کرنا شروع کردیا اگر یہ صواب ہوا تو یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے ہے اور اس کا فضل ہے۔ اگر دوسری بات ہوئی تو یہ میرے ناقص علم وفہم کا نتیجہ ہے۔ والله ولی التوفیق وهو حسبی ونعم الوکیل.

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی اس اذان کو بدعت نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان کا یہ فعل اجتہادی واستنباطی ہے۔

استنباط واجتہاد کسی اصل سے ہی کیا جاتا ہے جیسا کہ اس مسئلہ میں ہے، بدعت وہ ہے جس کی کوئی اصل بالکل نہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نماز فجر کے وقت سے پہلے بھی ایک اذان آپ کے ہی امر سے دی جاتی

تھی اور پھر طلوع فجر کے بعد ایک اور اذان جو دخول وقت کا اعلان ہوتی دی جاتی تھی، اور صحیح حدیث میں اس پہلی اذان کے مقصد کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، اسی طرح اذان عثمانی میں بھی قریب قریب یہی مقصد تھا اور ہے۔ لہٰذا ان کا استنباط صحیح ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل استنباطی مانتے ہیں گو انہوں نے استنباط کا اصل دوسرا بتایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

((وتبین مما مضی ان عثمان احدثه لاعلام الناس بدخول وقت الصلوٰة قیاسا علی بقیة الصلوٰة فالحق الجمعة بها...... وفیه استنباط معنی من الاصل لا یبطله)) ❶

''جو کچھ گذر چکا اس سے ظاہر ہو گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس اذان کا اضافہ لوگوں کو نماز کے وقت کے دخول کا اعلام کرنے کے لیے کیا تھا بقیہ نمازوں پر قیاس کرتے ہوئے جمعہ کو بھی ان سے ملحق کر لیا...... اور اس میں اصل سے ایک معنیٰ کا استنباط ہے جس کو اصل باطل نہیں کرتا۔''

جب ایسے حفاظ و محدثین اذان عثمان کو مستنبط قرار دے رہے ہیں گو اس اصل میں جس سے یہ مستنبط ہے اس کے بیان میں وہ مختلف ہیں لیکن مستنبط ہونے میں وہ ہمارے ساتھ متفق ہیں، تو دوسروں کو بھی حق ہے کہ اس کو کسی دوسرے اصل سے مستنبط قرار دیں۔

ہماری نظر میں اذان عثمانی کا فجر نماز کی اذانِ اول والے اصل سے مستنبط ہونا زیادہ قرین قیاس اور محکم موقف معلوم ہوتا ہے۔ اور ہم یہی سمجھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ استنباط ہی تصور کیا اور ان کے استنباط کو صحیح قرار دیا اس لیے انہوں نے اس فعل پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کوئی حرف گیری نہیں کی جیسا کہ ابن حمید اپنی تفسیر میں، ابن المنذر اور ابن مردویہ نے اس سلسلہ میں حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے جو روایت ذکر کی ہے، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

((فلم یعب الناس ذلك علیه وقد عابوا علیه حین اتم الصلوٰة بمنی)) ❷

''تو لوگوں نے اس اذان ثانی کی زیادت پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عیب جوئی نہیں کی حالانکہ جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ''منیٰ'' میں نماز پوری پڑھی (قصر نہیں کیا) تو لوگوں نے ان پر حرف گیری کی۔''

یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ''منیٰ'' میں نماز قصر نہ کرنا بلکہ پوری (حضر والی) پڑھنا تو لوگوں کے مؤاخذہ کا سبب بنی اگرچہ اس کا بھی صحیح دلیل سنت میں موجود تھا۔ امام دارقطنی اپنی سنن میں صحیح سند سے سیدتنا ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت لائے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر

---

❶ فتح الباری: ٢/ ٣٩٤ بتحقیق الشیخ ابن الباز "المکتبة السلفیة".

❷ الدر المنثور للعلامة السیوطی والاجوبة النافعة للعلامة الالبانی.

میں تھیں انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول! آپ نے تو سفر میں افطار کیا لیکن میں نے روزہ رکھا آپ نے نماز قصر کی اور میں نے پوری پڑھی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ نے جواب میں فرمایا اے عائشہ رضی اللہ عنہا تو نے بھی اچھا کیا۔

مقصد یہ کہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے منیٰ میں پوری نماز پڑھنے کی بھی دلیل موجود تھی تاہم چونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ نے سفر میں ہمیشہ قصر ہی کیا تھا اس لیے لوگوں نے حضرت عثمان کی اس بات پر تو حرف گیری کی لیکن جمعہ کے دن اذان ثانی کی زیادت پر کوئی حرف گیری نہیں کی۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل نبی کریم ﷺ کی سنت کے مخالف ہوتا اور کسی نص سے مستنبط نہ ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ جلیل القدر جماعت قطعاً خاموش نہ رہتی حالانکہ اس وقت عشرہ مبشرہ میں سے (۱) حضرت علی (۲) حضرت سعد بن ابی وقاص (۳) حضرت سعید بن زید (۴) حضرت طلحہ بن عبیداللہ (۵) حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ۳۲ ہجری میں وفات پائی غالب گمان یہی ہے کہ اس اذان کے اضافہ کے وقت وہ بھی موجود تھے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ۳۲ یا ۳۳ میں وفات پائی اس کے متعلق بھی یہی گمان ہے کہ وہ اس اذان کے اضافہ کے وقت موجود تھے اور یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بدعت کے سلسلہ میں بہت سخت تھے۔

ایک مرتبہ چند لوگوں کو مسجد میں مجتمع ہو کر چند اذکار ''سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر وغیرہا پڑھتے دیکھا ان اذکار کے پڑھنے کا اجر وثواب احادیث صحیحہ میں موجود ہے تاہم یہ لوگ ان اذکار کو کچھ ایسی ہیئت میں اکٹھے ہو کر پڑھ رہے تھے کہ ہیئت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو سخت ناپسند ہوئی اور ان لوگوں کو بہت سخت وست کہا جب یہ بزرگ ہستیاں اتنی بدعت بھی برداشت نہ کر سکے تو ان کے متعلق یہ خیال رکھنا کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس بات کو خاموشی سے برداشت کر لیا اور ان کو اتنا بھی ٹوک نہ سکے کہ اے امیر المومنین آپ یہ کیا کر رہے ہو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ کی سنت سے انحراف کر رہے ہو حالانکہ (ہمارے موجودہ بزرگوں کے کہنے کے مطابق) نبی کریم ﷺ یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے عہد مبارک میں بھی اس کے متقاضی اسباب تھے لیکن پھر بھی انہوں نے اس کا اضافہ نہیں کیا تم کیوں اضافہ کر رہے ہو؟ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ بہترین جماعت تو ایسی حق گو تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے بارعب خلیفہ کو بھی حق کہہ دیتے تھے حتیٰ کہ عورتیں تک ان کو کلمہ حق کہنے کی جرأت رکھتی تھیں تو ایسے حق گو صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے حلیم الطبع نرم دل انسان کو کلمہ حق کہنے سے ڈرتے تھے یا انہوں نے دانستہ اس سے پہلو تہی کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق انتہائی درجہ کا گھٹیا تصور ہے۔ لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتنی بڑی جماعت کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس بات پر اعتراض نہ کرنا بلکہ اس پر اپنی خاموشی سے اظہار پسندیدگی کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس بات کو سنت سے مستنبط سمجھا، اس کے استنباط کو صحیح تصور کیا اور اس لیے خاموش رہے۔

اسی طرح ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا تھا کہ ''تم میری سنت اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو'' تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو یہ علم عطاء کیا تھا کہ میرے یہ خلفاء راشدین میری سنت کے خلاف نہیں کریں گے۔ جو بھی عمل کریں گے وہ آپ ﷺ کی سنت ہی ہوگی یا ان کی سنت سے مستنبط و ماخوذ۔ اس لیے ان کی سنت سے تمسک کی بھی واضح طور پر ہدایت فرمائی لہٰذا جب یہ اذان ثانی رسول اکرم ﷺ کی سنت سے ہی ماخوذ و مستنبط ہے تو یہ سنت کے خلاف نہ ہوئی اور نہ ہی اس کو بدعت کہا جا سکتا ہے۔ باقی ہمارے محترم مولانا عبید اللہ صاحب عفیف حفظہ اللہ نے جو صاحب سبل السلام کی اتباع میں سنۃ الخلفاء الراشدین کو طریق نظام حکومت میں ہی محدود رکھا ہے تو افسوس! ہم ان سے اس بات میں اتفاق کرنے سے اپنے آپ کو قاصر پاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ طریق نظام حکومت کے بارے میں بھی کتاب وسنت کے ارشادات اور رہنما اصول موجود ہیں، اس لیے وہ خلفاء راشدین طریق نظام حکومت بھی ان اصول وارشادات کے پابند رہ کر ہی عمل میں لا سکتے تھے، ان سے انحراف کے کوئی نظام حکومت چلانے کے وہ قطعی طور پر مجاز نہ تھے اور اب بھی مسلم ممالک ان اصول وارشادات کے ماتحت رہ کر ہی کسی طریق نظام حکومت پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول اکرم ﷺ کا ان خلفاء راشدین کا سنت سے تمسک۔ والے ارشاد؟ کیا معنیٰ ہوئے؟ اور ان کی سنت کا خصوصیت سے ذکر کرنے کا کوئی خاص فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس دور کی کڑی ملانے کی بجائے اگر یہی کہا جائے چونکہ ان خلفاء راشدین کی سنت سنۃ الرسول ﷺ ہی ہوگی۔ یا آپ کی سنت مطہرہ سے مستنبط اس لیے خاص طور پر ان کی سنت سے تمسک کا یہی ارشاد ہوا، اور اس میں کوئی محذور لازم نہیں آتا لیکن خلفاء راشدین کے علاوہ دوسرے لوگوں کی یہ خصوصیت نہیں کیونکہ وہ بسا اوقات سنت سے انحراف بھی کریں گے اور عملاً چند باتوں میں ان سے انحراف سرزد بھی ہوا۔

مولانا محترم نے خلفاء راشدین کی چند باتوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہ باتیں سنت کے خلاف ہیں اور اہل حدیث حضرات بھی ان پر عمل نہیں کرتے۔ اس کے بارے میں یہ گذارش ہے کہ خلفاء راشدین معصوم نہیں تھے، ان پر (نسیان بھی طاری ہو جاتا تھا اور کبھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے امتحاناً یعنی وہ حق کی طرف رجوع کرتے ہیں یا نہیں) ان کو کسی بات کے بارے میں فی الوقت ذہول بھی ہو جاتا تھا لیکن جیسے ہی ان کو معلوم ہو جاتا کہ ان کا یہ فتویٰ...... بات کتاب وسنت کے خلاف ہے تو فوراً اس سے رجوع فرما لیتے۔

جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مجنونہ جس سے زنا کا صدور ہوا کے متعلق رجم کا حکم دیا تھا اور عورتوں کے مہر کے بارے میں فرمایا کہ جتنا نبی کریم ﷺ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو دیا تھا اس سے زائد نہ دیا جائے اگر کسی نے زیادہ دیا تو وہ اس سے چھین کر بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا، لیکن جیسے ہی انہیں معلوم ہوا کہ ان کا یہ

امر کتاب وسنت کے خلاف ہے تو اسی وقت رجوع فرمالیا۔

رہی یہ بات کہ انہوں نے ایک مجلس کی طلاق ثلاثہ کو تین قرار دیا تو یہ بات اسی حدیث میں موجود ہے کہ ان کا یہ امر اس کو سنت متبعہ بنانا نہ تھا بلکہ یہ امر محض تعزیراً تھا، یعنی طلاق مسنون تو یہ ہے کہ ایک ایک ماہ انہیں الگ الگ طلاق دی جائے اس طرح لوگوں کو اپنی رفیقہ حیات نے ہمیشہ کے لیے الگ ہو جانے سے پہلے اس پر غور وفکر کا موقع ملتا ہے کہ آیا میں اس سے ہمیشہ کے لیے الگ ہو جاؤں یا نہیں۔ گوایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں لیکن پھر بھی ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینا سنت کے خلاف ہے لہٰذا جب لوگوں نے اس سنت کے خلاف دھڑا دھڑ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینی شروع کر دیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس سنت کی خلاف ورزی کرنے سے لوگوں کو باز رکھنے کے لیے یہ حکم نافذ کر دیا کہ چلو جب تم سنت کے خلاف کرنے سے باز نہیں آتے تو ہم بھی ان ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی قرار دیتے ہیں، یعنی یہ حکم محض تعزیری تھا جو سنت کے خلاف ورزی سے لوگوں کو باز رکھنے کے لیے کیا گیا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے ایسے انتہائی اقدام کے بغیر لوگ اس چیز کو چھوڑنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے۔

بہرحال یہ حکم، صحیح یا غیر صحیح۔ لیکن محض تعزیری تھا، پس یہ قانون کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے سب کے سب لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا، اور یہی وجہ ہے کہ جماعت اہل حدیث کثر اللہ سوادھم بھی اس پر عمل نہیں کرتی۔ رہی حج تمتع والی بات تو ہمارے خیال میں یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ وہ غالباً (واللہ اعلم) قران یا افراد کو افضل سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان میں محنت وجہد زیادہ ہے اور انہوں نے یہ خیال کیا ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو لوگوں سے حج کے احرام کو کھلوا کر عمرہ بنانے اور بعد میں آٹھویں ذوالحجہ سے حج کے احرام باندھنے کا امر فرمایا۔ یہ اس لیے تھا کہ ان لوگوں کے ذہنوں پر یہ غلط تصور ثبت تھا کہ اشہر الحج میں عمرہ مناسب نہیں اور ان ایام میں وہ عورتوں کے پاس جانا بھی معیوب خیال کرتے تھے، جیسا کہ احادیث میں واضح طور پر آیا ہے، لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ اجتہادی غلطی ہے، جس کی وجہ سے وہ ایک اجر سے تو محروم نہیں ہو سکتے اور یہ بات کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تمتع کو ناجائز نہیں سمجھتے تھے بلکہ قران یا افراد کو افضل تصور فرماتے تھے، اس سے ظاہر ہے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم خصوصاً ان کا بیٹا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بھی ان سے اس مسئلہ میں مخالف تھے اور وہ تمتع کرتے رہتے تھے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زبردستی ان کو نہیں روکا اگر اس کو ناجائز سمجھتے تو ضرور ان کو زبردستی روک دیتے۔ واللہ اعلم

بہرحال ان باتوں کو خلفاء راشدین کے سلسلہ میں اس طرح پیش کرنا کہ یہ کام انہوں نے سراسر سنت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کیے ان بزرگ ہستیوں کے حق میں سوئے ظن کے سوائے اور کچھ نہیں۔ اگر ہمارے کرم فرما حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے استنباط کو بھی اجتہادی غلطی قرار دیتے تو یہ معاملہ کافی حد تک قابل برداشت بن جاتا۔ یہ بھی ہم علیٰ وجہ التنزل کہتے ہیں ورنہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع سے ہمارے نزدیک اس کو اجتہادی غلطی کہنا بھی مسلم

نہیں۔لیکن......افسوس یہ بزرگ تو اس کو بدعت ہی میں لا کر چھوڑنے پر مصر ہیں۔فالی اللہ المشتکی

علامہ البانی جو محقق العصر ہیں اور انہوں نے واقعہ کتاب وسنت کی نہایت بہترین خدمات انجام دی ہیں، افسوس وہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں انصاف نہیں کر سکے ایک طرف وہ "صلوٰۃ النبی ﷺ" میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول کو کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کی رحلت کے بعد "السلام علیک ایھا النبی" کی جگہ "السلام علی النبی" پڑھنا شروع کیا اور عطاء بن ابی رباح کے اس اثر جس میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی وفات کے بعد "السلام علی النبی" پڑھتے تھے۔

ان دو اثروں کے متعلق فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ فعل یا تصرف "توقیف" ہے۔یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول اکرم ﷺ کے کسی نص کی بناء پر انہوں نے یہ تصرف یا تغیر کیا حالانکہ ایسی کوئی حدیث صحیح نہیں ہے،جس میں یہ ارشاد ہو کہ میری رحلت کے بعد تم "السلام علی النبی" پڑھنا۔پھر بھی علامہ صاحب ان چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس تصرف کے متعلق یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ "توقیف" ہے،لیکن دوسری طرف سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ جو خلیفہ راشد ہے ان کے اس عمل کو اتنا شک کا فائدہ دینے کے لیے بھی تیار نہیں کہ یہ فعل ان کا اجتہادی اور استنباطی تھا،گو علامہ موصوف اس استنباط کو صحیح قرار دیں یا غلط؟لیکن کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسی بزرگ ہستی اس حسن ظن کی بھی مستحق نہیں سمجھی گئی بلکہ اس کو بدعت بنانے کے لیے کبھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا جاتا ہے کبھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بلا سند عمل نقل کیا جاتا ہے اور کبھی حسن بصری یا امام زہری رحمہ اللہ کا قول فانا للہ وانا الیہ راجعون، بعض حضرات (جواز اذان عثمان کے خلاف ہیں) چند صحابہ رضی اللہ عنہم کا نبی کریم ﷺ کی رحلت کے بعد "السلام علی النبی" پڑھنے کے متعلق اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کا دعویٰ کرنے سے بھی نہیں چوکتے حالانکہ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔

بہر کیف ان تمام معروضات کا یہ مقصد ہے کہ اولاً تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ حکم استنباطی ہے لہٰذا اس کو بدعت کہنا اصولاً صحیح نہیں۔واللہ اعلم

۲۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع حجت ہے۔اور اذان عثمانی پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو چکا ہے،لہٰذا یہ بدعت نہیں بلکہ مشروع ہے۔اس (اذان عثمانی) پر صحابی رضی اللہ عنہ کے اجماع دلیل تو وہ روایت ہے جو اس سے پہلے حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے ذکر کر چکے ہیں،جس میں یہ صراحت ہے کہ لوگوں نے اس اذان کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی حرف گیری نہیں کی۔لوگوں سے مراد اس جگہ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی ہیں جب ان سب کے سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس فعل کو استحسان کی نظر سے دیکھا،اس لیے ان پر کوئی حرف گیری نہ کی تو معلوم ہوا کہ اس پر ان کا اجماع ہو گیا تھا۔دوسری دلیل یہی حضرت سائب بن یزید کی حدیث ہے جو صحیح بخاری وغیرہ میں ہے۔

صحیح بخاری والی حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:

((فثبت الامر علی ذلك)) ❶

''پھر یہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عمل (سب اسلامیہ بلاد میں جو اس وقت تھے) باقی اور ثابت رہ گیا۔''

اور صحیح ابن خزیمہ اسی روایت کے یہ الفاظ ہیں:

((فثبت ذلك حتى الساعة نقلا عن)) ❷

''پھر یہی عمل (اذان عثمانی) اس وقت تک اسلامی قلمرو میں ثابت رہ گیا۔''

اس پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((والـذی يـظهر ان الناس اخذوا بفعل عثمان فی جميع البلاد اذ ذاك لكونه خليفة مطاع الامر)) ❸

''ان الفاظ (فثبت الامر الخ) سے جو ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت جتنے شہر تھے ان سب کے لوگوں نے اس عمل عثمانی کو لے لیا تھا کیونکہ وہ (برحق) خلیفہ تھے ان کے امر کی اطاعت کی جاتی تھی۔''

یہ الفاظ ''فثبـت الامـر علـى ذلك'' امام زہری کے ہوں یا حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کے ہوں جو انہوں نے امام زہری سے کہے دونوں صورتوں میں یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ امام زہری کے عہد تک اس عمل میں کہیں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ یہ روایت اصح الکتب بعد کتاب اللہ تعالیٰ کی ہے امام زہری حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہنچ نہیں سکے۔ لہٰذا اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور حکومت میں اذان عثمانی کو...... میں موقوف کر دیا تھا تو اس کا پتہ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ یا امام زہری رحمہ اللہ کو لازمی طور پر ہوتا پھر وہ کیسے یہ کہہ سکتے تھے کہ اس وقت تک بلاد اسلامیہ میں یہ اذان عثمانی ثابت رہ گئی۔ حالانکہ وہ دارالحکومت کوفہ میں بند ہو چکی تھی؟

اگر واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی کوئی روایت یا سند ہوتی تب بھی صحیح بخاری وغیرہ کی اس صحیح حدیث کے مقابلہ میں وہ مرجوح ہی ہوتی چہ جائیکہ اس اثر کی کوئی سند ہی نہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مغرب کی بات تو کی ہے کہ اس کے متعلق مجھے یہ خبر ملی ہے کہ وہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک والی اذان پر اکتفاء کیا جاتا تھا (اگرچہ محدثانہ اصول کے مطابق اس پر بھی یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ مبلغ (بکسر اللام) کون ہے اور یہ خبر کہاں تک معتمد علیہ ہے) تاہم انہوں نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اثر کا ذکر نہیں کیا اگر یہ صحیح ہوتا تو حافظ صاحب ''فثبـت الامر الخ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ضرور یہ فرماتے کہ ''لیکن یہ عمل

---

❶ صحيح البخاری مع فتح الباری: ٢/ ٣٩٧ بتحقيق الشيخ ابن باز.

❷ عن فتح الباری: ٢/ ٣٩٤.

❸ فتح الباری: ٢/ ٣٩٤.

کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں بند ہو گیا تھا۔“

لیکن حافظ صاحب نے ایک لفظ بھی اس سلسلہ میں نہیں کہا، کیا یہ عجیب بات نہیں؟ بڑے افسوس کی بات ہے کہ علامہ البانی حفظہ اللہ جیسا وسیع المطالع اور محقق جو احادیث وروایات کے سلسلہ میں کافی احتیاط وتشدد اختیار کرتے ہیں اور اسانید پر ہر پہلو سے بحث فرماتے ہیں اور اگر سند کے ہوتے ہوئے بھی اس میں ذرا سی علت کا سراغ مل جاتا ہے تو اسے حسن کے درجہ سے بھی گرا کر ضعیف قرار دے دیتے ہیں، لیکن زیر بحث مسئلہ میں وہ چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فیور میں نہ تھے اس لیے اپنے موقف کے اثبات کے لیے ”الاجوبة النافعة“ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اثر ”یعنی انہوں نے اپنے دور حکومت میں عثمانی اذان کو کوفہ میں بند کر دیا تھا“ بلاتحقیق نقل فرما کر صرف تفسیر قرطبی کا حوالہ دے کر چلتے بنے۔ ایسے محقق العصر سے ایسی بات کا صدور کتنا انوکھا دکھائی دے رہا ہے۔

اور اس اثر کو اس طرح تحریر فرمایا گویا یہ بات باسند ثابت شدہ حقیقت ہے۔ فیا للعجب

پھر مولانا عبید اللہ عفیف حفظہ اللہ نے بھی عجیب ستم ظریفی کا مظاہرہ فرمایا کہ بلاتحقیق محض علامہ البانی کی تحریر کو حرف آخر تصور فرما کر قرطبی کے تفسیر ہی کا حوالہ دے دیا اور ”الاعتصام“ میں اس کے طرز تحریر سے صاف عیاں ہو رہا ہے کہ وہ اس بات پر یقین رکھے ہوئے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ والا یہ اثر صحیح وثابت ہے۔ ہم نے تفسیر قرطبی کو دیکھا انہوں نے یہ اثر ضرور نقل کیا ہے لیکن نہ تو اس کی سند ذکر کی ہے نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس فعل کے بلاواسطہ راوی کا ہی نام تحریر کیا اور نہ ہی کسی مستند کتاب کا حوالہ دیا۔

امام قرطبی نے ساتویں صدی ہجری میں وفات پائی ان کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان کم از کم کتنے وسائط ہونے چاہئیں یہ اہل علم بالحدیث بخوبی جانتے ہیں لیکن یہ وسائط کیسے ہیں ثقہ یا ضعیف کچھ پتہ نہیں۔ ایسے غیر مستند اثر کو لے کر اس خارزار میں کود پڑنا اہل حدیث کو زیب نہیں دیتا۔ علامہ البانی کا مطالعہ نہایت وسیع ہے ان کی نظر سے بہت سے ایسے کتب احادیث وروایات بھی گذرے ہیں جو ہم نے نہیں دیکھے اگر یہ اثر باسند کسی مستند کتاب میں ان کی نظر سے گذرا ہوتا تو وہ صرف تفسیری قرطبی کے بے سند اثر کے حوالہ دینے پر ہرگز اکتفاء نہ کرتے اور مولانا عبید اللہ صاحب کو بھی یہ مناسب نہ تھا کہ وہ بغیر تحقیق اس اثر کو اپنے مقالہ میں تحریر فرماتے محدثین کرام رحمہم اللہ تو ان روایات کے اسانید کی جو احکام، عقائد اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شوق سے متعلق ہیں، کافی چھان بین اور نہایت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے مولانا نے تو یہ زحمت بھی اٹھانی ضروری نہیں سمجھی کہ وہ دیکھ لیتے کہ آیا اس اثر کی کوئی سند بھی ہے یا نہیں پھر اس غیر سند اثر کو لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو ذوالنورین خلیفہ راشد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تیسرے نمبر پر (جمہور اہل سنت کے نزدیک) افضل خلیفہ تھے، کے اس فعل کو دبے الفاظ میں بدعت قرار دے رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک صحیح العقیدہ اہل سنت والجماعۃ کے مسلمان کے لیے تو اس قسم کے انتساب کا تصور بھی سوہان روح ہوگا لیکن کیا کیا جائے

وللناس فيما يعشقون مذاهب .

ایک طرف تو مولانا اوران کے ہمنوا اس کو بدعت قرار دیتے ہیں اضطراری حالت کے تحت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس فعل کی وکالت بھی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ بے اختیار ''عذر گناہ بدتر از گناہ کا نمونہ سامنے آ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں: یہ ایک ہنگامی اوروقتی ضرورت تھی جس کے پورے کرنے کے لیے یہ اذان زیادہ کی گئی اب یہ ضرورت چونکہ ختم ہوگئی ہے لہٰذا اس سے پرہیز ہی اولیٰ ہے۔ ہماری گذارش یہ ہے کہ یہ ہنگامی یاوقتی ضرورت اب ختم ہوگئی ہے یا نہیں اس کو تو آپ سردست نہ چھیڑیں، یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کوئی آدمی گو وہ خلیفہ راشد ہی ہو اس کا مجاز بھی ہے یانہیں کہ وہ کسی ہنگامی حالت میں احداث فی الدین کرے؟

اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو ان اعذار یاردہ کے پیش کرنے کی زحمت کیوں اٹھائی جارہی ہے؟ ان اعذار سے تو آپ اور بھی زیادہ اس الزام کومضبوط بنارہے ہیں جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر لگایا جارہا ہے۔ لہٰذا اگر آں محترم اپنے موقف کو صحیح سمجھتے ہیں تو جرأت سے کام لیجئے اور صاف لفظوں سے اعتراف فرمائیں کہ واقعتاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس فعل سے احداث فی الدین کے مرتکب ہوگئے تھے لیکن اس فتویٰ سے پیشتر یہ بھی سوچ لیجئے کہ اتنی بڑی جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو اس پر اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر کوئی حرف گیری نہیں کی ان کا کیا بنے گا؟

اس کا جواب میں آپ پر ہی چھوڑتا ہوں۔

بہرصورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اثر بالکل بے سند ہے لہٰذا معرض استدلال میں اسے پیش کرنا اہل حدیث علماء کی شان سے بمراحل بعید ہے اس اثر پر اس نہج سے بھی غور کیا جائے کہ اس اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دارالخلافہ کوفہ میں عثمانی اذان بند کردی تھی اس کا واحد سبب یہی ہوسکتا ہے کہ وہ اس کو بدعت تصور فرماتے تھے اگر یہی بات ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ اس کو بدعت یا احداث فی الدین ہی تصور کرتے تھے تو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ کلمہ حق کیوں نہیں کہا؟ نہ کہنے کی بظاہر دو ہی وجہیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے کلمہ حق کہنے کی جرأت نہیں تھی۔

۲۔ جرأت تو تھی لیکن انہوں نے دانستہ منافقت اختیار کی اور کلمہ حق کہنے سے گریز کیا (لیکن کوئی صحیح العقیدہ اہل السنۃ والجماعۃ میں سے ان دونوں باتوں میں سے ایک کا بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب انتساب کرنا جائز نہیں سمجھے گا۔

اس سے واضح ہوگیا کہ یہ اثر روایۃ اور درایۃ ناقابل اعتبار ہے۔

پھر مولانا گھڑیوں کی بات بھی کرتے ہیں، یعنی اس وقت گھڑیاں نہیں تھیں، آج ان کی ایجاد سے کافی سہولت ہوگئی ہے لیکن کیا گھڑیوں کی ایجاد نے نماز کے اوقات معلوم کرنے کے لیے جو ارشادات شریعت مطہرہ نے دے

ہیں ان سے مستغنی کر دیا ہے؟ جواب یقیناً نفی میں ہے موسم سرما میں گھڑیوں کے مطابق جس وقت زوال ہوتا ہے موسم گرما میں اس وقت ابھی تو استواء ہی ہوتا ہے بلکہ کبھی استواء ہی نہیں ہوتا زوال تو اس کے بھی بعد ہوتا ہے ایک مرتبہ ہماری مسجد کے مؤذن نے گھڑی میں دیکھا اور سمجھا کہ ظہر کا وقت ہو گیا ہے کیونکہ اس دن سے پندرہ بیس دن پہلے اسی ٹائیم پر اذان دیا کرتا تھا لیکن ہم نے جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابھی زوال تو ہوا نہیں اس لیے دس بارہ منٹ بعد پھر اذان دلوائی۔

شریعت مطہرہ نے ظہر کے لیے زوال عصر کے لیے سایہ کا ایک مثل ہونا، مغرب کے لیے سورج کا غروب ہونا، عشاء کے لیے شفق کا غائب ہونا اور صبح کی نماز کے لیے فجر صادق کا طلوع ہونا نمازوں کے اوقات کے لیے علامات مقرر کی ہیں۔ جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں یہ علامات ہی معتبرہ تھیں اسی طرح اس وقت بھی (گھڑیوں وغیرہا کی ایجاد کے باوضو نماز کے اوقات کے لیے یہی علامات متعین ومعتبرہ ہیں۔

لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ لوگوں کی اطلاع کے لیے اذان کا ہی اضافہ کریں، وہ خلیفہ مطاع الامر تو تھے ہی لوگوں کو تاکیداً امر فرما دیتے کہ جمعہ کے دن جب استواء ہو جائے تب تم مسجد کی طرف آنے کی تیاری کر و اور گھروں سے نکل کر مسجد کی جانب روانہ ہو جاؤ تاکہ جیسے ہی زوال ہو تو تم خطبہ کا بھی استماع کر سکو اور نماز میں بھی ابتداء ہی سے شامل ہو سکو۔ خواہ مخواہ ایسے فعل کا ارتکاب کیوں کیا جو (آپ کے خیال کے مطابق احداث فی الدین ہے؟)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مذکور اثر کے سلسلہ میں میری آخری گذارش یہ ہے کہ اگرچہ ہمارے محترم دوست مولانا ثناء اللہ صاحب مدنی حفظہ اللہ نے اس کو صحیح فرض کر کے اس کی بہترین توجیہ پیش فرمائی ہے لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جہاں تک میرا مبلغ علم ہے اور میری ناقص جستجو کا تعلق اس اثر کی کوئی سند مجھے نہیں مل سکی۔

اگر علامہ البانی، مولانا عبیداللہ صاحب اور ان کے ہمنوا کسی مستند کتاب سے یہ اثر بمعہ صحیح سند کے دکھا دیں تو میں اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ واللہ تعالیٰ یقول الحق وھو یھدی السبیل

ہمارے محترم مولانا صاحب، علامہ البانی اور چند دوسرے بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس اجماع کی نفی کے لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر بھی پیش فرماتے ہیں۔ جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں جید سند کے ساتھ ان سے مروی ہے کہ وہ اس اذان ثانی عثمانی کو بدعت قرار دیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی جلالت قدر سے انکار نہیں اور ان کی فقاہت بھی مسلم لیکن کیا ان سے غلطی سرزد نہیں ہو سکتی تھی؟ یہی جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں کہ صلوٰۃ الضحیٰ کو بدعت کہتے تھے دیکھیے ''بخاری شریف مع فتح الباری وغیرہ'' حالانکہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً وفعلاً صلوٰۃ الضحیٰ کی حدیثیں روایت کی ہیں لہٰذا ان کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری

جماعت کی تغلیط کر کے صرف ان کی بات کو صحیح مان کر اس عثمانی اذان کو بدعت قرار دینا قرین عقل وقیاس معلوم نہیں ہوتی اس لیے اولیٰ تو یہی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تطبیق کی صورت نکالی جائے، اور وہ یہی ہوسکتی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول کا مطلب یہ لیا جائے کہ یہ اذان بعینہٖ اس طرح نبی کریم ﷺ کے دور میں نہیں تھی گو نص سے مستنبط ہونے کی وجہ سے یہ بدعت سیئہ یا احداث فی الدین تو نہیں ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے والد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی باجماعت تراویح کو بدعت کہا تھا لیکن ساتھ ہی اس کو نعمت'' بھی کہا یعنی یہ اچھی بدعت ہے یہ اس لیے کہ باجماعت تراویح تو خود نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے پھر بدعت کیسی لیکن اس باجماعت تراویح کا چونکہ عہد نبوی میں طریقہ مستمرہ میں رہا اس لیے اس استمرار کو انہوں نے بدعت کہہ دیا یعنی اصل تو ثابت ہے جس کی وجہ سے وہ اچھی ہے اور استمرار بعد میں ہوا اس لحاظ سے اس کو بدعت بھی کہہ دیا لیکن چونکہ اصل موجود ہے اس لیے یہ بدعت سیئہ نہیں ہے۔ بعینہٖ اسی طرح ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ اذان عثمانی کا اصل تو موجود ہے لیکن بعینہٖ اسی ہیئت میں اس وقت موجود نہ تھی اس لیے اس کو صحابی رضی اللہ عنہ نے بدعت کہہ دیا لیکن چونکہ اصل موجود ہے اس لیے اصطلاحی بدعت نہیں کہا جائے گا۔

خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما صلوٰۃ الضحیٰ کو بدعت کہنے کے باوجود اس کو ''نعمت'' بھی کہتے تھے یعنی یہ اچھی بدعت ہے دیکھئے کتب احادیث:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ویحتمل انه یرید انه لم یکن فی زمن النبی ﷺ وکل ما لم یکن فی زمنه یسمی بدعة لکن منها ما یکون حسنا)) ❶

''اور یہ احتمال ہے کہ (حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اس کو بدعت کہنے کا) یہ مطلب ہو کہ یہ چیز نبی کریم ﷺ کے مبارک زمانہ میں نہ تھی اور جو چیز آپ کے زمانہ میں نہ ہو اس کو بدعت کہا جاتا ہے لیکن ایسی بدعت میں سے کوئی بدعت حسنہ ہوتی ہے۔ (یعنی جس کا اصل موجود ہو)۔''

جیسے فیما نحن فیه میں ہے) اور کوئی اس کے خلاف یعنی بدعت سیئہ (یعنی جس کی اصل بالکل نہ ہو) ہمارے خیال میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سوا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت کی تغلیط کی بجائے اگر ان دونوں میں اس قسم کی کوئی بہترین صورت تطبیق وتوفیق کی اپنائی جائے تو یہ اولیٰ وانسب ہے۔ بصورت دیگر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد اگر علی سبیل الانکار ہی تھا اور وہ اس کو بدعت سیئہ ہی سمجھتے تھے تب بھی اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم پر اس سے کوئی مضر اثر نہیں پڑ سکتا کیونکہ صحیح بات یہی ہے کہ ایک فرد کے نکل جانے سے اجماع کا انتفاء نہیں ہوتا اور نہ ہونا ہی چاہیے۔ جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سوا صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت (جن میں چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے بھی تھے جو یقیناً حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے افضل تھے) نے اذان عثمانی کو لے لیا اور اس کو بدعت سمجھ کر اس پر نکیر بھی

نہیں فرمائی اور نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اس کی وجہ سے کوئی حرف گیری کی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ثابت ہوگیا اس لیے فعل عثمان قطعاً بدعت نہ ہوا۔

بعض حضرات کو بدعت حسنہ و بدعت سیئہ کی تفریق پر بھی اعتراض ہے ان کا کہنا ہے کہ بدعت سب کی سب سیئہ ہی ہے وہ حسنہ نہیں ہوسکتی ہم باادب گذارش کریں گے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی تو بدعت کی حقیقت سے آگاہ تھے لیکن انہوں نے باجماعت تراویح استمرار کے ساتھ پر بھی بدعت کا اطلاق کیا تھا لیکن یہ حضرات بھی اس کو بدعت سیئہ نہیں سمجھتے۔ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ''بدعة'' کے ساتھ اس کو ''نعمت'' بھی کہہ دیا یعنی یہ اچھی بدعت ہے، آپ ہی فرمائیں کہ اس کی کیا توجیہہ ہوگی؟

بعض بزرگ حضرات جو اس بات پر مصر ہیں کہ ایک فرد کے نکل جانے سے بھی اجماع منثی ہو جاتا ہے وہ بھی عجیب تناقض میں مبتلا ہیں ایک جانب وہ عثمانی اذان کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت کے اجماع کو اجماع تسلیم نہیں کرتے محض اس لیے کہ اس جماعت سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نکل گئے ہیں، لہٰذا اس ایک فرد کے نکل جانے سے اجماع ہے ہی نہیں تو دوسری جانب یہی بزرگ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کیا اس فرمان کو کہ ''ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد "السلام عليك ايها النبى" کی بجائے "السلام على النبى" کہنا شروع کیا، کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع قرار دے رہے ہیں۔

حالانکہ ان الفاظ سے اجماع الصحابہ رضی اللہ عنہم کا ثبوت مل رہا ہے۔ اولاً: ''ہم نے اس طرح کیا'' سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ یہ سب کے سب صحابہ کا فعل تھا؟ اور یہ بتلایا جائے کہ ''ہم نے'' کی صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت پر دلالت، دلالت ثلاثہ، مطابقی، تضمنی، التزامی۔ میں سے کونسی دلالت ہے؟

ثانیاً: اجماع کا یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے اس لیے کہ سنن کبریٰ للبیہقی میں صحیح سند سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے لوگوں کو تشہد بتایا اور اس میں "السلام عليك ايها النبى" کے الفاظ ہی کہے اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بھی سنن کبریٰ للبیہقی اور حدیث کے دوسرے کتب میں صحیح سند سے تشہد کے جو الفاظ وارد ہیں ان میں "السلام عليك ايها النبى" ہی مذکور ہے کیا ان دو جلیل القدر صحابیوں رضی اللہ عنہما کے نکل جانے کے باوجود بھی آپ کا مزعومہ اجماع ثابت ہے، دراں حالیکہ آپ ایک صحابی کے نکل جانے سے بھی اجماع کے ثبوت سے انکار کرتے ہیں، پھر یہ دورنگی کیوں؟ بلکہ ہم قارئین کرام کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ حضرات اپنے اس موقف پر کہ "السلام على النبى" کہنے پر اجماع صحابہ ہے دلیل کے طور پر چار پانچ (زیادہ سے زیادہ) صحابہ رضی اللہ عنہم سے زائد کوئی سند و متصل صحیح السند روایت پیش نہیں کرتے پھر یہ اجماع کا دعویٰ کہاں تک درست ہے یہ اہل علم حضرات کے سوچنے کی بات ہے اگر ان باتوں کے باوجود آپ اس پر بضد ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے

❶ فتح الباری: ۲/ ۳۹۴.

نکل جانے سے اجماع نہیں ہوا تو پھر آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم سب اہل السنۃ والجماعۃ جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ "الحمد لله رب العالمين" سے لے کر "من الجنة والناس" تک قرآن کریم ہی ہے اس پر بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع نہیں ہوا اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین (قل اعوذ برب الفلق وقل اعوذ برب الناس) کو مصحف میں نہیں لکھتے تھے بلکہ ان دوسورتوں کو مصحف سے محو کر دیتے تھے اس کے ثبوت میں بہت سی روایات صحیحہ موجود ہیں چنانچہ یہ روایات مسند احمد، زوائد مسند احمد، ابن حبان، مستخرج للاسماعیلی، مستخرج لابی نعیم، مسند حمیدی، طبرانی، ابن مردویہ اور مسند بزار میں موجود ہیں، چنانچہ عبدالرحمٰن بن یزید فرماتے ہیں:

((كان عبدالله يحك المعوذتين من مصحفه ويقول انهما ليتا من كتاب الله تبارك و تعالىٰ))

"ابن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے مصاحف میں سے ان (دوسورتوں) کو مٹاتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ دونوں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب میں سے نہیں ہیں۔"

یہ روایت مسند احمد ۱/ ۱۲۹، طبرانی کبیر رقم: ۱۹۵۰، ابن ابی شیبہ ۱۰/ ۵۳۸ وغیرہ میں موجود ہے۔ عبدالرحمٰن بن یزید کے علاوہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہی قول علقمہ اور زر بن حبیش نے بھی نقل کیا ہے۔ (ابن کثیر ۴/ ۵۷۱ ابن ابی شیبہ، المطالب العالیہ ۳/ ۴۰۲ وغیرہ)

علامہ ہیثمی فرماتے ہیں:

((رجال عبدالله رجال الصحيح ورجال الطبراني ثقات)) [1]

"کہ عبداللہ بن احمد کے راوی الصحیح کے راوی ہیں اور طبرانی کے رواۃ بھی ثقہ ہیں۔"

امام بزار نے بھی یہی اثر نقل کیا ہے جس کے الفاظ ہیں:

((لانه كان يحك المعوذتين من المصحف ويقول امر النبي ﷺ ان يتعوذ بهما وكان عبدالله لا يقرا بهما))

"یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو مصحف سے صاف کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے تعوذ یعنی دم کا حکم دیا ہے اور عبداللہ رضی اللہ عنہ ان کو نماز میں نہیں پڑھتے تھے۔"

یہ روایت طبرانی میں بھی ہے، علامہ ہیثمی لکھتے ہیں:

((رجالهما ثقات)) [2]

"طبرانی اور بزار کے راوی ثقہ ہیں۔"

---

[1] مجمع الزوائد: ٧/ ١٤٩. [2] المجمع: ٧/ ١٤٩.

پھر اس روایت کے بعد امام بزار فرماتے ہیں:

((لم یتابع عبداللہ احد من الصحابة وقد صح عن النبی ﷺ انه قرأبهما فی الصلوٰة واکتبتا فی المصحف" المجمع ایضا)) ❶

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی کسی بھی صحابی نے موافقت نہیں کی اور نبی ﷺ سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ آپ نے ان دونوں کو نماز میں پڑھا ہے اور مصحف میں لکھوایا۔''

اس سلسلہ میں اور بھی روایات ہیں، لیکن اس جگہ ان سب کا احصاء مطلوب نہیں، بعض علماء مثلاً امام نووی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف اس انتساب کو باطل قرار دیتے ہیں لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والطعن فی الروایات الصحیحة بغیر مستند لا یقبل))

''یعنی ان روایات صحیحہ میں بغیر دلیل کے اعتراض قابل قبول نہیں۔''

اسی طرح علامہ سیوطی نے اتقان فی علوم القرآن کے صفحہ ۷۹ پر علامہ نووی کے اس قول کی تردید حافظ ابن حجر سے نقل کی ہے اور اس سے پیشتر صفحہ ۶۵ پر لکھتے ہیں:

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ۱۱۲ ایک سو بارہ سورتیں ہیں:

بعض علماء نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس بات کی یہ تاویل کی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے معوذتین کا قرآن میں ہونے سے انکار نہیں کیا بلکہ ان دو سورتوں کو مصحف میں لکھنے سے انکار کیا وہ نبی کریم ﷺ کی اجازت کے بغیر مصحف میں کسی سورت کو لکھنا صحیح نہیں سمجھتے تھے اور انہیں اس کی (معوذتین کے لکھنے کی) اجازت صحیح نہیں سمجھتے تھے اور انہیں اس کی (معوذتین کے لکھنے کی) اجازت نہیں پہنچی تھی۔ اس پر حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

((هو تاویل حسن الا ان الروایة الصحیحة التی ذکرتها تدفع ذلك)) ❷

''یہ تاویل تو بہتر ہے مگر جس صحیح روایت کا میں نے ذکر کیا ہے یقیناً اس سے اس تاویل کی تردید ہوتی ہے۔''

اس مسئلہ پر اگر تفصیلی نگاہ ڈالنی ہو تو ہمارے محترم دوست حضرت مولانا ارشاد الحق صاحب الاثری کی کتاب ''توضیح الکلام'' حصہ دوم صفحہ ۴۲ کے آخر سے صفحہ ۴۶ تک مطالعہ فرمائیں۔

بہر حال ان حضرات کے موقف پر تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس بات پر بھی اجماع نہیں کہ قرآن مجید میں ۱۱۴ ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ قبیلہ خزرج کا سردار، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے مختلف ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

❶ المجمع: ۷/ ۱۴۹. ❷ فتح الباری: ۸/ ۷۴۳.

((وقصته في تخلفه عن بيعة ابى بكر مشهورة وخرج الى الشام فمات بحوران)) ❶

''اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے تخلف کا قصہ مشہور ہے (یعنی انہوں نے بیعت نہیں کی تھی) اور وہ مدینہ سے ہی شام کی طرف چلے گئے اور وہاں حوران میں ان کی وفات ہوئی۔''

اسی طرح حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((وتخليف سعد بن عبادة بيعة ابى بكر رضي الله عنه وخرج من المدينة ولم ينصرف اليها الى ان مات بحوران من ارض الشام)) ❷

''اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہے اور مدینہ سے نکل گئے اور پھر واپس نہیں آئے حتیٰ کہ شام کی زمین میں حوران کے مقام پر وفات پائی۔''

اگر ایک فرد کے نکل جانے سے اجماع منتفی ہو جاتا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع نہیں ہوا۔ حالانکہ اہل سنت تو اس کے قائل ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو گیا تھا۔

یہاں پہنچ کر ہم ان حضرات سے عرض کریں گے کہ اگر وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نکل جانے سے قرآن کریم کے متعلق بھی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس پر بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع نہیں ہوا۔

اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے تخلف سے بھی آپ یہی نتیجہ نکالنے کے لیے تیار ہیں، تو چلو اذان عثمانی کے متعلق بھی یہی فرماتے رہیں کہ اس پر بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع نہیں ہوا، لیکن اس صورت میں آپ کو یہ حق نہیں کہ دوسروں کو بھی اپنے اس موقف کا پابند بنانے کی سعی فرمائیں اور اگر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے خروج کے باوجود آپ قرآن کریم پر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع کے معتقد ہیں اور صرف حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے تخلف سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اجماع کا انکار نہیں کرتے تو از رو انصاف بتائیے کہ صرف ایک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اذان عثمانی کے بارے میں بدعت کہنے سے اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم انتفاء کی کونسی معقول وجہ ہے؟

بہر کیف ہم یقین رکھتے ہیں کہ اذان عثمانی پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو چکا تھا اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہوا تو حجت ہے اور اذان عثمانی بدعت یا احداث فی الدین نہ ہوئی مندوب ومشروع۔

آپ اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے تو نہ کیجئے لیکن دوسروں پر تو اس طرح بے تحاشا نکیر نہ فرمائیں اور اس دھن

❶ الاصابة: ٢/ ٣٠، طبع بيروت.

❷ الاستيعاب على هامش الاصابة: ٢/ ٤٠.

میں حضرت عثمان خلیفہ راشد رضی اللہ عنہ وارضاہ کی جانب دبی زبان میں احداث فی الدین کے انتساب سے بھی پرہیز نہ کریں یہ آپ جیسے اہل علم حضرات کے لیے (میرے نزدیک) قطعی طور پر مناسب نہیں۔

مولانا عبیداللہ صاحب حفظہ اللہ قسط میں فرماتے ہیں:

''بلاشبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع حجت ہے مگر اذان عثمانی پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ثابت نہیں ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امام زہری۔ امام حسن بصری، ایسے فقہاء تابعین اس کو بدعت اور محدث نہ گردانتے اور امام شافعی ایسے مجتہد اس کے خلاف رائے قائم نہ کرتے۔'' الخ (الاعتصام ۳ ربیع الثانی ۱۴۱۰ صفحہ ۱۲ کالم ۱)

یہ اقتباس مولانا جیسے محقق کی شان سے بمراحل بعید ہے۔ مولانا کی عبارت سے صاف عیاں ہے کہ وہ حضرت علی وعبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما دونوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اذان کو بدعت ومحدث قرار دینے والے سمجھتے ہیں، حالانکہ نہ شیخ البانی نے اور نہ ہی حضرت مولانا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی ایسا قول نقل فرمایا ہے جس میں یہ ہو کہ وہ اذان عثمانی کو بدعت کہتے تھے اگر ایسا کوئی ان کا قول باسند صحیح موجود ہے تو وہ برائے نوازش ہمیں دکھا کر ہماری معلومات میں اضافہ فرمائیں۔

اگر وہ بالفرض ایسا کہتے تھے تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر نکیر کیوں نہ کی؟ دراصل مولانا کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب یہ انتساب محض اس فعل پر مبنی ہے جو تفسیر قرطبی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن مذکورہ بالاصفحات میں ہم یہ ثابت کر آئے ہیں کہ یہ اثر ابھی تک ثابت نہیں کیا جا سکا۔ اس کی کوئی سند ابھی تک تو ہمیں مل نہیں سکی لہٰذا ایسی روایت یا ایسے اثر کو محض یہ دیکھ کر کہ یہ ایک جلیل القدر مفسر کی کتاب میں ہے اس پر اعتماد رکھ کر بغیر سندی تحقیق کے اس قسم کا انتساب کہاں تک صحیح ہے یہ فیصلہ اہل علم خود فرمائیں، ایسے معرکۃ الآراء مسائل پر محض حسن ظن سے کام نہیں لیا جا سکتا بلکہ مدعیان حضرات کو سب سے پہلے اس کی سند پیش کرنی چاہیے تھی اگر اس کی سند صحیح ہوتی تو اس سلسلہ میں انہیں کچھ کہنے کی بلاشبہ گنجائش تھی لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اثر کی کوئی سند نہیں، مزید اس کے بارے میں مذکورہ بالاصفحات میں ہم کافی عرض کر آئے ہیں۔

رہا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تو ان کے بارے میں اپنی گذارشات قارئین کرام کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ والی روایت میں بے شک "بدعة و محدث" کے الفاظ ہیں، لیکن محدثانہ اصول پر اس اثر کی سند ضعیف ہے۔

اس لیے کہ اس کی سند میں ہشیم بن بشیر ہے اور یہ تیسرے مرتبہ کا مدلس ہے۔ دیکھئے ''طبقات المدلسین'' للحافظ ابن حجر، اور تیسرے مرتبہ کے مدلسین کی روایات جب تک سماع کی تصریح نہ کریں مقبول نہیں ہوئیں اور یہاں وہ تصریح سماع نہیں کرتے بلکہ ''عن'' سے روایت کرتے ہیں دیکھئے المصنف لابن ابی شیبہ، پھر فن رجال کی

کتب (التہذیب وغیرہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ہیثم بن بشیر'' کی ولادت ۱۰۴ یا ۱۰۵ ہجری میں ہوئی اور امام حسن بصری رحمہ اللہ ۱۱۱ ہجری میں وفات پا گیا تھا لہٰذا ایسے صغیر بچہ کا امام حسن بصری سے سماع ناممکن تو نہیں لیکن بعید ضرور ہے اس وجہ سے یہ روایت منقطع ہے اس لیے ضعیف۔ لہٰذا اس اثر کو تو معرض استدلال میں پیش فرمانا ہی صحیح نہیں، رہا امام زہری تو ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

((فاحدث امیر المومنین عثمان التاذینة الثالثة علی الزوراء لیجتمع الناس))

''پھر امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے تیسری اذان کو نئے سرے سے بڑھایا جو زوراء کے مقام پر دی جاتی تھی تاکہ لوگ (خطبہ ونماز) کے لیے مجتمع ہو جائیں۔''

اس اثر میں بھی بدعت کا لفظ تو اصلاً نہیں ہے صرف یہ لفظ ہے ''فاحدث'' ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس ہیئت کذائیہ کے لحاظ سے یہ اذان نیا کام تھا اور یہ ہم بھی مانتے ہیں لیکن چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل مستنبط من النص تھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع بھی ہو گیا تھا (کما مر) لہٰذا یہ بدعت سیہ نہ ہوا پس صرف اس بات کو لے کر امام زہری کو بھی اذان عثمانی کو بدعت قرار دینے والوں کے زمرہ میں داخل کرنا صحیح نظر نہیں آتا، آپ خود انصاف کریں۔

اسی طرح امام والا مقام حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کو بھی اذان عثمانی کے خلاف رائے رکھنے والا سمجھنا بھی سہو نظر ہے۔ خود مولانا موصوف نے (الاعتصام ۱۸ ربیع الاول ۱۰، قسط دوم صفحہ ۱۵) پر جو امام والا مقام کی عبارت کتاب الام سے نقل فرمائی ہے، اس کی ابتداء میں یہ الفاظ ہیں:

((واجب ان یکون الاذان)) الخ

مجھے یہ پسند ہے کہ اذان وجمعہ کے دن اس وقت وہ جائے جب امام منبر وغیرہ پر آ کر بیٹھے اس پر زیادتی نہ کی جائے۔ الخ

کیا کسی چیز کو زیادہ پسند کرنا یا اس کو افضل سمجھنا اس پر دال ہے کہ دوسری چیز ناجائز ہے؟

کسی بات کو مندوب یا مستحب سمجھنے والے کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ اس دوسری بات کے خلاف رائے قائم کرتا ہے؟

اس کا جواب میں کیا دوں۔ آں جناب ہی اس پر تدبر فرمائیں۔ اگر امام موصوف رحمہ اللہ اس کے خلاف رائے رکھنے والا ہوتا تو اس کے ساتھ تصریح بھی فرما دیتے کہ اذان عثمانی بدعت وناجائز ہے لیکن انہوں نے اس طرح نہیں فرمایا ایک چیز کو پسند کرنا دوسری چیز کے تقدم..... کو لازم نہیں ہے۔ کما لا یخفی

آگے پھر مولانا امام شافعی سے نقل فرماتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں امام عطاء اس سے انکار کرتا تھا کہ یہ اذان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شروع کی تھی بلکہ اس کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شروع کیا۔ لیکن یہ اثر بھی..... حافظ ابن

حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((وعطاء لم يدرك عثمان لرواية من اثبت ذلك منه مقدمة على انكاره)) [1]

''اور عطاء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کو نہیں پہنچے لہٰذا وہ روایت جو اس اذان کو زیادہ کرنے والا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ثابت کرتی ہے عطاء کے انکار پر مقدم ہے۔تبعا لصاحب المنهل

آگے مولانا موصوف اس سے بھی عجیب تر بات تحریر فرماتے ہیں:

لہٰذا ہمارے نزدیک اس عبارت (فثبت الامر على ذلك) کا صحیح مطلب یہ ہے کہ امام بخاری امام ابوداؤد اور امام نسائی کے عہد میں اذان عثمانی کو قبول عام ہو گیا تھا۔'' الاعتصام ۳ ربیع الثانی، ۱۴۱۰ ہجری صفحہ ۱۲ کالم ۱،

حضرت مولانا محترم جیسے محقق کو اس قسم کی بات قطعی زیب نہیں دیتی اتنی بعید تاویل بلکہ توجيه الكلام بما لا يرضى به قائله اس لیے اپنایا جا رہا ہے کہ بلا تحقیق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر کو صحیح تصور فرما لیا گیا ہے اور اس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع کی زبردستی نفی کی جا رہی ہے۔فالى الله المشتكى

یہ تاویل قابل توجہ تب ہی بن سکتی تھی، جب یہ الفاظ (فثبت الامر على ذلك) امام بخاری وغیرہ کے ہوتے حالانکہ ایسا نہیں ہے، یہ الفاظ یا تو حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کے ہیں یا پھر امام زہری کے جیسا کہ حدیث کے سیاق سے ظاہر و باہر ہے۔اور دونوں صورتوں میں ان الفاظ کا یہ مطلب قطعاً صحیح نہیں بن سکتا جیسا کہ اس کی وضاحت ہم پہلے اچھی طرح کر چکے ہیں لہٰذا یہ تاویل لا يسمن ولا يغني من جوع کے مترادف ہے۔اسی سلسلہ میں مولانا موصوف نے حافظ ابن عبدالبر سے امام مالک رحمہ اللہ کی تصریح بھی نقل فرمائی ہے ان کے الفاظ اس طرح ہیں:

((عن مالك بن انس ان الاذان بين يدى الامام ليس من الامر القديم)) [2]

''امام مالک بن انس سے روایت ہے کہ اذان جو امام کے سامنے (منبر کے نزدیک) دی جاتی ہے وہ قدیم بات نہیں بلکہ بعد میں اس کا رواج پڑا۔''

امام مالک رحمہ اللہ یہ بات صحیح ہے کیونکہ یہ سنت کے خلاف ہے۔چنانچہ ابوداؤد، طبرانی وغیرہ میں بطریق ابن اسحٰق عن الزہری اسی حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

((ان بلالا كان يؤذن على باب المسجد)) [3]

''بیشک حضرت بلال رضی اللہ عنہ مسجد کے دروازہ پر اذان دیا کرتا تھا۔''

---

[1] فتح الباری ۲ / ۳۰۵......

[2] عون المعبود.

[3] فتح الباری وغیرہ.

اس طریق میں گو ابن اسحٰق مدلس ہے اور روایت ''عن'' سے کرتا ہے لیکن ایسی ابن اسحٰق کی طریق سے امام احمد رحمہ اللہ کے مسند میں زہری سے یہی روایت موجود ہے اور اس میں ابن اسحٰق سماع کی تصریح کرتا ہے، لہٰذا تدلیس کا شبہ نہ رہا۔ بعض علماء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کے مسند میں جو ابن اسحٰق کی روایت ہے اس میں اگرچہ سماع کی تصریح موجود ہے لیکن اس مصرح بالسماع روایت میں یہ زیادت (علی باب المسجد) موجود نہیں لہٰذا یہ محل نظر ہے لیکن چونکہ یہ حدیث ایک ہی ہے اور مخرج واحد ہے اور ابن اسحٰق کے سوائے اور سب رواۃ ثقہ ہیں اور ابن اسحٰق سماع کی تصریح بھی کر رہا ہے تو یہ زیادہ الثقہ ہے جو دوسری روایات کے منافی نہیں۔

(غور فرمایئے) اس لیے یہ زیادت مقبول ہوگی۔ کما لا یخفی علی اهل العلم باصول الحدیث

بہر حال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں یہ اذان حضرت بلال رضی اللہ عنہ مسجد کے دروازہ پر دیا کرتا تھا اور بعد میں بھی یہی دستور رہا۔ اس لیے بعد میں جو اس اذان کو امام کے سامنے منبر کے پاس کر دیا گیا تو یہ نیا رواج ہوا قدیم دستور جو مسنون تھا وہ نہ رہا اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے بھی اسی پر نکیر فرمایا ہے نہ کہ عثمانی اذان پر۔ اور ہم بھی یہی کہتے ہیں یہ اذان جو خطبہ کے وقت دی جاتی ہے وہ مسجد کے دروازہ پر دی جانی چاہیے اور لاؤڈ اسپیکر کے مائیک اسٹینڈ کی وائر بیس پچیس فٹ لمبی ہوگی تو آسانی سے یہ اذان مسجد کے دروازہ پر دی جاسکتی ہے۔ معین نہ کرے امام مالک رحمہ اللہ کے اس ارشاد میں فیما نحن فیه کے متعلق کچھ بھی نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ موضوع بحث نہیں، حضرت مولانا نے امام ابن الحاج کی تحقیق بھی ''عون المعبود'' سے نقل فرمائی ہے:

((ان السنة فی اذان الجمعة اذا صعد الامام علی المنبر ان یکون المؤذن علی المنار ﷺ کان علی عهد النبی ﷺ وابی بکر وعمرو صدرا لامن خلافة عثمان رضی اللہ عنہ ...... قال علماء نا: وسنة النبی ﷺ اولی ان تتبع فقد بان ان فعل ذلك فی المسجد بین یدی الخطیب بدعة))

''بیشک سنت جمعہ کی اذان جب امام منبر پر چڑھ بیٹھے یہ ہے کہ موذن کو منار (بلند مقام) پر ہونا چاہیے اسی طرح نبی اکرم ﷺ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی ابتداء خلافت میں تھا...... ہمارے علماء نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سنت کا اتباع اولیٰ وبہتر ہے کیونکہ یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ (جمعہ کے دن) مسجد میں خطیب کے سامنے (منبر کے نزدیک) اذان دینا بدعت ہے۔''

قارئین کرام! آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اس عبارت میں بھی خطیب کے سامنے مسجد کے اندر اذان دینے کو بدعت کہا گیا ہے نہ کہ اذان عثمانی کو مطلقاً۔ (فاین هذا مما نحن فیه؟)

پھر نبی اکرم ﷺ کی سنت سے بھی اشارہ اسی طرف ہے کیونکہ ابتداء عبارت میں یہ موجود ہے کہ نبی

کریم ﷺ کے عہد مبارک میں مؤذن منار (بلند مقام) پر اذان دیتا تھا، اس میں بھی اذان عثمانی کے متعلق کچھ بھی نہیں علاوہ ازیں اس کو بھی اولیٰ کہا ہے اور خلاف اولیٰ ہونے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ بدعت بھی ہے، آپ بھی اس پر غور فرمائیں۔ اسی طرح حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی کی عبارت جو عون المعبود سے نقل فرمائی گئی ہے اس سے بھی واضح ہے کہ انکار اذان کا خطیب کے بالکل نزدیک مسجد میں دینے پر ہے نہ کہ مطلق اذان عثمانی پر اور یہ زیر بحث نہیں۔

مزید علامہ البانی، احمد محمد شاکر مرحوم وغیرہ دور حاضر کے علماء کی عبارات کو دو تین بار دہرایا گیا ہے ان پر خامہ فرسائی کر کے بات کو طول دینا نہیں چاہتا صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ "هم رجال ونحن رجال والامر بيننا وبينهم سجال"

بہرحال جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے تو حضرت مولانا عبید اللہ حفظہ اللہ نے اس سلسلہ میں کوئی ایسی قاطع اطمینان بخش دلیل پیش نہیں فرمائی جس سے ان کی ''دعویٰ'' برہن ہو کر ہمارے سامنے آ جاتا صرف ادھر ادھر کی عبارات نقل فرمائی گئی ہیں جو قطعاً قاطع نزاع نہیں بن سکتیں۔ یہ بھی فرمایا جا رہا ہے کہ اذان عثمانی ایک ہنگامی صورت تھی۔ جو مدینہ کی آبادی بڑھ جانے، منازل کے دور ہو جانے اور لوگوں کی کثرت کی وجہ سے بڑھائی گئی کیونکہ پہلی اذان لوگوں کی آبادیاں اور ہو جانے کی وجہ سے سنائی نہیں دیتی تھی اس لیے دور سے آتے آتے ان سے پہلے نماز بھی ختم ہو جاتی چونکہ یہ ضرورت اب باقی نہیں رہی اس لیے اب اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

اس سلسلہ میں ہماری معروضات:

۱۔ یہ مسلم ہے کہ یہ اذان شروع تو لوگوں کی کثرت اور مسجد نبوی سے لوگوں کی آبادیوں کا دور ہو جانے کی وجہ سے ہوئی تھی لیکن بعد میں یہ بات سب اسلامیہ شہروں میں، صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور ہی میں رواج پا گئی جس پر "فثبت الامر على ذلك" کے الفاظ وضاحت سے دلالت کر رہے ہیں۔ مولانا محترم نے ان الفاظ کا جو مطلب بیان فرمایا ہے اس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ تاویل یہاں نہیں چل سکتی، حدیث کا سیاق اس سے اباء کرتا ہے۔

۲۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو گیا تھا جس پر بھی یہی الفاظ دلالت کرتے ہیں، چنانچہ علامہ قسطلانی اور علامہ عینی نے ان الفاظ کی شرح کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ اذان عثمانی پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو گیا تھا دیکھئے: ارشاد الساری وعمدۃ القاری، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے الفاظ سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے (ملاحظہ ہو فتح الباری) اور اس پر حدیث کے یہ الفاظ بھی دال ہیں کہ "فلم يعب الناس ذلك عليه" کہ لوگوں نے اس اذان کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حرف گیری نہیں کی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اثر کے بارے میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں۔ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ والا اثر تو وہ ابھی تک کسی سند صحیح سے ثابت نہیں پایا گیا لہٰذا اس کو معرض استدلال میں پیش

فرمانا علماء محققین کی شان سے بعید ہے، پھر اس پر یہ سوال بھی وارد ہوتا ہے کہ جب اس سلسلہ میں وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متفق نہیں تھے تو ان کو کیوں اس سے روکنے کی کوشش نہیں فرمائی، حالانکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے بارعب خلیفہ کو بھی دیوانیہ عورت کو رجم کرانے سے روک لیا؟

پھر اگر کسی وجہ سے وہ یہ فریضہ بجالا نہ سکے تو اپنے دور حکومت میں صرف کوفہ ہی کو اس بدعت (علی زعمکم) سے کیوں نجات دلائی حالانکہ مدینہ منورہ زیادہ مستحق تھا اس بات کا کیونکہ وہ بھی ان کی قلمرو میں شامل تھا؟

کیا مدینہ منورہ کو اس اذان عثمانی سے نجات دلانے کے اقدام سے وہ ڈرتے تھے؟ اور اگر ڈرتے تھے تو کیوں اور کس سے ان سب سوالات کے حل کیے بغیر بات نہیں بن سکتی۔

بہر کیف صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہو گیا اور اس اجماع سے بظاہر صرف حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مستثنیٰ ہیں۔ ہم پہلے تفصیل سے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اور بقیہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین تطبیق کی صورت بھی پیش کر چکے ہیں اور اگر تطبیق نہیں بن سکتی تب بھی اس ایک فرد کے خوف سے اجماع کے ثبوت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ (کما مر تفصیلہ)

۳۔ جمعہ کے دن اول ساعتوں میں مسجد میں آنے کی ترغیب اور اجر و ثواب احادیث صحیحہ میں وارد ہیں وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم پہلی گھڑیوں میں مسجد میں آیا کرتے تھے اور نوافل پڑھتے رہتے تا آنکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے لیے تشریف لا کر منبر پر بیٹھتے۔ لہٰذا جب آپ حضرات کے خیال میں اس اذان عثمانی کی یہ حالت تھی کہ (باین ہمہ صحابہ کرام کی نگاہ اس اذان کو وہ قبول عام حاصل نہ ہو سکا جو کہ متوارث اور...... مسنون اذان کو حاصل ہے ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دار الخلافت کے شہر میں اس کو نظر انداز کر کے ایک اذان پر اکتفاء نہ فرماتے) (الاعتصام صفحہ ۷ کالم ۱، قسط ثالث)

یعنی جب اذان عثمانی کو قبول عام نہ ہو سکا، جلیل القدر صحابہ اس سے متفق نہ ہوئے اور اس احداث کو انہوں نے صحیح نہیں سمجھا۔ اس لیے اس کو عملاً بند بھی کرا دیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس احداث کی کیا ضرورت پڑی تھی دراں حالیکہ اس ہنگامی مقصد کے لیے متبادل صورتیں موجود تھیں؟

مثلاً وہ لوگوں کو جمع کر کے سمجھا دیتے کہ وہ جمعہ کے دن زوال سے پیشتر ہی اپنی آبادیوں سے نکل کر مسجد کی طرف روانہ ہو جائیں جیسے ہی زوال ہوا اور اذان شروع ہو جائے تو وہ ابتداء ہی سے خطبہ کا استماع بھی کر سکیں اور نماز میں بھی شامل ہو جائیں وہ خلیفہ ہونے کی وجہ سے مطاع الامر تو تھے ہی ان کے اس تاکیدی امر میں اکثر لوگ تو خطبہ و نماز جمعہ کو آسانی سے پا لیتے ہاں جو دینی شعاروں کی ادائیگی میں کاہل ہوتے ہیں ان کے کوئی بات کارگر نہیں ہو سکتی۔ یا پھر لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث صحیحہ جن میں پہلی گھڑیوں میں آنے کا ثواب و فضائل مذکورہ ہیں سنا کر رغبت دلاتے اور امر فرماتے وہ پہلی گھڑیوں میں مسجد کی طرف آیا کریں اس طرح بھی یہ ہنگامی صورت پوری ہو سکتی تھی پھر بلا وجہ اس احداث کی کون سی یہ جواز تھی؟ اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان متبادلہ صور چھوڑ

کر اذان کا آغاز کرنا اور لوگوں (صحابہ رضی اللہ عنہم) کا ان پر نکیر نہ کرنا کہ اس پر ان کا اجماع ہو جانا اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ اذان عثمانی نبی کریم ﷺ کی سنت سے مستنبط تھی اور جمیع صحابہ نے بھی اس کو اصول شرعیہ کے ماتحت اور شرعی تقاضوں کو پورا کرنے کا تصور فرما کر اس پر اجماع کر لیا یعنی انہوں نے سمجھا کہ دوسری سے زیادہ یہ اذان شرعی تقاضوں کو پورا کرنے والی ہے لہٰذا اس کو ہی اختیار کر لیا گیا اور یہ مقبول عام و خاص ہوگئی (یاد رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ والا اثر بار بار حضرت مولانا صاحب پیش فرما رہے ہیں ابھی تک ثابت نہیں ہوا)

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اب یہ ضرورت باقی نہیں رہی۔

لوگ جمعہ کے دن پہلی گھڑیوں میں آنے کے شائق ہوتے ہیں، تو خطبہ کے وقت والی مسنون اذان سے بھی کافی پہلے آجاتے ہیں لیکن سب لوگ ایسے نہیں ہوا کرتے۔ بعض کاروباری لوگ ہوتے ہیں جو کاروبار میں مصروف رہتے ہیں حتیٰ کہ جب یہ خطبہ کی اذان سنتے ہیں تب اٹھتے ہیں اور تیاری کرتے ہیں پھر اس وقت پہنچتے ہیں کہ خطبہ قریب الاختتام ہوتا ہے یا اگر نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق کہ (خطبہ چھوٹا کرنا نماز لمبی کرنا آدمی کی دینی فقاہت کی علامت ہے) خطیب خطبہ تھوڑا کرتا ہے تو خطبہ سارا ہی ان لوگوں سے فوت ہو جاتا ہے بلکہ کبھی تو نماز کی بھی آخری رکعت میں آکر شامل ہوتے ہیں۔ گاؤں کی کیفیت (کم از کم ہماری سندھ میں) یہ ہے کہ چند گاؤں میں ایک گاؤں کو (کسی نہ کسی وجہ سے) مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اطراف و نواح کے لوگ اسی گاؤں میں آکر جمعہ ادا کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اذان سے قبل اپنے کاروبار کو حلال رزق کی طلب سے منع نہیں فرمایا لہٰذا یہ لوگ اذان تک اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں جب اذان سنتے ہیں تو چلنے کی تیاری کرتے ہیں۔ اذان سے کافی وقت پیشتر آنے والے لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اب اگر اسی خطبہ والی اذان پر اکتفاء کی جاتی ہے تو لوگ جب اذان سن کر تیاری کر کے آئیں گے تو وہ خطبہ کیا سنیں گے اور نماز میں کس وقت آکر شامل ہوں گے یہ بات میرے کہنے کی نہیں ہر ایک جان سکتا ہے۔

بہر حال! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سمجھ لیا کہ یہ ضرورت جو اس وقت لاحق ہوئی ہے اور آئندہ زمانہ میں بھی لاحق ہوگی شرعی تقاضوں کے مطابق پورا کرنے کے لیے یہ اذان ہی انسب و اولیٰ ہے نہ کہ کوئی اور متبادل صورت اس لیے انہوں نے اس اضافہ پر نکیر نہ فرمائی بلکہ اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے موافقت کر لی اور یہ اذان سب اسلامیہ شہروں میں ثابت و قائم ہوگئی۔

۴۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اذان عثمانی اور خطبہ کے وقت کی اذان کے درمیان تھوڑا سا وقت تھا اس میں بھی مبالغہ ہے اگر ایسا ہوتا تو جس مقصد کے لیے اس کا آغاز ہوا وہ قطعاً پورا نہ ہو سکتا تھا۔ یعنی مثلاً اگر اذان عثمانی اور اذان خطبہ کے درمیان چار یا پانچ منٹ کا ہی وقفہ تھا تو آپ ہی بتائیں اس طرح وہ لوگ جن کے اعلان کے لیے اس اذان کا آغاز ہوا وہ کیونکر ابتداء خطبہ میں پہنچ سکتے تھے؟ وہ اڑ کر تو آ نہیں سکتے تھے پھر اس اضافہ سے فائدہ؟

بلکہ ان دونوں اذانوں میں نصف گھنٹہ یا بیس پچیس منٹ کا وقفہ ہوتا ہوگا یا ہونا چاہیے تاکہ جس غرض کے پیش نظر اس کا آغاز ہوا وہ بوجہ اتم پورا ہو سکے۔ یہ بھی اسی طرح ہے۔ جس طرح ہمارے اہل حدیث علماء صحیح حدیث کے ان الفاظ (ان ینزل هذا ویرقی هذا) کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس میں بھی مبالغہ ہے۔

ایک کے اترنے دوسرے کے چڑھنے کے درمیان کم از کم پندرہ منٹ تو ہونے چاہئیں اگر اتنا وقفہ ہوگا تو لوگ اذان عثمانی سن کر چلنے کی تیاری کریں گے تو آسانی کے ساتھ خطبہ کے وقت جو اذان ہوگی اس کو پالیں گے یا زیادہ سے زیادہ خطبہ کی ابتدا ہی میں آجائیں گے اس طرح خطبہ کا استماع بھی کما حقہ ان کو میسر ہوگا اور نماز بھی بوجہ اتم جماعت کے ساتھ مل جائے گی۔

خلاصہ کلام اگر ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور وتدبر کیا جائے اور عدل وانصاف کا دامن تھام لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ عثمانی اذان کی اس وقت بھی ضرورت ہے اگر یہ چیز...... ہی فضول اور غیر ضروری بلکہ بدعت سیئہ ہوتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے بہترین عہد میں اس کو یہ قبول عام وخاص ہرگز حاصل نہ ہوتا اور نہ ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس اذان عثمانی کو اس وقت کے پورے بلاد اسلامیہ میں رواج پا جانے اور ثابت رہ جانے کی سعادت مرحمت فرماتا اور ابھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسی خیرامت کے بابرکت عہد میں۔

بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو یہ اذان...... پر دینے کا امر فرمایا تھا آپ اگر ان کی سنت پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی باہر کسی بلند جگہ پر یہ اذان دینی چاہیے۔

ان حضرات کی خدمت میں باادب یہ گذارش ہے کہ اذان عثمانی کو چھوڑیئے خود آپ حضرات نے بھی دوسری اذانوں کے سلسلہ میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کی سنت بالکلیہ ترک کر دی ہے، صحیح حدیث میں جو یہ الفاظ وارد ہیں کہ (ان ینزل هذا و یرقی هذا) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اذان بھی اونچی جگہ پر دی جاتی تھی لیکن آپ حضرات نے اس سنت کو بالکلیہ ترک کر کے مسجد میں ہی رکھے ہوئے لاؤڈ اسپیکر کے مائیک اسٹینڈ کے سامنے دینی شروع کر رکھی ہے ادھر تو آپ اتنی اتنی...... کے بارے میں ہم پر مواخذہ فرماتے ہیں لیکن خود اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت جگہ ایک دوسری صورت اختیار فرمالیں، تو آپ پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ یاللعجب

خودرا فضیحت دیگراں را نصیحت! یہ کیسا قول عمل کا تضاد آپ نے اپنا رکھا ہے۔ پھر ہمارے یہ مہربان یہی جواب دیتے ہیں کہ کسی بلند مکان پر چڑھ کر اذان دینا اس لیے تھا کہ آواز دور تک پہنچ سکے، چونکہ یہ ضرورت اب آلہ مکبرۃ الصوت نے پوری کر دی ہے اس لیے بلند مکان پر صعود ونزول کی ضرورت باقی نہ رہی لیکن دوسروں پر بے تحاشا اعتراض کرتے ہوئے انہیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ دوسرے بھی بعینہ یہی جواب دے سکتے ہیں کیوں؟ محض اس لیے

کہ دوسروں سے عدل وانصاف آج کل قلیل کالمعدوم ہوگیا ہے۔ فالی اللہ المشتکی

ہاں بایں ہمہ ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ کی سنت کا بھی کسی حد تک لحاظ کرتے ہیں، یعنی نبی ﷺ کے دور مبارک میں خطبہ کے وقت جو اذان دی جاتی تھی وہ مسجد کے دروازہ پر دی جاتی تھی۔ (کما مر مفصلا) اسی طرح ہم بھی اسی اذان کو مسجد کے دروازہ کے پاس دلواتے ہیں اس طرح کہ مائیک اسٹینڈ کی وایر اتنی لمبی لگائی جاتی ہے جو مائیک اسٹینڈ دروازہ تک پہنچ جائے۔ اس طرح کچھ نہ کچھ سنت پر عمل ہو جاتا ہے۔

خلاصہ کلام! ہمارے نزدیک اذان عثمانی پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو چکا ہے اور اجماع صحابہ حجت ہے اس اجماع کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے یا کہا جارہا ہے اس کا جواب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توفیق سے بالتفصیل مذکور ہو چکا۔ اور یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل مستنبط من النص ہے۔ ان کا اجتہاد واستنباط صحیح تھا اور شرعی تقاضوں کے مطابق۔ اسی لیے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے ان پر اس وجہ سے حرف گیری نہیں کی جیسا کہ "فلم یعب الناس ذلك علیه" کے الفاظ اس پر دال ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس فعل کے آغاز کے بعد یہ عمل اس وقت کے پورے عالم اسلام میں مروج ہو کر ثابت وقائم ہو گیا بعد کے خلفاء میں سے بھی کسی نے اس کو بند نہیں کیا اس سلسلہ میں جو اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے وہ بے سند ہے لہٰذا کسی اعتناء کے قابل نہیں صرف حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اذان عثمانی کو بدعت کہنا اگر بدعت سیئہ پر محمول بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی وہ اجماع کے وقوع میں خلل انداز نہیں۔ کما مر تفصیله

ان وجوہ کی بناء پر اذان عثمانی مندوب ومشروع پہلے بھی تھی اور اب بھی مندوب ومشروع ہے۔ جو اس پر عمل پیرا نہیں ہیں، ان کے متعلق بھی ہم کچھ نہیں کہتے۔ ہر ایک اپنے علم اور صحیح اجتہاد کے اتباع کا مکلّف ہے اگر ہم سب کی نیات صحیحہ ہیں تو ہر ایک کو اپنے اجتہاد پر اجر بہر حال ملے گا ان شاء اللہ تعالیٰ اگر اجتہاد صحیح وصواب ہوا تو دو اجر ورنہ ایک اجر تو ہر حال میں ملے گا۔ اور یہ کہ اس اذان عثمانی کی اس وقت بھی معقول ضرورت ہے اس لیے ہم نہ دینے سے دینے کو بہر حال بہتر واولیٰ سمجھتے ہیں۔

ان سب کا جواب بعون اللہ سبحانہ وتعالیٰ وحسن توفیقہ ہم مذکورہ بالا صفحات میں پیش کر چکے ہیں قارئین کرام بنظر عدل وانصاف اور غور وتدبر کے ساتھ ان کو ملاحظہ فرمائیں اگر کہیں مجھے غلطی سرزد ہوئی ہو تو مجھے اس پر متنبہ فرمائیں، میں ان کا مشکور مرہون منت رہوں گا۔

هذا وان ماكتبة في هذه الاوراق ان كان صوابا فمن الله سبحانه و تعالیٰ ومن عونه وحسن توفيقه ومنه و كرمه وفضله وعظيم احسانه فله الحمد وله الشكر و ان كان غير ذلك فمني ومن نفسي والله يقول الحق وهو يهدى

السبيل فاسئله ان يغفرلى خطاياى وذنوبى كلها وان يلهمنى رشدى ويعيذنى من شر نفسى وهو على كل شىء قدير وبالاجابة جديد، والحمد لله الذى بنعمته تتم الصالحات و على سيدنا محمدنا نبى الرحمة ورحمة للعالمين ازكى الصلوٰت والتسليمات وعلى آله واصحابه وازواجه المطهرات الى يوم يفوز المومنون الذين عملوا الصالحات برضوان من الله وبنعيم مقيم ولم تبق للكفار والمنافقين الا الحسرات .

وانا احقر العباد

ابو القاسم محب الله شاه عفا الله عنه

۱۹/۵/۱۴۱۰ہجری

۱۹/۱۲/۸۹ء

❁❁❁❁

برجواب

انسانی اعضاء کی پیوند کاری

جماعت اہل حدیث کے نامور عالم دین ممتاز مترجم مولانا محمد خالد سیف صاحب حفظہ اللہ نے ۱۹۹۰ میں ایک تحقیقی مقالہ بنام ''انسانی اعضاء کی پیوند کاری'' تحریر فرمایا جس میں انہوں نے اضطراری صورت میں اس عمل کو جائز لکھا تھا، اس کے جواب میں سید محبّ اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ نے ان کے مقالہ کے چند جزویات پر اعتراضات کیے جو کہ ایک مقالہ کی صورت اختیار کر گئے، جس کا نام انہوں نے ''گذارشات ہماری برجواب انسانی اعضاء کی پیوند کاری'' آپ نے اپنے مکالمے میں اعضاء کی پیوند کو غیر جائز فعل (عمل) قرار دیا۔ نیز یہ دونوں مقالے ''الاعتصام'' میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ (الازہری)
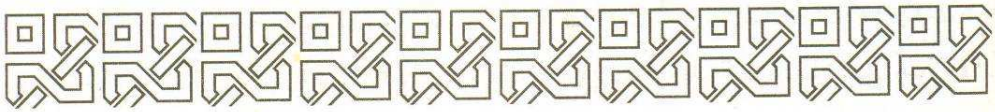
ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں مولانا محمد خالد سیف کا مقالہ نظر سے گذرا۔ ان کے اس پورے مقالہ کا تنقیدی جائزہ لینا میرا مقصد نہیں ہے اور نہ ہی میں اس پوزیشن میں ہوں کہ ان کے اس مقالہ کا تفصیلی جائزہ لے سکوں، یہ معاملہ میں دوسرے علماء وفضلاء پر چھوڑتا ہوں۔ میں صرف اس مقالہ کی چند باتوں کے متعلق اپنی گذارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس سے محض اصلاح مطلوب ہے نہ کہ محض تنقید برائے تنقید یا مبحث برائے مبحث۔ لہٰذا قارئین حضرات اور خود مقالہ نگار بھی میری ان گذارشات کا اسی جذبہ اور اسی مقصد کی روشنی میں مطالعہ فرمائیں، اگر میں غلطی پر ہوں تو مجھے ان پر مطلع فرمایا جائے۔ میں ان کا از حد ممنون ہوں گا۔ (شاہ صاحب)

فاضل مقالہ نگار کی پوری تحریر کی بناء اگر غور سے کام لیا جائے اس بات پر ہے کہ انسانی اعضاء کی پیوندکاری ایک ضرورت ہے اور ضرورت کی وجہ سے محظور چیز بھی جائز ہو جاتی ہے۔ (الضرورات تبیح المحظورات)

اور انہوں نے جو امثلہ پیش فرمائی ہیں وہ سب اسی محور کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں لیکن کوئی ناجائز یا حرام چیز کسی اضطراری حالت میں جائز ہو جاتی ہے تو اس کا یہ مطلب کس طرح ہوگا کہ اس ضرورت کے توقع یا اندیشہ سے اس چیز یا فعل وغیرہ کو جائز بنا کر عام طور پر اس کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔ یہی چیز ہے جو فاضل مقالہ نگار کی تحریر سے واضح طور پر مترشح ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں یا دوسرے ممالک میں کوئی اندھے پن کا شکار ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح مردار کھانے کی اضطراری حالت اتنی نادر اور قلیل ہے کہ وہ کالمعدوم (نہ ہونے کے برابر) ہے۔ اندھا پن کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ صرف ہمارے ہاں ہزاروں کی تعداد میں نابینا مرد اور خواتین موجود ہیں تو کیا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ فتویٰ صادر کیا جائے گا کہ اب جو بھی آدمی ہمارے ملک میں مرے، اس کی آنکھیں نکال لینی چاہئیں اور ان کو بلڈ بنکوں کی طرح محفوظ کیا جائے۔ اور اس طرح جتنے اندھے ہیں اور جو آگے اندھے ہو جائیں ان کو ان آنکھوں کی پیوندکاری کر کے نابینا سے بینا بنا دیا جائے۔ اور اس فتویٰ کو جو فاضل مقالہ نگاروں اور ان جیسے دوسرے فضلاء نے صادر فرمائے ہیں۔ ان کو حکومت کی طرف سے بھی قانونی تحفظ عنایت فرمایا جائے تاکہ جیسے ہی ملک کے طول وعرض میں کوئی آدمی جاں بلب ہو، اس کے سرہانے سرجن صاحبان سرجیکل آپریشن (Swarical Operation) کے آلات لے کر آدھمکیں اور جیسے ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے یہ اس پر عمل جراحی شروع کر دیں۔ اس طرح بے شمار آنکھیں جمع ہو جائیں گی اور نابینا لوگ نہ ہونے کے برابر ہو جائیں گے لیکن بات یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ سلسلہ آگے چلا جاتا ہے، سائنسی تجربات اور تحقیقات کا سلسلہ روز بروز ترقی پذیر ہے اور یہ پیوندکاری کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی محدود کیوں ہو بلکہ دوسرے اعضاء کی قطع وبرید بھی اسی پیوندکاری کے لیے جائز ماننی پڑے گی، بلکہ مقالہ نگار صاحب تو ایک زندہ آدمی

کے دوگردوں میں سے ایک گردہ کوعمل جراحی سے نکال لینے کے جائز ہونے کے حق میں ہیں۔ حالانکہ قدرت نے انسانی جسم میں جو کچھ رکھا ہے وہ بے حد ضروری ہے، کسی عضو کوفضول یا بے مصرف یا ضرورت سے زائد ہرگز ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا، اگر ایک زندہ آدمی کے دوگردوں میں سے عمل جراحی کے ذریعے ایک گردہ نکال کر کسی ایسے آدمی میں لگا دیا جائے جس کے دونوں گردے بے کار ہوگئے ہیں تو وہ تو فی الحال ممکن ہے کہ کچھ وقت کے لیے زندہ رہ سکے لیکن فرض کیجئے کہ جس آدمی کے دوگردوں میں سے ایک نکال لیا گیا تھا۔ اس کا دوسرا گردہ بھی خراب ہوجائے تو بتایا جائے کہ اب یہ بے چارا جس نے اتنی قربانی دی وہ کہاں جائے۔ یہ عجیب منطق ہے کہ ایک ناکارہ آدمی کو بچانے کے لیے ایک اچھے بھلے اور زندہ آدمی کو ناکارہ بنا دیا جائے۔ خیر یہ تو ضمنی بات تھی۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ اس پیوندکاری کا سلسلہ صرف آنکھوں تک ہی کیوں محدود ہو بلکہ دوسرے اعضاء کو بھی اس لسٹ میں شامل کردیا جائے۔ مثلاً ایک جوان آدمی ہے اس نے تازہ شادی کی ہے۔ اتفاق سے کسی حادثہ کا شکار ہونے کی وجہ سے اس کے اعضائے تناسل کٹ جاتے ہیں یا پھر بہت سے لوگوں کو بہت سی مہلک اور گھناؤنی جنسی بیماریاں لاحق ہوجاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کے اعضائے تناسل بالکل بے کار ہوجاتے ہیں اور وظیفہ زوجیت ادا کرنے تک کے قابل نہیں رہتے اور میرے علم میں یہ بات ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جن سے مجھے واسطہ پڑا ہے انہوں نے ان تباہ کن امراض سے نجات کے لیے علاج ومعالجہ کے ذریعے بھی اپنی وسعت کی حد تک پوری کوشش کی۔ لیکن وہ شفایاب نہ ہوسکے۔ اسی حالت میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جن کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب کا خوف ہوتا ہے اور وہ کسی ایسی بات پر اقدام نہیں کرتے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ناراضگی کا موجب بنے اور آخرت کے عذاب عظیم سے ان کو دو چار ہونا پڑے لیکن وہ زندگی ایسے گذار رہے ہیں کہ ہر وقت موت کی راہ دیکھتے رہتے ہیں کہ کب ان کو موت آئے اور وہ اس انتہائی بدترین ذہنی کوفت سے نجات پائیں لیکن جن لوگوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب کا خوف نہیں وہ خودکشی کرلیتے ہیں۔

ایسے واقعات بھی سنے پڑھے گئے ہیں تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ کسی اچھے بھلے صحت مند آدمی کے (جب وہ مر جائے) اعضاء تناسل کاٹ کر محفوظ کردیئے جائیں اور جب مذکورہ قسم کے لوگوں میں سے کوئی اس کا حاجت مند آجائے تو اس ناکارہ آدمی کو وہ اعضائے تناسل عمل جراحی کے ذریعے سے چسپاں کردیئے جائیں تاکہ وہ بقیہ زندگی کو کسی حد تک خوشگوار بنا سکے۔ کیا یہ بات فاضل مقالہ نگار کی پیش کردہ دلیل سے مطابقت نہیں رکھتی؟ انصاف مطلوب ہے۔

پھر ہم ایک قدم آگے اٹھا کر یہ کہنے کی بھی جرأت کرتے ہیں کہ مردہ شخص اپنے اعضاء سے فائدہ اٹھانے سے معذور ہے۔ ان کے اعضاء اس وقت ان کے کسی مصرف کے نہیں ہیں تو کیوں نہ یہ قانون بنا دیا جائے کہ جو بھی مردہ ہو اگر اس کے ورثا حائل یا مانع نہ ہوں تو اس کے سب اچھے اور صحیح اعضاء سرجیکل آپریشن کے ذریعہ مردہ کے

جسم سے نکال کر محفوظ کردیئے جائیں۔ چونکہ ہمارے ملک میں بازو اور ٹانگ کٹے ناک کٹے، کان کٹے وغیرہ وغیرہ موجود ہیں، تو مردوں کے اعضاء ان معذور لُولے لنگڑے لوگوں کے کام آجائیں گے۔ مانا کہ مردہ کے اعضاء کاٹنا ''بلیۃ'' ہے لیکن بقول فاضل مقالہ نگار یہ اخف البلیتین ہے کیونکہ مردہ کے یہ اعضاء اب ان کے کام میں تو آئیں گے نہیں لیکن دوسرے زندہ لوگ ان کے اعضاء کی پیوندکاری سے خودکشی یا بالکل نکارہ زندگی گذارنے سے نجات پاجائیں گے اور اس لحاظ سے یہ یقیناً اخف البلیتین ہوگی اور اس کے مقابلہ میں ان لوگوں کی خودکشی وغیرہ یقیناً بلیۃ کبریٰ ہے۔ اب اگر یہ سلسلہ اس طرح چل نکلے اور ہمارے علماء وفضلاء ان کے جواز کے فتوے دینے شروع کردیں تو فرمایئے کہ پھر مردوں کا کیا حشر ہوگا؟

اس کے کارآمد اعضاء تو سب کے سب کاٹ دیئے گئے باقی کیا بچنا ہے جس کی تجہیز، تکفین اور تدفین کی زحمت اٹھائی جائے اور اس صورت میں آپ فرمائیں کہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد عالی جو صحیح حدیث (سنن ابی داؤد وغیرہ) میں وارد ہے کہ: (کسر عظم المیت ککسرہ حیا) کا مطلب آخر کیا ہوگا۔ اس کی غرض وغایت کیا ہوگی؟ کیا یہ بالکلیہ۔ معاذ اللہ بےکار نہیں بن جاتا؟ جب اتنی ضروریات ہوں اور کسی مردہ کو بھی اس طریقہ کار پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں تحفظ حاصل نہ ہو تو حاکم بدہن رسالت مآب ﷺ کا یہ فرمان مبارک کسی کام کا نہیں رہتا کیونکہ یہاں کسی اتفاقی برسوں کے بعد کوئی نابینا رونما نہیں ہوتا تاکہ اس کی حیثیت اور اس کے کارآمد خواص وعوام ہونے کی وجہ سے کسی ایک مردہ کی آنکھیں نکال کر اس میں ٹانک دی جائیں بلکہ یہاں تو سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں نابینا لوگ رہتے ہیں۔ ان سب کے اس نقص کو پورا کرنے کے لیے ہزاروں مردوں کی آنکھیں یا دوسرے اعضاء کاٹنے پڑیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی صحیح العقیدہ مسلمان اس قسم کی جرأت نہیں کرسکتا کہ نبی کریم ﷺ کے کسی فرمان کو بےکار یا فضول کہنے کی جرأت کرے۔

انسانی اعضاء کی قطع وبرید کی حرمت کا سبب کچھ بھی ہو اور بقول فاضل مقالہ نگار وہ انسانی کرامت کی وجہ سے ہی ہو لیکن جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول علیہ السلام نے اس سے منع فرمادیا تو وجہ کچھ بھی ہو وہ اپنی اخذ کردہ وجہ سے ہرگز جائز نہیں ہوسکتا۔ حدیث مبارک میں یہ کہاں ہے کہ اس کی قطع وبرید صرف دشمنی یا انتقام کی وجہ سے نہ کی جائے۔ ہاں اگر کسی دوسرے کی بھلائی کے لیے کی جائے تو جائز ہے؟ یہاں تو حکم عام ہے اور ہما وشما کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کو اپنے ذاتی رجحانات اور ان اشیاء یا امور کی وجہ سے جو بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے ہمیں بھا گئی ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ کے عام حکم یا ارشاد کی تخصیص کریں۔ فاضل مقالہ نگار نے زندہ یا مردہ انسان کی چیر پھاڑ کی چند صورتیں تحریر فرمائی ہیں۔ ان میں سے بعض صورتوں کے متعلق ہم ان سے متفق نہیں ہیں۔ رہی بعض صورتیں تو ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ایک آدمی کا کوئی عضو کسی بیماری کی وجہ سے بالکل خراب ہوگیا، لہٰذا اگر اس ماؤف اور بےکار عضو کو کاٹ نہ دیا جائے تو اس کی سمیت دوسرے اعضاء بلکہ پورے جسم میں سرایت کرجائے گی۔ اس

طرح اس کی جان خطرہ میں پڑ جائے گی۔لیکن اس صورت میں تو ایسے آدمی کی بھلائی اور بہتری ہے جس کا کوئی عضو کاٹا جا رہا ہے اور اس طرح اس بے کار عضو کے کاٹ دینے پر اس کے پورے بقیہ جسم کی بہتری اور صحت کا انحصار ہے، اس لیے یہ عضو کاٹ دیا گیا تو بقیہ جسم محفوظ ہو جائے گا۔ ورنہ اس ایک عضو کے نہ کاٹنے سے پورا جسم سمیت سے بھر جائے گا اور اس کی جان خطرہ میں پڑ جائے گی لیکن ایک مردہ کے کسی عضو کی قطع وبرید پر اس کے بقیہ جسم کی کونسی بھلائی منحصر ہے؟ اس لیے مذکورہ صورت پر مردہ آدمی کی چیر پھاڑ کو قیاس کرنا صحیح نظر نہیں آتا، اسی طرح ایک زندہ ماں کے پیٹ کو چیر کر اس سے بچہ نکالنا (جب کہ فطری طور پر وہ بچہ نکل نہ سکتا ہو) تو اس میں بھی اسی ماں کی بہتری و بہبودی مقصود ہے۔ مزید برآں بچہ نکالنے کے بعد اس چاک شدہ پیٹ کو پھر ٹھیک کر دیا جاتا ہے اور اسی طرح ایک مردہ ماں کے پیٹ سے زندہ بچہ نکالنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کو چاک کیا جا سکتا ہے لیکن اس کو دفن کرنے سے پیشتر اس کے پیٹ کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح دونوں باتیں حاصل ہو جاتی ہیں لیکن ایک مردہ کا کوئی عضو کاٹ کر علیحدہ کر لینا نہ ہی میت کو کوئی فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ ہی اس کے کاٹے ہوئے عضو کو درست کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا زیر بحث مسئلہ کو ان صورتوں پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ پھر یہ صورتیں تو شاذ ونادر پیش آتی ہیں ان کی اتنی بہتات نہیں ہے جتنی کثرت نابیناؤں کی ہے۔ مزید برآں یہ قیاس نص کے مقابلہ میں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مردہ کی ہڈی توڑنے کو زندہ آدمی کی ہڈی کے توڑنے کے برابر قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس طرح ایک زندہ آدمی کی ہڈی توڑنے سے اس کو سخت اذیت پہنچتی ہے، اس طرح مردہ کو بھی اس سے اذیت پہنچتی ہے کیونکہ مردہ کو اس کا احساس بالکل نہیں ہوتا بلکہ یہ تشبیہ حرمت کے لحاظ سے ہے یعنی جس طرح ایک زندہ انسان کی ہڈی توڑنا حرام ہے اس طرح مردہ کی ہڈی توڑنا بھی حرام ہے۔ اس طرح یہ قیاس نص کے مقابلہ میں ہے اور ایسا قیاس سب فقہاء کے نزدیک باطل ہے۔ ایک صورت مولانا نے یہ بھی تحریر فرمائی ہے کہ کوئی بھوکا لاچار بے قرار ہو تو وہ مردہ آدمی کا گوشت بقدر ضرورت کاٹ کر کھا سکتا ہے۔

میری گذارش یہ ہے کہ کیا مردے اس طرح میدان پر پڑے ہوئے ملتے ہیں کہ ایک بھوکا مضطر ان کا گوشت بقدر ضرورت کاٹ کر کھالے؟ مردے یا تو دفن کیے جاتے ہیں یا جلائے جاتے ہیں۔ ایسا مردہ آخر اس بھوکے کو کہاں ملے گا؟ بظاہر تو یہ ایک محض مفروضہ معلوم ہوتا ہے اگر مولانا کی مراد یہ ہے کہ وہ مضطر بھوکا مقابر میں جا کر کسی مردہ کی قبر کھود کر اس سے مردہ نکال کر اس کا گوشت کاٹ لے تو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ مقابر تو شہروں اور گاؤں کے متصل ہوتے ہیں، لہٰذا ایسا بھوکا اسی گاؤں یا شہر میں جا کر اپنی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ اس کو کسی کی قبر کھودنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر یہ مضطر کسی بیابان میں ہے تو وہاں قبریں تو ہوتی ہی نہیں، پھر کہاں سے مردہ نکالے گا؟

ثانیاً اس آدمی کو کیسے یقین ہوسکتا ہے کہ اس قبر میں مدفون آدمی کا گوشت ابھی تک سڑ گل نہیں گیا۔ فرض کیجئے انہوں نے ایک قبر کھودی، لحد میں جھانکا، وہاں ہڈیوں کے پنجروں کے سوائے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر دوسری قبر کھودی اس میں بھی مطلوبہ چیز نہ ملی، پھر تیسری کھودی اس کا بھی وہی حشر ہوا تو یہ اس معیار سے مضطر کے اضطرار کا کیا حل ہوا؟ مزید برآں ان کو اس طرح قبروں کو کھودتے جھانکتے ہوئے کسی نے اگر دیکھ لیا تو پھر کیا بنے گا؟ اس کا تصور بھی مشکل ہے۔

تیسری قسط میں مولانا نے مردہ کی اس وصیت کہ ''میرے مرنے کے بعد میرے اعضائے کاٹ کر کسی ضرورت مند کو دے دیئے جائیں۔'' کے جواز پر صحیح بخاری وصحیح مسلم کی حدیث جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، سے استدلال فرمایا ہے۔ اس حدیث میں یہ ہے کہ ایک آدمی نے مرتے وقت اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ مرنے کے بعد ان کی لاش کو جلایا جائے جب وہ کوئلہ بن جائے ان کو پیس کر کچھ خاک ہوا میں اور کچھ پانی میں پھینک دیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ نے ان کی اس وصیت کی تغلیط یا تردید نہیں فرمائی تو معلوم ہوا کہ مرنے والا اگر اس قسم کی وصیت کر جائے تو وہ اس کا مجاز ہے اور اس وصیت پر عمل کیا جائے گا۔ میری گذارش ہے کہ اس مرنے والے آدمی نے یہ وصیت کی کہ اس کے مردہ جسم میں یہ تصرفات کیے جائیں۔ اس وصیت کے بیان کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان کی اس وصیت پر کوئی تبصرہ یا نکیر نہ فرمائی اگر اس سے اس قسم کی وصیت کا جواز نکلتا ہے تو پھر عرض ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ نے ان کی اس بات پر بھی نکیر نہ فرمائی کہ ''ان کی لاش کو جلایا جائے۔''

اور اس پر بھی رسالت مآب ﷺ نے سکوت فرمایا تو کیا اس سے اس مسئلہ کا بھی جواز مستنبط ہوگا کہ کوئی اپنی لاش کے دفن کرنے کی بجائے اسے جلانے کی وصیت کر سکتا ہے اگرچہ وہ مسلمان ہو؟ اور پھر اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ ہندوؤں اور چند دوسری اقوام میں جن میں لاشوں کے جلانے کی رسم رائج ہے اس کی بھی ایک اصل اصیل ہے اور یہ فعل بھی ناجائز نہیں۔ اور اگر مسلمان بھی تدفین وغیرہ کو ترک کر کے لاش جلانے کے طریقہ کو اپنا لیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اور یہ اس لیے کہ حدیث میں جس آدمی کا ذکر ہے وہ یقیناً مسلم تھا۔ کافر ومشرک نہیں تھا۔ اس لیے کہ کافر ومشرک کی مغفرت قطعاً نہیں ہوگی۔ البتہ وہ بدعمل تھا اس نے کوئی اچھا عمل نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اگر فاضل مقالہ نگار کے طرز استدلال کو صحیح مانا جائے تو لازم آئے گا کہ اگر مسلمان بھی اپنی لاشوں کو جلادیں تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں، بلکہ یہ بھی جائز ہے حالانکہ فطری طور پر مردہ لوگوں کو دفن ہی کیا جاتا ہے اور یہی طریقہ انسان کے ابتدائی عہد سے چلا آرہا ہے جیسا کہ سورۃ مائدہ میں جناب آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر ہے کہ ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔ پھر اس لاش کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ انہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایک کوے کو بھیج دیا اور وہ اپنی چونچ سے زمین کو کریدنے لگا۔ اس طرح ان کو راہنمائی ہوئی اور اپنے بھائی کو زمین میں

چھپا دیا۔ احادیث کی کتب میں اور فقہاء کی تالیفات میں تدفین وغیرہ اور اس کے طریقے اور ان کے متعلق مسائل قبروں وغیرہ کے متعلق شرعی احکام عبرت حاصل کرنے کے لیے قبور کی زیارت وغیرہ وغیرہ، یہ سب چیزیں تو مردوں کی تدفین پر مبنی ہیں لیکن اگر مردوں کو جلانے کی اجازت دی جائے تو یہ سارا باب ختم ہو کر رہ جائے گا۔ کما لا یخفٰی

دراصل اس حدیث میں اگر تدبر سے کام لیا جائے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے خوف وخشیت کو فضیلت و بھلائی اور اس کے دنیا وعقبٰی میں بہترین اثر اور اخروی عذاب سے نجات کا نہایت اہم عنصر قرار دیا گیا ہے اس سے بڑھ کر اس مزعومہ مسئلہ پر دلیل لینا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کی وصیت کا جواز نکلتا ہے، اس لیے کہ اس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ نے نکیر نہ فرمائی تو یہ قصہ پہلی امتوں کا ہے اور ہوسکتا ہے کہ ان امتوں میں اس قسم کی وصیت جائز ہو کیونکہ شریعت اسلامیہ میں یہ ممنوع ہوگئی کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ نے مردہ کی ہڈی توڑنے سے منع فرمادیا، لہٰذا منسوخ شدہ بات سے استدلال علمی شان سے بمراحل بعید ہے۔ واللہ اعلم

چوتھی قسط میں مولانا نے چند عصری علماء اور اسلامی نظریاتی کونسل وغیرہ کی آراء پیش کی ہیں اسلامی نظریاتی کونسل نے زندہ انسان کے کسی عضو کے کاٹنے کو (گو وہ خود اجازت دے) بہ چند وجوہ حرام قرار دیا ہے۔ اس طرح اسلامی نظریاتی کونسل ایک شق میں ہمارے ساتھ متفق ہے۔ اسی طرح ''رابطہ عالم اسلامی کی اسلامی فقہی کونسل'' کے ارکان میں سے ایک رکن نے میت کے اعضاء کی پیوند کاری کو ناجائز قرار دیا ہے۔ مخالفت کرنے والا ایک رکن ہے لیکن اس کی رائے کو حدیث مبارک کی تائید حاصل ہے۔ لہٰذا یہی صحیح ہے۔ کسی مسئلہ یا فتویٰ کی صحت کا مدار اس بات پر نہیں کہ اس یا اس بات کی حمایت میں لوگوں کی اکثریت ہے بلکہ اس کا مدار دلیل پر ہے۔ لہٰذا جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول علیہ السلام کی حدیث مبارک میت کے اعضاء کاٹنے سے مانع ہے تو بات اسی کی صحیح ہوگی جو اس مسئلہ میں عدم جواز کا فتویٰ دیتا ہے، گو وہ ایک ہی ہے۔ مولانا نے جو علماء کی آراء نقل فرمائی ہیں۔ ان میں سے چند باتوں کے جوابات تو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں اور جو کچھ باتیں تحریر کی ہیں ان کا جواب تحریر کر رہا ہوں۔ بفضل اللہ وحسن توفیقه

(ا) اسلامی نظریاتی کونسل نے جو یہ فرمایا کہ ''بلکہ اس سے (میت سے) مراد موصی (وصیت کرنے والے) شخص کی یہ خواہش ہے کہ اس کے مرنے کے بعد'' الخ (الاعتصام ۱۴ نومبر ۱۹۹۰ء ص ۱۰۰) اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ انسان کی وصیت یا خواہش وہی پوری کی جائے گی............ جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کے اوامر یا نواہی کے خلاف نہ ہو لیکن یہاں یہی بات ہے یعنی مردہ کے اعضاء کاٹنے سے رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے، لہٰذا ایسی خواہش کی تکمیل جائز نہیں ہوسکتی گو یہ خواہش یا عطیہ وہ خالصتاً للہ کر رہا ہو۔ کیونکہ ناجائز بات نیت کے اخلاص سے جائز نہیں ہوسکتی۔ باقی جو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث (یعنی میت کی ہڈی کو توڑنا زندہ کی ہڈی

توڑنے کے مانند ہے) منع میں صریح نہیں ہے تو اس کے متعلق ہم مذکورہ بالا صفحات میں عرض کر آئے ہیں کہ اس حدیث میں جو تشبیہ ہے وہ عدم جواز یا حرام ہونے کے سوائے دوسرے کسی مقصد کے لیے نہیں ہوسکتی۔ فتذکر۔

(۲) اسی صفحہ کے دوسرے کالم میں یہ عبارت ہے (وہ احادیث جو مثلہ اور میت کی ہڈی توڑنے کی ممانعت کے بارے میں آئی ہیں ان میں ممانعت کی علت حرمتی تحقیر اور ہتک احترام آدمیت ہے) سبحان اللہ! اس علت کا اس حدیث مبارک میں کہاں ذکر ہے؟ یہ عجیب بات ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کے رسول اکرم ﷺ کے فرمودہ احکام وارشادات میں سے ہم اپنی ناقص فہم سے خود ہی ایک علت کا استخراج کریں۔ (حالانکہ اس علت کا اس ارشاد میں کوئی پتہ نہ ہو) اور پھر اس حکم کو اس مخترعہ علت کے ساتھ وابستہ کرلیں جہاں وہ مزعومہ علت موجود ہو تو وہاں حکم نافذ اور جہاں یہ علت نہ ہو تو وہاں یہ حکم بھی مستثنیٰ ہو۔ اس طرح تو ہر ایک اللہ سبحانہ وتعالیٰ یا ان کے رسول اکرم ﷺ کے کسی حکم کی بھی کوئی نہ کوئی علت نکال کر اس عمومی حکم کو اس کے ساتھ محصور کردے گا جہاں اس کی یہ گھڑی ہوئی علت موجود ہوگی، وہ حکم بھی قابل عمل ہوگا اور جہاں یہ علت موجود نہ ہوگی وہاں وہ حکم ناقابل عمل ہوگا۔ شرعی احکام کو علل کے ساتھ وابستہ کرلینا اور پھر جہاں وہ علت ہو تو حکم معمول بہ ہو اور جہاں یہ علت معدوم ہو تو حکم بھی ناقابل عمل ہو اور یہ بحث نہایت طویل الذکر ہے اس جگہ اس سے تعرض کردینا کافی سمجھتا ہوں کہ جو محققین احکام کو علل سے وابستہ کرنے کے حامی ہیں وہ ان علل کو معتبر سمجھتے ہیں جو کہ کتاب وسنت میں ان احکام کے ساتھ منصوص ہوں۔ (دیکھئے حجة الله البالغة للشاة ولی الله الدهلوی)

باقی ایسی علل جن کا کتاب وسنت میں کچھ پتہ نہ ہو اور ان کو محض اپنی رائے سے ان احکام سے استخراج کرکے پھر ان احکام کو ان ہی سے باندھ دینا یہ محققین کا مسلک نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس طرح احکام سے علل کا استخراج کرتے ہیں وہ آپس میں اتنا اختلاف کرتے ہیں کہ ایک متوسط درجہ کا علم رکھنے والا اتنے بڑے اضطراب میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ اسے کچھ سمجھ نہیں دیتا کہ ان مختلف آراء میں سے کونسی رائے زیادہ قریب قیاس ہے میری اس بات کی اگر کوئی تصدیق کرنا چاہے تو اس کو امام ابن حزم کی کتاب ''المحلی'' میں ابواب الرباء کا تفصیل سے مطالعہ کرنا چاہیے۔

بہر کیف! جب رسول اللہ ﷺ کی حدیث شریف میں مردہ کی ہڈی توڑنے کی عمومی ممانعت ہے تو دوسرے کسی کو (كائنا من كان) کب یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ محض اپنی اختراعات سے اس عام حکم میں تخصیص کرلے۔ لہٰذا اس بات میں دلیل کے اعتبار سے کوئی جان نہیں۔ باقی ایک دو استثنائی صورتوں کے بارے میں پہلے اپنی گذارشات پیش کرچکا ہوں۔ والحمد لله علی ذلك

(۳) اسی نمبر کے صفحہ ۱۱ پر مفتی محمد رفیق چشتی صاحب کا فتویٰ پڑھتے ہوئے یہ عبارت ملتی ہے ''کیونکہ یہ مسئلہ حرام کے ساتھ دوا کرنے کی جزئیات میں سے ہے۔'' یہ بات بھی محل نظر ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام چیز سے دوا کی جاسکتی ہے اور یہ کہ حرام چیز سے شفاء حاصل ہوتی ہے اور یہ غلط ہے۔ کیونکہ یہ بات نبی کریم ﷺ

کی احادیث صحیح کے سراسر خلاف ہے۔ ذیل میں ہم چند احادیث مبارک تحریر کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ طبرانی وغیرہ میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:

((ان الله خلق الداء والدواء فتداووا ولا تتداووا بحرام))

''بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیماری اور دوا پیدا کی ہے۔ پھر تم (بیماری کے لیے) دوا کرو اور حرام چیز سے دواء نہ کرو۔''

علامہ چشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کے جملہ رجال ثقات ہیں، اور علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ اسناد حق ہے۔'' سلسلة الاحاديث الصحيحه: ١٧٤.

۲۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے اور اس کے اخیر میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ان الله لم يجعل فى حرام شفاء))

''بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حرام میں شفاء نہیں رکھی۔''

یہ روایت امام احمد رحمہ اللہ نے ''کتاب الاشربۃ'' میں ابویعلیٰ نے مسند میں اور اسی طریق سے ابن حبان نے روایت کی ہے، اس کی سند بھی حسن ہے۔ اسی امام احمد رحمہ اللہ نے طبرانی نے معجم کبیر میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کیا ہے۔

((ان الله لم يجعل شفاء كم فيما حرم عليكم))

''بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جس چیز کو حرام کیا ہے اس میں تمہارے لیے شفاء نہیں رکھی۔''

اس کی سند صحیح ہے۔ اس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح میں صیغۂ جزم سے تعلیقاً ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔ یہ روایت گو موقوف ہے لیکن جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں حکماً مرفوع ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کو مسرح نہیں ہے۔ جب حرام چیز سے تداوی شریعت میں ممنوع ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حرام چیز میں شفاء رکھی ہی نہیں، لہٰذا زیر بحث مسئلہ کو حرام کے ساتھ دوا کرنے کی جزئیات میں داخل کرنا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔

(۴) اسی نمبر اور اسی صفحہ کے دوسرے کالم میں مفتی فضیلۃ الشیخ حسن مامون کے فتویٰ میں یہ عبارت ہے:

''میت سے چشم حاصل کر کے زندہ نابینا شخص کو پیوندکاری کے ذریعے بصارت عطا کرنا میت کی محافظت کی نسبت بہت زیادہ سودمند ہے۔ اس لیے یہ شرعاً جائز ہے اور نہ ہی اس سے میت کی حرمت کو نقصان پہنچتا ہے کیونکہ ممانعت اس صورت میں ہے جب کوئی مصلحت یا اشد ضرورت نہ ہو۔''

میری گذارش ہے کہ زندہ نابینا کے لیے میت کی چشم حاصل کرنا میت کی محافظت کی نسبت بہت سودمند اس وقت ہوسکتا تھا جب کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں ممانعت وارد نہ ہوتی لیکن جب حدیث میں ممانعت وارد ہے، اس لیے یہاں میت کی محافظت ضروری ہے کیونکہ ایسا نہ کرنے سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے

رسول اکرم ﷺ کی نافرمانی لازم آتی ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول علیہ السلام کے حکم سے انحراف سخت وعید کا موجب بن سکتا ہے:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

(النور: ٦٣)

باقی رہی مصلحت کی بات تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول علیہ السلام کا ہر فرمان وحی یا وحی کی روشنی میں ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ایسی کسی مصلحت کی بنا پر آپ کا حکم متروک یا متبدل ہو سکتا تھا تو اس کی استثناء حدیث مبارک میں ضرور وارد ہوتی، آئندہ کا علم انسان کو تو نہیں لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کو تو ہے۔ اس کو اس کا علم تھا کہ آئندہ ایسے ایسے حالات پیش آئیں گے اور سائنس وتجربات اور تحقیق وجستجو کہاں تک ترقی کر جائے گی اس لیے ایسی مصلحت اگر اس حکم کو تبدیل کر سکتی تھی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے رسول اکرم ﷺ کو وحی کرتا اور وہ یہ استثنائی صورت بتا دیتے۔ "وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا" ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی مصلحت یا ضرورت پیش کر کے کتاب وسنت کے ارشادات کی تخصیص نکال کر اس حکم کو متروک قرار دے دیں یا اس کو بدل دیں۔ (وهو كما ترىٰ)

(۵) اسی نمبر کے صفحہ ۱۳ کالم اول میں "رابطہ عالم اسلامی کی اسلامی فقہی کونسل" کی شرائط کے ذکر میں نمبر ا میں عبارت ہے "عطیہ دینے سے عطیہ دینے والے کی زندگی کو نقصان پہنچنے کا کوئی خدشہ نہ ہو۔"

میں گذارش کروں گا کہ زندہ انسان کسی دوسرے انسان کو اپنے ان ہی اعضاء کا عطیہ دے گا جو دو دو ہوں مثلاً آنکھیں، ہاتھ، پاؤں، گردہ اور یہ تو بدیہی بات ہے کہ ان اعضاء کے عطیہ سے اگر ان کی زندگی کو نقصان نہ بھی پہنچے لیکن ان کے اعضاء کا نقصان تو ضرور ہوگا اور ان کی کارکردگی میں کافی کمی رونما ہوگی اور ایک عضو پر وہ بوجھ پڑے گا۔ جو دو میں بٹا ہوا تھا اور ہو سکتا ہے۔ ایک عضو اتنا بوجھ اٹھا نہ سکے اور آئندہ چل کر اس کے دو میں سے جو باقی ایک عضو تھا وہ بھی ماؤف ہو جائے تو اس عطیہ دینے والے کا کیا بنے گا؟ ویسے دنیا میں کانے، ہاتھ اور ٹانگ کٹے انسان بھی دیکھے جاتے ہیں اور وہ اپنی زندگی پوری کر رہے ہیں لیکن ان کی زندگی کس طرح گزرتی ہے، اس کا احساس ہم دو اعضاء رکھنے والے انسان کو کما حقہ نہیں ہو سکتا۔ جب ہم پر خدانخواستہ اس قسم کی کوئی آفت آتی ہے تب پتہ چلتا ہے کہ جن بے چاروں کو یہ نعمتیں میسر نہ تھیں ان کا کیا حال تھا۔

بہر حال ایک زندہ انسان کو اپنے اعضاء میں سے کسی محروم انسان کو عطیہ دینے کی ترغیب (بشرطیکہ اس کی زندگی خطرہ میں نہ ہو) ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ انسان اگر حادثہ کا شکار ہو کر پورا عضو کھو دے تو یہ اور بات ہے۔ انسان مجبوراً اس حالت کو برداشت کر لیتا ہے کیونکہ اس کے سوائے اس کو اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں ہے، لیکن اچھا خاصا انسان اور صحت مند جان بوجھ کر اپنا ایک عضو کٹوا کر دوسرے کو دے دے تو یہ ہماری ناقص رائے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو دانستہ ضائع کر کے اپنے آپ کو ناقابل نقصان پہنچا رہا ہے اور اس طرح یہ کفران نعمت

کے تحت میں بھی آتی ہے۔ شریعت اسلامی نے بلاشبہ دوسرے مسلمان کی اعانت اور بقدر وسعت اس کو فائدہ پہنچانے کی ترغیب دی ہے اور یہ بڑے اجر وثواب کا کام بھی ہے لیکن اس نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ اپنے اعضاء میں سے کاٹ کر دوسرے انسان کو فائدہ پہنچاؤ۔ بہرصورت یہ شق ہم ہیچمدانوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخری قسط میں مولانا نے انتقال خون کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے اس حد تک تو اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ کسی وقت کسی آدمی کی جان بچانے کے لیے بروقت ان کے اعزہ واقارب یا احباب وغیرہم میں سے کسی سے مطلوبہ خون انجکشن کے ذریعے لے کر اس مریض کے جسم میں منتقل کر دیا جائے اور یہ صورت ﴿فمن اضطر غیر باغ ولا عاد الی اخرہ﴾ میں داخل ہو سکتی ہے لیکن اس وقتی اشد ضرورت کو بنیاد بنا کر انتقال خون کی کھلی اجازت دی جائے اور اس کے جمع کرنے کے لیے بلڈ بینکس قائم کیے جائیں جس طرح آج یہی بات رواج پذیر ہو گئی ہے، تقریباً ہر بڑے ہسپتال میں خون کے اسٹور موجود ہوتے ہیں اور مریضوں کے جسم میں اس کی رقم لے کر اس خون کو منتقل کیا جا رہا ہے اس سے قطعاً اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پھر خون کی تحریم کا مسئلہ ہی باقی نہیں رہتا اگر کوئی آدمی کسی لمبے سفر پر جانے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کو یہ خیال آتا ہے کہ ہو سکتا ہے اس طویل اور دور دراز سفر میں کہیں کوئی حلال چیز میسر نہ آ سکے، اس لیے کیوں نہ میں کوئی مردار حرام چیز اپنے ساتھ لے لوں (یعنی حفظ ماتقدم کے طور پر) تاکہ اگر کسی وقت مجھے ایسی اضطراری صورت حال پیش آ جائے تو میں اس حرام چیز سے کچھ تناول کر لوں تاکہ میں مرنے سے بچ جاؤں۔ کیا ایسی صورت میں ایسے آدمی کو یہ فتویٰ دیا جا سکتا ہے کہ تم اپنے ساتھ حرام چیز لے جا سکتے ہو تاکہ اگر حلال چیز نہ مل سکے، تو اس سے تناول (بقدر ضرورت) کر لو۔ جہاں تک میرا حسن ظن ہے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ کوئی عالم اس قسم کا فتویٰ نہیں دے گا۔ بعینہ یہی بات انتقال خون کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ یعنی اگر کسی وقت اشد مجبوری کی وجہ سے انتقال خون کی ضرورت پیش آ جائے تو اس کو بنیاد بنا کر یہ فتویٰ صادر نہیں کیا جا سکتا کہ اب اس کی حلت کا عمومی فتویٰ دیا جائے اور اس کے حصول کے لیے باقاعدہ بلڈ بینکس اور بلڈ سٹوریج قائم کیے جائیں کیونکہ اس طرح خون کی حرمت بالکلیہ ختم ہو کر رہ جاتی ہے اور ہمارے یہاں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ کافی طویل عرصہ پہلے ہمیں یاد ہے کہ اس قسم (انتقال خون) کی ضرورت اکثر وبیشتر پیش نہیں آتی تھی۔ یہاں شاذونادر ایسا واقعہ سننے میں آتا تھا اور پھر اسی وقت کسی صحت مند آدمی سے خون لیا جاتا اور مریض کے جسم میں منتقل کر لیا جاتا لیکن جب سے یہ بلڈ بینکس وجود میں آئے ہیں تو اس قسم کے واقعات بھی کثرت سے رونما ہو رہے ہیں۔

یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی سنت جاریہ ہے کہ جب انسانوں میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نواہی یا محرمات کی طرف ان کا میلان ہوتا ہے اور اللہ کی منہی عنہ چیز کی طرف جھکنے کا داعیہ ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ بھی ان کی ابتلاء کے لیے اس چیز کے ارتکاب کے زیادہ مواقع ان کے لیے پیدا کر دیتا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے ہفتہ کے دن شکار کرنا ممنوع تھا اور ان کے دلوں میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اوامر ونواہی کی اطاعت کا داعیہ بالکل کمزور

تھا۔اس لیے ان سے انحراف کے بہانے ڈھونڈتے پھرتے تھے،اس لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھی ان کے ابتلاء کے لیے کچھ ایسا نمونہ بنا دیا کہ مچھلیاں ہفتہ کے دن پانی کے اوپر اتنی کثرت سے نمودار ہوتی تھیں کہ ان کے منہ میں پانی بھر آتا۔

﴿إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ (الاعراف: ۱۶۳)

بہرحال جب ہم نے خود ہی اس چیز کو اپنے لیے ضرورت قرار دے دیا ہے اور ایک نادر و کبھی کبھار واقع ہونے والی چیز کو وہم سے جلد جلد واقع ہونے والی متصور کر لیا تو قدرت بھی ہمارے لیے اب روز بروز اسے واقعات فراہم کرتی رہتی ہے۔اس سلسلہ میں چند مثالیں اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں لیکن سردست اس پر اکتفا کرتا ہوں۔علاوہ ازیں ان بلڈ بینکس میں جو خون جمع ہوتا ہے وہ مومن کافر فاسق وفاجر صالح وطالح سب سے لیا جاتا ہے اور کسی فاسق اور ملحد کا خون ایک صالح آدمی کے جسم میں جا کر اس پر ناگوار اثرات بھی پیدا کر سکتا ہے اس طرح بہت سے مفاسد کا امکان رہتا ہے۔بہرصورت اس بات کو محض ایک واہمہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس مسئلہ پر علماء وفضلاء عصر کو اچھی طرح غور و تدبر سے کام لے کر کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔عجلت سے کام لینا یا محض وقتی جذبات کی رو میں بہہ جانا عقلمندی نہیں ہے۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

❀❀❀❀

اہل حدیث ایک امتیازی لقب ہے

السعی الاثیث فی تحقیق التلقب باھل الحدیث ، اہل الحدیث ایک امتیازی لقب ہے، شاہ صاحب رحمہ اللہ سے شارجہ سے ایک نسیم احمد نامی شخص نے سوال کیا جو کہ اس مقالہ کے شروع میں موجود ہے، جس کا کہنا ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو ''جماعت المسلمین'' کہلوانا چاہیے جبکہ اہل حدیث کہلوانا بدعت ہے۔ تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس مقالہ میں یہ پیش کیا ہے کہ اہل حدیث کوئی فرقہ نہیں ہے اور نہ یہ کہلوانا بدعت ہے، بلکہ یہ نام صرف اور صرف ''امتیازی'' ہے اور اس کے کہلوانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (الازہری)

الجواب بعون الكريم الوهاب وبيده التوفيق وهو حسبی ونعم الوكيل .

سوال کے اسلوب و انداز سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سائل نے ''اہل حدیث'' کو بھی ایک فرقہ سمجھ رکھا ہے حالانکہ یہ بات قطعاً غلط ہے کہ ''اہل حدیث'' کوئی فرقہ ہیں جس وجہ سے فرقہ بندی کا الزام ان پر عائد ہوتا ہو بلکہ یہ (اہل حدیث) محض ایک امتیازی لقب ہے جوان کو اصحاب الرائے ومقلدین ومبتدعین سے ممتاز کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ لقب اصحاب الحدیث ''اہل حدیث'' کا پتہ خیر القرون میں ملتا ہے، امام احمد سے پوچھا گیا کہ ''ابدال'' کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا اگر وہ اہل حدیث نہیں ہیں تو پھر مجھے پتہ نہیں کہ وہ کون ہیں؟ [1] بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے تذکرہ میں بھی اس کا سراغ ملتا ہے اور اگر آپ کتب تاریخ کی ورق گردانی کریں، مثلاً تاریخ ابن خلدون مع مقدمہ وغیرہا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ تابعین وتبع تابعین کے زمانے سے ان سلف وصالحین کو اپنے آپ کو اصحاب الرائے سے ممتاز کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی، اور اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو اہل حدیث لقب دے دیا۔

لفظ حدیث کا اطلاق قرآن وحدیث دونوں پر ہوتا ہے:

اور یہ اس لیے کہ لفظ حدیث کا اطلاق قرآن وحدیث دونوں پر ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ۝﴾ (المرسلات : ٥٠)

اور......

﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ۝﴾ (الطور : ٣٤)

اور آپ ﷺ ہر خطبہ میں یہ الفاظ فرماتے تھے:

((احسن الحديث كتاب الله))

اس طرح قرآن پاک میں:

﴿وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا﴾ (التحريم : ٣)

یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نبی کریم ﷺ کے قول کو حدیث کہا ہے۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ سے ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک بات دریافت کی تو آپ ﷺ نے

---

[1] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے طائفہ منصورہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

((ان لم تكن هذه الطائفة المنصورة اصحاب الحديث فلا ادری من هم))؟

((معرفة علوم الحديث للحاكم، ص: رقم٢ وسنده حسن وفتح البارى: ١٣/ ٢٩٣. (الازهری)

فرمایا کہ ''میں جانتا تھا کہ تم ہی اسکے متعلق پوچھو گے کیونکہ میں تمہارا ''حدیث پر حرص'' جانتا ہوں۔''

بحرحال حدیث کا لفظ قرآن وسنت دونوں پر بولا گیا ہے اس لیے ان محدثین کرام وفضلاء وعظام نے یہی لقب اختیار کیا تاکہ اس کو سننے والا جان لے یہ جماعت صرف قرآن وسنت پر ہی عمل کرتی ہے بخلاف اہل الرائی کے۔

لفظ اہل کا معنی ومفہوم:

اور جس نیک (کام) یا بات سے انسان کو زیادہ تعلق ہوتا ہے اس کی طرف لفظ ''اہل'' سے منسوب ہوتا ہے۔
ذیل میں صحیح بخاری کی ایک حدیث نقل کرتا ہوں غور فرمائیں۔
امام بخاری کتاب الصوم میں باب الریان للصائمین کے تحت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث لائے ہیں:

((من انفق زوجین فی سبیل اللہ نودی من ابواب الجنۃ یا عبداللہ ھذا خیر فمن کان من اھل الصلاۃ دعی من باب الصلاۃ ومن کان من اھل الجھاد دعی من باب الجھاد ومن کان من اھل الصیام دعی من باب الریان، ومن کان من اھل الصدقۃ دعی من باب الصدقۃ الحدیث)) [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس آدمی کا کسی نیک کام سے زیادہ تعلق ہوتا ہے وہ اس کام کی طرف ''اہل'' سے منسوب ہوتا ہے لہٰذا جو آدمی قرآن وحدیث سے زیادہ شغف رکھتا ہے اور اپنا اوڑھنا بچھونا انہیں کو بناتا ہے تو کیوں نہ اس کو اہل حدیث کہا جائے اور میں تو یہی امید رکھتا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اللہ کے فضل سے قرآن وسنت سے زیادہ شغف رکھنے کی وجہ سے ان شاء اللہ باب الحدیث سے بلایا جائے گا۔(اللھم امین)

یہ اس لیے کہ لفظ حدیث کتاب وسنت دونوں کو شامل ہے ہاں اگر اہل قرآن لقب رکھا جاتا تو یہ صرف قرآن کے ساتھ مخصوص ہو جاتا باقی سنت کی طرف کوئی اشارہ نہ رہتا۔

الحاصل! اگر اسی امتیاز کو مدنظر رکھ کر جو اوپر مذکور ہوا ہے۔ اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں تو اس میں کون سی قباحت ہے اس سے کون سی شناعت لازم آتی ہے اور یہ بدعت کیسے ہوں؟ یہاں اس امتیازی لقب کی ضرورت اس لیے تھی اور ہے کہ دوسرے سب فرقے بھی اپنے آپ کو مسلم کہیں اور یہ دعویٰ بھی کرتے رہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں، ابتداء میں سلف صالحین کے زمانے میں سب کے سب فرقے اپنے آپ کو مسلمون کہتے تھے۔

خواہ وہ معتزلہ ہوں، بدعتی ہوں، خارجی ہوں، شیعہ اور روافض میں سے ہوں غرض کہ کسی فرقہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں لیکن کہتے اپنے آپ کو وہ مسلمان ہی تھے۔ اب آپ ہی فرمائیں وہ محدثین عظام اور سلف صالحین جو ما انا علیہ واصحابی پر عامل تھے وہ اپنے آپ کو کیسے ان سے ممتاز کرتے؟ میں آج کی بات آپ کو بتاتا ہوں، ہم سے بسا اوقات پوچھا جاتا ہے کہ صاحب آپ کس مسلک کے ہیں؟

---

[1] بخاری: ۱۸۹۷.

ہم اولاً ان کو یہی جواب دیتے ہیں کہ بھائی ہم مسلمان ہیں لیکن وہ پھر کہتے ہیں کہ صاحب مسلمان تو ہم سب ہیں لیکن آپ کس مسلک کے پیرو ہیں؟

دو تین بار کے اس سوال و جواب کے بعد جب ان کو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم اہل حدیث ہیں تو پھر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہیں ان کے سوال کا جواب مل گیا۔

بس یہی وجہ تھی اور ہے کہ ہم اس لقب مبارک کو اپنائے ہوئے ہیں، لیکن ہمیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر اس سے فرقہ بندی کیسے ہوئی اور یہ بدعت کیسے بنی۔

اہل حدیث طائفہ منصورہ کیوں؟

اہل حدیث کا اپنے آپ کو فرقہ ناجیہ کہنا وہ اس بنا پر ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی ناجی ان میں سے صرف ایک ہوگا اور وہ وہی ہے جو "ما انا علیه و اصحابی" پر عامل ہو اور یہ بات صرف اہل حدیث پر صادق آتی ہے کیونکہ صرف یہی جماعت ہے جو کتاب وسنت کو امام بناتی ہے اور اس کو ہی مستند مانتی ہے اور کسی جماعت کی یہ حالت نہیں، حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ، وغیرہم پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے گا کہ واقعی جماعت اہل حدیث ہی وہ جماعت ہے جو صرف کتاب وسنت پر عمل کرتی ہے۔

بہر حال اہل حدیث کوئی خاص فرقہ مخترعہ ومبتدع نہیں ہے لیکن وہ مسلمانوں کی ہی جماعت ہے جو صرف کتاب وسنت پر عمل کرتی ہے۔ اور اپنے آپ کو دوسرے فرقہ بندیوں سے ممتاز کرنے کے لیے اپنا لقب اہل حدیث رکھ لیا ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہاں اگر کوئی جاہل اس حقیقت کے برخلاف اہل حدیث کو بھی ایک فرقہ مخترعہ سمجھ لے تو اس سے اصل حقیقت پر کیسا اثر آتا ہے؟

دیکھئے جماعت المسلمین کے بھی چند افراد ایسے ہیں کہ وہ میرے اور بھائی صاحب حضرت علامہ سید بدیع الدین شاہ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے اور صاف صاف کہتے ہیں کہ ہم ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔

حالانکہ ان کا امیر سید مسعود احمد صاحب ہمارے پیچھے ہمیشہ نماز پڑھتا رہا ہے۔ تو کیا ان کم فہم اور کم علم لوگوں کے اس طرز عمل سے ہم یہ فرض کر لیں کہ واقعتاً جماعۃ المسلمین من حیث الجماعۃ کا یہی عقیدہ وعمل ہے کہ ہمارے پیچھے نماز جائز نہیں؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس کا جواب جماعۃ المسلمین کے سربراہ اور وہ لوگ خود دیں گے کہ ہمارا یہ خیال نہیں بلکہ یہ جاہل لوگوں کا خیال ہے اور ان کا خیال یا عمل، ہم جماعت المسلمین من حیث الجماعۃ پر کام نہیں آئے گا پس اس طرح یہی سمجھ لیں کہ اگر کوئی جاہل اپنے آپ کو اہل حدیث کہہ کر یہ تصور کرتا ہے کہ یہ امتیازی لقب سے بڑھ کر ایک الگ اور علیحدہ مخترعہ فرقہ ہے تو اس سے جملہ اہل حدیث کس طرح بدعتی یا فرقہ بندی کے مرتکب قرار پائیں گے؟ باقی رہا قرآن عظیم کا ہم کو مسلم کہنا تو وہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ ہم مسلم ہیں اس سے انکار تو کیا ہی نہیں ہے۔ البتہ محض امتیاز کے لیے یہ مزید لقب اختیار کر لیا ہے اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اصل نام

جو اللہ نے ہمارا رکھا ہے اس سے انکار یا اس سے انحراف اختیار کر رہے ہیں ان دونوں باتوں میں اچھی طرح سے غور کر کے ان کا فرق معلوم کر لیا جائے، اگر اس کے باوجود جماعت ''المسلمین'' کو اسرار ہے کہ آپ کے نام کا ثبوت نہیں ہمارے نام کا ثبوت ہے لہٰذا آپ کا نام بدعت اور ہمارا نام صحیح ہے تو اس کے متعلق میں یہ گذارش کروں گا کہ جناب اگر جناب کے زعم کے بموجب ہمارے نام کا ثبوت نہیں تو آپ کے نام جماعت والمسلمین' کا بھی نہیں۔ اللہ کی کتاب نے تو ﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ (الحج) کہ تمہارا نام المسلمون رکھا ہے پھر آپ نے یہ جماعت کے لفظ کا ٹانکا کیوں لگا رکھا ہے آپ کو تو اپنے آپ کو صرف ''المسلمون'' یا ''المسلمین'' کہنا چاہیے جماعت کا لفظ قرآن پر زیادتی ہے جو آپ کو تو قطعاً جائز نہیں پھر کیوں اپنے آپ کو جماعت المسلمین کہتے ہیں، ہاں جماعت المسلمین والے اپنے نام کے ثبوت میں ایک صحیح حدیث جو صحیح بخاری میں ہے آگے پیچھے کو چھوڑ کر محض اپنے مطلب اور لوگوں کو مغالطے دیتے ہیں کہ دیکھو ہم نے اپنے نام کا ثبوت دے دیا ہے۔ لیجئے میں پہلے صرف وہ ٹکڑا ذکر کرتا ہوں، جو یہ حضرات اپنے مفروضہ کے اثبات کے لیے پیش کرتے ہیں:

((فما تامرى ان ادركنى ذالك قال تلزم جماعة المسلمين وامامهم))

اب یہ قطعہ پیش کر کے پھولے نہیں سمائے کہ ہمارے نام کا حدیث صحیح سے ثبوت مل گیا۔ حالانکہ اگر بنظر انصاف وتدبر کے ساتھ ساری حدیث کو اور اس کے سیاق وسباق آگے پیچھے کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو ان کی دلیل تار عنکبوت سے بھی کمزور نظر آئے گا اور ان کے مغالطہ کی ساری قلعی کھل کر رہ جائیں گی۔ لیجئے میں عرض کرتا ہوں غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس حدیث میں جماعۃ المسلمین سے ترکیب اضافی کا پورا مفہوم مراد ہے یعنی اس وقت کی مسلمانوں کی جماعت سے چمٹ جاؤ یعنی مسلمانوں کی جماعت سے الگ نہ ہو جاؤ اسی وجہ سے دوسری حدیث میں آتا ہے کہ ''من شذ شذ فى النار'' اگر آپ ﷺ صرف یہ فرماتے کہ التزام المسلمین تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں میں شامل رہو یعنی مسلمانوں کے ساتھ کام کرتے رہو حالانکہ آپ کے فرمان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی جماعت سے ملے رہو۔ اگر کوئی آدمی موحد بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سب فرائض بھی بجا لاتا ہے اور عبادات سنت کے مطابق ادا کرتا ہے، لیکن وہ جماعت کے ساتھ نہیں رہتا بلکہ جماعت سے الگ ہو گیا ہے تو گویا وہ مسلم تو ہے لیکن وہ ایک بڑے جرم کا بھی ارتکاب کر رہا ہے، یعنی جماعت سے الگ ہو جانا فرداً فرداً تو ہر ایک مسلمان ہے، لیکن جماعت تو تب تشکیل پائے گی جب مسلمانوں کے افراد کا مجموعہ ایک جگہ ہی ہو لہٰذا آپ کے ارشاد کا مطلب یہی تھا کہ جماعتی نظام جب تک قائم ہے اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے اگر نبی کریم ﷺ کا مقصد یہ ہوتا کہ تم اپنی جماعت کا نام جماعت المسلمین رکھ لو تو آپ یہ نہ فرماتے کہ ''التزم جماعة المسلمين'' بلکہ ''التزم اسم جماعة المسلمين'' یا ''سموا انفسكم جماعة المسلمين'' فرماتے حالانکہ آپ ﷺ نے اس طرح نہیں فرمایا، ہم نے جو مطلب پیش کیا ہے حدیث شریف

کا بعد کا حصہ بھی اس پر واضح طور پر دلالت کرتا ہے چنانچہ ہم ذیل میں وہ حدیث پوری کی پوری نقل کرتے ہیں پھر آپ دیکھنا کہ کتنا بڑا مغالطہ یہ حضرات دیتے ہیں۔

((انـه سـمـع حذيفة بن اليمان لقول كان الناس يسألون رسول الله ﷺ عن الـخيـر وكـنـت اساله عن الشر مخافة ان يدركنى فقلت يا رسول الله ﷺ انا كـنـافـى جاهلية و شر فجاء نا الله هذا الخير فهل بعد هذا الخير من شر قال نـعـم فقلت وهل بعد ذلك الشرمن خير قال نعم وفيه دفن قلت سادفنه قال قـوم يهـدون بـغير هديى تغرف منهم وتنكر قال قلت فهل بعد ذالك الخير مـن شر قال نعم دعاة على ابواب جهنم من اجابهم اليها قذفوه فيها قلت يا رسول الله ﷺ صـفـهـم لـنـا قال هم من بلدتنا ويتكلمون بالسنتنا قلت فما تـامـرنـى ان ادركنى ذالك قال تلزم جماعة المسلمين وامامهم قلت فان لم يـكن لهم جماعة ولا امام قال فاعتزل تلك الفرق كلها ولو ان تعض بامهل شجرة حتى يدركك الموت وانت على ذالك)) [1]

آپ نے یہ حدیث ملاحظہ کر لی ہوگی، اس حدیث میں صاف طور پر نظر آ رہا ہے کہ حضرت ﷺ ایک زمانہ کا ذکر فرما رہے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو جہنم کی طرف بلانے والے ہوں گے، یعنی اپنے اعمال واعتقادات کی طرف دعوت دیتے ہوں گے جن کا انجام جہنم ہو پھر صحابی حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پوچھنے پر ان کی صفات بیان فرمائیں پھر جب اس صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ایسے دور کے متعلق مجھے کیا ارشاد ہے اگر یہ زمانہ میں پالوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: "التزم جماعة المسلمين وامامهم" یعنی پھر اس وقت تم مسلمانوں کی جماعت اور اس کے امام سے ملے اور چمٹے رہو ان سے الگ نہ ہو جاؤ اور نہ ان سے علیحدگی اختیار کرو یہ عبارت خود بخود بتا رہی ہے کہ یہاں جماعت کے ساتھ ملے رہنے کا حکم ہو رہا ہے نہ کہ ان کو یہ امر کیا جا رہا ہے کہ تم یہ نام اپنی جماعت کا رکھ لو اور یہی وجہ ہے کہ آگے پھر اس صحابی رضی اللہ عنہ نے ''دریافت کیا کہ اگر جماعت وامام نہ ہو تو؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: "فاعتزل" یعنی اگر جماعتی نظام ہی نہ ہو تو پھر تم بالکل علیحدہ ہو جاؤ اگرچہ تم کو درخت کی جڑوں کو کھانا پڑے تاہم تم بالکل ان سے الگ تھلگ رہو، بہر حال یہاں ارشاد تو جماعت کے ساتھ جماعتی نظام برقرار رکھنے کا اشارہ ہو رہا ہے اور یہ حضرات فرماتے ہیں لو جی! ہمیں حکم ہو گیا ہے کہ اپنا نام جماعۃ المسلمین رکھ لو حالانکہ یہاں جماعت کے تسمیہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ یہاں مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ ملے رہنے کا حکم ہو رہا ہے، الغرض اگر جماعۃ المسلمین اپنی جماعت کا نام صرف وہی رکھنا چاہتے ہیں جو قرآن میں ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے

---

[1] صحيح البخاری: ۲/ ۱۰۲۹۔ كتاب الفتن باب كيف الامران لم تكن جماعة.

سوائے جو بھی نام گویا امتیاز کے لیے ہی نہیں تاہم وہ بھی بدعت ہے تو انہیں اپنی جماعت کا نام صرف ''المسلمون'' یا ''المسلمین'' رکھنا چاہیے یہ جماعت کا لفظ اپنی طرف سے بڑھا رہے ہیں جو قطعاً جائز نہیں، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کو یہ نام ''جماعت المسلمین'' پسند ہوتا تو وہ یہ نہ فرماتا کہ: ﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ بلکہ یہ فرماتا "هو سماكم جماعة المسلمين" اور اللہ کو بھول وغیرہ نہیں ہوتی ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ (مریم)

اب آپ نے دیکھ لیا کہ جو نام ان حضرات نے اختیار کر رکھا ہے اس کا بھی ثبوت قرآن وحدیث سے نہیں ملتا لیکن پھر بھی اس سے چمٹے ہوئے ہیں، اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ تمہارا نام بے ثبوت ہے۔

حالانکہ ہم اوپر مذکورہ صفحات میں یہ واضح کر کے آئے ہیں کہ ہمارا نام مسلم ہی ہے ''اہل حدیث'' یہ جو لقب ہے ممتاز کرنے والا نام ہے جو دوسرے فرقوں سے صحیح مسلک والوں کو ممتاز کرتا ہے اس لیے کہ صرف ''مسلم'' ہونے کا دعویٰ تو سب کے سب فرقے کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حنفی یا کسی بدعتی وغیرہ کو یہ کہے کہ تم مسلم نہیں ہو یا تم مسلمانوں کی جماعت سے خارج ہو تو وہ اس پر غضبناک ہو جائے گا اور یہ کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ اس کو مسلمانوں کی جماعت سے خارج تصور کیا جائے پھر بتایئے ان سے امتیاز کیسے ہو؟

سوال کی دوسری شق کا جواب:

باقی سوال میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ''علماء اہل حدیث کہتے ہیں کہ ان کے بعض علماء شرک اور بدعات تک میں مبتلا ہیں؟

تو یہ بھی عجیب ہے سائل ان علماء (جو یہ کہتے ہیں) کے اسماء بھی لکھ دیتے تو ہم دیکھتے کہ وہ کون ہیں؟ اور انہوں نے کیا کیا کہا ہے؟

دراصل سائل کو اس بات سے غلطی لگی ہوگی کہ بعض علماء نے کسی کام کے متعلق کہا ہوگا کہ یہ کام بدعت کا ہے اور یہی کام کسی دوسرے عالم کو کرتے دیکھا ہوگا اس سے یہ بات بنالی کہ گویا ان کے علماء دوسرے علماء کو مبتدع کہتے ہیں حالانکہ اگر کسی آدمی کو کسی بات کی دلیل کا علم نہیں ہوا اس لیے وہ اس بات کو بدعت کہتا ہے تو اس سے دوسرا آدمی جو یہ کام کرتا ہے لیکن اس کو اس کام یا بات کا کتاب وسنت سے دلیل معلوم ہوگئی ہے تو وہ قطعاً مبتدع نہ ہو سکتا ہے اور نہ کہلوا سکتا ہے۔

دیکھئے روایات میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ''ضحیٰ'' کی نماز کو بدعت کہتے تھے۔

حالانکہ دوسرے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس کا پڑھنا ثابت ہے اور عاملین کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل دلیل کے طور پر موجود ہے۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں "صلوٰۃ ضحی" کو ترک نہ کرنے کی وصیت کی تھی۔ [1]

[1] بخاری، كتاب التهجد، باب ماجاء فی التطوع مثنیٰ مثنیٰ، رقم الحديث: (١١٦٧)

اور صحاح احادیث میں آپ ﷺ کا پڑھنا بھی ثابت ہے مثلاً

فتح مکہ کے موقعہ پر آپ ﷺ نے آٹھ رکعات ضحیٰ کی نماز پڑھی تھی۔ (صحیح بخاری)

آپ بتائیے کیا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بدعت کہنے سے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم بدعتی ہوگئے؟ جواب دینے سے قبل یہ سوچ لینا کہ اس جواب کی زد کہاں تک پہنچے گی؟

بہر کیف اگر ایک عالم دوسرے عالم کے کسی کام کو بدعت کہتا ہے اس وجہ سے کہ ابھی تک اس کو اس کی دلیل کا علم نہیں ہوا تو اس سے وہ عالم کیسے بدعتی ہو جائے گا جو اس کام کو علی وجہ البصیرۃ کتاب وسنت کی روشنی میں دلائل کی بنا پر کرتا ہے؟

اگر یہی طریقہ اور طرز استدلال ہے۔

تو ہم جماعت المسلمین کے بھی چند کاموں کو گنوا سکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بدعت ہیں تو کیا وہ اپنے آپ کو مبتدع تسلیم کرلیں گے؟

اس قسم کی طفل تسلیوں والی باتیں زیب نہیں دیتی بات تو بالکل واضح ہے کہ یہ لقب ''اہل الحدیث'' ہم نے صرف امتیاز کے لیے اختیار کر رکھا ہے اور امتیاز کے لیے کوئی نام اپنا لینا بدعت کے تحت نہیں آ سکتا یہی وجہ ہے امام المحدثین ابوعبداللہ البخاری، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی، امام مالک رحمہم اللہ وغیرہم سب کے سب اپنے آپ کو ''اہل الحدیث'' کہتے رہے کیا ان کو معلوم نہیں تھا کہ ہمارا نام اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ''المسلمون'' رکھا ہے کیا چودھویں صدی کے اختتام پر ایسے لوگ وجود میں آئے ہیں جن کو اصلی اور صحیح نام معلوم ہوا ہے باقی گذشتہ صدیوں کے سب کے سب لوگ اسی بدعتی نام کو اپنائے ہوئے تھے؟

اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر ہمارا جواب بھی سن لیجئے۔

ان کان بدعا کون اهل حديث

فليشهد الثقلان انی مبتدع

والله اعلم بالصواب

وانا احقر العباد

محب اللہ شاہ الراشدی

❁❁❁❁

پاؤں کے قبلہ رخ ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ

ہفت روزہ الاعتصام لاہور میں ایک مضمون مولانا عبدالقیوم صاحب کا شائع ہوا جنہوں نے ایک دو احادیث سے ثابت کرنے کی سعی کی کہ قبلہ رخ پاؤں کرنا صحیح نہیں ہے تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس مضمون کا جواب لکھا تھا۔

(الازہری)
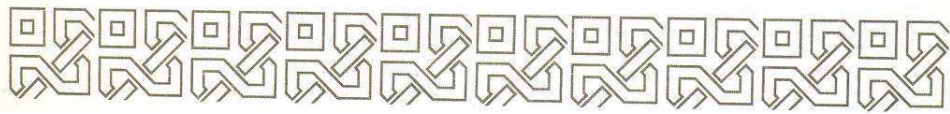
''الاعتصام'' مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۹۰ء میں مولانا عبداللہ صاحب قصوری کا مضمون بعنوان بالا نظر سے گذرا۔ افسوس ہوا کہ مولانا نے اس مضمون میں تحقیق سے کام نہیں لیا۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر عنوان کو پڑھ کر یہ خیال ہوا کہ دیکھیں کیا کچھ اس میں ہوگا، لیکن دلائل کو دیکھ کر ہمیں مایوسی ہوئی۔

تفصیل ملاحظہ ہو:

۱......سنن دارقطنی جلد ۲ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع روایت ذکر کی گئی ہے۔ مولانا نے اس حدیث کا ترجمہ کر دیا اور سند کے متعلق ایک حرف بھی تحریر نہ فرمایا حالانکہ سند کی تحقیق اور اس کی صحت وحسن کے یقین کے بغیر کسی حدیث کو معرض استدلال میں پیش کرنا علماء کی شان سے بعید ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث بالکل ضعیف ہے۔ مولانا صاحب سنن دارقطنی کی اس روایت کے متعلق صرف صاحب ''التعلیق المغنی'' کی عبارت کو دیکھنے کی زحمت گوارا فرماتے تو اس طرح اس حدیث کو بلا سند کی تحقیق کے تحریر فرما کر چلے نہ جاتے اگر خدانخواستہ انہوں نے مولانا عظیم آبادی کی تحقیق ملاحظہ فرمائی پھر بھی دانستہ اس علت سے تغافل برت کر چلے گئے تو فان كنت لا تدرى فتلك مصيبة، معاملہ اور بھی سنگین بن جاتا ہے

وان كنت تدرى فالمصيبة اعظم.

گو مولانا کی ذات سے حسن ظن ہمیں اس شق کے ماننے میں تامل ہے۔ بہر حال صاحب ''التعلیق المغنی'' فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی تو حسین بن زید ہے جس کو امام علی بن المدینی نے ضعیف کہا ہے۔ حافظ ابن حجر لسان المیزان میں ''حسن بن حسین عرنی'' کے ترجمہ میں فرماتے ہیں کہ: حسين بن زيد لين ايضا، یعنی حسین بن زید بھی کمزور ہے۔ دوسرا راوی اس کی سند میں ''حسن بن حسین العرنی'' ہے اس کا ترجمہ بھی حافظ ابن حجر کی کتاب لسان المیزان میں موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متروک ہے۔

حافظ صاحب نے چند ائمہ حدیث مثلاً ابوحاتم، ابن عدی، ابن حبان وغیرہم سے ان کو غیر صدوق اور غیر ثقہ کہا ہے اور اسی اللسان میں اس راوی کی چند منکرہ احادیث ذکر کی گئی ہیں اور ان میں اس حدیث کو بھی ذکر کیا ہے جو مولانا نے دلیل کے طور پر ذکر فرمائی ہے۔

حدیث کے اختتام پر حافظ صاحب فرماتے ہیں: وهو حديث منكر، اور یہ حدیث منکر ہے۔ اور پھر حسین بن زید کے متعلق یہ بھی فرمایا کہ وقال ابن عدى، منكر الحديث عن الثقات ويقلب الاسانيد، یعنی حسین بن زید ثقات راویوں سے منکر روایات لاتا ہے اور اسانید کو بدل دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کی سند میں ایک تیسرا راوی ''حسین بن الحکم الحیری'' ہے اور وہ بھی غیر معروف ہے ملاحظہ ہو۔ ''لسان الميزان للحافظ ابن حجر''

بہرحال یہ روایت شدید الضعیف ہے اس لیے کہ اس کی سند میں تین راوی ہیں۔ ایک ضعیف ہے دوسرا متروک ہے اور تیسرا غیر معروف ہے۔

اصول حدیث سے ممارست رکھنے والے جانتے ہیں کہ متروک راوی کی روایت کو نہ تو شواہد ومتابعات تقویت پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی ایسے راوی کی روایت کسی دوسری تھوڑے سے ضعف کی حامل کو ہی تقویت دے سکتی ہے یعنی ایسے راوی کی روایت نہ تو جابر بن سکتی ہے نہ مجبور۔ اس روایت میں تو متروک راوی کے علاوہ بھی دو راوی ضعیف ہیں لہٰذا اس کے ضعف میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کو امام نووی نے بھی ضعیف قرار دیا ہے جیسا کہ مولانا عظیم آبادی نے ''التعلیق المغنی'' میں تحریر فرمایا ہے اور حافظ ابن حجر نے منکر قرار دیا ہے جیسا کہ لسان المیز ان کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔

امام بیہقی نے بھی اس کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے جیسا کہ ''السنن الکبری'' کے جلد۲ صفحہ ۳۰۷ میں اس حدیث کے اوپر اس طرح عنوان منعقد فرماتے ہیں ((باب ما روی فی کیفیة الصلوٰة علی الجنب او الاستلقاء وفیه نظر)) خط کشیدہ الفاظ میں اس روایت کی تضعیف کی طرف اشارہ ہے۔ جب ائمہ حدیث سے اس حدیث کو ضعیف اور منکر قرار دیا ہے۔ تو ایسی ناکارہ روایت کو لے کر دلیل کے طور پر پیش کرنا مولانا کو زیب نہیں دیتا۔

دوسرے نمبر پر مولانا نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر سنن دارقطنی سے نقل فرمایا ہے۔ یہ اثر سنن کبریٰ للامام البیہقی وغیرہ میں بھی ہے۔ لیکن اس کی سند میں بھی ایک روای ابوبکر بن عبیداللہ بن عمر ہے جو اپنے والد عبیداللہ بن عمر سے روایت کرتا ہے اور اس راوی (ابوبکر بن عبیداللہ بن عمر) کا ترجمہ ہمیں کہیں نہیں ملا۔

الجرح و التعدیل لابن ابی حاتم، کتاب الثقات للعجلی، کتاب الثقات لابن حبان تقریب التهذیب و تهذیب التهذیب لابن حجر وغیرها.

کو دیکھا لیکن یہ نام ہی نہیں ملتا۔ جب اس اثر کی سند میں ایک راوی غیر معروف ہے تو اس کو معرض استدلال میں کیسے پیش کیا جا سکتا ہے۔

تیسرے نمبر پر مولانا نے متن کے الفاظ درج کیے ہیں نہ یہ لکھا کہ مرفوع ہے یا موقوف ہے۔

مرفوع ہونے کی صورت میں اس کو روایت کرنے والا کونسا صحابی ہے اور موقوف ہونے کی حالت میں بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس صحابی کا قول ہے۔ یعنی ان باتوں کے متعلق کچھ بھی تحریر نہیں فرمایا گیا پھر نیچے تحریر فرماتے ہیں ''کتاب بالا باب صلوٰۃ المریض ص ۴۳'' اوپر سنن دارقطنی کا ذکر ہے لیکن اس کے اس صفحہ یا اثر ابن عمر والے صفحہ پر تو اس قسم کی کوئی روایت نہیں لہٰذا اس کے متعلق ہم کچھ عرض کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ آگے پھر ہدایہ، کنزالدقائق، غنیۃ الطالبین اور درمختار کی عبارات نقل کی ہیں۔ لیکن کتب کوئی حجت نہیں ہیں۔ حجت تو صرف کتاب اللہ اور سنت الرسول ﷺ ہے اسی طرح بعض تابعین یا تبع تابعین کے آثار بھی کوئی حجت نہیں ہیں۔

خلاصہ کلام: مسئلہ زیر بحث پر مولانا نے کتاب وسنت سے کوئی ٹھوس دلیل پیش نہیں فرمائی، جس سے تشفی وتسلی ہو۔

آخر میں گذارش ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ کتاب وسنت میں ایسی کوئی صریح دلیل نہیں ہے جس سے پاؤں کا قبلہ رخ ہونا ناجائز قرار دیا جائے۔ ادھر جواز کے دلائل جو مولانا عبداللہ صاحب قصوری نے پیش فرمائے ان کا حال بھی معلوم ہو چکا۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے کہ شریعت مطہرہ نے بیت اللہ العظیم کی تعظیم وتوقیر کا حکم دیا ہے۔ سورۃ حج کی وہ آیت جو مولانا نے نقل فرمائی ہے:

﴿ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِo﴾ (الحج: ٣٢)

یہ بھی اس پر دال ہے اگرچہ مولانا نے جلالین وابن کثیر کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ یہاں شعائر اللہ سے مراد قربانی کے جانور ہیں۔ لیکن جیسا کہ اصول فقہ میں یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ "العبرۃ لعموم اللفظ لا بخصوص السبب" اعتبار لفظ کے عموم کو ہوتا ہے نہ کہ سبب کے خصوص کو اور پھر سیاق وسباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بیت اللہ، مسجد حرام، مناسک حج، قربانی کے جانور اور دوسری عبادات سب شعائر اللہ میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے بہت سے مفسروں نے بھی اس جگہ "شعائر اللہ" کو عام ہی رکھا ہے بلاوجہ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر ان حقائق کے باوجود مولانا کو اصرار ہے کہ یہاں شعائر اللہ سے مراد قربانی کے جانور ہی ہیں تو اس آیت کریمہ سے پیشتر یہ آیت کریمہ گذر چکی ہے کہ:

﴿ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ....﴾ (الآية) (الحج: ٣٠)

یہ آیت کریمہ "وليطوفوا بالبيت العتيق" کے بعد آئی ہے اور مضمون کے لحاظ سے اس جگہ حرمات اللہ میں بیت اللہ و مسجد حرام یقیناً داخل ہیں۔ لہٰذا حقیقت سے فرار مناسب نہیں۔

بہرصورت جب بیت اللہ یا قبلہ کی تعظیم شرعاً مطلوب ہے تو راقم الحروف کے خیال میں جن لوگوں کے ہاں قبلہ کی طرف پاؤں کو دراز کرنا سوء ادبی میں داخل ہے انہیں بہر حال اس سے اجتناب کرنا اولیٰ وافضل ہے اور جو اس کو سوء ادبی یا تعظیم وتوقیر کے منافی نہیں سمجھتے ان کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے۔

واللہ اعلم وعلمه اتم واحكم، وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين وصلى الله على سيدنا محمد وآله واصحابه وبارك وسلم.

وانا احقر العباد

محب الله شاه ١٩٩٠/ ١٢/ ٣

❁❁❁❁

بحالتِ قیام جوتا پہننے کی ممانعت کی احادیث کی تحقیق

حدیث شریف میں ہے:

((نهی رسول اللهﷺ ان ینتعل الرجل قائما))

''رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہوکر جوتا پہننے سے منع فرمایا۔''

یہ حدیث متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

اس روایت کی تحقیق میں علماء نے اختلاف کیا، شیخ عبدالرؤف آف شارجہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے جبکہ ڈاکٹر ابوجابر دامانوی صاحب حفظہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس کے جواب میں شیخ محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ نے الاعتصام میں اس کا علمی تعاقب کیا اور یہ مقالہ تحریر کیا، جس میں تمام طرق سے ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور قابل عمل ہے۔ (الازہری)

الاعتصام مجریہ ۸ رجب ۱۴۱۱ ہجری مطابق ۲۵ جنوری ۱۹۹۱ء میں محترم ڈاکٹر ابو جابر عبداللہ صاحب کا مضمون بعنوان ''بحالت قیام جوتا پہننے کی ممانعت والی حدیث ضعیف ہے۔'' نظر سے گذرا، نہایت افسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس حدیث کی تضعیف میں بہت تعسف سے کام لیا ہے، یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ آج ہمارا حال یہ ہوگیا ہے کہ کوئی حدیث ہمارے مذاق کے موافق نہیں ہوتی یا اس پر عمل پیرا ہونے میں قدرے دشواری پیش آتی ہے تو اس کو کسی نہ کسی طرح ضعیف بنا کر رکھ دیتے ہیں، خواہ اس میں ہمیں کتنے ہی پاپڑ بیلنے کیوں نہ پڑیں۔

اس سلسلے میں صحیح طریقہ کار تو یہ تھا کہ اسی حدیث کے مقابلے میں دوسری روایات کا تتبع کیا جاتا، اگر کوئی صحیح روایت جواز کی مل جاتی تو ان دونوں میں تطبیق کی صورت نکل آتی یا پھر ان کے متعلق دوسرے وجوہ وعوامل تلاش کیے جاتے، تو بمصداق ''جوئندہ یابندہ'' کوئی نہ کوئی صحیح محمل مل جاتا۔ لیکن اس ہٹ کر تعسف سے کام لے کر حدیث کو ہی ضعیف بنا کر چھوڑنا انتہائی ناانصافی ہے۔ پہلی حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی ابوالزبیر کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف الاسناد ہے۔

دوسری روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے، اس کے تین طرق ہیں۔

پہلا طریق: ((من طریق ابی معاویة عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی هریرة ﷺ مرفوعا)) مروی ہے، اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اولاً اس کی سند میں ابو معاویہ الضریر ہیں۔ وہ مدلس ہیں اور اس جگہ ''عن'' سے روایت کرتے ہیں، لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔

گذارش ہے کہ ابو معاویہ الضریر کا نام محمد بن حازم ہے اس کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے طبقات المدلسین طبع ''المکتبة السلفیہ، لاہور'' کے صفحہ ۳۶ پر مدلسین کے مرتبہ ثانیہ میں ذکر فرمایا ہے اور مرتبہ ثانیہ کے متعلق کتاب مذکور ہیں، صفحہ ۱۳ پر فرماتے ہیں:

((الثانیة، من احتمل الائمة تدلیسه واخرجوا له من الصحیح لامامته وقلة تدلیسه من جنب ما روی کالثوری الخ))

''دوسرا، مدلسین کا مرتبہ وہ ہے جن کی تدلیس کو ائمہ حدیث نے ان کی امامت اور قلت تدلیس کی وجہ سے قبول فرمایا ہے۔ مثلاً امام سفیان الثوری'' الخ

جب ابو معاویہ کو حافظ صاحب نے تدلیس کے دوسرے مرتبہ میں ذکر کیا ہے تو حافظ صاحب رحمہ اللہ کے ارشاد کے مطابق ائمہ حدیث کے نزدیک ان کی تدلیس محتمل ومقبول ہوگی نہ کہ مردود۔

حافظ صاحب ۳۶ پر ابو معاویہ کے بارے میں فرماتے ہیں "اثبت اصحاب الاعمش فیه" ابو معاویہ

اعمش سے روایت کرنے میں ان کے دوسرے اصحاب سے اثبت ہیں۔‘‘ اوراس جگہ وہ اعمش سے ہی راوی ہیں، لہٰذا یہ علت غیر موثر ہے۔

ہوسکتا ہے ڈاکٹر صاحب یہاں بھی وہی ہتھیار استعمال کرنے لگ جائیں جو آگے اعمش کے متعلق کام میں لائے ہیں کہ ’’لیکن حافظ صاحب کا یہ قول صرف ان کا ظن ہے اوراس کی کوئی دلیل ان کے پاس موجود نہیں۔الخ

یہ عبارت انہوں نے حافظ ذہبی کے قول یعنی ’’اعمش کی جو روایات ان کے ان شیوخ سے مروی ہیں، مثلاً ابو وائل، ابراہیم اور ابوصالح السمان سے، وہ اتصال پر محمول ہیں۔‘‘

کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے حالانکہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، نخبۃ الفکر طبع فاروقی کتب خانہ ملتان کے ص ۱۳۵ پر فرماتے ہیں:

((هو من اهل الاستقراء التام من نقد الرجال))

’’یعنی حافظ ذہبی رجال کے نقد میں استقرار تام کی اہلیت رکھتے ہیں۔‘‘

اوراس سلسلے میں انہیں مہارت کاملہ حاصل ہے۔اس وقت تک جملہ علماء وفضلاء محققین اور علم حدیث کی ممارست رکھنے والے سب کے سب انہیں کی کتب کے خوشہ چین رہے ہیں، وہ اس لیے کہ حافظ ذہبی بھی جو کچھ فرماتے ہیں وہ بالعموم اور اغلب طور پر ائمہ حدیث متقدمین اور ناقدین فن کے اقوال اور ان کے فرمودات اور ارشادات اور ان کے طرزعمل سے ماخوذ ہوتا ہے لیکن آج ایسے مجتہد پیدا ہو چکے ہیں کہ ان کی ان مساعی جمیلہ پر پانی پھیر رہے ہیں اور ان کی ان تحقیقات کو محض ان کا بغیر دلیل اپنا ظن بتا رہے ہیں۔اگر بالفرض ہم مان لیں کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا اپنا ظن ہے تو یہ ظن بھی حقیقت کے مترادف ہے کیونکہ امام ذہبی رحمہ اللہ بھی حافظ تھے۔انہوں نے بھی رواۃ حدیث کی روایت کو متقدمین ائمہ حدیث کی طرح پورے طور پر ناقدانہ اصول پر رکھ کر پھر ان پر حکم لگایا ہے اگر کسی ایک یا دو جگہ پر ان سے اس سلسلہ میں کوئی غلطی ہوگئی ہے تو اس قسم کی شاذ و نادر غلطیاں تقریباً سب ہی ائمہ حدیث سے ہوئی ہیں کیونکہ انسان بہرحال معصوم نہیں ہے لیکن یہ انصاف کا خون نہیں کہ ان کی اس شاذ و نادر غلطی کو لے کر ان کی بقیہ سب تحقیقات پر تنسیخ کا قلم پھیر دیا جائے؟ پھر ڈاکٹر صاحب ایک باقاعدہ بیان فرماتے ہیں "والمدلس اذا عنعن فلا تكون فيه الحجة" جو مدلس بھی عنعنہ کرے (عن سے روایت کرے) اس میں حجت نہیں ہوتی۔

حالانکہ ڈاکٹر صاحب کا یہ عموم صحیح نہیں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے طبقات المدلسین میں اوران سے پیشتر حافظ علائی نے جامع التحصیل میں مدلسین کے مراتب بیان فرمائے ہیں۔

یاد رہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتاب طبقات المدلسین جیسا کہ خود حافظ صاحب نے اپنی اس کتاب کی ابتداء میں تصریح فرمائی ہے۔حافظ علائی کی کتاب سے ماخوذ ہے لہٰذا اگر ہر محدث کا عنعنہ مسترد ہے تو ان حفاظ کا

ان مدلسین کو ان مراتب میں تقسیم کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور ان بزرگوں نے اپنی ان کتب میں بیان فرما دیا ہے کہ ان مراتب میں سے پہلے اور دوسرے مرتبہ کے مدلسین کی معنعنہ احادیث ائمہ حدیث نے قبول کی ہیں۔اب ہم ان حفاظ حدیث کی بات مانیں یا ڈاکٹر صاحب کی؟ ہاں اگر کسی موضوع پر حافظ علائی اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ میں اختلاف ہو جائے مثلاً ایک راوی کو حافظ علائی رحمہ اللہ نے دوسرے مرتبہ میں ذکر کیا ہو اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے تیسرے مرتبہ میں ذکر کیا ہو تو ایسے موقع پر ہم دوسرے دلائل کی طرف مراجعت کریں گے اور جس کی بات ان دلائل کی روشنی میں صحیح نظر آئی اس کو اختیار کیا جائے گا مثلاً امام زہری رحمہ اللہ کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تیسرے مرتبہ میں ذکر کیا ہے لیکن حافظ علائی ان کو دوسرے مرتبہ میں لائے ہیں، اس جگہ تحقیق سے حافظ علائی کا موقف صحیح نظر آتا ہے۔

بہرحال جب ابومعاویہ الضریر دوسرے مرتبہ کے مدلسین میں سے ہیں تو ان کا عنعنہ ائمہ حدیث کے طرز عمل کے مطابق مقبول ومحتمل ہوگا نہ کہ مسترد ونامقبول۔

دوسری حدیث میں دوسرا راوی جس پر ڈاکٹر صاحب نے کلام کیا ہے وہ (اعمش سلیمان بن مہران) ہے اس پر بھی وہی تدلیس کا خدشہ پیش فرمایا ہے اور بلا وجہ بات کو طول دیا ہے اعمش کو اگرچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دوسرے مرتبہ میں ذکر کیا ہے لیکن اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک موقف وہ ہی صحیح ہے۔ جو حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، یعنی جب وہ ایسے شیوخ سے معنعنہ روایت کرے جن سے انہوں نے بہت سی روایات لی ہیں اور وہ ان کے کبار شیوخ میں سے ہیں تو ایسا عنعنہ اتصال پر محمول ہوگا لہٰذا اس جگہ وہ چونکہ ابوصالح سے روایت کر رہا ہے جو ان کے کبار شیوخ میں سے ہے لہٰذا یہ روایت اتصال پر محمول ہوگی۔

میں کہتا ہوں راویوں کی روایات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی راوی دو ایسے راویوں سے روایت کرتا ہے جن کی کیفیتیں ایک جیسی ہوتی ہیں تو ایسی حالت میں وہ راوی اسی شیخ کی کنیت پر اکتفا کرتا ہے جو اس کا معروف ومشہور استاذ ہو اور ان سے بہت سی روایات انہوں نے لی ہیں۔ اگر دوسرا ہوتا ہے تو وہ نام سے یا کسی دوسرے طریقہ سے اس کی وضاحت کرتا ہے۔ یہاں بھی یہی معاملہ ہے۔اعمش جس ابوصالح سے اکثر روایات لیتا ہے اور جو اس کے کبار شیوخ میں سے ہے وہ ابوصالح السمان (ذکوان) ہے نہ کہ باذام۔مزید برآں یہ بات بھی ملحوظ ذہنی چاہیے کہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں اعمش کے ترجمہ میں جن سے وہ روایت کرتا ہے ان میں باذام کا نام تو مذکور ہے لیکن آگے یہ بات بھی ملتی ہے کہ اعمش نے باذام سے کچھ بھی نہیں سنا، چنانچہ التہذیب میں امام ابن ابی حاتم سے نقل کیا ہے:

((وقال ابی لم یسمع من ابی صالح مولی ام ھانی التھذیب طبع نشر السنة)) (ج٤/ ص١٩٦)

''میرے باپ (ابوحاتم الرازی) نے فرمایا (اعمش) نے ام ہانی کے غلام ابوصالح سے کچھ نہیں سنا۔''

اور ام ہانی کا مولیٰ ابوصالح باذام ہی ہے۔ اسی طرح ص ۱۹۷ پر فرماتے ہیں:

((قال عبدالله بن احمد عن ابيه الاعمش عن ابی صالح يعنی مولی ام هانی))

''عبداللہ اپنے والد حضرت امام احمد رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا اعمش کی روایت ابو صالح مولیٰ ام ہانی سے منقطع ہے۔''

کتب حدیث میں اعمش کی بے شمار روایات عن ابی صالح (بلاصفت) مروی ہیں، پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ انہوں (اعمش نے) یہ سب بے شمار روایات ایسے راوی سے روایت کی ہیں جس سے کچھ سنا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ صحاح ستہ و دیگر کتب احادیث میں اعمش کی لاتعداد احادیث عن ابی صالح عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ مروی ہیں اور شارحین کرام عموماً اس ابوصالح سے ابوصالح السمان (ذکوان) ہی مراد لیتے آئے ہیں، تو کیا یہ سب غلطی کرتے آرہے ہیں اور ان روایات میں ابوصالح تھا تو باذام لیکن ان سب علماء محدثین نے خطا کی کہ ان کو 'السمان' ہی قرار دیا اور اس نکتہ پر صرف ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم نوا ہی مطلع ہو سکے؟ ہم ایسے ہیچ مندانوں کی سمجھ سے تو یہ بات از حد بالاتر ہے۔ بہرحال یہ نکتہ محض جدت پسندی کا نتیجہ ہے جس کا داعیہ محض ایک صحیح روایت کو ضعیف قرار دینے کی سعی ہے اور بس۔

خلاصہ کلام دوسری حدیث کا یہ طریق ہماری تحقیق کے مطابق صحیح ہے اس کی تضعیف کی کوئی وجہ وقیع سامنے نہیں آئی۔

دوسری حدیث کا دوسرا اور تیسرا طریق ضعیف ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، اسی طرح تیسری حدیث جو سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کا پہلا طریق قتادہ کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے اور سلیمان بن عبیداللہ الرقی بھی قوی اور مضبوط نہیں۔ تیسری حدیث کا دوسرا طریق بھی عنبسہ بن سالم کی وجہ سے ضعیف ہے۔

چوتھی حدیث جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ بھی صحیح ہے اس کی صحت پر کوئی غبار نہیں۔

لیکن محترم ڈاکٹر صاحب نے اس جگہ بھی امام سفیان الثوری کے متعلق وہی حربہ استعمال کیا ہے جو ابومعاویہ العزیز کے سلسلہ میں پیش فرمایا تھا، یعنی بدقسمتی سے انہوں نے کتب رجال میں دیکھ لیا کہ سفیان الثوری رحمہ اللہ بھی مدلس ہیں، حالانکہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ میزان میں (جہاں سے ڈاکٹر صاحب نے یہ نقل فرمایا ہے کہ "كان يدلس عن الضعفاء" وہ ضعفاء سے تدلیس کرتے تھے) یہ بھی ساتھ ہی فرماتے ہیں:

((ويكن لـه نقد وذوق ولا عبرة لقول من قال: يدلس ويكتب عن الكذابين)) (الميزان طبع عيسى البابى: ٢/ ١٦٩)

''امام سفیان الثوری کو ناقدانہ بصیرت اور ذوق تھا (جس سے ان ضعفاء کی روایات صحیحہ کا امتیاز کر لیتا تھا) اور اس آدمی کی بات کا کوئی اعتبار نہیں جو یہ کہتا ہے کہ امام ثوری رحمہ اللہ کذابوں (جھوٹوں) سے تدلیس کرتا تھا اور ان سے روایات لکھا کرتا تھا۔''

افسوس کہ ڈاکٹر صاحب نے "یدلس عن الضعفاء" تو نقل فرمایا اور آگے جو کچھ تھا اس کو حذف کر دیا گیا، اس لیے کہ یہ قطعہ ان کے موقف کے لیے مضر تھا؟ پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے "کان یدلس عن الضعفاء" والا ٹکڑا اس عبارت کے بعد ذکر فرمایا ہے:

"الحجة الثبت، متفق علیه مع انه، کان یدلس عن الضعفاء" یعنی ''امام ثوری رحمہ اللہ حجت ثبت اور محدثین کے درمیان متفقہ طور پر مقبول ہیں، باوجود اس بات کے کہ وہ ضعفاء سے تدلیس کرتے تھے۔

اب قارئین کرام آپ خود ہی انصاف کریں کہ وہ "کان یدلس عن الضعفاء" سے پیشتر جو عبارت ہے وہ ڈاکٹر صاحب کے موقف کو کتنا بے معنیٰ کر رہی ہے!! اس سے تو صاف عیاں ہے کہ حافظ ذہبی کا موقف بھی وہی ہے جو حافظ ابن حجر کا ہے: یعنی ان کی امامت وجلالت اور ندرت تدلیس کی وجہ سے ائمہ حدیث نے ان کی معنعنہ روایات بھی قبول فرمائی ہیں۔ امام ثوری کی امامت وجلالت تو حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے ابتدائی الفاظ سے نمایاں ہے رہی ان کی ندرت تدلیس تو حافظ ابن حجر طبقات المدلسین میں دوسرے مرتبہ کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

((من احتمل الائمة تدلیسه واخرجوا له فی الصحیح لامامته وقلة تدلیسه فی جنب ماروی کالثوری))

''دوسرا مرتبہ وہ ہے جن کی تدلیس کو ائمہ حدیث نے برداشت کیا ہے اور اپنی صحاح میں ان کی روایات نکالی ہیں ان کی امامت اور قلت تدلیس کی وجہ سے جیسا کہ امام ثوری۔''

پھر آگے جا کر حافظ صاحب نے جب دوسرے مرتبہ کے مدلسین کے نام گنوائے ہیں وہاں بھی امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کے متعلق امام المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں:

((ما اقل تدلیسه))

''امام ثوری کی تدلیس کتنی قلیل ہے۔''

جب ائمہ فن کی تصریحات سے معلوم ہو گیا کہ امام ثوری رحمہ اللہ کی تدلیس بہت قلیل ونادر ہے اور وہ اس تدلیس قلیل کے باوصف حجۃ وثبت ہیں اور محدثین کے مابین متفق علیہ ہے اور محدثین نے ان کی احادیث کی اپنی صحاح میں تخریج کی ہے۔ تو آپ ڈاکٹر صاحب کی یہ علت کوئی وزن نہیں رکھتی۔

بہرکیف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ والی حدیث کی سند بھی صحیح ہے۔

پانچویں حدیث بھی ضعیف ہے۔

بالجملہ ڈاکٹر صاحب نے پانچ حدیثیں ذکر فرمائی تھیں، ان میں سے دو کی سندیں صحیح ہیں اور باقی تین بجمیع طرقہا ضعیف ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے ان دو صحیح سندوں والی حدیثوں کے متعلق جو کچھ خامہ فرسائی فرمائی اس میں کوئی بھی ایسی علت بیان نہیں فرمائی جو ان حدیثوں کو ضعیف وساقط عن الاحتجاج بنادے۔

هـذا ما عندی والعلم عند الله العلام وهو أعلم بالصواب وصلى الله على خير خلقه سيدنا محمد وآله واصحابه وبارك وسلم.

❁❁❁❁

تسکین القلب المشوش باعطاء التحقیق فی تدلیس الثوری والاعمش

بحالت قیام جوتا پہننے کی ممانعت

جماعت کے معروف محقق محترم جناب زبیر علی زئی صاحب حفظہ اللہ نے شاہ صاحب رحمہ اللہ کے مضمون "ایضاح المرام واستیفاء الکلام، علی تضعیف حدیث النهی عن الانتعال فی حالة القیام" پرتنقید فرمائی اور تحریر فرمایا کہ جوتا دونوں حالتوں میں پہننا صحیح ہے۔

تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان کے رد میں ایک مقالہ بنام "تسکین القلب المشوش باعطاء التحقیق فی تدلیس الثوری والاعمش" تحریر فرمایا اور جہاں جہاں محترم زبیر علی زئی صاحب نے اختلاف کیا آپ نے ان کا علمی تعاقب فرمایا اور ثابت کیا کہ یہاں الاعمش اور امام ثوری رحمہ اللہ کی تدلیس مضر نہیں ہے۔ (الازہری)

قارئین کرام! کچھ عرصہ ہوا راقم الحروف نے ایک مقالہ تحریر کیا تھا۔ اس کا موضوع تھا کہ ''کھڑے ہوکر جوتی پہننے سے ممانعت کی جو حدیثیں وارد ہیں'' ان میں سے دو حدیثیں۔

١۔ ((الثوری عن عبدالله بن دینار عن ابن عمر رضی اللہ عنہما))

٢۔ ((الاعمش عن ابی صالح عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ)) (صحیح الاسناد ہیں)

اس پر ہمارے ایک کرم فرما محترم مخلص دوست مولانا زبیر علی زئی حفظہ اللہ نے تنقید فرمائی ہے۔

تنقید سے نہ تو گھبرانا چاہیے اور نہ برا ہی منانا مناسب ہے۔ تنقید سے بالاتر تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پاک ہے یا اس کا رسول اللہ ﷺ ان کے علاوہ اور کسی کو یہ مقام وحیثیت ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی۔

اپنے مقالہ میں محترم دوست نے چند کلمات میری تعریف میں بھی قلم بند فرمائے ہیں۔ یہ ان کا محض حسن ظن ہے۔ ورنہ ''من آنم کہ من دانم'' بہرحال اس حسن ظن کے لیے میں ان کا مرہون منت ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دل کی گہرائیوں سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ارحم الراحمین انہیں دنیا وعقبیٰ میں جزائے خیر رحمت فرمائے۔ اللھم آمین

ہمارے محترم دوست نے ان حدیثوں کی سندوں کو ضعیف قرار دینے کے لیے بڑی کاوش کی ہے۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی یہ تحقیق یا تنقید قطعی طور پر مجھے مطمئن کرنے میں ناکام رہی ہے اور الحمد لله ثم الحمد الله میں ابھی تک اپنے پہلے موقف پر قائم ہوں اور اس سے بال برابر بھی ہٹنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس اجمال کی تفصیل قارئین آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز

محترم دوست ابتداء میں تحریر فرماتے ہیں اور پھر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب طبقات المدلسین سے ثابت کیا کہ امام سفیان ثوری اور امام سلیمان بن مہران الاعمش مرتبہ ثانیہ کے مدلسین ہیں جن کا عنعنہ بھی قابل قبول ہے۔ (الاعتصام مجریہ دو اگست ۱۹۹۱ء صفحہ ۱۵ کالم اول)

حالانکہ یہ بات نہیں۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کے متعلق تو بلاشبہ میں نے لکھا ہے کہ چونکہ یہ طبقات المدلسین مولف حافظ ابن حجر رحمہ اللہ میں یہ مرتبہ ثانیہ میں مذکور ہے۔ لہٰذا اس کا عنعنہ مقبول ہے لیکن امام اعمش کے بارے میں اس طرح ہرگز نہیں لکھتا بلکہ امام اعمش رحمہ اللہ کے متعلق میری عبارت اس طرح ہے کہ:

''اعمش کو اگرچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دوسرے مرتبہ میں ذکر کیا ہے، لیکن اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک موقف وہی صحیح ہے جو حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے یعنی جب وہ الخ'' (الاعتصام مجریہ ۷ جون ۱۹۹۱ء ص ۱۲ کالم اول)

اب قارئین کرام خود فیصلہ فرمائیں کہ میں نے کب اور کہاں لکھا ہے کہ اعمش کی تدلیس مطلقاً مقبول ہے کیونکہ حافظ صاحب نے ان کو مرتبہ ثانیہ میں ذکر کیا ہے؟ بلکہ الاعتصام میں میری عبارت واضح طور پر بتارہی ہے کہ

میں اعمش کو تیسرے مرتبہ کا مدلس سمجھتا ہوں۔ ہاں جب وہ اپنے کبار شیوخ، ابراہیم، ابو وائل اور ابو صالح السمان ایسے شیوخ سے روایت کرے۔ تب ان کا عنعنہ اتصال پر محمول ہوگا نہ کہ مطلقاً۔ قارئین کرام کے مزید افادہ کے لیے میں گزارش کرتا ہوں کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اگر چہ طبقات المدلسین میں اعمش کو مرتبہ ثانیہ میں ذکر فرمایا ہے لیکن اپنی کتاب "النکت علی کتاب ابن الصلاح" جو کہ طبقات المدلسین کے بعد تحریر فرمائی ہے جیسا کہ ان کی اس کتاب (النکت) سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنی اس غلطی کی تلافی فرما دی ہے اور اعمش رحمہ اللہ کو مرتبہ ثالثہ میں ذکر کیا ہے دیکھئے "النکت ج ۲ص ۶۴۰"

بہر کیف امام اعمش رحمہ اللہ تیسرے مرتبہ کے مدلسین میں سے ہیں۔ یہاں اس زیر بحث حدیث میں ہم نے جو ان کے عنعنہ کو قبول کیا۔ اس کی وجہ دوسری ہے نہ کہ وہ بات جو ہمارے محترم دوست نے تحریر فرمائی ہے پھر اسی صفحہ ۱۵ کے دوسرے کالم سطر ۸ میں فرماتے ہیں: "مگر امام حاکم نے انہیں طبقہ ثالثہ میں ذکر کیا ہے۔ جامع التحصیل...... [1]

امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((والثالث من يدلس عن اقوام مجهولين لايدرى من هم كسفيان الثورى وعيسى بن موسى غنجار وبقية بن الوليد))

ہمارے دوست محترم کی عبارت میں کتاب کے صفحات بھی مرقوم ہیں لیکن میں نے دانستہ یہ صفحات نہیں لکھے کیونکہ میرے پاس جامع التحصیل وغیرہ ہیں لیکن ہمارے محترم دوست کے مرقوم صفحات میں (اکثر طور پر) یہ عبارات نہیں ملتیں۔ اس لیے ہم نے اچھی طرح تلاش کر کے یہ عبارات دیکھیں۔

ہماری معروضات:

(۱) محترم دوست نے امام حاکم کی عبارت جامع التحصیل سے نقل فرمائی ہے۔ اولیٰ وانسب تو یہ تھا کہ وہ خود امام حاکم کی کتاب "معرفة علوم الحديث" متعلقہ فصل کو پوری طرح دیکھ کر کوئی رائے قائم فرماتے۔ نقل در نقل سے جو غلطیاں رونما ہوتی ہیں۔ ان سے محترم دوست بخوبی واقف ہوں گے۔ امام حاکم رحمہ اللہ تو اس طرح فرماتے ہیں:

((قال ابو عبدالله التدليس عندنا على ستة اجناس)) [2]

"ابو عبداللہ (حاکم) فرماتے ہیں پھر تدلیس ہمارے یہاں چھ جنسوں پر ہے۔"

لیکن علامہ علائی جامع التحصیل میں اس طرح لکھتے ہیں:

---

[1] جامع التحصيل ص ۱۱۲ "فی نسختنا"

[2] معرفة علوم الحديث

((وقد قسم الحاكم ابو عبدالله فى كتابه (علوم الحديث) اجناس المدلسين الى ستة اقسام)) ❶

''(حاکم) عبداللہ نے اپنی کتاب علوم الحدیث میں مدلسین کی جنسوں کو چھ قسموں میں تقسیم کیا ہے۔''

اہل علم ان دونوں عبارتوں میں جو باریک فرق ہے اس کو خیال میں رکھیں۔امام حاکم کی کتاب کو غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس جگہ مدلسین کے مراتب من حيث الرد والقبول بیان نہیں فرمائے بلکہ محض ان کی اجناس بیان فرمائی ہیں، یعنی مدلسین کس کس قسم کے ہوتے ہیں۔لیکن اس سلسلہ میں یہاں بحث کو بلا وجہ طول دینا مقصود نہیں اگر ہمارے محترم دوست کو اصرار ہے کہ یہاں امام حاکم نے مدلسین کے مراتب ہی بیان فرمائے ہیں تو لیجئے بسم الله امام حاکم نے (آپ کے خیال کے مطابق) المرتبة الاولى میں ان تابعین کا ذکر کیا ہے جو تدلیس صرف ثقہ سے ہی کرتے تھے اور مثال کے طور پر اس مرتبہ میں ابوسفیان وطلحہ بن نافع اور قتادہ بن دعامہ کا نام لیا ہے کیا ہمارے محترم دوست قتادہ کے متعلق امام حاکم کی ہمنوائی کرتے ہیں اور وہ مرتبہ اولیٰ کا مدلس ہے اور یہ کہ وہ صرف ثقہ سے ہی تدلیس کرتے تھے؟ حالانکہ اہل علم بالحدیث سب کے سب جانتے ہیں کہ ائمہ حدیث میں سے کسی ایک نے بھی قتادہ کو مرتبہ اولیٰ میں شامل نہیں سمجھا۔اس لیے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''النکت'' میں مرتبہ اولیٰ کی وضاحت اس طرح فرمائی:

((الاولى من لم يصف بذلك الاشاذا وغالب رواياتهم مصرحة بالسماع: والغالب ان اطلاق من اطلق ذلك عليهم فيه تجوز من الارسال الى التدليس ومنهم من يطلق ذلك بناء على الظن ويكون التحقيق بخلافه كما بينا ذلك فى حق شعبة قريبا وفى حق محمد بن اسماعيل البخارى فى الكلام على التعليق اهـ)) ❷

''مرتبہ اولیٰ کے مدلسین وہ ہیں جو شاذ و نادر ہی تدلیس سے موصوف کیے جاتے ہیں۔ان کی غالب روایات میں ان کے سماع کی تصریح ہوتی ہے (پھر) اس مرتبہ کے مدلسین کے بارے میں غالب یہی بات ہے کہ ان پر جنہوں نے مدلس کا اطلاق کیا ہے انہوں نے مجاز سے کام لیا ہے، یعنی ارسال پر تدلیس کا اطلاق کر دیا (یعنی ظاہر ہے کہ ارسال اور چیز ہے تدلیس اور) اور ان اطلاق کرنے والوں میں سے اپنے اس اطلاق کی بناء محض ظن وتخمین پر رکھی ہے حالانکہ تحقیق کے لحاظ سے وہ اس کے سراسر خلاف ہوتا ہے جیسا کہ ہم پہلے امام شعبہ کے حق میں بیان کر چکے ہیں۔اسی طرح تعلیقات البخاری پر

---

❶ جامع التحصيل ص ١١٢.

❷ النكت ٢/ ٦٣٦م ٦٣٧.

کلام کے سلسلہ میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ بعض نے امام المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ پر بھی تدلیس کا الزام لگایا ہے (یعنی درآنحالیکہ وہ اس تدلیس کے وہمہ سے بالکلیہ بری ہیں)۔''

یہ ہے حافظ صاحب کی مرتبہ اولیٰ کے مدلسین کے بارے میں وضاحت! تو کیا قتادہ اسی مرتبہ کے ہیں؟ کیا ائمہ فن نے ان کو جو مدلس قرار دیا ہے وہ محض ظن وتخمین پر مبنی ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ قتادہ کی تدلیس اتنی مشہور ومعروف ہے کہ مبتدی بھی جانتا ہے کہ قتادہ مدلس ہے۔ پھر کیا ہمارے دوست قتادہ کو مرتبہ اولیٰ میں داخل کرنے پر آمادہ ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جب آپ کے خیال میں یہاں امام حاکم مدلسین کے مراتب ہی بیان کر رہا ہے تو پھر ان کے ساتھ اس بات میں کیوں ہمنوا نہیں ہوتے؟ اسی طرح امام حاکم کا یہ فرمانا کہ قتادہ صرف ثقہ سے تدلیس کرتے تھے، بھی محل نظر ہے۔ ہم نے کتب رجال وحدیث وغیرہ کو دیکھا لیکن ان میں اس قسم کے مدلسین میں صرف امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا نام تو ملتا ہے لیکن قتادہ کا نام کہیں نہیں ہے۔ آگے چلئے امام حاکم نے جنس ثانی میں محمد بن اسحٰق اور ہشیم بن بشیر کے نام بھی ذکر فرمائے ہیں۔ [1]

اب اگر ہمارے محترم دوست کے خیال کے مطابق الجنس الثانی سے مراد مرتبہ ثانیہ ہے تو لیجئے بسم اللہ کر کے اعلان فرما دیجئے کہ محمد بن اسحاق کا عنعنہ بھی مقبول ہے حالانکہ حافظ صاحب نے طبقات المدلسین میں انہیں مرتبہ رابع میں ذکر فرمایا ہے اور ان کے متعلق فرماتے ہیں:

((صدوق مشهور بالتدليس عن الضعفاء والمجهولين وعن شر منهم وصفه بذلك احمد والدار قطني وغيرهما اهـ))

''(ابن اسحاق) صدوق ہے اور ضعفاء مجاہیل اور ان سے بھی بروں سے تدلیس کرنے میں مشہور ہیں اور ان کو اس قسم کی تدلیس سے امام احمد رحمہ اللہ اور دار قطنی وغیرہما نے موصوف کیا ہے۔''

اب بتائیے کیا وہ راوی جو ضعفاء ومجاہیل اور ان سے بھی گئے گزرے رواۃ سے تدلیس کرتا ہو وہ تدلیس کے مرتبہ ثانیہ میں داخل کیے جانے کے لائق ہے؟

اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر امام حاکم کا ان کو مرتبہ ثانیہ میں داخل کرنا کہاں تک صحیح ہے؟

اب بھی اگر آپ اس بات پر مصر ہیں کہ حاکم نے اس جگہ مدلسین کے مراتب ہی بیان فرمائے ہیں لیکن ابن اسحٰق اور ہیثم (جو کہ عام تدلیس کے علاوہ تدلیس التسویہ بھی کرتے تھے) کو مرتبہ ثانیہ میں داخل کرنے میں امام حاکم سے غلطی ہوگئی ہے، تو ہم یہ بھی کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ امام ثوری رحمہ اللہ کو مرتبہ ثالثہ میں شامل کرنے میں بھی امام حاکم رحمہ اللہ سے بطریق اولیٰ غلطی ہوگئی ہے۔ یہ کہنا کہ ابن اسحٰق اور ہشیم کو مرتبہ ثانیہ میں اور قتادہ کو مرتبہ اولیٰ میں داخل کرنا واقعتاً امام حاکم سے غلطی ہوگئی۔ لیکن امام ثوری کو مرتبہ ثالثہ میں داخل کرنے میں وہ حق پر ہیں تو یہ قسمتاً خیزی

[1] دیکھئے جامع التحصیل ومعرفة علوم الحدیث للحاکم ص ۱۰۵.

ہوگی اگر ہمارے محترم دوست اپنے موقف سے رجوع کرلیں اور تسلیم کرلیں کہ واقعی امام حاکم نے اس جگہ مدلسین کے مراتب بیان نہیں فرمائے (اور یہی بات درحقیقت صحیح بھی ہے) تو جس بنا پر انہوں نے امام ثوری رحمہ اللہ کو تیسرے مرتبہ میں داخل کیا تھا وہ بھی ختم ہوگئی۔

(ب) ہمارے دوست محترم مرتبہ ثالثہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((والثالث من یدلس عن اقوام مجھولین لا یدری من ھم کسفیان الثوری وعیسیٰ بن موسیٰ غنجار وبقیة بن الولید)) [1]

''تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو مجہول نامعلوم لوگوں سے تدلیس کرتے ہیں، مثلاً سفیان ثوری، غنجار اور بقیہ بن الولید۔''

والثالث من یدلس الخ یہ پوری کتاب حافظ علائی کی کتاب ''جامع التحصیل'' سے نقل کی گئی ہے اور نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حافظ علائی نے حاکم کی کتاب ''معرفۃ علوم الحدیث'' سے اس موقف پر جو عبارت نقل فرمائی ہے اس میں ایسے اختصار سے کام لیا ہے کہ بات کچھ سے کچھ ہوگئی ہے اور اس سے زیادہ افسوس محترم دوست پر ہے کہ انہوں نے بھی حافظ علائی کی منقولہ عبارت جوں کی توں نقل کردی ہے اور اصل کتاب (معرفۃ علوم الحدیث امام حاکم) کی طرف مراجعت ضروری ہی نہیں سمجھی۔ واللہ باللہ! یہ طرز عمل ان کے علمی شان سے بمراحل بعید ہے۔ ناظرین اہل علم! آپ میری گذارشات کو بتدبر و تامل ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے جنس اول (یا ہمارے محترم دوست کے خیال کے مطابق اول مرتبہ) کا بیان کر کے مثال کے طور پر متصل ہی ابوسفیان طلحہ بن نافع اور قتادہ کا نام لے لیا۔ (دیکھئے ص ۱۰۳)

۲۔ جنس ثانی کا بیان ص ۱۰۴ پر ہے۔ اس جنس کے بیان کے بعد احادیث سے ان کے امثلہ بیان فرمائے ہیں اور یہ امثلہ ص ۱۰۵ تک چلے جاتے ہیں۔ ان میں انہوں نے سفیان بن عیینہ، ہشام بن عروہ اور اعمش کو ذکر کیا۔ لہٰذا اگر یہاں مراتب مدلسین کا ہی ذکر ہے تو ہمارے دوست محترم اعمش کو مرتبہ ثانیہ میں کیوں داخل نہیں سمجھتے؟ یہ طرز انتہائی عجیب ہے کہ صرف امام ثوری رحمہ اللہ کو تیسرے مرتبہ میں داخل کرنے کیلئے امام حاکم کا حوالہ دیا جارہا ہے اور اسی بات میں ہی ان کا اتباع کیا جارہا ہے۔ فیا للعجب

اس کے بعد امام حاکم رحمہ اللہ نے ص ۱۰۵ پر لکھا ہے:

((فقد صح مثلا ذلك (ای مثل الجنس الثانی) عن محمد بن اسحق ویزید بن ابی زیاد)) الخ [2]

---

[1] طبقات المدلسین طبع المکتبة السلفیة لاهور، ص۵۱.

[2] معرفة علوم الحدیث للحاکم ص ۱۰۵.

''اسی جنس ثانی والا طرز عمل ابن اسحٰق اور یزید بن ابی زیاد...... سے صحیح طرز پر ثابت ہے۔''

ناظرین کرام! آپ یہ بات نوٹ فرمالیں کہ امام حاکم، نے اس جگہ جنس ثانی میں یزید بن ابی زیاد کو شامل سمجھا ہے۔ اس سے بھی ظاہر و باہر ہے کہ یہاں مدلسین کے مراتب کا بیان نہیں ہو رہا کیونکہ یزید بن ابی زیاد ضعیف نہیں۔ فتدبروا

۳۔ تیسری جنس کے بیان میں حافظ علائی نے ثوری، غنجار، اور بقیہ بن الولید کو مثال کے طور پر متصل ذکر کیا ہے لیکن امام حاکم نے اس طرح لکھا ہے:

((الجنس الثالث من التدليس قوم دلسوا على اقوام مجهولين لا يدرى من هم ومن اين هم)) ❶

''تدلیس کی تیسری جنس وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایسے مجاہیل سے تدلیس کی جن کے بارے میں نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کون ہیں اور نہ یہ معلوم کہ کہاں کے ہیں۔''

پھر اس کے متصل انہوں نے کسی کا نام نہیں لیا بلکہ اس جنس کا حال حدیث سے دیا اور اس حدیث کی سند میں بھی نہ ثوری کا نام نہ غنجار کا اور نہ بقیہ بن الولید کا بلکہ حسین اشقر کا۔ اس کے بعد ایک اور روایت ذکر کی جس میں محمد بن سیرین فرماتے ہیں:

((ثلاثة يصدقون من حدثهم انس وابو العالية والحسن)) ❷

''تین آدمی ہیں جو اس آدمی کی تصدیق کر لیتے ہیں جو ان کو حدیث سناتا ہے (یعنی وہ اس راوی کی تحقیق و تفتیش نہیں کرتے) انس، ابو العالیہ اور حسن۔''

تو کیا سیدنا انس رضی اللہ عنہ بھی اس تیسرے مرتبہ کے مدلس ہیں؟ اچھا آگے چلئے، پھر امام حاکم لکھتے ہیں:

((وقال ابو عبدالله قد روى جماعة من الائمة عن قوم من المجهولين فمنهم سفيان الثورى...... وكذلك شعبة بن الحجاج حدث عن جماعة من المجهولين فاما بقية بن الوليد فحدث عن خلق من خلق الله لا يوقف على انسابهم ولا عدالتهم)) الخ ❸

''ابو عبداللہ (حاکم) کہتا ہے کہ بے شک ائمہ کی ایک جماعت نے مجاہیل سے روایت کی ہے ان ائمہ میں سے سفیان ثوری ہے...... اور اسی طرح شعبہ بن الحجاج نے بھی مجاہیل کی ایک جماعت سے روایت

❶ معرفة علوم الحديث ص ١٠٥.

❷ المصدر السابق ص١٠٦.

❸ معرفة علوم الحديث ص ١٠٦.

کی ہے۔ باقی رہا بقیہ تو وہ اللہ (سبحانہ وتعالیٰ) کی مخلوق میں سے ایسے لوگوں سے روایت کرتا ہے کہ جن کے نہ انساب کا کچھ پتہ ہے اور نہ ہی ان کی عدالت کے بارے میں کوئی علم......"

یہ ہے امام حاکم کی اصل عبارت، اس سے جو سیدھی سادی بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ امام ثوری اور امام ابو شعبہ وغیرہما نے مجاہیل سے روایت کی ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ ان ائمہ کے ضعف کا باعث بنے۔

امام ابن رجب نے [1] امام نسائی سے نقل کیا ہے کہ امام ثوری اور امام عبداللہ بن المبارک ضعفاء سے روایت کیا کرتے تھے اور ان ضعفاء وغیرہم سے روایت کرنے میں بھی ائمہ کے مقاصد صحیحہ تھے، جیسا کہ امام ابن ابی حاتم نے [2] اور دوسرے علماء نے اپنی کتب میں امام ثوری وغیرہ کے متعلق ان ضعفاء سے روایت کرنے کے مقصد کی وضاحت فرمائی ہے، تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ بہر حال اگر اس عبارت کا مقصد وہی صحیح ہے جو ابھی ہم عرض کر آئے ہیں تو اس سے کوئی شناخت لازم نہیں آتی۔ اگر ہمارے دوست اور ان کے ہمنواؤں کو اس پر اصرار ہے کہ یہاں مجاہیل سے روایت کا مطلب ان سے تدلیس ہی ہے۔ کیونکہ یہ عبارت وہ تدلیس کے نوع میں ہی لائے ہیں تو پھر گذارش ہے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ امام شعبہ رحمہ اللہ بھی ضعفاء سے تدلیس کرتے تھے۔ حالانکہ یہ سراسر باطل ہے۔ امام شعبہ رحمہ اللہ تدلیس عن الضعفاء تو کجا وہ محض تدلیس سے ہی بری تھے۔ تدلیس کے متعلق ان کے مثل یہ الفاظ اصول الحدیث کی کتب اور مدلسین کے طبقات وغیرہما میں وارد ہیں اس حقیقت سے اہل علم بالحدیث بخوبی واقف ہیں اور امام شعبہ رحمہ اللہ نہ صرف خود تدلیس سے بری تھے بلکہ وہ اپنے مدلسین شیوخ سے بھی وہی روایت لیتے تھے جو ان کی مسموعہ ہوتی تھی۔ جیسا کہ یہ حافظ ابن ابن حجر رحمہ اللہ [3] اور امام ابن ابی حاتم [4] کی کتابوں میں مصرح ہے۔ لہٰذا اگر امام حاکم کے اس پیرے سے آپ امام ثوری رحمہ اللہ کا مدلس عن المجاهیل ہونا ثابت کریں گے، تو اسی پیرا سے امام شعبہ کا بھی مدلس عن المجاهیل ہونا لازم آئے گا جو بالکلیہ باطل ہے۔ بعض لوگوں نے امام شعبہ رحمہ اللہ سے بھی تدلیس کے صدور کا دعویٰ کیا ہے اور محض ظن وتخمین پر، ورنہ از روئے تحقیق یہ قطعاً حقیقت کے خلاف ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ [3] نے ان کے اس ظن کی دلائل سے تردید فرمائی ہے۔ فلیراجع

تنبیہ: امام حاکم [4] نے چوتھی جنس کا ذکر کیا ہے اور پھر لکھتے ہیں:

((قال ابوعبداللہ وقد کان الثوری یحدث عن ابراهیم بن هراسة فیقول حدثنا ابواسحق الشیبانی))

---

[1] شرح علل الترمذی ص ١٦٧.

[2] الجرح والتعدیل.

[3] طبقات المدلسین، النکت، فتح الباری.

[4] الجرح والتعدیل.

''ابوعبداللہ (حاکم) فرماتے ہیں، امام ثوری، ابراہیم پر ہراسہ (جو کہ شدید مجروح ہے) سے حدیث کرتے اور کہتے ہم سے ابواسحق الشیبانی نے حدیث بیان کی۔''

اور ابواسحق الشیبانی ایک ایسے راوی کی بھی کنیت ہے جو ثقہ ہے۔ حاکم کا مقصد غالباً یہ تھا کہ امام ثوریؒ اس طرح تدلیس الشیوخ کا ارتکاب کرتے تھے اور کسی ثقہ راوی کی کنیت کو شدید مجروح راوی پر چسپاں کر دیتے تھے کہ وہ معلوم نہ ہو سکے حالانکہ یہ امام حاکم کا وہم ہے اور واللہ سبحانہ وتعالیٰ امام ثوری پر اتہام ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ [1] میزان الاعتدال سے نقل کرتے ہوئے ابراہیم بن ہراسہ کے ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

((ابراهيم بن هراسة الشيباني الكوفي...... كان مروان بن معاوية (اى الفرارى) يقول ثنا ابواسحق بكنية لكى لا يعرف...... وقال ابن عدى حدثنى الصوفى ثنا على ابن الجعد انا ابواسحق اظنه قال الشيبانى عن يعقوب بن محمد))

''ابراہیم بن ہراسہ شیبانی کوفی مروان بن معاویہ فزاری انہیں (ابن ہراسہ کو) ابواسحق کنیت دیتے تھے اور کہتے) حدثنا ابو اسحق...... تاکہ یہ معلوم نہ ہو سکے......اور امام ابن عدی نے فرمایا، حدیث بیان کی ہم سے صوفی نے، انہوں نے کہا حدیث بیان کی ہم سے علی بن الجعد نے، کہا خبر دی ہم کو ابواسحق نے میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ابواسحق کو (شیبانی) کی کنیت سے یاد کیا اور ابواسحق نے یعقوب بن محمد سے روایت کی۔'' الحدیث

اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ ابراہیم ابن ہراسہ کو ابواسحق الشیبانی کی کنیت سے یا تو مروان بن معاویہ فزاری نے ذکر کیا یا پھر علی بن الجعد نے، نہ کہ امام ثوری نے، دیکھئے کتنا بڑا وہم امام حاکم سے صادر ہوا۔ آگے پھر حافظ صاحب اللسان میں امام ابن ابی حاتم کی جرح والتعدیل سے نقل فرماتے ہیں:

((وقال ابن ابى حاتم روى (اى ابن هراسة) عن الثورى ومغيرة بن زياد وجبلة بن سليمان وروى عنه على بن هاشم بن مرزوق الهاشمى واسحق بن موسى الانصارى))

''اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ ابن ہراسہ روایت کرتا ہے امام نووی سے اور مغیرہ بن زیاد سے اور جبلہ بن سلیمان سے۔ اور روایت کرتا ہے ان سے علی بن ہاشم بن مرزوق الہاشمی اور اسحق ابن موسیٰ الانصاری۔''

یہ عبارت اسی طرح امام ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل میں موجود ہے۔

[1] النکت.

اہل علم قارئین غور فرمائیں کہ اللسان اور الجرح والتعدیل سے معلوم ہوگیا امام ثوری ابن ہراسہ سے روایت نہیں کرتا بلکہ ابن ہراسہ، ثوری سے روایت کرتا ہے لیکن امام حاکم نے وہم کی بنا پر امام ثوری کو ابن ہراسہ سے راوی بنادیا اور ابن ہراسہ کو ابواسحٰق شیبانی کی کنیت یا تو مروان بن معاویہ فزاری نے دی ہے تا کہ اس کا علم نہ ہوسکے یا پھر علی بن الجعد نے دی ہے لیکن افسوس صد افسوس! امام حاکم رحمہ اللہ نے اس گھناؤنے فعل کے ارتکاب کی نسبت امام ثوری رحمہ اللہ کی طرف کردی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار.

کیا ہمارے محترم دوست امام حاکم کے ان اوہام کے باوصف بلا وجہ امام ثوری کو مدلسین کے مراتب میں سے ایسے مرتبہ میں داخل کرنا چاہتے ہیں جن کا عنعنہ قابل قبول نہ ہو۔

گر ہمیں مکتب وہمیں ملا

کارِ طفلاں تمام خواہد شد

دراصل صحیح بات یہی ہے کہ اس جگہ امام حاکم نے مدلسین کے مراتب من حیث قبول عنعنتهم ومن حیث ردها بیان ہی نہیں کیے۔ اور ہمارے محترم دوست سے یہ غلطی اس لیے صدور میں آئی کہ انہوں نے امام حاکم رحمہ اللہ کی اصل کتاب معرفۃ علوم الحدیث کے مطالعہ کی زحمت نہیں اٹھائی۔

الاعتصام اگست کے اسی صفحہ ۱۵ کالم ۲ پر لکھتے ہیں:

''حافظ العراقی'' نے ''التبصرۃ والتذکرۃ'' میں امام ابوبکر الصیرفی کی کتاب ''الدلائل'' سے نقل کیا کہ:

((كل من ظهر تدليسه عن غير الثقات لم يقبل خبره حتى يقول حدثني او سمعت))

پھر اس کا ترجمہ لکھا۔ آگے پھر لکھتے ہیں۔

(نیز دیکھئے تدریب الراوی فتح المغیث للسخاوی ''حسین الکرابیسی'' وغیرہ بھی یہی لکھتے ہیں۔

تقریباً یہی قول امام بزار وغیرہ کا ہے۔ فتح المغیث وغیرہ۔

الاعتصام ۲ اگست ۱۶ کالم نمبر ا

ہمارے کرم فرمانے حافظ عراقی کی کتاب "التبصرة والتذكرة" تدريب الراوی، فتح المغیث اور شرح علل الترمذی لابن رجب کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ جس سے یہ ابہام ہوتا ہے کہ ان کتب کے مصنفین۔ عراقی، سیوطی، سخاوی اور ابن رجب ان کا بھی یہی خیال ہے اور یہی ان کا مسلک ہے حالانکہ نظر غائر سے ان کتب کا مطالعہ کرنے والا بخوبی جانتا ہے کہ ان حفاظ کو اس جگہ مدلسین کی روایات کے قبول یا رد کے بارہ میں چند مذاہب بیان کرنے مقصود تھے نہ کہ اپنی رائے کا اظہار، یہ چیزیں ''النکت'' للحافظ ابن حجر رحمہ اللہ میں بھی بیان ہوئی ہیں۔

۱۔ بعض اہلحدیث کا مسلک تو یہ ہے کہ مدلس کی کوئی روایت مقبول نہیں اگرچہ سماع کی تصریح بھی کردے۔

۲۔ ایک مرتبہ بھی اگر کسی نے تدلیس کی تو جب تک وہ سماع کی تصریح نہ کرے اس کی روایت مقبول نہیں کہ مسلک امام والا مقام حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اتباع کا ہے۔

۳۔ اگر صرف ثقہ سے تدلیس کرتا ہے تو اس کا عنعنہ مقبول ہے ورنہ بغیر تصریح سماع اس کی روایت مقبول نہیں یہ مسلک امام بزار رحمہ اللہ حسین کرابسی اور ابوالفتح الازدی کا ہے۔

۴۔ مدلس اگر ثقہ ہے تو اس کا عنعنہ بھی مطلقاً مقبول ہے۔ حافظ ابن حزم کا اغلب احوال میں اور بعض دوسرے اہل حدیث کا یہی مذہب ہے۔

۵۔ اگر مدلس کی روایات میں تدلیس غالب ہے تو اس صورت میں جب تک حدثنا وغیرہ کے صیغے نہ کہے اس کی روایت حجت نہیں، یہی مسلک امام علی ابن المدینی وغیرہ کا ہے۔ امام المحدثین کا میلان بھی اسی جانب ہے۔ حافظ ذہبی، علائی اور حافظ ابن حجر بھی اس پر کاربند تھے اور اسی بناء پر انہوں نے مدلسین کے طبقات کی تقسیم کی ہے اور تدبر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جمہور کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام علی ابن المدینی کے اس مسلک کا بیان امام خطیب بغدادی نے الکفایہ میں کیا ہے۔

محترم دوست نے جو یہ فرمایا کہ ''امام یعقوب بن شیبہ کا رجحان بھی اسی طرح ہے'' یہ محل نظر ہے۔ محترم دوست نے ''الکفایہ'' کا حوالہ دیا ہے حالانکہ الکفایہ کے اس صفحہ پر وہ چیز نہیں ہے جو محترم دوست اس سے بیان فرما رہے ہیں۔ الکفایہ کی عبارت اس طرح ہے۔

((حدثنی ابو القاسم الازهری قال ثنا عبدالرحمن بن عمر الخلال قال ثنا محمد بن احمد بن یعقوب قال ثنا جدی قال سالت یحیی بن معین عن التدلیس فکرهه وعابه قلت له افیکون المدلس حجة فیما روی اوحتی یقول حدثنا واخبرنا؟ فقال لا یکون حجة فیما دلس)) [1]

''حدیث بیان کی ہم سے محمد بن احمد ابن یعقوب نے انہوں نے کہا حدیث بیان کی ہم سے میرے دادے (یعقوب بن شیبہ) نے اور کہا میں نے امام ابن معین سے تدلیس کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے اس کو ناپسند کیا اور اس کو معیوب سمجھا تو اس پر میں نے کہا تو کیا مدلس اپنی ہر روایت میں حجت ہے یا صرف اس روایت میں جہاں وہ ''حدثنا'' و ''اخبرنا'' سے سماع کی تصریح کر دے؟ امام ابن معین نے جواب دیا جس روایت میں انہوں نے تدلیس کی ہے اس میں وہ حجت نہیں۔''

امام ابن معین کے اس قول کہ ''جس روایت میں تدلیس کی ہے اس میں وہ حجت نہیں'' کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔

۱۔ جس روایت کے بارے میں تحقیق سے معلوم ہو جائے کہ اس نے یہاں تدلیس کی ہے وہاں وہ حجت نہیں،

[1] الکفایة: ۳۵۲.

یعنی اسی جگہ یہ روایت مقبول نہ ہوگی۔

۲۔ مطلب یہ ہوگا کہ جس روایت میں تدلیس کرے، یعنی سماع کی تصریح نہ کرے بلکہ عن وغیرہ کے صیغے سے روایت کرے تو اس میں حجت نہیں۔

یہ مطلب اتنا واضح نہیں ہے، تاہم اگر یہی اس کا مطلب ہے تو اس کا ماحصل یہ ہوگا کہ جو مدلس بھی ہو، خواہ قلیل التدلیس ہو یا کثیر اور خواہ وہ ثقہ سے تدلیس کرتا ہو یا ضعیف سے۔ ان تمام احوال میں جب تک وہ سماع کی تصریح نہ کرے اس کی روایت حجت نہیں ہے وہ اس لیے کہ اس روایت کے الفاظ عام ہیں۔ اس صورت میں امام ابن معین، حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے ہمنوا ہوں گے۔ بہر حال اس روایت میں جو کچھ ہے وہ امام ابن معین کے مسلک کا بیان ہے اس سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ مسلک امام یعقوب بن شیبہ کا بھی ہے؟ اگر ہم تسلیم کر لیں کہ امام یعقوب بن شیبہ کا اس روایت کو لانا ہی اس پر دال ہے کہ ان کا رجحان بھی اسی جانب ہے، پھر بھی اس سے وہ بات اخذ نہیں کی جا سکتی جو ہمارے دوست اخذ کرنا چاہتے ہیں۔

مذکورہ عبارت کے پہلے مطلب کے اعتبار سے تو بالکل واضح ہے اور دوسرے مطلب کے لحاظ سے بھی۔ اس سے وہ چیز ماخوذ نہیں ہو سکتی جس کے استخراج کے در پے ہمارے محترم دوست ہیں کیونکہ امام ابن معینؒ کی مذکورہ عبارت کے الفاظ عام ہیں، یعنی جو بھی مدلس ہو خواہ اس نے ایک مرتبہ ہی تدلیس کا ارتکاب کیا ہو اور چاہے وہ ثقات سے تدلیس کا عادی ہو یا ضعاف ومجاہیل سے۔ اس روایت میں یہ تو ہرگز نہیں ہے کہ اگر وہ ضعاف سے تدلیس کرتا ہو تو اس صورت میں اس کی روایت حجت نہیں پھر محترم دوست اس عموم کو ضعاف سے تدلیس کرنے والوں کے ساتھ کس دلیل کی بناء پر مخصوص قرار دے رہے ہیں؟ بلاوجہ کسی عموم کی تخصیص کا تو کسی کو بھی حق نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ محترم دوست نے جس بات کے اثبات کے لیے اس عبارت کا حوالہ دیا وہ بات اس محولہ عبارت سے ثابت نہیں ہوتی۔

استدراک: الکفایہ کی جس روایت کا حوالہ محترم دوست نے دیا تھا اس سے تو وہ بات ثابت نہیں ہوتی جس کے اثبات کے لیے انہوں نے اس کا حوالہ دیا۔ البتہ شرح علل الترمذی لابن رجب میں ایک عبارت ہے جس سے ان کی بات کی طرف قدرے اشارہ ملتا ہے وہ عبارت یہ ہے:

((ورخص في التدليس طائفة قال يعقوب بن شيبة من رخص فيه فانما رخص فيه عن ثقة سمع عنه واما من دلس ممن لم يسمع منه فلم يرخص فيه وكذا اذا دلس عن غير ثقة)) [1]

''اور ایک جماعت نے تدلیس کی رخصت دی ہے۔ امام یعقوب بن شیبہ فرماتے ہیں۔ جس کسی نے

---

[1] شرح علل الترمذی، لابن رجب ص ۲۶۷.

تدلیس کی رخصت دی ہے تو اس نے صرف اسی صورت میں دی ہے کہ وہ اس سے تدلیس کرے جو ثقہ ہو اور اس سے ان کا سماع بھی ثابت ہو لیکن اگر ایسے راوی سے تدلیس کرتا ہے جس سے اس نے کچھ نہیں سنا تو اس کو رخصت نہیں دی گئی۔ اسی طرح جو غیر ثقہ سے تدلیس کرتا ہو تو اس کو بھی رخصت نہیں دی گئی۔''

آگے حافظ ابن رجب فرماتے ہیں:

((کذا قال یعقوب وقد کان الثوری وغیرہ یدلسون من لم یسمعوا منه ایضا فلا یصح ما ذکر یعقوب)) [1]

''امام یعقوب نے اسی طرح فرمایا حالانکہ امام ثوری وغیرہ جن سے نہیں سنا ان سے بھی تدلیس کرتے تھے۔ لہٰذا جو کچھ امام یعقوب نے ذکر کیا وہ صحیح نہیں۔''

تنبیه: یہاں امام یعقوب نے تدلیس کو ارسال کے معنیٰ میں لیا ہے کیونکہ ماہرین اصول حدیث جانتے ہیں کہ صحیح مسلک پر تدلیس ہوتی ہی اس سے ہے جس سے اس مدلس نے سوائے اس مدلسہ روایت کے اور روایات سنی ہوں اگر اس نے اس سے کچھ سنا ہی نہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ جس سے ''عن'' وغیرہ کے محتملہ صیغہ سے روایت کرتا ہے وہ ان کے معاصر تو تھا لیکن اس سے سماع نہ ہو سکا تو یہ ارسال خفی ہے نہ کہ تدلیس۔

۲۔ اگر وہ ان کے معاصر ہی نہ تھے تو یہ مطلق ارسال ہے تدلیس نہیں۔ [2]

تنبیه ۲: حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کی مذکورہ بالا عبارت تدلیس کی رخصت وعدم رخصت کے بیان میں ہے۔ انہوں نے پہلے تو یہ بیان فرمایا کہ بعض اہل علم بالحدیث نے تدلیس کی رخصت دی ہے اس کے بعد پھر امام یعقوب بن شیبہ کا وضاحتی نوٹ ذکر کیا۔ وہ یہ کہ جس کسی نے تدلیس کی اجازت دی ہے تو ان دو شرطوں کے ساتھ۔

۱۔ مدلس جس سے تدلیس کرتا ہے اس سے اس نے سنا ضرور ہو۔

۲۔ اور غیر ثقہ سے بھی تدلیس نہ کرے۔

اس وضاحتی نوٹ سے بھی محترم دوست کے موقف کا کما حقہ اثبات نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس عبارت میں تدلیس کی رخصت کی شرطوں کا بیان ہے یعنی تدلیس کرنے کی کس ضرورت میں اجازت ہے۔ اس میں یہ نہیں ہے کہ اگر وہ غیر ثقہ سے تدلیس کرتا ہے تو اس کی روایت محتج بہا نہیں رہتی اور محترم دوست اسی کا اثبات کرنا چاہتے ہیں اور جو اس سے ثابت نہیں ہوتا۔ ہماری اس توجیہ پر کہ ''یہاں تدلیس کی رخصت یا عدم رخصت اور اگر رخصت ہے تو

---

[1] شرح علل الترمذی لابن رجب ص ۲۶۷۔ ۲۶۸.

[2] شرح نخبة الفکر، النکت کلاهما للحافظ ابن حجر، الکفایة للخطیب، وغیره.

کس صورت میں ہی کا بیان ہے'' امام ابن معین کی ایک عبارت دلالت کرتی ہے جو حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا عبارت سے قبل ذکر کی ہے۔

((وقال يحيى بن معين كان الاعمش يرسل، فقيل له: ابن بعض الناس قال: ان من ارسل لا يحتج بحديثه فقال: الثورى اذا لا يحتج بحديثه وقد كان يدلس، انما سفيان امير المومنين فى الحديث)) [1]

''امام ابن معین رحمہ اللہ نے فرمایا: اعمش ارسال کرتے تھے اس پر انہیں کہا گیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو ارسال کرتا ہے اس کی حدیث حجت نہیں ہے تو امام ابن معین رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر یہ بات ہے تو امام ثوری رحمہ اللہ کی حدیث بھی محتج بہ نہیں رہتی (اس لیے کہ) امام ثوری تدلیس کرتا تھا (لیکن ایسا نہیں ہے) امام سفیان ثوری رحمہ اللہ تو حدیث میں مومنوں کا امیر ہے۔''

اس قطعہ کا مطلب بالکل واضح ہے یعنی تدلیس کوئی ایسی بات نہیں جو مدلس کے مجروح بن جانے کا باعث بن جائے۔ جب امام ثوری رحمہ اللہ جو حدیث میں مومنوں کے امیر تھے ان سے بھی تدلیس کا صدور ہو چکا ہے، یعنی امام ثوری رحمہ اللہ کے تدلیس کرنے سے ان کی جلالت و امامت پر کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہاں بھی امام ابن معین کی عبارت میں ''ومن كان يدليس'' عام لفظ ہے، یعنی ثقہ سے تدلیس ہو یا غیر ثقہ سے۔ لیجئے صاحب امام ابن معین بھی امام ثوری کی احادیث کو محتج بہ قرار دیتے ہیں گو وہ ثقہ سے تدلیس کرے یا غیر ثقہ سے کیونکہ ''يدلس'' عام لفظ ہے اور امام موصوف کی اس عبارت سے معلوم ہو گیا کہ امام ثوریؒ مدلسین کے مرتبہ ثانیہ میں داخل ہیں، یعنی جن کی عنعنہ روایات بھی، ان کی امامت و جلالت اور قلت تدلیس کی وجہ سے مقبول ہیں۔ اب یہ موقف صرف حافظ ابن حجر، یا علائی اور حافظ ذہبی رحمہم اللہ کا نہ رہا بلکہ ان کے ساتھ امام ابن معین جیسے جرح و تعدیل کے امام بھی شامل ہیں لیکن آں محترم دوست نے اپنے موقف کے اثبات کے لیے امام ابن معینؒ کے ہم پلہ کسی امام کا نام نہیں لیا۔ فلله الحمد والمنة

اور ہم نے جو یہ کہا کہ یہاں یہ بیان مقصود ہے کہ تدلیس سے راوی مجروح نہیں ہوتا جو اس کی روایات سے احتجاج ہی نہ کیا جا سکے۔

اس پر امام احمد رحمہ اللہ کا ارشاد جو حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے امام ابن معین کے قول سے پہلے ذکر کیا ہے، بخوبی دلالت کرتا ہے۔

((وقال احمد فى التدليس اكرهه له قيل له: قال شعبة هو كذب قال احمد لا تدلس قوم ونحن نروى عنهم)) [2]

---

[1] شرح علل الترمذی لابن رجب ۲٦۷. [2] شرح علل الترمذی لابن رجب، ص ۲٦۷.

''امام احمد رحمہ اللہ نے تدلیس کے متعلق فرمایا کہ میں اس کو ناپسند کرتا ہوں۔ ان سے کہا گیا کہ امام شعبہ رحمہ اللہ اس کو جھوٹ کہتے ہیں؟ فرمایا نہیں، کتنے لوگوں نے تدلیس کی اور ہم ان سے روایت کرتے رہتے ہیں۔''

آگے محترم دوست فرماتے ہیں: [1] ''اور یہی مذہب قرین صواب ہے۔ حافظ علائی نے اسے ہی...... ہذا الراجح قرار دیا ہے۔ الخ''

محترم دوست کی یہ بات بچند وجوہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔

(ا) یہ صحیح ہے کہ یہ مسلک چند محدثین کا ضرور ہے لیکن جمہور کا نہیں۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث اس کے خلاف ہیں۔ امام علی بن المدینی رحمہ اللہ کا قول الکفایہ وغیرہ سے پہلے نقل ہو چکا ہے کہ اگر اس کی روایات پر تدلیس غالب ہے تو اس کا عنعنہ حجت نہیں، یعنی اگر اس نے کثرت سے جو روایتیں کی ہیں ان کے مقابلہ میں ان کی تدلیس قلیل ہے تو وہ مقبول ہے اور اسی جانب امام المحدثین بخاری رحمہ اللہ کا میلان ہے، اس لیے تو فرماتے ہیں کہ ''ما اقل تدلیسہ'' [2] یعنی امام ثوری رحمہ اللہ کی تدلیس کتنی کم ہے۔ تھوڑا سا پہلے امام ابن معین کا قول بھی منقول ہو چکا ہے کہ وہ جانتے تھے کہ امام ثوری رحمہ اللہ تدلیس کرتا ہے اس کے باوجود وہ ان کو امیر المومنین فی الحدیث قرار دیتے ہیں اور ان کو حجت سمجھتے ہیں حالانکہ ابن معین رحمہ اللہ خواہ امام بخاری کو یہ علم تھا کہ امام ثوری رحمہ اللہ ضعفاء سے بھی تدلیس کرتے ہیں۔

(ب) مدلسین کو چند مراتب میں تقسیم کرنا بھی اس مسلک کے خلاف ہے کیونکہ ثقہ سے تدلیس کرنے والے کے علاوہ کسی دوسرے کا عنعنہ مقبول ہی نہیں تو ان مراتب کی کیا حاجت رہی؟ بس صرف ایک مرتبہ ہی باقی رہتا ہے یعنی جو ثقہ سے تدلیس کرتا ہے اس کا عنعنہ مقبول ہو اور سب کا مسترد۔ لہٰذا دوسرے اور تیسرے مرتبہ کا کہاں موقعہ رہا؟ صرف دو رہ جاتے ہیں (۱) جس کا عنعنہ مقبول اور وہ وہی ہیں جو ثقہ سے تدلیس کرتے ہیں۔ (۲) جن کا عنعنہ نامقبول لیکن محترم تو تیسرے مرتبہ تک کے قائل ہیں۔ اسی لیے تو امام ثوری کو تیسرے مرتبہ میں داخل کرنے کے لیے اپنی علمی کاوش کو پورا کر دیا ہے۔

یہاں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ نے جو مدلسین کے مراتب بیان کیے ہیں ان کی وجہ سے اعتراض نہ کیا جائے کیونکہ انہوں نے جن کو مرتبہ اولیٰ قرار دیا ہے وہ درحقیقت کوئی مرتبہ ہے ہی نہیں، اس لیے کہ ان کے اس مرتبہ اولیٰ میں ان رواۃ یا حفاظ کا ذکر ہے جن سے شاذ و نادر ہی تدلیس ہوئی ہے یا ظن و تخمین کی بناء پر ان کی طرف تدلیس کی نسبت کی گئی ہے، مثلاً: امام شعبہ اور امام بخاری وغیرہما صحیح طور پر مراتب کی ابتدا مرتبہ ثانیہ سے ہوتی ہے۔ تدبروا و تاملوا

[1] الاعتصام اگست ص ١٦ کالم نمبر ١.

[2] طبقات المدلسین، النکت، کلاهما للحافظ ابن حجر، فتح المغیث للسخاوی وغیرہ.

(ج) اگر آپ کے اس مسلک کو صواب قرار دیا جائے تو سوائے امام سفیان بن عیینہ کے اور کوئی راوی ایسا ہمارے سامنے نہیں آتا جو ثقہ سے ہی تدلیس کرتا ہو۔ ہم نے بہت سی متعلقہ کتب کی ورق گردانی کی لیکن سوائے ابن عیینہ کے اس سلسلہ میں کسی دوسرے کا نام نہیں ملتا۔ ابن عیینہ کے نام کے بعد وغیرہ لکھ تو دیتے ہیں لیکن عملاً دوسرے کسی کا نام نہیں لیا جاتا۔ امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں قتادہ کا نام ذکر تو کیا ہے لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ تفصیل اوپر گذر چکی۔

حافظ عراقی لکھتے ہیں: ❶

((واعلم ان ابن عبدالبر قد حكى عن ائمة الحديث انهم قالوا يقبل تدليس ابن عيينة لانه اذا وقف لحال على ابن جريج ومعمر ونظائرهما وهذا ما رجحه ابن حبان وقال هذا شيء ليس في الدنيا الالسفيان بن عيينة فانه، كان يدلس ولا يدلس الاعن ثقة متقن ولا يكاد يوجد لابن عيينة خبر دلس فيه الا وقد بين سماعة عن ثقة))

''جان لو کہ امام ابن عبدالبر نے ائمہ حدیث سے یہ بات نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ امام ابن عیینہ کی تدلیس قبول کی جائے گی کیونکہ وہ جب تدلیس کرتے اور سننے والوں نے روک کر ان سے دریافت کیا تو وہ ابن جریج اور معمر جیسے ثقات کا نام لیتے تھے اور یہی بات ہے جس کو امام ابن حبان نے ترجیح دی اور فرمایا کہ یہ (صرف ثقات سے تدلیس کرنا) ایسی چیز ہے کہ دنیا بھر میں امام سفیان بن عیینہ کے سوائے کسی اور کے لیے نہیں ہے (یعنی) وہ (ابن عیینہ) تدلیس (تو) کرتا تھا لیکن صرف ثقہ اور متقن سے اور ابن عیینہ کی کوئی روایت ایسی نہیں ملتی جس میں انہوں نے تدلیس کی ہو اور پھر یہ بیان نہ کیا ہو کہ یہ روایت انہوں نے فلاں سے سنی ہے (یعنی تدلیس کرتا بھی تھا تو بتا دیا کرتا تھا کہ دراصل یہ روایت انہوں نے فلاں ثقہ سے سنی ہے)۔''

حافظ ابن رجب، ابن حجر وغیرہما نے بھی اپنی کتب میں قریب قریب یہی قول امام ابن حبان رحمہ اللہ کا نقل کیا اور کسی نے بھی (میرے علم کی حد تک) ابن حبان کے اس قول پر تعقب نہیں فرمایا۔ جب مدلسین میں بجز امام ابن عیینہ کوئی بھی ایسا نہیں جو صرف ثقات سے تدلیس کرتا ہو تو محترم کے مسلک کے مطابق یہ لازم آئے گا کہ امام ابن عیینہ رحمہ اللہ کے سوائے اور کسی کا بھی عنعنہ مقبول نہ ہو۔ نہ امام زہری رحمہ اللہ کا نہ کسی اور کا۔ بلکہ آپ کو تو اعلان کر دینا چاہیے کہ مرتبہ ثانیہ کے پورے کے پورے مدلسین (باستثناء ابن عیینہ) کی روایات جب تک سماع کی تصریح نہ کریں قبول نہ کی جائیں گی۔ اس طرح تو آپ نے حافظ علائی، حافظ ابن حجر وغیرہما جنہوں نے مدلسین کو چند

---

❶ التبصرة والتذكرة: ١/١٨٢.

مراتب میں تقسیم فرمایا ہے ان سب کی ان مساعی جمیلہ پر پانی پھیر دیا۔ تیسرے اور چوتھے مرتبہ کے متعلق تو ان بزرگوں نے خود ہی تصریح فرمادی ہے کہ بغیر تصریح سماع ان کی روایات مقبول نہ ہوں گی لیکن آپ کے اس قرین صواب مسلک کے باعث ابن عیینہ کے سوائے مرتبہ ثانیہ بھی پورا پورا ختم ہو گیا۔ فیاللعجب

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مرتبہ ثانیہ میں تینتیس رواۃ کے نام گنوائے ہیں، ان میں سے امام ابن عیینہ کو مستثنیٰ کرنے کے بعد بتیس رہ جاتے ہیں۔ آپ کرم نوازی فرماتے ہوئے اور ہمیں مستفید کرتے ہوئے ان بتیس رواۃ کے نصف رواۃ یعنی ۱۶ کے متعلق ائمہ حدیث کی تصریحات سے یہ ثابت کر کے دکھائیں کہ یہ رواۃ صرف ثقہ سے ہی تدلیس کرتے تھے۔ چلو ہم آپ کی خاطر نصف کی بات بھی چھوڑتے ہیں آپ صرف ان ناموں میں سے صرف رابع یعنی آٹھ رواۃ کے ہی نام پیش فرمادیں اور اس کے ساتھ ائمہ کے نام جنہوں نے یہ تصریح فرمائی ہو کہ یہ آٹھ غیر ثقہ سے تدلیس نہیں کرتے تھے۔ اب جب کہ مرتبہ ثانیہ باقی ہی نہیں رہا تو آپ کو دوسرے اور تیسرے مرتبہ کی بات چھیڑنی ہی نہیں چاہیے اور امام ثوری کو جو آپ تیسرے مرتبہ میں داخل کرنے کی سعی فرمار ہے ہیں یہ محض فضول بات ہے۔ آپ کو مراتب کی بات بالکلیہ ترک کر کے یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ کسی مدلس بھی روایت سوائے ابن عیینہ کے بغیر تصریح سماع حجت نہیں مقبول نہیں بلکہ مسترد ہے۔ وھذا کما تری اور یہ بھی محترم نے خوب فرمایا: حافظ علائی بھی فرماتے ہیں کہ "ھذا ھو الراجح" لیکن محترم نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ اس طرح حافظ علائی کے قول اور طرز عمل میں تضاد لازم آتا ہے کیونکہ ایک طرف وہ یہ فرماتے ہیں کہ راجح یہی ہے کہ اسی مدلس عنعنہ مقبول ہونا چاہیے جو صرف ثقہ سے تدلیس کرتا ہو اور دوسری جانب امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کو مرتبہ ثانیہ میں داخل کیا جن کا عنعنہ ائمہ حدیث نے قبول کیا ہے اور ان کو محتج بہ قرار دیا۔ لہٰذا اگر وہ بات راجح ہے جو تو یہ بات جس کو وہ راجح فرما رہے ہیں وہ صواب نہیں، اب آپ ہی فرمائیں کہ ان میں سے کونسی بات صحیح ہے لیکن یہ خیال رہے کہ جس کو بھی صحیح قرار دیں اس کی صحت کے دلائل بھی ساتھ ہونے چاہئیں۔

اسی صفحہ ۱۶ کالم نمبر ا پر فرماتے ہیں:

> ''حافظ ذہبی جو کہ مشہور، ثقہ، متقن، حجت، امام اور صاحب الاستقراء التام فی اسماء الرجال ہیں۔ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ امام سفیان ثوری ضعفاء سے تدلیس کرتے تھے۔ دیکھئے میزان الاعتدال......''

یہ محترم کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف حافظ، امام، ثقہ، متقن، حجت اور صاحب الاستقراء التام فی نقد الرجال ذہبی کو اپنے موقف کے اثبات کے لیے گواہ کے طور پر پیش فرمارہے ہیں اور دوسری طرف اسی حافظ حجت، متقن، ثقہ، امام اور صاحب الاستقراء التام فی نقد الرجال کی یہ گواہی بلا دلیل مسترد فرمادیتے ہیں کہ امام ثوری ضعفاء سے تدلیس کے باوجود ثبت وحجت ہونے میں متفق علیہ ہیں۔ میزان کی اسی جگہ پر ان کے الفاظ یہ ہیں:

((سفیان بن سعید الحجة الثبت، متفق علیه مع انه کان یدلس عن الضعفاء ولکن له نقد وذوق ولا عبرة لقول من قال: یدلس ویکتب عن الکذابین)) ❶

''سفیان بن سعید حجت ثبت ہیں (اور ائمہ حدیث کے مابین) متفق طور پر حجت ہیں باوجود اس کے کہ وہ ضعفاء سے تدلیس کرتے تھے لیکن ان کو ان ضعفاء کی روایات کے نقد کی صلاحیت ہے اور ان کی صحیح وسقیم روایتوں کو پرکھنے کا انہیں ذوق ہے اور اس آدمی کی بات کا کوئی اعتبار نہیں، جو کہتا ہے کہ امام ثوری کذابین سے تدلیس کرتے تھے اور ان سے روایات لکھتے تھے۔''

ناظرین کرام! ہمارے محترم دوست ماشاء اللہ اہل علم بالعربیہ ہیں۔ اور تراکیب عربیہ کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اب میں ان سے دریافت کرتا ہوں کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت میں جو یہ الفاظ ہیں کہ "مع انه کان یدلس عن الضعفاء" ان کا تعلق کس سے ہے؟ ظاہر اور صحیح بات یہ ہے کہ اس کا تعلق ''متفق علیہ'' کے ساتھ ہے یعنی امام ثوری رحمہ اللہ تدلیس عن الضعفاء کے باوجود ائمہ حدیث کے ہاں متفقہ طور پر حجت ہے اگر آپ اس کو نہیں مانتے تو خود ہی بتایئے کہ اس کا تعلق کس سے ہے۔ آیا "ولکن له نقد وذوق" سے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو آپ ہی غور فرمائیں کہ اس طرح معنیٰ میں کتنا فساد لازم آتا ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ''اور لیکن امام ثوری کو نقد وذوق تھا باوجود اس کے کہ وہ ضعفاء سے تدلیس کرتا تھا۔'' آپ ہی بتائیں کہ اس کا کیا مطلب؟ ہم تو اس سے کوئی مطلب نکال نہیں سکتے۔ ہمارے محترم دوست ہی اس سے کوئی مطلب نکال لیں تو وہ ہی اس کی رہنمائی کریں۔ اصل بات یہ ہے کہ ولکن سے تدلیس عن الضعفاء کی وجہ سے بتائی جارہی ہے اسی طرح اس قطعہ "ولا عبرة لقول" الخ سے بھی اس کا تعلق نہیں ہے کیونکہ اس طرح کا کوئی معنیٰ نہیں بنتا۔ بہر کیف بات وہی صحیح ہے جو ہم نے عرض کی ہے، یعنی اس قطعہ کا تعلق ''متفق علیہ'' سے ہی ہے۔ یعنی باوجود تدلیس عن الضعفاء امام ثوری ائمہ محدثین کے نزدیک متفقہ طور حجت ہیں۔ اس کا مطلب یہ لینا کہ تدلیس عن الضعفاء کے باوجود ائمہ حدیث نے ان کی روایات مجموعی طور پر رد نہیں کیں یعنی جہاں وہ سماع کی تصریح کریں، بھی صحیح نہیں کیونکہ اس بات میں امام ثوری رحمہ اللہ کی کیا خصوصیت ہے؟ یہ چیز تو بقیہ بن ولید اور ابن اسحٰق جیسے مرتبہ رابع کے مدلسین کو بھی حاصل ہے وہ بھی جب سماع کی تصریح کرتے ہیں تو ان کی روایات مقبول ہوتی ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((واذا حدث بقیة عن المشهورین فروایاته مقبولة واذا حدث عن المجهولین فغیر مقبولة)) ❷

''بقیہ جب مشہورین سے روایت کرے تو ان کی روایات مقبولہ ہیں اور اگر مجہولین سے حدیث بیان

❶ میزان الاعتدال: ۲/۱۶۹۔ ❷ معرفة علوم الحدیث للحاکم: ۱۰۶۔

کرے تو وہ مقبول نہیں۔"

اور مشہورین کا پتہ تو تب چل سکتا ہے کہ سماع کی تصریح کرے، بغیر تصریح سماع کیسے پتہ چل سکتا ہے۔ مقصد یہ کہ بقیہ بھی اگر سماع کی تصریح کرتا ہے اور جس سے سماع کی تصریح کی ہے وہ مشہور ومعروف راوی ہے تو اس کی روایات بھی مقبول ہیں۔ پھر امام ثوری کی اس معاملہ میں کونسی خصوصیت رہی۔ جو اس کے متعلق حافظ ذہبی رحمہ اللہ خاص طور پر یہ فرمارہے ہیں کہ تدلیس کے باوجود وہ متفقہ طور پر حجت ہے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ حافظ ذہبی نے جو یہ فرمایا ہے کہ امام ثوری رحمہ اللہ متفقہ طور پر حجت ہیں، یہ بات ان کی اپنی رائے نہیں بلکہ ائمہ حدیث کے درمیان امام ثوری رحمہ اللہ کی تدلیس حجت نہیں ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے یہ غلط یا جھوٹ یا پھر محض اپنے ظن سے بلا دلیل ائمہ حدیث کی طرف اس کی نسبت کردی یا پھر آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ حافظ صاحب موصوف نے صحیح لکھا ہے۔ واقعتاً امام ثوری تدلیس عن الضعفاء کے باوجود ائمہ حدیث کے نزدیک حجت ہے اگر یہ بات محترم نے تسلیم کرلی تو یہ معاملہ ختم۔ ہم تو امام ثوری رحمہ اللہ کے بارے میں ان ہی ائمہ فن کی بات مانیں گے اور اسی کا اتباع کریں گے کیونکہ ان مسائل میں اور اس سلسلہ میں ان کی ہی بات حجت ہے۔ ہاں آپ کو اختیار ہے کہ ان ائمہ حدیث کے اتفاق کو مسترد کردیں اور اپنے اسی موقف پر جمے رہیں لیکن اس صورت میں آپ کو یہ حق نہیں کہ خواہ مخواہ دوسروں کو بھی مجبور کریں کہ وہ بلا دلیل اتباع کریں۔

اس طول کلامی کا ماحصل یہ ہے کہ محترم دوست اپنے موقف پر حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے اس قول کہ "مع انہ کان یدلس عن الضعفاء" کو دلیل کے طور پر پیش کررہے ہیں۔ یعنی امام ذہبی رحمہ اللہ نے لامحالہ یہ بات ائمہ حدیث سے نقل فرمائی ہوگی کیونکہ وہ امام ثوری کے معاصر تو تھے نہیں۔ لیکن اسی دم میں حافظ ذہبی کے اس نقل کو کہ ثوری رحمہ اللہ محدثین کے نزدیک متفقہ طور پر حجت ہے۔ کو نہیں مانتے شاید اس نقل کو بھی وہ محض ظن وتخمین قرار دے رہے ہیں اگر یہ بات ہے تو آپ ہی سوچیں کہ اس طرح حافظ ذہبی کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے اور محترم دوست نے ان کو جن القاب سے یاد فرمایا تھا ان کا کیا بنے گا؟ اگر حافظ صاحب کی بات کو آپ تسلیم کرتے ہیں اور اس کو صحیح سمجھتے ہیں تو بات ختم ہوجاتی ہے اور آپ کو ان ائمہ حدیث کے اتفاق سے خلاف کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل . آگے پھر اسی ص ۱۶ کالم نمبر ا پر لکھتے ہیں:

"اس قسم کے مدلس عن الضعفاء کے بارے میں امام ابن معین رحمہ اللہ کا یہ قول مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لا یکون حجۃ فیما دلس ." [1]

امام ابن معین رحمہ اللہ کے اس قول کے متعلق کافی طور پر اپنی گذارشات پیش کرچکے ہیں اور خصوصی طور پر امام ثوری کے متعلق ان کا جو موقف تھا وہ بھی بیان ہو چکا ہے تاہم یہاں بھی بالاختصار کچھ عرض کرتا ہوں۔

---

[1] الکفایۃ.

حافظ خطیب بغدادی رحمہ اللہ کی امام ابن معین رحمہ اللہ سے نقل کردہ پوری عبارت اس طرح ہے:

((قال (یعنی یعقوب بن شیبة) سألت یحیی بن معین عن التدلیس فکرهه وعابه قلت له افیکون المدلس حجة فیما روی او متی یقول حدثنا واخبرنا؟ فقال لا یکون حجة فیما دلس؟))

''امام یعقوب بن شیبہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابن معین رحمہ اللہ سے تدلیس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اس کو ناپسند کیا اور اسی کو معیوب سمجھا (تب) میں نے کہا، اچھا مدلس جو بھی روایت کرے وہ حجت ہوگی یا وہ جس میں حدثنا واخبرنا کے صیغہ سے سماع کی تصریح کرے؟ تب امام ابن معین رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ جس روایت میں تدلیس کرے اس میں وہ حجت نہیں۔''

میرے محترم دوست! امام ابن معین رحمہ اللہ کی اس عبارت میں یہ کہاں ہے کہ جو تدلیس عن الضعفاء کا مرتکب ہو، اس کی مدلسہ روایت حجت نہیں۔ اس میں تو امام یعقوب بن شیبہ کا سوال بھی مطلق تدلیس سے تھا نہ کہ تدلیس عن الضعفاء وغیرہ سے اس لیے امام ابن معین نے بھی اس کے جواب میں یہ فرمایا کہ وہ اس کو (مطلق تدلیس) کو ناپسند کرتے ہیں۔ پھر امام ابن شیبہ نے پوچھا کہ اچھا جو تدلیس کرتا ہو اس کی ہر روایت حجت ہوگی یا وہ جس میں سماع کی تصریح کرے تو اس کے متعلق (یعنی مطلق تدلیس کے متعلق نہ کہ ضعفاء سے تدلیس کرنے والے کے بارے میں) مدلس کے بارے میں یہ فرمایا کہ جس روایت میں تدلیس کی وہ حجت نہیں، مقصد یہ ہے کہ امام ابن معین تو ہر مدلس کے بارے میں اپنی رائے پیش کر رہے ہیں، خواہ کثیر التدلیس ہو، خواہ قلیل، ثقات سے تدلیس کرتا ہو یا ضعاف سے اور یہ ان کا مسلک تھا۔ اس سلسلہ میں وہ امام والا مقام حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے ہم نوا ہیں باستثناء، امام ثوری رحمہ اللہ۔ ومن هم من قبیله.

تفصیل پہلے گذر چکی، بہر کیف امام ابن معین کے ارشاد میں تو عموم ہے اور آپ بلا دلیل اس کو مدلس عن الضعفاء سے مخصوص بتا رہے ہیں۔ یہ طرز عمل بجا طور پر قابل اعتراض ہے۔ دعویٰ خاص دلیل عام۔

خلاصہ کلام: امام ابن معین رحمہ اللہ کی عبارت سے ان کے موقف کی کوئی تائید نہیں ملتی۔ منصف مزاج اہل علم غور فرمائیں، پھر اسی صفحہ ۱۶ کالم نمبر ۱ پر امام والا مقام حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی ''الرسالة'' سے عبارت نقل فرما کر پھر لکھتے ہیں: ''معلوم ہوا کہ جو شخص اگر ایک مرتبہ ہی تدلیس کرے (یعنی کسی ضعیف سے جمعا بین الروایتین) تو اس کی معنعن روایت غیر مقبول ہے، لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ مدلسین کے طبقہ ثالثہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کی معنعن روایات ضعیف ہوتی ہیں الا یہ کہ ان کی متابعت ثابت ہو جائے۔ (۱۲ اگست ص ۱۶ کالم ۱، ۲)

محترم دوست کی یہ عبارت بچند وجوہ مخطور فیہا ہے۔

۱۔ امام والا مقام حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب ''الرسالۃ'' اب بھی موجود ہے اور ان کی یہ منقولہ عبارت امام ابن ابی حاتم نے جرح وتعدیل میں اور حافظ عراقی، حافظ ابن حجر، حافظ ابن رجب وغیرہم رحمہم اللہ نے بھی نقل کی اور خود دوست محترم نے بھی نقل فرمائی اس میں یہ کہاں ہے کہ مدلس جب ضعیف راوی سے تدلیس کرے تب اس کا عنعنہ مقبول نہیں؟ ان کی عبارت میں تو بالکلیہ عموم ہے یعنی تدلیس کرنے والے نے، خواہ ایک مرتبہ ہی تدلیس کا ارتکاب کیا ہو، اور وہ تدلیس ثقہ سے ہو یا غیر ثقہ سے لیکن بغیر تصریح سماع اس کی روایت مقبول نہیں ہے۔

اچھی زبردستی ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی عموم کی حامل عبارت میں اپنی طرف سے تخصیص کر کے اس کو اپنے موقف کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا جائے۔ آخر آپ کو یہ حق کب حاصل ہوا کہ کسی دوسرے کی عموم کی حامل عبارت میں خود ہی تخصیص فرمالیں؟ ہمیں آپ جیسے اہل علم سے ایسی توقع نہ تھی کیونکہ دعویٰ خاص اور دلیل عام لہٰذا تقریب تام نہیں۔

۲۔ یہ بھی آپ نے آپ تے عجیب ہی کہی کہ امام والا مقام کی عبارت میں جو یہ الفاظ تھے کہ ''جو شخص اگر ایک مرتبہ ہی تدلیس کرے۔'' اس کا بین قوسین یہ مطلب بیان کیا (یعنی کسی ضعیف سے جمعا بین الروایتین) گویا یہ بین قوسین والی عبارت اپنی تخصیص کے لیے دلیل کے طور پر پیش کی ہے لیکن میں پوچھتا ہوں بین الروایتین سے کیا مراد ہے؟ آیا امام شافعی علیہ الرحمہ والرضوان کی دو روایتیں مراد ہیں؟ لیکن امام والا مقام کی اس سلسلہ میں روایتیں ہیں ہی کب، آپ ''الرسالۃ'' میں دیکھئے اور جن حفاظ وعلماء نے ان کی عبارت تدلیس کے سلسلہ میں نقل کی ہے، ان کو دیکھیں کسی نے امام والا مقام سے دو روایتیں نقل نہیں کیں۔ پھر جمع کی بات کیسے؟ اگر دوسری روایت سے مراد امام ابن معین والی روایت ہے جس کو حافظ صاحب نے الکفایہ میں، امام یعقوب بن شیبہ کے واسطے سے ذکر فرمائی ہے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ اولاً اس لیے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی عبارت عام میں امام ابن معین کی روایت سے تخصیص کیسے جائز ہوگی۔ ان کا مسلک اپنا، امام والا مقام کا اپنا، ان کے مسلک سے دوسرے کے مسلک میں تخصیص ایک ایسی نرالی چیز ہے کہ اس کی مثال پہلے ہم نے نہیں دیکھی۔ ثانیاً امام ابن معین رحمہ اللہ کی روایت ہے جو الکفایہ میں مذکور ہے اس میں بھی عموم ہے جیسا کہ پہلے تفصیلاً گذر چکا۔ اس میں آپ کی اختیار کردہ تخصیص قطعاً نہیں ہے۔ لہٰذا امام ابن معین رحمہ اللہ کی یہ عبارت بھی امام شافعی رحمہ اللہ کی عبارت میں تخصیص کا موجب نہیں بن سکتی۔ آپ پہلے تو یہ دو روایتیں پیش کریں ان کو دیکھیں، پھر اس سلسلہ میں کوئی گذارش کی جاسکتی ہے۔

۳۔ اگر آپ امام شافعی کے مسلک کو اپناتے ہیں تو وہ مدلسین کے طبقات جو آپ نے بنائے ہیں ان کا کیا بنے

گا؟ امام موصوف کے مسلک کے مطابق مدلسین کے طبقات تو باقی رہتے ہی نہیں کیونکہ ان کا مسلک تو یہ ہے کہ کسی بھی مدلس کی روایت بغیر تصریح سماع مقبول نہیں، یعنی خواہ ثقہ سے تدلیس کرتا ہو یا غیر ثقہ سے ایک مرتبہ بھی کسی نے تدلیس کا ارتکاب کیا تو امام موصوف ان کی روایت کو بغیر تصریح سماع قبول نہیں کرتے۔ امام موصوف کے اس مسلک پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ امام صاحب تو سماع کی تصریح سے مدلس کی روایت قبول کرتے ہیں بعض محدثین ایسے بھی ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ نے بیان کیا ہے جو تدلیس کو جرم قرار دیتے ہیں اور تدلیس کے مرتکب راوی کی کوئی روایت بھی قبول نہیں کرتے۔ گو سماع کی تصریح بھی کرتا ہو۔ اگرچہ یہ مسلک جمہور کا نہیں ہے۔ اب اگر آپ امام صاحب کے مسلک کو اختیار کرتے ہیں تو پہلے موقف سے دستبردار ہو جائیے۔ اور طبقات وغیرہ کی بات ہی نہ چھیڑیں اور اگر پہلے موقف پر ہی آپ قائم ہیں تو اپنے موقف پر استدلال کے لیے امام صاحب کی عبارت ہرگز پیش نہ فرمائیں۔ وهذا واضح لاخفاء فيه.

آگے اسی صفحہ ۱۶ کالم نمبر ۲ پر تحریر فرماتے ہیں:

تنبیہ ۲: سفیان ثوری کی درج ذیل علماء سے معنعن روایت بھی سماع پر محمول ہے: حبیب بن ابی ثابت سلمہ بن کہیل اور منصور وغیرہم۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ولا اعرف لسفيان الثوری عن حبيب بن ابی ثابت ولا عن سلمة بن كهيل ولا عن منصور ومشائخ كثيرة لا اعرف لسفيان عن هولاء تدليسا، ما اقل تدليسه))

پھر اس کا ترجمہ تحریر فرمایا۔ پھر لکھتے ہیں: ''کاش! مشائخ کثیرہ امام بخاری بتا دیتے۔'' میرے محترم دوست آپ نے خیال نہیں فرمایا۔ امام بخاری نے تو بہت سے شیوخ کا ذکر کیا تھا لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان کا ذکر چھوڑ دیا کیونکہ "وذكر مشائخ كثيرة" یہ امام ترمذی رحمہ اللہ کا قول ہے یعنی امام بخاری رحمہ اللہ نے اور بھی بہت سے شیوخ کا ذکر کیا۔ اس لیے آپ کا یہ فرمانا کہ کاش امام بخاری یہ مشائخ کثیرہ بتا دیتے صحیح نہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان شیوخ کے نام کیوں ذکر نہ کیے۔ تو بات یہی سمجھ میں آتی ہے کہ جب امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ فرمایا کہ ان کی تدلیس بہت قلیل و نادر ہے۔ (جس پر ان کے یہ الفاظ "ما اقل تدليسه" دلالت کر رہے ہیں) لہٰذا اگر ایسے قليل التدليس اور حجة وامام وامير المومنين فی الحديث کی معنعنہ روایت بھی غیر مقبول ہو گی تو اور کس کی مقبول ہو گی؟ اور یہی مسلک امام المحدثین کے جلیل القدر شیخ علی ابن المدینی کا ہے۔

حافظ سخاوی رحمہ اللہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: [1]

[1] فتح المغيث: ۱/۱۷۵.

((والرابع ان کان وقوع التدلیس منه نادرا قبلت عنعنة ونحوها والا فلا وظاهر جواب ابن المدینی فان یعقوب بن شیبة قال سالته عن الرجل یدلس ایکون حجة فیما لم یقل فیه حدثنا فقال اذا کان الغالب علیه التدلیس فلا))

''چوتھا مسلک یہ ہے کہ اگر مدلس سے تدلیس تھوڑی وقوع میں آتی ہے تو اس کی معنعنة ونحوها روایات قبول کی جائیں گی ورنہ غیر مقبول اور یہی مسلک امام ابن المدینی کے جواب کا ظاہر ہے کیونکہ یعقوب بن شیبہ نے کہا میں نے ان سے (ابن المدینی سے) ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جو تدلیس کرتا ہے کہ آیا اس کی معنعنہ روایت حجت ہوگی؟ جواب میں فرمایا کہ اگر اس آدمی پر تدلیس ہی غالب ہے (یعنی اکثر طور پر تدلیس ہی کرتا ہے) تو اس صورت میں اس کی روایت حجت نہ ہوگی (یعنی اگر قلیل التدلیس ہے تو وہ مقبول ہوگی)۔''

حافظ سخاوی امام بخاری والی مذکورہ عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

((وما اشار الیه شیخنا من اطلاق تخریج اصحاب الصحیح لطائفة منهم حیث جعل منهم قسما احتمل الائمة تدلیسه وخرجوا له فی الصحیح لامامته و قلة تدلیسه فی جنب ماروی کالثوری یتنزل علی هذا لا سیما وقد جعل من هذا القسم من کان لا یدلس الاعن ثقة کابن عیینة)) اھ[1]

''اور جس کی طرف ہمارے شیخ (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) نے اشارہ کیا ہے کہ مدلسین کی ایک جماعت سے اصحاب الصحیح نے علی الاطلاق (یعنی خواہ سماع کی تصریح کرے یا نہ کرے) اپنی کتب میں روایات کی تخریج کی ہے اور (شیخ نے) ان مدلسین کی ایک قسم وہ بنائی ہے جس کی تدلیس کو ائمہ حدیث نے قبول کیا ہے اور ان کی روایات اپنی صحیح میں لائے ہیں ان مدلسین کی امامت اور قلت تدلیس کی وجہ سے انہوں نے جو بہت سی روایات کی ہیں، ان کے عقائد میں ان کے مقابلہ میں مثلاً امام ثوری (ہمارے شیخ کے اس صنیع کو) اسی بات پر (یعنی وہ بات جو پہلے امام بخاری سے نقل ہو چکی) محمول سمجھا جائے خصوصاً (ہمارے شیخ نے) اس قسم میں اس مدلس کو بھی داخل کیا ہے جو ثقہ کے سوا تدلیس نہیں کرتا تھا۔ مثلاً: ابن عیینہ۔'' ھ

''اس کا لب لباب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جو امام ثوری رحمہ اللہ وغیرہ جیسے ائمہ کو جو دوسرے مرتبہ میں داخل کیا ہے اس کی بنا امام المحدثین بخاری کی مذکورہ عبارت پر ہے، یعنی امام ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سفیان ثوری کی تدلیس بالکل کم ہے اور جس امام کی تدلیس بہت کم ہو۔ اس کی روایات ائمہ حدیث تدلیس کے باوجود قبول

[1] فتح المغیث: ١/١٧٧.

کرتے آئے ہیں۔

نوٹ: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی یہ عبارت ''طبقات المدلسین'' میں ہے۔

اب میں محترم دوست سے پوچھتا ہوں کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ جو یہ فرمایا کہ ائمہ حدیث نے امام ثوری کی حدیث کو تدلیس کے باوجود قبول کیا ہے ان کا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو ثابت ہو گیا کہ ائمہ حدیث نے ان کی مدلسہ روایات بھی قبول فرمائی ہیں اور حافظ صاحب نے کسی امام کو مستثنیٰ بھی نہیں کیا اور اسی جانب حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ''المیزان'' میں اشارہ کیا۔ (یہ عبارت گذر چکی ہے)

لہٰذا جب ائمہ حدیث نے امام ثوری کی معنعنہ روایات قبول کی ہیں تو آپ کو یہ حق کیسے حاصل ہوتا ہے کہ ان سب ائمہ کے خلاف امام ثوری کی معنعنہ روایات کو مردود قرار دیں؟ اگر آپ یہ فرمائیں کہ حافظ صاحب نے یہ بات نہیں کی یہ محض من عن نفسہ کہی ہے تو اس کا صاف صاف مطلب یہ ہوگا کہ حافظ صاحب نے یہ محض (معاذ اللہ) جھوٹ ہے کیونکہ یہاں حافظ صاحب رحمہ اللہ ائمہ حدیث سے امام ثوری کی معنعنہ روایات کے احتمال کو نقل کر رہے ہیں، لہٰذا اگر انہوں نے واقعتاً ایسا نہیں کیا تو یہ کذب ہوا۔ ان ائمہ پر آپ ہی فرمائیں کذب کی آخر اور تعریف ہی کیا ہے؟ لیکن میں تو حافظ صاحب کے متعلق ایسی بات کہنے کی جرأت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ محترم کا معاملہ تو یہ آپ ہی کے سوچنے کی بات ہے۔ اس سے زیادہ میں اس سلسلہ میں کسی تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ہاں اتنا عرض ضرور کروں گا کہ اگر حافظ ذہبی وحافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے متعلق صرف اس سلسلہ میں جھوٹ سفید ثابت ہو جائے تو ان کی کسی بات پر اعتماد نہیں رہے گا بلکہ ان پر اعتماد بالکلیہ ختم ہو جائے گا۔ آپ حافظ ذہبی رحمہ اللہ وحافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتب سے مستقبل میں کوئی حوالہ پیش نہ فرمائیں۔ واللہ الموفق

پھر اسی ص ۱۶ کالم نمبر ۲ پر تحریر فرماتے ہیں:

تنبیہ ۳: سفیان ثوری ثقہ، متقن، حجۃ وزبردست امام تھے۔ آپ کذابین سے تدلیس نہیں کرتے تھے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کا عنعنہ قابل قبول ہے بلکہ تدلیس عن الضعفاء کی وجہ سے آپ کی معنعن روایات ضعیف ہیں۔

محترم دوست کی یہ عبارت بچند وجوہ صواب سے دور ہے۔

اولاً: اس طرح تو آپ نے امام ثوری جیسے امیر المومنین فی الحدیث کو ان کے اعلیٰ مرتبہ اور امامت کی سطح سے گرا کر بقیہ بن الولید کے ہم پلہ بنا دیا کیونکہ بقیہ جو نہ ثقہ، نہ متقن ہے نہ حجت ہے اور نہ امام وامیر المومنین فی الحدیث ہے بلکہ ضعفاء مجاہیل اور کذابین سے تدلیس کرتا تھا اور عام تدلیس کے علاوہ تدلیس تسویہ کا بھی مرتکب تھا اور وہ صدوق تھا اور کثیر التدلیس عن الضعفاء تھے۔ تاہم وہ بھی جب حدثنا وسمعت کہے تو اس کی روایات مقبول ہیں۔ اور حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ جب

بقیہ مشہورین سے روایت کرے تو مقبول ہوتا ہے۔ جب بقیہ جیسے رواۃ جو ثقاہت کے نچلے یا متوسط درجہ میں ہوں، ان کی روایات بھی تصریح سماع سے مقبولہ ہیں اور امام ثوری رحمہ اللہ جو مطلق تدلیس کا ارتکاب بھی نہایت قلت سے کرتا تھا۔ کما قال امام المحدثین پھر بھی آپ ان کی معنعنہ روایت کو شرف قبولیت بخشنے پر تیار نہیں ہیں تو صاف معلوم ہوا کہ آپ امام ثوری رحمہ اللہ کی امامت ثقاہت، حجیت اور اتقان کا ذرہ بھر بھی لحاظ نہیں فرماتے۔ پتہ نہیں ان کی ثقاہت، اتقان، حجیت اور امامت کا مفہوم محترم کے ہاں کیا ہے؟

ثانیاً: محترم دوست کی یہ عبارت ان کے اس موقف پر مبنی ہے۔ عنعنہ صرف اس مدلس کا مقبول ہے جو صرف ثقہ سے تدلیس کرتا ہو اور یہ مسلک مخدوش ہے کما مر تفصیلہ اور مزید اس سے یہ لازم آئے گا کہ امام ثوری رحمہ اللہ کی جو روایت بھی ان تین شیوخ، حبیب بن ابی ثابت، سلمہ بن کہیل اور منصور کے علاوہ جن شیوخ سے بھی ہو اور وہ روایت معنعنہ ہو (بجز اس صورت کے کہ امام ثوری سے شعبہ یا یحییٰ القطان روایت کرتے ہوں) تو وہ تدلیس کی وجہ سے نامقبول ہو۔ اور صورت حال یہ ہے کہ امام ثوری رحمہ اللہ کے صرف ثقات شیوخ کی لسٹ بھی کافی طویل ہے۔ دیکھئے کتب اسماء الرجال صحیحین کے متعلق تو آپ کا اور ہمارا یہی حسن ظن ہے کہ ان میں جو بھی رواہ مدلسین ہیں، ان کا عنعنہ ونحوھا اتصال پر ہی محمول ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی حدیث کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں امام ثوری رحمہ اللہ کے واسطہ سے کئی روایات ملتی ہیں جن کے بارے میں ان کے ائمہ مصنفین کا یہی ارشاد ہے کہ وہ صحیحہ یا حسنہ ہیں۔ مثلاً امام ترمذی رحمہ اللہ کی ''الجامع'' اور ابتدا سے لے کر عصر حاضر تک کے شراح نے ان ائمہ کی تصریح کو بحال رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو علامہ مبارکپوری کی کتاب ''تحفۃ الاحوذی'' اور علامہ شمس الحق عظیم آبادی کی کتب ابوداؤد کی شرحیں اور دارقطنی پر تعلیق وغیرھا من الکتب۔

لیکن محترم کے موقف کی بناء پر ایسی بہت سی روایات ضعیف ٹھہریں گی، اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ امام ثوری رحمہ اللہ کثرت سے تدلیس کے مرتکب ہوتے تھے اور یہ کہ امام المحدثین نے جو ثوری رحمہ اللہ کے متعلق فعل التعجب استعمال کیا، یعنی "ما اقل تدلیسہ" اس کی تدلیس کتنی کم ہے۔'' یہ صحیح بات نہ تھی بلکہ محترم کے خیال کے مطابق امام والا مقام کو تو "ما اکثر تدلیسہ" کہنا چاہیے تھا: ''کتنی کثرت سے امام ثوری تدلیس کرتے ہیں۔ روایت کے لیے متابعت کی تلاش اور اس کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ سردست تو چونکہ زیر بحث حدیث کے متعلق ہی گفتگو تھی۔ اس لیے آپ نے بھی اس کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا لیکن اگر اس موقف کو سامنے رکھ کر ہم دواوین حدیث کو تلاش کرنا شروع کر دیں تو بہت سی روایات جن کو سلف سے لے کر خلف تک صحیح ومتصل قرار دیتے آئے ہیں ان میں سے اچھی خاصی تعداد ضعیف بن جائے گی۔ تعجب ہے کہ جس جلیل القدر امام کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مطلق تدلیس بھی بہت کم ہے اس کے بارے میں محترم کا یہ فیصلہ ہے کہ مطلق تدلیس والی روایت کو چھوڑیئے اس کی مدلسہ عن الضعفاء روایات کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔

ثالثاً: مقالہ کی ابتداء میں آپ نے میری ایک بات کو اصول بنا کر بالکل غلط نتیجہ نکالا ہے۔ میرا مقصد تو یہ تھا کہ ان علماء وحفاظ مثلاً: حافظ ذہبی، حافظ ابن حجر اور حافظ علائی میں مراتب کے لحاظ سے کچھ اختلاف ہو تو اس صورت میں دوسرے قرائن ودلائل سے پتہ چلایا جائے گا کہ کس کی بات زیادہ قرین عقل وقیاس ہے۔ لیکن جناب نے اس کو بالکل عمومی رنگ دے دیا اور یہ اصول بنا لیا کہ یہ تینوں ائمہ اگر کسی بات پر متفق بھی ہوں پھر بھی ہم ان سے اختلاف کر سکتے ہیں اگر ہمیں دلائل سے ہماری اختیار کردہ بات صحیح نظر آئے۔

(جی حضرت) آپ ذرا تدبر سے کام لیں۔ امام ثوری کو مرتبہ ثانیہ میں داخل کرنے پر حافظ ذہبی، ابن حجر اور علائی متفق ہیں اور ان کا یہ موقف دلائل پر مبنی ہے۔

(ا) انہوں نے اپنی رائے نہیں پیش فرمائی بلکہ ائمہ حدیث سے یہ اتفاق نقل فرمایا کہ انہوں نے امام ثوری کی تدلیس کو محتمل سمجھا ہے اور ان کو قبول کیا ہے آپ امام ابن معین کا اختلاف پیش نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ ان کا موقف وہ قطعاً نہیں جس کی ترجمانی محترم فرما رہے ہیں۔ اس کی وضاحت بھی گذر چکی۔ علاوہ ازیں انہوں نے امام ثوری رحمہ اللہ کو خود ہی مستثنیٰ فرما دیا جیسا کہ یہ بھی اوپر بیان ہو چکا۔ اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ کی مثال بھی پیش کرنا مفید نہیں۔ اس لیے کہ ان کا موقف بھی وہ نہیں جو جناب کا ہے، آپ صرف امام بزار، یعقوب بن شیبہ یا پھر ابوالفتح الازدی اور ان جیسے کچھ اور محدثین کا ذکر کر سکتے ہیں لیکن ان میں سے بھی امام یعقوب بن شیبہ کا موقف بعینہ وہ نہیں جو جناب کا ہے۔ اس کا بیان بھی ہو چکا۔ بایں ہمہ ان کے معارض امام علی ابن المدینی رحمہ اللہ ہیں۔ جن کا مسلک یہ ہے کہ مدلس کی روایات پر غلبہ تدلیس کا نہیں ہے تو اس کا عنعنہ حجت ہے (اس کا ناقل امام یعقوب بن شیبہ ہی ہیں اور امام ابن المدینی کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ ارشاد ہے کہ سوائے امام ابن المدینی رحمہ اللہ کے کسی شیخ کے سامنے اپنے تئیں کم نہیں سمجھا۔ اسی مسلک کی طرف امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی رجحان معلوم ہوتا ہے۔ ان حفاظ کے اس طرز عمل کی دوسری دلیل یہ ہے کہ امام ثوری کی تدلیس (مطلق) ان کی بے شمار روایات کے مقابلہ میں بالکل قلیل ہے۔ یہی مسلک ابن المدینی کا ہے جیسا کہ ابھی ابھی ذکر ہوا۔

(ج) امام ثوری رحمہ اللہ ان ضعفاء سے تدلیس کرتے تھے۔ جن کے صحاح وصفات روایات کے امتیاز کا ان کو ذوق وملکہ حاصل تھا۔ کما قال الذهبی فی المیزان جیسا جرح وتعدیل وغیرہ میں منقول ہے کہ ثوری سے پوچھا گیا کہ آپ جابر جعفی سے روایت کیوں کرتے ہیں، تو فرمایا میں ان کی صحیح حدیث وضعیف میں امتیاز کر سکتا ہوں۔ امام شعبہ وغیرہ دوسرے ائمہ حدیث ضعاف سے روایات کرتے تھے تاکہ ان کا حال اچھی طرح معلوم ہو جائے۔ امام ثوری کی ان ضعاف سے تدلیس کی ایک وجہ معقول یہ بھی ہے کہ اس ضعیف راوی سے جو روایت انہوں نے لی وہ ہے تو صحیح، یعنی اس کا متن کسی دوسرے طریق سے صحیح طور پر وارد ہے لیکن انسان پر بسا اوقات نسیان طاری ہو جاتا ہے یا اس سے فی الوقت ذہول ہو جاتا ہے اور اس حدیث کو اس وقت بیان کرنا بھی ضروری ہوتا

ہے۔لہٰذا وہ اس ضعیف راوی سے ہی یہ صحیح المتن روایت لے آتا ہے اور چونکہ اس راوی ضعیف کے نام لینے سے یہ صحیح المتن روایت بھی شاید مسترد کر دی جائے۔اس خدشہ کی وجہ سے وہ ان کا نام نہیں لیتا اور تدلیس کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ انہیں یقین تھا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ بہرحال ان حفاظ کے اس موقف (ثوری کو مرتبہ ثانیہ میں داخل کرنا) پر تدبر سے کام لیا جائے تو اور بھی دلائل مل سکیں گے۔لہٰذا ان کا موقف صحیح ہے اور اس پر کوئی غبار نہیں۔اب آپ فرمائیں کہ آپ جو امام ثوری کو مرتبہ ثالثہ میں داخل فرمار ہے ہیں اس پر کیا دلیل ہے؟ امام بزار رحمہ اللہ وغیرہ کا یہ عام قول تو آپ نقل کر سکتے ہیں کہ جو غیر ثقہ سے تدلیس کرے اس کا عنعنہ مقبول نہیں ہوتا۔

یہ مسلک اولاً تو مخدوش ہے اس کا انطباق پوری طرح نہیں ہوتا اور ثانیاً ہمارے اصول وکلیات میں بھی چند مستثنیات ہوتے ہیں جن کے استثناء کی بھی معقول وجوہ ہوتی ہیں، یعنی امام بزار وغیرہ نے ایک عام قانون بتایا ہے لیکن ہمارے مبلغ علم کی حد تک کہیں بھی امام ثوری رحمہ اللہ کا نام لے کر یہ نہیں فرمایا کہ یہ روایت صحیح نہیں اس لیے کہ اس میں ثوری مدلس عن الضعفاء ہے اور اس نے سماع کی تصریح نہیں کی۔اس کے برعکس حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ نے ائمہ حدیث سے نقل فرمایا کہ وہ خصوصی طور پر امام ثوری رحمہ اللہ کی معنعنہ روایات بھی قبول کرتے تھے۔ میں نے جو بات لکھی تھی، امام زہری رحمہ اللہ کی مثال دے کر۔یعنی امام زہری رحمہ اللہ کو حافظ صاحب نے تو تیسرے مرتبہ میں ذکر کیا لیکن حافظ علائی نے اسے دوسرے مرتبہ میں ذکر کیا ہے۔لہٰذا میری بات آپ کو مفید تو تب ہوتی جب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے خلاف آپ حافظ ذہبی اور علائی دونوں سے یا کم از کم ان میں سے ایک کا اختلافی نوٹ نقل فرماتے اور یہ کہہ دیتے کہ دیکھو حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے یا حافظ علائی نے امام ثوری کو تیسرے مرتبہ میں داخل کیا ہے لیکن معاملہ بالکلیہ برعکس ہے۔ یہ دونوں حافظان، امام ثوری رحمہ اللہ کی معنعن روایات کے مقبول ہونے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے ہمنوا ہیں۔اور اسی وجہ سے علائی نے بھی انہیں مرتبہ ثانیہ میں ذکر فرمایا۔اس پر مستزاد یہ کہ ان تینوں حفاظ کی پشت پر متقدمین ائمہ حدیث بھی ہیں۔امام ابن معین رحمہ اللہ جو مطلق مدلسین کی روایات جو مصرحہ بالسماع نہ ہوں حجت نہیں سمجھتے انہوں نے بھی امام ثوری رحمہ اللہ کو مستثنیٰ کرایا (ان کا قول گزر چکا) میری بات کو اگر آپ عمومی رنگ ہی دینا چاہتے ہیں تو آپ بھی ان تینوں حفاظ ذہبی، علائی، عسقلانی رحمہم اللہ کے متفقہ فیصلہ کے خلاف متقدمین ائمہ حدیث سے ایسی تصریحات پیش فرمائیں جن سے بالوضاحت معلوم ہو جائے کہ وہ خصوصیت سے امام ثوری کی معنعن روایات کو مسترد کر دیتے تھے والا فلا بالجملہ آپ کے پاس کوئی ٹھوس دلیل ہے ہی نہیں۔ جن کی بناء پر امام ثوری رحمہ اللہ کی معنعنہ روایات کو مسترد کیا جائے۔آپ نے صرف بعض ائمہ حدیث کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ معنعنہ روایت صرف اس کی مقبول ہوگی جو ثقہ سے تدلیس کرتا ہو لیکن یہ دلیل بچند وجوہ مخدوش ہے (تفصیل گذر چکی ہے) بایں ہمہ ہر کلیے یا اصول سے کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں اور ہم نے امام ثوری کے مستثنیٰ ہونے پر دلائل پیش بھی کر دیے اور آپ کا موقف بے دلیل ہی رہا۔امام ثوری کے متعلق بحث کا اختتام ہو رہا

ہے لہٰذا میں اپنے محترم دوست کو یہ گذارش کرنے کی جرأت کررہا ہوں کہ آپ جیسے اہل علم کو یہ قطعی زیب نہیں دیتا کہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے رہیں۔

امام ثوری رحمہ اللہ متفقہ طور پر ثقہ، حجت، متقن امام اور امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ اس جلالت و امامت کے ساتھ اقل التدلیس ہیں اور ائمہ حدیث نے ان کی غیر مصرح بالسماع روایات کو بھی محتمل قرار دیا ہے اور ان میں سے کسی نے بھی امام ثوری رحمہ اللہ کا نام لے کر یہ نہیں فرمایا کہ ان کی غیر مصرح بالسماع روایات مقبول نہیں۔ اب ایسے امامت کی اعلیٰ سطح پر فائز شخصیت کو آپ نیچے گرا کر ایسی سطح پر لا کھڑا کریں کہ اس میں اور بقیہ بن الولید جیسے ضعفاء (مجاہیل اور کذابین سے تدلیس کرنے والوں، تدلیس التسویہ کا ارتکاب بھی کرتے ہوں، صدوق سے اوپر ان کا درجہ بھی نہ ہو) میں کوئی فرق نہ کریں کیونکہ بقیہ بھی جب تصریح سماع کرے، تو اس کی روایات بھی مقبول ہوتی ہیں۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ واقعتاً ثوری رحمہ اللہ اور بقیہ ایک ہی سطح پر ہیں اور ان دونوں کا ایک ہی مقام ہے؟ آپ کا موقف بظاہر اس کی غمازی کرتا ہے اور جس بناء پر آپ نے یہ موقف اپنایا ہے وہ عملاً قابل عمل بھی نہیں اس لیے اس موقف کے مطابق آپ مرتبہ ثانیہ کے لیے سات آٹھ نام بھی نہیں بتا سکتے۔ یہی ایک سفیان بن عیینہ کا نام ملے گا۔ آخر ایک مرتبہ کے لیے چند نام تو ہونے چاہئیں۔ یہ کیا عجوبہ پن ہے کہ اس اصول کا مصداق صرف ایک ہی دستیاب ہوسکا۔ لہٰذا میری گذارش یہ ہے کہ محترم اپنے موجودہ موقف پر تدبر و تامل سے نظر ثانی فرما کر اس سے رجوع فرمالیں۔ واللہ الموفق للصواب

اب آگے امام اعمش رحمہ اللہ کی تدلیس کے متعلق معروضات پیش کی جائیں گی۔ ان شاء اللہ العزیز محترم دوست نے امام اعمش کے متعلق الاعتصام صفحہ ۷، کالم نمبر ا سے لے کر دوسرے کالم میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا یہ قول الخ تک جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ میرے خیال (گستاخی معاف) سراسر غیر متعلق ہے کیونکہ میں نے اپنے مضمون میں یہ تو نہیں لکھا تھا کہ امام اعمش حافظ صاحب کے طبقات کی تحریر کے مطابق مرتبہ ثانیہ میں داخل ہے بلکہ میری تحریر آج بھی اخبار میں موجود ہے جو اس طرح ہے۔

''اعمش کو اگرچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دوسرے مرتبہ میں ذکر کیا ہے لیکن اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک موقف وہی صحیح ہے جو حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے یعنی جب وہ ایسے شیوخ سے معنعنہ روایت کرے جن سے انہوں نے بہت سی روایات لی ہیں اور وہ ان کے کبار شیوخ میں سے ہیں تو ایسا عنعنہ اتصال پر محمول ہوگا۔ الخ

اب محترم دوست خود ہی فیصلہ کریں کہ میں نے اعمش کو کب دوسرے مرتبہ میں داخل کیا ہے؟ بلکہ میں نے تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے طبقات المدلسین والے موقف کو صحیح نہیں قرار دیا بلکہ میرے نزدیک اس سلسلہ میں صحیح موقف حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا ہی ہے۔ باقی رہا محترم دوست کا حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے موقف پر اعتراض، تو اس کا جواب ان شاء اللہ آئندہ آرہا ہے۔

الاعتصام صفحہ ۱۷ کالم ۲ کے اخیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا یہ قول کہ اعمش کی ابوصالح وابووائل (شقیق) وغیرہما سے معنعن روایات سماع پر محمول ہیں۔''

درج بالا دلائل کی روشنی میں صحیح نہیں ہے۔

میری گذارش: درج بالا جو دلائل آپ نے تحریر کیے ہیں وہ سب عمومی ہیں اوران سے چند مخصوص شیوخ سے تدلیس نہ کرنے کی نفی لازم نہیں آتی بلکہ ایسے امثلہ موجود ہیں کہ مدلس راوی تیسرے مرتبہ کا ہے لیکن ائمہ نے ان کے متعلق یہ تصریح فرمائی ہے کہ یہ مدلس فلاں فلاں شیوخ سے تدلیس نہیں کرتا تھا۔ حافظ ابن رجب فرماتے ہیں: [1]

((ذكر من عرف بالتدليس وكان له شيوخ لا يدلس عنهم فحديثه عنهم متصل منهم))

''ان رواۃ کا ذکر جو تدلیس کرنے میں معروف تھے۔ (تاہم) ان کے چند شیوخ ایسے بھی تھے جن سے وہ تدلیس نہیں کرتے تھے (لہٰذا) ان شیوخ سے جو حدیثیں روایت کرتے تھے وہ متصل ہیں۔''

پھر لکھتے ہیں:

((هشيم بن بشير ، ذكر احمد انه لا يكاد يدلس عن حصين))

''ان میں سے ہشیم بن بشیر ہے امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ہشیم، حصین (بن عبدالرحمٰن السلمی) سے تدلیس نہیں کرتا تھا۔''

اس کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ کی وہ عبارت نقل کی، جو انہوں نے امام ثوری رحمہ اللہ کے متعلق فرمائی تھی۔ اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ بعض رواۃ جو معروف بالتدلیس تھے وہ بھی چند مخصوص شیوخ سے تدلیس نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا اعمش کے معروف بالتدلیس ہونے کے باوجود معین مخصوص شیوخ سے تدلیس نہ کرنے پر آپ متعجب کیوں ہو رہے ہیں۔

پھر صفحہ ۱۸ کالم نمبر ۱ پر تحریر فرماتے ہیں۔ بلکہ ان سے پہلے حافظ نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((وكقوله من الاعمش عن ابى صالح والاعمش مدلس ، والمدلس اذا قال "عن" لا يحتج به الا اذا ثبت السماع من جهة اخرى)) [2]

لیکن میرے محترم یہ کوئی کلیہ تو نہیں کہ متقدم جو بھی کہے وہ صحیح ہوتا ہے اور جو ان سے متاخر کہے وہ صحیح نہیں ہوتا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے ابوصالح سے اعمش کی روایت کے بارے میں یہ فرمایا کہ بغیر سماع کی تصریح

---

[1] شرح العلل الترمذی: ۵۰۳. [2] شرح مسلم: ۲/۱۱۹.

کے ان کی روایت حجت نہیں تو یہ انہوں نے محض اس لیے کہ اعمش معروف بالتدلیس ہے اس کی انہوں نے کوئی ٹھوس دلیل نہیں دی۔ اس کے برعکس حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی بات دلائل پر مبنی ہے جو آئندہ ان شاء اللہ ذکر کیے جا رہے ہیں۔ لہٰذا جب حافظ ذہبی رحمہ اللہ کو علم ہو گیا کہ اعمش اِن ان شیوخ سے تدلیس نہیں کرتا تھا تو وہ امام نووی رحمہ اللہ پر حجت نہیں۔

((من عرف حجة على من لم يعرف))

کسی کا زمانہ کے لحاظ سے متقدم ہونا یہ کوئی دلیل نہیں کہ جو ان سے زمناً متاخر ہو اس کی بات صحیح نہیں۔ اعتبار تو دلائل کو ہے نہ کہ شخصیات کو۔ دلائل کے ذکر سے پیشتر میں اپنے محترم دوست سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کو نقد الرجال میں استقراء تام حاصل ہے تو کیا ان کا استقراء تام صرف امام نووی رحمہ اللہ کے تدلیس عن الضعفاء میں ہی محدود ہے؟ اور کیا اس کے سوائے انہیں دوسرے رجال کے متعلق استقراء تام تو کیا مطلق استقراء بھی حاصل نہ تھا؟ بلکہ وہ محض ظن وتخمین اور رجم بالغیب کے طور پر رجال کے متعلق کہہ جاتے تھے؟ افسوس محترم حافظ ذہبی رحمہ اللہ جیسے محقق جس کے صاحب استقراء تام ہونے کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کو شک کا فائدہ دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ یعنی یہ فرما دیتے کہ انہوں نے یہ ارشاد بھی ضرور متقدمین کی تصریحات اور ان کے رویہ پر مبنی ہوگا۔

((وللناس فيما يعشقون مذاهب))

کسی راوی پر ائمہ فن کے کلام۔ تعدیلاً وتجریحاً، توثیقاً وتضعیفاً کے تین ماخذ ہوتے ہیں۔ کبھی یہ تینوں یک جا پائے جاتے ہیں کبھی ان میں سے کوئی ایک۔

۱۔ جس امام نے کسی راوی پر کلام کیا ہے وہ اس کے معاصر تھے اور ان کا حال (حدیث میں) مشاہدہ سے معلوم کر کے اس پر کلام کیا ہو۔

۲۔ وہ ان کے معاصر تھے لیکن ان سے متقدم ائمہ فن کے اس راوی پر کیے ہوئے کلام کی بناء پر ان پر کلام کیا۔

۳۔ اس راوی کی روایت کو دوسرے ثقات رواۃ کی روایات سے مقابلہ کر کے اور ان کی روایت پر روایۃً و درایۃً اچھی طرح تدبر کرنے کے بعد ان کے بارے میں کوئی فیصلہ دیا ہو۔

اس تیسری قسم کی "التنکیل" میں امام ابن معین وغیرہ کی مثالیں دے کر بخوبی وضاحت کر دی گئی ہے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اعمش کے معاصر تو یقیناً نہیں تھے لیکن ان کے متعلق متقدمین کی تصریحات انہیں بوجہ اتم حاصل تھیں۔ اسی طرح کسی راوی کی روایات کی روایت ودرایت کے اصول پر پرکھ کر اس کے بارے میں کسی فیصلہ دینے کا بھی انہیں اچھا ملکہ حاصل تھا۔ گو حافظ ابن الصلاح کے مقدمہ میں اس خیال کا اظہار فرمایا ہے کہ عصور متاخرہ کے محدثین میں ایسی حدیث کی تصحیح کی اہلیت نہیں جس کی متقدمین میں سے کسی نے تصحیح نہیں فرمائی، لیکن اس پر

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اچھا تعاقب کیا ہے اور ثابت کیا کہ متاخرین بھی کسی حدیث کی تصحیح کر سکتے ہیں اگر ان میں ضروری شرائط موجود ہیں۔

میری گذارش یہ ہے کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اعمش رحمہ اللہ کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ متقدمین کی تصریحات اور خود ان کی تحقیق دونوں پر مبنی ہے۔

اب آگے ملاحظہ فرمائیے:

(۱) آپ نے پہلے جو کچھ لکھا یا اس فقرہ میں امام نووی رحمہ اللہ کا حوالہ دیا ان میں اعمش کے ان تینوں ابراہیم، ابووائل، ابوصالح کے متعلق کوئی خصوصی دلیل پیش نہیں کی گئی کہ یہ یا یہ دلیل ہے اس پر کہ اعمش واقعتاً ان تینوں سے بھی تدلیس کرتا تھا۔ ہر جگہ صرف یہ ہے کہ "الاعمش مدلس" یا "کان یدلس" لیکن ان کی تدلیس سے وہ (ذہبی رحمہ اللہ) غیر واقف نہیں۔ دیکھئے المیز ان وغیرہ۔ یعنی حافظ ذہبی رحمہ اللہ اعمش کے مدلس ہونے کے منکر نہیں بلکہ وہ چند شیوخ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ ان سے تدلیس نہیں کرتا تھا، لہٰذا وہ روایات جو ان سے مروی ہیں وہ اتصال پر مبنی ہیں اور یہ تخصیص متقدمین کی تصریحات کے علاوہ ان کی اپنی تحقیق پر مبنی ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ علم الروایہ والدرایہ دونوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں اور وہ نقد الرجال میں صاحب الاستقراء التام ہیں۔ جب وہ چند شیوخ خصوصاً ابراہیم ابووائل وابوصالح کی تخصیص کرتے ہیں تو لامحالہ ان کی یہ تخصیص علم وتحقیق کی روشنی پر مبنی ہوگی۔ انہوں نے اعمش کی روایات کو اچھی طرح پرکھا ہوگا۔ ان شیوخ سے جو روایات مروی ہیں ان کو دوسرے ثقات کی روایات سے مقابلہ اور ان سے موازنہ نہ کیا ہوگا اور دواوین حدیث میں جو روایات اعمش کی ان شیوخ سے مروی ہیں ان پر دقت سے نظر ڈالی ہوگی، پھر اس تحقیق عمیق کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ وہ ان شیوخ سے تدلیس نہیں کرتا تھا۔ امام نووی رحمہ اللہ بلاشبہ ائمہ حدیث میں سے ہیں لیکن رواۃ حدیث کے سلسلہ میں (ہماری ناقص رائے میں) ذہبی رحمہ اللہ ان سے کافی آگے ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اس مقام پر فائز ہیں جو متاخرین میں سے بہت کم لوگوں کو حاصل ہو سکا ہے۔ اگر حافظ ذہبی رحمہ اللہ کو یہ مقام دینے کے لیے آپ تیار نہیں اور نہ ہی ان کی تحقیق پر اعتماد ہے تو اس کا لامحالہ یہ نتیجہ ہوگا۔ حافظ صاحب اگر کسی راوی کو ثقہ قرار دیتے ہیں لیکن متقدمین میں سے اس کی توثیق کے سلسلہ میں کوئی روایت نہیں لاتے اور نہ ان میں سے کسی کی تصریحات پیش کرتے ہیں تو ان کی یہ توثیق ناقابل قبول ہوگی بلکہ آپ کے اس موقف کے تحت کوئی یہ کہہ سکتا ہے اور کہے گا کہ حافظ صاحب کی توثیق مقبول نہیں۔ اس لیے کہ یہ ان کا اپنا خیال ہے اور انہوں نے ائمہ حدیث متقدمین میں سے کسی کی توثیق مقبول نہیں۔ جب ان کی بات پر اعتماد نہ رہا تو یہ شک وشبہ بھی لازم آئے گا۔ حافظ صاحب کی کتاب "سیر اعلام النبلاء" کے مطالعہ سے ایسے رواۃ کا بھی علم ہوتا ہے جن کے بارے میں انہوں نے (ثقہ وغیرہ) کے الفاظ تحریر فرمائے ہیں اور متقدمین ائمہ حدیث میں سے کسی کی توثیق بھی نقل نہیں فرمائی۔ حتیٰ کہ اس کتاب کے محقق کو حاشیے

میں یہ لکھنا پڑتا ہے کہ اس کتاب (السیر) کے علاوہ اس راوی کے احوال کے لیے ہمیں کوئی دوسرا مصدر نہیں ملا۔ تو کیا آپ ایسے سب رواۃ (جن کی حافظ صاحب نے توثیق فرمائی اور ان کے بارے میں متقدمین میں سے کسی کی توثیق کی تصریح بھی نہیں فرمائی) کے متعلق یہی فرمائیں گے کہ ان کی یہ توثیق مقبول نہیں یہ ان کا اپنا خیال ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس طرح آپ اس جلیل القدر حافظ حدیث اور نقد الرجال میں استقراء تام رکھنے والے کی ساری مساعی جمیلہ پر پانی پھیر دیں گے۔ آپ خود ہی سوچیں کہ جناب کے اس نہج پر سوچنے کی زد کہاں کہاں تک پہنچ کر رہے گی۔ آگے چلنے سے پہلے آپ اعمش کی ضعفاء کی تدلیس کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی تحقیق کو ملاحظہ فرمائیں۔

((قال جرير بن عبدالحميد سمعت مغيرة: يقول: اهلك اهل الكوفة ابو اسحق واعمش هذا كانه عنى الرواية عمن جاء ه والا فالاعمش عدل صادق ثبت صاحب سنة وقرآن يحسن الظن بمن يحدثه ويروى عنه ولا يمكننا ان نقطع عليه بانه علم ضعف ذلك الذى يدلسه فان هذا حرام))

''جریر بن عبدالحمید نے کہا: میں نے مغیرہ سے سنا فرماتے تھے اہل کوفہ کی حدیث کو ابواسحٰق اور آپ کے اعمش نے خراب کر دیا۔ (ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں) گویا اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ (اعمش) جو بھی آتا ہے اس سے روایت لے لیتے ورنہ اعمش، عدل، صادق، ثبت صاحب سنت وقرآن تھے جو اس سے حدیث بیان کرتا اور وہ (اعمش) ان سے روایت کرتا تھا۔ اس میں حسن ظن رکھتا تھا اور ہمیں یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم یہ یقین کر لیں کہ وہ جس سے تدلیس کرتا تھا اس کے ضعف کا علم بھی رکھتا تھا کیونکہ یہ حرام ہے۔''

چند سطروں کے بعد اسی صفحہ پر فرماتے ہیں:

((قلت وهو يدلس وربما دلس عن ضعيف ولا يدرى به فمتى قال حدثنا فلا كلام ومتى قال "عن، تطرق" اليه احتمال التدليس الا فى شيوخ اكثر عنهم كابراهيم وابى وائل (فى الاصل ابن ابى وائل وهو غلط) وابى صالح السماع فان روايته عن هذا الصنف محمولة على الاتصال))

''میں کہتا ہوں وہ (اعمش) تدلیس کرتا ہے اور بسا اوقات کسی ضعیف سے بھی تدلیس کرتا ہے اور انہیں اس کا علم نہیں ہوتا پھر جب وہ "حدثنا" کہے تو اس کی روایت کے حجت ہونے میں کوئی کلام نہیں اور جب "عن" کہے تو اس میں تدلیس کا احتمال آ جاتا ہے مگر ان شیوخ میں جن سے انہوں نے بہت سی روایات لی ہیں مثلاً ابراہیم (النخعی) و ابووائل (شقیق بن سلمہ) اور ابوصالح السمان تو اس کی روایت اس صنف سے اتصال پر محمول ہوگی۔''

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ اعمش جان بوجھ کر ان ضعفاء سے نہ تو روایت کرتا تھا اور نہ تدلیس کرتا تھا لہٰذا اعمش کو بقیہ وغیرہ جیسے مدلسین کے زمرہ میں داخل نہیں کیا جاسکتا۔ شاید آپ یہ سوال کرنے لگیں کہ اگر جان بوجھ کر ان ضعفاء سے روایت نہیں کرتا تھا بلکہ ان سے حسن ظن کی بناء پر غلطی کر جاتا تھا تو ایسی تدلیس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس راوی کا نام کیوں نہیں لیتے تھے؟

لیکن یہ سوال جناب پر بھی الٹ پڑے گا وہ اس طرح کہ جب آپ بھی قائل ہیں کہ جو ثقہ سے تدلیس کرے اس کی روایت مقبول و حجت ہے تو آپ بھی بتائیں کہ جب مدلس راوی ثقہ ہے تو اس سے تدلیس کی کیا ضرورت تھی؟ آخر انہوں نے اس ثقہ کا ہی نام کیوں نہ لیا؟ فما هو جوابكم فهو جوابنا

بلاشبہ ان ائمہ کے تدلیس کے بھی چند وجوہ اور کچھ مقاصد بھی تھے لیکن اس صورت میں غریب اعمش کے ساتھ ہی ایسے حسن ظن رکھنے سے کیوں بخل کیا جاتا ہے۔ کیا وہ امام ثقہ، ثبت وغیرہ ہونے کے باوجود اتنا گیا گذرا تھا۔ کہ اس کے ساتھ ایسا حسن ظن رکھنا بھی جائز نہیں سمجھا جاتا۔ بہر حال حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا اعمش کے بارے میں ان کبار شیوخ کو مستثنیٰ کرنا حقائق و دلائل اور ان کی روایات کو بدقت نظر پر کھنے پر مبنی ہے۔ اب اگر ان کی رائے کو صحیح نہیں سمجھتے تو یہ بے دلیل بات ہے آپ نے محض عمومی دلیل پیش کی ہے ان کبار شیوخ کے بارے میں متقدمین کی تصریحات سے خصوصی طور پر کوئی دلیل پیش نہیں فرمائی۔ یعنی اعمش ان سے بھی تدلیس کرتا تھا۔ محض مدلس ہونا تو حافظ ذہبی رحمہ اللہ کو بھی تسلیم ہے لیکن انہوں نے علی وجہ البصیرت اس عموم سے ایک استثناء کی ہے۔ جس کو آپ ٹھوس دلائل سے رد نہیں کر سکے۔

(۲) حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اعمش کے کبار شیوخ میں سے مثال کے طور پر تین شیوخ ذکر کیے ہیں۔ ابراہیم نخعی، ابووائل اور ابوصالح السمان رحمہم اللہ۔

اب آپ ائمہ حدیث کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں۔

امام ابن معین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے تھے: [1]

"اصح الاسانید" الاعمش عن ابراهيم بن يزيد النخعي عن علقمة بن قيس عن عبدالله بن مسعود ہے۔ معلوم ہوا کہ اعمش ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے تدلیس نہیں کرتے تھے۔ ورنہ امام ابن معین رحمہ اللہ اس کو اصح الاسانید میں شمار نہ کرتے۔ امام ابن معین رحمہ اللہ کو اعمش کی تدلیس کا علم تھا پھر بھی الاعمش عن ابراهيم کو اصح الاسانيد کہا وهذا واضح، اسی طرح علامہ احمد محمد شاکر رحمہ اللہ یہ بات امام احمد رحمہ اللہ سے بھی نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ اصح الاسانید کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((وما كان من حديث عبدالله بن مسعود فقال احمد: حدثنا ابو معاوية

---

[1] التقييد والايضاح للعراقي ص ۱۱ توضيح الافكار ۱/ ۳۲ وغيرهما.

فقال حدثنا الاعمش عن ابراهيم عن علقمة عن عبدالله))

''سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو احادیث آتی ہیں ان کی اصح الاسانید کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ہے: حدثنا ابو معاوية قال حدثنا الاعمش عن ابراهيم عن علقمه عن عبدالله''

اس سے بھی معلوم ہوا کہ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک بھی اعمش ابراہیم سے تدلیس نہیں کیا کرتا تھا ورنہ اعمش عن ابراہیم کو اصح الاسانید نہ کہتے۔ بہرحال جرح وتعدیل کے دو اماموں، ابن معین وامام احمد کے نزدیک اعمش، ابراہیم نخعی سے تدلیس نہیں کرتا تھا۔ وهو المطلوب

(۲) رامہرمزی نے المحدث الفاصل میں' ابن ابی حاتم نے جرح وتعدیل میں، حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں اور امام ابویعلی الخلیل نے ''الارشاد: ۱/۱۷۷'' میں امام وکیع بن الجراح سے روایت کی ہے کہ انہوں نے اپنے تلامذہ کو فرمایا کہ ان دو اسنادوں:

۱۔ ((عن سليمان الاعمش عن ابی وائل عن عبدالله بن مسعود عن النبی ﷺ))

اور.....

۲۔ ((عن سفيان الثوری عن منصور عن ابراهيم عن علقمة عن عبدالله بن مسعود......))

میں سے کس اسناد کو آپ زیادہ پسند کرتے ہیں کہ میں اس اسناد سے آپ کو حدیث سناؤں۔ تلامذہ نے جواب دیا کہ ہم تو اعمش والی اسناد کو پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ اقرب اسناد ہے تو امام وکیع نے فرمایا: تم پر افسوس! اعمش شیخ ہے، عالم ہے۔ ابووائل شیخ ہے لیکن سفيان عن منصور عن ابراهيم عن علقمة: فقيه عن فقيه عن فقيه ہے۔ یعنی امام وکیع نے دونوں اسنادوں کو صحیح تو قرار دیا لیکن ثانی کو اس لیے ترجیح دی کہ اس کے سب کے سب رواۃ فقیہ ہیں۔ اگر اعمش عن ابی وائل میں بھی اعمش نے تدلیس کی ہوتی تو وہ اسناد ضعیف ہو جاتی لہٰذا اس کا دوسری اسناد میں موازنہ کوئی معنیٰ نہیں رکھتا، البتہ اگر دونوں صحیح ہوں تو دونوں میں رواۃ کی صفات مختلفہ کی وجہ سے موازنہ اور ترجیح وغیرہ ہو سکتی ہے۔ آپ اس پر غور فرمائیں مطلب یہ کہ ائمہ اور حفاظ حدیث کے نزدیک اعمش عن ابی وائل اتصال پر محمول ہے ورنہ اگر اس میں بھی تدلیس ہوتی تو وہ غیر متصل ہوتی اور اس لیے ضعیف۔ لہٰذا اس کا موازنہ دوسری صحیح اسناد سے قطعی غیر مناسب ہے۔ واللہ اعلم

(۳) رہا ابوصالح السمان تو اس کے بارے میں سردست متقدمین سے مجھے کوئی تصریح دستیاب نہیں ہوئی۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے پاس اس قسم کی تصریح ضرور موجود ہوگی۔ اس لیے کہ اس قسم کی تصریح کے مصادر ومراجع پر جو دسترس حافظ ذہبی رحمہ اللہ کو تھی وہ ہمیں حاصل نہیں۔ ان کی کتب میں ایسی بہت سی کتب کے

نام ملتے ہیں جن کے ہم نے صرف نام ہی سنے ہیں اوران کو دیکھنا تا حال نصیب نہیں ہوا، حافظ صاحب نے اعمش کے جن تین شیوخ کا نام بطور مثال دیا تھا، ان سے اس عاجز نے دو کے متعلق کچھ تصریحات پیش کردی ہیں۔ باقی صرف ایک رہ جاتا ہے۔ تو جب ان کے دیئے ہوئے ناموں میں سے دو کے بارے میں ہمیں ایسی تصریحات مل گئیں جن سے ان کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ اس ایک نام کے لیے بھی بالضرور ان کے پاس متقدمین کی ایسی تصریحات ہوں گی جو ان کے موقف کو صحیح ثابت کر رہی ہوں گی اور یہ مقولہ تو محترم دوست بھی جانتے ہوں گے کہ ((للاکثر حکم الکل)) لہٰذا حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی یہ زیر بحث بات محض ان کا خیال نہیں ہے اور نہ ہی وہ محض ظن وتخمین ہے بلکہ دلائل وحقائق پر مبنی ہے۔ البتہ جناب کی بات محض بے دلیل ہے اور اس کو ظن وتخمین کہنا بجا ہوگا کیونکہ آپ نے حافظ موصوف کے اس مخصوص استثناء کے رد میں کوئی ٹھوس دلیل پیش نہیں فرمائی۔ امام نووی کا جو قول تحریر فرمایا اس میں تو اعمش کے مدلس ہونے کا بیان ہے اس سے کسی خصوصی استثناء کی نفی نہیں ہوتی۔ امام نووی کا قول تو تب آپ کا مستدل بن سکتا تھا جب وہ متقدمین ائمہ جرح وتعدیل کی ایسی تصریح پیش فرماتے ہیں جس سے صراحتاً یہ معلوم ہو کہ واقعتاً اعمش ابو صالح سے بھی تدلیس کرتا تھا۔ واذ لیس فلیس اعمش کے عام مدلسین کی لسٹ میں شامل ہونا اس بات کی قطعی نفی نہیں کرتا کہ وہ چند مخصوص سے تدلیس کرتا تھا، لہٰذا آپ کے کہنے کے برعکس آپ کا ہی ارشاد محض آپ کا خیال ہے اور وہ بھی بے دلیل۔

ائمہ حدیث متقدمین کے طرز عمل سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ اعمش ابو صالح السمان سے تدلیس نہیں کرتا تھا۔ ان ائمہ کے اس طرز عمل کو ملاحظہ فرمائیں۔

٭ صحیحین کے سوائے جو سنن اربعہ میں مسانید اور دوسرے دواوین حدیث میں بہت سی حدیثیں اعمش عن ابی صالح عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ موجود ہیں ان کے مصنفین اور ان کے شراح نے ان احادیث کی تصحیح فرمائی ہے اگر اعمش ابو صالح السمان سے بھی تدلیس کرتا تھا۔ تو یہ کبار ائمہ حدیث ان احادیث کی تصحیح نہ فرماتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ائمہ حدیث کے۔ ہاں یہ بات مسلم تھی کہ اعمش ابو صالح سے تدلیس نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ بھی دیکھیں کہ علماء عصر بھی اسی سند کو صحیح قرار دیتے ہیں، چنانچہ علامہ احمد محمد شاکر رحمہ اللہ امام احمد رحمہ اللہ کے مسند کی شرح میں رقمطراز ہیں: [1]

((ثم رواية ابی معاوية عن الاعمش عن ابی صالح صحيحة علی شرط الشيخين والصحيحان رويا الكثير بهذا الاسناد)) اهـ

''پھر (اس پر مستزاد یہ بات ہے کہ) روایت ابو معاویہ کی اعمش سے اور اعمش کی ابو صالح سے صحیح ہے شیخین (بخاری ومسلم) کی شرط پر ہے اور صحیحین نے اس اسناد سے بہت سی روایات لی ہیں۔''

---

[1] مسند احمد بتشريح احمد محمد شاكرؒ طبع دار المعارف ١٩٥٥ء بمصر ج١٣ ص١٨٣.

اسی طرح امام ابویعلی الخلیلی کی کتاب ''الارشاد'' کے محقق تحریر فرماتے ہیں۔ [1]

((فیہ الاعمش وھو مدلس وقد عنعنہ لکن روایتہ ھنا عن ابی صالح السمان وھو من کبار شیوخہ الذین اکثر عنھم فھی محمولۃ علی الاتصال ولا توثر فیہ العنعنۃ کما صرح بذلک الذھبی فی المیزان ۲/ ۲۲٤))

''اس حدیث کی سند میں اعمش ہے اور وہ مدلس ہے اور اس جگہ انہوں نے ''عن'' سے روایت کی ہے لیکن اس جگہ ان کی روایت ابوصالح السمان سے ہے اور وہ اعمش کے ان کبار شیوخ میں سے ہیں جن سے انہوں نے بہت سی روایات لی ہیں، لہٰذا یہ روایت اتصال پر محمول ہوگی اور اس کا عنعنہ اس میں کچھ بھی اثر انداز نہ ہوگا جیسا کہ ذہبی نے المیزان میں تصریح فرمادی ہے۔''

خلاصہ کلام: صحیح بات یہی ہے کہ اعمش، ابوصالح، ابووائل، ابراہیم نخعی اور ان جیسے دوسرے کبار شیوخ سے تدلیس نہیں کرتا تھا۔ جب اس روایت میں تدلیس نہیں بلکہ متصل ہے تو یہ حدیث صحیح ہوئی۔ واللہ اعلم

تنبیہ: دنیا میں ایسا کوئی کلیہ نہیں جس سے کچھ نہ کچھ مستثنیات نہ ہوں یا ان میں سے کوئی شاذ ونادر فرد خارج نہ ہو لیکن پوری دنیا اکثریت پر ہی اعتماد کرتی ہے اگر اکثر افراد اس کلیہ سے خارج نہیں ہوتے تو وہ کلیہ مسلمہ ہو جاتا ہے۔

امام اعمش کے متعلق اب تک جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس کا بھی یہ حال ہے کیونکہ دو تین مواضع ایسے ہیں جہاں ائمہ فن نے تصریح فرمائی ہے کہ یہاں اعمش نے ابوصالح یا ابووائل سے تدلیس کی ہے اور قرائن بھی اس کے موید ہیں تو ان مواضع کو مستثنیات میں سے قرار دیا جائے گا اور وہاں عدم سماع وانقطاع تسلیم کیا جائے گا۔ بصورت دیگر جہاں ائمہ فن میں سے نہ کسی امام نے یہ تصریح فرمائی ہو کہ یہاں اعمش نے ابوصالح، ابووائل یا ابراہیم وغیرہ سے تدلیس کی ہے اور نہ وہاں کچھ ایسے قرائن ہی موجود ہوں جن سے تدلیس کا شبہ پڑتا ہو تو وہاں یہ کلیہ صحیح ہوگا اور وہاں اعمش کی معنعن روایات بھی سماع پر محمول ہوں گی۔ واللہ اعلم

لہٰذا اگر محترم دوست اپنے دعویٰ میں سچے ہیں۔ تو ائمہ میں سے کسی امام کا ایسا قول دکھادیں جس میں یہ تصریح ہو کہ زیر بحث حدیث میں بھی اعمش نے ابوصالح سے تدلیس کی ہے۔

صفحہ ۱۸ کالم نمبر ۱ پر پھر تحریر فرماتے ہیں:

''اگر اعمش کی ابی وائل شقیق سے معنعن روایت کو مطلقاً سماع پر محمول کیا جائے تو ایک جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ کی عدالت (نعوذ باللہ) ساقط ہو جاتی ہے۔ (دیکھئے کتاب المعرفۃ والتاریخ الامام یعقوب الفارسی ج ٤ ص ۷۷۱ وسیر اعلام النبلاء ج۲ ص۳۹۳، ۲۹٤) جو کہ مسلمین (اہل السنہ والجماعہ) کے صحیح عقیدہ کے لحاظ سے باطل ہے، لہٰذا حافظ ذہبی کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔'' واللہ اعلم

[1] کتاب الارشاد للخلیلی فی الھامش: ۱/ ۳۱٤.

مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے محترم دوست کو اپنے مدعا کے اثبات کے لیے اس قسم کی سطحی باتیں کرنا قطعی مناسب نہ تھا۔ یہ ان کی علمی شان سے بمراحل بعید ہے خیر جب کہ انہوں نے یہ سب کچھ لکھا ہے تو ہمیں بھی کچھ عرض کرنا پڑتا ہے۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے حق میں کچھ فرمایا یہ غیظ وغضب کی حالت میں فرمایا: چنانچہ حافظ ذہبی ۲/۳۹۴ پر اسی روایت کے بعد اعمش کا یہ قول نقل فرماتے ہیں۔

((ثـم يـقـول الاعـمـش ، حدثنا هم بغضب اصحاب محمد ﷺ فاتخذوه دينا))

''لوگوں کو ہم نے تو نبی کریم ﷺ کے اصحاب کے غضب کا قصہ سنایا اور انہوں نے اس کو دین بنالیا۔''

پھر کتاب کے محقق اس پر حاشیے میں لکھتے ہیں:

((عـلـى ان قـول الاعـمـش الذى سيورده المصنف يفهم منه ان حذيفة انما قـال ذلك فـى حالة الغضب التى يقول فيها الانسان كلاما لا يعتقدهاحقيته اذا رجع حين يسكت عنه الغضب))

''علاوہ ازیں اعمش کے قول جو عنقریب مصنف لا رہا ہے سے سمجھا جاتا ہے کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ قول غضب کی حالت میں ہی کہا تھا۔ وہ غضب کی حالت جس میں انسان واہیات بھی کہہ دیتا ہے جس کی حقیقت کا خود بھی اعتقاد نہیں رکھتا۔ جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے اور (سنجیدگی سے) اپنی طرف رجوع کرتا ہے۔''

اور یہ بات بالکلیہ صحیح ہے، غصہ کی حالت میں اپنے اوپر کنٹرول کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ غضب کی حالت میں بھی کلمۃ الحق کہنا نبی کریم ﷺ کا خاصہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی سب احادیث لکھتے جاتے تھے۔ لوگوں نے انہیں کہا نبی کریم ﷺ انسان ہیں، غضب و رضا دونوں حالتوں میں کلام کرتے ہیں۔ لہٰذا تم آپ ﷺ کی سب باتیں نہ لکھا کرو۔ جب سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کی طرف رجوع کیا تو فرمایا کہ تم سب کچھ لکھتے رہو کیونکر (اپنے منہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) اس سے کسی حالت میں بھی (غضب خواہ رضا) حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا تو یہ سید ولد آدم ﷺ کا ہی خاصہ تھا۔ دوسرے اس مرتبہ ومقام پر فائز نہیں تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کتنے ہی بلند و بالا مقام پر فائز تھے، تاہم وہ معصوم نہ تھے۔ لہٰذا اگر غصہ کی حالت میں سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اس قسم کے الفاظ نکل گئے تو اس میں کونسی اچنبھے کی بات ہوگئی۔

صحیح بخاری میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے عرض کیا مجھے کچھ وصیت

فرمایئے؟ تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "لا تَغْضَبْ" غصہ نہ کرو۔ انہوں نے اس بات کو چند بار دہرایا لیکن بارگاہ رسالت سے یہی جواب "لا تَغْضَبْ" غصہ نہ کرو۔ غضب کی اس کیفیت کی وجہ سے حافظ ابن قیم رحمہ اللہ وغیرہ نے غضبان (غصہ میں بھرے ہوئے) کی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں کیا۔

یہ چند سطور ایک منصف مزاج کے لیے کافی ہونی چاہئیں لیکن میں اس بات کو صرف یہیں تک چھوڑنا نہیں چاہتا بلکہ چند مثالیں بھی اس جگہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ "باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ" میں حضرت عتبان بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے..... اس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے گھر تشریف لائے پھر عتبان رضی اللہ عنہ کی بتائی ہوئی جگہ پر نفلی نماز کی امامت فرمائی، پھر حضرت عتبان رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو وہاں آ کر جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک آدمی نے پوچھا کہ مالک کو میں دیکھ نہیں رہا۔ (وہ کہاں ہے) تو ان میں سے ایک نے کہا:

((ذاك منافق لا يحب الله ورسوله فقال رسول الله ﷺ: لا تقل ذالك . الا تراه قال لا اله الا الله يبتغى بذلك وجه الله؟ فقال: الله ورسوله اعلم اما نحن فوالله لا نرى وده ولا حديثه الا الى المنافقين: قال رسول الله ﷺ فان الله قد حرم على النار من قال لا اله الا الله يبتغى بذالك وجه الله))

"یہ تو منافق ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اور اس کے رسول سے محبت نہیں کرتا تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ایسا نہ کہو، کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ لا الہ الا اللہ کہتا ہے اور اس کہنے سے وہ خالصتاً اللہ کی رضا چاہتا ہے؟ تو اس آدمی نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں باقی ہم تو اللہ کی قسم ان کی دوستی اور بات چیت منافقین سے ہی دیکھتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو اللہ نے ایسے آدمی کو جو لا الہ الا اللہ اخلاص کے ساتھ اور اللہ کی رضا جوئی سے کہتا ہے جہنم کی آگ پر حرام کر دیا ہے۔"

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے متعلق کسی ظاہری بات کی وجہ سے منافق کا لفظ استعمال کرتا ہے حالانکہ وہ منافق نہیں، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ مالک کے حق میں ایسا نہ کہو۔ پھر ان کی نفاق سے براءت بیان فرمائی اور یہ ظاہر ہے کہ جس کسی نے مالک کے بارے میں کہا وہ محض غصہ کی وجہ سے تھا۔

۲۔ صحیح بخاری میں "افک" والی حدیث میں خود ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے منبر پر بیٹھ کر مسلمانوں سے فرمایا کہ جس نے میرے اہل کے بارے میں مجھے ایذا پہنچائی ہے، اس سلسلے میں میری معاونت کون کرے گا؟ تو سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (قبیلہ اوس سے)

کھڑے ہوئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں آپ کی اعانت کروں گا اگر آپ ﷺ کو ایذا پہنچانے والا ہمارے قبیلہ اوس سے ہے تو میں اس کی گردن ماروں گا اور اگر وہ ہمارے بھائیوں، یعنی قبیلہ خزرج سے ہوگا تو جو آپ امر فرمائیں گے ہم اس کے مطابق آپ کی امر کی تعمیل کریں گے......!! اس پر قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا اللہ کی قسم! تم نے جھوٹ بولا، تم اس کو قتل نہیں کرو گے اور نہ ہی اس کے قتل پر تمہیں قدرت حاصل ہوگی اگر وہ تمہاری قوم سے ہوتا تو تم اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتے تو اس پر سیدنا ابن حضیر رضی اللہ عنہ جو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی تھے وہ اٹھے اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((كذبت لعمر الله لتقتلنه فانك منافق تجادل عن المنافقين ، قالت فثار الحيان الاوس والخزرج حتى هموا ان يقتلوا ورسول الله ﷺ قائم على المنبر))

''اللہ کی قسم تو نے جھوٹ بولا، ہم ضرور اسے قتل کریں گے تو تو منافق ہے، منافقوں کی جانب سے لڑ رہے ہو۔ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس پر اوس و خزرج دونوں قبیلے ہیجان میں آ گئے حتیٰ کہ آپس میں لڑنے کا ارادہ کر لیا۔ اس حال میں کہ رسول اللہ منبر پر کھڑے تھے۔'' الحدیث الخ

اب ہمارے محترم دوست تدبر فرمائیں اور بتائیں کہ جو الفاظ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کے حق میں کہے تھے زیادہ سنگین ہیں یا وہ الفاظ جو سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے حق میں کہے۔ للہ آپ از راہ انصاف فرمائیے کہ سیدنا اسید رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ (فانك منافق تجادل عن المنافقين) ''بے شک تم تو منافق ہو اور منافقین کی جانب سے لڑ رہے ہو۔''

اپنے اندر کتنی سنگینی رکھتے ہیں؟ تو کیا محترم کے موقف کے مطابق نبی کریم ﷺ کے سامنے سیدنا اسید رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ کی وجہ سے سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عدالت ساقط ہوگئی؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ سیدنا اسید رضی اللہ عنہ کے یہ یہ الفاظ محض غیظ و غضب کی وجہ سے زبان سے نکل گئے اس لیے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی جانب سے مدافعت فرما رہے تھے، لہٰذا سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے مذکورہ الفاظ کی وجہ سے انہیں ہیجان آ گیا اور ان کو شدید غصہ لاحق ہوگیا۔ اور اسی شدت غصہ کی وجہ سے ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔ یہی وجہ ہے کہ خود سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس رویہ پر یہ فرماتی ہیں کہ:

((وكان راى سعد بن عبادة قبل ذلك رجلا صالحا لكن احتملته الحمية فقال......))

''اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اس واقعہ سے پیشتر ایک صالح مرد تھا لیکن اس معاملہ میں قومی حمیت نے انہیں

برانگیختہ کیا اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا.....''

بات بالکل واضح ہے کہ یہ بات سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے خطا اور لغزش اور غلطی سے صدور میں آئی ورنہ وہ (معاذ اللہ) منافق نہ تھے بلکہ ایک نیک وصالح آدمی تھے۔ کیا غیظ وغضب، غم وغصہ کی حالت میں انسان سے جو کچھ لاشعوری طور پر صدور میں آتا ہے یا آسکتا ہے اس کے اس سے بہتر کوئی مثال ہوسکتی ہے؟

۳۔ صحیح بخاری "باب غزوة الفتح" میں سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے کہ انہوں نے خط کے ذریعہ قریش مکہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ مکرمہ کے فتح کرنے کے ارادہ کی اطلاع دینی چاہی۔ یہ خط ایک عورت لے جارہی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے چند صحابہ رضی اللہ عنہم گئے اور اس عورت سے وہ خط لے کر آگئے۔ جب خط پڑھا گیا تو حاطب رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے ساری بات بیان کردی تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اما انه قد صدقكم) ''انہوں نے آپ کو سچی بات بتادی۔'' اس پر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

((يا رسول الله دعني اضرب عنق هٰذا المنافق))

''اے اللہ کے رسول! مجھے چھوڑو کہ میں اس منافق کی گردن ماردوں۔''

تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((انه قد شهد بدرا وما يدريك لعل الله اطلع على من شهد بدرا قال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم))

''بے شک یہ (حاطب رضی اللہ عنہ) بدر میں حاضر تھا اور تجھے کیا پتہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو بدر کے غزوہ میں حاضر تھے۔ ان کی طرف دیکھا اور فرمایا تم جو بھی عمل کرو میں تمہیں بخش دوں گا۔''

اس جگہ بھی وہی بات ہے، یعنی سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ حاطب رضی اللہ عنہ کے اس فعل اور دینی حمیت وغیرت کی وجہ سے بے حد غصہ میں آگئے اور حاطب رضی اللہ عنہ کو منافق کہا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی گردن مارنے کی اجازت مانگی تو اللہ تعالیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سمجھایا کہ واقعتاً یہ منافق نہیں البتہ ان سے ایک بڑا جرم ہوگیا ہے لیکن چونکہ وہ بدری ہے لہٰذا وہ مغفور ہے، اس لیے تو اللہ نے اہل بدر پر نظر رحمت ڈالی اور فرمایا تمہارے سب گناہ معاف کیے جائیں گے۔

محترم دوست غور فرمائیں مذکورہ تینوں واقعات سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اور آپ کے سامنے پیش آئے تاہم نہ تو ان کی عدالت ساقط ہوئی جن کے حق میں مذکورہ الفاظ کہے گئے اور نہ ہی ان لوگوں کی جنہوں نے یہ الفاظ کہے تھے، برا بھلا کہا گیا اس لیے کہ سید الاولین والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ یہ الفاظ غیظ وغضب کی حالت میں ان کی زبانوں سے نکلے تھے اور وہ بھی اسلامی غیرت اور دینی حمیت کی وجہ سے لہٰذا ایسی صورت حال میں اپنے آپ پر

کنٹرول کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، البتہ جن کے حق میں یہ الفاظ کہے گئے تھے ان کی براءت واضح فرمادی۔

اب محترم دوست سوچیں کہ جب اللہ کے رسول کے سامنے بھی غصہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبان سے دوسرے صحابی کے حق میں ایسے الفاظ نکل جاتے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی میں ایک صحابی کی زبان سے دوسرے صحابی کے بارے میں اس قسم کے الفاظ کا غصہ کی حالت میں نکل جانا کیوں بعید معلوم ہورہا ہے؟

لو! ایک مثال غیر صحابی کی بھی سن لیجئے۔

محمد بن اسحٰق کے متعلق امام مالک رحمہ اللہ نے دجال وغیرہ کے الفاظ کہے حالانکہ بڑے بڑے محدثین مثلاً: امام المحدثین وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ حنفیہ میں سے امام ابن ہمام وغیرہ نے بھی ان کی توثیق کی ہے اور محققین علماء نے امام مالک رحمہ اللہ کے ان الفاظ کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ابن اسحٰق نے موطا امام مالک رحمہ اللہ کے بارے میں کہا کہ وہ میرے پاس لاؤ کیونکہ (انا بیطارہ) ''میں اس کا معالج یا مرض کی تشخیص کرنے والا ہوں۔'' اس پر امام مالک رحمہ اللہ غضبناک ہوگئے اور یہ الفاظ ابن اسحٰق کے بارے میں فرمائے۔

پھر محدثین نے یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ بالآخر امام مالک اور ابن اسحٰق میں صلح وصفائی ہوگئی معلوم ہوا کہ یہ الفاظ امام صاحب موصوف سے غصہ کی حالت میں نکل گئے تھے۔ ورنہ اگر یہ الفاظ امام صاحب نے جروح کے طور پر فرمائے ہوتے تو صلح وصفائی کے کیا معنیٰ؟

ایک مثال ہمارے اس عصر کی بھی پیش خدمت ہے۔

ہماری جماعت کے بعض ثقہ لوگوں نے بتایا کہ ہمارے جد امجد سید رشد اللہ شاہ رحمہ اللہ کا یہ معمول تھا کہ وہ نماز عصر کے بعد مسجد میں ہی بیٹھے رہتے اور نماز مغرب تک علماء وصلحاء سے صحبت رہتی، علمی گفتگو ہوتی، کئی مسائل زیر بحث آتے۔ ایک مرتبہ حسب معمول جد امجد رحمہ اللہ کسی مسئلہ پر مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ سے بحث فرمارہے تھے۔ بحث کے دوران جد امجد کو کسی بات پر غصہ آگیا اور مولانا عبیداللہ رحمہ اللہ کو کہا: ''مولوی صاحب آپ جیسے سکھ تھے ویسے ہی سکھ رہے۔''

اس پر مولانا نے اور تو کچھ نہیں کہا صرف یہ الفاظ پڑھ لیے (بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَان) اسی وقت جد امجد کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اسی وقت مغرب کی نماز کی اقامت ہوئی۔ نماز سے فراغت کے بعد جد امجد نے اسی وقت جماعت سے فرمایا ہم سے مولانا کے حق میں بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ آپ سب میرے ساتھ مولوی صاحب کی خدمت میں چلیں تاکہ ہم ان سے معافی مانگ لیں، پھر وہ جماعت کی معیت میں مولانا کے پاس گئے اور ان سے معافی مانگی اور انہوں نے معاف فرمادیا۔ اس قدر طوالت وسمع خراشی کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کتنے ہی علم وفضل کی اعلیٰ سطح پر فائز ہو لیکن ہے وہ بہرحال انسان ہی، وہ فرشتہ نہیں ہے جس سے کوئی غلطی یا

گناہ صدور میں نہ آئے۔ بشر بشر ہی رہتا ہے اگر چہ وہ ولایت کے اونچے مقام پر کیوں نہ ہو۔ لہٰذا اگر سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے بتقاضائے بشری غصہ کی حالت میں سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ نامناسب الفاظ نکل گئے ہوں تو اس سے کونسا ایسا محذور لازم آتا ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے محترم بلاوجہ بیچارے اعمش کی تدلیس کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

سیدنا علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس وجہ سے طرفین میں اس ناچاقی کی بنا پر اتنی کدورتیں بڑھ گئیں کہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے رہتے تھے۔

صحیح بخاری میں موجود ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کو کہا کہ تم کیوں علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا نہیں کہتے۔ الخ بہرکیف غیظ وغضب کسی حد تک ایک محمود قوت ہونے کے باوصف انسان کی بڑی کمزوری ہے اور اس کی شدت میں انسان اپنے اوپر کنٹرول کرنے سے معذور ہو جاتا ہے اور ایسے حالات میں کوئی بھی ذی عقل منصف مزاج اس غصہ کے عواقب واثرات کو اپنے کسی موقف پر دلیل کے طور پر پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ واللہ اعلم

امید ہے کہ محترم دوست اس مسئلہ پر غور فرمائیں گے۔ اللھم اھدنا الی سواء الصراط

پھر اسی صفحہ ۱۸ کالم نمبر ۱ پر تحریر فرماتے ہیں:

''لہٰذا معلوم ہوا کہ کھڑے ہو کر جوتے پہننے کی ممانعت والی روایات سنداً غیر صحیح ہیں۔ اور ان سے استدلال نامناسب ہے۔'' واللہ اعلم

لیکن میرے محترم! آپ نے جو کچھ ارقام فرمایا، وہ قارئین اہل علم کی نظروں سے گذر چکا اور اب راقم الحروف نے جو گذارشات پیش کی ہیں وہ بھی علماء وفضلاء کے سامنے ان شاء اللہ آئیں گی۔ لہٰذا فیصلہ وہی کریں گے کہ آیا محترم کی نگارشات صحیح ہیں یا میری گذارشات اور کیا ممانعت والی روایتیں سنداً صحیح ہیں یا ضعیف۔ فَانْتَظِرُوا اِنِّی مَعَکُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ.

اسی صفحہ ۱۸ کالم نمبر ۱ کے آخر میں طبقات ابن سعد سے ایک روایت نقل فرمائی ہے لیکن خود ہی فرماتے ہیں کہ اس کی سند بھی ضعیف ہے جب اس کی سند مسلم طور پر ضعیف ہے تو اس کے پیش فرمانے سے فائدہ؟

اسی صفحہ ۱۸ کالم نمبر ۲ پر تحریر فرماتے ہیں، مختصر یہ کہ اس سلسلہ میں تشدد نہیں کرنا چاہیے۔ ھذا ماعندی واللہ اعلم بالصواب.

تشدد: ہم نے نہ پہلے کیا نہ اس وقت کر رہے ہیں اور نہ ہی آئندہ ان شاء اللہ کرنے کا کوئی ارادہ ہی ہے۔

میرا موقف! ممانعت والی حدیث میری تحقیق کے مطابق سنداً صحیح ہے اور میری نظر سے اس وقت تک کوئی ایسی سنداً صحیح حدیث نہیں گذری جو اس کی معارض بن سکے۔

گناہ صدور میں نہ آئے۔ بشر بشر ہی رہتا ہے اگر چہ وہ ولایت کے اونچے مقام پر کیوں نہ ہو۔ لہٰذا اگر سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے بتقاضائے بشری غصہ کی حالت میں سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ نامناسب الفاظ نکل گئے ہوں تو اس سے کونسا ایسا محذور لازم آتا ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے محترم بلاوجہ بیچارے اعمش کی تدلیس کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

سیدنا علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس وجہ سے طرفین میں اس ناچاقی کی بنا پر اتنی کدورتیں بڑھ گئیں کہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے رہتے تھے۔

صحیح بخاری میں موجود ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کو کہا کہ تم کیوں علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا نہیں کہتے۔ الخ بہرکیف غیظ وغضب کسی حد تک ایک محمود قوت ہونے کے باوصف انسان کی بڑی کمزوری ہے اور اس کی شدت میں انسان اپنے اوپر کنٹرول کرنے سے معذور ہو جاتا ہے اور ایسے حالات میں کوئی بھی ذی عقل منصف مزاج اس غصہ کے عواقب واثرات کو اپنے کسی موقف پر دلیل کے طور پر پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ واللہ اعلم

امید ہے کہ محترم دوست اس مسئلہ پر غور فرمائیں گے۔ اللھم اھدنا الی سواء الصراط

پھر اسی صفحہ ۱۸ کالم نمبر ا پر تحریر فرماتے ہیں:

''لہٰذا معلوم ہوا کہ کھڑے ہو کر جوتے پہننے کی ممانعت والی روایات سنداً غیر صحیح ہیں۔ اور ان سے استدلال نامناسب ہے۔'' واللہ اعلم

لیکن میرے محترم! آپ نے جو کچھ ارقام فرمایا، وہ قارئین اہل علم کی نظروں سے گذر چکا اور اب راقم الحروف نے جو گذارشات پیش کی ہیں وہ بھی علماء وفضلاء کے سامنے ان شاء اللہ آئیں گی۔ لہٰذا فیصلہ وہی کریں گے کہ آیا محترم کی نگارشات صحیح ہیں یا میری گذارشات اور کیا ممانعت والی روایتیں سنداً صحیح ہیں یا ضعیف۔ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ .

اسی صفحہ ۱۸ کالم نمبر ا کے آخر میں طبقات ابن سعد سے ایک روایت نقل فرمائی ہے لیکن خود ہی فرماتے ہیں کہ اس کی سند بھی ضعیف ہے جب اس کی سند مسلم طور پر ضعیف ہے تو اس کے پیش فرمانے سے فائدہ؟

اسی صفحہ ۱۸ کالم نمبر ۲ پر تحریر فرماتے ہیں، مختصر یہ کہ اس سلسلہ میں تشدد نہیں کرنا چاہیے۔ ھذا ماعندی واللہ اعلم بالصواب .

تشدد: ہم نے نہ پہلے کیا نہ اس وقت کر رہے ہیں اور نہ ہی آئندہ ان شاء اللہ کرنے کا کوئی ارادہ ہی ہے۔

میرا موقف! ممانعت والی حدیث میری تحقیق کے مطابق سنداً صحیح ہے اور میری نظر سے اس وقت تک کوئی ایسی سنداً صحیح حدیث نہیں گذری جو اس کی معارض بن سکے۔

لہٰذا اس صحیح حدیث یعنی:

((اذا امرتکم بامر فاتوا منه ما استطعتم وما نهيتكم عنه فاجتنبوه))

صحیحین عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مطابق ہم اکثر واغلب حالات میں جوتا بیٹھ کر ہی پہنتے ہیں کیونکہ کھڑے ہو کر جوتی پہننے سے ممانعت آ چکی ہے لیکن اس کے باوجود ہم نے اب تک نہ تو اس کی باقاعدہ تبلیغ کی ہے اور نہ ہی اس سلسلہ میں ذرہ بھر تشدد اختیار کیا جو کھڑے ہو کر پہنتے ہیں ان کو کبھی ہم نے اس پر نہیں ٹوکا۔ البتہ ہم سے اگر استفسار ہوتا ہے تو دلیل میں یہ ممانعت والی روایتیں پیش کر دیتے ہیں۔

میرے محترم دوست آپ یہ خیال کبھی اپنے دل میں نہ لائیں کہ میں نے یہ مقالہ محض اس لیے تحریر کیا ہے کہ آپ نے میری زیر بحث حدیث کی سند کی تصحیح کو غیر صحیح قرار دیا ہے یا میری تحریر پر کیوں تنقید کی۔ اگر آپ نے اس تنقید میں ایک اصولی بات کو نہ چھیڑا ہوتا تو میں اس مقالہ کے تحریر کرنے پر مشکل سے آمادہ ہوتا۔

میرا یہ مزاج ہی نہیں ہے کہ جو بھی مجھ پر تنقید کرے میں اس پر رد لکھنے کے لیے قلم اٹھالوں۔ یعنی اس نے مجھ پر کیوں تنقید کی۔ میں تنقید برائے تنقید کا کبھی بھی نہ قائل رہا اور نہ اس کا حامی نہ اس پر عامل۔ مقالہ ہذا کا اصلی محرک یہ ہوا کہ محترم نے بلا تدبر محض عجلت پسندی میں امام ثوری اور اعمش رحمہما اللہ کی سب معنعنہ روایات کو ضعیف قرار دے دیا حالانکہ تحقیق اس کے خلاف تھی۔ اگر محترم کا موقف اختیار کیا جائے تو صحیحین کے سوا اور سب روایات جو حدیث کے دوسرے دواوین ہیں اور جن کی تصحیح ائمہ حدیث کرتے آئے ہیں وہ سب کی سب بلا استثناء (امام ثوری و اعمش کی وجہ سے) ضعیف قرار پائے گی اور اس طرح حدیث کا ایک بڑا ذخیرہ ضعیف قرار پا کر سرد خانہ میں رکھ دیے جانے کے ہی قابل بنتا۔ وهذا كما ترى

اور اس پر طرہ یہ کہ آپ نے اپنے موقف کے اثبات کے لیے ایسے دلائل کا سہارا لیا جو آپ کی علمی شان سے بمراحل بعید تھے۔ بس یہی بات تھی جس نے اس موضوع پر مجھے قلم اٹھانے پر آمادہ کیا۔ اور الحمد لله ثم الحمد لله میں نے اس کا جواب تحریر کر کے پورا کر دیا۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل سے میں اس پر مطمئن بھی ہوں۔ ویسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ جانتا ہے کہ ہر وقت بیٹھ کر جوتا پہننے میں کافی مشکلات وغیرہ بھی ہیں لیکن ایک حدیث کو ہم نے (اپنے علم کی حد تک) سنداً صحیح سمجھا ہے تو اس کے خلاف عمل پیرا ہونے کو سخت ناپسند کرتے ہیں کیونکہ ہر انسان سے اس کی نیت اور اس کو جتنا علم ہوگا کے مطابق ہی آخرت میں پوچھ گچھ ہوگی۔ لہٰذا اگر ہم اس حدیث پر عمل نہ کریں تو یہ خطرہ ہے کہ ہم سے پوچھا جائے گا، کہ جب تم نے اس حدیث کو صحیح سمجھا تو کیوں اس پر عمل نہ کیا۔

لہٰذا محترم دوست کے لیے صحیح طرز عمل صرف یہ تھا کہ وہ احادیث کا تتبع فرماتے۔ احادیث کے دفاتر کو کھنگالتے اور اس کے نتیجہ میں ان کو صحیح السند روایت ایسی مل جاتی جس سے کھڑے ہو کر جوتا پہننے کا جواز نکلتا ہو تو وہ

پیش فرمادیتے تو چشم ماروشن دل ماشاء اللہ، ماشاء اللہ ہم بھی اس کے قائل اوراس پر عامل ہوجاتے لیکن اس صحیح طرز عمل کو چھوڑ کر محض بحث برائے بحث کو اپنانا آپ کے کچھ شایان شان نہیں۔

ولله يقول الحق وهو يهدى السبيل، وما علينا الا البلاغ والله بصير بالعباد، اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ولا تجعله علينا ملتبسا واجعلنا للمتقين اماما.

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين وصلى الله على خير خلقه سيد الاولين والآخرين محمد وآله واصحابه وبارك وسلم تسليما كثيرا.

✿✿✿✿

کیا حضرت مریم علیہا السلام، فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن جنت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہوں گی؟ کی تحقیق

کتب احادیث میں ایک روایت جو کہ ضعیف ہے، اس متعلق ملتی ہے کہ جنت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں حضرت مریم علیہا السلام، فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن، ہوں گی۔ جب کہ اس حدیث کی کوئی اصل موجود نہیں، یہ حدیث زبان زد عام مشہور ہے اور اسی بات کو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنے مضمون میں بڑے عرق ریزی سے ثابت کیا ہے۔
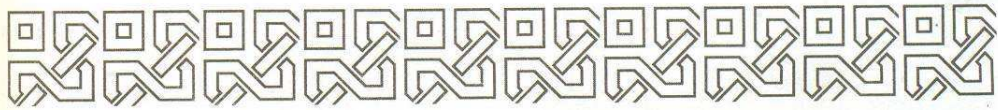
سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض علمائے کرام کہتے ہیں کہ قیامت والے دن نبی ﷺ کی شادی ان عورتوں کے ساتھ ہوگی (۱) حضرت بی بی مریم (۲) فرعون کی بیوی آسیہ (۳) حضرت موسیٰ کی بہن کلثوم، کیا اس بارے میں کوئی صحیح روایت ہے یا نہیں؟ (بینوا وتوجروا)

الجواب بعون الوهاب: اس کے متعلق دو روایات ضرور آئی ہیں لیکن سند کے لحاظ سے انتہائی سخت ضعیف ہیں جو کہ قابل حجۃ نہیں ہیں۔ ہم یہاں پر ان روایات کو ذکر کر کے اس کی اسنادی حقیقت بیان کرتے ہیں۔

نمبر ۱ ...... حدیث معجم الکبیر للطبرانی جلد ۸ صفحہ ۲۵۸ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے:

((حدثنا محمد بن نوح بن حرب العسكرى ، ثنا خالد بن يوسف السمتى ثنا عبدالنور بن عبدالله ، ثنا يونس بن شعيب عن ابى امامة قال سمعت رسول الله ﷺ يقول لعائشة اشعرت ان الله عزوجل زوجنى فى الجنة مريم بنت عمران وكلثوم اخت موسىٰ وامرأة فرعون))

اس روایت کی سند میں پہلا متکلم فیہ راوی خالد بن یوسف السمتی ہے جن کے بارے میں امام ذہبی رحمہ اللہ المیزان [1] میں اور علامہ ہیثمی مجمع الزوائد [2] میں لکھتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے۔ ہمارے علم کے مطابق صرف ابن حبان نے ان کو ثقات میں لائے ہیں پھر ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی وہ روایت جو اپنے باپ یونس بن خالد السمتی سے روایت نہ کرتے ہوں وہ قابل اعتبار ہے۔ ہماری گذارش یہ ہے کہ امام ابن حبان اگر چہ بلند پایہ محدث وامام ہیں لیکن موصوف جرح وتعدیل کے معاملے میں انتہائی تساہل درجے کے آدمی ہیں، جن کے تساہل کے بارے میں متعلقہ فن کے اماموں نے اپنی کتابوں میں تصریح فرمائی ہے کہ امام موصوف اپنی کتاب ثقات میں کتنی ہی جگہوں پر کئی راویوں کو لا کر بعد میں فرماتے ہیں (لا اعرفه) یعنی میں ان کو نہیں جانتا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ اپنی کتاب ثقات میں ان راویوں کو لا کر پھر انہی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں ان کو نہیں جانتا تو پھر کتاب الثقات میں ان کو لانے کا کیا مطلب ہے؟

علامہ امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابن حبان کی کتاب المجروحین مطالعہ کر کے دیکھی تو اس میں کسی مجہول راوی کا تذکرہ تک نہیں ہے حالانکہ اصول حدیث کے ماہر جانتے ہیں کہ جہالت جروح شدیدہ میں سے ہے۔ پھر جو بزرگ اتنا متساہل ہے کہ اپنی کتاب مجروحین میں مجاہیل کا ذکر ہی نہیں کرتا تو اس کی توثیق

---

[1] ميزان الاعتدال جلد٢ ص ٤٣٦ـ طبع مكتبة رحمانيه لاهور.

[2] مجمع الزوائد جلد٩ ص ٢١٨.

دوسرے ائمہ کے مقابلے میں کیسے مقبول ہوگی۔ جبکہ امام ذہبی جس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ اس طرح لکھتے ہیں: هو من اهل الاستقراء التام في نقد الرجال. یعنی امام ذہبی رحمہ اللہ نقد روایات کے بارے میں ان میں سے ہیں جن کی روایات کے بارے میں جرح وتعدیل کے بارے میں اس نے استقراء التام حاصل کیا ہے۔ جب ایسے امام نے خالد بن یوسف کی تضعیف کی ہے تو ابن حبان جیسے متساہل کی توثیق کے مقابلے میں ذہبی جیسے امام کی تضعیف راجح ہوگی۔ کچھ علماء نے علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ کی کتاب الفوائد البہیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ابوحاتم نے بھی ابن حبان کی طرح خالد بن یوسف کی توثیق کی ہے اور اس عالم کا کہنا ہے اس ابوحاتم سے مراد ابوحاتم الرازی ہیں اور چونکہ ابوحاتم الرازی متشددین میں سے ہیں ان کی توثیق بہرحال امام ذہبی وغیرہ سے مقدم سمجھی جائے گی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ امام ذہبی کی جرح غیر مفسر ہے۔ ہماری گذارش یہ ہے کہ اولاً علامہ لکھنویؒ کی کتاب فوائد البہیہ میں کافی تلاش کے باوجود مذکور حوالہ ہمیں نہیں مل سکا ہے۔ حالانکہ ہمارے پاس اس کتاب کا پرانا نسخہ جو ہندوستان میں چھپا تھا وہ بھی موجود ہے اور تازہ نسخہ جو کراچی سے چھپا ہے وہ بھی موجود ہے مگر دونوں میں یہ عبارت ہمیں نظر نہیں آئی۔ (واللہ اعلم) ثانیاً اگر اس طرح کا حوالہ مذکورہ کتاب یا کسی اور کتاب میں موجود بھی ہو لیکن اس ابوحاتم سے مراد ابوحاتم الرازی نہیں ہے بلکہ اس ابوحاتم سے ابن حبان ہی مراد ہے کیونکہ ان کی کنیت ابوحاتم ہے ہماری اس گذارش کی دو دلیل ہیں ایک یہ کہ امام ابوحاتم الرازی کے فرزند امام عبدالرحمٰن بن حاتم نے ایک کتاب فن رجال پر بنام ''الجرح والتعدیل'' تصنیف کی ہے اس کتاب میں خالد بن یوسف السمتی کے بارے میں توثیق کے الفاظ تو درکنار اس کا ذکر تک نہیں ہے حالانکہ ابن ابی حاتم کی یہ کتاب ابو حاتم الرازی اور ابوزرعہ الرازی وغیرہما کے اقوال سے بھری پڑی ہے۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ ان کے والد نے کسی راوی کی توثیق کی ہو اور وہ اس کی توثیق تو کیا، تذکرہ تک نہ کرے اہل انصاف کو غور کرنا چاہیے۔ دوسری دلیل اگر اس خالد بن یوسف کی توثیق کرنے والوں میں ابوحاتم الرازی ہوتے تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی کتاب المیز ان میں ضرور اس کا تذکرہ کرتے جبکہ اس ابن حبان کی توثیق خالد بن یوسف کے بارے میں نقل بھی کی ہے اور یہ ایسی واضح بات ہے کہ ہر مصنف مزاج اس کو ضرور قبول کرے گا۔ جبکہ یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچی کہ جو حوالہ ابوحاتم الرازی کا خالد بن یوسف کی توثیق کے بارے میں ہے وہ غلط ہے تو پھر صرف ابن حبان کی توثیق ہی باقی رہتی ہے۔ جو کہ انتہائی متساہل ہیں اور توثیق کے بارے میں کافی تساہل سے کام لیتے ہیں اس لیے ان کی توثیق کے مقابلے میں دوسرے فن کے اماموں کی تضعیف راجح ہوگی۔ باقی یہ کہا جاتا ہے کہ خالد بن یوسف کی وہ روایت (ابن حبان کے مطابق) جو اپنے باپ سے ہو وہ معتبر نہیں ہے اور چونکہ علامہ ہیثمی اس روایت کے بارے میں علت صرف خالد بن یوسف کی پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت میں خالد بن یوسف اپنے والد سے روایت نہیں کرتا اس لیے اس کی روایت حسن ہوگی۔ تو اس کے لیے یہ گذارش ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ سارا کچھ

طبرانی کی اصل کتاب میں دیکھے بغیر صرف علامہ ہیثمی کی کتاب مجمع الزوائد کو دیکھ کر چالبازی کی گئی ہے۔

اولاً: خالد کی اپنے والد سے روایت نہ کرنا اس سے یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ خالد سے اوپر جو راوی ہیں وہ سارے کے سارے ثقہ ہیں حالانکہ ایسے بھی ہوسکتا ہے کہ خالد کے والد کی جگہ پر کوئی اس سے بھی سخت راوی ہو اور علامہ ہیثمی اس کے بارے میں متنبہ کرنا بھول گئے ہوں۔

ثانیاً: ہمارے سامنے امام امام طبرانی کی کتاب معجم الکبیر ۸/ ۲۵۸ طبع احیاء التراث پر یہ روایت امام ابوامامہ والی موجود ہے جس کی سند میں خالد بن یوسف، عبدالنور بن عبداللہ سے روایت کرتا ہے اور عبدالنور یونس بن شعیب سے روایت کرتا ہے یہ دونوں راوی سخت ضعیف ہیں ان کی روایت سے ہرگز دلیل لینا درست و جائز نہیں ہوگا۔ اب پہلے عبدالنور کے بارے میں جرح وتعدیل کے اماموں کی رائے ملاحظہ فرمائیں۔

اولاً: حافظ ذہبی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''میزان الاعتدال'' [1] میں فرماتے ہیں: کذاب معنیٰ جھوٹا ہے۔ اور امام ابوجعفر محمد بن عمر العقیلی اپنی کتاب الضعفاء الکبیر میں فرماتے ہیں۔ ((کان یغلوا فی الرفض لا یقیم الحدیث ولیس من اھله والحدیث موضوع لا اصل له)) یعنی عبدالنور رافضی ہونے میں حد سے زیادہ افراط کرنے والے تھے۔ حدیث پوری طرح بیان نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی حدیث کے اہل میں سے تھے۔ پھر امام عقیلی عبدالنور کے طریق سے ایک روایت ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ یہ موضوع ہے اس کا کوئی اصل نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لسان المیزان [2] میں فرماتے ہیں کہ عبدالنور کو ابن حبان ثقات میں لائے ہیں پھر حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ شاید ابن حبان کو اس موضوع روایت پر اطلاع ہی نہیں ہوا ہے اسی لیے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔ جبکہ خالد بن یوسف عبدالنور بن عبداللہ سے روایت کرتا ہے جو کذاب اور سخت رافضی ہے حدیث کا اہل ہی نہیں ہے تب ایسے راوی کی روایت کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ حسن کے درجے تک پہنچتی ہے، کیسے صحیح ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس اس روایت کو نہ صرف ضعیف بلکہ موضوع کہنا چاہیے۔ عبدالنور پھر یونس بن شعیب سے روایت کرتا ہے۔ اس کے بارے میں علامہ ذہبی میزان اور حافظ ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں کہ اس کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ منکر الحدیث ہے امام ابن عدی اپنی کتاب کامل میں زیر بحث حدیث ابوامامہ والی لا کر کہتے ہیں کہ یہی روایت ہے جس کے بارے میں امام بخاری یونس بن شعیب پر انکار کیا ہے اور علامہ عقیلی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ یہ مجہول ہے اور علامہ دولابی اس کو ضعیف روایوں میں ذکر کیا ہے۔ ائمہ کے ان اقوال سے دو باتیں ثابت ہوئی ایک یہ کہ یونس بن شعیب امام بخاری کے کہنے کے مطابق منکر الحدیث ہے اور علامہ عبدالحیٔ لکھنوی اپنی کتاب الرفع والتکمیل بھی حافظ ذہبی کی کتاب میزان سے نقل کرتے ہیں کہ امام بخاری کا قول ہے کہ جس کو میں منکر الحدیث کہوں اس سے روایت لینا حرام ہے پھر اس بات کو بحال رکھتے ہوئے علامہ لکھنوی لکھتے

---

[1] میزان الاعتدال، ج: ۲، ص: ۶۷۱۔ [2] لسان المیزان ج: ۲، ص: ۲۸۵۔

ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کسی راوی کے اوپر منکر الحدیث کا اطلاق کریں اس سے روایت لینا جائز نہیں ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ روایت جس پر بحث چل رہی ہے اس کو بھی امام بخاری نے منکر الحدیث قرار دیا ہے تیسری بات کہ شیخ دولابی نے بھی اس کو ضعیف راویوں میں شمار کیا ہے۔ اور امام عقیلی کے ہاں مجہول ہے۔ اور جہالت بھی شدید جرح میں شمار ہوتی ہے کسی بھی لحاظ سے کسی بھی محدث نے اس کی توثیق نہیں کی ہے خلاصہ کلام کہ جب روایت کی سند میں خالد بن یوسف جن کو ثقہ بنانے کے لیے کچھ بزرگوں نے ایڑھی چوٹی کا زور لگایا ہے لیکن اس کے علاوہ اسی روایت کی سند میں دو راوی قادح اور سخت ضعیف ہیں اور ان پر جھوٹ کی بھی تہمت لگائی گئی ہے۔ اگر بالفرض خالد بن یوسف ثقہ ثابت ہو جائے لیکن پھر بھی یہ روایت ہرگز ہرگز صحت یا حسن کے درجے تک نہیں پہنچ سکتی۔ واللہ اعلم بالصواب

اسی سلسلے کی دوسری روایت حضرت سعد بن جنادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی جاتی ہے:

((قال قال رسول الله ﷺ ان الله عزوجل قد زوجني في الجنة مريم بنت عمران وامراة فرعون واخت موسى)) (رواه الطبراني)

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ جنت میں میری شادی مریم بنت عمران، فرعون کی بیوی (آسیہ) اور موسیٰ کی بہن کے ساتھ کروائے گا۔“

اس روایت کی سند معجم الطبرانی میں اس طرح ہے۔

((حدثنا عبدالله بن ناجيه ثنا محمد بن سعد الغوفي ثنا ابي ثنا عمي ثنا يونس بن نفيع عن سعد بن جناده))

اس روایت کی سند میں محمد بن سعد عوفی ہے۔ اتنا زیادہ سخت ضعیف تو نہیں ہے لیکن پھر بھی فی الجملہ اس میں ضعف ہے جس طرح خطیب بغدادی اپنی کتاب تاریخ میں محمد بن سعد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کان لینا فی الحدیث یعنی وہ حدیث میں کچھ کمزور تھا اور امام حاتم نے دار قطنی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا (انہ لا باس بہ) لسان المیزان [1] یعنی اس سے کوئی ڈر نہیں ہے یہ اگرچہ توثیق کے ضعف میں سے ہے لیکن توثیق کے آخری مراتب میں سے ہے پھر یہ دونوں قول خطیب اور امام دار قطنی کے اکٹھے ہو کر ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ یہ راوی اگرچہ زیادہ کمزور نہیں ہے لیکن اس میں کمزوری ضروری ہے بعد میں پھر اس کا والد سعد بن حسن بن عطیہ بن سعد الکوفی، اس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لسان المیزان [2] میں فرماتے ہیں:

((قال احمد فيه جهمي ولم يكن هذا ممن يتساهل ان يكتب عنه ولا اراه موضعا لذالك حكاه الخطيب))

---

[1] لسان المیزان، ج: ۲، ص: ۱۵۰۔ [2] لسان المیزان، ج: ۲، ص: ۳۴۔

یعنی امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ راوی جہمی تھا (جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے انکاری ہوتے ہیں) اور یہ اس کے قابل ہی نہیں ہے کہ اس سے روایت لینے میں تساہل سے کام لیا جائے۔ اور نہ ہی اس کو روایت کی جگہ پر سمجھتا ہوں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ امام احمد رحمہ اللہ کا قول شیخ خطیب بغدادی سے منقول ہے۔ اس سند میں تیسرا راوی سعد بن محمد بن حسن کے چچا ہیں۔ جن کا نام حسین بن الحسن بن عطیہ الکوفی ہے اس راوی کے بارے میں حافظ صاحب اپنی کتاب میں ائمہ جرح وتعدیل کے یہ اقوال نقل کرتا ہے:

((ضعفه يحيىٰ بن معين وغيره وقال ابن حبان وروى اشياء لا يتابع عليها لا يجوز الاحتجاج بخبره وقال النسائي ضعيف، وقال ابو حاتم ضعيف الحديث وقال ابن سعد سمع سماعًا كثيرا وكان ضعيفا في الحديث وذكر العقيلي في الضعفاء وقال الجوز جاني واهي الحديث)) [1]

یعنی امام یحیٰ بن معین وغیرہ نے ان کو ضعیف کہا ہے اور ابن حبان فرماتے ہیں کہ کتنی ہی اشیاء اس نے روایت کی ہیں لیکن کسی نے اس کی مشابہت نہیں کی ہے اس کی خبر سے حجت لینا جائز نہیں ہے اور امام نسائی فرماتے ہیں کہ یہ راوی ضعیف ہے امام ابو حاتم الرازی فرماتے ہیں کہ حدیث میں ضعیف ہیں ابن سعد فرماتے ہیں کہ اس کی روایات تو بہت سنی ہیں لیکن حدیث میں ضعیف ہے اور امام ابو جعفر العقیلی نے ان کو کتاب الضعفاء میں ذکر کیا ہے۔ جوز جانی کہتے ہیں یہ حدیث میں بے حد کمزور ہے۔ قارئین دیکھیں کہ جرح وتعدیل کے کتنے اماموں نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور کسی امام کی بھی توثیق ہمارے علم کے مطابق منقول نہیں ہے۔ اور حسین بن حسن روایات کرتا ہے یونس بن نفیع سے اور اسی یونس بن نفیع کا ترجمہ ہمیں فن رجال کے کسی کتاب میں نہیں ملتا اور علامہ ہیثمی مجمع الزوائد میں لا کر لکھتے ہیں کہ اسی روایت کی سند میں ایسا راوی ہے جس کو میں نہیں جانتا۔ غالباً علامہ ہیثمی کا اشارہ اسی یونس بن نفیع کی طرف ہے۔ کیونکہ اس کا ترجمہ نہیں ملتا لیکن علامہ ہیثمی کے اس کلام میں کچھ تساہل ہے کیونکہ اسی روایت کی سند میں یونس بن نفیع کے علاوہ دوسرے بھی کم از کم دو راوی سخت ضعیف ہیں۔ لہٰذا جس روایت میں دو راوی سخت ضعیف ہیں اور تیسرا راوی مجہول غیر معروف اور چوتھا معمولی ضعیف ہو اس روایت سے دلیل لینا یا اس طرح کی دوسری روایت کا مؤید بنانا یا تو محدث کے فوائد واصول سے ناواقفی ہے یا تجاہل عارفانہ ہے کیونکہ اصولی طرح ایسی سخت ضعیف حدیث کو نہ تو حجت بنا سکتے ہیں اور نہ ہی دوسری روایت کا مؤید بنا سکتے ہیں۔ اور دوسری کوئی روایت ہی اس کا مؤید بن سکتی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

تیسری روایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

((دخل رسول الله ﷺ على خديجة في مرضها الذى توفيت فيها فقالها اما

[1] لسان الميزان، ج: ١٥٥/١٥٦.

علمت ان الله عزوجل زوجنی معك فی الجنة مریم بنت عمران وامراة فرعون وكلثم اخت موسیٰ الخ)) (مجمع الزوائد: ۹/ ۴۱۲)

نبی ﷺ حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اس جب آپ بیماری کی حالت میں تھیں وہ بیماری جس میں آپ فوت ہوئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا آپ کو معلوم ہے اللہ تعالیٰ جنت میں تیرے ساتھ مجھے تین عورتیں بی بی مریم، فرعون کی بیوی آسیہ اور اخت موسیٰ کے ساتھ نکاح کروائے گا۔

یہ حدیث مجمع الزوائد میں سیدہ خدیجۃ الکبریٰ کی اخبار میں آئی ہے جس کی سند اس طرح ہے:

((حدثنا علی بن عبدالعزیز حدثنا الزبیر بن بکار حدثنی محمد بن حسن عن یعلی بن المغیرة عن ابی عوانة))

اس روایت میں ابن ابی داؤد کا نام عبدالعزیز بن ابی داؤد ہے جو ساتویں طبقے کے تبع تابعین میں سے ہیں اور نبی کریم ﷺ تک کم از کم دو تین طبقہ ضرور ہوں گے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس تبع تابعین نے کس تابعی سے روایت سنی ہے آیا وہ تابعی ثقہ تھا یا ضعیف اور اس محذوف راوی تابعی کے متعلق بھی معلومات نہیں ہے کہ اس نے یہ روایت کسی صحابی سے لی ہے یا مرسل بیان کر رہا ہے ایسی منقطع الاسناد روایت کو دلیل اور حجۃ بنانا علماء کے شان سے بہت دور ہے۔ پھر ابن ابی داؤد سے یعلی بن مغیرہ روایت کرتا ہے۔ جو فن رجال کی کتب ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان میں کسی میں بھی ان کا ترجمہ نہیں ملتا۔ تو پھر ایسے غیر معتبر راوی کا کیا اعتبار۔ تیسرے درجے میں یعلی بن مغیرہ سے محمد بن حسن روایت کرتا ہے اور وہ محمد بن حسن بن زبالہ مخزومی اور مدنی ہے۔ ان کے بارے میں ائمہ جرح و تعدیل کے کیا رائے ہیں۔ وہ درج ذیل ملاحظہ فرمائیں: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تہذیب التہذیب [1] میں لکھتے ہیں کہ امام یحییٰ بن معین محمد بن حسن کا تذکرہ کر کے فرماتے ہیں والله ما هو بثقته ، یعنی اللہ کی قسم یہ آدمی ثقہ نہیں ہے اور ہاشم بن مرثد امام ابن معین سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ هو كذاب خبيث لم يكن بثقته ولا مامون يسرق . دوسری جگہ الفاظ ہیں كان يسرق الحديث ، یعنی یہ آدمی جھوٹا پلید ہے ثقہ نہیں ہے۔ حدیثیں چوری کرنے سے مامون نہیں ہے دوسرے الفاظوں میں فرمایا کہ وہ حدیثیں چوری کیا کرتا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں عنده مناكير یعنی اس کے پاس منکر حدیثیں ہیں۔ امام احمد بن صالح مصری فرماتے ہیں کہ ((كتبت عنه ماة الف حديث ثم تبين لی انه كان يضع الحديث فتركت حديثه)) یعنی میں نے ان سے ایک لاکھ حدیثیں لکھی تھیں پھر میرے لیے یہ بات کھل گئی کہ وہ حدیثیں وضع کرتا ہے پھر میں نے ان کی حدیثوں کو چھوڑ دیا اور امام ابوزرعہ الرازی فرماتے ہیں کہ واهی الحديث حدیث میں

[1] تهذيب التهذيب، ج: ۹۔ ص: ۱۰۱.

حد درجہ کا کمزور تھا اسی طرح ابوحاتم الرازی فرماتے ہیں کہ ذاهب الحديث ، ضعيف الحديث عنده مناكير ، منكر الحديث، یعنی وہ حدیث میں کسی کام کا نہیں ہے۔ ضعیف الحدیث ہے اس کے پاس منکر روایات ہیں اور منکر الحدیث ہے۔ اور امام ابوعبید الآجری امام ابوداؤد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: كذابا المدينة محمد بن حسن بن زبانه ووهب بن وهب ابو البختري، یعنی مدینہ کے دو آدمی جھوٹے ہیں ایک محمد بن حسن بن زبانہ دوسرے ابوالبختری۔ ابوداؤد نے مزید کہا بلغني انه كان يضع الحديث بليل على السراج ، یعنی مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ وہ رات کو بیٹھ کر حدیثیں گھڑتا تھا اور امام نسائی ایک جگہ فرماتے ہیں کہ متروک الحدیث یعنی حدیث کے معاملے میں چھوڑے ہوئے ہیں دوسری جگہ فرمایا: ليس بثقة ولا يكتب حديثه ، کہ نہ وہ ثقہ ہے اور نہ اس کی روایت لکھی جائے گی۔ ليس بثقته ولا يكتبه حديثه ، یہ دونوں جرح شدید میں سے ہیں امام مسلم بن حجاج فرماتے ہیں کہ محمد بن زیاد غیر ثقہ، یعنی محمد بن زیاد ثقہ نہیں ہے امام ساجی فرماتے ہیں: وضع حديث على مالك ، امام مالک پر بھی حدیث گھڑتا تھا۔

امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ متروك الحديث ، ابن حبان فرماتے كان يروى عن الثقات ما لم يسمع منهم ، ہیں یعنی بعض ان راویوں سے بھی روایت کرتا ہے جن سے سنا نہیں ہے۔ ابویعلی خلیل فرماتے ہیں: رواه عن مالك مناكير وهو ضعيف ، یعنی امام مالک سے منکر حدیثیں روایت کی ہیں اور خود ضعیف ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس راوی محمد بن حسن بن زبانہ کے بارے جرح وتعدیل کے بلند پایہ اماموں کے کیا تبصرے ہیں۔ انہوں نے اس کو وضاع اور کذاب قرار دیا ہے۔ اس کو متروک اور واہی خیال کیا ہے۔ کسی بھی امام نے اس کی توثیق نہیں کی ہے۔ حتیٰ کہ ابن حبان جیسے متساہل نے بھی جو ان کے بارے میں ریمارک کیا وہ بھی گذر چکا اسی حقیقت کو مدنظر رکھ کر آپ مولوی محمد شعیب اللہ بنگلور کے مدرسے کے ناظم نے جو کچھ اس راوی کے بارے میں کہا ہے وہ رسالہ ماہنامہ محدث ۱۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸ء مطابق ربیع الاول ۱۴۰۹ ہجری میں پڑھیں اور غور کریں کہ اس سلسلہ میں مولوی موصوف نے کتنے قدر بے انصافی سے کام لیا ہے۔ رسالہ محدث کے صفحہ نمبر ۱۴۱ پر اردو میں کچھ عبارت اس طرح ہے کہ اس محمد بن حسن بن زبالۃ سے ابوداؤد نے جو کہ اصحاب صحاح سے ہیں انہوں نے روایت لی ہے پھر یہ روایت پہلی دو روایتوں کے ثبوت پر شاہد ہے۔ ناظرین انصاف کریں کہ اگرچہ اسی راوی کے اوپر علامہ مزی نے [1] (د) یعنی ابوداود کے علامت لکھی ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی کتاب تہذیب التہذیب [2] میں لکھتے ہیں کہ امام ابوداؤد نے اس راوی سے بالکل روایت نہیں کی ہے جبکہ خود ابوداؤد سے بصری نے جو نقل کیا ہے تو وہ راوی جھوٹا ہے۔ رات کو بیٹھ کر حدیثیں وضع کرتا تھا جس طرح پہلے گذر چکا پھر جس راوی کی ابوداؤد تصریح

---

[1] تهذيب الكمال، ج: ٨، ص: ٦٣٧. [2] تهذيب التهذيب، ج: ٩، ص: ١٠٢.

کرے ان سے کس طرح روایت کرے گا، علاوہ ازیں صحیحین کے علاوہ باقی صحاح اربعہ کے مصنفین اپنی کتابوں میں حدیث کی صحت کا التزام نہیں کیا ہے بلکہ ان میں جہاں صحیح وحسن حدیثیں ہیں تو وہاں منکر ضعیف متروک بلکہ موضوع بھی ہیں۔ خود امام ابوداؤد اپنی سنن میں لائے ہوئے کتنے ہی راویوں کے بارے میں متروک وغیرہ اطلاق کیا ہے۔ اصول حدیث کے ماہر جانتے ہیں کہ متروک راوی کی روایت نہ دوسری کسی روایت کی مؤید بن سکتی ہے اور نہ ہی کوئی دوسری حدیث اس کی تائید کرسکتی ہے بہرحال یہ روایت بالکل بیکار ہے کسی کام کی نہیں ہے۔ مولوی محمد شعیب اللہ صاحب نے اس جگہ پر ارہ زولائی کا اظہار کیا ہے۔ چوتھی روایت ابوشیخ کی تاریخ میں ہے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی جاتی ہے:

((قال قال رسول الله ﷺ یا عائشة اما تعلمین ان الله تعالیٰ عزوجل زوجنی فی الجنة مریم بنت عمران وکلثم اخت موسی وامرأة فرعون))

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ جنت میں میری شادی مریم بنت عمران، فرعون کی بیوی (آسیہ) اور موسیٰ کی بہن کے ساتھ کروائے گا۔''

اس روایت کی سند میں عبدالنور بن عبداللہ اور یونس بن شعیب راوی ہیں جن کے بارے میں گذشتہ صفحات میں حوالات کے ساتھ تحقیق عرض کر چکے۔ یہ روایت بعینہ وہی روایت ہے جو معجم طبرانی کے حوالے سے ذکر کر چکے ہیں۔ کوئی نئی روایت نہیں ہے۔ اس کو چوتھا نمبر دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ دوسری حدیث دوسرے طرق سے آئی ہے حالانکہ یہ تاثر سراسر غلط ہے۔ وہی روایت ہے اسی صحابی رضی اللہ عنہ سے ہے اور ان سے راوی یونس بن شعیب اور ان سے عبدالنور بن عبداللہ صرف اتنا طرق ہے۔ تو یہی روایت پہلے طبرانی کے معجم الکبیر سے نقل کی گئی تھی۔ ابوالشیخ کی تاریخ والی روایت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ قارئین کرام کو اس روایت کی سندی حیثیت اوپر ذکر کی گئی گذارشات کے مطابق معلوم ہوگئی ہوگی۔

آخر میں یہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ قیامت کے دن جنت میں اگر اللہ تعالیٰ جناب رسالت مآب ﷺ کی تزویج حضرت مریم علیہا السلام وغیرہا سے کرائے گا تو ہم اس سے ناراض نہیں ہیں۔ ہماری آنکھیں تو ٹھنڈی ہیں لیکن اس دنیا میں جب ہمیں کوئی بھی صحیح مرفوع حدیث نہیں ملی ہے اور جو بھی دو تین روایتیں پیش کی گئی ہیں وہ حد درجہ ضعیف بلکہ موضوع ہیں اس لیے ایک مسلم کو خاص کر کے اہل علم کو ایسی روایات موضوعہ کو نبی ﷺ کی طرف منسوب کرنے سے بچنا چاہیے ورنہ اس حدیث کے زمرے میں آجائے گا جس میں نبی ﷺ نے فرمایا: ((من حدث حدیثا یری انه کذب فهو احد الکاذبین ، او کما قال)) جس آدمی نے ایسی حدیث بیان کی جس کے بارے میں اس کو پتہ ہے کہ یہ جھوٹ ہے۔ تو یہ آدمی بھی ان دو جھوٹوں میں سے ایک

ہے۔اس لیے ایسی بات کی نسبت ان کی طرف کرنے کا جرم انتہائی سنگین اور خطرناک معاملہ ہے جس سے بچنا واجب اور لازم ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ (الآية) (بنی اسرائیل: ٣٦)

''اس بات کے پیچھے مت پڑو جس کا آپ کو علم نہیں ہے۔''

جب کہ زیر بحث بات غیب کے باب میں سے ہے اور قرآن اور صحیح حدیث سے کچھ معلوم نہیں ہوتا اس کے متعلق یقینی طور کچھ معلوم نہیں ہوتا اس لیے مسلمہ طریقہ یہی ہے کہ ہمیں اس پر سکوت اختیار کرنا چاہیے اور اس کو یقینی تصور کر کے نڈر ہو کر بیان کرنے سے اجتناب کرنا انسب اور اولیٰ بلکہ واجب اور ضروری ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

احقر العباد

محب الله شاه

❁❁❁❁

سات اہم سوالات کے جوابات

زیرِ نظر مقالہ الشیخ محبّ اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ کے کچھ سوالات اور ان کے جوابات پر مشتمل ہے، دراصل یہ کل سات سوالات کا مجموعہ ہے جو شاہ صاحب سے عربی زبان میں کیے گئے تھے جن میں ہمارے معاشرتی مسائل کے متعلق شاہ صاحب رحمہ اللہ سے استفسار کیا گیا اور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بڑے احسن انداز میں اور علمی بحث کرتے ہوئے ان سوالوں کے کافی وشافی جوابات مرحمت فرمائے، ان سوالوں میں جو مسائل دریافت کیے گئے اور جوابات میں جو مسائل زیرِ بحث لائے گا ان میں سے نماز تراویح کی تعداد، نماز تہجد، نماز تسبیح، معانقہ کرنا، ولیمہ کے مسائل، الکحل اور نشہ آور اشیاء سے بنی ہوئی ادویات سے علاج، تصویر اور ٹیلی ویژن کا حکم اور سلمان رشدی (ملعون) اور اس کی کتاب کے متعلق مسائل کو زیرِ بحث لاکر کمال علمی مہارت سے ان کا شرعی حل پیش فرمایا ہے۔

((الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على اشرف الانبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين)) امابعد!

زیر نظر مقالہ الشیخ محب اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ کے کچھ سوالات اوران کے جوابات پر مشتمل ہے، دراصل یہ کل سات سوالات کا مجموعہ ہے جو شاہ صاحب سے عربی زبان میں کیے گئے تھے جن میں ہمارے معاشرتی مسائل کے متعلق شاہ صاحب رحمہ اللہ سے استفسار کیا گیا اور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بڑے احسن انداز میں اور علمی بحث کرتے ہوئے ان سوالوں کے کافی وشافی جوابات مرحمت فرمائے ،ان سوالوں میں جو مسائل دریافت کیے گئے اور جوابات میں جو مسائل زیر بحث لائے گا ان میں سے نماز تراویح کی تعداد، نماز تہجد، نماز تسبیح ،معانقہ کرنا، ولیمہ کے مسائل، الکحل اور نشہ آور اشیاء سے بنی ہوئی ادویات سے علاج ،تصویر اور ٹیلی ویژن کا حکم اور سلمان رشدی (ملعون) اور اس کی کتاب کے متعلق مسائل کو زیر بحث لا کر کمال علمی مہارت سے ان کا شرعی حل پیش فرمایا ہے، شیخ صاحب کی شخصیت تو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اس لیے میں اس پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔

اعتدال پسندی، علمی رسوخ اور بڑے اہم اور دقیق استدلالات پر مشتمل یہ علمی امانت بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ اعتدال پسندی اور علمی رسوخ آج ہر اہل علم کے علم کا حصہ ہونی چاہیے اور اسی تناظر میں اس کا اردو ترجمہ کر کے اہل دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ ہر صاحب ذوق آدمی ان سے استفادہ کرے اور اعتدال کی راہ پر گامزن ہو۔

اللہ شیخ کی اس مساعی جمیلہ کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازے۔

(راشد صوفی)

سات اہم سوالات کے جوابات

تمام تعریفات اس ذات کے لیے جو دعاؤں کو قبول کرنے والی ہے اور جو مانگنے والے کو کبھی ناامید نہیں کرتی، وہی اللہ کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اول وآخر کی تمام تعریفات اسی کے لیے ہیں، اور قیامت کے دن تمام بادشاہت اسی کے لیے ہوگی جہاں پر عمل کی جزاوہ عطا فرمائیں گے۔

اور درود وسلام ہو، اس ہستی پر کہ جو صاف ستھری اور کھری شریعت دے کر مبعوث فرمائے گئے، جنہوں نے امر ونہی، قول وعمل ہر چیز کو واضح کر دیا کہ جن کے ارشادات عالیہ، ابدتک کے لیے کافی ہیں۔ انسانی حیات میں وہ مکمل رہنما ہیں ظاہری یا معنوی لحاظ سے۔ اوران کا اسوۂ حسنہ قندیل کی مانند ہے گمراہی کے اندھیروں میں، کفر، الحاد اور تشکیک کے اندھیروں میں۔ اوران صحابہ پر بھی کہ جنہوں نے آپ کے اقوال وافعال مکمل دینی امانت سمجھ کر ہم تک پہنچادیئے نہ اس میں کچھ ضائع کیا نہ غلو اور نہ ہی کمی کی۔ ان کی اس کوشش پر ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ جس دن نہ مال نہ اولاد کام آئے گی جس دن گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی کسی کو بادشاہت نہیں ملے گی، صرف اللہ کا حکم چلے گا، اس دن ہمیں اکٹھا فرمادے۔ مختصر حمد وثناء کے بعد!!

بعض سلفی بھائیوں کی طرف سے مجھے کچھ سوالات موصول ہوئے کہ میں قرآن وسنت کی روشنی میں انہیں ان کا حل پیش کروں۔ میں تو خود کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ علماء وفضلاء کے برابر ٹھہروں لیکن ان بھائیوں کے حسن ظن اور خلوص کی بنا پر ہر کوشش کر کے ان کے ان سوالات کے جوابات دوں۔

اللہ سے میں دعا گو ہوں کہ اللہ مجھے اتنی ہمت دے کہ میں اس اہم کام میں کامیاب ہو جاؤں، اللہ مجھے حق وسچ بیان کرنے کی توفیق نصیب فرمائے، کیونکہ اللہ ہی سیدھی راہ دکھانے والا ہے اور وہی ہمیں کافی ہے اور بہترین کار ساز ہے۔

سوال ۱: **نماز تراویح سنت گیارہ رکعت ہیں لیکن اگر کوئی گیارہ سے زیادہ پڑھنا چاہے تو کیا یہ جائز ہے؟**

الجواب بعون الوهاب: نفلی عبادات میں اللہ رب العزت نے کوئی تعداد یا قید مقرر نہیں فرمائی ہے، فرمان الٰہی ہے: ﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ﴾ (البقرة: ۱۵۸)

اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللَّهَ قَالَ مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ

حَتَّى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَائَتَهُ)) (بخاری: ٦٥٠٢)

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جو میرے کسی ولی کو تکلیف دے تو میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں، اور نہیں قرب حاصل کرتا ہے میرا بندہ میری طرف مگر میرے فرض کیے ہوئے پر عمل کر کے، اور جو بندہ نوافل کے ذریعے میری قربت کے حصول کی کوشش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، تو میں اس کا کان، آنکھ اور ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں کہ جن سے وہ سنتا ہے دیکھتا ہے پکڑتا ہے اور چلتا ہے اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے تو میں اسے ضرور دوں اگر پناہ مانگے تو پناہ دوں۔''

نبی کریم ﷺ نے نوافل کی کوئی حد بیان نہیں فرمائی صحیح حدیث میں ہے:

((خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصِيَامُ رَمَضَانَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ وَذَكَرَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الزَّكَاةَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَأَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ وَاللَّهِ لَا أَزِيدُ عَلَى هَذَا وَلَا أَنْقُصُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ))

(بخاری: ٤٧)

''ایک شخص نے نبی ﷺ سے سوال کیا اسلام کے بارے میں تو آپ ﷺ نے اسے بتایا کہ دن اور رات میں پانچ نمازیں ہیں، پوچھا: کیا اور بھی کچھ ہے؟ فرمایا نہیں اگر تو نفلی پڑھے، پھر آپ نے فرمایا رمضان کے روزے فرض ہیں تو پھر وہ پوچھنے لگا ان کے علاوہ اور بھی ہیں؟ فرمایا نہیں لیکن اگر نفلی رکھے تو تیری مرضی۔ پھر آپ نے زکوٰۃ کے بارہ میں بتایا تو پھر اس نے پوچھا کہ کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے فرمایا نہیں، مگر تو نفلی ادا کرے تو تیری مرضی۔ تو وہ آدمی جانے لگا اور کہنے لگا کہ اللہ کی قسم! نہ میں اس سے زیادہ کروں گا اور نہ اس سے کم تو آپ ﷺ نے فرمایا: کامیاب ہو گیا اگر اس نے سچ کہا۔''

اس حدیث میں بھی آپ ﷺ نے نفلی عبادت کی کوئی حد بیان نہیں فرمائی یہ تو عبادت کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کتنی نفلی عبادت کر سکتا ہے اور کئی دفعہ انسان کوشش کرتا ہے کہ میں خوش نفس کی رغبت اور للّٰہیت اور مناجات الٰہیہ کے لیے نفلی عبادت کروں اور اس کا مطمع نظر صرف تقرب الٰہی ہوتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ نفلی عبادت کرے لیکن اس میں اتنے افراط سے کام نہ لے کہ سستی تھکاوٹ، کج روی اس کا مقدر بن جائے اور فرائض سے بھی وہ

غافل ہو جائے۔

جب نفلی عبادت کرنے والا ان شروط کا خیال رکھے تو پھر وہ جتنی چاہے نفلی عبادت کرے کوئی قباحت نہیں، ہاں جب خاص نماز تراویح کی بات ہو تو بلا شک یہ مسنون ثابت شدہ صرف گیارہ رکعت ہیں، ان کے اوپر اضافہ کرنا محض نفلی عبادت میں اضافہ کرنا ہے، تراویح گیارہ رکعت ہی ہیں اور نفلی نماز کا حکم بیان ہو چکا ہے، اگر نفل کی نیت سے مسنون رکعات پر اضافہ کیا جائے تو ہمارے نزدیک یہ اس صورت میں جائز ہے کہ ان زوائد کو فرائض واجبات لوازم یا سنن موکدات نہ سمجھے اور جو ان زوائد کو ادا نہ کرے تو انہیں برا یا مجروح نہ سمجھے اور جو ان زوائد کو فرائض وواجبات یا سنن موکدات سے سمجھے اور ان کے تارک کو مجروح سمجھے گا تو وہ اللہ کی حدود سے تجاوز کرنے والا ہوگا اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے وہی ظالم ہیں، اس صورت میں اس کی یہ نفل عبادت قرب الٰہی کا ذریعہ نہیں ہوگی بلکہ یہ بدعت سیئہ ہوگی جو کسی بھی حال میں مستحسن نہیں ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک کہ جو لوگ ۲۰ رکعات ادا کرتے تھے، عہد عمر رضی اللہ عنہ میں جیسا کہ سنن الکبریٰ بیہقی میں ہے جس کی سند بھی جید ہے، بلکہ بعض تو ۲۰ سے بھی زیادہ ادا کرتے تھے، اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گیارہ رکعات باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا تھا لیکن ان پر مستزاد سے منع بھی نہیں کیا تو ہمارے نزدیک حق بات یہی ہے کہ سنت مسنونہ ثابتہ سے نماز تراویح گیارہ رکعت ہی ہیں لیکن اگر نفل کی نیت سے زیادہ پڑھ لی جائیں تو جائز ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

سوال ۲: کیا نماز تہجد اور نماز تسبیح کو رمضان یا غیر رمضان میں باجماعت ادا کیا جا سکتا ہے؟

الجواب بعون الوھاب: نفلی نماز باجماعت جائز ہے چاہے وہ نماز تہجد ہو یا نماز تسبیح یا کوئی اور نماز نفل، کیونکہ نبی ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر باجماعت نماز ادا فرمائی، آپ کے پیچھے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ایک بچہ اور ان کے پیچھے ام سلیم والدہ انس رضی اللہ عنہا کھڑی ہوئیں تو آپ نے انہیں دو رکعت نفل باجماعت پڑھائی، جیسا کہ کتب احادیث سے ثابت ہے۔ اور صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ ایک دفعہ یہ اپنی خالہ اور ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر رات کو ٹھہرے، جب نبی کریم ﷺ تہجد کے لیے اٹھے تو ابن عباس بھی ساتھ اٹھ کر وضو کر کے آپ کے بائیں طرف کھڑے ہو گئے تو آپ ﷺ نے ان کو اپنے دائیں طرف کھڑا کر لیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کی اقتدا میں مکمل نماز تہجد ادا کی۔ صلاۃ التسبیح بھی چونکہ نوافل سے ہے تو انہیں بھی باجماعت ادا کیا جا سکتا ہے، چاہے رمضان ہو یا غیر رمضان، ہاں! ایک بات کا خیال رکھے کہ کوئی خاص مہینہ یا جگہ مقرر نہ کرے یا خاص دن مقرر نہ کرے کہ اگر اس میں نفلی عبادت کروں گا تو زیادہ ثواب ہوگا علاوہ اس دن یا مہینے کے کہ جو شریعت میں بیان کر دیئے گئے، تو ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم شرعی حدود کا خیال رکھیں ان سے تجاوز نہ کریں۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال ۷: کیا سفر سے لوٹنے کے علاوہ دوسرے مواقع پر معانقہ (گلے ملنا) کیا جاسکتا ہے؟

الجواب بعون الوھاب: معانقہ کرنا گلے ملنا یہ انسان کا انسان سے محبت کرنے کا ایک طریقہ اور اس کا اظہار ہے کہ جو محبت وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے دل میں رکھتا ہے اور اپنے دوست سے ملاقات کے وقت اظہار مسرت کا ایک طریقہ ہے، یہ بالکل جائز ہے بلکہ مستحب اور ثواب کا باعث ہے۔ (ان شاء اللہ) اگر انسان کی اس سے نیت اپنے بھائی کی عزت وتکریم اور محبت ہو۔

نبی ﷺ نے اس شخص کو فرمایا تھا کہ جس نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ فلاں سے محبت کرتا ہے، تو آپ نے فرمایا تھا ((هَلْ اَخْبَرْتَهٗ بِذَالِكَ ، فَاِنْ لَمْ تَكُنْ قَدِ اخْبَرْتَهٗ بِهٖ فَاذْهَبْ وَاَخْبِرْهُ)) کیا تو نے اسے بتایا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اگر تو نے ابھی تک اسے نہیں بتایا تو جاؤ اور اسے بتادو۔

اور معانقہ اطلاع محبت کا بہترین ذریعہ ہے، صحیح حدیث میں ہے:

((ذَرُوْنِیْ مَا تَرَكْتُكُمْ ، مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوْهُ وَمَا اَمَرْتُكُمْ بِهٖ فَاتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ ، اَوَ كَمَا قَالَ ﷺ)) (صحيح مسلم، سنن النسائی، کتاب الحج)

''مجھے چھوڑ دو جب تک میں تمہیں چھوڑے رکھوں، جس سے روکوں اس سے رک جاؤ اور جس چیز کا حکم دوں اپنی طاقت کے مطابق اسے بجالاؤ۔''

اور معانقہ کرنا اباحت اصلیہ کے تحت جائز ہے کیونکہ نہ تو شریعت نے اس سے روکا ہے اور نہ کوئی سختی کی ہے تو یہ مباح ہے۔

امام دارقطنی نے اپنی سنن اور ابونعیم نے الحلیہ اور امام بیہقی نے سنن الکبریٰ اور طبرانی نے معجم الکبیر میں ابوثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ تقریباً ایک جیسے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ان اللـه تعـالـیٰ فرض فرائض فلا تضيعوها وحد حدودا فلا تعتدوها و حرم اشياء فلا تنتهكوها وسكت عن اشياء رحمة لكم غير نسيان فلا تبحثوا عنها)) (هذا حديث حسن كمال قال النووی)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے فرائض رکھے ہیں انہیں ضائع مت کرو اور جو اس نے حدیں مقرر فرمائی ہیں ان کی خلاف ورزی نہ کرو اور حرام اشیاء کی خلاف ورزی نہ کرو اور جن اشیاء کا حکم بیان نہیں کیا گیا سکوت اختیار کیا گیا ہے تو یہ اس کی تم پر رحمت ہے نہ کہ وہ بھول گیا ہے، ان کے بارہ میں بحث میں نہ پڑو۔''

تو یہ سکوت عنہ عمل ہے ہمیں اس میں بحث سے گریز کرنا چاہیے اور یہ مباح بلکہ مندوب ہے، اخلاص نیت سے۔

اور جو سفر سے واپس آئے تو اس کے ساتھ معانقہ کرنے کے ثبوت میں بہت سارے آثار وارد ہوتے ہیں لیکن مقیم کے بارہ میں اسی طرح کے آثار نہیں ملتے۔ مسافر سفر سے آتا ہے تو اس کے ساتھ معانقہ کی کوئی خاص

علت نہیں بلکہ صرف اظہار محبت ہوتا ہے تو یہی علت اصلیہ مقیم میں بھی موجود ہے اور گزشتہ دو روایتیں بھی اس کی تائید کرتی ہیں کہ مقیم سے معانقہ کیا جا سکتا ہے۔ معجم الاوسط للطبرانی اور تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں ایک حدیث ہے کہ:

((ان النبی ﷺ ارسل الی ابی ذر وکان خارجامن البیت فلما جاء اخبر برسالة النبی ﷺ، قال ابو ذر فلما جئت التزمنی النبی ﷺ)) (الحدیث)

''نبی ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس پیغام بھیجا آپ گھر سے باہر تھے جب واپس آئے تو گھر والوں نے نبی ﷺ کے پیغام کے بارہ میں بتایا تو ابوذر فرماتے ہیں: میں آپ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے مجھے اپنے سے چمٹا لیا۔''

اگر چہ ایک راوی کے مبہم ہونے کی وجہ سے اس میں کچھ ضعف ہے لیکن یہ ضعف یسیر ہے جو شواہد سے دور ہو جاتا ہے اور دوسرے آثار جو میں بیان کر چکا ہوں وہ اس کی تائید کرتے ہیں۔

نیز ترمذی اور ابن ماجہ کی وہ روایت انس کہ جس میں ہے کہ ایک آدمی نے آپ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملے تو کیا اس کے لیے جھک سکتا ہے؟ فرمایا: نہیں: پھر پوچھا: کیا اس سے چمٹ کر اس کا بوسہ لے سکتا ہے؟ فرمایا: نہیں، پھر پوچھا کیا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرے؟ فرمایا: ہاں۔''

تو یہ روایت حنظلہ بن عبید اللہ السدوسی کے ضعف کی وجہ سے ضعیف ہے اور ائمہ جرح وتعدیل سے اس کی تضعیف ثابت ہے اور ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ یہ روایت آثار صحیحہ جو بیان کیے جا چکے ہیں ان کے بھی مخالف ہے، چلو اگر بالفرض اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو ہم اس کو مقیم کے ساتھ معانقہ کرنے پر محمول کریں گے کیونکہ مسافر کے ساتھ معانقہ کرنا یہ تو صحیح سندوں سے ثابت ہے۔

اگر چہ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، لیکن امام ترمذی کا تساہل مشہور ہے اور اس جیسی روایات سے احتجاج پکڑنا غلط ہے۔ اس حدیث کے ضعیف ہونے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ کسی کے لیے بھی جھکنا جائز ہے بلکہ دوسرے دلائل سے غیر اللہ کے لیے جھکنا حرام قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس میں رکوع کی مشابہت آ جاتی ہے اور رکوع اور سجود غیر اللہ کے لیے جائز نہیں ہے۔

نوٹ: ابوالقاسم عفی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک حدیث بیان کی جو مسند احمد میں اور بیہقی نے کتاب الادب میں ذکر کی ہے صحیح سند کے ساتھ کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((ان رجلا من اهل البادية كان اسمه زاهر بن حراء قال: وكان النبی ﷺ يحبه وكان ذميما فاتاه النبی ﷺ يوما وهو يبيع متاعه فاحتضنه من خلفه وهو لا ينظر......)) الخ

''کہ ایک آدمی دیہاتیوں میں سے جس کا نام زاہر بن حراء تھا وہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور میں غریب آدمی تھا، ایک مرتبہ آپ تشریف لائے زاہر بازار میں اپنا سامان بیچ رہا تھا تو آپ ﷺ نے اسے پیچھے سے پکڑ کر گلے سے لگالیا، زاہر نہ دیکھ سکے تو وہ کہنے لگے: کون ہے؟ پھر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ نبی ﷺ تھے تو زاہر اپنی پیٹھ کو آپ کے سینہ مبارک سے اچھی طرح ملا دیا تو آپ ﷺ آواز لگانے لگے اس غلام کو کون خریدے گا؟ تو زاہر کہنے لگے اے اللہ کے رسول! میں تو ایسا شخص ہوں کہ جس کی کوئی قیمت ہی نہیں لگائے گا تو آپ نے فرمایا: تو اللہ کے ہاں بہت قیمتی ہے۔''

اس حدیث میں نبی ﷺ نے اپنے صحابی کو اپنے سینے سے چمٹایا اور وہ صحابہ سفر سے نہیں آئے تھے بلکہ مقیم تھے اور یہی محل استشہاد ہے اور صحیح بخاری میں بھی ہے کہ نبی ﷺ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو سینے سے لگایا اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ ((اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ)) ''اے اللہ اسے قرآن کا علم عطا فرما۔''

سوال ٤: ولیمہ جماع سے قبل ہے یا بعد؟

الجواب بعون الوھاب: ولیمہ قبل الدخول اور بعد الدخول دونوں طرح نبی ﷺ کے فعل سے ثابت ہے، جو قبل الدخول ہے اس کی دلیل وہ حدیث ہے کہ جس میں ہے کہ نبی ﷺ نے جب زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو آپ نے اپنے صحابہ کو گوشت اور روٹی کا ولیمہ کھلایا۔ انہیں اپنے گھر بلایا کھانا کھلایا، پھر وہ لوگ آپ کے گھر ہی میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آپ ﷺ گھر سے باہر چلے گئے، جب واپس آئے تو لوگ بیٹھے تھے، آپ واپس چلے گئے پھر آئے تو ابھی لوگ بیٹھے تھے آپ پھر واپس چلے گئے اور ایسا دو یا تین بار ہوا۔ اور آپ ﷺ انہیں کہہ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم چلے جاؤ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب وہ چلے گئے تو میں نے آپ کو ان کے جانے کی اطلاع دی۔ اس وقت تک آیۃ الحجاب جو سورۃ الاحزاب میں ہے نازل ہو چکی تھی، آپ اپنے اہل پر داخل ہو گئے اور میرے اور اپنے درمیان پردہ گرا دیا۔ تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ولیمہ قبل الدخول تھا۔

اور جو بعد الدخول ولیمہ کا مسئلہ ہے تو اس کی دلیل جنگ خیبر میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا واقعہ ہے کہ جس میں یہ وضاحت ہے کہ پہلے آپ اپنے اہل پر داخل ہوئے اور پھر گھی، ستو اور کھجور کا ولیمہ کیا۔

تو اس دلیل سے بعد الدخول ولیمہ ثابت ہوتا ہے، بہر حال اس میں وسعت ہے جب انسان کو سہولت ہو تب وہ ولیمہ کرے قبل الدخول، بعد الدخول کی کوئی شرط نہیں۔

سوال ٥: اکثر ادویات میں نشہ آور اشیاء الکحل وغیرہ استعمال ہوتا ہے تو ان ادویات کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الوھاب: ادویات نشہ اور اشیاء کے علاوہ بہت ساری اشیاء سے مرکب ہوتی ہیں اور دوسری اشیاء کے ملنے سے ان کا نشہ زائل ہو جاتا ہے جب ایسا ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اب

وہ نشہ آور رہے ہی نہیں۔

اور یہ علم ان کیمیاء کے ماہر اہل علم سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ مختلف اشیاء کو ملا کر ایک مرکب بناتے ہیں اور پھر اس میں تجربات کرتے ہیں اور اس کے آثار فعل ترکیب وغیرہ کو جانچتے ہیں۔

ہاں ایسی دوا جس سے نشہ زائل نہ ہو اور مخصوص مقدار یا اس سے زائد پینے سے نشہ دیتی ہو تو ایسی دوا حرام ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں ہے:

((ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام ، او کما قال النبی ﷺ))

''جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ دیتی ہو اس کی تھوڑی مقدار کا استعمال بھی حرام ہے۔''

یہ مسئلہ جدید مسائل میں سے ہے، لہٰذا جو تبحر اہل علم ہیں اور قرآن وسنت کے علم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم سے بھی واقفیت رکھتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ بیٹھیں اور ان مسائل پر کتاب وسنت کی روشنی میں غور وخوض کریں اور پھر ایک محاضرہ رکھیں جس میں عصری علوم کے ماہرین بھی ہوں اور پھر وہ اس پر بحث کریں تو جو نتیجہ آئے اور انشراح صدر ہو اور جو تحقیق سے بات ثابت ہو اسے مکمل تحقیق کے ساتھ نافذ کریں اور کسی سے نہ ڈریں تا کہ اس مسئلہ میں جو اشتباہ ہے اور مشکل ہے وہ حل ہو سکے، لیکن میں اس وقت اس مسئلہ میں اپنی کوئی واضح رائے نہیں دے سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب

ابوالقاسم عفی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس مسئلہ میں اپنے برادر محترم ومکرم سے تبادلہ خیال کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا، کہ اقرب الی الصواب بات یہی ہے کہ اس سے بچا جائے، ہر حال میں۔ چلو اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ اور اجزاء کے ملنے کی وجہ سے نشہ اس کا زائل ہو جاتا ہے، لیکن نبی علیہ السلام نے نشہ کو بیماری قرار دیا ہے تو جو خود بیماری ہو وہ بیماری کو کیسے دور کرے گی اور آپ ﷺ نے اسے دواء نہیں فرمایا: اگر سارے اطباء اور ڈاکٹر اکٹھے ہو کر بھی یہ کہیں کہ یہ شفاء ہے تو ہم انہیں ہی جھوٹا کہیں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر سچا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

یہی ہمارا مسلک اور ہمارا عقیدہ ہے، اسی پر ہمارا ایمان ہے اور یہی راہ راست پر چلنے والوں کا عقیدہ ہوتا ہے، اگر کوئی یہ جرأت کرے اور ڈاکٹرز کی بات کو سچ سمجھے اور نبی ﷺ کی بات کو غلط تو وہ اپنے ایمان پر غور کرے نوحہ کرے اللہ ہی حق بات فرماتے ہیں اور راہ راست پر ہدایت دیتے ہیں۔

ممکن ہے کوئی یہ بات کہے کہ اگر اس سے علاج ہو رہا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟

تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت ساری حلال اشیاء نباتات معدنیات جڑی بوٹیاں پیدا فرمائیں ہیں کہ جن سے علاج ممکن ہے تو ان حلال اشیاء کو چھوڑ کر ہم حرام کی طرف کیوں جائیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج : ۷۸)

''اللہ نے تمہارے دین میں تم پر کوئی سختی نہیں کی۔''

تو حرج اصلاً تصور نہ کریں بلکہ یہ مصمم ارادہ اور نیت صادقہ اور کتاب وسنت کی اتباع میں ہوتا ہے۔

سوال ٦: ٹیلی ویژن اور اسلامی فلموں کا کیا حکم ہے؟ کیا ہم تعلیم کی غرض سے یہ استعمال کر سکتے ہیں اور کیا ٹیلی ویژن تصویر میں داخل ہے؟

الجواب بعون الوهاب: یہ اس وقت کی بڑی عجیب بات ہے کہ ہم فلموں کا نام سنتے ہیں کہ یہ اسلامی فلمیں ہیں کہ یہ اسلامی اشتراکیت یا اسلامی جمہوریت ہے مجھے ابھی تک کوئی ایسا نہیں ملا کہ جو مجھے اس بارہ میں سمجھائے کہ ان کے یہ اسلامی نام کیونکر رکھے گئے ہیں، یہ نظریات اور اصطلاحات جو یہودی ہیں یہ کیوں ہمارے اندر آئے ہیں۔ آسمان زمین سے کہاں ہے تو یہ کہاں ہے۔ کیا تعلق ہے ان کا اس دین کے ساتھ جو دین منزل من اللہ ہے، یہ باطل نظریات اور خود ساختہ الفاظ واصطلاحات جو اہل الاھواء والبدع کی پیداوار ہیں، کیا ہم میں ایک بھی ایسا صاحب بصیرت آدمی نہیں کہ جو ان اشیاء کی گہرائی میں جا کر سوچے، کیا کوئی یہ بات واضح کر سکتا ہے کہ جو لوگ غیر ممالک میں رہتے ہیں، وہ یہ فلمیں وغیرہ تعلیم وتربیت کے لیے استعمال کرتے ہیں، کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا، کیونکہ ان لوگوں کا اس سے مقصد صرف اور صرف انہیں دیکھ کر انسانی جواہر کا ضیاع اور اخلاق کی بربادی اور فحاشی کے اندھیرے کنویں میں دھکیلنا ہے۔ یہ صرف لغو کھیل اور ان کی بری تسکین اور نفسانی خواہش کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان سے ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ کچھ وقت دنیاوی امور سے چھٹکارا پا کر اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کرنا ہے، تو یہ اشیاء وہ صرف اور صرف ان مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں نہ کہ ان کا اس سے مقصد کوئی تعلیم وتربیت ہے اور آج کل جتنی بھی فلمیں بنائی جاتی ہیں، وہ صرف اور صرف اخلاق کو تباہ کرنے والی ہیں اور خاندانی نظام کو تباہ کرنے والی ہیں کیونکہ جب ایک عورت اسے دیکھتی ہے اور پردہ اسکرین پر جو دیکھتی ہے پھر عام زندگی وہ اپنے آپ کو ویسا تصور کرتی ہے جس سے بالآخر زنا تک سرزد ہو جاتا ہے اور کتنے ہی شریف لوگ ایسے ہیں جو چور، ڈاکو بن جاتے ہیں جس کا سبب بھی بعض اوقات یہی پردہ اسکرین پر چلنے والی فلم ہوتی ہیں کہ وہ عام زندگی میں اپنے آپ کو ویسا تصور کرتا ہے اور پھر وہ سب کر گزرتا ہے جو دیکھتا ہے افسوس ہے آج کل کے علماء کرام پر جو ان اشیاء کے تھوڑے سے فائدے کو دیکھتے ہوئے جواز کا فتویٰ دے دیتے ہیں کہ اگر انہیں جائز منفعت کے لیے استعمال کیا جائے تو ٹھیک ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ فوائد کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ اس دنیا میں جو بھی اشیاء وہ نفع اور نقصان دونوں کو شامل ہیں، ہم اس میں موازنہ کریں کہ ان میں نفع کتنا ہے اور نقصان کتنا ہے اگر ان میں نقصان کی بہ نسبت نفع زیادہ ہے تو ہم پھر اسے جائز کہہ سکتے ہیں۔

لیکن جب اس کا نقصان اس کے نفع سے بڑا ہو تو ہم اسے کیسے فائدہ مند کہہ سکتے ہیں ((واثمهما اكبر من نفعهما)) کہ ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔ یعنی شراب اور جوئے کا۔ تو یہاں بھی ان فلموں اور پردہ

اسکرین کا نقصان ان کے نفع سے کئی گنا بڑا ہے، تو ایک عاقل انسان کے لیے یہی لائق ہے کہ ان سے بچے۔ یہ اشیاء اخلاق اور جوہر انسانی کو تباہ کرنے والی ہیں اور یہ تمام اشیاء یہود کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ اہل اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور یہ بات قرآن سے ثابت ہے، میں نے ایک انگریزی کتاب جس کا مصنف بھی انگریز ہی تھا کا مطالعہ کیا جس میں یہود کی میٹنگ کا تذکرہ تھا اور ان میٹنگز میں جو قرار دادیں پاس ہوئیں ان کا تذکرہ تھا، ان اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں نے یہ بات اس میں بڑی واضح اور صراحت کے ساتھ کہی کہ یہ انسان جن کو یہ اپنے لیے ایک تفریح کا ذریعہ سمجھتا ہے انہیں ان مسلمانوں میں عام کردو تا کہ ان کے اخلاق برباد ہو جائیں اور یہ لوگ افراط وتفریط کا شکار ہو جائیں، تو بتائیں ان یہودیوں کی بات پر یقین کریں یا اپنوں کی۔

فصل: پھر یہ بات کہی جاتی ہے کہ فلم یہ ایک متحرک تصویر ہے جو پردہ اسکرین پر دیکھی جاتی ہے، جاندار کی تصویر حرام ہے جس کے بارہ میں بے شمار احادیث وارد ہوئیں ہیں جو تواتر کی حد کو پہنچ جاتی ہیں کئی صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہ مروی ہے کہ آپ ﷺ نے جاندار کی تصویر بنانے سے منع فرمایا ہے اور جو ایسا کرتا ہے اس پر لعنت فرمائی ہے اور ساتھ میں یہ بھی فرمایا کہ تصویر بنانے والے اللہ مخلوق میں سے بدترین لوگ ہیں جنہیں قیامت کے دن یہ کہا جائے گا کہ جو تصویریں تم بنایا کرتے تھے آج ان میں جان ڈالو اور وہ اس سے قاصر ہوں گے اور انہیں سخت عذاب دیا جائے گا اور یہ عمل کبیرہ تباہ کرنے والا گناہ ہے اگرچہ یہ آج پورے عالم اسلام میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ مسلمانوں کے دل اس چیز پر کیسے راضی ہو گئے تو جو حرام ہے اور شیطان کی رضامندی کا سبب ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی ہے اور پھر افسوس یہ کہ ہم ان کا نام رکھتے ہیں۔ ''اسلامی'' افسوس ہے مسلمانوں پر اور ان کے ایسے اسلام پر'' اور پھر مزید سونے پہ سہاگہ کہ جب انہیں اس کام سے روکا جائے تو جواب دیتے ہیں کہ یہ کام تو فلاں عالم فاضل بھی کرتے ہیں اور فلاں فلاں ملک میں یہ رائج ہے وہ ممالک کہ جنہیں ہم اسلامی ملک کہتے ہیں، کتنی عجیب بات ہے۔ کیا ہم کسی ایک ملک کے ساتھ خاص ہیں؟ یا کیا ہم کسی خاص عالم فاضل پر ایمان لائے ہیں؟ بلکہ ہمارا ایمان تو اللہ اور اس کے رسول پر ہے اور انہی کی اتباع کرنا ہم پر لازم وملزوم ہے اگر ساری دنیا ایک چیز کو مل کر حلال یا حرام کرنا چاہیں تو بھی وہ اس کو حلال یا حرام نہیں کر سکتی جب تک کہ اللہ یا اس کے پیغمبر جناب محمد ﷺ اس کو حلال وحرام قرار نہ دے دیں۔ کیونکہ ایک مومن کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ہدایت اور بھلائی صرف اللہ اور اس کے رسول کی اتباع میں ہے نہ کہ غیروں کی۔

اگر سارے ممالک اسلامیہ ایک حرام چیز کو حلال کرنے پر تل جائیں اور اللہ اور اس کے پیغمبر نے اسے حرام کیا ہو تو وہ تمام غلطی پر ہیں اگر کہیں درستگی ہے تو وہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے پاس ہے۔

لیکن افسوس در افسوس کہ یہ مسئلہ قلوب مسلمین سے اس طرح نکال دیا گیا ہے، اس طرح مسلمان اس کی اہمیت سے غافل ہو گئے ہیں کہ علماء کرام کہ جو اپنے آپ کو سلف کے عقیدہ پر تصور کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اہل

الحدیث کہلاتے ہیں وہ بھی پوری طرح اس میں ملوث ہیں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بعض اہل حدیث جماعت کے اکابر فضلاء جو کیمرے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور لوگوں کو خطبہ دیتے ہیں، انہیں کتاب وسنت کی اتباع کا وعظ کرتے ہیں انہیں بدعتوں، فحاشی، منکرات سے روکتے ہیں لیکن ان کے سامنے مصور ان کی تصویر کشی کر رہا ہوتا ہے اور ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی کہ اس کام سے نبی علیہ السلام نے منع فرمایا ہے، بلکہ حالت تو یہ ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ گویا اس کام کو حرام ہی قرار نہ دیا گیا ہو۔ میں نے انہیں اس بات پر تنبیہاً خط لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ اب زندگی کا ایک حصہ ہے جس سے بچنا ناممکن ہے کیونکہ اس سے ہماری تصاویر اور ہماری بات دوسروں تک پہنچتی ہے اور ہمارے مسلک کی ترویج ہوتی ہے۔ تو مجھے دوبارہ ان کی طرف لکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ آج ہماری زندگی کا معیار اس قدر گر گیا ہے کہ آج حرام اشیاء ہماری زندگی کا لازمی جزو بن چکی ہے جس سے بچنا ناممکن ہے، پھر تو مجھے خطرہ ہے کہ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا، کہ پتا نہیں کیا کیا حرام اشیاء ہماری زندگی کا حصہ بنتی ہیں اور ہم اسے جائز قرار دیں گے، یہ عریاں رقص، فلمی گانے، آلات موسیقی، مخلوط محفلیں، سود اور رشوت خوری اور ایسی بے شمار اشیاء جو حرام ہیں لیکن یہ سب ہماری زندگی کا لازمی جزو بن جائیں گی تو یہ بھی حلال ہو جائیں گی۔ اور پھر لوگ ان میں بھی جائیں گے اور اپنے وقت کو ضائع کریں گے۔ جیسا کہ سائل نے کہا تھا کہ اسلامی فلمیں کہ جو صرف تعلیم کی غرض سے دیکھی جاتی ہیں ان میں کوئی لہو ولعب نہیں۔

چلو بالفرض مان لو کہ یہ اسلامی فلمیں فقط تعلیم کے لیے ہیں، لیکن ان میں صحابہ، تابعین اور اولیاء اللہ اور محدثین کی جو تصویر کشی کی جاتی ہے کیا آج کا کوئی آدمی ان پاک ہستیوں کے برابر ہوسکتا ہے؟ کیا آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ آج کا ایک فاحش انسان کسی صحابی کی تصویر کشی میں ملوث ہو۔ ارے یہ صحابی تو کیا یہ تو اس صحابی کے پاؤں کی دھول مٹی کے برابر بھی نہیں ہوسکتا کہ جو مٹی کی دھول نبی علیہ السلام کے ساتھ ان کے قدموں پر لگی۔ تو کیسے ایک آدمی ان جیسی تصویر پیش کرسکتا ہے اور پھر اسے پردہ اسکرین پر دکھلایا جائے۔

بہر حال بات تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہی خارج عن البحث ہے، ہم فضول اس میں وقت کو ضائع نہ کریں ان میں صرف جاہل ہی اپنا وقت ضائع کرسکتا ہے، ۱۴ صدیاں گزر گئیں آج تک کسی بھی اہل علم نے تعلیم وتربیت کے لیے اسلاف کے زندہ ہونے کی شرط نہیں لگائی تو آج ہمیں اس کی اتنی کیا ضرورت پڑ گئی کہ ہم ان بے کار اور بری اشیاء کی طرف رجوع کریں، کیا ان حرام اشیاء کے بغیر آج تعلیم ممکن نہیں؟ غور کریں۔

رہی بات جہاں تک ٹیلیویژن کی تو بذات خود ٹیلیویژن برا نہیں لیکن چونکہ یہ ہی فلموں کی رویت کا ذریعہ بنتا ہے اور پھر اس کو دیکھنے کے بعد انسان سینما اور بڑی اسکرینوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اگر انسان شہر میں رہتا ہو تو وہ سینما گھر کی طرف جائے گا ہی۔ اور پھر جب سینما کی طرف متوجہ ہوگا اور لازمی امر ہے کہ پھر اسے مال بھی زیادہ خرچ کرنا پڑے گا اور بہت ساری مشکلات سے بھی گزرنا پڑے گا تو یہ تمام کام انتہائی برے ہیں۔ اور اگر گاؤں کا

ماحول ہو وہاں اگر ایک گھر والے بھی ٹی وی لے آئیں تو پورا گاؤں ان کے گھر امنڈ آتا ہے اور ان کا گھر سینما کا نظارہ پیش کر رہا ہوتا ہے، جہاں مرد عورت بچے ہر عمر کے افراد آتے ہیں، تو جو گھر اللہ کی برکتوں سے بھرا ہوتا ہے وہ فحاشی، منکرات اور فسق و فجور کا اڈا بن جاتا ہے اور اسے دیکھ کر لوگوں کے ذہن خراب ہوتے ہیں وہ ایک علیحدہ نقصان ہے۔ بعض لوگ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اس پر صرف خبر سنتے ہیں تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ جو نیوز کاسٹر ہوتی ہے، بہت دفعہ عورتیں اور لڑکیاں ہوتی ہیں تو انسان خبر سنے گا کیا وہ ان عورتوں کی تصاویر نہیں دیکھے گا، اور اللہ تعالیٰ کا تو یہ فرمان ہے: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ (النور: ۳۰) کہ مومنوں کو حکم دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو پست رکھیں، تو کیا خبریں دیکھنے سے اللہ کے اس حکم کی نافرمانی نہیں ہوتی۔ اور پھر کیسے ممکن ہے کہ ایک گھر میں ٹی وی ہو اور آدمی اسے خبروں یا اسلامی پروگرام یا تقاریر تک محدود رکھے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جب صاحب گھر باہر جائے گا تو کیا وہ ٹی وی پر پہرہ دار بٹھائے گا، ہوسکتا ہے اس کے جانے کے بعد اس کے اہل خانہ اس پر منکر اور بری اشیاء دیکھیں، کیونکہ جو ہذیانی کیفیت فلمیں دیکھنا نفسانی خواہشات جنسی میلان جس طرح مردوں میں ہوتا ہے عورتوں میں بھی تو ہوتا ہے تو کتنی ہی پاکباز عقلمند عورتیں اس ٹی وی کی وجہ سے اس فحاشی کے دلدل میں دھنس جاتی ہیں۔

بـــــاب: اس کے علاوہ ویسے ہی اسلام میں تصویر ممنوع اور حرام ہے اور یہ ٹیلی ویژن تصویر کا ایک آلہ ہے اور مشکوک چیز ہے، اور جو مشکوک اشیاء کے قریب بھی جاتا ہے ممکن ہے کہ وہ مشکوک سے حرام میں داخل ہو جائے اور عین ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے انسانی فحاشی میں غرق ہو جائے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ (الانعام: ۱۵۱)

''فحاشی کے قریب بھی نہ جاؤ چاہے جو ظاہر ہو یا پوشیدہ۔''

تو جو شخص بھی یہ پسند کرتا ہو کہ وہ اپنے ایمان اور عزت کی حفاظت کرے تو ان تمام عوامل سے اپنے آپ کو بچائے کہ جو ایک پاکدامن انسان کو برائی کے راستے پر ڈال دیں جو اہل اسلام اور اسلام کے دشمنوں کی ایجادات ہیں کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں کو صراط مستقیم سے ہٹائیں۔

تو ہمارے علم کے مطابق ٹی وی بھی ممنوع ہے شرعی لحاظ سے۔ اور ہر مومن مرد اور مومنہ عورت پر یہ لازم ہے، اپنے آپ کو اور اپنے گھر اس بڑی تباہی اور ہلاکت سے بچائیں کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو تمام گھر والوں کا گناہ سربراہان کے ذمہ ہوگا۔ کیونکہ نبی ﷺ نے ہرقل کو جو خط لکھا تھا اس میں یہ بھی لکھا تھا:

((فان تولیت فعلیك اثم الاریسیین)) (الجامع الصحیح للبخاری)

''اگر تو ایمان نہ لایا پھر گیا تو تمام اریسیوں کا گناہ تیرے سر ہوگا۔''

تو عزیزان من! ایسی تمام اشیاء سے اپنے آپ کو بچالو کہ جو ظاہراً تو بڑی اچھی ہیں لیکن حقیقت میں زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال ۷: سلمان رشدی اور اس کی کتاب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

الجواب بعون الوهاب: میں نے اس کی کتاب نہیں پڑھی لیکن مختلف رسائل وجرائد میں اس کے کچھ اقتباسات پڑھے ہیں جیسے الاعتصام وغیرہ میں، اس خبیث نے شان رسالت، قرآن، اسلام اور اہل اسلام کے متعلق جو بکواسات کی ہیں ایک خوف الٰہی رکھنے والے انسان کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے، اللہ کی قسم! اس کی اس خبیث حرکت پر ہمیں متحد ہونا چاہیے اور دینی حمیت اور غیرت کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور اس کے خلاف ہر طرح سے آواز بلند کرنی چاہیے اور اس کی حرکت خبیثہ کو عام کیا جائے تا کہ اس کا سد باب ہو سکے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيدنا وسيد المرسلين محمد وآله واصحابه اجمعين ، آمين

❁❁❁❁

بذل أقصي الوسع
في
أجوبة السوالات التسع

نو اہم سوالات کے جوابات

یہ مضمون ان سوالات کا مجموعہ ہے کہ جس میں لوگوں نے شاہ صاحب سے نو سوالات کیے تھے۔اور گذارش کی تھی کہ آپ ان سوالوں کے جواب عقلاً سمجھائیں، تو ان سوالات کے جوابات میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بڑے احسن انداز سے عقلی طور پر اور دلائل کے ساتھ ان کے سوالوں کے جواب دیئے۔
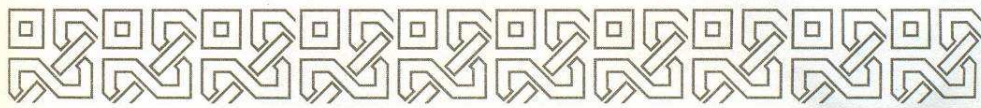
آپ سے کیے گئے سوالات حسب ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت کو عقلاً سمجھائیں اور ثابت کریں؟

۲۔ دوسرا سوال تقدیر کے متعلق ہے۔

۳۔ غنی اور فقیر، امیر اور غریب کا فرق کیوں؟

۴۔ جب اللہ نے ہر نبی کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تو حضرت محمد ﷺ کو پوری دنیا کے لیے کیوں بھیجا، حالانکہ ان کی زبان عربی تھی، لہٰذا آپ صرف عالم عرب کے لیے نبی ہوئے، سندھیوں کے لیے کوئی سندھی اور انگریزوں کے لیے کوئی انگریز نبی بن کر آتا وغیرہ وغیرہ؟

۵۔ کچھ جانور حلال تو کچھ حرام کیوں کیے گئے؟

۶۔ دو بہنوں کو اکٹھے نکاح میں رکھنے کی منع میں کیا حکمت ہے؟

۷۔ اگر پاکستان میں زنا کے متعلق قانون شہادت کو عمل میں لایا جاتا ہے تو اس سے زنا بڑھ جائے گا۔

۸۔ کوئی بچہ مسلمان، تو کوئی ہندو کے گھر میں پیدا ہوتا ہے تو پھر نتیجہ پر اعتراض کیوں؟

۹۔ لیلۃ القدر کے متعلق

شاہ صاحب رحمہ اللہ سے یہ سوالات عقل کے تناظر میں پوچھے گئے ہیں تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی ان سوالات کے جواب بھی عقلی طور پر دیے ہیں۔

الحمد لله الملهم للصواب الهادی إلی الطریقة سدار الجواب: الذی أعطٰی کل شیء خلقه هدی وهو الکریم الوهاب، خلق الخلائق وقدر المقادیر وربط المسببات بالأسباب وأشهد أن لا الٰه الا الله وحدهٗ لا شریك له غافر الذنب وقابل التوب شدید العقاب واشهد ان محمدًا عبده ورسوله أرسله إلی الناس کافة وختم به النبیون فلا نبی بعده إلی یوم الحساب انزل الله سبحانه وتعالٰی علیه الکتاب والحکمة وعلمه ما لم یکن یعلم وألهمه فصل الخطاب أرسل الله بالهدی ودین الحق، لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرك الکافر والزندیق والمجاهر بزندقته والدهری المرتاب، فعلی الله علیه۔ وبارك وسلم وعلی اٰله وأزواجه وعلی جمیع الأصحاب. أمابعد!

اس وقت راقم الحروف کی طرف ۹ سوالات آئے ہیں تا کہ ان کے جواب بالصواب تحریر کر کے بھیجے جائیں۔ اللہ

تعالیٰ پر امید باندھ کر اسی کی توفیق سے ان سوالات کے جوابات تحریر کر رہا ہوں، مالک جل وعلی سے دعا ہے وہ اپنے بے حد فضل وکرم سے مجھ ان سوالات کے صحیح جوابات الہام کرے، کیونکہ وہ ہی تو عز وجل ملھم للصواب ہے۔

((فھو حسبی ونعم الوکیل ونعم المولٰی ونعم النصیر۔ اللھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابه ولا تجعله علینا ملتبسا واجعلنا للمتقین امامًا))

سوال ۱: **اللہ تعالیٰ کی ذات مبارک کو عقلاً سمجھائیں اور ثابت کریں۔**

جواب: بعون الکریم الوہاب، اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے وجود کے منکر ہر زمانہ میں تمام تھوڑے رہے ہیں، اکثریت ان لوگوں کی رہی ہے جو اللہ کے وجود کے تو انکاری نہیں ہیں، لیکن ان کے ساتھ شرک کرتے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن کریم سورۂ یوسف میں ہے:

﴿وَ مَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ۝﴾ (یوسف: ۱۰۶)

''اکثر لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے بھی اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار حد درجہ کی جہالت ہے، سوائے اس آدمی کے جو اپنے عقل کا دیوالیہ کر بیٹھا ہو، دوسرا کوئی آدمی خالق کائنات وجود کا منکر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جن گمراہ قوموں کا تذکرہ کیا ہے، وہ سب کی سب مشرک تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی دہریا یا اللہ کی ذات کے وجود کا انکاری نہ تھا اور جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام ان قوموں کی طرف مبعوث ہوئے، انہوں نے توحید کی تبلیغ کی اور شرک کی تردید کی۔ اللہ کے وجود کے منکر سے شاید ہی سابقہ پڑا ہو۔ سورۂ ابراہیم میں ہے:

﴿قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ الآیة (ابراھیم: ۱۰)

ان قوموں کے رسولوں نے فرمایا کہ کیا اللہ کے بارے میں شک ہو سکتا ہے جو زمینوں اور آسمانوں کا مالک ہے؟

یہ سوال ایک عقل سلیم رکھنے والے سے ہے، یعنی ہر عقل سلیم رکھنے والا انسان کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ یہ کسی کاریگر کی بنائی ہوئی ہے۔ کیونکہ کسی عقل مند انسان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ ہی نہیں سکتی اور نہ ہی وہ اس کے ممکن ہونے کا تصور بھی کر سکتا ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی بغیر صانع کے وجود میں آ سکتی ہے، تو پھر یہ اتنا بڑا کارخانہ ہے زمین، آسمان سورج، چاند اور ستارے، پہاڑ، دریا، نہریں، سمندر، درخت، باغ اور باغیچے مطلب کہ یہ پوری کائنات بغیر خالق اور صانع کے کس طرح خود بخود وجود میں آ گئی؟ اس طرح کی بے ہودہ بکواس کوئی عقل کا اندھا ہی کر سکتا ہے لیکن کوئی عقلمند ایسی واہیات بکواس کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

تاریخ کی کتابوں میں عباسی خلافت کے وقت کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ اس وقت ایک دہریہ آیا جو کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکاری تھا اور لوگوں سے خالق کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے عقلی دلائل مانگنے لگا۔ خلیفہ نے امام

ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف آدمی بھیجا۔امام صاحب کچھ دیر سے پہنچے تو ان سے دیر سے پہنچنے کا سبب دریافت کیا گیا، امام صاحب فرمانے لگے کہ میں دریائے دجلہ کے کنارے پر پہنچا تو دیکھا کہ کئی تختے جدا جدا پڑے ہیں جب میری نظر ان تختوں پر پڑی تو یہاں سے یہ تختہ بھاگا اور وہاں سے وہ تختہ بھاگا اور آ کر آپس میں مل گئے اور ایک کشتی تیار ہوگئی، جس پر سوار ہو کر یہاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں میری تاخیر کا یہی سبب ہے۔اس پر دہریہ (خالق کا انکاری) کہنے لگا کہ واہ! آپ نے میرے مقابلہ کے لیے عالم بلایا ہے جو ایسی بے عقل بات کر رہا ہے کہ الگ الگ تختے خود بخود بغیر کسی بنانے والے کے آپس میں مل کر ایک کشتی تیار ہوگئی، یہ تو سراسر بے عقلی کی بات ہے۔اس پر امام صاحب کہنے لگے اے احمق، جاہل! تو صرف ایک کشتی کے خود بخود بننے کے انکاری ہوا اور بغیر بنانے والے کے اس کا بن جانا، بے عقلی کی بات تصور کرتا ہے ہو تو پھر اتنے بڑے کارخانے کا خود بخود بغیر کسی صانع کے بن جانا اس پر تجھے کس طرح جرأت ہوئی کہ تو یہ نظریہ رکھے، تو احمق اور جاہل ہے۔ایسا عقلی جواب سن کر دہریا لاجواب ہوگیا اور خلیفہ نے ان کی گردن مارنے کا حکم دے دیا۔

مقصد یہ تھا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وجود اور ہستی پر اس کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ ہے۔اس ذات پاک ہستی کا انکار سوائے عقل کے اندھے کوئی انسان نہیں کرسکتا۔دنیا کے مشہور بتیس (۳۲) یا اس سے بھی زیادہ سائنسدانوں نے اپنے سائنسی انکشافات اور تجربات علوم کی بنا پر یہ واشگاف اقرار کیا ہے کہ بیشک اللہ ہے۔انہوں نے اپنے اس مستحکم عقیدہ پر سائنسی تجربات اور کئی دلائل پیش کیے ہیں وہ سارے ایک کتاب میں مذکور ہیں۔وہ کتاب اصلاً انگلش میں ہے جو (Godis) کے نام سے ہے۔اس کا ترجمہ اردو زبان میں شائع ہوا ہے جس کا نام ہے ''خدا ہے'' وہ کتاب ہماری لائبریری میں موجود ہے۔

بہر حال اس حقیقت کا اتنا واضح ہونا اور اس پر تقریباً کائنات کے تمام عقلمندوں کے اتفاق کے باوجود بھی آج کل عقل کے اندھے کمیونسٹ اور سوشلسٹ ''بے حیا باش وہر چہ خواہی کن'' کے مصداق اپنے عقل کے دشمن بن کر اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنے اور ان کو سیدھے راستے سے ہٹانے کے لیے کھلم کھلا بے ہودہ سر آلاپ رہے ہیں کہ اللہ کی ذات ہے ہی نہیں اور اس کو عقل سے ثابت کرو وغیرہ وغیرہ اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورۂ نمل میں فرعون اوران کے ساتھیوں کے متعلق فرمایا کہ:

﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ (النمل: ١٤)

ان کے دلوں نے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت وصداقت کا یقین کرلیا لیکن باہر سے محض ظلم اور تکبر کی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔اسی طرح یہ ظالم بھی اگرچہ اللہ کے وجود کو دل سے مانتے ہیں اور ان کو ان کا ضمیر جھنجوڑتا رہتا ہے لیکن محض ظلم، حدود توڑنے اور نفسیاتی خواہشات کی بے لگام پیروی کر کے زبان سے بے اختیار اللہ جل واعلیٰ کی ہستی کا انکار کر رہے ہیں۔اس لیے ہم یہاں پر کوئی بھی تین دلیل سائنٹیفک نمونے پر اپنے منصف

ومزاج اور حق کے طالبوں پر عقل کی آواز پر کان لگانے والوں کے لیے تحریر کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اسی میں حق کے طالبوں کے لیے کافی اور شافی تسلی اور تشفی بخش رہنمائی کا سامان مہیا کرے گا۔ (اللھم آمین)

۱۔ یہاں پر یہ دلیل ہم گو سائنٹیفک طور پر پیش کر رہے ہیں، لیکن دراصل یہ قرآن کریم کی سورت مؤمنون کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

﴿وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَّٰهُ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِهِ لَقَٰدِرُونَ﴾ (المومنون : ۱۸)

''ہم نے نازل کیا آسمان سے ٹھیک اندازے کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اور اس کو زمین میں ٹھہرایا اور ہم اس کو جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔''

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ آغاز پیدائش میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہی وقت زمین پر اتنا پانی نازل فرمایا کہ قیامت تک کرہ ارض کی ضروریات کے لیے ان کے علم کے مطابق کافی تھا، وہ پانی زمین کے ہی نشیبی حصوں میں قرار پکڑ گیا جس سے سمندر اور نہریں وجود میں آئیں اور اسی ہی پانی سے زیر زمین یا (Sub-Soil-Water) پیدا ہوا۔

اب یہ اسی پانی کا ہی ہیر پھیر ہے کہ جو سردی گرمی اور ہواؤں کے ذریعے ہوتی رہتی ہے۔ اسی کو ہی برف پوش پہاڑ، دریا، چشمے اور کنویں زمین کے مختلف حصوں میں پھیلاتے رہتے ہیں اور یہی بے شمار چیزوں کی پیدائش اور ترکیب میں شامل ہوتا ہے اور پھر ہوا میں تحلیل ہو کر اصل ذخیرے کی طرف واپس جاتا رہتا ہے، شروع دن سے لے کر آج تک اس پانی کے ذخیرے میں نہ ایک قطرہ کمی ہوئی ہے اور نہ ہی ایک قطرہ زیادہ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے، یہ تو آیت کریمہ کا مطلب تھا، اب دلیل کی وضاحت کی جاتی ہے۔

آج مدرسہ یا اسکول کے ہر ایک طالب کو معلوم ہے کہ وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے دو گیسوں کے امتزاج یا ملنے کی وجہ سے بنا ہے اور یہ حقیقت بھی سائنسدانوں کے ہاں ہے کہ یہ سمندر وغیرہ بہت عرصہ پہلے اس طرح وجود میں آئے کہ ماضی میں ہائیڈروجن اور آکسیجن دونوں گیسیں ایک وقت میں زیادہ مقدار میں آپس میں ملیں جس کے نتیجے میں اوپر فضا سے بے حساب پانی گرا جو زمین کے نشیبی حصوں میں قرار پکڑ گیا جس کی وجہ سے سمندر وغیرہ وجود میں آگئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دہریہ یا کیمونسٹ کے کہنے کے مطابق اس کائنات کو چلانے والا یا پیدا کرنے والا جس کو اللہ کہا جاتا ہے وہ ہے ہی نہیں تو پھر وہ بتائیں کہ سائنسی انکشافات اور تحقیقات موجب جبکہ اب بھی فضا میں وہ گیسیں، ہائیڈروجن اور آکسیجن موجود ہیں تو پھر وہ آپس میں اس انداز میں کیوں نہیں ملتی جس انداز میں ماضی بعید میں آپس میں ملیں تھیں کہ جن کے امتزاج کی وجہ سے اتنی بڑی مقدار میں اوپر سے پانی گرا تھا کہ جس کی وجہ سے سمندر، نہریں یا زیر زمین پانی قرار پکڑ گیا۔ ظاہر ہے کہ آج بھی اگر وہ دونوں گیسیں آپس میں اس انداز

سے ملیں تو اوپر سے بے انتہا پانی گرنا شروع ہو جائے کہ جس سے حضرت انسان بلکہ پوری جاندار چیزوں کا کیا حشر ہوتا، یہ ہر عقلمند جان سکتا ہے۔ مگر آج وہ دونوں گیسیں اتنی بڑی مقدار میں آپس میں نہیں ملتیں، آخر کونسی ہستی ہے جس نے مخلوقات کی ضروریات کے مطابق دونوں گیسوں کو اتنے بڑے انداز میں ملا کر اتنا بڑا پانی کا ذخیرہ مہیا کیا، لیکن آج وہ ہستی ان دونوں گیسوں کو آپس میں اتنی بڑی مقدار میں ملنے نہیں دیتی۔ آخر وہ کون سی ہستی ہے؟ حالانکہ وہ دونوں گیسیں آج بھی فضا میں موجود ہیں مگر کون ہے جو ان کو اتنی بڑی مقدار میں ملنے سے روک رہا ہے؟

اسی طرح یہ بھی سوال ہے کہ آخر کون ہے جو پانی کے بخارات سے آکسیجن اور ہائیڈروجن کو الگ الگ کرتا ہے فضائی آکسیجن کو ہائیڈروجن کے ساتھ ملنے سے روک رہا ہے۔ مگر یقین رکھیے ان ملحد دہریوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دونوں گیسیں تو ایک اندھا، بہرا اور لاشعور مادہ ہے ان میں یہ سمجھ کہاں سے آئی کہ آج اگر ہم اتنی بڑی مقدار میں ملے تو جاندار چیزیں تباہ اور ہلاک ہو جائیں گی جبکہ ان مادوں میں کوئی شعور نہیں ہے تو لامحال ماننا پڑے گا کہ ایک قادر مطلق ہستی جو اپنی بے پناہ قدرت کے ساتھ ایک وقت میں مخلوقات کی ضروریات کے لیے ان کی تخلیق سے پہلے ان گیسوں کو اتنی انداز میں آپس میں ملایا جس سے بڑی مقدار میں اوپر سے پانی گرا، لیکن آج وہ قادر قدیر ہستی ان کو اتنی بڑی مقدار میں اس قدر ملنے سے روک رہی ہے وہ یہی ہستی ہے جس کو ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کہتے ہیں۔

بہرحال اس حقیقت باہرہ سے انکار کرنے کی جرأت سوائے ضدی ملحد اور عقل کے دشمن دہریہ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔

مطلب کہ اس سوال کا ان کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ یہاں البتہ وہ جان چھڑانے کی خاطر یہ کہیں گے بلکہ کہتے بھی ہیں کہ ان باتوں میں ہم کیوں پڑیں یہ کسی طرح بھی ہے، لیکن ہمیں پتا نہیں ہے تو پھر ہم ان کے پیچھے کیوں پڑیں! اس سے خاموش رہنا بہتر ہے۔

حالانکہ ہر عقل سلیم رکھنے والا انسان ان کے اس جواب سے ان کی نمایاں شکست اور مغلوبیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

﴿إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (الانعام: ۲۱)

اس آیت کا خلاصہ مولانا مودودی رحمہ اللہ کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کی سورۃ مومنوں کی مذکورہ آیت کریمہ کی تشریح سے ماخوذ ہے۔

دلیل نمبر ۲: محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب اپنی کتاب ''انسان کائنات اور قانون فطرت'' کے صفحہ نمبر ۱۰، ۱۱ پر ''انسانی جسم'' کے عنوان سے جدید علوم (تشریح انسانی متعلق) حاصل شدہ علوم ومعارف، سائنسی تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر اس طرح رقمطراز ہیں۔ ''مرد کے پیدائشی مادے سے یعنی نطفے کے ایک مکعب سینٹی

میٹر میں اڑھائی کروڑ منی کے جرثومے ہوتے ہیں اور عام حالات میں ایک دفعہ میں کتنے ہی مکعب سینٹی میٹر جتنا مادہ ہوتا ہے۔ جس میں ماہرین کے اندازے کے مطابق (۵۰) کروڑ جرثومے (منی کے زندہ جراثیم) ہوتے ہیں۔ ان نصف ارب جراثیم میں سے ہر ایک میں ایک مکمل انسان بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے، لیکن دوسری طرف صرف ایک جرثومہ عورت کے بیضے میں داخل ہوتا ہے، جو تخلیق انسانی کا باعث بنتا ہے، اسی طرح ہر بالغ عورت کے مخصوص حصے میں (۴) چار لاکھ کچے بیضے موجود ہوتے ہیں، لیکن ان میں صرف ایک بیضہ پکہ ہو کر اپنے مقرر وقت پر ظاہر ہوتا ہے، تاکہ مرد کا کوئی ایک جرثومہ اس میں داخل ہو کر ایک مکمل حیاتی کا یونٹ بن کر حمل کی صورت اختیار کرے، یہاں پر ڈاکٹر صاحب کی عبارت پوری ہوئی۔

اس عبارت سے اللہ خالق کائنات کے وجود پر دلیل ملتی ہے جبکہ سائنس اور جدید علوم انسانی جسم کی تشریح کے متعلق تھی۔ حقیقت ثابت معلوم ہوئی کہ مرد کے ایک دفعہ کے نطفہ میں نصف ارب جرثومے ہوتے ہیں جن میں ہر ایک جرثومے میں ایک مکمل انسان بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح عورت کے مخصوص حصہ میں چار لاکھ کچے بیضے موجود ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مرد کے نصف ارب جرثومے میں سے صرف ایک ہی جرثومہ عورت کے بیضے میں کیوں داخل ہوتا ہے؟ باقی جرثومے کیوں داخل نہیں ہوتے؟ وہ کونسی طاقت ہے جو باقی جراثیم کو عورت کے بیضے میں داخل ہونے سے روکتی ہے؟ بذات خود ان جراثیم میں تو کوئی شعور نہیں ہوتا اور نہ ہی مرد کے نطفے (یا پیدائشی مادہ) میں کوئی سمجھ یا شعور ہوتا ہے۔ پھر کون ہے جو ان کو کنٹرول کرتا ہے اور ایک سے زائد جراثیم کو عورت کے بیضے میں داخل ہونے سے روکتا ہے؟ اسی طرح عورت کے مخصوص حصے میں چار لاکھ کچے بیضے ہوتے ہیں، ان میں صرف ایک ہی پکا ہو کر کیوں ظاہر ہوتا ہے؟ زیادہ کیوں نہیں پکے ہو کر ظاہر ہوتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ اگر مرد کے ایک سے زیادہ جرثومے عورت کے بیضے میں داخل ہو جائیں یا عورت کے بھی ایک سے زیادہ کچے بیضے پکے ہو کر مرد کے جرثومے کو قبول کرنے کے لیے ظاہر ہو جائیں تو عورت بیچاری کا کیا حشر ہوتا یہ ہر عقلمند جانتا ہے، اسی حشر یا نقصان کا شعور بے شعور مادے میں کہاں ہے، بہر حال اس سوال کا جواب ان عقل کے دشمنوں کے پاس کہاں سے آیا، ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

اگر اللہ خالق کائنات قادر مطلق کی ہستی کے قائل ہو جائیں تو اس سوال کا فوراً حل مل جائے گا، یعنی وہ اللہ کی ذات ہے جو مرد کے جراثیم میں سے صرف ایک جرثومے کو عورت کے بیضے میں داخل ہونے کے لیے تیار کرتا ہے اور باقی اجزا کو نہیں چھوڑتا۔

اسی عورت کے تمام بیضوں میں سے صرف ایک کو پکا کر کے مرد کے جرثومے کو اخذ کرنے کے قابل بناتا ہے، باقی بیضے اس کے امر کے مطابق کچے ہی رہتے ہیں اور مرد کے جرثومے کو قبول کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار ، اس سے ایک بخوبی اندازہ لگاسکتے ہیں کہ آج کل کی سائنس خود اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلائل فراہم کر رہی ہے اور اسلام کے دین حق ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔

دلیل نمبر۳: اس کائنات کے خلا میں کیمیا اجرام فلکی حرکت کر رہے ہیں۔ سورج، چاند، زہرہ، مشتری، زحل، مریخ سفید کہکشاں وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم تو کہتا ہے:

﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۳۳)

یہ سارے اجرام فلکی اس خلا میں تیر رہے ہیں۔ سائنسدان اور جغرافیہ کے ماہرین کی بھی یہ تحقیق ہے کہ سورج اپنی مدار پر گھوم رہا ہے، چاند زمین کے اردگرد گھومتا ہے۔ باقی دوسرے بے شمار سیارے اور ستارے اپنے اپنے دائرے میں حرکت کر رہے ہیں اور ان کی تحقیق کے مطابق کئی ہزار سال پہلے یہ وجود میں آئے اور اس وقت سے لے کر آج تک حرکت کر رہے ہیں۔ زمین بھی ان کی تحقیق کے مطابق سورج کے اردگرد گھوم رہی ہے اور خود اپنے اردگرد بھی یومیہ حرکت کر رہی ہے، اب یہ اللہ خالق اکبر کے انکاری بتائیں کہ یہ اتنے بڑے اجسام والے کئی ہزار سالوں سے اپنے دائرے میں حرکت کر رہے ہیں اور ان میں کوئی بھی دوسرے کے دائرے میں ذرا برابر داخل نہیں ہوتا، کوئی بھی اپنی حرکت طلوع یا غروب میں کسی بھی موسم میں ایک سکینڈ بھی آگے پیچھے نہیں کرتا۔ اتنا بڑا انظام آخر کس طرح چل رہا ہے، وہ کون ہے جو اتنی بڑی جسامت والی مخلوق کو خلا میں ایک مقرر دائرے (Sphere) میں کنٹرول کیے ہوئے ہے کہ ایک انچ بھی اپنے مدار سے نہیں ہٹتے۔ کیا اللہ قادر مطلق کے علاوہ کوئی ہے؟ یا اس بے پناہ قدرت رکھنے والے کے سوائے ممکن ہوسکتا ہے؟ اگر تھوڑی بھی عقل والا سوچے گا تو فوراً بول اٹھے گا ہرگز نہیں، ان عظیم اجرام میں سے کوئی بھی اتنے بڑے لمبے عرصے اور لامحدود وقت تک اپنے مدار پر اتنا کھڑا نہیں ہوسکتا کہ ایک بال بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔

علاوہ ازیں! اتنے بڑے ہائل شاوی اجرام حرکت تو بعد کی بات ہے، مگر اولاً تو ان کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وجود میں کیسے آئے؟ کیونکہ کائنات کی کوئی بھی چیز خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی وہ بغیر صانع کے وجود میں نہیں آسکتی اور نہ ہی کبھی آئی ہے، تو پھر پہلے وہ جواب دیں کہ وہ وجود میں کس طرح آئے؟ ان کے پاس معقول جواب کوئی نہیں ہے۔ صرف حقیقت ثابت کو ماننے سے انکار کے شوق میں ایسی الٹی سیدھی باتیں کریں گے جس سے ہر سمجھدار انسان فوراً اندازہ لگا لے گا کہ یہ صواحب محض فالتوں باتیں کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور محض دفع الوقتی اور سمجھدار لوگوں کو بے وقوف بنانا اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہی ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ ان عظیم اجرام کے چھوٹی چھوٹی مثالیں آج سائنس سے فراہم کر دیں عصری سائنسدانوں نے مصنوعی سیارے بنا کر زمین کے چاروں طرف روانہ کر دیئے ہیں، جو اس کے اردگرد گھومتے ہیں کیا یہ مصنوعی سیارے خود بخود وجود میں آگئے؟ ہرگز نہیں۔ بغیر صانع کے خود بخود بن کر اور خلا میں حرکت کرنے لگے؟ یا ان کے بنانے کے بعد خود بخود خلا میں اڑنے لگے،

ہرگز نہیں بلکہ ان کے موجد نے ان کو حرکت میں لائے۔ کیا یہ مثالیں ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟

یعنی جس طرح یہ مصنوعی سیارے یا راکٹ خلا میں بنانے والوں نے بنا کر چلائے اسی طرح یہ عظیم اجرام فلکی کو بھی ایک خالق اکبر نے اپنی قدرت باھرہ سے پیدا کر کے ان کو اپنی مدار میں متحرک کر بنا دیا ہے اور اس خالق اکبر قادر مطلق کا نام ''اللہ'' ہے۔ سائنسدانوں نے میزائل وغیرہ جو کہ ریموٹ کنٹرول (Remote Cnotral) طریقہ پر ہیں، یعنی ایک خاص جگہ یا کنٹرول کرنے کا مقام ہوتا ہے وہاں سے یہ فائر کیے جاتے ہیں، جو جہاز وغیرہ کو نشانہ بنا کر اس کی تباہی کا سبب بنتے ہیں اور وہ کنٹرولنگ اسٹیشن سے طاقتور دوربینی (Powerful tele scope) کے ذریعے مشاہدہ بھی کرتے ہیں کہ وہ واقعی نشانے پر لگے ہیں یا نہیں۔ اس ایجاد سے بھی ظاہر ہوا کہ اول یہ میزائل کن کاریگروں نے بنائے، پھر ان کے رکھنے والوں نے ایک خاص نشانے پر فائر کیا۔ نہ یہ سارے خود بخود وجود میں آئے اور نہ ہی وجود میں آنے کے بعد خود حرکت میں آئے اور نہ ہی مطلوبہ جگہ پر خود بخود جا کر لگے، یہ بالکل واضح ہے، پھر آخر اس کائنات کے ان اتنے بڑے اجرام فلکیہ کے بارے میں یہ احمقانہ خیال ان حضرات کو کس طرح آیا کہ وہ خود بخود وجود میں آئے اور خود ہی اپنے دائرے میں متحرک ہو گئے! ہزاروں سال گزرنے کے باوجود نہ ان کی حرکت میں فرق آیا اور نہ ہی اپنے مدار سے ایک انچ بھی ہٹے ہیں۔

کیا یہ عقلمندوں کی گفتار ہے یا مجنون کی؟ یہی حقیقت ہے جس کی طرف یہ آیت کریمہ رہنمائی کرتی ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَ لَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾ (الفاطر: ٤١)

یعنی تمام فلکی اجرام اور زمین کو اللہ تعالیٰ ہی اپنے مدار میں اپنی جگہ پر روکے ہوئے ہے۔ ورنہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹتے تو کوئی بھی ان کو روک نہیں سکتا۔

اور اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹتے تو جاندار اشیاء کا کیا حال ہوتا، اس کے تصور کرنے سے ہی کپکپی شروع ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ ''بیشک اللہ تعالیٰ بردبار اور گناہ بخشنے والا ہے۔'' یعنی اسی وجہ سے بندوں کے گناہوں کے باوجود ان اجرام کو روکے ہوئے ہے اور ان کو چھوڑتا نہیں ہے، اس لیے کہ مخلوق نہ تباہ ہو جائے۔ انسان کی کوئی بھی چیز کتنی ہی بڑی محنت اور کاریگری کے ساتھ کیوں نہ بنائی گئی ہو خواہ مشینری ہو، انجن ہو، ہوائی جہاز ہو یا کوئی اور چیز ہو، لیکن وہ دائمی طور پر نہیں چل سکتی۔ ایک مکینک کسی مشین کو چلا تو دیتا ہے، لیکن وہ چل چل کر خراب یا نقص والی بن جاتی ہے، لیکن وہ مشین نہ خود بنی اور نہ ہی خود بخود چالو ہوئی، اس کو چلایا بھی کسی واقف نے، مگر پھر بھی ایک وقت پر وہ خود بخود خراب ہو جاتی ہے۔ آٹو میٹک (Auto matic) گھڑیاں ہیں لیکن ان پر بھی ہمارا تجربہ ہے کہ وہ بھی ایک وقت پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ہوائی جہاز دیکھو کیسے خلا کو چیر کر چلتا ہے، لیکن اگر ان میں کوئی نقص پیدا ہوا یا چلتے چلتے اگر کھڑا ہوا تو وہ دھڑام سے زمین پر گر کر خود بھی تباہ ہوگا اور اس میں سوار مسافر بھی

اجل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیا ان تمام واقعات کا ہم مشاہدہ نہیں کرتے؟ بہر حال ان تمام عجیب وغریب اشیاء کو کس نے بنایا اور پھر چلایا اور ان پر کنٹرول بھی کیے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی کبھار حوادثات کا شکار ہو جاتے ہیں تو کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ اتنے بڑے اجسام سورج اور اس کا نظام شمسی، چاند اور ستارے وغیرہ اور زمین ہزاروں سالوں سے چل رہے ہیں، لیکن پھر کیوں نہیں وہ رکتے اور نہ ہی ان میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی اپنے مدار سے ایک بال جتنا بھی اِدھر اُدھر ہوتا ہے۔ ان کے طلوع وغرب کا نا ہم مقرر ہے، جس میں کبھی ایک سیکنڈ تفاوت نہیں ہوا ہے اور ان کی مقررہ رفتار کو دیکھ کر سورج کے طلوع اور غروب اوقات (ہر موسم میں) نقشے کی صورت میں بنائے جاتے ہیں جو کہ تقریباً صحیح ہوتے ہیں اور اسی حرکت اور ہیر پھیر کی بنیاد پر لوگوں کو خبر ہے کہ فلاں مہینے میں گرمی اور فلاں مہینے میں سردی آئے گی۔

کیا یہ سارا نظام جو کہ اتنا مستحکم اور مضبوط ہے اتنے لمبا عرصہ گزرنے کے باوجود اس میں کوئی تفاوت نہیں کیا؟ یہ سب کچھ بغیر صانع کے وجود میں آیا، یہ بغیر قادر مطلق کے باقاعدہ منظم طریقے سے چل رہا ہے؟ کیا یہ بات انسانی عقل میں آنے جیسی نہیں ہے ایک حقیقت پسند انسان فوراً پکار اٹھے گا، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ بہر حال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کے وجود کے دلائل کائنات کے ذرے ذرے میں آنکھیں رکھنے والوں کے لیے موجود ہیں۔ باقی شیخ سعدی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق ؎

گر نہ بیند بروز شپر چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اگر دن میں چمگادڑ دیکھ نہیں سکتا تو اس میں سورج کا کوئی قصور نہیں ہے، اگر ان صاحبوں کو یہ دلائل نظر نہیں آتے تو اس میں اس حقیقت ثابتہ کا کیا قصور ہے، ایسے صاحب اپنی بیمار آنکھوں کا علاج کروائیں، اگر غور کیا جائے تو دوسرے دلائل بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن اس جگہ پر دلائل کا احصار (شمار) مطلوب نہیں ہے (اگر در خانہ کس است یک حرف بس است) عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

طوفان نوح لانے سے اسے چشم فائدہ؟
''دو اشک بھی بہت ہیں اگر اثر کریں۔'' (واللہ اعلم)

سوال نمبر ۲: کا جواب جو اللہ کی توفیق سے پیش خدمت ہے۔ **حسبنا اللہ ونعم الوکیل**، یہ سوال تقدیر کے بارے میں ہے۔

اللہ کی قسم اگر یہ سوال ملحدوں یعنی دین اسلام کے دشمنوں کی طرف سے نہ ہوتا تو اپنے قلم کو ہرگز حرکت میں نہ لاتا، کیونکہ اس مسئلہ میں بے جا غور وخوض مومن کے لیے بے حد نقصان دہ ہے، لیکن دین اسلام کے دشمنوں کی سازش اور عوام کو گمراہ کرنے کی سوچی سمجھی ناپاک کوشش کو مدنظر رکھ کر اس موضوع پر قلم اٹھاتا ہوں اور اللہ سبحانہ و

تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے حق کا کلمہ کہنے کی توفیق عطا فرمائے اور کلمہ حق تحریر کرنے کے لیے راہ آسان بنائے اور اپنے فضل سے میری ہر جگہ پر رہنمائی فرمائے۔ اللھم آمین

کوئی بھی کام کرنا ہوتا ہے یا کوئی جگہ بنانی ہوتی ہے، کوئی گاؤں یا شہر آباد کرنا ہوتا ہے یا کوئی کارخانہ وغیرہ جاری کرنا ہوتا ہے مطلب کہ کوئی بھی اسکیم بروئے کار لانی ہوتی ہے تو اول اس کا نقشہ، اس کے اجزا، اس کے تمام پرزوں اور اس کے لوازمات اور ان میں واقع اشیاء کی ترتیب اسی طرح اس کے متعلق کئی اشیاء کا تصور اور خاکہ، نقشہ یا نمونہ، ان کی ترتیب وترکیب، ان کے اجزا ولوازمات کے موضوع کی تقسیم اور ان کی ظاہری ہیئت اور کیفیت پورے کی پوری اولاً تو ذہن میں بٹھانا پڑتی ہے، اس کے بعد اس مکمل خاکہ کو سپرد قرطاس کیا جاتا ہے بعد ازاں اس کے مطابق اس اسکیم کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو پوری طرح ذہن میں لانے کے بعد اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں، اللہ کی توفیق سے۔ پہلے چند اہم نکتے ذہن نشین کر لیجیے۔

الف۔ انسان کے سوا باقی پوری کائنات کا جس کا مشاہدہ کرتے ہیں انسان کے لیے ہی پیدائش ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (البقرة: ٢٩)

''اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے جو کچھ زمین میں ہے۔''

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ﴾ (الجاثیة: ١٣)

''اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو آسمانوں میں اور جو زمینوں میں ہے اس کو تابع بنایا۔'' بہرحال اس کائنات کے تمام اجرام علویہ وسفلیہ انسان کے تابع بنائے گئے ہیں اور انسان کے کام، منفعت اور فائدے کے لیے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج انسان چاند وغیرہ پر کمند ڈال رہا ہے، یعنی یہ سب کچھ جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ سارا انسان کے کام آتا ہے، اگر یہ نہ ہوتے یا کچھ وقت کے لیے انسان کی دسترس سے دور ہو جاتے تو انسان بڑی مصیبت میں پڑ جاتا، لیکن اگر انسان نہ ہوتا تو ان اشیاء کو کوئی نقصان نہیں ہوتا، کئی انسان آ رہے ہیں، اور جا رہے ہیں لیکن انسان کی آمد ورفت کا ان پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، کسی بڑی ہستی کی موت پر کبھی ایسا نہیں دیکھا گیا ہے کہ سورج نے طلوع ہونا چھوڑا ہو یا دریا نے بہنا بند کیا ہو، یا سیارات اور ستارے غیر متحرک ہوئے ہوں بلکہ وہ اپنی مقرر ڈیوٹی ادا کرتے رہتے ہیں، لیکن اگر سورج طلوع نہ ہو یا لمبا عرصہ غائب رہے یا دریا بہنا بند یا کم پانی آئے تو خود سوچو کہ حضرت انسان کا کیا حال ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ پوری کائنات انسان کے لیے ہے اور اس کی ضروریات کو پورا کر رہی ہے، مگر خود حضرت انسان ان میں سے کسی کے بھی خاص کام کے لیے نہیں ہے اگر وہ انسان چلا جائے تو ان پر کوئی نقصان یا اثر نہیں ہوتا وہ اپنا دائمی فرض بجالاتے رہتے ہیں۔

(ب) جب اتنی بڑی وسیع کائنات انسان کے لیے ہے اور انسان ان کے کسی کام کا نہیں ہے تو پھر خود انسان کس

کام کا ہے، جب انسان اس کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ پوری کائنات سے اشرف ہے، کیونکہ حاکم جن پر حکمرانی کرتا ہے وہ ان سے اعلیٰ ہوتا ہے تو پھر کیا عقل اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ کارآمد ہے اور وہ ہمارے لیے مفید خدمت سرانجام دے رہا ہے اور اس کا حکمران نکما اور بالکل بے مقصد و بے غرض وغایت نفع اور فائدہ سے یکسر خالی اور محروم ہے؟ عقل ہرگز اس بات کو تسلیم نہیں کرے گی، پھر سوچنا ہے کہ اس حکمران انسان کی تخلیق و پیدائش کی غرض وغایت کیا ہے، اس کو کیا فرائض انجام دینے ہیں؟ اس کا جواب بھی قرآن میں موجود ہے۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات : ٥٦)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔''

یعنی جس طرح یہ پوری کائنات انسان کی خدمت کر رہی ہے اور اس کے فائدے کے لیے ہے، انسان جو بھی کام ان سے لینا چاہتا ہے وہ اس کے اس ارادے کی تکمیل سے انکار نہیں کرتے بلکہ وہ جو کام بھی چاہے جائز ہو یا ناجائز لینا چاہے گا وہ ان کے حکم کی بجا آوری سے سرتابی نہیں کرتے۔ اسی طرح انسان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی بجا لانے کے لیے اس خطہ ارضی پر آیا ہے تاکہ وہ اپنے حقیقی خالق بے حد رحم وحلم والے رب کے ہر معاملے پر کام کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں مرضی رکھے اور اس کے حکم ارشاد رہنمائی اور مرضی کے مطابق چلے، انہی نکتوں کا نتیجہ اللہ کی کتاب ورسل علیہم السلام اور اس کے اوامر ونواہی زندگی کی طرز بود وباش کے متعلق رہنما اصولوں کی صورت میں اس دھرتی پر تشریف لائے کیونکہ جب انسان کو اللہ کی مرضی کے مطابق چلنا تھا تو لامحالہ اس کو یہ علم بھی دینا تھا کہ زندگی کے گوناگوں شعبوں کے متعلق اس کے رب کی کیا مرضی اور حکم وارشاد ہے، اس کے لیے وحی کی ضرورت تھی۔

(ج) انسان اس دنیا میں ایک بڑی آزمائش اور امتحان گاہ میں ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الکھف : ٧)

زمین پر جو کچھ ہے اس کو ہم نے ان کے لیے خوبصورت بنایا تاکہ انسان کی آزمائش کی جائے کہ کون ہے جو نیک عمل کرتا ہے۔ یہ آزمائش اس لیے نہ تھی کہ اس کو پتہ ہی نہ تھا، بلکہ اس لیے کہ یہ اس کا دستور ہے کہ وہ کسی کو بھی بغیر عمل خواہ نیک ہو یا یہ کہ محض اپنے علم کے مطابق جزا اور سزا دے بلکہ کوئی بھی انسان جب بد ارادہ کرتا ہے تو اس وقت تک اس پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا جب تک ارادے کے مطابق عمل نہ کر لے۔ اسی طرح سورۂ ملک میں فرمایا:

﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک : ٢)

''''وہ اللہ مالک الملک جس نے موت اور حیاتی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ کون ہے تم میں سے جو نیک عمل کرتا ہے۔''

بہر حال یہ دنیا امتحان کی جگہ یا Examination hall ہے، تاکہ ان لوگوں کا امتحان لیا جائے کہ وہ جس

عظیم مقصد کے لیے اس کرہ ارض پر آئے ہیں وہ مقصد کس طرح انجام دیتے ہیں، آیا بطریقہ کمال یا کم یا اس سے زیادہ یا بالکل اصل مقصد کے خلاف۔

۴: جب یہ دنیا امتحان گاہ اور ابتلاء کا مقام ہے تو ظاہر ہے کہ انسان کے سامنے دونوں راستے آئیں خیر وشر، نیکی اور بدی کی سمجھ آئے اور ان میں فرق کا بھی الہام کیا جائے اللہ کی پسند اور ناپسند کی معلومات ہو۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن کریم ان دو آیات کریمہ میں ارشاد کیا ہے:

﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (البلد : ۱۰)

''انسان کو دونوں راستے خیر وشر کے دکھائے۔''

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ (الشمس : ۸)

''اور نفس انسانی کی طرف برائی اور پرہیز گاری کا بھی الہام کیا۔''

جب انسان کے سامنے دونوں راستے ہیں اب چوائس اور انتخاب کا سوال پیدا ہوا، یعنی دونوں میں سے کس راستے انتخاب کرے، اس لیے آزمائش خاطر یہ بھی ضروری تھا کہ انسان کو اتنا اختیار ملے کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی مرضی اور ارادے کے مطابق اختیار کرے۔ اسی لیے اس کو اپنے کسی بھی ارادے کو عمل میں لانے کی قوت اور اختیار دیا گیا ہے، آزمائش کے لیے ضروری ہے کہ جس کو آزمایا جائے اس کو دونوں اطراف میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی قوت ہو ورنہ اگر اس کو غلط یا برائی کا راستہ اختیار کرنے کا ایک قسم کا اختیار ہی نہ ہوتا تو پھر انسان جمادات کی طرح ہوا یا مشینی صفت انسان ہوا جس کو نہ اپنا شعور ہے نہ کوئی ارادہ یا اختیار۔ چلانے والے نے اس کو چلا دیا تو چل رہی ہے جب بند کیا تو بند ہوگئی، نہ اپنے ارادے سے حرکت میں آئی اور نہ ہی اپنے ارادے سے حرکت کو بند کیا ایسے انسان کے لیے جزا وسزا کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مثلاً کوئی انسان مجنون یا دیوانہ ہے تو مرفوع القلم ہے، کسی کام کی وجہ سے شرعاً اسے سزا نہیں، کیونکہ اس میں عقل نہیں ہے، لہٰذا اس کے کام بے اختیار ہیں، عقل وارادہ ماتحت نہیں ہیں۔ بہر حال انسان کو صاحب الارادۃ والاختیار بنایا گیا ہے، تاکہ وہ اپنے اختیار سے کسی بھی راستے کا انتخاب کرلے اسی کے مطابق چلے اور پھر اس کا نتیجہ دیکھے۔

یہی ارادہ اور اختیار کسی حد تک آزادی کے ساتھ سارا امتحان اور اس کی جزا وسزا کی بنیاد ہے۔

۵: یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان کو اتنا اختیار دے کر اس امتحان حال میں کیوں لایا گیا ہے؟ یا ان کے آزمائش کی کیا ضرورت تھی؟

اس کے لیے یہ گزارش ہے کہ اول تو یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ذاتی معاملہ ہے، ہم اس کے بارے میں کیا قیاس آرائی کر سکتے ہیں، تاہم ہمارے ہے ناقص علم اور فہم میں جو حقیقت آئی ہے وہ یہاں عرض رکھتے ہیں۔ (واللہ اعلم) انسان کی اس طرح صورت گری کر کے اسے گوناگوں لیاقتوں سے مزین بنا کر مختلف قوتوں سے مسلح بنا کر اور

قدرے اختیار دے کر اس عالم رنگ و بو میں آزمائش کے لیے آمد سے اللہ تعالیٰ کی کتنی صفات حمیدہ کا ظہور ہوا اللہ تعالیٰ تو اپنی ذات پاک میں غنی وحمید ہے، لیکن اگر ان صفات اور لیاقتوں والا انسان نہ ہوتا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت عدل، رحم فضل، کرم، حلم بردباری، غفاریت والی صفت اور ہر چیز کے خالق ہونے کی صفت (پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ ساری کائنات انسان کے لیے ہی پیدا کی گئی ہے) بندوں سے محبت کرنا، عفو ودرگزر سے کام لینا کی صفات وغیرہ وغیرہ آخر وہ کس طرح ظہور پذیر ہوئیں۔ ملائکہ (فرشتے) تو پہلے پیدا تھے مگر صرف ان کی پیدائش سے یا ان کی موجودگی سے اوپر ذکر کی گئی بے شمار صفتوں کا ظہور نہ ہوا کیونکہ ان فرشتوں کو کوئی اختیار نہیں ہے، لہٰذا وہ کون سی خطائیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کو صفت غفاریہ سے معاف کرتے، ان میں ظلم کا مادہ نہ تھا اور نہ ہی اس کو اختیار کرنے کی ان میں قوت تھی، پھر اللہ تعالیٰ کی صفت عدالت کا کس طرح ظہور ہوتا۔ علی ہذا القیاس دوسری کئی صفات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اگر اتنی ساری مخلوق مع انسان پیدا نہ کرتے تو ان کو کون پہچانتا اگر چہ وہ خود تو ہمیشہ ہی سے اپنی ذات کے اعتبار سے غنی، حمید اور مجید تھا۔ اسی طرح اس بااختیار انسان کو اس عالم میں بھیجنے سے کیا وجود میں آیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے متعلق فرشتوں کو فرمایا:

﴿اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۳۰)

''یعنی انسان میں کیا کیا خوبیاں ہیں وہ کیا کیا کر سکتا ہے، اس کو کتنا بڑا علم دیا گیا ہے، اس میں کتنی سمجھ رکھی ہے۔ اس کا علم آپ کو نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کا ہی نتیجہ ہے کہ انسان زمین تو زمین مگر اجرام علویہ کے تسخیر کے احوال جاننے کے لیے کمربستہ ہو گیا ہے جن میں کچھ تک تو قدرے پہنچ بھی گیا ہے اور کیا کیا عجیب وغریب چیزیں ایجاد کر دیں، یہی روز بروز کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا ہے کیا یہ سارا کچھ علم کا کرشمہ نہیں ہے؟ بہر حال اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے بے انتہاء کا ظہور بھی انسان کی تخلیق سے ہوا۔ مشہور مقولہ ہے ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' یعنی جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو اس کے حل کے لیے انسان کوئی نہ کوئی ایجاد یا راستہ تلاش کرتا ہے تاکہ اس کی وہ ضرورت وحاجت پوری ہو جائے، اب سوچنا چاہیے کہ اگر ان ضرورتوں اور صفتوں والا انسان نہ ہوتا تو اس دنیا کی کسی بھی چیز سے کوئی ایجاد نہ ہوتی، اس کائنات کے ذرے ذرے میں بے شمار قوتیں اور فائدے مالک کائنات نے رکھے ہیں۔ ان کا کبھی بھی ظہور نہ ہوتا، لیکن جب جب انسان کو ضرورتیں لاحق ہوتی گئیں۔ تب تب وہ اس کائنات کے کیمیاء مظاہر اور اشیاء سے وہ خفیہ قوتیں اپنے تجربہ اور سائنس کے علم سے ظاہر کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور اسی ابتلا اور بااختیار ہونے کی صورت سے انسان میں باقاعدہ ترقی کرنے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے والا جذبہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ مشینی صفت مخلوق کیسی بھی ہوتی اس سے ایسی ایجادات وجود میں نہ آئیں۔ وہ تو اپنی حرکت میں لانے والی تحریک پر ایک خاص سمت یا ڈائریکشن پر چلتا رہتا، دوسری طرف توجہ کرنا یا ترقی کرنے کا شعور ئی نہ ہوتا۔ لہٰذا ترقی یا گونا گونی اور رنگا رنگی طرز و بود و باتوں کا

تو خیال ہی نہیں آتا کیا یہ معمولی بات ہے؟ کیا یہ بڑی حکمت نہیں ہے جو کہ ایک حکیم علیم ہستی کی طرف رہنمائی کر رہی ہے؟ اس پر خوب غور کرنا چاہیے۔

و: انسان کو اتنے اختیار اور ارادے کو عمل میں لانے کی آزادی کی وجہ سے اس عالم میں لامحالہ نمونے ظاہر ہونے تھے کوئی خیر کو تو کوئی شر کو اختیار، کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ تو کوئی اسفل السافلین کی طرف جانے کی سعی کرتا۔ کوئی بلند اخلاق کا مجسمہ ہوتا تو کوئی بداخلاقی کی بدترین مثال ہوتا۔ کیونکہ بدی کا اختیار اس سے سلب کیا جاتا تو آزمائش کا بنیادی ختم ہو جاتا۔ جس طرح تفصیلاً ذکر کر چکے ہیں۔

ذ: اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت بالکل صحیح وسالم اور دین اسلام کے مطابق بنائی ہے جس طرح قرآن میں ہے:

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (الروم: ۳۰)

''پس آپ اپنے چہرے کو یا توجہ کو دین پر قائم رکھیں اس حال میں کہ تو باطل سے حق کی طرف جانے والا ہوتا۔''

یعنی وہ دین اسلام جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی فطرت بنائی ہے۔ صحیح حدیث بخاری وغیرہ میں ہے کہ:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ)) (الحديث)

''ہر بچہ اپنی صحیح فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے۔''

اسی طرح سورۃ التین میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝﴾ (التين: ٤)

''بیشک ہم نے انسان کو ایک بہترین بناوٹ میں پیدا کیا ہے۔''

بہر حال کسی بھی ماحول یا خاندان میں بچہ کا تولد ہو مگر وہ اپنی ماں کے پیٹ سے صحیح فطرت لے کر باہر آتا ہے، یعنی کسی کو مسلمان یا کافر بنا کر پیدا نہیں کرتا، لیکن اس عالم میں آنے کے بعد ماحول، سوسائٹی، خاندان اس کے رسم ورواج اور اس کے علاوہ دوسرے کئی اسباب اس کی فطرت کو بگھاڑنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ان کا فوری تدارک ہوا تو زائل ہو جاتے ہیں ورنہ آگے چل کر وہ لاعلاج اسٹیج پر پہنچ جاتے ہیں۔ (اعاذنا الله منها)

بہر صورت انسانی فطرت تو سب کی صحیح ہوتی ہے، اس میں کوئی فرق نہیں، البتہ انسانی لیاقت صلاحیت، استعداد اور انسان میں رکھی ہوئی قوتوں میں کافی فرق ہوتا ہے، ایک انسان میں قوت برداشت بہت زیادہ ہوتی ہے تو کئی انسانوں میں نا ہونے کے برابر ہوتی ہے، کسی انسان میں کوئی خاص لیاقت ہوتی ہے تو دوسرا اس سے محروم ہوتا ہے، کوئی انجینئر ہے تو کوئی کامیاب ڈاکٹر، کوئی ماہر وکیل ہے تو کوئی خطابت کا شہسوار، کوئی حکمرانی، بادشاہی یا امارت وسیادت کا حامل ہے، تو دوسری طرف کوئی مزدوری کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک انسان جسمانی قوت میں

اوپر ہے تو دوسرا نہایت ہی کمزور ہے۔ اسی طرح خارجی امور کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدرتی لحاظ سے اس میں بھی مساوات نہیں ہے۔ ایک مالدار اور بڑا سرمایہ دار ہے تو دوسرا فقیر اور محتاج ہے، ایک شخص کے بے شمار اعوان، انصار، عزیز و اقارب، خاندان وقبیلہ کے بے شمار افراد ہیں جو ہر معاملے میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں تو دوسرے بیچارے کا کوئی یار دوست نہیں ہوتا۔ ایک طاؤسی تخت کی زینت بنا ہوا ہے تو دوسرے کو کوئی جوتوں کی جگہ پر بیٹھنے نہیں دیتا۔ درحقیقت یہ اختلاف اس عالم کی زیب وزینت ہے جس طرح شاعر ذوق نے کہا ہے ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

مگر یہ اختلاف مصنوعی نہیں بلکہ قدرتی ہے۔ اس لیے کہ زندگی کا ہر شعبے میں انسان کی آزمائش ہو سکے جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ﴾ (الانعام: ١٦٥)

''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے ہی بعض سے بعض کو بلند کیا تا کہ جو کچھ تمہیں عطا کیا ہے اس کے متعلق تمہاری آزمائش کرے۔''

ظاہر ہے کہ اگر دنیا کے تمام انسان غنی اور مالدار ہوتے تو مالی یا اقتصادی اور اجتماعی تعاون کے لحاظ سے ان کی کس طرح آزمائش ہوتی؟ اگر سارے طاقتور ہوتے یا سارے بے پرواہ ہوتے تو کسی محتاج یا کمزور، بیوہ اور مسکین کی مدد کر کے اس خوبی اور کمال کو انسان ذات کس طرح حاصل کرتی؟ حالانکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا ابتلاء ہونا تھا، اسی طرح اندرونی قوتوں میں بھی مساوات ہوتی۔ ایک دوسرے کا بر وتقویٰ میں تعاون کا سلسلہ ناپید ہوتا تو پھر کسی انسان کو کسی بھی صفت کی تعریف وثنا کا موقع ہی نہ ملتا۔ دنیا ایک خشک اور بہجت ورونق سے عاری ایک اکتانے والی یکسانیت کا بے ڈھنگہ نمونہ بن جاتی۔ ہم انسانوں کی یہ حالت ہے کہ کسی بھی معاملے یا کام یا امیر میں یکسانیت کو ہرگز پسند و برداشت نہیں کرتے۔ اسی لیے مالک الملک نے ہماری زندگی کو نیک دلچسپ نمونہ عطا کیا ہے، جس کے کسی بھی شعبے میں یکسانیت نہیں ہے۔ اللہ اکبر! اور اسی اختلاف کی وجہ سے لوگوں کے اعمال، عقائد، تصورات لائحہ عمل طریقہ کار حتیٰ کہ نیک وبد میں بھی بڑا فرق اور تفاوت وجود میں آ گیا جو ابتلاء کے لیے اختیار دے کر اس عالم رنگ وبو میں انسان کو بھیجنے کا لازمی نتیجہ تھا۔

ج: جب انسان کے تمام افراد کی فطرت صالح وسالم تھی تو پھر وہ خیر وشر میں کیسے تقسیم ہوا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے اس دہری تقسیم کے بھی کئی اسباب ہیں، مثلاً ماحول سوسائٹی خاندانی رسوم وروایات، بری صحبت اور ساتھ۔ جس میں زیادہ لیاقت تھی وہ بارگاہ الٰہی میں زیادہ مقبول ہوا یا کسی دنیاوی

اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوا مگر دوسرے میں وہ لیاقت نہ تھی یا کم تھی اس کو پہلے کے مرتبہ ومقام پر حسد ہوا اور نتیجتاً اس کوئی نہایت ہی غلط قدم اٹھا اور اپنے محسود کی جان کے در پے ہوا۔ یا اسے نقصان پہنچانے کی سوچنے لگا۔ ایک کو جسمانی طاقت بے پناہ ملی ہوئی تھی، جس نے انے اختیار کے مطابق اس کو غلط استعمال کیا اور اپنے کتنے ہی ہم نوعوں کی تباہی کا باعث بنا، کسی کو کوئی جسمانی ضرورت تمام زیادہ لاحق ہوئی مثلاً بھوک اور بدحالی وغیرہ یا جنسی ضرورت پوری کرنے کے لیے فوری کوئی ذریعہ نہ تھا، اس نے بجائے صبر کرنے کے بھوک مٹانے کی خاطر چوری کی یا ناجائز جگہ پر اپنی جنسی ضرورت کو پورا کرنا چاہا اسی طرح کئی دوسری امثال پیش کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح ان دو بلاکوں میں تقسیم ہونا ناگزیر تھا، لیکن یہ سب کچھ قدرت کی طرف سے آزمائش تھی کہ بھوک اور بدحالی میں صبر کرتا ہے یا دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے۔ بے حد ضرورت میں اللہ کی رضا پر راضی رہتا ہے یا نہیں جس کی تفصیل اوپر گزر چکی۔ حقیقت میں انسان کا کمال بھی اس میں ہے کہ وہ اس دنیا میں رہے اس کے اسباب مال ومتاع، اہل وعیال تمام باتوں سے دلچسپی رکھے اور پھر بھی اللہ کو راضی رکھے ورنہ اگر کوئی تارک دنیا ہو کر بیٹھ جائے تو اس میں کیا کمال ہے، قرآن نے تو انہی لوگوں کو سراہا ہے جو دنیا میں رہ کر اپنے رب کو راضی رکھتے ہیں۔ فرمایا:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (النور: ٣٧)

''وہ لوگ جو اپنے کاروبار میں معروف ومشغول بھی ہیں تاہم اس حالت میں بھی اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔''

نبی ﷺ نے خصی ہونے سے منع فرمایا ہے کیونکہ خصی آدمی میں برائی کی قوت ہی نہیں ہوتی، لہٰذا وہ اگر برائی نہیں کرتا تو اس میں کیا کمال ہے اور اس کی کس طرح آزمائش ہوگی، کمال تو اس میں ہے کہ انسان میں طاقت مردانی بے پناہ ہو اور وہ اس کو ناجائز جگہ پر استعمال نہ کرے محض اللہ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے۔ اس کو راضی رکھنے کے لیے ایسے کام کے قریب بھی نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اس معاملے میں بڑی تعریف کی ہے اور فرمایا: ''وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔'' (یوسف)

اسی طرح انسانی خوبیوں اور خامیوں کے موروثی اثرات بھی ہوتے ہیں۔ والدین کی جسمانی یا روحانی مادی یا معنوی خوبیاں اور خامیاں اولاد کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض بیماریاں بھی موروثی ہوتی ہیں، آج کل ''نفسیات'' (Psy Chology) کے ماہرین کی بھی یہ تحقیق ہے کہ اولاد کی طرف آباؤاجداد کی صفتیں یا خصائص منتقل ہوتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہوئی تو اس کے اولاد میں یہ بات چلی، ان سے بھول ہوئی تو اس کی اولاد میں بھی یہ بات چلی آرہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ'' گویا ضروری اور حتمی نہیں ہے کہ خاندان یا والدین کی خصوصیتیں بالضرور اولاد کی طرف منتقل ہوتی ہوں، بلکہ نہیں بھی ہوتی۔ مقصد کہ یہ بھی ایک

سبب ہوتا ہے جو گا ہے بگاہے بعد کی اولاد کے سدھارے یا بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔ میرا ایک چشم دید واقعہ ایک مزدور کی دو بیویاں تھی، انسان کتنی بھی کوشش کرے لیکن دل کا میلان ایک کی طرف ہوتا ہے برابری اس معاملے میں ناممکن ہوتی ہے۔ اس آدمی کی دونوں بیویوں سے اولاد تھی۔ ایک بیوی سے زیادہ محبت اور دوسری سے تھوڑی کم محبت تھی، جس کی وجہ سے ایک بیوی کو دوسری پر زیادہ غم اور غصہ تھا اندر ہی اندر غصہ کی لہر موجود تھی۔ ایک دن وہ مرد اپنے چھوٹے بیٹے (جو زیادہ محبت والی بیوی سے تھا) کو کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا اور ساتھ ہی دوسرے کندھے پر دوسری بیوی کا چھوٹا بیٹا تھا، خاوند نے دوسری طرف توجہ کی تو چھوٹے بیٹے نے جو دوسرے آدمی کے کندھے پر تھا وہ اپنے دوسرے بھائی کا بازو پکڑ کر کاٹنے لگا (دانتوں سے) تو باپ نے دیکھ لیا اور اس سے چھڑایا، یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ کیا عجیب معاملہ ہے کہ ماں کے غم اور غصہ کا اثر چھوٹے بچے پر بھی نمایاں ہے، اللہ کی قدرت سے وہ بچہ پھر جلد ہی فوت ہو گیا، چونکہ دوسرا بیٹا اس سے چھوٹا تھا اس سے گمان ہو رہا تھا کہ اس عمر میں اگر اتنا غصہ ہے دوسرے بھائی پر تو بڑا ہو کر پتہ نہیں کیا کرے گا۔ دونوں مائیں اعلیٰ پوزیشن کی تھیں مرد بھی بڑی حیثیت کا تھا اور دوسری بیوی جس سے کم محبت تھی وہ خاندانی لحاظ سے ان دونوں سے بہتر تھی، اگر خدانخواستہ وہ بچہ ہوتا تو پتہ نہیں دوسرے بھائیوں کا کیا حشر کرتا لیکن عالم الغیب والشهادة نے اس کو پہلے ہی بلا لیا۔

ط: کوئی بھی آدمی کوئی کارخانہ بناتا ہے یا کوئی مکینک یا مشین وغیرہ بناتا ہے تو اسے ان کے متعلق مکمل معلومات رہتی ہے، مثلاً کارخانہ میں فلاں چیز کہاں پر ہے یا کہاں رکھی جائے یا فلاں پرزے کا کیا کام ہے اس کی کارکردگی میں کیا کیا موانع ہوتے ہیں یا پیدا ہونے کے امکانات ہوتے ہیں، اس لیے وہ ان کی مرمت وغیرہ کے لیے اوزار اور آلات کو تیار رکھتا ہے تاکہ بوقت ضرورت ان کی فوری اصلاح ہو سکے، اگر کسی میں کوئی نقص یا خرابی پیدا ہوتی ہے تو فوراً سمجھ جاتا ہے، فلاں پرزے میں خرابی ہے تو کیا اللہ سبحانہ و تعالیٰ جس نے یہ کائنات پیدا کی ہے۔ اس کو اس کے بارے میں علم نہیں تھا یا نہیں ہے؟ ایسی بے ہودہ بکواس کوئی جاہل ہی کر سکتا ہے کسی دوسرے میں جرأت نہیں ہو سکتی، لیکن انسان کے اندر علم اور اندازے کی ایک حد اور انتہا ہوتی ہے وہاں پہنچ کر اس کا علم اور اندازہ ختم ہو جاتا ہے مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم وسیع وعریض ہے جس کا اندازہ لگانے سے بھی انسان عاجز ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے علم اور انسان کے علم میں یہاں فرق اور امتیازات ہیں وہاں یہ بھی ایک اہم فرق اور امتیاز جہاں انسان کو کسی پرزے میں نقص یا خرابی پیدا ہونے کا اندازہ خرابی پیدا ہونے کے بعد ہوتا ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کو اس کا پہلے ہی علم ہوتا ہے کہ دنیا کی فلاں چیز میں فلاں وقت یہ نقص یا خرابی پیدا ہو گی اور اس کے اسباب کا بھی پہلے ہی علم ہوتا ہے۔ اس خیر و شر کے یہ اسباب ہوتے ہیں، اس نکتہ کو خوب ذہن نشین کر لیں۔

ی: جب کوئی اسکیم بنائی جاتی ہے تو اس کا نقشہ اور خاکہ ذہن میں بٹھایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسکیم تیار

کرنے والوں کے ذہن میں اس کے نتائج یا اس کو عمل میں لانے سے جو ارد گرد کے ماحول میں اثرات مرتب ہوتے ہیں وہاں یہ بھی ذہن میں موجود ہوتے ہیں جن کو بعد میں کاغذ پر منتقل کیا جاتا ہے، پھر اس کو عمل میں لانے کے لیے تیاریاں کی جاتی ہیں اور اس کی شروعات ہوتی ہیں، لیکن انسان کا علم محدود ہوتا ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی نتائج اس کے منصوبے کے خلاف آتے ہیں یا اندازے سے کم ہوتے ہیں یا ان کے ساتھ کئی دوسرے نتائج بھی پیدا ہو جاتے ہیں، جو اس کے ذہن میں نہیں ہوتے۔ بسا اوقات وہ پوری اسکیم فیل ہو جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے مقرر منصوبے میں اس قسم کے نقص یا خرابی کا پیدا ہونا ناممکن ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم لامحدود ہے۔

ان دس نکتوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں، تقدیر کے معنیٰ ہے اندازاً اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں ارادہ کیا کہ اس عالم کو تخلیق کیا جائے اس کے متعلق پروگرام اور اسکیم اس کے علم میں موجود تھی جس کی تفصیل (گذشتہ نکات کی روشنی میں) اس طرح ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ ایک ایسی دنیا وجود میں لائی جائے جس کے وجود میں آنے کے بعد ہی اس کی مخلوق کو معرفت یا پہچان حاصل ہوگی اور مخلوق کو بھی پتہ چلے گا کہ اس کا بھی کوئی ایک رب وحدہ لاشریک لہ ہے۔ جس نے اپنی پہچان اور صفات حمیدہ کے ظہور کے لیے اس دنیا کو پیدا کرنا چاہا، جس میں ایسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا جس کے پیدا ہونے کے بعد اللہ کی صفات کا بوجہ اتم ظہور ہوا اور وہ مخلوق ایسی ہو جو حاجت عقل واختیار ہو مجبور محض نہ ہو اپنے ارادے سے خیر وشر کی راہ لے سکے پھر ان کو ارادے کی آزادی دے کر امتحان میں مبتلا کیا تاکہ ان تمام صفات وغرض وغایات کا ظہور ہو۔ (جن کی تفصیل نکات کے ضمن میں گزری) اس مخلوقات اور دنیا کے متعلق پورا خاکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اس عالم میں جو مخلوق پیدا کروں گا وہ اپنے اختیار وارادے کی آزادی کے سبب لازمی طور چند بلاکوں میں بٹ جائے گی اور اس کے یہ یہ نتائج لامحالہ اٹل طور پر نکلیں گے جو ان اعمال کے نتائج ہوں گے، جس طرح مادیات کے بھی نتائج مشاہدے میں آتے ہیں یعنی کوئی اگر زہر کھاتا ہے تو ضرور مر جاتا ہے، کوئی مقوی چیز کھاتا ہے تو اس سے اس کی قوت اور طاقت ملتی ہے بعینہ اسی طرح اعمال کے بھی اللہ تعالیٰ نے نتائج مقرر کر دیے، اچھے کام کا نتیجہ یہ اور برے کام کا یہ نتیجہ نکلے گا اور مخلوق کو ارادے کو عمل میں لانے کی آزادی دے کر اس کی آزمائش کروں گا تاکہ اپنے اختیار سے وہ جو چاہے کر سکے اس کو مجبور محض نہیں بناؤں گا کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی بھی کام نہ کر سکے کیونکہ یہ امتحان اور ابتلاء کے منافی ہے اور وہ جس بھی راستہ کو اختیار کرے گا اس کے اسباب بھی فراہم کیے جائیں گے۔ جو خیر کے لیے کوشاں ہوگا اس کے لیے بھی راہ ہموار ہوگی اور جو شر کی طرف مائل ہوگا اس کے لیے بھی دروازے کھلے ہوئے ہوں گے۔

﴿فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰىO فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰىO﴾ (اللیل: ۷، ۱۰)

کیونکہ آزمائش اس کے بغیر ناممکن ہے۔ جس کی تفصیل نکات میں گزر چکی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو اس دنیا کے نقشے کے مطابق یہ بھی علم تھا کہ اگر اس کی فطرت سالم پیدا ہوگی تاہم اس کو یہ اسباب سامنے آئیں گے، یہ حالات درپیش آئیں گے، ان مسائل سے دوچار ہوگا، اس کو یہ صحبت میسر ہوگی جس کا ساتھ دینے کے لیے یہ خاص امور سامنے آئیں گے، جس کی وجہ سے یہ بے بلاک وجود میں آئیں گے ان کے اس حسن اختیار یا سوئے (برا) اختیار اور غلط انتخاب کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔

حاصل کلام کہ اس دنیا کے متعلق پورا نقشہ کہ یہ آسمان عالم کے اوپر چھت اور فرش کے لیے زمین اور باقی ضروریات کے لیے پہاڑ، دریا، باغ، باغیچے اور زمین کے اندر معدنی اشیاء کہاں ہوں گی یا کہاں پر زیادہ ہوں گی اور روشنی کے لیے سورج اور چاند وستارے وغیرہ ہوں گے ان سب کے لیے خاص دائرہ یا جگہ یا حلقہ مقررہ ومعین ہوگا اس کرہ ارض میں سمندر اور دریاؤں کی وراثت کس طرح ہوگی؟ خشکی کی اراضی کس طرح ہوگی؟ سورج زمین سے کتنا دور ہونا چاہیے؟ زمین پر موسموں کا اندازہ اور تقسیم ہونی چاہیے پھر ان موسمی مضر اثرات سے بچاؤ یا دوسری کائناتی نقصان کار اشیاء سے امن کے لیے کیا تدابیر ہونی چاہئیں؟ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا علم واندازہ بہرحال اس بڑے گھر جس میں ضروریات کی تمام چیزیں موجود ہوں اس کے مکمل منصوبے کے بعد اس میں باارادہ مخلوق کو بسانے اور اس کے نسلی اضافے کے ان کا کرہ ارض کے مختلف خطوں اور علاقوں میں آباد ہونا اور اس کے بعد اس کے ماحول حالات وکیفیات میں اختلاف کے سبب اسی مخلوق کے احوال واعمال رہنا کرنا، بود وباش میں اختلاف ہوگا اور جن کو جہاں خاص امور سے دوچار ہونا پڑے گا، اس کے مطابق خود کو ان حالات کے مطابق بنانے کی کوشش کرے گا، کچھ ناگزیر اسباب کی وجہ سے ان کے عقائد واعمال اخلاق وغیرہ میں اختلاف ہوگا۔ جس کی وجہ سے منافرت اور ایک دوسرے کے مقابلے بھی ہوں گے اور کئی وجوہ کی بنا پر وہ برائیوں اور بداخلاقیوں میں بھی سب گرفتار ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حجت پوری کرنے کے لیے ان پر انبیاء بھیجے گا جو ان کو شر سے خیر کی طرف آنے کی دعوت دیں گے اور جنہوں نے ان کی بات کو مانا وہ دونوں جہانوں میں کامیاب ہوں گے اور جنہوں نے ان کی بات کو نہ مانا وہ نتیجتاً بڑے وبال سے دوچار ہوں گے یعنی اسی طرف اللہ تعالیٰ کو نہ صرف کلی یا اجمالی طرح بلکہ تفصیلی اور ہر جز کا علم تھا کہ اس آدمی کو یہ باتیں پیش آئیں گی۔ جس کی وجہ سے یہ ہدایت یافتہ ہوگا اور یہ اسباب سامنے آئیں گے جس کی بنا پر وہ گمراہ ہوگا۔ اس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کو اس راستے پر چلایا یا خود اس سے یہ گناہ کا کام کروایا بلکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو آزمانے کے لیے ارادہ کو عمل میں لانے کے لیے آزادی دی ہے جس کے نتیجے میں لامحالہ وہ طریقے وجود میں آنے تھے اور وجود میں آئے کہ جن کے نتائج بھی لازمی نکلنے تھے مطلب کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عمل کی آزادی دی ہے تاکہ اس کو آزمایا جائے اور انسان اس آزادی سے کوئی بھی کام لے چاہے اچھا لے یا برا لے۔ اپنی مرضی اور ارادے سے اللہ تعالیٰ نے اتنا

کیا ہے کہ ایسا نظام قائم کر دیا ہے جس سے انسانی ارادے کی آزادی بھی برقرار رہتی ہے اور آزمائش کی صورت بھی عمل میں جاتی ہے۔

فرض کریں کہ کسی آدمی کے چند نوکر یا ملازم ہوں یا چند بیٹے ہوں وہ ان نمونے اور طرز عمل سے اندازہ لگا لیتا ہے کہ فلاں خادم فرمانبردار ہے یا فلاں بیٹا فرمانبردار ہے، لیکن اگر وہ محض اپنے اندازے کے مطابق ان کے ساتھ نافرمانوں والا سلوک کرے گا تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ بابا سائیں ہمیں آزما لیتا، بغیر آزمانے کے ہمارے ساتھ یہ سلوک کرتا ہے یا یہ سزا دیتا ہے ان کی اس حجت کو ختم کرنے کے لیے ان پر کوئی کام رکھتا ہے یا ان کو کوئی ذمہ داری دیتا ہے پھر وہ فرمانبرداری یا نافرمان اس ذمہ داری پوری کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے مالک یا باپ کی طرف سے مناسب سلوک یا جزاو سزا پالیں تو ان کو یہ حق کہاں ہے کہ وہ کہہ دیں ہم ایسے ہیں اس لیے اس کے علاوہ کیا بن سکتے تھے۔

کیونکہ کہ اس آدمی کا علم ان کے طرز عمل کے سبب تھا، لہٰذا اس علم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے ان کو مجبور کیا، اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تو تمام انسانوں کی فطرت صحیح سالم پیدا کی ہے، لیکن اس دنیا میں آنے کے بعد اس عالم کے جو اسباب اس کے سامنے آئے ہیں ان کو اپنی مرضی سے اختیار کرنے کے سبب وہ نتائج اس کے دامن میں پھنس جاتے ہیں، یہاں ہم انسانوں کو لوگوں کے طرز عمل سے اندازہ ہو جاتا ہے لیکن وہ طرز عمل کس سبب سے ہوا وہ کبھی معلوم ہو جاتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس کو یہ اسباب سامنے آئیں گے جس وجہ سے وہ اپنی آزادی کے اختیار کے مطابق اس کو اپنائے گا اور نتیجہ بھگتے گا، تو یہ آزادی آزمائش کے لیے ضروری تھی۔

دوسری مثال: ایک ماہر ڈاکٹر کسی مریض کی چیک اپ کے بعد اس کو کہہ دے کہ یہ نہیں بچے گا پھر وہ آدمی واقعتاً مر گیا تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ اس ڈاکٹر نے اس کو مار ڈالا ہے؟ ہرگز نہیں! ڈاکٹر نے تو اس کی بیماری کی نوعیت اور کیفیت ڈگری اور درجے کے علم کے مطابق اس بات کا اظہار کیا البتہ یہ بیماری اس اسٹیج پر کیسے پہنچی یا شروع کیسے ہوئی اس کا پتہ کبھی کبھی ہوتا ہے تو کبھی کبھی نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ کو ہر انسان کی جسمانی یا روحانی بیماری کا علم ہوتا ہے اور اس کے پیدا ہونے کا بھی علم ہوتا ہے تو کیا یہ علم اعتراض جیسی بات ہے؟

بہر حال اس عالم کے اس مکمل نقشے یا خاکے کے علم اور اندازے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک کتاب میں ثبت کر دیا ہے جس کو وہ ''قرآن مبین'' یا ''امام مبین'' سے پکارتا ہے، مطلب کہ تقدیر کی معنیٰ ہے علم یا اندازہ تو اس میں کیا خرابی ہے؟ اس سے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم اور اندازے کی وسعت معلوم ہوئی جو کہ اس کی کمال کی صفت ہے اس میں کوئی بھی خرابی نہیں ہے۔ یہاں اگر اللہ تعالیٰ یہ لکھ دیتے کہ فلاں بندے آپ نے یہ کام کرنا ہے اور فلاں اپنے یہ کام کرنا ہے تو اس صورت کچھ بولنے کی گنجائش ہو سکتی تھی لیکن اس طرح نہیں، اس نے تو یہ لکھا ہے کہ فلاں آدمی ان وجوہات کی بنا پر اپنی آزادی سے کام لے کر یہ کام کرے گا خدارا انصاف کریں اس میں کیا خرابی ہے؟ یہ کون سی اعتراض جیسی بات ہے؟

جب کہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے علم حکمت، تقدیری اندازے کا بے انداز اور بے شمار ثبوت فراہم کر رہا ہے، تو انسان کے متعلق اس کے علم واندازے کا انکار کیوں؟ یہاں پر یہ سوال بالکل فضول ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کیوں انسان کے سامنے یہ مختلف اسباب لائے ہیں جن کی وجہ سے وہ خیر اور شر کے مختلف حصوں میں تقسیم ہوگئے ہیں کیوں نہ ان کے سامنے ایک ہی راستہ لائے؟ اس لیے کہ اس صورت میں انسان مشینی صفت کی ایک مخلوق ہوتا اور ایک ہی راہ کو لے چلتا اور اس میں اس کے ارادے یا عمل کا کوئی دخل نہ ہوتا، اس حالت میں امتحان یا آزمائش والی بات سراسر مہمل اور بیکار ہو جاتی کہ اس کو کسی راستے اختیار کرنے کا کوئی اختیار ہی نہیں ہے اس لیے آزمائش کس چیز کی؟ بہر حال ابتلاء اور آزمائش اور کے لیے دونوں راستوں کا ہونا اور انسان کے سامنے پیش آنا اٹل اور ضروری تھا تا کہ ان میں خود جس کو چاہے اس کو اختیار کر لے، دنیا کمال حاصل کر لے یا اپنی لیاقت اور صلاحیت کو ضائع کر کے ترقی اور فلاح کا دروازہ خود ہی بند کر دے۔ یہ حقیقت اس قدر واضح ہے جس کا انکار سوائے ضد اور عناد کے ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں پر یہ سوال بھی قابل دریافت ہے کہ تقدیر کے متعلق سوالات ملحد (اللہ تعالیٰ کے وجود انکاری) ان کی طرف سے پیش ہوئے ہیں یا کسی مسلمان جاہل کی طرف سے، اگر پہلی شق ہے تو درحقیقت ان سوالات کے جوابات دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تقدیر یا علم واندازہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کا منکر ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت کے بارے میں بحث کرنا سراسر بیکار اور فضول ہے، بحث ومناظرے کے طریقے کے بھی برخلاف ہے تو وقت کا بھی ضیاع ہے۔

صفت کسی ذات کی فرع ہوتی ہے، جب کوئی ذات کو ہی نہیں مانتا تو اس کی صفت یا خوبی اور کمال پر بحث کرنا یا اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے چھان بین کرنا سراسر غیر معقول ہے۔ ان حضرات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں بحث کرتے ہوئے دلائل پیش کرنے چاہئیں۔ پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے دل سے اقراری بنے تو پھر صفات کے متعلق تحقیق ہونی چاہیے اور حق کو معلوم کرنا چاہیے۔ یہ حضرات تو اللہ تعالیٰ کے وجود کے ہی منکر ہیں۔ باقی ایسے سوالات صرف لوگوں کو سمجھانے کی خاطر کرتے رہتے ہیں یہ طریقہ کار درست نہیں ہے اس طرح حق واضح نہیں ہوگا۔

لیکن اگر یہ سوال کسی جاہل مسلمان کی طرف سے ہے تو اس کو حکمت موعظہ حسنہ اور نرم وشریں الفاظ میں پوری حقیقت سمجھانی چاہیے کہ ''بھائی تقدیر کا معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ کا اندازہ یا علم، لہٰذا اگر قائل نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا معبود اللہ سبحانہ وتعالیٰ جس نے اس پوری کائنات کو پیدا کیا اور کائنات کے ذرے ذرے میں بے شمار حکمتیں رکھیں جس کے قلیل انداز کو اہل علم وسائنس روز بروز کائنات کے مظاہر سے اخذ اور استنباط کرتے رہتے ہیں۔ یہ معبود (معاذ اللہ) کوئی جاہل معبود ہے جس کو کوئی پتہ ہی نہیں ہے کہ اس کی پیدا کردہ مخلوق کیا کام کر رہی ہے یا کرے گی، یعنی نعوذ باللہ اس نے صرف اس مخلوق کو پیدا کر دیا باقی اس کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اس میں صلاحتیں اور

لیاقتیں ہیں اور ان استعداد کے موجب ان سے کون سے کام صادر ہوں گے، حالانکہ کوئی بھی انسان کوئی چیز یا مشین وغیرہ ایجاد کرتا ہے تو اس کو یہ بھی پتہ ہوتا ہے کہ یہ چیز کس کام کی ہے اس سے کیا فائدے اور کیا نقصانات ہوں گے، مگر اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ نہایت بدترین اور گھٹیا تصور ہے کہ اس کو کوئی پتہ ہی نہ تھا۔ (فیاللعجب)

اس تھوڑی سی حقیقت پر نظر ڈالو گے تو زیادہ الجھن اور خسارے سے بچاؤ ہو جائے گا۔ اس سوال کا جواب زیادہ لمبا ہو گیا ہے، لیکن کیا کریں میرے خیال اتنی تفصیل میں جائے بغیر سوال کا جواب شاید سمجھ میں نہ آتا۔ بہرکیف سوال کا جواب آپ کے سامنے ہے اگر ٹھیک ہے، تو یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مہربانی ہے جس نے مجھے اس کا علم دیا اور اس کے لکھنے کی توفیق دی اور اگر خدانخواستہ صحیح نہیں ہے تو یہ میرے نفس کی نادانی اور قلم کی کمزوری ہے۔ (اللھم اھدنا سواء الصراط)

سوال ۷: غنی اور فقیر، امیر اور غریب کے رزق کا فرق کیوں؟

جواب: بعون الكريم الوهاب.

اس سوال کا جواب سوال نمبر ۲ میں تقدیر کے متعلق مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے ضمناً عرض کیا ہے کہ یہ سب کچھ ابتلاء اور آزمائش کے لیے ضروری تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر سارے غنی اور امیر ہوتے تو باہمی تعاون اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا سوال ہی ختم ہو جاتا۔ اسی فرق کی بنا پر ہی زکوٰۃ، صدقات، خیرات وغیرہ غریب مسکین محتاج کی مدد کرنے کے لیے اور خیر کے کاموں میں خرچ کرنے کے لیے مقرر ہوئے، یہ ساری باتیں اسی فرق اور امتیاز پر ہی مبنی ہیں، پچھلے صفحات میں سورۃ انعام کی آیت نقل کر کے آیا ہوں جس میں اسی اونچ نیچ کی علت بیان ہے جس کو ملاحظہ کیجئے اگر سارے امیر اور مالدار ہوتے تو ان باتوں کا وجود کہاں رہتا؟ حالانکہ آج کل دنیا ہر اس شخص کی تعریف کرتی ہے جو غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرتا ہے، اپنوں اور بیگانوں کی ضرورت کے وقت اعانت کرتا ہے، خیر کے کاموں میں مثلاً ہسپتال، تعلیمی ادارے اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں خرچ کرتا ہے، ہر کوئی اس کی تعریف کرتا ہے حتیٰ کہ وہ ملحد بھی اس کی تعریف کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر یہ تقسیم قدرتی نہ ہوتی تو ان خوبیوں کو گننے والا دنیا میں موجود ہی نہ ہوتا۔ کیا ایسے حضرات دنیا سے ایک فیاض اور دوسروں کو نفع پہنچانے والے لوگوں کے خاتمے کے خواہاں ہیں؟

بہرصورت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو انسان ذات کی آزمائش جس طرح باقی کتنی باتوں سے کرنی تھی اسی طرح اس کی ذات وصفات کے شعبے میں بھی آزمائش کرنی تھی تاکہ ظاہر ہو کہ فقیر اپنی فقیری پر صبر وشکر تحمل برداشت سے کام لیتا ہے یا نہیں، غنی اپنی ملکیت سے ان ناداروں کی اعانت کرتا ہے یا نہیں، خیر کی ضرورتوں میں انفاق سے حصہ لیتا ہے یا نہیں، پھر اعتراض کس چیز کا ہے؟ اس طرح سے ہر انسان دوسرے کی طرف محتاج ہے۔ ایک دوسرے کے تعاون کا ضرورت مند ہے، ورنہ ان عقل کے دشمنوں کے خیال مطابق دنیا سے باہمی تعاون کا باب ہی ختم ہو جائے گا۔

دوسرے کو چاہنے والا کوئی بھی نہ رہے گا۔ ایسا بے ہودہ سوال تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔ کوئی بیوقوف تو اس طرح بھی کہہ سکتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیمار اور تندرست پیدا کیے سارے صحت مند کیوں نہ پیدا کیے، سارے مرد یا ساری عورتیں کیوں نہ پیدا کیں، سارے گورے پیدا کیوں نہ کیے؟ سب کو ہمیشہ کے لیے کیوں نہیں پیدا کیا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہر کوئی سمجھتا ہے کہ اس قسم کے سوالات فضول اور بے ہودہ ہیں، درحقیقت اس اختلاف کا ہی نتیجہ ہے کہ دنیا نہایت ہی دلکش ہوئی پڑی ہے ؏

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن
اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

ورنہ ان کے خیال کے موجب پوری یکسانیت ہوتی ہے تو دنیا ایک منٹ بھی رہنے کے قابل نہ ہوتی، لیکن سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں کا اصل مقصد یہی ہے کہ نعوذ باللہ اللہ ہے ہی نہیں۔ تبھی تو انسان سارے کام اپنی مرضی سے کرتا ہے یہ فرق اور امتیازات خود اس نے ایجاد کیے ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے وجود پر بحث کی جائے، پھر اگر وہ اللہ کے وجود کے اقراری ہو جاتے ہیں تو دوسرے سوالات بھی حل ہو جائیں گے۔ ورنہ ان کے ساتھ گفتگو کرنا بیکار ہے۔ واللہ اعلم

سوال ٤: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر نبی کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تو حضرت محمد ﷺ کو پوری دنیا کے لیے کیوں مبعوث کیا گیا، حالانکہ ان کی زبان عربی تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ صرف عالم عرب کے لیے نبی ہوتے، سندھیوں کے لیے کوئی سندھی اور انگریزوں کے لیے کوئی انگریز رسول بن کر آتے۔ وغیرہ وغیرہ؟

جواب: بعون الکریم الوهاب:

قرآن کریم میں واضح ہے کہ:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (ابراهيم: ٤)

''یعنی نہیں بھیجا ہم نے کوئی بھی رسول مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ ان پر بیان کرے۔''

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر ملک اور ہر قوم میں کوئی نہ کوئی نبی بھیجا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۝﴾ (الرعد: ٧)

''یعنی ہر قوم کے لیے کوئی نہ کوئی ہادی ''پیغمبر'' تھا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (فاطر: ٢٤)

''یعنی ہر امت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کوئی نہ کوئی ڈرانے والا گزر چکا ہے۔''

لہٰذا سرزمین سندھ اور انگریزوں کے ملک میں اور دوسرے سارے ممالک یا خطہ میں کوئی نہ کوئی آتا رہا ہے

لیکن قرآن کریم میں کسی بھی جگہ پر اس طرح نہیں ہے کہ میں ہمیشہ اس طرح ہر ملک میں الگ الگ نبی بھیجتا رہا ہوں۔اور کوئی بھی ساری دنیا کے لیے ایک جامع نبی نہیں بھیجوں گا،لہٰذا یہ اعتراض فضول ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ایک ایسا جامع کمالات نبی علیہ السلام بھیجا جو پوری دنیا کے لیے قیامت کے دن تک ہو اور اس کی لائی ہوئی شریعت کامل ومکمل ہو جو تا قیامت لوگوں کی رہنمائی کرتی رہے۔جب بھی کوئی مسئلہ درپیش آئے تو اس میں اس کا حل موجود ہو۔تب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا اور ساتھ ایسی کتاب بھی دی جو تا قیامت لوگوں کے لیے رہنماء اور ہادی ہے،جس کا مثل لانے سے انس وجن عاجز ہیں۔جب اس کتاب کو تا قیامت رہنا تھا تو اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود اٹھایا۔یہی وجہ ہے دشمنانِ اسلام کی بھرپور کوشش کے باوجود اس میں ایک حرف کا بھی الحاق یا اضافہ یا کمی وبیشی ہرگز نہ ہوسکی۔حالانکہ توریت،انجیل اور دوسرے آسمانی کتب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے تھے اور سچے تھے ان کے لانے والے بھی سچے پیغمبر تھے لیکن ان کی نبوت عمومی اور ساری دنیا کے لیے نہ تھی اور نہ ہی ہمیشہ کے لیے تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد ان کی کتابوں میں تحریف،تبدیل اور اضافات ہوگئے۔جس کا اقرار ان کتابوں کے ماننے والے بھی کرتے ہیں۔لیکن اس کتاب (قرآن کریم) کا ایک حرف بھی آگے پیچھے نہیں ہوسکا۔اگرچہ اس کو آئے ہوئے ۱۴۰۰ چودہ سو سال سے بھی زائد عرصہ ہوگیا ہے۔یہ قرآن شریف کا دائمی معجزہ ہے،ورنہ دوسری کوئی بھی کتاب اتنا عرصہ تو کیا تین سو سال بھی محفوظ نہ رہ سکی اور اس میں تحریف ہوگئی۔اس طرح بھی نہیں ہے کہ قرآن کریم اس وقت یا آج کے عربوں کے لیے معجزہ تھی یا ہے بلکہ پوری دنیا کے لیے ہے،آج بھی دنیا میں کتنے ہی عیسائی ایسے ہیں جو عربی پر بڑی مہارت رکھتے ہیں ان جتنی مہارت ہمارے پڑھے لکھے عالم بھی نہیں رکھتے۔انہوں نے بیشتر کتب عربی زبان میں لکھی ہیں۔عربی لغت کے کتنے ہی کتاب لکھے ہیں جو دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن عربی کے ان ماہر عیسائیوں کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ قرآن کریم کے اس چیلنج کو قبول کرسکیں کیوں؟

اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کا مقابلہ انسانی طاقت سے ماوراء ہے،یہی معجزہ رہتی دنیا تک ہمارے نبی ﷺ کی صداقت کا ایک عظیم الشان ثبوت ہے۔نبی کریم ﷺ کے بعثت کے وقت دنیا کی یہ حالت تھی کہ پوری دنیا میں تقریباً (ماسوائے امریکا) لوگوں کے ایک دوسرے سے روابط قائم تھے گزرے ہوئے نبیوں کی طرح ہر دنیا کا خطہ اور علاقہ الگ تھلگ نہیں تھا،یعنی آپ ﷺ کی بعثت کے وقت پوری دنیا ایک گھر کی مانند بنی ہوئی تھی اس وقت سے لے کر آج تک پوری دنیا کے علاقے ایک دوسرے کے بالکل قریب آتے رہے اور آج دنیا کی کیا حالت ہے کہ جو بالکل ایک گھر کی مثل بن چکی ہے اور پوری دنیا کا احوال ایک ہی وقت میں انسان اپنے گھر بیٹھے بیٹھے معلوم کرسکتا ہے اور سن سکتا ہے۔لہٰذا ایک ہی گھر کے لیے سربراہ یا نبی بھی ایک ہی ہونا چاہیے نہ کہ زیادہ کیونکہ دنیا کی موجودہ حالت نبی ﷺ کی بعثت سے شروع ہوئی ہے جس کا تقاضا ہے کہ دنیا کا مرشد،ہادی،

رہنما اور پیغمبر ایک ہی ہونا چاہیے تاکہ ساری دنیا ایک ہی برادری کے دھاگے میں بندھی ہوئی ہے۔ ہر ملک کے جدا جدا نبی نہ ہوں کیونکہ یہ نمونہ عالمی برادری کے منافی ہے اور افتراش انتشار کی علامت ہے، بہر حال آپ ﷺ کی بعثت مبارکہ کے وقت ساری دنیا اپنی زبان حال سے یہ تقاضا کر رہی تھی کہ ہمارا پیشوا لیڈر اور بشیر و نذیر ایک ہی ہونا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ مالک الملک جو کہ عالم الغیب ہے، انسانیت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اور ان کی زبان حال کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے ایک عظیم الشان نبی مبعوث کیا جو ایسی کتاب کے ساتھ آیا جو رہتی دنیا تک معجزہ ہے اور تمام انسانوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہے۔ آنے والے مسائل کا حل بھی اس میں موجود ہے اور ملتا رہے گا اور اسی کلام پاک اور اس کے لانے والے عظیم الشان پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوری دنیا کو یہ شاندار تصور (Grand-Conception) عطا فرمایا کہ یہ پوری دنیا اور اس کے باشندے ایک ہی عالم برداری کے اجزاء یا افراد ہیں حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بھری مجلس میں یہ واشگاف اعلان فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی (غیر عربی) پر محض اس وجہ سے فضیلت نہیں ہے کہ وہ عربی ہے، کسی عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر فضیلت نہیں، سب کے سب آدم کی اولاد ہیں، آدم کو اللہ نے مٹی سے بنایا تھا، تم میں سے اگر کسی کو کوئی فضیلت حاصل ہے تو محض تقویٰ کی بنا پر ہے، ورنہ اگر اب بھی ہر ملک کا الگ الگ نبی ہوتا تو آج تک دنیا کے اس شاندار تصور کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ دنیا اور بھی زیادہ متفرق برادریوں میں تقسیم ہو جاتی۔ اسلام اس شاندار تصور کا مظاہرہ ہر سال حجاز مقدس میں کرتا رہتا ہے، جہاں ہر دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے لوگ مختلف ذات، زبان قبیلے اور الگ الگ خصوصیات اور امتیازات اور اونچ نیچ کے باوجود بھی ایک ہی لباس میں ملبوس ہو کر ایک ہی نمونہ و ہیئت میں ایک ہی رب وحدہ لا شریک لہ کے سامنے جھک کر دعا مانگتے ہیں، وہاں پر کوئی امتیاز نظر نہیں آتا، اگرچہ آپس میں باہمی کئی امتیازات کیوں نہ ہوں۔ کیا اس قسم کا تصور اور اس کا عملی مظاہرہ کسی دوسرے مذہب یا قوم یا کسی علاقے یا ملک کے لوگوں نے سوائے اسلام کے پیش کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بے شمار فوائد اور انسانیت کی بھلائی کی باتوں میں سے یہ بھی ایک نہایت عظیم الشان عملی نمونہ ہے اس جیسا نہ کوئی پیش کر سکا ہے اور نہ ہی کر سکے گا، پس رہا یہ سوال کہ اس مقصد کے لیے عرب و حجاز کے خطے کو منتخب کر کے ایسے پیغمبر کا کیوں انتخاب کیا گیا، دوسرے ملکوں سے کیوں نہ ہوا اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ، سندھ، سے یا یورپ وغیرہ سے یا کسی اور ملک یا خطہ سے پیغمبر کا انتخاب کرتا تو بھی یہی سوال اٹھایا جاتا، لہٰذا ایسے عظیم الشان پیغمبر کے انتخاب کے لیے عالمی برادری کو وجود میں لانے کے لیے جس بھی خطہ کا انتخاب ہوتا تو لازماً دوسرے ممالک سے اعتراض دہرایا جاتا، کہ اس مقصد کے لیے، فلاں علاقہ ہی کیوں منتخب کیا گیا؟ ہمارا خطہ کیوں نہ منتخب کیا گیا، حالانکہ اسی عالمی برادری کے وجود میں لانے کے لیے ضروری تھا کہ ساری دنیا کے لیے ایک ہی پیشوا اور پیغمبر ہونا چاہیے، اس لیے جہاں بھی اس کا انتخاب ہوتا تو دوسرے خطے کے لوگ یہ سوال اٹھاتے، اس لیے انسانوں کو چاہیے

کہ اس بارے میں معاملہ اللہ پر ہی چھوڑ دیں کیونکہ جہاں بھی اس کو مناسب نظر آیا اس نے وہاں سے اس کا انتخاب کر ہی لیا اس میں کیا خرابی ہے؟ کیا اللہ کے ماننے والوں کا اللہ تعالیٰ پر اتنا بھی بھروسہ نہیں ہے کہ اس نے جو بھی اور جہاں بھی انتخاب کیا اس میں ہمارے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اگر یہ اعتراض کرنے والے اللہ کے وجود کے منکر ہیں تو ان کو اس اعتراض کا کوئی حق بھی نہیں علاوہ ازیں جس خطہ سے دین اسلام کی تبلیغ کی ابتدا ہوئی یعنی (مکہ معظمہ) وہ پرانی دنیا، ایشیا، یورپ، افریقہ کے تقریباً بیچ کی جگہ ہے۔ چنانچہ جغرافیہ جاننے والوں پر یہ مخفی نہیں ہے اس کے متعلق معلومات کے لیے قاضی سلیمان منصور پوری کی کتاب رحمۃ للعالمین کی پہلی جلد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

بہر حال مکہ معظمہ پوری دنیا کا سینٹر ہونے کی بنا پر زیادہ حقدار تھا اور وہاں سے ہر ملک کی طرف دین کی آواز پہنچی اسی مرکزی حیثیت کی بنا پر عرب کا خطہ منتخب کرنا زیادہ موزوں تھا اور بلا شک وشبہ نبی اکرم ﷺ کی ہستی اس پورے علاقے میں ایک ہی ہستی تھی جو اس عظیم منصب کی حقدار تھی۔ بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں ایک بھی ایسی ہستی نہ تھی جو اس عظیم الشان منصب کے لیے منتخب کی جاتی۔ پوری دنیا میں صرف حضرت محمد ﷺ کی ہی بابرکت ہستی تھی جس کو اس کامل دین کا علمبردار بنایا گیا کیونکہ وہی اس بڑے منصب کے حقدار تھے، لہٰذا جب اللہ عالم الغیب والشہادہ نے پوری دنیائے عرب وعجم پر نظر ڈالی تو سارے مغضوب علیہم نظر آئے۔ کوئی بھی اس منصب کے لائق نظر نہیں آیا کہ جس کو اس رحمت والے دین کا حامل بنایا جائے، سوائے پیارے پیغمبر جناب محمد ﷺ کی بابرکت ہستی کے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ہی ان کا انتخاب فرمایا اس میں کیا اعتراض اور کون سی قباحت ہے؟ یہاں یہ ضرور ہے کہ انگریزی زبان بھی کافی دنیا میں بولی جاتی ہے، عالمی زبانوں میں سے ایک ہے لیکن کوئی انصاف کرے جس کو دونوں زبانوں (عربی، انگریزی) پر مکمل عبور ہو وہ یقیناً یہ مانے گا کہ عربی زبان میں جو وسعت ہے اس کا عشر وعشیر بھی انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ اسی عربی زبان ایک سائینٹفک (Scientfic) ہے اس کے نحو، صرف، علم البلاغہ اور علم لغت کے مہارت رکھنے والوں سے پوچھو گے تو معلوم ہوگا کہ عربی زبان مختلف زبانوں سے کس قدر وسیع واعلیٰ درجہ پر فائز ہے۔ دنیا کی کوئی بھی زبان اس کا ہرگز ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتی، یہ ہمارا دعویٰ ہے۔ جس کو کوئی ان شاء اللہ رد نہیں کر سکتا، لہٰذا ایسے عالمی دین اور عالمی برادری کو وجود میں لانے کے لیے زبان بھی ایسی کا انتخاب ہونا چاہیے تھا جو سب زبانوں سے اعلیٰ ہو۔ عربی زبان کی لطافت نحو اور صرف زیر وزبر اور پیش یا الف، واؤ اور ی کے اختلاف کے لحاظ سے معنیٰ میں بے پناہ اختلاف آ جاتا ہے یہ ایسی خصوصیت ہے جو دوسری زبان میں نہیں ملتی، اس ایک زبان میں مہارت لانے کے لیے جتنے علوم کی ضرورت ہوتی اتنے علوم کی ضرورت دوسری زبانوں میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا کامل دین کے لیے عربی زبان کا انتخاب عین حکمت کا تقاضا تھی، اگر اس کی جگہ دوسری زبان منتخب کی جاتی تو وہ ہرگز اس کامل دین کے لیے موزوں نہ ہوتی، علاوہ ازیں جب اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے رہنا تھا اور انسان کو کئی مسائل درپیش آتے رہتے ہیں لہٰذا اس کے لیے ایسی زبان کا اختیار کرنا ضروری تھا جس میں رہتی دنیا

تک انسانوں کے مسائل کا حل موجود ہو، یہ عربی زبان اور اس کے الفاظ کے معانی کی بے پناہ وسعت ہی ہے کہ ہر زمانہ کی ضرورتوں کا ساتھ دیتی رہی ہے اور ہر دور میں انسانی مسائل کا حل اس میں دستیاب رہا ہے، دوسری زبان یہ پارٹ ہرگز ادا نہیں کر سکتی تھی، یہ صحیح ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی قوم کی بھی زبان عربی تھی کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ نبی ﷺ پوری دنیا میں جا کر ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائیں۔ ان کی ڈائریکٹ (Direct preching) ایک قوم تک ہی رہ سکتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ڈائریکٹ عربوں کی طرف بھیجا تا کہ وہ اس کے حامل بن کر اس دین کو دوسرے ملکوں اور انسانوں تک پہنچائیں اس طرح یہ دین۔ قرآن وسنت پوری دنیا میں پہنچ گئے۔

یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایسا انتظام ضرور کیا کہ اپنے کلام پاک کے تراجم پوری دنیا کے مشہور زبانوں میں میسر کروائے، اس طرح دنیا کلام پاک سے اپنی اپنی زبان میں مستفید ہوتی رہے، اور ہوتی رہے گی۔ (ان شاء اللہ)

خلاصہ کلام کہ جب تک دنیا اپنی صغرسنی میں تھی اور اپنے کمال کو نہ پہنچی تھی تب تک تو ہر ملک میں الگ الگ نبی آ رہے تھے لیکن جب دنیا اپنی بلوغت وکمال کو پہنچی اور اپنے لسان حال سے تقاضا کرنے لگی کہ اب میرے لیے ایک ہی رہنمائے آئے، ایک ہی دستور یا آئین، نمونہ یا لائحہ عمل آئے اور میرے تمام افراد ایک ہی برادری میں پرو لیے گئے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پناہ رحمت اور فضل عظیم کے ساتھ یہ دعا قبول کی اور ان انسانوں میں سے ہی ایک عظیم الشان نبی جس کی صداقت وامانت، تقویٰ اور دیانت عالم آشکار تھی۔ اس سفیر کی جو زبان پوری دنیا کی زبانوں سے اعلیٰ تھی اس کو ایسے خطہ سے مبعوث کیا جو پوری دنیا کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا تھا جس نے آ کر پوری دنیا کے انسانوں کو امن کا پیغام دیا۔ ان سب کو ایک ہی عالمی برادری سے منسلک کیا ان کو ایسا کامل دین عطا کیا جو کامل ہونے کے ساتھ ساتھ رہتی دنیا تک کے انسانوں کی ضروریات کو پورا کرتا رہے، اور وہ سارے ایک ہی معبود کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن کر رہیں، کوئی بھی اپنے آپ کو دوسروں کا خادم سمجھے، یہ سارا نظام یا مقصد خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے ورود مسعود کے ساتھ پورا ہوا اس میں کون سی ایسی بات ہے جو اعتراض کے لائق ہے، باقی ان علم اور روشنی کے چمڑوں کو اسلام کے نہ غروب ہونے والے سورج (رسول اللہ ﷺ) سے خواہ مخواہ ضد یا عداوت ہے تو اس کا علاج ممکن ہی نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

سوال ۵: کچھ جانور حلال تو کچھ جانور حرام کیوں کیے گئے؟

الجواب بعون الکریم الوھاب: اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسان کو ہر زندگی کے ہر شعبے میں آزماتا ہے، اٹھنے میں بیٹھنے میں، کھانے میں پینے میں لباس میں پانے کھونے میں، شادی غمی میں تجارت وکاروبار میں کھیتی باڑی بس بادشاہی اور سلطنت میں سماجی اور معاشرتی اقتصادی اور دولت وغربت بیماری اور صحت، سیاحت اور تدبیر منزل عبادات ومعاملات یعنی کہ ہر بات میں امتحان ہوتا ہے اس میں کون سا اعتراض ہے اس کو کیوں حلال کیا اور اس کو

کیوں حرام کیا، علاوہ ازیں! جن چیزوں کو حرام کیا گیا ہے وہ آج کی سائنس یا علوم تجربات و مشاہدات کی بنا ثابت ہو چکیں ہیں کہ وہ چیزیں جسمانی یا روحانی طور پر واقعی نقصان کار ہیں۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں کہ جو چیز انہوں نے حرام کی ہے وہ دراصل ہمارے لیے ظاہری یا معنوی طور پر نقصان کار ہے، جس نے اللہ تعالیٰ پر ایمان اور بھروسہ نہ رکھا وہ ذلیل ہوتا رہا باقی یہ کہنا کہ اگر کوئی شراب بناتا ہے اس لیے کہ کون اس کو پیتا ہے اور کون اس سے پرہیز کرتا ہے اس پر کیا گناہ! تو ایسا سوال کرنے والوں کو شرم آنی چاہیے، اللہ تعالیٰ تو مالک ہے جس نے یہ کائنات پیدا ہی آزمائش کے لیے کی ہے، اس کو ہر طرح حق ہے کہ ہم سے پوچھے اور آزمائش کرے مگر دوسرے انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسروں کی آزمائش کرے اگر کوئی ایسے کرتا ہے تو وہ خود پہلے امتحان ہے اور جو خود امتحان میں ہو وہ دوسرے کا کیا امتحان لے گا یا اس کے امتحان کا اس کو کیا حق ہے؟ کیا یہ حضرات دوسرے انسانوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا مسند پر بٹھانے کے خواہ ہیں؟ اللہ اکبر ثابت کریں خدائی دعویٰ؟

ان صاحبوں سے عقل چھین لی گئی ہے جو اب اللہ تعالیٰ کے اختیارات اور اس کی خاص باتوں کو دوسرے انسانوں کے حوالے کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ یا وہ اپنی ہی عقل کے دشمن بننے کے لیے ایسے بودے ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔ ہوسکتا ہے ان لوگوں کو اعتراضات کے نمبر بڑھا کر اسلام دشمنی کا واشگاف اعلان کرنے کا شوق دامنگیر ہے، بہرحال یہ سوال سراسر فضول اور بیہودہ ہے۔

سوال ٦: دو بہنوں کو اکٹھے نکاح میں رکھنے کی منع میں کیا حکمت ہے؟

الجواب بعون الکریم الوھاب: ایسے سوالات صرف اعتراضات کے نمبر بڑھانے کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتے۔ اگر کوئی اسلام کا پیروکار ایسا سوال کرتا ہے تو اس کو ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں! اگر کوئی ملحد کرتا ہے تو پہلے وہ اسلام کو سچا مانے پھر کوئی دوسری بات کرے لیکن جو اسلام کو مانتا ہی نہیں ہے اس میں کسی بات کی حکمت کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ محض اپنا اور دوسروں کا ٹائم ضائع کر رہا ہے، بہرصورت اسلام کی اس مخالفت میں بھی عظیم حکمت ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ دو سوکنوں کی آپس میں اکثر نہیں بنتی، کبھی کبھی تو وہ حد سے بڑھ جاتی ہیں، ایک سوکن دوسری سوکن کو نقصان پہنچانے کے لیے گاہے بگاہے اس کی جان کے درپے ہوتی ہے جبکہ اسلام دو بہنوں کی آپس میں ایسی عداوت اور قطع تعلقی کو ہرگز پسند نہیں کرتا، اس لیے اسلام دو بہنوں کو ایک ساتھ جمع کرنے سے منع کرتا ہے۔ اگر دونوں کا ایک دوسری کو نقصان پہنچانے کا خیال بھی نہ رہے لیکن دل تو ایک دوسرے سے بغض آلودہ اور متنفر ہو جاتے ہیں اور یہ جو بات اسلام میں قطعاً پسند نہیں ہے کیونکہ یہ بات رشتہ داری چھیننے پر منتج ہوتی ہے اور رشتہ داری توڑنا بہت بڑا گناہ ہے۔ واللہ اعلم

سوال ۷: اگر پاکستان میں اسلام کی زنا کے متعلق شہادت والے قانون کو عمل میں لایا جائے تو اس سے زنا

بڑھ جائے گا؟

الجواب بعون الکریم الوھاب: میرے محترم دوستو! آپ لوگ ان سوالات کی نوعیت پر بھی تو غور کرو کیا ایسے سوالات کسی عقل یا ہوش وحواس رکھنے والے کے ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کا مطلب یہ ہوا کہ اگر چہ اس وقت پاکستان میں زنا کم ہے کیونکہ بڑھ جانا یہ کسی چیز کی فرع ہوتی ہے اس بات کی کہ پہلے یہ کم ہے لیکن اسلامی قانون شہادت کے عمل سے بڑھ جائے گا۔ حالانکہ یہ بات مشاہدات اور واقعات کے برخلاف ہے اس وقت زنا کے متعلق قانون شہادت ابھی عمل میں نہیں آیا ہے، تب بھی زنا اور اس کے اسباب ومحرکات ہمارے ملک پاکستان میں اس قدر زیادہ ہیں جو ان کے تجربہ کے بعد زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں کہ کیا یہ اسلامی ملک ہے؟ اسلامی معاشرہ یا سوسائٹی ہے؟ ملحد اور بے دین لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں جن کی وجہ سے زنا اور اس کے محرکات واسباب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر افسوس آج دیکھنے والوں کی آنکھیں دیکھنے سے محروم ہیں، ان کی آنکھوں کے سامنے معاشرہ کا بیڑہ غرق ہو رہا ہے مگر ان کو کچھ نظر نہیں آتا اور پھر اوپر سے یہ کہتے رہتے ہیں کہ اسلامی قانون شہادت عمل میں آئے گا تو زنا بڑھ جائے گا۔ تف ہو ایسی سمجھ پر۔ حیف ہو ایسی بے ہودہ سوچ پر! دراصل ان کو اسلامی تہذیب کی شناخت نہیں ہے اسلام جو کہ پاک سوسائٹی کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اس کو یہ لوگ جانتے تک نہیں ہیں، اسلام نے جو زنا کے قلع قمع کیلئے جو ارشادات عالیہ دیئے ہیں ان سے بھی یہ عقل کے دشمن سراسر ناواقف ہیں، اسلامی قانون شہادت کا زنا کے بڑھنے یا کم ہونے میں کوئی حصہ نہیں ہے اس قانون کا ایک مقصد ہے جو آگے بیان کیا جاتا ہے۔ (ان شاء اللہ)

زنا کے بڑھنے کے اسباب صرف یہ ہیں کہ اسلام جیسا سماجی نظام وجود میں لانا چاہتا ہے اور اس کے لیے جو احکامات اور اوامر ونواہی پیش فرمائے ان پر عمل نہیں ہے۔ اس حقیقت کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اسلام ہر وقت ٹکٹکی تیار کر کے نہیں کھڑا ہے کہ بس کوئی آئے اور اس پر چڑھ کر اس کا خاتمہ کیا جائے، بلکہ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "آخر الدواء الکی" یعنی داغنا آخری دوائی ہے، جو صرف اس حالت میں عمل میں لائی جاتی ہے جب مرض کا علاج دوسری دوائی سے نہ ہو رہا ہو۔ ایسے نہیں ہے کہ جس کو سر میں درد ہو اس کو داغ دیا جائے یا جس کو پیٹ میں درد ہو اس کو بھی داغ لگایا جائے، بعینہ اسی طرح اسلامی حدود ایک آخری چارہ کار ہیں۔ اس سے پہلے مسلمانوں کا معاشرہ ہوگا تو اول زنا کا بیج ہی ختم ہو جائے گا اس کے حدود کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی لیکن پھر بھی اگر ایسے معاشرے کے باوجود بھی کوئی نالائق منہ نکالتا ہے اور تمام پابندیوں کو توڑ کر نفس شیطان کا بندہ ہو جاتا ہے اور ایسی بدکاری کرتا ہے تو اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ دوسرے ایسے نالائق لوگوں کے لیے سبق بن جائے۔

نبی ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی مرد اجنبیہ غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت اختیار کرتا ہے تو تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوتا، یعنی شیطان ضرور ان کے دلوں میں ناجائز خیالات ڈالے گا اور وہی خیالات انسان کے ارادے کے

اسباب بن جاتے ہیں اور اگر ارادہ کیا تو جا کر برائی کے گڑھے میں گرے گا۔ لیکن یہ حضرات اگر جان بوجھ کر یہی پرچار کرتے ہیں کہ عورتوں کو نکالو ان کا پردہ چاک کروان کو کھلم کھلا میدانوں پر جلوہ افروز ہونے دو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر تفریح گاہ جیسا کہ میلے اور کلفٹن بازاریں وغیرہ آج کل بے پردہ عورتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ لوگ ان کی بے پردگی کی حمایت کیوں کرتے ہیں، صرف اس لیے کہ ان کی حریص اور شہوت پرست آنکھوں کی ضیافت کا سامان میسر ہو اور ان اچھی شکل وصورت والی حسین وجمیل عورتوں کو دیکھ کر ان کی بے لغام آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ ورنہ دوسروں کی عورت کو باہر نکالنے اور بے پردہ کرنے سے آخر ان کو اور کیا حاصل ہوتا ہے؟ جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ حضور ﷺ نے کسی غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے مگر آج کل کے مغرب زدہ انسان کالجز اور یونیورسٹیز میں مخلوط تعلیم کی کیوں حمایت کر کے اپنی بیٹیوں اور نور نظروں کو پروفیسروں اور شاگردوں کے ساتھ اکیلے ملاقات ومجلس کے لیے اور ان کے ساتھ کندھا کندھے کے ساتھ ملا کر ان نام نہاد تعلیمی اداروں کے گندے ماحول میں خود جا کر چھوڑ کر آتے ہیں۔

میرا اپنا چشم دید واقعہ ہے کہ یونیورسٹیز میں ایسے ماحول ہے جیسا کہ ہندوؤں کی کتابوں میں ملتا ہے کہ سری کرشن پانی کے بیچ میں بیٹھا ہے اور کتنی ہی گوپیاں اس کے اردگرد کھڑی ہیں بعینہ اسی طرح پروفیسر صاحب کرشن کا روپ بنا کے بیچ میں کرسی لگا کے بیٹھ جاتا ہے اور اس کے اردگرد زرق وبرق لباس میں ملبوس اور پاؤڈر اور لب اسٹک کی سرخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور اپنے حسن کے بے پناہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر وہ نوجوان لڑکیاں اس پروفیسر کے اردگرد گوپیوں کے روپ میں کرسیوں پر براجمان ہوتی ہیں۔ خدارا انصاف سے بتائیں ضمیر کی آواز کی طرف کان دے کر سنو، اس ہیئت اور کیفیت میں پروفیسر صاحبان کیا پڑھاتے ہوں گے اور وہ طالبات کیا سبق حاصل کرتی ہوں گی، کیا یہ بھی میرے لکھنے کے متقاضی ہے؟ اور پھر میرا یہ بھی تجربہ ہے کہ یہ پروفیسر محض ان نوجوان لڑکیوں کے منظور نظر بننے کی خاطر امتحانوں میں زیادہ نمبر دے دیتے ہیں حتیٰ کہ کچھ لڑکے ڈبل یا ٹرپل ایم۔اے کر رہے ہوتے ہیں اور وہ یونیورسٹی ''حور'' ایم۔اے کے پہلا امتحان دی رہی ہوتی ہے، پھر بھی اس کو اس لڑکے سے زیادہ نمبر ملیں گے اور وہ لڑکا جس کو زیادہ نمبر ملنے کا امکان ہوتا ہے اس کو کم نمبر دیئے جاتے ہیں۔

راقم الحروف کی آنکھوں نے کیا کچھ دیکھا ہے یہ داستان بہت لمبی ہے جس کو بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے تو ایسے ماحول میں اور ایسے جذبات سفلیہ کو بھڑکانے والے حالات میں نوجوانوں میں زنا کے محرکات اور اس کی مائل کرنے کی باتیں پیدا نہ ہوں گی تو کیا وہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما جیسے پاکباز انسان بنیں گے؟ یہاں پر اور بھی بہت کچھ لکھ سکتے ہیں، مگر سردست اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ب: اسلام کا حکم ہے کہ کوئی غیر مرد کسی غیر محرم عورت کی طرف نہ دیکھے، اسی طرح عورت کو بھی یہی حکم ہے کہ غیر مرد سے اپنی نظر کو جھکائے، (سورۃ النور) لیکن اس حکم کی ہمارے ملک پاکستان میں جو مٹی پلید کی جاتی ہے وہ

کسی سے مخفی نہیں ہے۔

ج: اسلام کا یہ حکم ہے کہ دوسرے کے گھر میں بغیر اجازت اور بغیر سلام کیے ہوئے مت داخل ہو، (سورۃ النور) نبی کریم ﷺ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آدمی نے کسی دوسرے کے گھر کے سوراخ وغیرہ سے گھر والوں کی بے خبری کی حالت میں دیکھا اور گھر والوں کو اس کا پتہ پڑ گیا اور انہوں نے کسی چیز سے اس کی آنکھ پھوڑ دی تو ان پر کوئی دیت وغیرہ نہیں ہوگی۔

د: اسلام کا حکم ہے کہ آپ کے خادم یا آپ کے چھوٹے بچے دو تین وقتوں میں اپنے والدین سے اجازت لے کر پھر آئیں۔ (۱) صبح کی نماز سے تھوڑا پہلے (۲) دوپہر کے وقت جب گھر والے گرمی کی وجہ سے کپڑے وغیرہ اتار کر سو رہے ہوں (۳) عشاء کی نماز کے بعد (سورۃ النور) یہ حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ اوقات خلوت کے ہوتے ہیں انسان اپنے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ...... خاص مصروف یا ایسے لباس میں ہوسکتا ہے جس میں ان کو دیکھنا جائز اور مناسب نہیں، کیونکہ اگر بچوں نے اس عمر میں ایسی چیز کا مشاہدہ کیا تو وہ شہوانی خیالات کی طرف متوجہ ہوسکتے ہیں، لہٰذا دین اسلام میں اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ چھوٹے بچے بھی اپنے والدین کے پاس ان اوقات میں بغیر اجازت کے نہیں جا سکتے۔ آج اسی دین کے پیروکاروں کا کیا حال ہے۔ ان کے گھر T-V سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن سے کئی فاحش ڈرامے، بیہودہ موسیقی اور انتہائی شرمناک باتیں نشر ہوتی ہیں۔ اجنبی عورتوں کی صورتیں واضح طور پر دیکھی جاتی ہیں، حالانکہ ان کو ان عورتوں سے نظروں کو جھکانے کا حکم ہے، خدا کے لیے ان پر کچھ غور کریں جن گھروں میں ایسے فاحش مناظر اور بے حیائی والی باتیں ہوں گی ان کی اخلاقی حالت کیا ہوگی؟ ایسے گھر فحاشی کے اڈے نہ بنیں گے تو کیا پاکیزہ انسانوں والے ماحول والے بنیں گے؟ دل اور نفس اسی طرح نفسانی خواہشات مرد اور عورت دونوں میں فطرتاً رکھی ہوئی ہے، پھر ایسے گھروں میں جب ایسے بے حیا مناظر نشر ہوں گے تو کیا ان شوق سے دیکھنے والوں مرد عورتوں کے دلوں میں سفلی جزبات کو بھڑکانے والے محرکات پیدا نہیں ہوں گے؟ یہاں کچھ اور بھی زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت ہے لیکن کاغذ کی تنگ دامنی اور مضمون کی طوالت سے بچنے کے لیے قلم کو روکنا پڑ رہا ہے۔

ہ: اسلام جاندار چیزوں کی تصویر کشی سے سختی سے روکتا ہے، اس سلسلے میں بے شمار احادیث تواتر کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں، تصویر کے ان بے انداز خرابیوں اور برائیوں میں سے ایک یہ بھی ہے اس فن کو اتنا فروغ دیا گیا ہے جو عورتوں کی چھپی تصویروں کو تو چھوڑو، ننگی تصاویر بھی راقم الحروف نے دیکھی ہیں، تم کسی بھی دکان پر جاؤ گے تو تقریباً ہر چیز پر عورت کی تصویر نظر آئے گی خاص طور پر دار اللباس پر جاؤ گے تو وہاں عورت کا بڑا مجسمہ نظر آئے گا، ایسا سب کچھ کیوں ہے؟

و: گانا بجانا، صحیح بخاری کی حدیث سے حرام وناجائز معلوم ہوتا ہے لیکن ہماری قوم کیا حال ہے جو گانے بجانے اور ڈانس وغیرہ سے اس کو فراغت ہی نہیں ملتی کیا گانے بجانے اور ساز وغیرہ کے برے نتائج سے ہمارے سمجھدار لوگ عاجز ہیں، میرے خیال میں گانا بجانا اور اس آواز وغیرہ سے انسان کے دل ودماغ پر ایسا خراب اثر پڑتا ہے اور اس کے عقل وپرور پر اتنا نشہ چڑھا دیتا ہے کہ اتنا نشہ شراب بھی نہیں چڑھاتی، ایسا ساز سننے والا جس عورت سے وہ ساز یا آواز سن رہا ہوتا ہے تو اس کو ایسے خیالات آتے ہیں ابھی ابھی اٹھ یا جاکر اس بہترین آواز والی عورت کو اپنی آغوش میں لے۔ ہمارے سلف صالحین نے ایسے ساز والی آواز کو زنا کا محرک یا رقیۃ الزنا تصور کیا ہے۔ اسی طرح کئی دوسری ایسی اشیاء وغیرہ ہمارے ملک میں بہت ہیں۔ کیا وہ ساری اشیاء زنا کی محرکات میں سے نہیں ہیں اور بالفعل اس کے اضافہ میں بہت بڑا رول ادا نہیں کیا ہے؟ کیا یہ سینمائیں وغیرہ زنا کے وجود میں لانے کی کامیاب فیکٹریاں نہیں ہیں؟ اگر یقیناً ہیں جیسا کہ یقیناً ہیں بھی تو پھر وہ معترض حضرات بتائیں اتنے بڑے زنا کا طوفان بدتمیزی میں آخر اسلام کا قانون شہادت کیا اضافہ کرے گا، آخر اس حالت میں اضافہ کی گنجائش کہاں ہے، پیمانہ پہلے ہی لبریز ہے، اگر کچھ ڈالو گے تو چھلک پڑے گا، باقی اس میں کیا اضافہ ہوگا؟ آپ نرم مزاجی سے میری گزارشات پر نظر ڈالیں، پھر سوچیں کیا میں نے جھوٹ لکھا ہے؟

بہرحال زنا اور اس کے محرکات کے اضافے کا سب سے بڑا سبب اسلامی قوانین کی پاسداری نہ کرنا اور اسلامی معاشرے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے ہوئے احکامات سے انحراف اور اوپر بیان کیے ہوئے بے حیائی کے کاموں سے لگاؤ رکھنے کی وجہ سے ہے۔

اب میں اسلام کی زنا کے متعلق شہادت کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں، اسلام نے جو احکامات، سوسائٹی اور معاشرے کو پاکیزہ رکھنے کے لیے دیئے ہیں، ان پر اگر ہم پوری طرح عزم واستقلال سے عمل کریں، تو نتیجتاً ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جس میں زنا تو دور کی بات ہے زنا کی بو بھی نہیں آئے گی اور نہ ہی اس تک پہنچنے کے اسباب ومحرکات ہوں گے، ایسے معاشرے میں اولاً زنا ہوگا ہی نہیں، لیکن پھر بھی اگر کوئی خبیث وبدباطن انسان جرأت کرکے ایسا انتہائی برا کام کرتا ہے تو اسلام نے اس کے لیے نہایت ہی سخت اور عبرتناک سزا تجویز کی ہے، یعنی اگر غیر شادی شدہ کنوارہ ہے تو اسے ۱۰۰ سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر شادی شدہ ہے تو اس کو رجم (سنگسار) کرنے کا حکم ہے، اور اس کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے تاکہ سب کو اس سے عبرت حاصل ہو، مطلب کہ اسلام کے احکامات پر عمل کرنے سے اول تو ایسی برائی وجود میں ہی نہیں آئے گا اگر اِکا دُکا واقعہ ہو بھی گیا تو اس کو سزا بھی ایسی ملے گی جس سے دوسرے بھی سبق حاصل کریں گے اور ایسی بے حیائی سے باز آئیں گے۔

اب جب کہ زنا کے لیے اتنی بڑی سزا مجوزہ ہے تو اس کے نفاذ کے لیے گواہی بھی ایسی پکی ہونی چاہیے، کیونکہ رجم (سنگسار) والا آدمی تو یقیناً ختم ہو جائے گا، لیکن جس کو سو کوڑے لگیں گے وہ بھی تو بڑے خطرے میں ہے، یعنی جان جانے کا بھی خطرہ ہے، لہٰذا انسانی حیاتی کو مدنظر رکھ کر اس کی ثابتی کے لیے ایسا سخت قانون شہادت مقرر کیا گیا ہے ورنہ اگر ایک دو آدمیوں کی گواہی کافی سمجھی جاتی تو پھر کتنے ہی لوگ محض اپنی ذاتی دشمنی اور عناد کی بنا پر کسی پرہیز گار آدمی کو بھی اس میں ملوث کر سکتے ہیں تاکہ اس کی جان جوکھے میں چلی جائے۔ اسی طرح کئی بے گناہ بھی اس کی لپیٹ میں آ سکتے ہیں۔ اس لیے قانون شہادت کو سخت مقرر کیا گیا ہے۔ اس صورت میں معاشرہ پاک ہونے کی وجہ سے اول تو زنا کا وجود ہی نہیں ہوگا اگر کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو بھی گئی اور دو تین آدمیوں نے دیکھ بھی لیا ہے لیکن چار گواہوں کا معاملہ پورا نہیں ہوا ہے، لہٰذا ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس کی پردہ پوشی کریں شاید وہ مرد بھی شرمندہ ہو کر اپنے کیے ہوئے گناہ پر از حد پشیمان ہو اور سچے دل سے توبہ تائب ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دے۔ بہرحال گواہوں کا اندازہ پورا نہیں ہے تو ان کو پردہ پوشی کرنی چاہیے کیونکہ ایسے پاکیزہ معاشرہ جس کے اکثر لوگ اس کام سے دور ہوتے ہیں، اس میں ایک دو مثالوں سے کوئی نمایاں نقصان نہیں ہوتا۔ اس لیے گواہوں کے نامکمل ہوتے کے موقع پر اس پر پردہ پوشی کرنا ہی بہترین طرز عمل ہے، نہ کہ ڈنڈا پیٹا جائے تاکہ جس کو پتہ نہیں ہے اس کو بھی پتہ چل جائے۔ اس طرح سے مسلم معاشرہ میں بے حیائی کی اشاعت ہوگی اور لوگ سوچیں گے کہ اس سوسائٹی میں بھی ایسے مرد یا خواتین موجود ہیں جن سے برائی کا کام پورا کروایا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ چیز اور زیادہ معاشرے کی خرابی کا باعث بن جائے گی۔ اور لوگ برائی کا سوچیں گے، اور پردہ پوش سے برائی کی اتنی اشاعت نہیں ہوگی۔ قرآن کریم میں بھی برائی کی اشاعت کے بارے میں سخت مذمت کی گئی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (النور: ١٩)

یعنی ''بیشک وہ لوگ جو ایمان والے لوگوں میں بے حیائی کی بات پھیلانا چاہتے ہیں ان کے لیے دنیا وآخرت میں دردناک عذاب ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی بے حیائی کی بات کو اشاعت کرنے سے جو خطرناک نتائج نکلیں گے یا تباہ کن اثرات پیدا ہوں گے ان کی سنگینی کا علم اللہ تعالیٰ ہی رکھتا ہے، تمہیں اس کا کوئی علم نہیں۔''

بہرحال بے حیائی جس طرح خود بے حد خراب اور بڑا گناہ کا کام ہے اس طرح اس کی اشاعت اور ترویج بھی نہایت ہی خراب اور گناہ کا کام ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ)) (مسلم)

''یعنی کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔'' مگر یہ ساری باتیں وہاں کارگر ثابت ہوں گی۔ جہاں اسلامی معاشرہ قائم ہوگا، باقی ہمارا ملک جس میں پہلے ہی بے حیائی کی فیکٹریاں اور کارخانے ہیں، اسلامی نظام والا معاشرہ ہی نہیں ہے بے حیائی کی باتیں عروج پر ہیں۔ برائی کے محرکات چپے چپے پر قدم قدم پر سامنے آرہے ہیں، ایسے ماحول میں کوئی بھی اسلامی قانون کارآمد ثابت نہیں ہوگا اگر چہ اس کی تقاضا کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی جائے لہٰذا ہمارے مسلمانوں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیے اور ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کوئی بھی اسلامی قانون برائی کو پھیلانے اور اس میں اضافے کا باعث نہیں بن سکتا، بلکہ اسلام کے سارے قوانین نور اور روشنی رشد و ہدایت کے راستے ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے دنیا آخرت دونوں میں انسان سرخرور ہوسکتا ہے اور برائی کا نام ونشان نیست و نابود ہو جائے گا، لیکن اگر ہمارا معاشرہ ہی خراب ہو تو بجائے اسلامی قوانین پر نکتہ چینی کرنے کے اپنے معاشرے کی اصلاح کرنی چاہیے لیکن لوگ خواہ مخواہ اپنی اندرونی خباثتوں کو ظاہر کرنے کی خاطر لوگوں کے سامنے فضول اور بیہودہ سوالات اٹھا کر کوئی ان کی خدمت نہیں کر رہے اور نہ ہی مجموعی طور پر انسانی بھلائی کا سامان اکٹھا کرتے ہیں محض اپنا منہ خراب کرتے ہوئے اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

سوال ۸: کوئی بچہ مسلمان کے گھر میں تو کوئی ہندو کے گھر میں پیدا ہوتا ہے تو پھر نتیجہ پر اعتراض کیوں؟

الجواب بعون الکریم الوھاب: حقیقت میں اس سوال کا جواب تقدیر والے سوال کے جواب میں ذکر کر دیا ہے، لہٰذا اس کو دہرانا سراسر بے فائدہ ہے کیونکہ جو پہلے ذکر کر کے آیا ہوں اس پر تھوڑا غور کرو گے تو آپ کو جواب مل جائے گا۔ لیکن جب آپ نے سوال کیا ہے تو مجبوراً کچھ عرض کرنا پڑ رہا ہے۔ اول تو سوچ کی بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر ایک کی فطرت صحیح سالم پیدا کی ہے (جس طرح قرآن کریم اور حدیث شریف میں ذکر کر کے آیا ہوں لیکن یہ ہندو یا مسلمان، عیسائی یا یہودی، مجوسی یا ملحد کیمونسٹ یا دھریے یہ ساری تفریق انسانوں نے خود اپنے اختیار کو غلط استعمال کرتے ہوئے وجود میں لائی ہیں، اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کیا قصور، باقی اللہ سبحانہ وتعالیٰ سب کو مسلمانوں کے گھروں میں پیدا کرتا ہے تو اس کا مطلب دوسرے الفاظوں میں اس طرح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سب کو مسلمان کرنا یہ تب ہی ہوسکتا تھا جب اللہ تعالیٰ انسانوں سے دنیا میں دیا ہوا اختیار سلب کر لیتا اور ان کو کسی بھی راستے لینے کا اختیار ہی نہ ہوتا اور انسان محض مشینی صفت تخلیق بن جاتا جس طرح سورج، چاند، ستارے اور دوسرے اجرام فلکی بغیر شعور اور بغیر اپنے اختیار وارادے کے اپنے مدار پر حرکت کرتے ہیں، انسان بھی اگر اس طرح بے شعور اور بے ارادہ جمادات کے زمرے میں آتا تو پھر انسان کا فضل کمال کہاں سے آتا اس کے علم سے جو وجود میں آیا وہ کہاں سے آتا۔ اشرف المخلوقات کا لقب کیسے ملتا اور اعلیٰ مرتبہ کیسے حاصل کرتا؟ انسان کا مرتبہ بلند اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے ارادہ واختیار سے کوئی اعلیٰ درجے کا کام سرانجام دیتا ہے ورنہ مشینی صفت کی کسی بھی

چیز کو کوئی بھی داد نہیں دیتا، اس حقیقت کو سمجھنے سے یہ لوگ قاصر ہیں تو اس کے لیے راقم الحروف کیا کچھ کر سکتا ہے، علاوہ ازیں! میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انسان یہاں امتحان گاہ میں ہے، لہٰذا اس کو مجبور محض بنایا۔ سراسر خلاف ہے آزمائش ارادے کی آزادی کے متقاضی ہے۔ لہٰذا اس ارادے کی تذادی سے لازماً مختلف راستے پیدا ہونے تھے پھر اعتراض کس چیز کا؟ مزید یہ گذارش کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل جیسی بے بہا قوت سے نوازا ہے۔ تو ہندو کے گھر پیدا ہونے والا یا کسی اور کے گھر پر پیدا ہونے والا بچہ اس کو بھی عقل جیسی نعمت ملی ہوئی ہے جب تک نابالغ ہے اس پر کوئی قلم نہیں ہے کیونکہ اس وقت یہ کامل عقل والا نہیں ہے، لیکن بلوغت کے بعد انسان عقل کے کمال کو پہنچ جاتا ہے، لہٰذا وہ چاہے تو عقل سے کام لے کر مسلمان ہو سکتا ہے اور کتنے ہی ہندو بلوغت کے بعد تحقیق کر کے قرآن وحدیث کا تدبر سے مطالعہ کر کے اسلام کے پیروکار بن گئے ہیں۔ ہندوں مخالفوں کی مخالفت کے باوجود اسلام کو ترک نہیں کیا۔ ایسے مقالات ہمارے سامنے موجود ہیں۔ لہٰذا صرف ہندو کے گھر میں پیدا ہونا اسلام کے ترک کے لیے ایک بے حقیقت بہانہ تو بن سکتا ہے لیکن صحیح جواب ہرگز نہیں بنتا۔ قیامت کے دن کوئی بھی انسان یہ نہیں کہہ سکے گا کہ اے اللہ تو نے مجھے ہندو کے گھر میں پیدا کیا اور میں مجبور تھا، اگر کسی نے اس طرح کیا تو آپ فرمائیں گے کہ فلاں کیا میں نے تم کو عقل جیسے انمول موتی سے نہیں نوازا تھا؟ کیا تو اس سے کام لے کر سیدھا راستہ نہیں لے سکتا تھا؟ آخر تو نے آباء واجداد کی تقلید سے منہ موڑ کر اور بندھن توڑ کر حق کا راستہ کیوں نہیں لیا۔ حالانکہ دنیاوی معاملات میں تو نے کئی اعتبار سے زمانے کے حالات کے تقاضے کے مطابق آباء اجداد کی باتوں کو ترک کیا۔ تو پھر اسلام اور کفر کے متعلق سوچ کر اپنے آباء اجداء کی تقلید کو توڑ کر سیدھا راستہ کیوں اختیار نہ کیا؟ اس سوال کا جواب نہ ان کے پاس اب ہے اور نہ ہی قیامت کے دن ہوگا، بہر حال اگر عقل ہے تو یہ سوال ختم ہے کہ ہندو کے گھر میں پیدا ہوا ہے، ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ ہندو کے گھر پیدا ہونے والے بچے عقل سے کام لے کر مسلمان بن جاتے ہیں لیکن مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے والے بچے عقل سے کام نہ لے کر گمراہی کو اختیار کرتے رہتے ہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ صرف مسلمان یا ہندو کے گھر میں پیدا ہونا ہدایت گمراہی کے لیے کافی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ سوال بیہودگی، حماقت اور بے عقلی کا نمایاں ثبوت ہے۔ مزید گزشتہ صفحات کا مطالعہ کریں گے تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔ (واللہ اعلم)

سوال ۹: لیلۃ القدر کے متعلق وضاحت فرمائیں؟

الجواب بعون الملك الكريم الوهاب: اس کرۂ ارض کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنایا ہے کہ ہر علاقے خاص طور پر دور دراز کے علاقے ان کا وقت الگ الگ کیا ہے کہیں دن ہے تو کہیں ابھی رات ہے، کہاں پر رات ختم ہونے والی ہوتی ہے تو کہیں پر رات ابھی شروع ہو رہی ہوتی ہے، بہر حال اسی اوقات کے اختلاف کی وجہ سے اسلامی عبادات وغیرہا کے اوقات ہر ملک میں الگ الگ ہیں، مثلاً ہمارے ملک میں ہم عشاء پڑھ کر فارغ ہوتے ہیں، تو انگلینڈ میں ابھی عصر کا وقت ہوتا ہے کیونکہ وہاں پر سورج ہمارے ملک سے پانچ چھ گھنٹے بعد طلوع

غروب ہوتا ہے لہٰذا پوری دنیا کے ملکوں میں ان عبادات کا ایک وقت مقرر کرنا درست نہیں ہے بلکہ ہر ملک عبادت کے اوقات وہاں کے حساب سے مقرر کیے جاتے ہیں، آپ کو معلوم ہوگا کہ عید الاضحیٰ سال میں صرف ایک مرتبہ ہوتی ہے لیکن سعودی عرب میں ہم سے ایک دو دن پہلے ہوتی ہے کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم عید الاضحیٰ کے اجر و ثواب سے محروم رہ جائیں گے؟ ہرگز نہیں، اسی طرح خود رمضان المبارک بھی حجاز سے ایک دو دن بعد ہمارے پاس آتا ہے، تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابتدائی ایک دو روزے ہم سے رہ گئے ہیں یا وہ ہمارے پاس بالکل آتے ہی نہیں ہیں؟ ہرگز اس طرح نہیں ہے۔ اسلام جو کہ عالمگیر مذہب ہے۔ ساری دنیا کے لیے ہے۔ اس لیے رمضان المبارک کی باقی عبادات ہمارے ہاں ہمارے وقت کے مطابق عمل میں لائی جائیں گی۔ صحیح حدیث میں ہے چاند دیکھ کر روزے رکھو اور چاند دیکھ کر روزے ختم کرو، لہٰذا ہمارے ہاں رمضان شروع تب ہوگا جب چاند نظر آئے گا، دوسرے ممالک میں چاہے پہلے نظر آئے یا بعد میں وہ ان ملکوں کے وقت کا مدار ہے، جہاں بھی چاند نظر آئے گا، وہاں رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو جائے گا، لہٰذا ہر قدر کی رات بھی ہر ایک ملک کے لیے اس حساب سے آئے گی، جہاں یہ چاند ہم سے ایک دو دن پہلے نظر آیا ہے وہاں ہر قدر کی رات ہم سے ایک دو دن پہلے نظر آئے گی اور جہاں چاند بعد میں نظر آئے گا وہاں قدر کی رات بھی اتنی ہی بعد ہوگی۔ یہ رات قدر کی سال میں ایک ہی رات کے برخلاف ہرگز نہیں ہے، یعنی قدر کی رات سال میں برابر ایک ہی ہوتی ہے لیکن ہر ملک میں اپنے اپنے وقت کے مطابق ہوگی، اگر سعودی عرب کے لیے شب قدر ایک ہے تو ہمارے لیے بھی ایک ہی ہے، اسی طرح پوری دنیا کے لیے سال میں، ایک ہی رات ہے۔ اور ہر سال میں ایک ہی رہے گی۔ لیکن سورج کے طلوع و غروب کے اوقات مختلف ملکوں میں مختلف ہونے کی بنا پر اس کا (شب قدر) کا وقت بھی مختلف ہے، اس طرح ہم تو کیا ساری دنیا کے لوگ لیلۃ القدر کے خیر و برکت سے محروم نہیں رہیں گے۔ یہ اللہ رب العزت کا فیصلہ ہے۔ آپ سوچیں صرف لیلۃ القدر نہیں باقی عبادات کے اوقات بھی مختلف ملکوں میں مختلف وقت میں ہوتے ہیں۔ مثلاً عید الفطر، یوم ۹ ذوالحجہ، عید الاضحیٰ خود رمضان المبارک بلکہ سال کے ۱۲ مہینے بھی ہر جگہ پر ایک ہی دن یا ایک ہی وقت پر نہیں ہوتے۔ مثلاً: سعودیہ میں شروع سال کا ابتدائی مہینہ (محرم) شروع ہو جاتا ہے لیکن ہمارے یہاں ابھی ذوالحجہ ہی چل رہا ہوتا ہے کیا یہ واضح حقیقت نہیں ہے؟ اللہ چونکہ رب العالمین ہے اس نے ہر ملک کے آدمیوں کو اپنی مہربانیوں اور فیضانہ عنایات سے ہرگز محروم نہیں رکھا ہے بلکہ ہر ملک کے باشندے کو اس کو حاصل کرنے کا موقعہ فراہم کیا ہے جو کہ اس کے اپنے اوقات کے ساتھ منحصر ہے۔ اس مہربانی اور خیر و برکت کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدائے عام ہے اگر کوئی اپنی ہی نالائقی کی وجہ سے ان برکات سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے گریبان میں خود جھانکے۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم والحمد للہ الذی بنعمۃ تتم الصالحات وصلی اللہ علی خیر خلقہ سیدنا محمد خاتم النبیین وآلہ واصحابہ وبارك وسلم.

انا احقر العباد محب اللہ شاہ عفا اللہ عنہ

آٹھ اہم سوالات کے جوابات

القطوف الدانية فی اجوبة السوالات الثمانية ، ''آٹھ سوالات کے جوابات'' شاہ صاحب رحمہ اللہ سے محمد عارف نامی شخص نے جس کا تعلق ضلع سیالکوٹ سے تھا آٹھ سوال لکھ کر ارسال کیے اور جواب طلب کیے تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان کا علمی جواب تحریر کر کے ان کو ارسال کیے، استفسار عام کے لیے پیش خدمت ہے۔(الازہری)

سوال ۱: وضو شروع کرتے وقت پوری بسم اللہ یا صرف بسم اللہ والحمدللہ پڑھنی چاہیے۔

سوال ۲: رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے چاہیے یا نہیں جیسا کہ اہل علم باندھتے ہیں اور اگر نہیں تو پھر حدیث تحریر فرمائیں؟ اور اس کے متعلق اگر آپ نے کوئی کتاب لکھی ہو تو بھیج دیں تا کہ تسلی ہو سکے؟

سوال ۳: وتروں میں دعا قنوت رکوع کے بعد پڑھنی چاہیے یا رکوع سے پہلے ہاتھ اٹھا کر یا ہاتھ باندھ کر یا کھلے چھوڑ کر اور تین رکعت وتر کی دو سلام سے پڑھتے وقت نیت کس طرح ہو؟ صرف قرآن وحدیث کے عین مطابق جواب دیں۔

سوال ٤: خطبہ جمعہ زوال سے پہلے شروع کرنا اور سورج ڈھلتے ہی جماعت کھڑی کر دینا سنت طریقہ ہے یا نہیں؟ اور جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے اور دوران خطبہ آنے پر جو دو رکعت پڑھی جاتی ہیں وہ سنت کہلاتی ہیں یا نفل؟ صحیح حدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

سوال ۵: اعادۂ روح کا عقیدہ قرآن وحدیث کے مطابق ہے یا مخالف اور کیا یہ عقیدہ رکھنا شرک ہے، اور قرآن پاک کی آیت کے خلاف تو نہیں؟

سوال ٦: دینی امور میں قرآن پاک کی تعلیم دینا امامت کرانا خطبہ دینا جلسوں میں تقریر کے لیے جانا وغیرہ پر اجرت لینا صحیح حدیث کے مطابق ہے یا غلط ہے؟

سوال ۷: فرض نمازوں کے بعد اجتماعی، انفرادی دعا کرنا سنت سے ثابت ہے یا بدعت ہے؟

سوال ۸: بریلوی، دیوبندی کے پیچھے نماز پڑھ لینے سے نماز ہو جائے گی یا نہیں' اور اس صورت میں جہاں ہوں ہی بریلوی اور دیوبندی جبکہ حکم یہ ہے کہ جب اذان کی آواز سن لو تو مسجد میں جماعت کے لیے حاضر ہونا ضروری ہے سوائے شرعی عذر کے۔

اس سلسلہ میں کوئی کتابچہ ہو تو وہ بھی بھیج دیں، شکریہ۔ امید ہے آپ جواب جلدی دیں گے۔

آپ کا خیر اندیش

محمد عارف

جوابات

الجواب بعون الوھاب .

سوال نمبرا کا جواب:

ا۔صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو کی ابتدا میں ''بسم اللہ والحمد للہ'' پڑھنا چاہیے جیسا کہ الطبرانی الصغیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((قال رسول الله ﷺ یا ابا هريرة اذا توضات فقل بسم الله والحمد لله فان حفظتك لا تبرح مكتب لك الحسنات حتى نحدث من ذلك الوضوء))

''اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جب تو وضو کرے تو بسم اللہ، والحمد للہ کہا کرو کیونکہ تم پر جو اللہ تعالیٰ کے نگران فرشتے ہیں، وہ تمہارے لیے نیکیاں لکھتے رہیں گے، جب تک کہ تم اس وضو سے محدث (بے وضو) نہ ہو جاؤ۔''

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کی اسناد حسن ہے۔(مجمع الزوائد ا/۲۲۰)

۲۔اور وضو کے دوران یہ دعا پڑھنی چاہیے:

((اللهم اغفرلى ذنبى ووسع لى فى دارى وبارك لى فى رزقى))

جیسا کہ امام نسائی، امام حاکم اور دیگر ائمہ نے اس کو حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الاذکار میں اس کی سند کی تصحیح کی ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الاذکار میں اس کی تصحیح پر اعتراض کیا ہے لیکن یہ اعتراض عند المحققین مرفوع ہے۔واللہ اعلم

سوال نمبر۲ کا جواب:

میری تحقیق یہی ہے کہ رکوع کے بعد قیام میں ہاتھوں کو چھوڑ دینا چاہیے باندھنا نہیں چاہیے۔اس مسئلہ میں راقم الحروف نے ایک سندھی زبان میں ضخیم کتاب لکھی تھی بعد میں چند احباب کے کہنے پر اردو زبان میں بھی ایک رسالہ مختصر بنام ''نیل الامانی وحصول الآمال'' لکھا اس پر بھائی صاحب جناب سید بدیع الدین شاہ نے تنقید فرمائی میں نے پھر اس کا جواب لکھا جو حال ہی میں کراچی سے طبع ہوا ہے میں یہ دونوں کتابیں ارسال کر رہا ہوں، آپ گہری نظر سے مطالعہ کر کے ان کے متعلق اپنے چند تاثرات ضرور لکھ بھیجیں۔

سوال نمبر۳ کا جواب:

ا۔وتر میں قنوت رکوع سے پہلے بھی آئی ہے رکوع کے بعد بھی آئی ہے جیسا کہ نسائی شریف وغیرہ کتب حدیث سے صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے یعنی یہ دونوں امر جائز ہیں۔

البتہ میری تحقیق بخاری وغیرہ کی حدیث سے یہی ہے کہ اکثر طور پر وتر میں قنوت رکوع سے قبل پڑھنی چاہیے اور فرض نماز میں رکوع کے بعد۔ لیکن حدیث کی رو سے دونوں باتیں وارد ہیں باقی اگر رکوع سے قبل قنوت پڑھے تو ہاتھ باندھ کر اور اگر رکوع کے بعد تو ہاتھ چھوڑ کر۔

۲۔ خاص طور پر وتر میں دعاء قنوت کے لیے نبی کریم ﷺ سے کوئی حدیث تاحال ایسی دیکھنے میں نہیں آئی جس میں یہ وارد ہو کہ اس میں آپ ہاتھ اٹھا کر پڑھا کرتے تھے یا ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے البتہ فرض نماز میں قنوت پڑھنے کے لیے ہاتھوں کے اٹھانے کی حدیث صحیح۔ امام احمد کے مسند وغیرہ میں وارد ہے لہٰذا مجھ سے جو پوچھتا ہے کہ وتر کی دعا قنوت میں ہاتھ اٹھانے چاہئیں یا نہیں تو میں ان کو یہ جواب دیتا ہوں کہ جو کام فرض نماز میں جائز ہے وہ نوافل میں بھی جائز ہے جب فرض نماز میں قنوت نازلہ میں ہاتھ اٹھانے ثابت ہیں تو وتر جو صحیح مسلک قرآن وحدیث کے مطابق فرض نہیں ہے بلکہ نفل ہے تو اس میں بھی ہاتھ اٹھانے جائز ہوتے ہیں یعنی اگر کوئی اٹھائے تو اس کو بھی جائز کہنا چاہیے البتہ اس کو ضروری یا نبی ﷺ کی واردہ سنت تصور نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے وتر میں ہاتھ اٹھانے کے آثار ہیں لہٰذا میں تو اس کو صرف جائز سمجھتا ہوں اور ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ رکوع کے بعد قنوت پڑھتا ہوں اور ہاتھ بھی اٹھا لیتا ہوں۔ واللہ اعلم

۳۔ وتر کا طریقہ اکثر طور پر دو سلام سے ہی صحیحہ حدیثوں میں میں وارد ہے البتہ ایک سلام سے بھی حدیث میں آیا ہے لیکن اس صورت میں دوسری رکعت پر بھی تشہد کے لیے بیٹھنا نہیں ہے بلکہ تیسری اور آخری رکعت میں بیٹھ کر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیر دینا چاہیے جیسا کہ احادیث میں وارد ہے اور حدیث میں (سنن دارقطنی) وغیرہ میں یہ بھی آیا ہے کہ وتر کو مغرب نماز کے مشابہہ نہ بناؤ۔ لہٰذا اگر وتر ایک سلام سے پڑھے تو بیچ میں قعدہ نہ کرے کیونکہ اس صورت میں وتر مغرب نماز سے مشابہہ ہوگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وتر قنوت سے مغرب نماز سے ممتاز ہو جائے گا۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ قنوت نازلہ نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیثوں میں پانچوں فرائض ''جن میں مغرب بھی آجاتی ہے'' میں وارد ہے لہٰذا قنوت سے وتر کی مغرب سے مشابہت ختم نہیں ہوگی یہ مشابہت صرف اس صورت میں ختم ہوگی کہ بیچ میں قعدہ نہ کیا جائے یا احناف جو دعا قنوت پڑھتے وقت ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہہ کر پھر ہاتھ باندھ کر قنوت پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح مغرب سے مشابہت ختم ہوگئی یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ طریقہ محدثہ ہے، نبی کریم ﷺ سے اس طرح ثابت نہیں۔ باقی رہی نیت تو یہ ابتداء ہی میں پہلی رکعت کے شروع کرتے وقت تین رکعات ہی کی کی جائے گی رہا بیچ میں سلام کا تخلل تو یہ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کی وجہ سے ہے اور ہم یہ کرتے بھی سنت کی وجہ سے ہی ہیں۔ ہمیں حکم بھی سنت کے اتباع کا ہے۔ واللہ اعلم

سوال ۴ کا جواب:

۱۔ صحیح بخاری، فتح الباری وغیرہما سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ زوال سے پیشتر نہیں بلکہ زوال ہوتے

ہی آجاتے اور خطبہ شروع کرتے اور خطبہ میں زیادہ وقت نہ لیتے تھے اور پھر نماز شروع فرما دیتے اور صحیح حدیث میں آپ کا ارشاد بھی موجود ہے کہ خطبہ کا چھوٹا کرنا اور نماز کو لمبا کرنا یہ آدمی کی فقاہت (دین کی سمجھ) کی علامت ہے بہرحال صحیح حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ اور نماز سب زوال کے بعد ہوا کرتے البتہ زوال ہوتے ہی تشریف لاتے البتہ جمعہ کے دن زوال سے قبل اور استواء سراج کے وقت بھی نوافل پڑھنے کی اجازت ہے جیسا کہ احادیث سے نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ جمعہ کے دن نبی کریم ﷺ نے خطبہ و نماز سے کافی پہلے مسجد میں آنے کی ترغیب دلائی ہے اور بڑے اجر وثواب کی خبر دی ہے اور فرمایا کہ آدمی کو مسجد میں سویرے آنا چاہیے اور نوافل پڑھتا رہے پھر جب امام آئے تو چھوڑ کر توجہ سے خطبہ سنے لہٰذا خطبہ سے قبل جتنے کچھ نوافل پڑھے گئے وہ آپ ﷺ کی قولی سنت ہوئے اور خطبہ کے دوران بھی آپ ﷺ کا ہی حکم وارشاد ہے کہ آپ میں سے جب کوئی مسجد میں آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو اس کو بھی بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھنی چاہئیں اور ان کو لمبا نہ کرے بلکہ تخفیف کرے لہٰذا یہ بھی قولی سنت ہی ہوئی ہے۔ واللہ اعلم

سوال نمبر ۵ کا جواب:

قبر میں سوال وجواب کے لیے روح کے اعادہ کا عقیدہ صحیح حدیث سے جو صحیح مسلم وامام کے احمد کے مسند وغیرہ میں صحیح سندوں سے ثابت ہے لہٰذا یہ عقیدہ شرک کیسا؟ اور یہ عقیدہ قرآن کریم کی کسی آیت کے خلاف نہیں کیونکہ یہ اعادہ عالم برزخ میں ہے جس کے احکام اس دنیوی عالم سے بالکلیہ مختلف ہیں ان کے احکام کو دنیاوی باتوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا یہ اعادہ دنیوی ہوتا تو اس کے متعلق کچھ نہ کچھ زبان کھولنے کی گنجائش ہوتی لیکن جب یہ بات ہی عالم برزخ ہے اور یہ عالم بالکل علیحدہ عالم ہے لہٰذا اس سے کوئی استحالہ لازم نہیں آتا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جمہور سلف صالحین کا یہی عقیدہ ہے اس سے انکار یا تو معتزلہ نے کیا ہے یا آج کل کے کچھ ملحد یا مدعی اجتہاد۔ اللہ تعالیٰ گمراہی سے پناہ میں رکھے۔ آمین واللہ اعلم

سوال نمبر ۶ کا جواب:

قرآن کریم وغیرہ تبلیغ دین کے لیے سنا کر اس پر اجرت لینا جائز نہیں، قرآن کریم فرماتا ہے:

﴿قُلْ لَا اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا﴾ الآية (الشورىٰ: ۲۳)

البتہ قرآن کریم سکھلانا یا اس کی اور علوم دینیہ کی تعلیم دینا اور تدریس کرنا اس پر اجرت لی جاسکتی ہے۔

صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک آدمی جس کو سانپ نے ڈس لیا تھا اس پر سورۃ فاتحہ سے دم کیا اور وہ اچھا ہو گیا پھر انہوں نے معاوضہ میں بکریاں لیں نبی کریم ﷺ نے اس معاوضہ کو بحال رکھا اس کو

جائز قرار دیا اور مزید یہ فرمایا کہ قرآن پر جو تم لیتے ہو وہ زیادہ حق ہے۔

بہرحال جملہ دلائل کو دیکھ کر یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ دین کی تبلیغ کرنی ہے یا قرآن سنا کر تبلیغ اسلام وشریعت کرنی ہے تو اس پر اجرت نہیں لینی چاہیے البتہ کسی کو قرآن پڑھ کر دم کرے یا معلم بن کر محنت کرے یا بچوں کو قرآن پڑھائے یا دینی علوم کی مدارس میں تعلیم دے تو یہ تبلیغ کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ محنت ہے جو وہ کرتا ہے۔ لہٰذا اس پر معاوضہ درست ہے، ان دونوں میں جو فرق ہے اس کو خوب غور وفکر کر کے سمجھ لینا چاہیے اسی طرح امامت وخطابت کا معاملہ ہے اگر کوئی مسکین وفقیر ہے اور وہ اپنا کام یا کوئی دھندا ومشغلہ ترک کر کے خطابت وغیرہا کے فرائض انجام دیتا ہے تو اگر اس کو معاوضہ نہ دیا جائے گا تو وہ اپنی زندگی کی ضروریات کو کس طرح پورا کرے گا اگر ایک آدمی سب کچھ چھوڑ کر اسی کام میں لگ گیا ہے تو ان کو اس کا معاوضہ دینا چاہیے لیکن یہ دین کی تبلیغ کا صلہ نہیں بلکہ اس محنت کا صلہ ہے جو وہ اپنا سب کچھ ترک کر کے کر رہا ہے ورنہ اگر وہ یہاں متعین نہ ہوتا تو کوئی مشغلہ اختیار کر کے اپنے روزگار کا انتظام کر لیتا۔ اسی طرح جلسوں وغیرہ میں جانے کا معاملہ ہے۔ اگر جہاں جلسہ ہو رہا ہے وہ کافی دور رہے اور وہاں پہنچنا کافی رقم صرف کیے بغیر آسان نہ ہو تو جو بلانے والے ہیں وہ ان کو اتنا خرچہ دیں جس سے وہ وہاں پہنچ جائے۔

ہاں تبلیغ پر وہ ان سے کچھ رقم طے کر کے لے یہ جائز نہیں۔ البتہ بلانے والے اپنی مرضی سے (بلاتقاضے کے) ان کو ہدیۃً کچھ دے دیں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ واللہ اعلم

سوال نمبر ۷ کا جواب:

جامع ترمذی میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کونسی دعا زیادہ سنی جاتی ہے (مقبول ہوتی ہے) آپ ﷺ نے فرمایا رات کا آخری حصہ اور فرائض (پانچوں وقتوں کی نمازوں) کے پیچھے امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے، اس سے معلوم ہوا کہ فرضی نمازوں کے بعد بھی دعا کی قبولیت کا زیادہ امکان ہوتا ہے اور دعا بغیر ہاتھ اٹھائے بھی کی جاسکتی ہے اور ہاتھ اٹھا کر بھی کی جاسکتی ہے کیونکہ دعاء میں ہاتھوں کے اٹھانے کا ذکر بہت سی احادیث قولیہ وفعلیہ میں وارد ہے اور ہاتھ اٹھانا دعاء کے خاص آداب میں سے ہے۔

سنن الکبریٰ للامام البیہقی: ۲/۱۳۳ میں ایک حدیث ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((وهذا الدعاء فرفع يديه حذو منكبيه)) الخ

یعنی آپ ﷺ نے اپنے کندھوں کے برابر اپنے ہاتھ مبارکہ اٹھائے اور فرمایا کہ یہ ہے دعا یعنی دعاء اس طرح مانگنی چاہیے کہ ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھانا چاہیے۔

معلوم ہوا کہ دعا میں ہاتھ اٹھانا دعا کے آداب میں سے ہے۔ اسی طرح صحیح ابن حبان وغیرہ میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے جب میرا بندہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے تو مجھے حیاء آتی ہے کہ میں اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹاؤں۔ بہرحال ہاتھ اٹھانا دعاء میں دعاء کے آداب میں سے ہے اور وہ مندوب ومستحب ہے اور چند وقائع بھی احادیث صحیحہ میں مروی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دعاء میں ہاتھ اٹھائے اور صحیح مسلم میں صلوٰۃ الخوف کے بعد بھی ہاتھ اٹھانے مذکور ہیں۔ (یعنی آپ ﷺ نے اٹھائے) جب دعا میں ہاتھ اٹھانے مسنون ومستحب ہیں تو فرض نماز کے بعد اگر کوئی دعا کرنا چاہے تو وہ کیوں ہاتھ نہ اٹھائے حالانکہ ترمذی والی حدیث سے معلوم ہوا کہ فرض نماز کے بعد بھی دعاء کی قبولیت کا زیادہ موقع ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے تو ابن ابی شیبہ کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نماز فجر کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ یہ روایت ابن ابی شیبۃ کے مصنف میں تو دیکھنے میں نہیں آئی ہوسکتا ہے کہ ان کے ''المسند'' میں ہو لیکن وہ اس وقت ہمارے پاس نہیں۔

بہرحال مذکورہ قولیہ احادیث سے اتنا تو ثابت ہوگیا کہ نماز فرض کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے مستحب ہیں لہٰذا انفراداً تو دعاء کے لیے ہاتھ اٹھانا جائز ہوا باقی رہا اجتماعی طور پر تو صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ ایک آدمی آیا اور قحط سالی کا شکوہ کیا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک دعاء کے لیے اٹھائے اور لوگوں نے بھی اپنے ہاتھ اٹھائے۔ الخ

اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو کہا کہ تم بھی ہاتھ اٹھاؤ بلکہ آپ ﷺ کے ہاتھ اٹھاتے ہی انہوں نے بھی ہاتھ اٹھا لیے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کا معمول تھا کہ جب آپ ﷺ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو وہ بھی ساتھ ہی اپنے ہاتھوں کو اٹھا لیتے تھے۔

اس حدیث میں گو فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنے کا بیان نہیں لیکن اس سے فی الجملہ اجتماعی دعا کرنا اظہر من الشمس ہے۔

۲۔ ایک حدیث بھی ملاحظہ فرمایئے جو قولی ہے۔ یہ روایت امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنے مستدرک ۳/ ۳۴۷ میں وارد کی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ حضرت حبیب بن مسلمۃ الفہری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ فرماتے تھے:

((لا يجتمع ملأ فيد عوبعضهم ويؤمن البعض الا اجابهم الله))

یعنی کوئی جماعت بھی ایک جگہ جمع ہوکر دعا کرے ایک ان میں سے دعاء مانگے اور دوسرے اس پر آمین کہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعاء کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔

اس حدیث کی سند حسن ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے مستدرک کی تلخیص میں اس روایت کو بحال رکھا اس پر کوئی

جرح نہ فرمائی اس کے سب رواۃ ثقہ وصدوق ہیں۔ابن لہیعہ میں کلام ہے لیکن جب ان سے عبداللہ بن المبارک، ابوعبدالرحمٰن المقری جیسے تلامذہ روایت کریں تو وہ مقبول ہوتی ہے یہاں بھی ان سے ابوعبدالرحمٰن المقری (عبداللہ بن یزید) راوی ہے لہٰذا یہ روایت ان کی صحیح ہے۔

ابن لہیعہ مدلس بھی ہے لیکن اس روایت میں انہوں نے ''حدثنی'' کہہ کر سماع کی صراحت کردی لہٰذا یہ روایت قوی وجید ہے اسی لیے حافظ ذہبی بھی اس پر خاموش رہے۔واللہ اعلم

اس حدیث سے اجتماعی طور پر دعاء کرنا مندوب معلوم ہوتا ہے۔اور حدیث میں ''ملأ'' کا لفظ ہے جس سے ہر جماعت مراد لی جاسکتی ہے خواہ وہ نماز فرض کی جماعت ہو یا علم وتبلیغ کے لیے اجتماع ہو یا کسی جلسہ کا اجتماع ہو یا فوجی جماعت ہو ان سب کو یہ لفظ شامل ہے کیونکہ جو لفظ عام ہو اس کو بلاقرینہ یا بلا خاص دلیل کے کسی ایک فرد کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جاسکتا اور چونکہ کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے معلوم ہو کہ فرض نماز کی جماعت اس سے مستثنیٰ ہے لہٰذا یہ بھی اس میں یعنی اس لفظ کے عموم میں شامل رہے گا۔اور کسی حدیث میں اب تک یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ آپ نے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے سے منع فرمایا یا خود کبھی فرض نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے۔یعنی نہ یہ وارد ہے (جتنا کچھ اب تک معلوم ہوا ہے) کہ آپ نے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھائے اور نہ یہ ہے کہ ہاتھ نہیں اٹھائے۔اور عدم ذکر عدم وجود کو مستلزم نہیں ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ فرض نماز بعد اجتماعی طور پر دعا کرنا نبی کریم ﷺ کی قولی حدیث کے بموجب مندوب ومستحسن ہے اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ہاتھ اٹھانا احادیث کی رو سے دعا کے آداب میں سے ہے اور مستحسن ومندوب ہے بہرحال ان دلائل سے راقم الحروف کے نزدیک فرض نماز کے بعد اجتماعی طور پر دعا کرنا جائز ہے۔ بلکہ اس کو مندوب بھی کہہ سکتے ہیں البتہ اس کو نماز کے لوازمات سے سمجھنا اور یہ تصور کر لینا کہ اس کے سوا نماز پوری ہی نہیں ہوتی یا جو اس طرح دعا نہ کرے بلکہ اٹھ کر چلا جائے اس کو برا بھلا کہنا یا اس پر طعن وتشنیع کرنا یہ ناجائز ہے اگر ایسا تصور کر لیا جائے تو یہ بدعت ہوگی اور ناجائز ہوگی۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے ''تحفۃ الاحوذی شرح الترمذی'' میں بھی تقریباً اسی طرح لکھا ہے یعنی اگر اس کو نماز کے لوازمات میں سے تصور نہ کیا جائے اور نہ کرنے والے پر نکیر بھی نہ ہو تو یہ ان شاء اللہ جائز ہے۔هذا ما عندنا والعلم عند الله

سوال نمبر ۸ کا جواب:

دیوبندی اگر پکا موحد ہو اور جو مسنون طریقہ پر نماز پڑھنے والے سے نفرت نہ کرتا ہو لیکن اس کو بھی صحیح سمجھتا ہو تو میرے نزدیک اور دوسرے محققین اہل حدیث کے نزدیک ان کے پیچھے نماز ہو جائے گی البتہ اگر متعصب اور سنت سے نفرت کرنے والا ہو تو ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

باقی بریلوی ہوتو ان کا عقیدہ ہی صحیح نہیں اور وہ شرک تک میں مبتلا ہیں اس لیے ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا قطعی ناجائز ہے کیونکہ ان کی نماز خود بھی نہیں ہوتی قرآن کریم مشرکین کے متعلق فرماتا ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَ فِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ﴾ (التوبة : ۱۷)

یعنی مشرکین کے سب اعمال برباد ہیں اور وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔ جب خود ان کے اعمال بھی نامقبول و برباد ہیں۔ تو دوسروں کو ان کی اقتداء سے کیا حاصل ہوگا؟

لہٰذا جہاں بریلویوں کے سوائے اور کوئی ہے ہی نہیں تو یہ بھی شرعی عذر ہے گویا یہاں کوئی جماعت یا امام وغیرہ ہے ہی نہیں اس صورت میں ان موحدین کو اپنی جگہ نماز پڑھنا چاہیے اگر ہو سکے تو سب ہم خیال موحدین جمع ہو کر ...ا چھوٹی سے مسجد بنا دیں اس میں جماعت کریں اور جب تک ایسی مسجد تیار ہو گھر یا کسی اور مکان میں اوقات نماز پران موحدین کو جمع ہو کر نماز باجماعت ادا کرنی چاہیے۔ باقی ان بریلویوں کے پیچھے ہرگز نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

اس مسئلہ پر سردست کوئی کتابچہ ہمارے پاس نہیں ہے لہٰذا معذرت خواہ ہوں۔

آپ کے سوالات کے جواب بحمد للہ اپنے ناقص علم کے مطابق تحریر کر دیئے ہیں، آپ مجھے دعاؤں میں ضرور یاد رکھا کریں۔ اور کوئی خاص بات نہیں جو تحریر کی جاتی۔ والسلام

احقر العباد: محب اللہ شاہ راشدی

کیا صلوٰۃ وتر کے بعد بیٹھ کر نفل پڑھنا بدعت ہے؟

صوبہ پنجاب اور جماعت اہل حدیث کے عظیم مناظر محدث شیخ عبدالقادر حصاروی رحمہ اللہ نے وتر کے بعد دو رکعات کو پڑھنا بدعت قرار دیا تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے احادیث صحیحہ سے ثابت کیا کہ یہ صحیح ہے اس مقالہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان کا رد پیش کیا ہے در اصل یہ مضمون بہت طویل تھا اس کا اختصار پیش خدمت ہے۔

(الازہری)
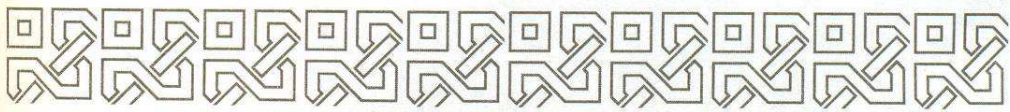
ذیل میں ہم چند احادیث نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ وتروں کے بعد (مطلقاً نہ کہ تہجد کے وقت) دو رکعتیں نفل بیٹھ کر نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ سنن ابن ماجہ میں ہے:

((حدثنا محمد بن بشار ثنا حماد بن مسعدة ثنا میمون بن موسیٰ المرئی عن الحسن عن امه سلمة ان النبی ﷺ کان یصلی بعد الوتر رکعتین خفیفتین وهو جالس))

''ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ وتر کے بعد دو ہلکی پھلکی رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔''

اس حدیث کی سند کے سب رواۃ ثقہ ہیں میمون بن موسیٰ المرئی بھی صدوق ہے، ہاں وہ مدلس ہے اس لیے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہاں تدلیس سے کام لیا ہوگا آگے اور بھی حدیثیں آرہی ہیں جس سے اس روایت کی تائید ہو جائے گی اور اس حدیث کی سند میں جو حسن اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں ان کا نام خیرۃ ہے اور وہ بھی مقبولہ ہے اور ابن حبان ان کو اپنی ثقات میں لائے ہیں۔ کذا فی التقریب اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے، اس حدیث کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان دوگانہ سے مراد وہ دو رکعتیں ہیں جو تہجد کے وقت وتروں کے بعد پڑھا کرتے تھے، کیونکہ اس میں مطلقاً بعد الوتر کا بیان ہے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ عشاء کے بعد رات کے اول حصہ میں رات کے درمیانے حصہ میں اور آخر رات میں وتر پڑھا کرتے تھے۔ یعنی آپ سے تینوں وقتوں میں رات کے اول اوسط اور آخر میں وتر پڑھنا ثابت ہے۔ اور کان یصلی کا یہی مقتضی ہے کہ ہمیشہ ورنہ کم از کم اکثر تو ضرور ایسا کرتے تھے۔ مقصد یہ کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب بھی وتر پڑھتے تھے خواہ اول رات میں یا اس کے آخری حصہ میں تو دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ اس حدیث میں ہے کہ وہ رکعتیں ہلکی پھلکی (خفیفتین) ہوتی تھیں۔ اس کی وضاحت اگلی حدیثوں میں آرہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ دو رکعتیں نہیں جو تہجد کے وقت مخصوص طریقے سے پڑھا کرتے تھے اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر تو یہ حدیث مسلم شریف والی حدیث کے متعارض ہو جائے گی کیونکہ مسلم شریف والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دو رکعتیں لمبی ہوتی تھیں اور اس حدیث کا مفاد یہ ہے کہ ہلکی ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے کہ مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ وتر کے بعد ہمیشہ دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے اب کبھی تو وہ دو رکعتیں ہلکی ہوتی تھیں اور کبھی لمبی۔ اس مخصوص طریقہ پر جو مسلم شریف کی حدیث میں وارد ہے اس میں تعارض کی کون سی بات ہے؟ اور دونوں جگہوں پر کان کا لفظ وارد ہے۔ اس سے بھی کوئی نقص لازم نہیں آتا کیونکہ دونوں طریقے آپس میں دوام کے ساتھ ثابت ہیں اور دونوں فعلوں کا کثرت سے ہونا بھی کوئی اچنبے کی بات نہیں کیونکہ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ

نبی کریم ﷺ بعض مرتبہ اتنے روزے رکھا کرتے کہ خیال کیا جاتا کہ اب افطار ہی نہیں کریں گے اور بعض مرتبہ اتنے دن افطار کرتے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ اب روزہ ہی نہیں رکھیں گے۔

اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ روزے بھی بہت دن تک رکھا کرتے اور پھر افطار بھی کافی عرصہ تک کیا کرتے۔ یعنی دونوں فعل مبارک کثرت سے ہوتے۔ اسی طرح کبھی آپ کافی کافی عرصہ تک ہلکی رکعتیں ہی پڑھتے رہتے جس میں سورۃ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ اور قُلْ یَا اَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ پڑھا کرتے اور کبھی وہ دو رکعتیں لمبی بھی کر دیا کرتے تھے۔ اس میں کوئی تعارض وتخالف نہیں ہے۔

خیر یہ تو ضمنی چیز تھی۔ اصل مقصد یہ تھا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ وتر کے بعد بیٹھ کر رکعتیں خفیفتین پڑھتے تھے لہٰذا وتر کے بعد دوگانہ بیٹھ کر پڑھنا مسنون ہوا۔ اور جو مسنون ومشروع سمجھ کر پڑھتا ہے وہ نام نہاد اہل حدیث یا بدعتی وغیرہ نہیں ہے بلکہ متبع سنت ہے۔ رہا خصوصیت کا دعویٰ تو اس کے متعلق بعد میں عرض کروں گا۔

۲۔ ((حدثنا عبدالله حدثنی ابی ثنا عبدالصمد حدثنی ابی ثنا عبدالعزیز یعنی ابن صهیب عن ابی غالب عن ابی مامة ان النبی ﷺ كان يصليهما بعد الوتر وهو جالس يقراء فيهما اذا زلزلت الارض وقل يا ايها الكافرون .))

(احمد وبیهقی)

اس حدیث کی سند بالکل صحیح ہے اس میں پہلے حضرت عبداللہ ہیں جو حضرت امام احمد کے فرزند ہیں وہ ثقہ ہیں، پھر ان کے والد حضرت امام احمد رحمہ اللہ ہیں۔ پھر عبدالصمد جو ہے وہ عبدالصمد بن عبدالوارث ہے جیسا کہ رجال کی کتب سے پتہ چلتا ہے اور جیسا کہ بیہقی کی روایت سے جو انہوں نے سنن کبریٰ میں نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے وہ روایت یہ ہے:

((قال البیقهی فی سنن الکبری، اخبرنا ابوعبدالله الحافظ وابوبكر احمد بن الحسن القاضی وابو صادق محمد بن احمد الصیدلانی قالوا ثنا ابوالعباس محمد بن یعقوب ثنا ابو قلابه ثنا عبدالصمد ابن الوارث ثنا ابی عن عبدالعزیز بن صهیب عن ابی غالب عن امامة ان النبی ﷺ كان يصلی ركعتين بعد الوتر وهو جالس يقراء فيهما اذا زلزلت و قل يا ايها الكافرون .))

مقصد یہ ہے کہ امام احمد والی سند میں جو عبدالصمد ہے وہ ابن عبدالوارث ہے اور وہ ثقہ ہے۔ اسی طرح اس کا والد عبدالوارث ابن سعید وہ بھی ثقہ ہیں۔ اس کے بعد پھر عبدالعزیز بن صہیب ہیں وہ بھی ثقہ ہیں۔ پھر ابو غالب ہیں یہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے صاحب ہیں ان کے نام میں اختلاف ہے، لیکن وہ کنیت سے مشہور ہیں۔ ان کے

متعلق صاحب التقریب حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ صدوق یخطی کا لفظ راوی کی عدالت میں قادح نہیں ہے اور نہ اس کو احتجاج کے رتبہ سے گرا دیتا ہے کیونکہ خطا اور وہم سے کوئی راوی معصوم نہیں ہے الا ماشاء اللہ۔ یہی وجہ ہے کہ رجال کی کتب میں بہت سے ایسے رواۃ ملتے ہیں جن کے متعلق ان کی کتب میں یہی لکھا ہوتا ہے۔ صدوق یخطی یا صدوق یھم یا صدوق له اوھام، حالانکہ وہ صحیحین کے رواۃ میں سے ہوتے ہیں، مثلاً: حسن بن ذکوان بخاری کے رجال میں سے ہے لیکن تقریب میں لکھا ہے کہ صدوق یخطی اس طرح حرمی بن عمارہ بن ابی حفصہ جو بخاری اور مسلم کے رواۃ میں سے ہے، کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تقریب میں تحریر فرماتے ہیں، صدوق یھم اسی طرح سعید بن یحییٰ بن یحییٰ بن سعید بن ابان الاموی (یہ راوی بھی شیخین کے رواۃ میں سے ہے) کے متعلق حافظ صاحب تقریب فرماتے ہیں کہ ثقہ ربما اخطاء بہر کیف ایسے اور بھی رواۃ ہیں جو اگرچہ شیخین کے رواۃ میں سے ہیں لیکن ان کے متعلق رجال کی کتب میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ یخطی یھم له اوھام اور ربما اخطاء لیکن ان الفاظ سے وہ حجیت سے گر نہیں جاتے کیونکہ جہاں ان سے کچھ وہم ہوا یا خطا ہوگئی ہے۔ وہاں ائمہ حدیث اور حفاظ فن نے تنبیہ کر دی ہے، لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ جہاں پر بھی راوی دیکھیں تو کہیں کہ یہاں بھی اس نے خطاء کی ہوگی۔ مقصد یہ ہے کہ اس حدیث کے متعلق ائمہ حدیث میں سے کسی نے چونکہ یہ نہیں فرمایا کہ اس سے یہاں بھی خطا ہوگئی ہے، اس لیے یہ روایت مقبول ہوگئی، پھر آخر میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ ہیں جو صحابی ہیں۔

خلاصہ کلام کہ اس حدیث کی سند کے سب رواۃ ثقات ہیں اور اس میں کوئی راوی مدلس بھی نہیں، لہٰذا علت بھی نہیں اور نہ کہیں انقطاع وغیرہ کی علت ہے، لہٰذا یہ حدیث اگر صحیح لذاتہ نہیں ہے (کیونکہ ایک راوی ابو غالب میں ضبط کی کمی ہے تو لذاتہ سے کم مرتبہ بھی نہیں۔ بلکہ دوسری احادیث سے جو آگے آ رہی ہیں تقویت پکڑ کر صحیح لغیرہ بن جائے گی۔ کما لا یخفی علی من مارس المصطلح .

خلاصہ کلام یہ حدیث بالکل بے غبار ہے اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے اور ان دو رکعتوں میں سورۃ اِذَا زُلْزِلَتِ اور قُلْ یَا اَیُّهَا الْکَافِرُوْنَ پڑھا کرتے تھے اور یہ حدیث ابن ماجہ والی حدیث کی موید بھی ہے کیونکہ اس میں بھی رکعتین خفیفتین پڑھنے کا ذکر ہے اور اس حدیث میں بھی کان یصلی کے الفاظ ہیں جو دوام یا کثرت پر دال ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ روایت حضرت ابوامامہ سے مروی ہے جس سے ظن غالب یہی ہوتا ہے کہ یہ دو رکعتیں عشاء کے بعد وتر کے بعد آپ پڑھا کرتے تھے کیونکہ تہجد تو آپ اپنے گھر میں ہی پڑھا کرتے تھے۔

علاوہ ازیں حدیث کے الفاظ یہ ہیں کان یصلی رکعتین بعد الوتر . اور یہ الفاظ عام ہیں، لہٰذا ان کو بلا دلیل صرف تہجد کے وقت کے ساتھ مخصوص کرنا صحیح نہیں کیونکہ جب احادیث صحیحہ سے نبی کریم ﷺ کا

رات کے تینوں وقتوں اول، اوسط، آخر میں وتر پڑھنا ثابت ہے اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے تو ان دو رکعتوں کا آپ سے پڑھنے کا ثبوت مل گیا اور وہ بھی دواماً لہٰذا یہ کہنا کہ ''ان دو رکعتوں کا وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھنا بے ثبوت ہے قطعاً صحیح نہیں ہے۔''

۳۔ امام بیہقی سنن کبریٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث لاتے ہیں:

((حدثنا ابو الحسن محمد بن الحسن بن داود العلوی املاء ثنا ابو نصر محمد بن حمدوية ابن سهل المروزی ثناء عبدالله بن حماد الامل ثنا يزيد بن عبدربه ثنا بقية ابن الوليد عن عتبة بن ابی حكيم عن قتادة عن انس بن مالك ان النبی ﷺ كان يصلی بعد الوتر ركعتين وهو جالس يقرا فی الركعة الاولی بام القران واذ زلزلت وفی الثانية قل يا ايها الكافرون .)) (بيهقی)

اس حدیث کی سند میں اور سب راوی ثقہ ہیں لیکن بقیہ سخت مدلس ہیں اور سماع کی تصریح نہیں کی اور عتبہ بن ابی حکیم تو صدوق ہے لیکن کثیر الخطا ہے اور قتادہ بھی گو ثقہ ہے لیکن وہ مدلس ہے لیکن ان وجوہ سے سند میں خفیف سا ضعف پیدا ہوتا ہے، اس لیے اعتبار و استشہاد میں کوئی قباحت نہیں، یعنی جب کہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے صحیح یا حسن لذاتہ سند سے حدیث ثابت ہوگئی تو یہ حدیثیں گو قدرے ضعیف ہیں اس کی مؤید بن جائیں گی اور اس کو شواہد کی حیثیت سے ذکر کرنے میں کوئی قباحت نہیں بہر کیف اس حدیث سے بھی بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ وتر کے بعد ہمیشہ بیٹھ کر دوگانہ ادا فرماتے تھے پہلی رکعت میں اِذَا زُلْزِلَت اور دوسری میں قُلْ يَا اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ پڑھا کرتے تھے، جب ایک فعل رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ سے ثابت ہوگیا تو اس کے اتباع کو بدعت کہنا اور اس کے متبع کو نام نہاد اہل حدیث کہنا زبردستی اور سینہ زوری ہے یہ بھی صحیح نہیں کہ سلف میں وتر کے بعد دو رکعت نہیں پڑھا کرتے تھے بلکہ امام محمد بن نصر نے قیام اللیل میں لکھا ہے کہ:

((وكان سعد بن ابی وقاص يوتر ثم يصلی علی اثر الوتر مكانه .))

یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وتر کے بعد اسی جگہ پر نماز پڑھا کرتے تھے، اسی طرح لکھا ہے وكان الحسن يامر بسجدتين بعد الوتر. یعنی حسن بصری وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کا امر فرمایا کرتے تھے۔ اور لکھتے ہیں کہ:

((وقال كثير بن مر ة وخالد بن معدان لا تدعهما وانت تستطيع يعنی الركعتين بعدالوتر .))

کثیر بن مرۃ اور خالد بن معدان دونوں نے بھی یہی فرمایا کہ جب تک قدرت ہو وتر کے بعد دو رکعتوں کو نہ چھوڑا کرو۔ پھر فرماتے ہیں:

((وقال عبدالله بن مساحق كل وتر ليس بعده ركعتان فهو ابتر .))

عبداللہ بن مساحق فرماتے ہیں کہ جس وتر کے بعد دو رکعتیں نہیں پڑھی جاتیں وہ دم کٹا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو رکعتیں کچھ الگ نہیں ہیں بلکہ وتر کے ساتھ ہیں اس لیے یہ دو رکعتیں وتر کو قیام اللیل کے آخر میں رکھنے کے منافی بھی نہیں ہیں۔ آگے پھر امام محمد بن نصر فرماتے ہیں:

((وقال عياض بن عبدالله رايت ابا سلمه ابن عبدالرحمن اوتر ثم صلى ركعتين في المسجد .))

عیاض بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کو دیکھا کہ وتر کے بعد مسجد میں ہی دو رکعتیں ادا کیں یہ ابوسلمہ وہی بزرگ ہیں جو سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کے قیام اللیل کی گیارہ رکعت کے راوی ہیں۔ بہرکیف خیر القرون میں اور خود صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے لہٰذا اس کو بدعت کے حدود میں داخل کرنا خصوصاً جب کہ ان کا یہ فعل رسول اللہ ﷺ سے خاص ہے، کیونکہ اگر آپ امت کو ایک امر فرمائیں اور خود اس کے مخالف کوئی عمل کریں تو یہ ایک کی ذات مبارک سے مخصوص ہوگا تو یہ کلیتہً صحیح نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے مثلاً: حدیث میں کھڑے ہو کر پینے سے منع آتا ہے اور ایسی کوئی حدیث نظر سے نہیں گزری جس میں یہ ہو کہ آپ نے کھڑے ہو کر امت کو پینے کی اجازت دی ہے، حالانکہ صحیح حدیثوں میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کھڑے ہو کر پیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے محققین نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا جائز، بیٹھ کر پینا بہتر ہے ایسی اور بھی مثالیں دستیاب ہوسکتی ہیں اس لیے یہ کہنا کہ جہاں بھی آپ کا فعل اس امر کے خلاف ہو جو آپ نے امت کو دیا ہے تو وہ آپ کی ذات مبارک سے مخصوص ہوگا۔ صحیح نہیں ہے۔

❁❁❁❁

دنیا کے عظیم مصلح مجاہد اور اپنے وقت کا عظیم عالم ابن الشیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کے بارے شاہ صاحب نے ایک بہترین مقالہ تیار کیا، جس میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کو ان کی مساعی جمیلہ پر خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ (الازہری)

بسم الله الرحمن الرحيم، حامدا ومصليا ومسلما.

امام محمد بن عبدالوہاب کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے ایک حقیقت کے اظہار اور ایک مغالطہ کے ازالہ کی ضرورت ہے، عام طور پر اہل بدعت (بریلوی وغیرہم) کی طرف سے آئے دن یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ''نجدی'' یعنی موجودہ سعودی حکومت نبی کریم ﷺ کی دعا سے محروم ہے اور بارگاہ رسالت سے ارشاد ہو چکا ہے کہ نجد میں فتن و زلازل ہوں گی اور چونکہ موجودہ سعودی حکومت امام محمد بن عبدالوہاب کے بتائے ہوئے طریقہ حقہ اور اسی نہج پر چل رہی ہے، اس لیے ان اہل بدعت کا مقصد دراصل امام محمد بن عبدالوہاب کو ملعون کرنا ہے، اس لیے کہ حضرت شیخ بھی نجدی ہیں۔ عیینہ میں تولد ہوئے جو ریاض کے بالکل قریب ہے اور بالآخر اپنی دعوت کا مرکز درعیہ کو بنایا اور وہیں وفات پائی اور درعیہ وادی حنیفہ کے کنارے آباد ہے، پہلے یہ بستی مشرقی کنارے کی جانب تھی اور اب غربی کنارے واقع ہے اور ریاض سے تقریباً تیں میل کے فاصلہ پر ہوگی، بہر کیف چونکہ امام محمد بن عبدالوہاب نجدی ہیں، لہٰذا مذکورہ بالا حدیث کی وجہ سے جملہ اہل نجد کو مطعون کیا جاتا ہے، جن میں حضرت شیخ بھی آجاتے ہیں۔ حالانکہ ان لوگوں نے مذکورہ حدیث کی ترجمانی میں انتہائی بددیانتی کا ثبوت دیا ہے، ہم یہاں اصل حدیث کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔

یہ حدیث صحیح بخاری کے کتاب الفتن کے باب ''قول النبی ﷺ الفتنة من قبل المشرق'' میں بایں الفاظ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے وارد ہے:

((قال ذكر النبى ﷺ اللهم بارك لنا فى شامنا اللهم بارك لنا فى يمننا قالوا وفى نجدنا قال اللهم بارك لنا فى شامنا اللهم بارك لنا فى يمننا قالوا يا رسول الله وفى نجدنا فاطنه قال فى الثالثة هناك الزلازل والفتن وبها يطلع قرن الشيطان)) ا ھـ

اس حدیث میں نجد کا لفظ ضرور آیا ہے مگر اس سے سعودی حکومت والے یا حضرت شیخ وغیرہ کو سمجھنا فقط غلط اور بے بنیاد ہے۔

لفظ نجد کی لغوی تحقیق:

تمام شارحین حدیث نے لفظ نجد کے یہ معنی لکھے ہیں:

((اصل النجد ما ارتفع من الارض وهو خلاف الغد فانه ما انخفض منها))

(الفتح والارشاد وغيرهما)

یعنی اصل نجد کے معنی زمین کا وہ حصہ جو اوپر ہو اور اس کا مقابل غدرٌ ہے جو پست زمین کو کہا جاتا ہے اس کے بعد معلوم کرنا چاہیے کہ نجد دو ہیں، ایک نجد یمامہ اور دوسرا نجد عراق حدیث میں جو لفظ نجد وارد ہوا ہے، اس سے مراد مؤخر الذکر، یعنی نجد عراق ہے نہ کہ نجد یمامہ اور اس پر دلیل وہ احادیث ہیں جو صحیح بخاری میں دوسری جگہ پر اور صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں وارد ہیں جن سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ نجد سے یہاں مراد نجد عراق ہے۔

۱۔ جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس طرح روایت ہے:

((ان النبی ﷺ قام علی المنبر ، قال ھھنا ارض الفتن و اشار الی المشرق یعنی حیث یطلع قرن الشیطان))

۲۔ صحیح بخاری کے باب مناقب قریش میں جو روایت اس کے الفاظ یہ ہیں:

((سمعت ابن عمر (ای اباہ) یقول سمعت رسول اللہ ﷺ یشیر بیدہ نحو الشرق ویقول ھا ان الفتنة ھھنا ثلثا حیث یطلع قرن الشیطان))

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جس نجد میں فتن و زلازل کے ہونے کا بیان ہے وہ مشرق میں تھا اور مدینہ کے مشرق میں نجد عراق ہے نہ کہ نجد یمامہ اور موجودہ سعودی حکومت والے اور اس کے شیخ وغیرہم نجد یمامہ کے ہیں نہ کہ نجد عراق کے اور اس کی وضاحت ایک اور روایت سے بھی ہوئی ہے جو امام مسلم اپنی صحیح (مسلم) میں فضیل بن غزوان کے طریق سے لائے ہیں، فضیل کہتے ہیں۔

((سمعت سالم بن عبداللہ عمر یقول یا اھل العراق ما اسلکم عن الصغیر وارکبکم الکبیرة سمعت ابی یقول سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الفتنة یجیء من ھھنا و اوماء بیدہ نحو المشرق من حیث قرنا الشیطان "بتثنیة القرن"))

اس روایت نے واضح کر دیا کہ اس حدیث کا راوی حضرت سالم حضرت عبداللہ بن عمر کا فرزند ارجمند بھی اس سے نجد عراق سمجھ رہا ہے، اور اپنی اس فہم پر مرفوع حدیث ہے دلیل پیش بھی فرما دی کہ نبی کریم ﷺ نے فتنوں کا سرچشمہ مشرق کی جانب کو قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ مدینہ سے مشرق کی طرف نجد عراق ہی ہے اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ نبی کریم ﷺ کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف ثابت ہوئی۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں لہٰذا اہل بدعت کا موجودہ سعودی حکومت، حضرت شیخ وغیرہم کو نجدی ہونے کی وجہ سے اس حدیث کی بنا پر مطعون کرنا سراسر علمی خیانت اور بدترین قسم کی بددیانتی ہے اور حدیث مبارک میں تحریف معنوی ہے۔

اب پہلے حضرت شیخ کی زندگی کے مختصر حالات درج کیے جاتے ہیں۔

ولادت:

حضرت شیخ ۱۱۱۵ہجری مطابق ۱۷۰۳ء میں شہر عیینہ میں تولد ہوئے، عیینہ مملکت سعودی عرب موجودہ دارالسلطنت ریاض کے شمار میں واقع ہے۔

آپ ذہنی وجسمانی دونوں ہی اعتبار سے خوب چست وچالاک تھے اور بموجب اس کہاوت کہ:

Coming Events cast thir shadows before.

آنے والے واقعات اپنے سائے پہلے ہی ڈال دیتے ہیں، چونکہ قدرت کو حضرت شیخ سے تجدیدی کام لینا تھا اور زبان وقلم کا شہسوار اور تلوار کے دھنی بنانا تھا، اس لیے وہ بچپن میں ہی دوسرے بچوں سے ممتاز اور چست وچالاک تر تھے۔

ابتدائی حالات:

شیخ نے اپنے والد ہی کی زیر تربیت اپنے پیدائشی شہر میں نشو ونما پائی، یہ زمانہ عبداللہ بن محمد بن محمد بن معمر کی حکومت کا تھا، دس سال کی عمر سے قبل ہی قرآن مجید حفظ کر ڈالا دس بارہ سال سے پہلے ہی بلوغت کو پہنچ گیا، آپ کے والد کا بیان ہے کہ آپ اس عمر میں نماز باجماعت کے پوری طرح پابند ہو چکے تھے، لہٰذا میں نے اسی سال ان کی شادی کر دی۔

تعلیم:

آپ نے اپنے والد محترم سے تفسیر وحدیث اور فقہ حنبلی کی تعلیم حاصل کی آپ بچپن سے ہی شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کی شاگرد رشید علامہ ابن قیم کی کتابوں کا خوب مطالعہ کیا کرتے تھے۔

علمی سفر:

حضرت شیخ نے پہلا حج بیت اللہ کے ارادہ سے سفر شروع کیا، فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ کا رخ کیا اور مسجد نبوی اور دوسری مسنون جگہوں کی زیارتوں سے فراغت حاصل کر کے مدینہ منورہ کے مشہور ومعروف اور چوٹی کے علماء سے استفادہ شروع کیا، ان شیوخ میں سے چند کے یہ نام ہیں:

(۱) شیخ عبداللہ بن (ابراہیم بن) سیف نجدی جو سب سے ممتاز تھے اور علمائے مدینہ کے سربراہ تھے۔

(۲) شیخ محمد حیات سندھی، سے ملاقات، شیخ عبداللہ بن ابراہیم کی وساطت سے ہوئی، انہوں نے شیخ محمد حیات سے شیخ محمد بن عبدالوہاب کا تعارف کرایا، اور کہا کہ وہ صحیح العقیدہ ہیں اور نجد میں پھیلی ہوئی شرک وبدعات کے خلاف ان کے جذبات بڑھے ہوئے ہیں اور یہ کہا کہ یہ نجد سے صرف اس لیے آئے ہیں تاکہ علم دین کے ہتھیار سے مسلح ہو کر اپنے علاقہ میں دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کا علم بلند کریں۔

پھر بصرہ کی طرف روانہ ہوئے، وہاں اہل علم کی ایک بڑی جماعت سے علم حاصل کیا، جن میں شیخ محمد المجموعی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اسی دوران مفید اصلاحی موضوعات اور شرک و بدعات اور خرافات کے رد میں رسائل اور کتابیں بھی لکھتے رہے۔

مخالفت:

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین آپ کی تکذیب اور ایذا رسانی کے درپے ہوگئے، ان کو عین دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں شہر سے نکال دیا، اور ساتھ ہی آپ کے شیخ محمد المجموعی کو بھی اذیتیں پہنچائیں، پھر علمی استفادہ کے لیے شام تشریف لے گئے، لیکن زادِ سفر ختم ہو جانے کی وجہ سے مجبوراً پہلے احساء واپس آ گئے اور شیخ عبداللہ بن عبداللطیف الشافعی کے ہاں مہمان ہوئے، اور ان سے علمی استفادہ کیا اور احساء سے واپس نجد کے ایک دیہات حریملاء جہاں ان کے والد عیینہ سے قضا کے عہدہ سے معزول ہو کر آ گئے تھے، واپس آ گئے۔

شیخ کی دعوت سے قبل نجد کی دینی و سیاسی حالت:

شیخ کی دعوت سے قبل نجد کی حالت سب سے بدتر تھی، مؤرخین کا بیان ہے کہ نجد خرافات اور فاسد عقائد اور دین کے مخالف امور کا سب سے بڑا مرکز تھا، جہاں کچھ چیزیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منسوب تھیں لوگ جوق در جوق وہاں جاتے اور ان قبروں سے اپنی حاجات طلب کرتے اور اپنے مصائب کو دور کرنے کے لیے استغاثہ کرتے، اس طرح جبیلہ میں حضرت زید بن الخطاب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھائی کی قبر پر جا کر لوگ آہ وزاری کرتے اور اپنی مرادیں مانگتے اسی طرح درعیہ میں بھی بعض صحابہ کی قبروں کا چرچا تھا اور سب سے زیادہ عجیب بات شہر مفتوحہ میں دیکھنے میں آئی کہ لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ جو عورتیں نر جانوروں کی زیارت کرتی ہیں ان کی شادی جلد ہو جاتی ہے اور جو عورتیں ان سانڈھوں کا طواف کرتیں وہ کہتیں کہ، اے سانڈھ میں سال گزرنے سے پہلے ہی اپنا شوہر چاہتی ہوں، حدیبیہ میں ایک غار تھا، جہاں لوگ بکثرت جاتے تھے وہاں کے متعلق مشہور تھا کہ کسی شہزادی نے کسی ظالم کے ظلم سے بھاگ کر وہاں پناہ لی تھی۔ اسی طرح غبیرا کی گھاٹی میں ضرار بن ازور کی قبر پر آ کر لوگ ناقابل بیان شرکیہ حرکات کرتے تھے۔

حجاز کی حالت:

حجاز کی حالت بھی نجد سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، وہاں لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبروں کے ساتھ وہ سب کام کرتے تھے جو صرف اللہ رب العزت ہی کے لیے لائق و زیبا ہیں، خود حجرہ نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے ساتھ بھی لوگ یہی شرکیہ معاملات کرتے، جب حضرت شیخ علمی استفادہ کے لیے مدینہ منورہ میں تھے ان دنوں کا ایک واقعہ ہے کہ علامہ محمد حیات سندھی نے ایک مرتبہ حضرت شیخ کو حجرہ نبویہ کے پاس

کھڑا پایا جہاں لوگ طرح طرح کی دعائیں اور فریادیں کر رہے تھے، اس پر حضرت شیخ نے علامہ سندھی سے دریافت کیا کہ ان لوگوں کی بابت آپ کی کیا رائے ہے، وہ بولے: ((ان هـو لاء متبر ما هم فيه وباطل ما كانوا يعملون)) یقیناً یہ لوگ جس کام میں ہیں قابل تباہی و بربادی ہے، اور ان کے اعمال و باطل و غلط ہیں اسی طرح بصرہ، زبیر، عراق، شام اور مصر و یمن میں بھی عقلی سوز جاہلیت اور بت پرستی کا رواج عام تھا عدن اور یمن کے بارے میں بھی ایسی ہی بے شمار خرافات کا ذکر لوگوں کی زبانی سنا تھا، شیخ نے ان تمام منکرات کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ و سیرت صحابہ کے ترازو پر تولا اور عوام کو دین کی صحیح راہ اور اس کی روح سے بہت دور پایا، آپ نے محسوس کیا کہ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اللہ نے اپنے پیغمبروں کو کیوں مبعوث فرمایا اور نہ ہی لوگ یہ جانتے ہیں کہ جاہلیت اور اس دور کی بت پرستی کیا تھی چند لوگوں کے سوا باقی تمام لوگوں نے دین اور اس کی تمام اصل و فرع کو بالکل بدل ڈالا تھا، شیخ کی دعوت سے قبل لوگوں کی دینی حالت کا یہ اجمالی نقشہ تھا۔

نجد کی سیاسی حالت:

جب ملک کی اس طرح حالت ناقابل برداشت بن جاتی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں میں سے ایک صالح بندہ کو اس خطہ میں اٹھاتا ہے اور اس سے دین حق کی تجدید کا کام لیتا ہے، صحیح یا حسن سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنن ابی داؤد میں روایت ہے:

((ان الله يبعث هذه الامة على رأس كل مأمة سنة من يجدد لها دينها))

''یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے بندوں کو مبعوث فرماتا رہے گا جو اس امت کے لیے اس کو دین کی تجدید کیا کریں گے۔''

اس حدیث مبارک میں یہ نہیں ہے کہ ساری زمین کے لیے ایک ہی مجدد ہوگا کیونکہ ایسا شخص جو ساری دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح کہ وہ ظلم و بے انصافی سے بھری ہوگی، صرف مہدی ہوگا جیسا کہ احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے بلکہ ہوسکتا ہے کہ زمین کے ہر خطہ میں ایک الگ مجدد ہو۔ فتدبر

اس سے یہ اشکال بھی رفع ہو جاتا ہے کہ علماء نے مختلف لوگوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ مجدد تھے جبکہ ہر خطہ کے لیے الگ مجدد ہوگا تو ہوسکتا ہے کہ حجاز میں ایک مجدد ہو اور اسی زمانہ میں سرزمین ہند میں کوئی اور مجدد ہو اس طرح اشکال باقی نہیں رہتا۔ واللہ اعلم

جب ہم شیخ کے عہد کے وقت حجاز و نجد وغیرہما کی حالت دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہی جاہلیت کی باتیں اور وہی خرافات و توہمات اور افعال محرکات شرکیہ و اعمال بدعیہ رواج پا چکی تھی جو کسی نبی کی بعثت کے وقت لوگوں میں رائج ہیں اور چونکہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد اب کوئی نئی نبوت کھڑی نہیں کی جائے گی، اس لیے اس امت میں جب کبھی جاہلیت کا دور آئے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ ایک مجدد مبعوث فرماتا رہے

گا جو اس امت مرحومہ کی اصلاح کرے گا، اور دین حق سے بدعات وغیرہ کا پردہ اٹھا کر اس کو پھر اس کی اصلی صورت وشکل اور اصلی روح کے ساتھ ان لوگوں کو سامنے پیش کرے گا اسی سنت اللہ جاریہ کو مدنظر رکھ کر جب ہم حضرت امام محمد بن عبدالوہاب، کی دعوت پر نظر کرتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ واقعتاً حجاز ونجد کے خطہ میں مجدد دین تھے گو ان کی دعوت واصلاح کی مساعی جمیلہ حجاز سے نکل کر دور دراز خطوں میں بھی پہنچ گئی۔

شیخ کی دینی تحریک کی ابتداء:

شیخ نے جب عوام کی دینی ودنیاوی بدحالی کا اچھی طرح مشاہدہ کرلیا اور یہ دیکھ لیا کہ نجد وحجاز کو علماء عام طور پر بدعات کے قائل ہیں اور انہوں نے سب باتوں کو اسلام میں داخل کرلیا ہے، جز سے قرآن وسنت انکار کرتے ہیں، اور ایسے جاہل عوام کی گمراہیوں اور بدعات کی طرف ان کے رجحانات عامہ کو دیکھ کر شیخ کا عقیدہ اور پختہ ہوگیا کیونکہ انہوں نے ان احادیث کا مطالعہ کیا تھا، جنہیں مسلمانوں کے اندر ایسی خرافات اور گمراہیوں کے پھیلنے کی پیشین گوئی کی گئی تھی جیسے یہ حدیث بدء الاسلام غریبا وسیعود غریبا الخ یعنی اسلام اجنبیت کی حالت میں ابھرا اور وہ اس کی آخری حالت پہلے جیسی یعنی اجنبیت کی ہوجائے گی وغیرہ۔

ان حالات کی روشنی میں شیخ نے پختہ ارادہ کرلیا کہ وہ اپنی قوم کی ضلالت کے خلاف دوٹوک آواز بلند کریں اور قوم کی گمراہی پر واضح وصاف لفظوں میں تنبیہ فرمائیں۔

وانذر عشیرتك الاقربین کی سنت:

شیخ نے حریملا میں اپنی قوم کو دعوت دینا شروع کی، آپ نے فرمایا: ''اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارا جائے نہ اس کے سوا کسی کی نذر مانی جائے اور نہ قبروں وپتھروں سے استغاثہ کیا جائے، نہ ان پر منتیں مانی جائیں، نہ ان سے نفع ونقصان کا عقیدہ رکھا جائے کیونکہ یہ سب کھلی گمراہی، جھوٹ اور سراسر باطل ہیں اور یہ اعمال انتہائی ناپسندیدہ ہیں، ان تمام خرافات کو بالکل ترک کردینا ضروری ہے، شیخ اپنے مواعظ کو قرآن، احادیث رسول اللہ ﷺ اور سیرت صحابہ سے خوب مدلل اور مزین کیا کرتے تھے۔

شیخ کا نازک موقف:

شیخ کے ان مواعظ سے ان کے اور عوام کے درمیان اختلافات شروع ہوگئے، خود ان کے والد شیخ عبدالوہاب بھی سخت مخالف ہوگئے کیونکہ وہ بھی ان نام نہاد علماء مقلدین کے اقوال سے متاثر تھے جو ان خرافات کے قائل اور عامل تھے۔ یہاں پہنچ کر ہم تھوڑی دیر کے لیے توقف کرتے ہیں اور غور کرتے ہیں تو قدرت کی ایک عجوبہ کاری نظر آتی ہے کہ اکثر اولوالعزم شخصیتوں کو ایسے گھرانی سے اٹھایا جاتا ہے جو ضلالت کی گہری خندق میں گرے ہوئے

ہیں۔ دیکھو خلیل اللہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا سارا خاندان اور قوم حتیٰ کہ ان کا باپ بھی بت پرستی میں گرفتار تھا، لیکن اللہ کے خلیل علیہ السلام نے صحیح اسلام اور توحید کا راستہ اختیار کیا، اپنی قوم اور اپنے باپ کو حتی کہ تبلیغ کی اور اس وجہ سے آپ کا والد آپ سے ناراض ہوگیا اور یہ دھمکی دی کہ یا تو اپنی اس تبلیغ سے باز آجاؤ یا پھر میں تمہیں سنگسار کردوں گا اور مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ اسی طرح امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا والد کیسی بدعات میں مبتلا تھا اور وہ ساری کہانی خود مومن آزاد نے تحریر فرمادی ہے اور حق گوئی اور بیان حقیقت میں اپنے والد کا کچھ پاس ولحاظ نہ کیا، ایسے خاندان کے چشمہ وچراغ ہونے کے باوجود اور ایسے کٹر بدعتی کا بیٹا ہونے کے باوجود حضرت مومن آزاد جس طریق پر چلے جو کتاب وسنت کا صحیح راستہ اور انتہائی قابل رشک ہو۔ رحمہ اللہ

شیخ کے والدین:

''مرنے سے قبل شیخ کے والد اور ان کے بھائی سلیمان بھی آپ سے بحث ومباحثہ اور تکرار وجدال کے بعد بالآخر آپ کی دعوت سے مطمئن ہوگئی۔''

ایک عجیب ستم ظریفی:

قارئین! آپ نے دیکھا کہ حضرت شیخ رحمہ اللہ کے والد ابتدا میں بدعات وخرافات کی طرف مائل تھے، اور حضرت شیخ کے سخت مخالف تھے اور شیخ کی بدعات وشرکیہ افعال کے خلاف آواز اور نکتہ چینی کو ناپسند کرتے تھے لیکن لوگ ہر اس آدمی کو جو کتاب وسنت کی تبلیغ کرتا ہے اور شرک وبدعت کی تردید کرتا ہے اس کو ''وہابی'' کہتے ہیں، یعنی ایسے آدمی کو عبدالوہاب کی طرف نسبت کرتے ہیں حالانکہ صحیح نسبت محمدی ہے نہ کہ وہابی، لیکن ایک بات اور بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ ہمارے بھولے بھالے مسلمان بھائی وہابی کا لفظ سنتے ہی غصہ میں بھر جاتے ہیں اور ان کا رنگ بدل جاتا ہے، صرف قبوری اور میلادی ہی نہیں بلکہ اچھی اچھی خوش خیال اور ثقہ قسم کے دیندار لوگ بھی متوحش ہو جاتے ہیں اور اس علم وروشنی کے دور میں بھی بہت سے رواجی قسم کے مقلد مسلمان وہابی کے لفظ سے بھڑک جاتے ہیں، لیکن جب ہم غیروں کی تحریرات دیکھتے ہیں تو ازحد تعجب ہوتا ہے کہ غیر اس تحریک کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنا اس کو کیا تصور کیے بیٹھے ہیں، غیروں کے خیالات کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں، دی گڈلک انگلش ڈکشنری کا مصنف لکھتا ہے:

"Wahebi - wahabee, one of a set Founded in the 18th contwry by Abdul wahab to restore mohammedan ism to its frimitive pwrity. P1041"

''کہ وہابی ایک فرقہ ہے جو اٹھارہویں صدی میں عبدالوہاب نے اس کی بنیاد رکھی تھی تاکہ محمدیت

واسلام کو اس کے ابتدائی اور اصل خلوص کی طرف لوٹایا جائے۔''

چیمبرز ٹوینتھ سنچری ڈکشنری میں لکھا ہے:

"Wahebi - wahabee, one of a set of moslems founded in cantral arbic abaout 1760 by Abd-ul-wahab (1691-1787) whese aim was to restor frimitive, mohammedan ism. P1244"

''وہابی مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے جس کی وسط عرب میں ۱۷۶۰ء کے لگ بھگ عبدالوہاب نے بنیاد رکھی تھی، اس کا مقصد اصلی اور ابتدائی محمدیت واسلام کو بحال کرنا تھا۔''

مصنف کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری لکھتا ہے:

"Wahebi, one of a set of Mohammeden fwritans following the lether of Koran, (Abd-ul-wahab founder, 1700) P1440.

''وہابی راسخ العقیدہ مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے جو قرآن کے الفاظ کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرتا ہے اور اس میں تاویل وغیرہ نہیں کرتا بلکہ جو معنی لغت سے معلوم ہوتے ہیں ٹھیک اس کا اتباع کرتے ہیں''

نیو ورلڈ ڈکشنری میں مصنف یوں رقمطراز ہے، ص ۱۶۴۰۔

"Wahebi - wahabee, a memmber of a stiet fwristic sat of moslems fownded by Abdul wahab."

''وہابی مسلمانوں کے ایک راسخ العقیدہ اور خالص پکے فرقہ کا ایک فرد ہے اس کی بنیاد عبدالوہاب نے رکھی تھی۔''

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ہماری غیر وہابیت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، مذکورہ بالا عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ اور وہابی مسلمانوں کے ایک راسخ العقیدہ اور خالص پکے قرآن کے متبع فرقہ کے ایک فرد کا نام ہے، مگر جس تحریک کو وہابی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ عبدالوہاب کی پیدا کردہ تحریک نہیں تھی بلکہ محمد بن عبدالوہاب کی پیدا کی ہوئی تھی۔ تاہم دشمنوں نے بڑی ڈھٹائی سے کام لیا اسے ''محمدی'' کے بجائے ''وہابی'' بتایا۔ اور وہابی کو بطور گالی استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کے نام نامی ''وہاب'' کی تحقیر اور تذلیل کے سامان کیے، اب آپ اندازہ فرمالیں کہ جو لوگ ''محمدی'' تحریک کو بطور گالی وہابی کہہ کر اللہ کے اسم گرامی کی توہین کا ارتکاب کرتے ہیں، ان کی آخرت اور ایمان کا کیا ہے گا؟ اس کی بنیاد رکھنے والا عبدالوہاب تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو اپنی اصلی اور اسی خلوص پر بحال کر دیا جائے، یعنی اس سے بدعات، خرافات اور اعمال شرکیہ اور کتاب وسنت کے خلاف اسلام وغیرہا کو نکال دیا جائے تا کہ وہ اپنی اصلی اور ابتدائی صورت میں جلوہ گیر ہو یعنی جس طرح اس کی حضرت رسول اللہ ﷺ اور آپ کے

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پیش فرمایا تھا، کیا یہ کوشش قابل نفرت ہو؟ کیا اس سلسلہ میں جو مساعی جمیلہ کی گئیں وہ اسلام کے مخالف ہونے کی وجہ سے قابل رد ہیں۔ حاشا و کلا

بلکہ ایسی کوششیں عین اسلام ہونے کی وجہ سے قابل تحسین لائق صد آفرین ہیں، پر اس لفظ سے نفرت کیسی؟ اس سے بدکنا کیسا؟

بہر حال ان مخالفتوں کے باوجود شہر حریملا کے بہت سے لوگ شیخ کے معتقد دور مطیع ہو گئے یہ کشمکش جاری تھی کہ ۱۱۵۳ہجری میں آپ کے والد اس جہان فانی سے رحلت کر گئے، آپ کے شہر میں دو قبیلے تھے اور دونوں ہی اپنی اپنی قیادت کے دعویدار تھے اور شہر میں کوئی ایسا شخص بھی نہ تھا جو دونوں میں فیصلہ کرا دیتا جس سے کمزور اپنا حق پالیتا اور کمینے محروم ہوتے انہی میں سے ایک قبیلہ کے پاس بہت سے غلام تھے جو ہر طرح کے منکرات کے مرتکب ہوئے اور لوگوں پر ظلم و تعدی کیا کرتے تھے، شیخ نے ان کو ٹوکنے اور روکنے کا ارادہ کر لیا جب یہ خبر ان غلاموں کو ہوئی تو انہوں نے آپ پر اچانک حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور ایک دیوار کی آڑ میں گھات لگا کر چھپ گئے لیکن وقت پر کچھ لوگوں کو پتہ چل گیا اور ان کے شور کرنے پر سب بھاگ گئے۔

عیینہ میں قیام:

شیخ نے حریملا چھوڑ کر اپنے آبائی وطن عیینہ میں سکونت اختیار کر لی اس وقت عیینہ کا حاکم عثمان بن احمد بن معمر تھا اس نے شیخ کا بڑے اعزاز و احترام کے ساتھ استقبال کیا، شیخ نے اپنی دعوت اصلاح جو سراسر کتاب وسنت کی تعلیم تفصیل سے حاکم کے سامنے پیش کی اور اس کو توحید کا مطلب سمجھایا اور بتایا کہ اس وقت عوام میں جو عقائد پھیلے ہوئے ہیں توحید کے سراسر منافی ہیں اس کو آیات قرآن و احادیث کے ذریعہ سے بھی سمجھایا کہ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کی دعوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اللہ ان کی مدد کرے گا، انہی کو نجد و دیگر مقامات کی پیشوائی اور قیادت کے ساتھ ساتھ حقیقی و ابدی سعادت بھی نصیب کرے گا، حاکم عیینہ نے شیخ کی دعوت قبول کر لی اور ان کے فرمودات پر خوشی کا اظہار کیا، اب شیخ نے دعوت الی اللہ عام کر دی لوگوں کو صرف خدائے واحد کی بندگی اور کتاب وسنت کی اتباع کی طرف بلانا شروع کیا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام عملاً شروع کر دیا عیینہ میں لوگوں نے کچھ ایسے درخت بنا رکھی تھی جن پر نذر و منت کے ڈورے اور قسم قسم کے چیتھڑے لٹکایا کرتے تھے جو ان کے زعم میں حاجت روائی کے اسباب تھے جیسا کہ ملک میں بھی کئی ایک تھگڑ پیر مشہور ہیں، شیخ نے رغبت دلا کر بعض آدمیوں سے یہ درخت کٹوا دیئے۔

فاروقی سنت کا پورا ہونا:

ایک بہت بڑا درخت خاص شہر میں بھی اس قسم کا تھا جس کے واسطے شیخ نے خود ہمت فرمائی، دوپہر کے وقت

اسے کاٹنے کا انتظام کیا اتفاق سے وہاں ایک بکریوں کا چرواہا ملا شیخ نے اسے اپنا کپڑا اتار کر دے دیا اور اس طرح موقعہ پا کر اس درخت کا صفایا کر دیا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی جب دیکھا کہ لوگ بہ نیت تبرک اس درخت کا قصد کر رہے ہیں جس کے نیچے نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیعت لی تھی اور وہاں خصوصی طور پر جا کر نمازیں پڑھتے ہیں، تو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے کٹوا کر جڑ سے نکلوا دیا کہ مبادا یہ قصداً آگے چل کر شرک و بدعت کا باعث نہ بن جائے۔ الحمد للہ شیخ کے ہاتھ سے یہ فاروقی سنت بھی پوری ہوئی، رفتہ رفتہ شیخ کے ساتھ عیینہ میں بھی کافی جماعت ہوگئی۔

شیخ اور زید بن خطاب کا قبہ:

بمقام جبیلہ ایک قبہ جو بنام زید بن الخطاب (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھائی اور غزوۂ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے مقابلہ میں جو شہید ہوئے) چلا آتا تھا لوگوں نے نہ معلوم کب سے ان کے نام کا ایک قبہ و مشہد بنا لیا جو ب رفتہ رفتہ ایک بت خانہ کی صورت میں بدل چکا تھا ہر قسم کی نذر و نیاز منتیں اور چڑھاوے اس پر چڑھائے جاتے تھے اور طواف و سجدہ کی رسم بھی یہاں ادا کی جاتی تھی جیسا کہ بڑی بڑی قبروں پر ہوا کرتی ہے، جیسا کہ ہمارے ملک میں سیوہن میں قلندر شہباز، بھٹ شاہ میں عبداللطیف اور لاہور میں علی ہجویری کی قبر و مزار وغیرہ کی پرستش کی جاتی ہے ایک روز شیخ نے عثمان سے کہا کہ موقع دیجئے کہ اس قبہ کو ڈھا دیں جس سے لوگ گمراہ ہوتے جا رہے ہیں، اور جس کی بدولت باطل و ضلال کی اشاعت زور افزوں ہے، عثمان نے کہا بہتر۔ شیخ نے کہا جبیلہ والے اس میں مزاحم ہوں گے اور جب تک آپ ہمارے ساتھ نہ ہوں گے ہم اسے نہیں ڈھا سکتے، آپ خود بھی ساتھ چلئے چھ سو آدمیوں کی مختصر جماعت لے کر یہ سب وہاں پہنچے جبیلہ والے بھی یہ خبر سن کر مقابلہ کے لیے نکلے، عثمان نے انہیں دیکھ کر جنگ کی تیاری کی قریب تھا کہ دونوں فریق میں معرکہ شروع ہو جاتا مگر جبیلہ والے سمجھ گئے اور قبہ کی حمایت سے باز آئے، عثمان نے شیخ سے کہا کہ آپ خود جو چاہیں کریں، ہم نہ ڈھائیں گے، چنانچہ شیخ نے بذات خود کدال لے کر اسے ڈھانا شروع کر دیا اور زمین کے برابر کر کے ہی دم لیا بہت سے بدعتی قبر پرست اس رات منتظر رہے کہ شیخ پر کوئی آفت و بلا آئے گی مگر صبح تک کچھ بھی نہ ہوا شیخ بالکل صحیح سلامت اٹھے۔

صحیح مسلم میں ابو الہیاج اسدی سے روایت ہے کہ ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تجھے ایسے کام کے لیے نہ بھیجوں جس کے لیے مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا یعنی جو تصویر دیکھوں اسے مٹا ڈالوں اور جو قبر اونچی دیکھوں اس کو زمین کے برابر کر دوں اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ نے قبر کو چونے گچ اور اس پر کچھ لکھنے اور قبہ وغیرہ بنانے اور اس پر مجاور بن بیٹھنے سے منع فرمایا ہے الحمد للہ یہ سنت بھی شیخ کے ہاتھوں بدرجہ اتم پوری ہوئی سچے اور پکے موحد اور حق گوئی اور حق پرست بزرگوں کی یہی شان ہوتی ہے کہ جب منکر دیکھتے ہیں تو اپنے ہاتھوں سے اس کا ازالہ کر دیتے ہیں۔ افسوس ہمارے ملک کے حکام کی

حالت پر اوران کی جی حضوری علماء پر کہ وہ ایسے منکرات اور شرک و بدعت کے اڈے آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن اس کا ازالہ تو بجائے خود وہ ان اڈوں کی سرپرستی اور حمایت کرتے ہیں جیسا کہ ہماری حکومت نے اب ان سب میلوں ٹھیلوں کی سرپرستی بھی شروع کر دی ہے جو پہلے لوگوں کا اپنا انفرادی معاملہ ہوا کرتا تھا لیکن ایوب خان کے دور سے یہ معاملہ حکومت کی سرپرستی اور زیر قیادت و باہتمام تمام انجام پانا شروع ہو گیا۔

اور ہمارے وزیر اعظم بھٹو نے سیہون میں قلندر کے مقبرہ پر طلائی دروازہ کا افتتاح کیا، محمد علی جناح مرحوم کی قبر پر ایک سونے کی قندیل آویزاں کی گئی ہے اور آئے دن حکام اور وزراران مقبروں اور مزاروں پر پھولوں کی چادر چڑھاتے رہتے ہیں اور خود ہمارے دفاعی وزیر کوثر نیازی بھی ان حرکتوں کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ فاعتبروا یا ولی الابصار

افسوس ان میلوں ٹھیلوں اور مقبروں پر قومی ملکیت کا جو ضیاع ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس پر کسی کی زبان نہیں کھلتی لیکن جب قربانی کی عید پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کے لیے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے پرویزی قسم کے لوگ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں اور واویلا کرتے ہیں کہ ہائے اتنا قومی ملکیت کا بلا صرف ضیاع ہو رہا ہے لیکن ان معاملوں پر ان کی زبان گنگ ہو جاتی ہیں ان کا قلم لنگڑا بن جاتا ہے۔ فیاللعجب

اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن مجید میں مسلمان حاکموں کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگر ان کو زمین میں تمکن حاصل ہو جائے تو وہ چار کام کریں گے، ان چاروں میں سے ایک "ونھوا عن المنکر" منکرات سے روکنا ہے، لہٰذا موجودہ حکام کا یہ فرض تھا کہ وہ ان سب قبول وغیرہ کو ڈھا کر زمین بوس کر دیتے اور ان پر طلائی دروازے، سونے کی قندیلیں لگانے سے ادا کرتے قبور تو مقام عبرت ہیں نہ کہ تماشہ گاہ اور تفریح کی جگہیں دیکھئے حضرت شیخ نے باوجود اس کے کہ ان کو پوری طرح سے حکومت حاصل نہیں تھی محض تھوڑی قوت حاصل ہونے کی وجہ سے اپنے ہاتھوں ایک قبہ کو گرا دیا جو کئی برسوں سے لوگوں کی پرستش و پوجا کا مرکز بن چکا تھا اور کوئی اس کو ڈھانے کے لیے ہاتھ نہیں اٹھا رہا تھا اور امیر عثمان جو حضرت شیخ سے تعاون کا وعدہ کر چکا تھا وہ بھی اس پر اقدام کی جسارت نہیں کر رہا تھا اور بدعتی اور شرکیہ خیالات کے لوگ تو حضرت شیخ پر کسی آفت اور بلا کے نازل ہونے کے منتظر تھے لیکن بفضل وحسن وتوفیقہ حضرت اپنا کام کر چکے اور یہ عظیم کارنامہ اپنے ہاتھوں سرانجام دے ڈالا اور الحمد للہ انہیں ذرا سی بھی تکلیف نہ پہنچی، وذلك فضل الله يوتيه من يشاء

شیخ اور زنا کی حد:

ایک روز شیخ کے پاس ایک عورت آئی اور اپنے جرم کا چند مرتبہ اقرار کیا، شیخ نے لوگوں سے اس کی بابت دریافت کیا کہ دیوانی تو نہیں ہے؟ پھر اس سے کہا کہ شاید تجھ پر جبر کیا گیا ہو، شاید تجھے اس کی خبر نہ تھی، اس نے اچھی طرح اقرار کیا کہ نہیں مجھ سے یہ بدکاری ہوش وحواس اور اختیار کی حالت میں سرزد ہوئی شرع کے مطابق شیخ

نے اسے رجم فرمایا، حضرت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھی ایک شخص بنام ماعز رضی اللہ عنہ حاضر ہوا تھا اور زنا کا چند بار اقرار کیا، آپ نے بھی اس سے پوچھا کہ تو دیوانہ تو نہیں دوسرے لوگوں سے بھی جو ان کی قوم سے تھے دریافت فرمایا کہ یہ دیوانہ تو نہیں پھر ان کو کہا کہ تم نے شاید بوس و کنار کیا ہو، اس نے جواب دیا نہیں بلکہ زنا کا ارتکاب کیا اور بعینہٖ اس طرح جس طرح سلائی سرمہ دانی میں جاتی ہے اس طرح صراحت کی اور چار مرتبہ اقرار کیا تب آپ نے لوگوں سے فرمایا ان کو لے جا کے رجم کرو۔ ❶

الحمد للہ حضرت شیخ سے بھی یہ سنت پوری ہوتی ان باتوں سے شیخ کی شہرت روز بروز بڑھتی گئی اور لوگوں کے دلوں میں آپ رحمہ اللہ کا رعب لوگوں کے دلوں پر چھا گیا۔

شیخ اور والی احساء:

یہ اور اس قسم کی خبریں جب سلیمان بن محمد (جو اس وقت حاکم احسا تھا) کو پہنچیں تو اس نے امیر عثمان کو تہدید آمیز خط لکھا کہ تمہاری پاس جو عالم ہے اس نے قبہ منہدم کر دیا اور اس قسم کے بہت سے کام کیے جو ہمارے ہاں اب تک نہیں ہوا کرتے تھے اسے فوراً قتل کر دے ورنہ تیرا سالانہ وظیفہ بند کر دیا جائے گا اور ہم خود تیرے مقابلہ کے لیے فوج لے کر آئیں گے اس خط نے عثمان کے اوسان خطا کر دیئے اسے سخت قلق و اضطراب ہوا، چنانچہ اس نے شیخ سے پوری کیفیت بیان کی ہر چند شیخ نے سمجھایا نصیحت کی مگر اس کے دل سے وہ خیال نہ نکلا آخر ایک روز کہلا بھیجا کہ سلیمان نے آپ کے قتل کا حکم دیا ہے، ہم اس کے حکم کی مخالفت نہیں کر سکتے نہ ہم میں اس سے مقابلہ ان کی تاب ہے نہ وہ سالانہ چھوڑ سکتے ہیں جو وہ ہمیں دیا کرتا ہے نہ آپ کو اپنے ملک میں قتل کرنا پسند کرتے ہیں، لہٰذا آپ کسی اور جگہ چلے جایئے۔

---

❶ مولانا اصلاحی اس روایت کے حق میں نہیں ہیں اس لیے وہ رجم کو شرعی سزا صرف ان زانیوں کے لیے خاص کرتے ہیں جو عادی مجرم اور غنڈے کہلاتے ہیں۔ ماعز رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی انکا یہی نظریہ ہے کہ وہ عادی مجرم تھا یہاں تک کہ وہ عورتوں کا تعاقب کیا کرتا تھا۔ اور اس نے یہ دیکھ کر اعتراف جرم کر لیا تھا کہ اب نبی کریم ﷺ ...... ہیں ہمارے نزدیک ان کا یہ نظریہ محل نظر ہے۔ ایک تو یہ مفروضہ ہے کہ رجم کے لیے زانی کا عادی مجرم ہونا ضروری ہے، ایک بے دلیل مفروضہ ہے۔ فرض کیجئے! ماعز رضی اللہ عنہ عادی مجرم تھے اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ورنہ اس کو رجم نہ کیا جاتا۔ کیا نبی کریم اور صحابہ کے عہد میں ایسا ایک اور واقعہ مل سکتا ہے جس سے یہ پتہ چل جائے کہ تفتیش کرتے ہوئے اس امر کا بس کھوج لگایا گیا ہو اگر عادی مجرم نہ نکلا ہو تو اسے درے مار کر چھوڑ دیا گیا ہو؟

حضرت ماعز سے جو سوالات کیے گئے تھے، ماعز نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ''واقعتاً پاک ہونے کے لیے آئے تھے پر حضور کے سوال کی نوعیت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف واقعہ کے سرزد ہونے کا یقین چاہتے تھے اس کے عادی اور غیر عادی مجرم ہونے کا امتیاز ان کے سامنے نہیں تھا۔ ورنہ سوالات کی نوعیت اتنی سادہ نہ ہوتی۔

پھر عادی یوم کی کوئی دوٹوک حد معلوم نہیں ہے اور جسے آپ غیر عادی تصور کرتے ہیں اس کے بارے میں یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ چھپا رستم نہیں ہے؟ ہمارے نزدیک عادی مجرم کی قید لگانے سے سیاہ کارواں کیے...... آپ اصل میں چور راہ مہیا کر رہے ہیں۔ بہر حال اگر مسجد دین کے واویلا سے دعوت کی بات نہیں ہے تو یہ ایک گھپلا ضرور ہے۔ اس سے مفید نتیجہ تو مشکل نکل سکتا ہے راہ صاف نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے ایس تک بندیوں سے قوم کو معاف رکھا جائے تو احسان ہوگا۔ (عزیز زیدی)

شیخ کی دوبارہ ہجرت اور موت سے نجات:

عثمان نے اپنے ایک شہسوار کو حکم دیا کہ چند سواروں کو لے کر اس شخص کو جہاں چاہے لے جاؤ اور فلاں مقام پر پہنچ کر اسے قتل کر کے واپس آ جانا شیخ نے کہا کہ میں درعیہ جانا چاہتا ہوں، چنانچہ عین دوپہر کے وقت چلچلاتی دھوپ میں شیخ نے سفر کیا سوار پیچھے پیچھے آ رہے تھے اور شیخ آگے آگے، اس سفر میں شیخ نے بجز ومن یتق الله یجعل له مخرجا ویرزقه من حیث لا یحتسب اور لا اله الا الله والله اکبر، کچھ گفتگو نہ کی آخر جس مقام پر قتل کا حکم تھا وہاں پہنچ کر سوار نے قتل کرنا چاہا مگر اس کا ہاتھ نہ چل سکا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ایسا رعب ڈال دیا کہ اسے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا آخر شیخ کو چھوڑ کر واپس چلا آیا اور عیینہ پہنچ کر عثمان سے کہا کہ مجھ پر ایسا رعب طاری ہو گیا کہ جان بچا کر واپس آنا غنیمت جانا یہ سفر کے مصائب والام برداشت کر کے عصر کے وقت حدود درعیہ میں پہنچے اور محمد بن سویلہ عدینی کے ہاں ٹھہرے وہ واقعات سن کر نہایت خوفزدہ ہوا اور ابن مسعود کی طرف خیال کیا کہ کہیں مجھ پر کوئی آفت نہ آ جائے شیخ نے بہت کچھ سمجھایا نصیحت کی آخر ابن سویلہ کو صبر آ گیا۔

امیر محمد بن سعود کی نصیحت:

درعیہ پہنچنے پر چند مخصوص آدمی حضرت شیخ سے ملے ان کی وعظ وارشاد سے توحید واتباع سنت کی حقیقت سمجھ کر ان کی حمایت کے لیے تیار ہو گئے، پہلے انہوں نے سوچا کہ ابن سعود سے اس کا ذکر کریں مگر اس کوف سے کہ مبادا کہیں وہ مخالفت نہ کر بیٹھے رک گئے اور یہ مصلحت خیال کی کہ اس کی بیوی جو عاقلہ دمدبرہ تھی سے ذکر کیا جائے یہ لوگ اس کے ہاں پہنچے اس کے دل میں شیخ سے محبت ڈال دی، اس نے نہایت خوبی سے اپنے خاوند محمد بن سعود سے پورا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ اللہ نے اس شخص کو آج تیرے پاس بھیج دیا ہے، یہ بہت بڑی غنیمت ہے اسے قبول کر اس کی قدر وقیمت جان اور جہاں تک ہو سکے اس کی عزت وتوقیر کر، اس نے یہ بات قبول کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں بھی شیخ کی محبت ڈال دی پہلے اس نے شیخ کو اپنے پاس بلانا چاہا مگر لوگوں نے سمجھایا کہ مناسب یہ ہے کہ آپ خود تشریف لے جائیں اور اس طرح ان کا احترام فرمائیں تاکہ لوگ بھی اس ذائقہ سے ان کی عزت وتوقیر کریں، چنانچہ ابن سعود خود ابن سویلہ کے مکان پر پہنچ کر حضرت شیخ سے ملا اور نہایت تعظیم وتکریم سے پیش آیا پھر شیخ سے کہا خوش ہو یئے آپ کی ہر طرح عزت وتوقیر کی جائے گی اور یہ وطن آپ کو اپنے وطن سے زیادہ عزیز ہوگا، شیخ نے (جواباً) کہا میں آپ کو عزت وقوت کی خوشخبری دیتا ہوں کلمہ توحید (لا الٰہ الا اللہ) ایسی چیز ہے جو اسے مضبوط پکڑ لے اور اس کی حمایت میں کھڑا ہو جائے اسے ملک اور ولایتوں کا مالک بنا دیتا ہے یہی وہ کلمہ ہے جس کی طرف تمام انبیاء بلاتے تھے اس کے بعد نبی کریم ﷺ (فداہ ابی وامی و روحی) کی سیرت پاک کا ذکر کیا آپ کی دعوت وتبلیغ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو کیفیت تھی بیان کی امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر آپ نے جتنا، چنانچہ وقت عزیز صرف کیا اچھی طرح بتایا بدعت ورسوم کی برائی اور یہ کہ ہر بدعت گمراہی ہے اچھی طرح ظاہر کی اور

یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف بلانا اس کی راہ میں جہاد کرنا ضلالت پرستوں کو ہدایت پر لانا یہی اصلی فلاح و بہبود کا ہے اور اس میں ہی دین و دنیا کی ترقی کا راز مضمر ہے، اس کی بدولت اخوت ایمانی اور قوت اسلامی قائم و دائم رہتی ہے اور یہی تمام خوبیوں کی کلید ہے، پھر تمام نجدیوں کی حالت جو اس وقت تھی بیان کی جو سراسر بے دینی شرک و بدعت میں منہمک تھے آپس میں اختلاف ونفاق ان کا ادنیٰ شیوہ اور ظلم و ستم کو دین و ایمان سمجھ رکھا تھا، نہ خدا کا خوف انہیں نہ شرک و بدعت سے نفرت نہ ایمان کی محبت آبائی رسوم اور تقلید و بدعات کو اسلام و ہدایت سمجھ چکے تھے، نہ فرائض اسلام نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج کا کوئی ذکر نہ قرآن اور تمام مصلحین کو بھی تو انہی القاب سے نوازا جا چکا ہے۔

اعلان جہاد بالسیف:

شیخ رات دن دعوت الی اللہ وعظ و ارشاد اور علمی رسائل کی تالیف و اشاعت میں مصروف رہنے لگے اور امیر محمد بن سعود اپنی بساط بھر آپ کی مدد کرتا رہا، لیکن آپ کی دعوت کے مخالفین بھی ہر ممکن ذریعہ سے آپ کے خلاف برسر پیکار تھے، جس سے مجبور ہو کر شیخ اور امیر محمد بن سعود کی دعوت کو قوی اور طاقتور بنانے کی خاطر جہاد کے لیے تیار ہونا پڑا اور کئی سال تک یہ دینی جنگ جاری رہی جنہیں اکثر مواقع پر فتح امیر محمد بن سعود ہی کو ہوتی رہی اور قبائل و بستیاں یکے بعد دیگرے قبضہ میں آتے گئے اور بچے کھچے لوگ آپ کی دعوت کی حقانیت جان لینے کے بعد برضا و رغبت آپ کے مطیع ہو گئے اس اثناء میں آپ نے دعوت قادئین کا صرف دفاع کیا اور دعوت کی راہ میں حائل مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کی۔

تکمیل دعوت:

ریاض کی فتح اور سلطنت کی وسعت اور مشکلات کے رفع ہو جانے کے بعد شیخ نے عوامی امور اور مال غنیمت کے معاملات امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود کے سپرد کر دیئے اور خود علم و عبادت اور درس و تدریس میں منہمک ہو گئے لیکن امیر محمد بن سعود اور اس کے صاحبزادے عبدالعزیز شیخ کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے اور کوئی حکم نافذ کرنے سے پہلے شیخ سے اس کی شرعی حیثیت معلوم کر لیا کرتے تھے۔

امیر محمد بن سعود کی بیعت:

اس کے بعد امیر نے شیخ سے دعوت الی اللہ جہاد فی سبیل اللہ، اتباع سنت رسول اللہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شعائر دین کے قیام پر بیعت کی، شیخ جب پوری طرح درعیہ میں جم گئے تو ان کے معتقد متعارفین ہر طرف سے ان کی خدمت میں پہنچنے لگے جن میں آل معمر کے رؤسا بھی شامل تھے۔

ابن معمر کی ندامت اور حاضری:

امیر عثمان بن معمر جس نے شیخ کو عیینہ سے نکالا تھا، جب یہ معلوم ہوا کہ امیر محمد بن سعود نے شیخ کی بیعت کر لی

ہے اور اس کے ساتھ تمام اہل درعیہ شیخ کے حامی و ناصر بن گئے ہیں تو اسے اپنے کئے پر ندامت ہوئی اور عیینہ کے رؤسا اور معززین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ وہ شیخ کے پاس حاضر ہوا اور معافی چاہی اور شیخ سے عیینہ واپس چلنے کی درخواست کی شیخ نے اس معاملہ کو امیر محمد بن سعود کی رضامندی پر چھوڑ دیا امیر محمد بن سعود نے اجازت نہیں دی اور امیر عثمان کو ناکام واپس ہونا پڑا، اب شیخ کے پاس لوگ جوق در جوق آنے لگے اور لوگ عقائد کی صفائی اور خرافات سے توبہ کرنے لگے درعیہ میں لوگوں کی کثرت آمد ایک مسئلہ بن گئی کیونکہ درعیہ اور اہل شہران کے قیام وطعام کی کفالت نہیں کر سکتی تھی، چنانچہ بعض شائقین علم راتوں کو کام بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ مشکل بھی آسان کر دی۔

دعوت وارشاد:

شیخ نے لوگوں کی تعلیم پر بڑی زبردست محنت کی آپ نے لا الٰہ الا اللہ کا معنی بتایا کہ اس کے پہلے جزء میں تمام باطل معبودوں کی نفی ہے اور دوسرے جز ''الا اللہ'' میں وحدہ لاشریک کے ساتھ بندگی کا اثبات ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ اس کو کہتے ہیں جس کی طرف دل محبت وخوف اور بزرگی وامید سے جھکتے ہیں، آپ کی ان ہدایات بھری تعلیم سے لوگوں کے ذہن روشن ہو گئے قلوب کی صفائی اور عقائد درست ہو گئی اور شیخ کی محبت آنے والوں کے دلوں میں بڑھ گئی۔

رؤساء وقضاۃ کو دعوت:

آپ نے نجد کے مختلف رؤسا اور ان سے درخواست کی کہ شرک وعناد چھوڑ کر شیخ کی بیعت اور آپ کی اس دعوت کا مذاق اڑایا اور آپ کو حاصل و بے عالم ہونے کا طعنہ بھی دیا اور بعض نے آپ پر جادوگر ہونے کا الزام بھی لگایا، اندھی تقلید اور بغض وعناد کا برا ہو کہ آپ پر انتہائی ناگوار اتہاماً بھی لگائے گئے جن سے آپ بالکل بری تھے یہ بدبخت اتنا بھی نہیں سمجھتے تھے کہ ایک جاہل شخص اتنے ٹھوس دلائل کیسے پیش کر سکتا ہے اور جادوگر نہیں ایسی بات سکھا ہی نہیں سکتا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس سے ہو ہی نہیں سکتا، بہر حال اس میں تعجب کی بات کیا ہے۔

وفات:

شیخ کا یہ آخری دور بہترین دور تھا جو پرسکون اور پاکیزہ نہایت خوش وخرم گزرتا رہا یہاں تک کہ ماہ ذوالقعدہ ۱۲۰۶ ہجری میں شیخ نے وفات پائی اور ایک عظیم مجدد اسلام اور ولی اللہ دار البقا کو سدھار گئے۔ رحمہ اللہ واسکنہ فی الجنان، آمین

کسی مجدد کی دور میں یہ نہیں ہوتا کہ کوئی اور حق پرست یا حق گو عالم وفاضل بالکل ہوتا پھر نہیں بلکہ بہت سے حق گو علماء وفضلاء موجود ہوتی ہیں لیکن جو کام قدرت نے اس بزرگ ہستی کے لیے مقدر کر رکھا ہوتا ہے وہ کسی دوسرے سے انجام پذیر نہیں ہوتا مثلاً امام احمد بن محمد بن حنبل رحمہ اللہ کے عہد مبارک میں کتنے علماء وفضلاء حق گو تھے کیا اس

دور میں اور کوئی فاضل نہ تھا؟ یقیناً تھا اور بہت تھے لیکن جو کام قدرت نے حضرت امام احمد رحمہ اللہ کے سپرد کرنا تھا وہ انہیں ہی انجام دینا پڑا کسی اور سے یہ بوجھ نہ اٹھا اور نہ اٹھایا جا سکا اسی طرح حضرت امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے زمانہ میں بھی فضلاء ونبلاء کا ایک جم غفیر موجود تھا لیکن جو جہاد لسان، قلم اور ہاتھ سے انہوں نے کیا اور جو کارنامے انہوں نے انجام دیئے اور کسی سے نہ ہو سکے اسی طرح آپ ہر دور کے مجدد کے عہد کو ملاحظہ کرتے جایئے آپ کو معلوم ہوگا کہ اسے علماء حقہ کی کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن وہ کہا گیا ہے کہ:

قرعہ بنام من دیوانہ زدند

اس کے مطابق تجدیدی کارکرعظام انہی سے انجام پذیر ہوتے ہیں نہ کسی دوسرے سے اب اس بات کو ذہن رکھتے ہوئے آپ حضرت شیخ کی زندگی پر اور ایک دور پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے عہد میں بھی علماء حقہ کی کمی نہیں تھی ہم نے ایک واقعہ تو مذکورہ بالا صفحات میں حضرت شیخ اور علامہ محمد حیات سندھی کا نقل کر چکے ہیں کہ حضرت شیخ نے حضور اکرم ﷺ کے روضہ اطہر پر اعمال شرکیہ دیکھ کر شیخ سندھی سے دریافت کیا تھا کہ ان باتوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے تو وہ بولے کہ ان ھـولاء متبـر ما ھم فیه وباطل ما كانوا یعملون.
اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سندھی حق پرست عالم تھے، اس لیے حق بات کا اظہار بے خوف وخطر کر دیا لیکن عمل طور پر انہوں نے بھی ان مفاسد اور اعمال شرکیہ کر خلاف کوئی جہاد نہیں کیا یہ
تو حضرت شیخ کے لیے مقدر تھی

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدا کر بخشندہ

اب حضرت شیخ کے کارناموں کو مختصراً قلمبند کیا جاتا ہے۔

شرکیہ اڈوں کو گرانا اور ان کا قلع قمع کرنا:

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت شیخ نے ان بڑے بڑے قبور کو اپنے ہاتھوں سے زمین بوس کیا جو مضبوط تھی اور دوسرا کوئی آدمی اس پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت بھی نہ کرتا تھا اور کچھ قبے دوسروں کے ہاتھ سے گروائے حالانکہ ان مزاروں پر اعمال شرکیہ کرتے ہوئے خود ان کی ملک نجد کے لوگ بھی کافی بڑا عرصہ گزار چکے تھے اور ان پر ہاتھ اٹھانے کو باعث تباہی سمجھتے تھے لیکن حضرت شیخ نے ایک قبہ تو اپنے ہاتھوں سے مسمار کر دیا اور ان کی مخالف رات بھر ان کی تباہی کا انتظار کرتا رہے لیکن بفضل اللہ وہ صحیح سلامت رہے اسی طرح بہت سے درختوں کو کاٹ کر ختم کر دیا جن کی عام طور پر پرستش کی جاتی تھی اور ان کو قاضی الحاجات تصور کیا جاتا تھا کچھ علماء برحق بھی موجود تھی لیکن یہ جرأت مندانہ اقدام کسی سے نہ ہو سکا اور اس سے فاروقی سنت کا احیا ہو گیا۔

بدعات کا انکار:

حضرت شیخ نے فروعی بدعات ومحدثات کا انکار کیا جیسا کہ میلادنبوی کی مجالس اذان سے قبل تذکیر اور بعدہ رسول اللہ ﷺ پہ جہری درود لفظوں کے ساتھ نیت کا ادا کرنا خطیب کا منبر پر چڑھتے وقت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث پڑھنا اور اسی طرح صوفیاء کے بدعتی طریقوں کی مخالفت کی، غرض کہ ان تمام بدعات کا رد کیا جن کا استحباب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے وارد نہیں اس مہم کے انجام دینے میں حضرت شیخ کو بہت سے مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا، اصل قصہ یہ ہے کہ نجد والے اور اطراف کے لوگ شرک وبدعات، اوہام اور خرافات میں بالکل ڈوبے ہوئے تھے یہ عقائد ان کو اپنے آباء واجداد سے بطور ورثہ ملی تھی، ان میں وہ پلے بڑھے تھے، لہٰذا جب حضرت شیخ نے ان کو ان سب سے روکنا شروع کیا اور ان خرافات واوہام کی حقیقت ان پر واضح کردی اور علماء سوء وعوام جو ان میں ملوث تھی ان کو جاہل ومشرک بتایا اور برملا ان کی حقیقت کو ظاہر کرنا شروع کیا تو ان علماء سوء کی حمیت جاہلیت کی لگ پھڑک اٹھی اور انہوں نے سوچا کہ اگر ہم نے حضرت شیخ کی دعوت قبول کرلی تو عوام میں ہماری پوزیشن خراب ہوجائے گی اور لوگ کہیں گے کہ یہ علم کا دعویٰ کرتے تھے درس وافتاء کے مراتب پر فائز تھے خود کو راہ حق کا ہادی قرار دیتے تھے اور اب حضرت شیخ کی دعوت کی اشاعت کے بعد ان کی جہالت کھل گئی گروہ شیطان نے یہ سب باتیں ان کی دلوں میں ڈال دی تھیں اور انہیں اعزاز اور اعلیٰ منصب کی محبت کی طرف کھینچا بالآخر حق کے مقابلہ میں وہ اکڑ گئی اور لایعنی بحث وجدال کے ہتھیار سے لیس ہوگئے اور عوام میں یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ شیخ کے عقائد عامۃ المسلمین کے بالکل خلاف ہیں، نیز شیخ اولیاء اللہ وبزرگان دین کی تنقیص کرتے ہیں لہٰذا ان کی پیروی کی سخت مخالفت کرنی چاہیے اس طرح عوام وخواص نے بودے اور کمزور دلائل اور خود ساختہ شبہات کا سہارا لے کر شیخ کا مقابلہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے شیخ کی مدد کی اور مضبوط دلائل آیات قرآنی واحادیث صحیحہ کے ذریعہ ان پر حجت قائم کردی جب یہ لوگ علمی دلائل میدان میں شکست کھا گئے تو بجائے ہار ماننے کی الٹا حضرت حضرت شیخ کی راہ میں حائل ہوگئے اور ظلم جنگ پر اتر آئے، لیکن حضرت شیخ نے ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اولوالعزم اور باہمت استقلال ہستیوں کی طرح امیر محمد بن سعود کی سرپرستی میں جس دعوت کو شروع کیا تھا اس کی خاطر ان دشمنوں سے شدید جنگ چھیڑ دی اور جس طرح علمی میدان میں دشمن شکست کھا کر خالی ہاتھوں بھاگے اسی طرح میدان جنگ میں بھی ناکامی کا منہ دیکھا اور فتح ونصرت حضرت شیخ کے قدم چومتی جب علمی وجنگی دونوں راستے ان پر بند ہوگئے تو انہوں نے شیخ کو بدنام کرنے کی ایک ترکیب یہ سوچی کہ ان پر بے بنیاد الزامات اور جھوٹے اتہامات لگانا شروع کردیا جائے اور کچھ لوگوں کو بھی لکھا کہ یہ شخص بدعتی ہوا اور سعودی عوام کے عقائد خراب کررہا ہے اور عوام کو ان کے موروثی دین سے ہٹا رہا ہو، اور شعائر دین کی تحقیر کرتا ہے، مشائخ واولیاء کے قبوں و کتبوں کو منہدم کرتا ہے وغیرہ وغیرہ، لہٰذا ان ظالموں کی سرکوبی سے اگر حکومت خاموش رہی تو مسلمانوں کے دلوں

سے حکومت کا رعب و دبدبہ جاتا رہے گا، اور اس کی حیثیت عوام ہی گھٹ جائے گی اور آئندہ کرتی بھی دعویٰ خلافت میں ان کا ساتھ دینے والا باقی نہیں رہے گا، مخالفین لوگوں اور ان کے شیخ الاسلام نیز فوج کے سرداروں سے برابر مدد لیتے رہے یہاں تک کہ سلطنت عثمانیہ ان بہتان تراشوں کے فریب میں آ گئی اور جب شیخ کی دعوت تجدد و عمان تک پہنچ گئی اور آل سعود کی حکومت مضبوط ہوگئی اور سعودی حکومت کے اثرات نجد سے عمان تک پھیل گئے اور شام و عراق سے اس کی ٹکر ہونے لگی تو ترکوں کو بلاد عرب سے اپنے سامراجی نظام کے چل چلاؤ کا خوف ہوا اور جب ۱۲۱۸ ہجری بن آل سعود نے مکہ مکرمہ بھی فتح کر لیا تو ترک قلم و خنجر دونوں ہی سے مسلح ہو کر میدان میں اٹھ کھڑے ہوئے اور سلطنت عثمانیہ نے اپنے مصد کے گورنر محمد علی پاشا کو حکم دیا کہ نجدیوں کو سرکوبی کے لیے ایک لشکر جرار تیار کیا جائے، لیکن ترک فوج بار بار شکست کھاتی رہی، ہر حال شیخ کے وقت حالت یہ تھی جیسا کہ احمد بن حجر ● کے الفاظ سے ظاہر ہے لکھتے ہیں: ''شیخ ایسے وقت میں آگے بڑھ کر اس وقت پورا جزیہ عرب ایک ایسے مصلح کا شدید طور پر محتاج تھا جو اس مہلک مرض سے ان کا علاج کرے اور اس کو رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کی طرف لوٹا سکے۔''
چنانچہ آپ کی یہ مبارک دعوت نجد میں پھیلی ہوئی خرافات اور قبروں کی تعظیم اور غیر اللہ کی نذر اور شجر و حجر کے ساتھ لوگوں کے عقائد فاسدہ پر پوری طرح اثر انداز ہوگئی اور سب کا خاتمہ کر کے شریعت محمدیہ کے نشانات دوبارہ زندہ اور تازہ کر دیئے۔

حضرت شیخ کے تعلیمی کارنامے:

نجد کے لوگ جہالت و بغاوت کی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور غاروں، درختوں کے ساتھ اعتقاد رکھتے تھے لیکن اس دعوت نے ان کے درمیان شریعت مطہرہ کے علوم اور اس کے تمام ذرائع مثلاً تفسیر، حدیث، توحید، فقہ، سیرت، تاریخ، نحو اور دوسرے علوم کو عام کر دیا اور درعیہ علوم و معارف کا مرکز بن گیا جہاں نجد اور تمام علاقوں سے طالب علم پہنچنے مگر بلکہ یمن و حجاز اور خلیج عرب ہر چہار طرف سے لوگ آنے لگے اور تمام علاقوں میں دین کا علم پھیل گیا علم کا اتنا چرچا ہوا کہ مؤرخین کے بیان کے مطابق چرواہا اپنے مویشی جنگل میں چراتا اور اس کی تعلیم کی تختی اس کی گردن میں لٹکی ہوئی تھی اس علم اور اس کی وسعت کی قوت سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے مختلف علوم کی نادر کتابیں لکھیں جب کہ نجد اور آس پاس کے علاقوں پر جہل عظیم نے اپنا سکہ جما رکھا تھا، روز ظلمت و اوہام کی تاریکیوں میں وہ بھٹک رہے تھے۔

اہل نجد میں انتشار کے بعد اتحاد:

اس وقت اہل نجد منتشر تھے کوئی چیز انہیں باہم مربوط نہیں کر سکتی تھی نہ شرعی حکم اور نہ کوئی قانون وہ اپنے تمام اعتقادات اور اختلافات میں بالکل الگ الگ تھی لیکن شیخ کی اس دعوت نے ان کی آواز متحد کر دی ان کے بکھرے

ہوئے شیرازے کو اکٹھا کر دیا اور سب کو ایک ہی جھنڈی کے نیچے جمع کر دیا اور ایک ہی بادشاہ کا ان کو تابع کر دیا، جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق ان کی رہنمائی کرتا تھا، اس سے قبل نجد کا دوسری جماعتوں میں کوئی چرچا نہ تھا وہ انتہائی حقیر اور اس حالت میں تھا جس کا نہ وزن نہ جس کی قیمت، نہ اس کا کوئی بادشاہ اور وہ بھی چھوٹی چھوٹی بستیوں کے معمولی امراء کے علاوہ کوئی مشہور حاکم نہ تھا لیکن شیخ کی دعوت کے بعد اب وہی نجد ایک مستقل مملکت بن چکا ہے جس کی شہرت اقصاء کر عالم تک پھیل گئی اس وقت صرف دولت عثمانیہ میں کچھ دم خم تھا اس کو بھی اس کی مضبوط حیثیت کا احساس ہوا اور اس کو مٹانے اور اس سے لڑنے کے لیے لشکر جرار تیار کر ڈالا مشہور مورخ محمد جمیل بیہم کے الفاظ میں نجدین اور تمام متفرق جزیرۃ العرب میں یہ تحریک عربوں کو متحد اور آزاد کرنے لگی۔

امن عامہ کے لیے حضرت شیخ کی مساعی جمیلہ:

ان کی دعوت کی برکت سے نجد کے تمام علاقوں میں امن وامان قائم ہو گیا، یہ حالت ہو گئی کہ پیدل اور سوار مسافر رات دن کی طویل مسافت طے کرتے لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوتا جبکہ اس کے پاس مال کی اتنی بڑی مقدار ہوتی کہ جس کو اٹھانے کے لیے ایک پوری گروہ کی ضرورت ہوتی تھی اس مبارک دعوت کے آثار میں سر موجودہ مملکت سعودیہ ہے، جس کی سلطنت پورب میں خلیج عربی سے لے کر پچھم میں بحیرۂ احمر تک پھیلی ہوئی ہے یہ سلطنت صحیح معنوں میں کتاب وسنت اور توحید خالص کی سلطنت ہے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی حکمرانی ہے۔ یہ وہ سلطنت ہے جس نے انصاف اور امن وسلامتی کو چپہ چپہ تک پھیلا دیا یہ وہ حکومت ہے جو مرکز علم سے معزز ہو گئی اور اسی عظم کو تمام عمان اور رعیت میں پھیلانے کے لیے یہ مستعد ہو گئی حتیٰ کہ ان کو بھی فیض پہنچایا جو اس سلطنت میں باہر سے پہنچے۔

چنانچہ بڑے بڑے علمی ادارہ کالج اور مدارس قائم کیے گئے اور مدرسین وطلبہ پر خواہ وہ وطنی ہوں یا غیر وطنی سب پر بے حساب دولت خرچ کی گئی اور یہ وہ حکومت ہے جو اپنے احکامات واخلاق کی حفاظت اور کتاب وسنت سے فیصلہ لینے کے اعتبار سے صحیح معنوں میں اسلام کے عہد اول اور سلطنت صالحین کی نمائندہ ہے، یہ حکومت اپنی رعایا کے مصالح کے لیے انتہائی مستعد ہے اور ان کی فلاح وبہبود اور فقر وفاقہ کے خاتمہ نیز زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے بھرپور کام کر رہی ہے اسی طرح حجاج کی راحت وآسانی کے لیے بھی پوری طرح بیدار ومتحرک ہے حجاج کی فلاح وبہبود اور ان کی راہ میں حائل تمام مشکلات دور کرنے اور احکام شریعت کے نفاذ، امن عامہ عدل اور علم کی نشر واشاعت اور بدعت وضلالت کے چنگل سے نیز کمینوں اور بداخلاقی لوگوں اور محرکات الٰہی کے مرتکب ہونے والوں پر سختی کرنے کے اعتبار سے یہ عرب کی سب سے بہترین سلطنت ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا رہے اور اسے خیر ونفع عام کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

---

(1) یہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نہیں بلکہ ایک تیرہویں صدی ہجری کا عالم ہے جو قطر کا قاضی تھا۔

سلطنت سعودیہ خلدھا اللہ پر تین دور گزرے ہیں، چونکہ ہم اس تیسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا اس دور کے کچھ واقعات قلمبند کیے جاتے ہیں۔

تیسرا دور:

سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل سے شروع ہوتا ہے انہی کے دور میں دوسری اور آخری مرتبہ حجاز مقدس اور حرمین شریفین کی فتح ہوئی اور اس وقت سے تا حال انہی کی حکومت چلی آتی ہے، جب سلطان عبدالعزیز نے حجاز پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے اپنے شیخ اعلیٰ کے اتباع میں قبوں وکتبوں کو منہدم کرایا اور بدعت وشرک کے اڈوں کو ختم کیا اور ان کو بھی اس وقت کے علماء سوء سے ٹکر لینی پڑی اور انہی علماء سوء نے طعن وتشنیع کی مہم شروع کر دی۔ افسوس کہ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور ابھی تک ان علماء سوء کے مقلدین حکومت سعودیہ کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ فالی اللہ المشتکی

بہرحال اس وقت علماء نے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی عوام وخواص جھوٹے الزامات وخود ساختہ اتہامات سے بدظن کرنے کی کوششیں کیں، لیکن حضرت امام عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس وقت بھری مجلس میں یہ جواب دیا کہ اگر کتاب وسنت کے علماء کتاب وسنت سے یہ ثابت کر دیں کہ میرا یہ کام (قبوں کو منہدم کرنا وغیرہ) کتاب وسنت کے خلاف ہے تو ان مقبروں اور منہدم شدہ قبوں کو پھر سے اینٹ پتھر سے نہیں بلکہ سونے سے بنا دوں گا لیکن جیسا کہ واضح ہے، وہ علماء وفضلاء سب کے سب خاموش ہو گئے، کیونکہ حضرت الامام کا یہ کام کتاب وسنت کی تعلیمات کے خلاف تو تھا نہیں بلکہ کتاب وسنت کی تعلیمات پر مبنی تھا بالآخر انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے لیکن اپنی بدگوئی سے باز نہ آئے۔ فاللّٰہ یحکم بینھم فیما کانوا فیہ یختلفون

اور اسی سلطان مرحوم نے خداترسی، حق پرستی، صداقت واستقامت، دیانت واتباع کتاب وسنت کو شعار بنا لیا تھا کہ ہر موقع پر اور ہر موطن پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کو اپنی صداقت واعانت سے نوازتا تھا اور جگہ جگہ پر فتح ونصرت صرف ان کا ہی استقبال کرتی۔

تین چار برس ہوئے کہ ہم مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ برادرم حضرت علامہ بدیع الدین شاہ صاحب نے ایک واقعہ سنایا اور بھائی صاحب کے قول کے مطابق اس واقع کا راوی ابھی تک زندہ تھا یہ واقعہ بھائی صاحب نے اس بزرگ کی زبانی اس طرح بیان کیا کہ جب سلطان عبدالعزیز رحمہ اللہ حرمین شریفین کو ظریف حسن کے تسلط سے آزاد کروا رہا تھا تو اس وقت ہم (اس واقعہ کا راوی) اہل بدعت کے ساتھ تھے اور سلطان مرحوم کے برخلاف ہر محاذ پر اہل بدعت کی ہی مدد کرتے تھے اور ان کے فتح یاب ہونے کے متمنی وخواہاں تھے ایک وقت ایسا آیا کہ سلطان مرحوم کے مقابلہ میں شریف کی مدد کے لیے جہاز آنے والے تھے سلطان مرحوم کی فوج نے جا کر سلطان سے عرض کی کہ زمین پر تو ہم بفضل اللہ تعالیٰ اچھی طرح سے مقابلہ کرتے ہیں اور ہر مومن پر اللہ کے فضل

سے کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ ہوائی جہاز آ رہے ہیں ان کا مقابلہ کس طرح کیا جائے یہ وقت تھا کہ ان کے پاس انسٹی ائیر کرافٹ اور اس قسم کا جدید اسلحہ نہ تھا سلطان مرحوم نے یہ سن کر فرمایا کہ تم گھبراؤ نہیں بس جس وقت ہوائی جہاز سامنے آئیں تو اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر نکلو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا، پھر وہ راوی کہتا ہے کہ یہ ہمارا عینی مشاہدہ ہے کہ ادھر ہوائی جہاز سامنے سے فضا میں شور مچاتے اڑتے آ رہے تھے اور ادھر سلطان مرحوم کی فوج کے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اوپر فضا میں ہوائی جہاز کو آگ لگ گئی جب یہ مشاہدہ ہم نے اپنی آنکھوں سے کیا تو ہمیں یقین ہوگیا کہ حق سلطان کی حمایت میں ہے، اس لیے ہم نے بھی اہل بدعت کو چھوڑ کر سلطان مرحوم کی جانبداری میں ہوگئے۔ بھائی صاحب نے فرمایا کہ یہ واقعہ بیان کر کے راوی زار و قطار رونے لگا اور کہا کہ وہ کیسا دور تھا کہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سلطان مرحوم کی جانب ہی تھی۔

سلطان مرحوم کی انکساری اور تواضع:

غالباً ۱۹۴۹ء کا دور تھا میں بحری جہاز کے ذریعہ حج پر گیا تھا ایک مرتبہ میں حطیم میں تھا تو معلوم ہوا کہ سلطان عبدالعزیز طواف کے لیے تشریف لا رہے ہیں، ہم بھی برائے زیارت چشم براہ بن گئے، بالآخر سلطان تشریف لائے چونکہ بہت بوڑھے ہوگئے تھے، لہٰذا ان کے فرزندوں نے انہیں ایک کرسی نما ٹرالی پر بٹھا کر طواف کرایا، ہر چکر میں جب میری جانب سے گزرتے تو میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ ان کے اور میرے درمیان زیادہ سے زیادہ ۶/۵ فٹ کا فاصلہ ہوگا، یعنی دوسرے سلطانوں اور بادشاہوں کی طرح پہلے سب لوگوں کو حرم سے باہر نہیں نکالا گیا اور نہ ہی لوگوں کو اتنا دور رکھا گیا اور سلطان اور ان کے درمیان ایسی فوجی قطاریں کھڑی کی جائیں کہ عوام سلطان کو ایک نظر بھی نہ دیکھ سکیں۔ فرحمه الله رحمة واسعة.

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مبارک مملکت کا سایہ ابدالآباد تک ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے اور اس کے بانی حضرت الامام محمد بن عبدالوہاب کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا فرمائے۔ ان کی جگہ اعلیٰ علیین میں بنائے اور انہیں نبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت نصیب فرمائے اور ان کی بابرکت دعوت کو دن دگنی رات چوگنی ترقی و فروغ عطا فرمائے۔ اللھم آمین

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين وصلى الله على خير خلقه سيدنا ومرشدنا وهادينا وشفيعنا نبي الرحمة محمد واله واصحابه وازواجه وذرياته واهل بيته اجمعين وبارك وسلم.

وانا العبد الضعيف

محب الله شاه عفى عنه الله

❀❀❀❀

باب پنجم

شخصیات 2

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کی شخصیت پر الاعتصام نے ایک خاص نمبر شائع کیا تھا تو شاہ صاحب نے ان کی شخصیت پر ایک جامع مضمون تحریر کر کے ان کو داد تحسین پیش کیا۔ (الازہری)
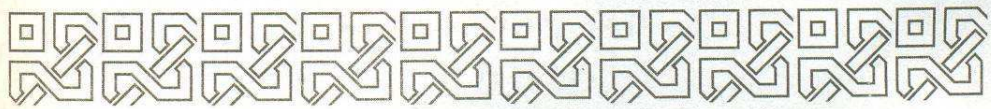
حضرت مولانا عطاء اللہ مرحوم اسم با مسمّٰی تھے، یعنی وہ اپنے والدین کے لیے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے عطیہ تھے ہی لیکن راقم الحروف کے خیال میں مرحوم اہل علم کے لیے عموماً اور جماعت اہل حدیث کے لیے خصوصاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لاجواب عطیہ اور نعمت عظمٰی تھے۔ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی ہستی کی قدر کما حقہ اس کی زندگی میں نہیں کرتا لیکن اس کو اپنی اس تفریط و تقصیر کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ اس فانی دنیا سے انتقال کر کے اس کی رحمت کے جوار میں جا پہنچتی ہے۔

مولانا عطاء اللہ مرحوم کے متعلق کم از کم اس راقم الحروف کو یہی احساس کھائے جا رہا ہے کہ ہم نے مولانا جیسی بابرکت ہستی سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ ہی ان کے فیوض و برکات سے اپنی علمی تشنگی کے لیے اس

یگانہ روزگار ہستی سے سیرابی کا کوئی سامان کیا لیکن

اب کیا پچھتائے ہوت۔ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

میرے لیے تو اب اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ میں اس محبوب استاد رحمہ اللہ کے متعلق اپنے چند تاثرات قلم بند کر کے اپنے تڑپتے ہوئے دل کے لیے جھوٹی تسلی کا سامان کر لوں۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ سے میری واقفیت اتنی پرانی ہے کہ مجھے اس وقت یہ بھی یاد نہیں کہ ان سے میری پہلی ملاقات کب، کہاں اور کس تقریب میں ہوئی تھی؟ اس وقت میری عمر کا (ہجری تاریخوں کے اعتبار سے) اکہتر واں سال چل رہا ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ ان سے پہلی ملاقات سے لے کر ان کی وفات تک کم از کم چالیس برس گذر چکے ہوں گے، چونکہ پہلی ملاقات سے لے کر وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے تک ان کی جو نوازشات وعنایات راقم الحروف پر تھیں، ان کی وجہ سے میں تو اپنے آپ کو ان کے گھر کا ہی ایک فرد تصور کرتا ہوں۔ ان کی نظر عنایت جو مجھ پر تھی۔ اس کا اندازہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔ جب بھی ملتے تو اتنی محبت وشفقت سے ملتے کہ گویا میں ان کا اپنا بچہ یا عزیز رشتہ دار یا کم از کم ایک گہرا دوست ہوں جس سے کافی مدت کے بعد مل رہے ہیں۔ چار پانچ مرتبہ میرے گھر گوٹھ تشریف لائے۔ ایک مرتبہ میرا بڑا بیٹا روح اللہ جیپ کے حادثہ میں وفات پا گیا تھا، تو حضرت مولانا رحمہ اللہ لاہور سے میرے پاس تعزیت کے لیے تشریف لائے۔ دو تین مرتبہ رات بھی ہمارے پاس رہے اور اپنے قیمتی فیوضات سے نوازتے رہے۔ فجر کی نماز کے لیے ان سے اصرار کیا تو مہربانی فرما کر نماز پڑھائی اور بعد نماز ہماری مسجد میں قرآن کریم کا درس بھی دیا پھر ان سے لائبریری میں مجلسیں ہوتی رہتی تھیں اور ان مجالس میں بہت سے انمول فوائد حاصل ہوتے تھے۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ ان باتوں کو اس وقت کیوں قلم بند نہ کیا۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے جب علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ شہید ہوئے تھے تو میں

بھی ان کے پس ماندگان سے تعزیت کے لیے لاہور گیا اور رات کو لاہور پہنچا، اس وقت حضرت مولانا رحمہ اللہ کے در دولت پر حاضر ہوا۔ انہوں نے اسی وقت اندر گھر میں بلا لیا کیونکہ وہ پیرانہ سالی اور فالج کی بیماری کی وجہ سے خود باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ میں حاضر خدمت ہوا۔ پھر انہوں نے جس شفقت سے مجھے اپنی آغوش میں لیا۔ اور جس عنایت و کرم کی نظر سے مجھے دیکھا وہ میرا ہی دل جانتا ہے وہ نہایت ہی خوش ہوئے۔ کمزور آواز میں باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتیں اس وقت بہت تھوڑی سمجھ میں آتی تھیں، اس لیے کہ ایک تو میرے کانوں میں ثقل سماعت اور پھر مولانا مرحوم کی نحیف آواز میں بہت کم سمجھ سکا۔ ہاں جو بات سمجھ میں نہ آتی تھی وہ ان کے بچے مجھے سمجھا دیتے تھے۔ بہر کیف ان کی اس وقت کی آخری گفتگو سے بھی مجھ پر عنایات اور بے پناہ شفقت و محبت کا واضح اور نمایاں سراغ ملتا تھا۔ میں رات انہیں کے پاس الاعتصام کے دفتر میں اوپر ایک کمرے میں رہا۔ دوسرے دن عصر کی نماز دفتر کے اوپر جو چھوٹی سی مسجد ہے اس میں ادا کی۔ مجھے اس کی امامت کے لیے کہا گیا۔ پھر حضرت مولانا مرحوم کو بھی لے آئے۔ انہوں نے یہ نماز عصر میرے پیچھے ہی ادا فرمائی۔ لاہور میں کئی بار جا چکا تھا اور اکثر بار انہیں کے ہاں ہی قیام کرتا۔ کبھی اپنے دفتر کی عمارت میں اور کبھی کسی ہوٹل کے کمرہ میں اپنے خرچہ پر مجھے ٹھہراتے۔ الحمدللہ ان کے بچوں حافظ احمد شاکر و ابناء حفظہ اللہ وغیرہ کا برتاؤ بھی مجھ سے بے حد کریمانہ رہا ہے۔ جب بھی جاتا ہوں تو قیام، طعام اور شہر میں ادھر ادھر جانے اور گھومنے کا سب خرچہ وہ اپنی جیب سے محض للہ فی اللہ اور اپنے والد محترم مرحوم کا ایک عزیز دوست سمجھ کر کرتے ہیں۔

فجزاهم الله جميعا خيرا فى الدنيا والعقبى ، اللهم اٰمين

مولانا مرحوم کی بعض عنایات کا ذکر:

۱۔ نویں سالانہ اہل حدیث کانفرنس منعقدہ لاہور مورخہ ۳۔۴۔۵ نومبر ۱۹۶۷ء جمعہ، ہفتہ، اتوار کو ہونے والی تھی۔ اس سے تقریباً ۱۵، ۲۰ دن پہلے مولانا مرحوم نے اپنا ایک آدمی [1] میرے پاس مع اپنے نامہ کے بھیجا۔ اس وقت یاد نہیں کہ وہ آنے والا ان کا فرزند حافظ محمد احمد حفظہ اللہ تھے یا کوئی اور بہر حال اس آنے والے نے آں محترم مرحوم کا پیغام بھی سنایا اور اپنے نامہ میں بھی باصرار تام مجھے ارشاد فرمایا کہ اس کانفرنس کی صدارت کا بوجھ میں ہی اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھاؤں اور یہ کہ اس کے لیے صدارتی خطبہ بھی تحریر کر کے آں محترم کو ارسال کر دوں تا کہ جلسہ سے پہلے ہی اس کو چھاپ دیا جائے۔ میں آں محترم کے ارشاد کو ردّ نہ کر سکا۔ اور دو تین دنوں میں خطبہ صدارت ان کو ارسال کر دیا اور موقعہ پر لاہور حاضر ہوا۔ بعد میں خود مولانا مرحوم نے مجھے بتایا کہ اس کانفرنس میں آپ کی صدارت کے لیے حضرت مولانا اسماعیل مرحوم (جو اس وقت جماعت اہل حدیث کے امیر تھے) پر میں نے ہی زور ڈالا تھا۔ اور علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم

---

[1] جانے والے حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی رحمہ اللہ جو اس وقت ان کے شریک تجارت رہے۔

اور دوسرے معزز حضرات لاہور اسٹیشن پر میرے استقبال کے لیے آئے تھے۔ اس کانفرنس میں میری جو عزت افزائی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔

۲۔ ایک مرتبہ مولانا مرحوم سے عرض کیا کہ مجھے سنن نسائی کا وہ نسخہ مرحمت فرمایا جائے جس پر آں محترم کی التعلیقات السلفیہ ہیں اور حال یہ تھا کہ اس وقت سنن النسائی مع التعلیقات السلفیہ آؤٹ آف پرنٹ ہو چکی تھی اور کوئی ایک کاپی بھی ان کے مکتبہ میں برائے فروخت باقی نہ رہی تھی لیکن میری گذارش کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے انہوں نے اس کتاب کی وہ کاپی جو انہوں نے اپنے لیے رکھی تھی اور اس پر ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نوٹس بھی تھے۔ وہ از راہِ عنایت مجھے مرحمت فرمادی، جو میرے پاس اب تک موجود ہے اور اس کے نوٹس وہ انمول جواہر پارے ہیں جن کی قدر علم حدیث سے شغف رکھنے والے ہی جان سکتے ہیں۔ بعد میں جب وہ دوبارہ طبع ہو کر آ گئی تو اس نئی طبع کی بھی ایک کاپی مجھے ارسال فرمادی۔

۳۔ مولانا محمد بشیر رحمہ اللہ کی دو کتابوں اتمام الحجۃ اور القول المحمود فی رد جواز السود ❶ کی بات نکلی تو میں نے عرض کیا کہ ان دونوں کتابوں کے فوٹو اسٹیٹ مجھے مرحمت فرمائے جائیں تو انہوں نے نوازش فرما کر ''القول المحمود'' کا فوٹو اسٹیٹ مجھے مرحمت فرمادیا اور اس کے سرورق پر اپنے دستِ مبارک سے یہ چند سطور تحریر فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت الفاضل المحدث المحترم حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! اتمام الحجۃ میرے پاس موجود نہیں۔ القوم المحمود کی فوٹو کاپی حاضر خدمت ہے وصولی سے مطلع فرمائیں۔ سب صاحبزادگان سے سلام عرض کریں۔ حافظ احمد سلام عرض کر رہے ہیں۔

هذا والسلام

محمد عطاء اللہ حنیف، ۱۰ فروری ۱۹۸۱ء

۴۔ ایک اور موقعے پر راقم نے مولانا مرحوم سے گذارش کی کہ حضرت مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ کی کتاب ''مسئلہ حجاز پر ایک نظر'' درکار ہے تو فوراً اس کی فوٹو اسٹیٹ لے کر ارسال فرمادی۔

۵۔ ان سے حدیث کی سند و اجازت کا خواستگار ہوا تو تھوڑا عرصہ کسرِ نفسی سے ٹالتے رہے۔ لیکن میرے اصرار پر بالآخر اپنے ہاتھ سے سند لکھ کر مجھے ارسال فرمادی۔ اس قسم کی اور بھی باتیں ہیں۔ ان سب کا احصاء یہاں مطلوب نہیں ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے حضرت الاستاذ کی خدمت میں کوئی گذارش کی ہو اور وہ پوری بھی کر سکتے ہوں لیکن پھر بھی وہ پوری نہ کی ہو۔ اس قسم کا واقعہ میری یاد کی حد تک ایک مرتبہ بھی پیش

❶ سود پر الف لام اصل کتاب میں ہے۔

نہیں آیا۔ میں بارہا ان کی علمی باتوں سے مستفید ہوتا رہا ہوں۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میں نے چند علمی سوالات خدمت میں پیش کیے اور جب تک صحت اچھی رہی ان کے جوابات اپنے ہاتھ سے ہی تحریر فرما کر بھیجتے رہے۔ میں ان کے فرزند یا تلمیذ کی طرح تھا لیکن آں محترم میری اتنی عزت افزائی فرماتے کہ میں حیران ہو جاتا۔

حضرت مولانا مرحوم کا علمی مقام:

مولانا کے علمی مقام کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سب فنون پر عبور عطا فرمایا تھا لیکن حدیث وعلوم حدیث سے جو ان کو شغف تھا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ جس نے نسائی شریف پر ان کی التعلیقات السلفیہ کو غور وتدبر سے پڑھا ہے وہ جان سکتا ہے کہ اس میں کیا کیا جواہر پارے جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ صحاح ستہ کی کتابوں میں سے نسائی شریف کی کوئی تسلی بخش شرح میری نظر سے نہیں گذری، البتہ چند علماء نے ان پر حواشی لکھے ہیں۔ مثلاً علامہ سندھی کا حاشیہ اور علامہ جلال الدین سیوطی کی زھر الربی وغیرھما جب ان حواشی کا مطالعہ کر کے ہم ''التعلیقات السلفیہ'' پر آتے ہیں تب ہمیں صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ ''التعلیقات السلفیہ'' کی کیا افادیت ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ نے ان تعلیقات میں دریا کوزے میں بند کر دیا۔ بہت سے قیمتی فوائد جو اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتے وہ یہاں مل جاتے ہیں۔ ان کی تحریر وتقریر کا انداز ایسا متین سنجیدہ اور سلجھا ہوا ہوتا کہ موافق ومخالف کو پڑھتے ہوئے ناگواری محسوس نہ ہوتی تھی۔

ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں ان کے بہت سے مضامین، مقالات اور فتاوے شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مجلّہ میں دوسروں کے جو مضامین ومقالے شائع ہوتے۔ ان پر بھی بسا اوقات ان کے نوٹس ہوتے جو نہایت عالمانہ اور فوائد ومعلومات کا لاجواب معدن ہوتے تھے۔ میں تو اپنے محترم کرم فرما حافظ احمد شاکر اور عزیز دوست محترم حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا محمد سلیمان صاحب انصاری وغیرہم کو یہ گذارش کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ جس طرح حضرت علامہ مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی رحمہ اللہ اور حضرت الاستاذ مولانا ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ کے فتاوی جمع کر کے شائع کیے جا چکے ہیں۔ اسی طرح اگر حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کے فتاوے اور ان کے مضامین علمیہ اور ارشادات عالیہ یک جا جمع کر کے شائع کیے جائیں تو یہ بہت بڑی علمی ودینی خدمت ہوگی۔ اس وقت حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تو زندہ نہیں ہیں، لیکن اس طریقہ پر ان کی علمی ودینی خدمات کو زندہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ انمول جواہر ریزے آنے والی نسلوں کے لیے بھی مشعلِ راہ بنیں گے۔ میں نے حضرت الاستاذ رحمہ اللہ سے چند تحریری استفسارات کیے تھے اور اس وقت ان کی صحت اچھی تھی، اس لیے اپنے قلم سے ان استفسارات کا جواب عالمانہ اور اطمینان بخش مرحمت فرمایا۔

میں نے ایک کتاب ''تحصیل المعلاۃ فی حکم الجهر بالبسملة فی الصلوٰۃ'' لکھی تھی جس

پر حضرت العلامہ شیخنا مولانا سلطان محمود رحمہ اللہ اور چند دوسرے علماء نے بھی تقاریظ فرمائی تھیں لیکن حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ رحمہ اللہ جیسی علمی شخصیت کی عزت ومقام جو میرے دل میں تھا وہ مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں اس قابل فخر ہستی سے بھی اپنی اس کتاب پر تقریظ حاصل کروں۔ ایک مرتبہ حضرت والا میرے پاس تشریف لائے تو ان کو کتاب تھوڑی سی دکھائی۔ پھر آں محترم تشریف لے گئے اور میں نے اس کتاب کا فوٹو اسٹیٹ لے کر ان کو بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے مفصل اور مختصر دو تقریظیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر ارسال فرمائیں۔ وہ میں نے اپنی کتاب میں شامل کر لیں جو میرے لیے بڑا قیمتی اثاثہ ہیں۔ مفصل تقریظ میں حضرت الاستاذ نے اپنی طرف سے بھی مختصر تحقیق اسی مسئلے پر تحریر فرمائی۔ فالحمد لله علی ذلك

ایک مرتبہ صحیفہ اہل حدیث کراچی میں ایک فتویٰ شائع ہوا۔ جو میرے خیال میں غلط تھا۔ اس پر تعاقب لکھ کر میں نے صحیفہ والوں کو ارسال کر دیا اور انہوں نے پھر آئندہ اشاعت میں اس پر رد لکھ اور اپنے فتویٰ کو بحال رکھا۔ اس پر حضرت مولانا عطاء اللہ رحمہ اللہ نے الاعتصام میں غالباً نوٹ کی صورت میں تعاقب فرمایا۔ اور میرے تعاقب کو صحیح قرار دیا۔ راقم الحروف سے جو ان کو محض للہ فی اللہ محبت تھی۔ اس بیان سے میرا قلم قاصر ہے۔ فجزاہ الله تعالیٰ خیرا فی الدنیا والاخرة

حضرت الاستاذ کی امانات ودیانت:

ہماری لائبریری کا ایک مخطوطہ "معرفة السنن والآثار" للامام البیہقی جو تین جلدوں میں تھا وہ گم ہو گیا تھا۔ یہ کس طرح گم ہوا اس کا بیان بچند وجوہ ہیں میں یہاں تحریر نہیں کر سکتا۔ بہر حال یہ گم ہو گیا اور اس پر ایک طویل عرصہ گذر گیا اور ہم تو اس کو تقریباً بھلا ہی بیٹھے تھے۔ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ کرنا ہوا کہ ایک صاحب نے یہ نسخہ حضرت مولانا مرحوم کو فروخت کر دیا۔ کتاب پر چونکہ ہمارے جد امجد رحمہ اللہ کی لائبریری کی مہر لگی ہوئی تھی۔ بہر کیف مولانا مرحوم نے معلوم کر لیا کہ یہ کتاب راقم الحروف کی ہے۔ پھر انہوں نے اتنی بڑی عنایت فرمائی کہ وہ پوری کتاب بلا معاوضہ ہمارے سپرد کر دی۔ حالانکہ اگر مولانا مرحوم اس کتاب کو رکھ لیتے تو ہمیں اس کا پتہ بھی نہیں چل سکتا تھا۔

ایک مرتبہ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ لائبریری میں کتابیں دیکھتے دیکھتے اصول حدیث کی کتاب "بهجة النظر شرح نخبة الفكر" کا مخطوطہ دیکھا مجھے فرمایا کہ کچھ عرصہ کے لیے مجھے عاریۃً دے دیں، ہمیں کیا انکار ہو سکتا تھا۔ ہم نے ان کو دے دیا۔ پھر غالباً دو تین برس گزر گئے۔ چونکہ ہم نے یادداشت کے لیے بھی اس کتاب کا نام لکھ کر اپنے پاس نہیں رکھا۔ اس لیے ہمیں یہ بالکل یاد نہ رہا حتیٰ کہ ہم نے لائبریری کے رجسٹر میں کتابوں کا اندراج کیا تو اس کتاب کا نام بھی نہ لکھا۔ ہمیں تو اس کی یاد تک نہ تھی۔

ایک دن ڈاک سے ایک رجسٹر پارسل ملا۔ کھولا تو یہ کتاب موجود تھی۔ اور مزید نوازش یہ فرمائی کہ کتاب کے

ابتدائی کچھ اوراق جو اس میں نہیں تھے وہ کہیں سے حاصل کر کے اپنے ہاتھ سے وہ اوراق تحریر فرما کر کتاب کے ساتھ منسلک فرما کر ارسال کر دیئے۔ ان کی اس قسم کی عنایات کی جب یاد آتی ہے تو زبان سے بے اختیار ان کے لیے دعائے خیر کے کلمات نکل آتے ہیں۔

جزاه الله عنا وعن جميع اهل الحديث خير الجزاء اللهم ، اٰمين

ایک مرتبہ "آثار السنن مع التعليق" للنيموى مجھے مرحمت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ حضرت مولانا مبارکپوری نے، جو اس کتاب پر "ابکار المنن" کے نام سے تنقید فرمائی تھی اور اس کی تکمیل سے پہلے ہی مولانا مبارکپوری وفات پا گئے۔ اس کی میں تکمیل کروں۔ افسوس کہ میں اس ارشاد کی تعمیل ابھی تک کر نہیں سکا۔ احباب سے درخواست ہے کہ وہ میرے لیے دعاء فرمائیں تا کہ میں اس ارشاد کی تعمیل کر سکوں۔ وما ذالك على الله بعزيز

بہر حال حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی ذات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہ خوبیاں وکمالات جمع فرمائے تھے جو یکجا کسی شاذ و نادر ہستی میں ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔

فغفر الله له ورحمه رحمة واسعة ووهب له مرافقة النبيين والصديقين والشهداء والصالحين فى جنة الفردوس واعلى عليين ، اللهم اٰمين

❁❁❁❁

ہمارے جماعتی بھائی پروفیسر مولا بخش محمدی صاحب جو کہ ایک معروف ادیب اور مضمون نگار ہے آپ کے تقریباً ہر مؤقر رسائل میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اللھم زد فزد پروفیسر صاحب کو سید محبّ اللہ شاہ صاحب سے بے حد لگاؤ تھا اور پیر صاحب بھی ان کو اپنا بیٹا سمجھتے تھے، پروفیسر صاحب نے فراغت بھی انہی کے مدرسہ دارالرشاد سے حاصل کی ہے۔ پروفیسر مولا بخش محمدی صاحب نے شاہ صاحب سے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی ۱۰ سوالات کیے جس کے جواب شاہ صاحب نے اپنی مادری زبان سندھی میں بڑے ہی تفصیلی انداز میں دیئے جو بڑے علمی نکات پر مشتمل ہیں اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے شاگرد رشید مولانا محمد منیر جونیجو صاحب نے اس کو اردو قالب میں ڈھالا اور یہ شاہ صاحب کی خورنوشت پہلی بار منظر عام پر آ رہی ہے۔

(الازہری)
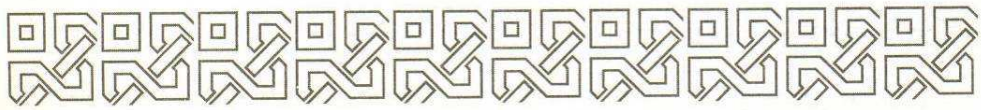
سوالات وجوابات

سوال ۱: آنجناب کی ولادت کہاں اور کس سال میں ہوئی؟ اور آپ کے والد محترم کی بابرکت علمی زندگی سے آشنا فرمایئے گا؟

جواب: میری پیدائش پیر جھنڈو کے گاؤں میں ہوئی جو اس گاؤں سے (جس میں ہم اس وقت رہ رہے ہیں) اس سے جنوب کی طرف دو فرلانگ کے فاصلے پر قومی شاہراہ پر واقع ہے۔ ہم اصل وہاں پر رہتے تھے پھر وہاں سے منتقل ہو کر یہاں آئے۔ جس کا سبب یہ تھا کہ ہمارے والد محترم اور ہمارے چچوں کے درمیان ایک تنازع تھا، جس نے کافی طول پکڑ لیا تھا یہاں تک کہ یہ فیصلہ پرائیویٹ کونسل میں گیا جہاں سے یہ فیصلہ ہمارے چچوں کے حق میں ہوا، جس کے بعد ہم اس گاؤں سے منتقل ہو کر یہاں پر آئے، وہ تنازع کیا تھا، اس کے محرکات کیا تھے؟ اس کا فیصلہ کس طرح ہوا؟ انگریز حکومت نے چچوں کے حق میں فیصلہ کس طرح کیا؟ یہ ایک لمبی داستان ہے جس کی تفصیل کی گنجائش نہیں، ❶ میں ۲۹ محرم الحرام اتوار کی رات صبح صادق سے پہلے ۱۳۱۵ء میں پیدا ہوا۔ عیسوی سال کے اعتبار سے یہ ۱۲/۱۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء ہے۔

الحمد للہ اللہ کے فضل وکرم سے ہمارے خاندان سازی کا طریقہ کتاب وسنت پر عمل رہا ہے، ہمارے مورث اعلیٰ حضرت پیر سائیں محمد راشد شاہ (جن کی نسبت راشدی خاندان منسوب ہے) سے لے کر اب تک یہی طریقہ اور نمونہ رہا ہے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ جس قدر کتاب وسنت کی معلومات بڑھتی چلی گئی اتنا قدم وہ اس کے مطابق کرتے رہے، اور حق کا راستہ معلوم کرنے کے بعد اپنے سابق مسلک کو ترک کر کے حق کا راستہ اختیار کرتے تھے اور اس کی مثال ہمارے خاندان کے ہر فرد کے متعلق ہیں لیکن طوالت کی وجہ سے یہاں پر ان کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں ہے اور یہ علمی زندگی اس وقت عروج کو پہنچی جب ہمارے جد امجد کا دور آیا، جب انہوں نے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی اور ایک لاجواب کتب خانہ کا قیام عمل میں لایا، جس میں ان کتب کو لا کر رکھا جو غیر مسلم پاک وہند میں مشکل سے ملتی ہوں، بہرحال وہ دور بڑا عروج کا دور تھا لیکن ہمارے دادا جی کی وفات کے وقت میری عمر صرف دس ماہ تھی، جس وجہ سے ان کے بارے میں مشاہدتاً مجھے کوئی معلومات نہیں ہے، البتہ جو کتاب لکھ کر چھوڑ گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنے وسیع علم سے نوازا تھا؟ اور کتاب وسنت سے کتنا شغف تھا، تقریباً ہر اس مسئلہ پر جو حدیث کے برخلاف حنفی علماء میں رائج تھا اس کی تردید میں کتاب لکھی مثلاً: سینے پر ہاتھ باندھنا، بغیر ولی کے نکاح کا ناجائز ہونا وغیرہ وغیرہ اور بدعتی لوگوں کے خلاف، علم غیب کے...... رد میں ایک ضخیم کتاب سندھی

❶ اس کی مکمل داستان مجلہ بحر العلوم میر پور خاص کے خاص نمبر "محدث العصر" میں موجود ہے۔ (الازہری)

زبان میں لکھی ہے، وحدت الوجود والوں کے رد میں کتنی ہی کتابیں لکھی ہیں۔اس کے علاوہ کتنے ہی مسائل حدیث سے ثابت کیے ہیں، کئی ایک کتب فن رجال پر بھی لکھی ہیں بہر حال ان کے علمی کارنامہ کا پتہ ان کی تصنیفات سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔تاہم آج بھی ان کے معتقد موجود ہیں، جن کو ان کی باتیں معلوم ہیں، اس کے بعد ہمارے والد محترمؒ کا دور آیا اور اس دور میں اگر چہ ہمارے چچوں کے درمیان سخت اختلافات تھے اور ہمارے والد محترمؒ پر کیس تھے، جن کی وجہ سے ان کو چین وسکون نصیب نہ ہوسکا، ان کیسز کے ختم ہونے کے بعد ہم یہاں پر آئے اور اس کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہمارے والد محترم اس دنیا سے رخصت ہوگئے، اس وقت میری عمر تقریباً ۱۵یا ۱۶سال کی ہوگی، تاہم ان کی بے سکونی، کیسز، جھگڑوں کے باوجود جو ان آنکھوں نے دیکھا اس کا اگر کوئی مسجد الحرام میں رکن اور مقام کے درمیان کھڑا کر کے قسم دے کر پوچھے گا تو یہی کہوں گا کہ ان آنکھوں نے ایسا مرد خواہ تقویٰ کے اعتبار سے خواہ کتاب وسنت کے ساتھ شغف کے اعتبار سے کوئی نہیں دیکھا، کہیں پر بھی نہیں حتیٰ کہ حرمین شریفین میں بھی نہیں، ان کی زندگی پر اگر بیٹھ کر لکھا جائے تو ایک پوری کتاب تفصیل سے لکھی جاسکتی ہے لیکن نہ تو اتنا وقت ہے اور نہ ہی یہاں پر اس کی گنجائش ہے، اس وجہ سے میں یہاں پر چند واقعات یا معلومات قلم بند کرتا ہوں، جن سے آپ، ان کی علمی زندگی کے متعلق بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

حدیث اور اس کے فنون خصوصاً فن رجال کے متعلق ان کو اتنا شوق تھا کہ اس وقت تاریخ بغداد (خطیب بغدادی کی) جو مطبوع نہیں تھی، وہ لندن سے فوٹو کروا کے منگوائی جس پر ۱۴۰۰ سو روپیہ خرچہ آیا، اس وقت ایک روپیہ کی کیا قدر وقیمت تھی وہ آپ کو معلوم ہوگی اور اتنا خرچہ کر کے وہ منگوائی اور وہ کتاب چھپی تو اس وقت اس کی قیمت صرف ۲۸ روپیہ تھی، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتب کے شوق نے ان کو کتنا خرچ کروایا۔اسی طرح دمشق سے تاریخ اصبھان، فوٹو اسٹیٹ کروا کے دو جلدوں میں منگوائی، یہ دونوں کتاب فوٹو اسٹیٹ خواہ چھپے ہوئے ہمارے کتب خانہ میں موجود ہیں، اس کے علاوہ مصر وشام میں ان کے کتنے ہی کاتب ہوئے تھے جو ان کی طرف سے معقول اجرت پر حدیث اور فن رجال کی کتب شام وغیرہ کے کتب خانہ سے نقل کر کے بھیجتے تھے، اسی طرح کن کن جگہوں پر اپنے آدمی بھیجتے تھے، مثلاً: ہمارے استاد محترم مولوی محمد اسماعیل پٹھان (مرحوم) کو حیدر آباد دکن (بھارت) بھیج کر وہاں سے کتاب نقل کروائی۔اس کے علاوہ ہمارے دوست قاضی لعل محمد (جو ابھی تک زندہ ہے) جو آپ کا محب تھا، وہ طبیب بھی ہے اور عالم بھی ہے، ان کو کن کن جگہوں پر بھیج کر کتب نقل کروائے، ہم نے دیکھا اگر ان کو کوئی شوق ہے تو صرف کتابوں کا ہے اس کے علاوہ اور کسی چیز کا نہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رجال کے فن میں اتنا ادراک اور مہارت سے نوازا تھا کہ جب حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ ہمارے والد کے پاس ملنے آئے تھے اور ان سے گفتگو وغیرہ کی تھی پھر جب واپس جانے لگے تو کہا کہ اگر آج کے دور میں کوئی فن رجال کا امام ہے تو وہ سید احسان اللہ شاہ راشدی ہے، اس طرح ہمارے والد محترم نے کتب کا کافی ذخیرہ جمع کیا تھا۔حیدر آباد

(دکن) والوں نے جب ((المستدرك للحاكم)) چھپوائی تھی اور چھپوائی کے وقت اس کے مختلف قلمی نسخے ان کو ملے تھے ایک نسخہ ہمارے کتب خانہ سے بھی ان کو ملا تھا، بعد میں انہوں نے اس مطبوع کتاب میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ہم کو جتنے بھی قلمی نسخے ملے ان میں (سید احسان اللہ شاہ راشدی) کا نسخہ سب سے زیادہ صحیح تھا، اسی طرح حیدرآباد دکن والوں نے جب سنن کبریٰ للبیہقی چھپوائی تو ایک نسخہ ہمارے کتب خانہ سے لے کر گئے تھے جس کا اظہار بھی انہوں نے اپنی مطبوع کتاب میں کیا ہے، اس وجہ سے جب تک ہمارے والد زندہ رہے اس وقت تک حیدرآباد دکن والے جب بھی کوئی کتاب چھپواتے تو ایک نسخہ ایک کاپی ہمارے والد کو ضرور ارسال کرتے، ایک مرتبہ ہمارے والد محترم کو خانپور کے ایک جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی، میں بھی وہاں آپ کے ساتھ گیا تھا، آپ نے جو وہاں پر تقریر کی وہ سب کو پسند آئی اور وہ ہمارے پاس لکھی ہوئی ہے۔ اسی طرح ان کی ایک کتاب بنام (المقالة المحبوبة فی الدعاء بعد الصلوٰة المكتوبة) اردو، عربی میں مکمل لکھی ہوئی ہے، لیکن چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اسی طرح ایک (رسـالـة فـی تـقبیل ایدی الكرام) لکھا تھا لیکن افسوس کہ وہ ہماری غفلت کی وجہ سے ہم سے ضائع ہو گیا، اسی طرح انہوں نے ''ابن ماجہ'' کی شرح بھی لکھنا شروع کی تھی، چند ابواب لکھے بھی تھے لیکن مسلسل بیماریوں، تنازعات اور بے سکونی کی وجہ سے پوری نہ کر سکے اور جو لکھا تھا وہ بہترین تھا، میں نے دیکھا بھی تھا لیکن افسوس کہ وہ اوراق بھی ہم سے ضائع ہو گئے نظر نہیں آ رہے ہیں، اس موضوع پر فی الحال اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ب: مدرسہ میں مدرسین کے لیے یہ قید یا شرط نہیں تھی کہ وہ صرف اہل حدیث ہوں بلکہ اس مدرسہ میں ان کی زندگی میں (جس طرح ہم نے مشاہدہ کیا ہے) خواہ اہل حدیث خواہ حنفی پڑھاتے تھے اور آتے رہتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کا طریقہ کار تھا کہ عصر کی نماز کے بعد ہمیشہ مسجد میں رہتے تھے مغرب تک پھر وہاں جان بوجھ کر کوئی مسئلہ چھیڑ کر علماء اور مدرسین سے بات چیت کرتے تھے اور بحث ومباحثہ میں حصہ لیتے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ کوئی حنفی اہل حدیث ہو جاتا تھا علاوہ ازیں کچھ مدرسہ کے طلباء آپ کی صحبت میں رہتے تھے، نتیجتاً ان پر اہل حدیث کا رنگ چڑھ جاتا تھا، ایک واقعہ مجھے یاد ہے، ہمارے مدرسہ میں ایک بنگالی طالب علم بنام سمیر الدین پڑھتا تھا، اس پر مرگی کا اثر تھا اس کی ہمارے والد سے محبت تھی، نتیجتاً اس نے رفع الیدین شروع کر دی، پھر چند دن بعد اس کو ترک کر دیا، ایک دن ظہر یا عصر کی نماز کے بعد غالباً عصر ہی کی نماز کے بعد، ہمارے والد نے سمیر الدین کی طرف متوجہ ہو کر کہا: سمیر الدین آپ نے نماز میں رفع الیدین کرنا کیوں ترک کر دیا ہے؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ استاد مولوی حمید الدین کہتا ہے یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب نہیں ہے، جس پر ہمارے والد نے کہا کہ قیامت کے دن آپ سے حضور اکرم ﷺ کی پیروی کے متعلق پوچھا جائے گا؟ یا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے بارے میں؟ یعنی جب آخرت میں بھی ہم سے نبی کریم ﷺ کی اتباع کے بارے میں پوچھا جائے گا تو پھر اتباع

بھی ان کی ہی کرنی ہے نہ کہ کسی اور کی، خواہ امام ابوحنیفہ یا امام شافعی رحمہ اللہ ہو یا کوئی اور ہو، اس طرح ان کو اتباع سنت پر موڑنے کی کوشش کی اس واقعہ میں میں بذات خود موجود تھا، اسی طرح ہم اولاد میں سے اگر کوئی سنت پر عمل کرنے میں کوتاہی کرتا تو فوراً اس کو تنبیہ کرتے تھے کہ کیوں تم نے فلاں سنت کو چھوڑا ہے۔ ایک مرتبہ مغرب نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''جن میں گاؤں کے لوگ مدرسہ کے استاذ، طلباء اور کئی دوسرے موجود تھے'' کہ اس نماز کے بعد والی سنت آپ ﷺ نے گھر جا کر پڑھی ہے اور تم یہ خیال نہیں کرتے، گھروں والے گھروں میں اوطاق والے اوطاقوں میں۔ اسی طرح جو جہاں کا رہنے والا ہے وہ عارضی طور پر ہی صحیح لیکن وہاں جا کر پڑھے مثلاً: مدرسہ کے استاد اور طلباء، مدرسے کے کمروں میں جا کر وہاں پر ادا کریں۔ ایسی تاکید کی جس پر مولویوں سمیت تمام لوگوں نے جا کر اپنے اپنے کمروں میں سنتیں ادا کیں، دوسری مرتبہ ان کو مغرب ہی کی نماز میں سہو پڑ گیا۔ نماز کے بعد جماعتیوں نے بتایا کہ نماز میں سہو پڑ گیا ہے آپ نے اٹھ کر نماز پوری کر کے سجدہ سہو کر کے سلام پھیر دیا اور پھر اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ حنفی علماء میں چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں کہ سہو کے سجدے کلام کے بعد دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ نماز ٹوٹ گئی، آپ نے ان پر کوئی وزن نہ دیا، حتیٰ کہ قاضی لعل محمد جو کہ آپ کا محب تھا، آپ کے ساتھ آ رہا تھا مسجد کے پاس ایک تالاب تھا وہاں تک کہتا آ رہا کہ پیر سائیں! آپ نے نماز کے بعد بات کی تو پھر وہ نماز کس طرح ہوئی لیکن آپ نے ان کو بھی سمجھایا کہ رسول اللہ ﷺ سے بھی صحیح طریقہ سے ثابت ہے کہ آپ نے سلام کے بعد رہی ہوئی نماز پوری کر کے سہو کے سجدے دیئے ہیں، نماز کو دوبارہ نہیں لوٹایا ہے۔ آپ نے دلیلاً ذوالیدین والے واقعہ کی طرف اشارہ کیا، آخر قاضی صاحب چپ ہو گئے وہ قاضی صاحب عالم ہونے کے ساتھ طبیب بھی ہے اور اس وقت نیوسعید آباد میں ان کا مطب خانہ بھی موجود ہے اور وہ عمر رسیدہ ہے اکثر وہ حضر و سفر میں ہمارے والد صاحب کے ساتھ رہتے تھے اور ان کی لائبریری کا انتظام و حفاظت بھی ان کے ذمہ ہوا کرتی تھی، ایک مرتبہ ہم والد کے ساتھ سفر میں تھے تو وہاں عربی ادب کی کتاب ''علم الادب اور صرف کی کتاب ''مراح الارواح'' کے چند اسباق مجھے پڑھائے تھے۔ آپ بہت ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے۔ مولوی محمد اسماعیل مرحوم اور قاضی صاحب کی آپس میں گہری دوستی تھی۔ سجدہ سہو کے بارے جو قاضی صاحب نے کہا وہ اس زمانہ کی بات ہے لیکن بعد میں قاضی صاحب پکے اہل حدیث اور متبع سنت ہو گئے تھے اور ہمارے والد کی باتوں کو یاد کر کے رو دیتے تھے۔ اور فرمایا کہ ایک مرتبہ میں ہمارے والدؒ کے ساتھ گھوڑے پر پیچھے بیٹھا ہوا تھا، آپ شاید گاؤں آ رہے تھے، کہنے لگے قاضی صاحب لوگ ہمارے نام پر پتا نہیں کیا کیا کہتے ہیں، ہمیں کیا سمجھتے ہیں کہ پیر اپنے بڑوں سے پھر گئے ہیں، حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں اس منزل اور اس حالت پر رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عشق اور محبت نے پہنچایا ہے (یہی یا اس کے ہم معنیٰ الفاظ) قاضی صاحب سے ہمارے بھی اچھے تعلقات ہیں تھوڑے وقت کے لیے وہ بھائی کو دیکھ کر رکوع کے بعد ہاتھ باندھتے تھے، لیکن بعد میں میری کتاب (التحقیق الجلیل) کے مطالعے کے بعد یا

اس سے تھوڑا پہلے اس عمل کو چھوڑ دیا اور میری کتاب پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، البتہ اتنا ضرور کہا کہ اس سے عوام کو زیادہ فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ اس میں علمی اصطلاحات زیادہ ہیں، جو کہ ان کی سمجھ سے بالا ہیں۔ اس لیے محض مسئلہ کو سمجھانے کی خاطر کوئی مختصر سی عام فہم کتاب لکھی جاتی تو بہت اچھا ہوتا۔ الحمد للہ یہی کمی محترم و مخلص دوست مولانا اللہ بخش صاحب نے پوری کر دی اور ایک چھوٹا سا رسالہ میری کتاب سے خلاصہ کے طور پر تصنیف کر دیا ہے۔ (فجزاه الله احسن الجزاء)

اسی طرح ایک واقعہ اس طرح ہے کہ ایک دفعہ ہمارے والد محترمؒ نے مجھے کہا کہ آج نماز آپ پڑھائیں، میں نے ارشاد کی تکمیل کی اور نماز پڑھائی اور آپ نے اور دوسروں نے میری اقتدا میں نماز ادا کی۔ اس پر بروھیوں اور لاسیوں (لس بیلہ والے) نے جا کر الگ نماز ادا کی اس وجہ سے کہ ایک نابالغ کو امام بنا دیا گیا ہے جبکہ نابالغ پر نماز فرض نہیں ہے لہٰذا یہ امام نابالغ ہوا...... فرض پڑھنے والے کی نماز نفل پڑھنے والے کے پیچھے نہیں ہوگی اس لیے انہوں نے جا کر الگ نماز ادا کی۔ میرے والد کو جب پتہ چلا تو ان کو بلا کر پوچھا کہ کیوں تم نے جماعت کے ساتھ نماز نہیں ادا کی؟ انہوں نے مذکورہ عذر پیش کیا۔ جس پر انہوں نے ان کو نبی ﷺ کے زمانے کا ایک واقعہ یاد دلایا کہ چھوٹا سا صحابی بڑوں کی امامت کرواتا تھا۔ اگر بچے کی امامت درست نہ ہوتی تو نبی کریم ﷺ اس طرح نہ کرتے، بلکہ اس چیز سے منع کرتے۔ یعنی یہ سنت تقریری ہے، علاوہ ازیں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے پیچھے عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد جا کر دوسری مسجد میں وہی عشاء کی نماز دوسروں کو پڑھاتے تھے اور روایات میں تصریح ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی فرض نماز وہی ہوتی تھی جو نبی ﷺ کے ساتھ ادا کرتے تھے جبکہ جو نماز خود پڑھاتے تھے وہ نفل نماز ہوا کرتی تھی۔ جس سے معلوم ہوا کہ متفرض کی متنفل کے پیچھے نماز ادا کرنا درست ہے لیکن ان صحیح دلائل کے باوجود وہ قائل نہ ہوئے۔ بحث و مباحثہ اور بے سود قیل و قال کو طول دیتے گئے، بالآخر کچھ تو غصہ میں مدرسہ چھوڑ کر چلے گئے، جس کی آپ نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ حق گوئی کی یہ حالت تھی کہ ایک مرتبہ سید غلام مرتضیٰ شاہ (جی۔ ایم۔ سید) وہ ہمارے والد کو حیدرآباد سندھ کے اسٹیشن پر ملا اس حالت میں سوٹ بوٹ داڑھی مونچھے چٹ۔ لیکن اس وقت ان کی یہ حالت نہ تھی جو آج ہے بلکہ دینداروں سے محبت کرنا، روزہ نماز کی طرف توجہ دینا، اللہ تعالیٰ پر تھوڑا بہت ایمان رکھنا۔ جیسی باتیں موجود تھیں۔ والد صاحب نے ان کو یہ سمجھ کر کہ کوئی دیوان (ہندو) ہوگا صرف ہاتھ دے دیا۔ کسی نے آپ کو بتایا کہ یہ شاہ صاحب غلام مرتضیٰ شاہ ہیں۔ جس پر آپ نے فرمایا۔ ہمیں کیا معلوم کہ یہ شاہ صاحب ہیں ہم نے تو سمجھا کہ کوئی دیوان یا عامل (ہندوں) ہے سیدوں والی تو کوئی نشانی اس پر نہیں ہے کس طرح پہچانیں۔ انگریز والا لباس، داڑھی موچھیں چٹ، کس طرح پتہ لگائیں، جس پر شاہ صاحب نے جواب دیا۔ سائیں کیا کریں افسروں سے کام پڑتے ہیں۔ پھر ان کا نمونہ اختیار کیے بغیر کام نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی عزت ہوتی ہے۔ جس پر میرے والد نے کہا کہ شاہ صاحب اب آپ سوٹ بوٹ میں ملبوس اور میں

اپنے اسلامی اور سندھی لباس میں ملبوس۔ میری شلوار ٹخنوں سے اوپر ہے جبکہ آپ کی داڑھی موچھیں چٹ انگریزوں کے نمونہ پر، میری داڑھی سنت پر اور موچھیں بھی سنت مطابق ہیں۔ اب ہم دونوں کسی کلیکٹر یا کسی اور افسر کے پاس چلتے ہیں پھر دیکھتے ہیں کہ وہ افسر پہلے آپ کو بلاتا ہے یا مجھے میری زیادہ عزت کرتا ہے یا آپ کی۔ اس پر شاہ صاحب کافی شرمندہ ہوئے اور کہا کہ سرآپ کی لوگ واقعی زیادہ عزت کرتے ہیں اور زیادہ عزت ہوگی اور اللہ تعالیٰ بھی آپ کی زیادہ عزت کرتا ہے یہ واقعہ بھی آپ کے کسی صحبتی اور جماعتی نے بتایا ہے، اسی طرح فقیر بخش یا فقیر محمد کاچھی یار والے نے والد صاحب کی دعوت کی۔ آپ جب وہاں گئے تو دیکھا کہ دیواروں پر تصاویر لٹکائی ہوئی ہیں، جس پر والد صاحب نے کہا کہ نہ ہم اس میں داخل ہوں گے اور نہ دعوت کھائیں گے جب تک ان تصاویر کو یہاں سے نہیں ہٹا دیا جاتا ہے۔ دعوت دینے والا کوئی جماعتی یا صحبتی نہیں تھا بلکہ محض پیر سائیں کی دینداری اور اہمیت کے سبب دعوت پیش کی لیکن اس کے باوجود انہوں نے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے تمام تصاویر کو اتار دیا۔ جس کے بعد آپ اندر داخل ہوئے پھر وہاں کئی دینی اور علمی باتیں ہوئیں مثلاً کوئی آدمی آیا۔ شاید وہ بھی سید تھا۔ وہ کہنے لگا۔ پیر صاحب اگر انسان کا دل صاف ہو تو داڑھی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا دل بالکل صاف ہے پھر اگر داڑھی منڈواتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے، آپ نے جواب دیا میاں صاحب آپ کا دل ہی خراب اور غیر صاف ہے کیونکہ اگر دل صاف ہو تو تمہارے چہرے پر آپ ﷺ کی متابعت اور حکم کا ظہور ہوتا۔ کیونکہ جس کا دل صاف ہوگا وہ ضرور ان کی سنت۔ قول و فعل میں اتباع کرے گا۔ لیکن آپ نے حکم کی تکمیل نہیں کی۔ آپ ﷺ کی پیروی اور اتباع سے بالکل کورے ہیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کا دل خراب ہے صاف نہیں ہے۔ اس پر وہ شخص لاجواب ہو گیا اور کہنے لگا سائیں! آپ نے بالکل سچ کہا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے میں نے کئی لوگوں کو لاجواب کر کے خاموش کر دیا تھا۔ یہ واقعہ بھی آپ کے ایک جماعتی غالباً حاجی عبداللہ میمن نے بتایا تھا۔ (واللہ اعلم) بہر حال سنت کی اتباع ان کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جو بھی بات ان کو معلوم ہوئی کہ یہ سنت ہے نبی کریم ﷺ نے یہ کام کبھی کیا ہے تو ہمارے والد صاحب کی کوشش ہوتی تھی کہ ضرور کسی بھی طرح اس سنت پر عمل کیا جائے، چاہیے ایک مرتبہ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح دنیا کے ہر بڑے عالم کے ساتھ آپ کی واقفیت ہوا کرتی تھی۔ مکہ اور مدینہ منورہ کے علماء حتیٰ کہ خود سلطان بن سعود رحمہ اللہ کے ساتھ بھی خط و کتابت تھی، ایک مرتبہ ہمارے یہاں مدینہ شریف کے ایک عالم اور کتب خانہ کے محافظ شیخ ابراہیم محمدی آیا تھا تین چار دن ٹھہرا تھا۔ والد کے ساتھ کافی صحبت اور مجلس اختیار کی پھر جب والد کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ حج پر گیا تو وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ بہت عمدہ اخلاق کے ساتھ پیش آیا، اپنا کتب خانہ بھی دکھایا جو پورے کا پورا قلمی نسخوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اس مرتبہ جب گئے تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن ان کی زندگی میں دیکھا تھا کہ یہاں پر علماء اور فقہاء کی کافی آمد رفت رہتی تھی۔ ہر ایک ان کے اخلاق، علم، دوستی اور للّٰہیت کا مداح ہوتا تھا۔ ان کی یہ خواہش خواہش تھی کہ کیسز اور

مقدمات سے آزاد ہوکر خاص طرح سے اور محض دینی تبلیغ کے لیے دورہ کیا جائے گا۔ مگر افسوس! کہ مقدمات ختم ہونے کے بعد ڈیڑھ سال کا عرصہ ہی میسر ہوا۔ اس میں بھی آدھا سال بیماری اور بے خوش حالی میں گذرا باقی ایک سال مدرسہ بنانے اور مسجد بنانے کے مدنظر رہا اس قلیل عرصہ میں بھی موجودہ مسجد کا پہلا طبقہ خود بنوایا۔ مدرسہ کا سنگ بنیاد بھی رکھا اور حالت یہ تھی کہ اپنے کے لیے پوری جگہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ ماضی قریب میں ہی یہاں شفٹ ہوئے تھے مگر وہ مسجد جو عارضی طور پر کھجور کی شاخوں کی بنائی گئی تھی اس میں وہی مدرس اور طلباء اپنا تعلیمی مشغلہ جاری کیے ہوئے تھے۔ گویا وہ منتقلی اور اضطراب و پریشانی بھی اس مشغلہ کی مانع نہ بنی اور جو بھی باہر سے آتا تھا۔ وہ عجب میں پڑ جاتا تھا۔ کہ یہ حال ہے؟ کہ اس عالم میں بھی تعلیمی مشغلہ جاری ہے۔ وہی رنگ ڈھنگ، وہی دینی مجلسیں اور کتاب وسنت کی درس وتدریس جاری ہے فرحمہ الله رحمة واسعة کبھی کبھی خود مدرسہ آ کر ہم سے اور دوسرے شاگردوں سے جو کتابیں قرآن یا حدیث کے متعلق پڑھیں ہوتی تھیں۔ اس میں سے پوچھتے اور سوال کرتے تھے اور بعض اوقات جمعرات کے دن شام کے ٹائم مدرسہ میں آ کر طلباء سے تقریریں سنتے تھے۔ جو اس دن مختلف موضوعات پر کرتے تھے۔ اور جس کی تقریر پسند آتی تھی اس کو انعام بھی دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ استاد کی شکایت لے کر ہمارے پاس کوئی نہ آئے۔ اگر کوئی بچہ بچگانہ ذہن کی وجہ سے پڑھنے سے ہچکچاتا تو وہ ان کے سخت عتاب پر آتا تھا اور بعض اوقات سزا بھی کھا جاتا تھا۔ پس یہ مت پوچھو کہ وہ زمانہ کیا تھا اور علم کا شوق کتنا تھا۔ افسوس! کہ آج اس کا عشر عشیر شوق بھی نظر نہیں آتا۔ (فانا لله وانا اليه راجعون)

حق کا کلمہ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی کہہ دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب ابھی کیس چل رہے تھے۔ کچھ آفیسران کے پاس آئے جن میں کچھ شاید سید بھی تھے۔ میں بھی موجود تھا۔ ان میں سے ایک آفیسر نے کہا کہ سائیں سارے سید (یا اس کے موافق لفظ ادا کیا) آ کر آپ کے ساتھ اکٹھے ہوئے ہیں۔ آپ نے کہا: سید بھی تو کچھ بال رکھتے۔ یعنی ان کی داڑھیاں منڈھی ہوئی تھیں۔ آپ کا مقصد تھا کہ سید تو ہو لیکن داڑھیاں نہیں رکھتے ہو یہ سید ہونا کس کام کا۔ وہ شرمندہ ہو کر چپ ہو گئے۔ اب یہاں انہی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

ج: سنت کا اتنا شوق ہوتا تھا۔ ان سے زیادہ محبوب دنیا میں کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ کتنے واقعات میں سے میں صرف ایک واقعہ لکھتا ہوں۔ جس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں اتباع سنت کا جزبہ اللہ نے ان کے اندر کتنا رکھا تھا۔ ہمارے والدؒ تیسری بنیادی کے خیال سے ہمارے چچا کے گھر گئے اور رشتہ مانگا تو وہ کہنے لگے کہ آپ نماز میں رفع الیدین کرتے ہیں یہ رواج ہمارے خاندان میں نہ تھا آپ نے نکالا ہے لہٰذا اس کو ترک کرو گے تو رشتہ دوں گا ورنہ نہیں۔ آپ غور کریں اگر ہمارے والد وقتی طور پر کام نکالنے کی غرض سے اس طرح کرتے تو کر سکتے تھے۔ جس کا کچھ ساتھیوں نے مشورہ بھی دیا تھا لیکن ہمارے والد صاحب یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ (رَن) عورت کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ کی سنت ترک نہیں کروں گا۔ خدا کی قدرت کے ہمارے والد نے سنت کے مقابلے میں

رشتہ کو چھوڑ دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے پیر سائیں مرحوم کی دل میں خیال ڈالا جس نے خود رشتہ دے دیا۔ آخر کار آپ نے چچا کے گھر سے شادی کی۔ بہرحال اس واقعہ سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سنت کا کتنا خیال رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کی جماعت کے لوگوں نے پیر سائیں (سنت وارو) ''سنت والے'' کا لقب دیا تھا۔ فی الحال ان کی علمی زندگی کے متعلق یہیں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

سوال ۲: ابتدائی زمانہ تعلیم اور اختتام تعلیم اور بعد میں سیاسی اور مذہبی خدمت کے بارے میں آگاہ فرمائیں گے؟

جواب: میں حضرت والد رحمہ اللہ کی زندگی میں ہی عربی علم کا کافی حصہ حاصل کر چکا تھا لیکن تکمیل ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے ان کی وفات کے بعد بھی اللہ کے فضل وکرم سے تعلیم کو جاری رکھا۔ بالآخر تکمیل کی اور طالب علمی کے دور کا اختتام ہوا۔ طالب علمی کے زمانے میں سیاسی معاملات میں حصہ لینا خارج از بحث وسوال تھا۔ لہٰذا اس زمانہ میں دنیا کی سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ البتہ والد صاحب رحمہ اللہ کی سنت رسول سے محبت گھریلو ماحول کا بھی اسی طرف جھکاؤ۔ سارے خاندان کی کتاب وسنت کی طرف رغبت، ان تمام باتوں نے فطرتاً وطبعاً حدیث کی طرف راغب کر دیا تھا۔ اس لیے اس زمانہ (زمانہ طالب علمی) میں چھوٹے چھوٹے رسائل (عربی میں) لکھنا شروع کیے مثلاً فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ، آمین بالجہر کا مسئلہ، وضع الایدی علی الصدر جیسے مسائل پر کتاب لکھی۔ جس کے ابتدا خطبہ والی عبارت والد رحمہ اللہ نے لکھ کر دی اور اس طرف رہنمائی کی۔ لیکن افسوس وہ کتاب بھی ضائع ہوگئی۔ اس طرح جو ساتھ پڑھتے تھے اور جو حنفی خیال ہوتے تھے ان سے مسلسل بحث مباحثہ کر کے حدیث کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کچھ تو اپنا خیال چھوڑ کر حدیث کی طرف آ گئے۔ لیکن اس کے بعد ان میں سے کوئی مجھ سے نہیں ملا۔ (واللہ اعلم) ان پر کیا گذرتا ہے۔ میرے اکثر استاد حنفی مسلک کے تھے۔ لیکن میری طبیعت اس طرف کبھی مائل نہیں ہوئی۔ بلکہ کتاب وسنت کی طرف مائل رہی (ذالك فضل الله يوتيه من يشاء) بحرکیف وہ زمانہ تو خواب کی مانند گذر گیا۔ دینی تعلیم کا اختتام اس وقت ہوا۔ جب والد رحمہ اللہ فوت ہو چکے تھے۔ لیکن وہ بچگانہ زمانہ تھا اتنا جذبہ نہیں تھا کہ ایسا کوئی کام کیا جائے۔ طلب علم کا شوق بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے لاشعوری طور پر میرے دل میں ڈال دیا تھا۔ جس کی وجہ سے میں بڑے شوق سے علم حاصل کرتا چلا گیا یہاں تک نحو کا شوق آ کر جاگا کہ جس کی وجہ سے وہ کتابیں بھی پڑھ لیں جو عام طور پر مدارس میں بھی نہیں پڑھائی جاتیں۔ لیکن شوق نے مجھے وہ بھی پڑھا دیں۔ اس کے بعد عربی ادب کا شوق جاگا۔ تو اس میں بھی بہت ساری کتابیں اساتذہ کے پاس پڑھ لیں حالانکہ کوئی واضح نصب العین میرے سامنے نہیں تھا لیکن وہ شوق کہاں سے آیا؟ اس کا جواب دینے سے میں خود بھی قاصر ہوں۔ حصول تعلیم کے بعد میں نے سیاست میں اس طرح حصہ نہیں لیا جس طرح عام طرح لیا جاتا ہے یعنی نہ کسی سیاسی جماعت (پارٹی) سے وابستہ رہا، نہ ہی اقتدار حاصل کرنے یا پاور حاصل کرنے

کی جدوجہد کی۔ البتہ وقتی طور پر مذہبی نقطہ نگاہ سے کن ملکی جماعتوں کے ساتھ مل کر مشترکہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ مثلاً ختم نبوت کے سلسلے میں تقریباً ۱۹، ۲۰ سال پہلے ایک جماعت کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کچھ جلسوں وغیرہ میں شریک ہوا۔ یا پھر جب شوشلزم کے برخلاف کام کرنے اور جدوجہد کرنے کا سوال پیدا ہوا تو اتحادالعلماء والوں کے ساتھ مل کر کام کیا اور سندھ کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں جلسے کیے اور تقریریں کیں۔ سیاست میں میری شرکت ایک دوسری طرح سے بھی ہوئی۔ یعنی دوستوں کے کہنے پر بی۔ ڈی میں حصہ لیا اور منتخب ہوگیا اور بالآخر چیئرمین بھی بن گیا گذشتہ انتخابات میں کچھ ساتھیوں نے مجھے قومی اسمبلی میں لانا چاہا اور کئی اہل حدیث بھی اس پر مجھے ابھار رہے تھے میاں فضل الحق صاحب بھی خاص طرح اس سلسلے میں میرے پاس آئے لیکن اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی اور میں اس گورکھ دندھے سے بچ گیا اور داخل نہ ہوا جان چھوٹ گئی۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر کے دکھایا کہ واقعی یہ قدم بہتر تھا ورنہ اگر میں بالفعل اس میں داخل ہو جاتا تو بڑی تکلیف کے نیچے آ جاتا، ویسے تو کچھ مخلص ساتھیوں کے لیے انگریز کے دور حکومت سے لے کر ان کے انتخابات کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر اپنی جماعت اور دوسرے لوگوں کے پاس دونوں کے لیے جاتے رہے ہیں لیکن اکثر طور پر ان کے لیے جن کو واقعی ملک وملت کے لیے مفید اور کارآمد تصور کیا جاتا تھا۔ مثلاً حاجی علی محمد مستری مرحوم۔ حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے ہی ان باتوں سے دور رکھا۔ اور دل ان کی طرف مائل نہیں ہوا کیونکہ ان معاملات میں دینی اور ملی خدمات کے بجائے محض اقتدار نفس کے حصول کی خواہش اور اپنے آپ کو بڑا لکھنے کی خواہش رہتی ہے۔ کوئی بھی اس لیے نہیں منتخب ہوتا کہ وہ دین کی خدمت کرے بلکہ محض اس لیے منتخب ہوتا ہے کہ میں "مخدوم" بنوں ملک میں میرا سکہ جمے۔ اور میری دھاک بیٹھے۔ اور اس کے نتیجے میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس کا سب کو معلوم ہے۔ پاکستان اور بھارت کی دونوں جنگوں میں ہم نے اپنی حقیقت مطابق بھرپور حصہ لیا۔ تقریریں کرنا۔ مالی امداد کرنا حتیٰ کہ ہمارے گھر والوں نے زیورات بھی دے دیئے محض للّٰہیت کی وجہ سے باقی جماعت کے لوگوں کو بھی رغبت دلائی ان سے بھی مالی تعاون کروایا۔ یہ سب اس وجہ سے کہ ہم نے اس کو جہاد فی سبیل اللہ سمجھا اور جانی طرح بھی تیار ہو گئے۔ ڈپٹی مختیار کار وغیرہ کو بھی کہا کہ ہم کو موقعہ دیا جائے ہم بھی محاذ پر جانے کے لیے تیار ہیں میرے ساتھ دوسرے جماعت والے بھی تیار تھے لیکن عملی طرح اس کا موقعہ نہ مل سکا۔ اس طرح دوسری جنگ میں بھی کافی حصہ لیا۔ وہ ہم سے گاڑی لینے آئے اگرچہ مجھے اس کی سخت ضرورت تھی لیکن اپنی ضرورت کو مؤخر کر کے للہ فی اللہ ان کے حوالے کر دی لیکن بعد میں وہ خود واپس کر گئے۔ یہ محض تحدیثاً فی الفهم لکھ رہا ہوں۔ اس میں تکبر یا فخر کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس جنگ میں ہمارا پہلے والا جوش وخروش اور ہیجان نہیں تھا بلکہ اس کی نسبت کم ہی جذبہ تھا۔ جس کی وجہ سے ملکی حکومت میں عوام اور خواص کی بدکرداری، عیاشی وغیرہ کا ہونا تھا۔ جس کی وجہ سے دل ان سے تنگ آ چکا تھا۔ اور یہ یقین تھا کہ للّٰہیت اب نہیں رہی۔ لہٰذا ان کے لیے جدوجہد کر کے کیا کریں، پہلی

جنگ کا نتیجہ دیکھا اللہ تعالیٰ نے بڑی شاندار فتح نصیب فرمائی، جس کے لیے ضروری تھا کہ ہم اللہ کا شکر بجالائیں، دین اسلام کے قوانین کو قولاً وفعلاً، اعتقاداً، وعملاً نافذ کریں لیکن اس کے بجائے ہم نے مزید اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں شروع کردیں۔ حکام اور رعایا نہایت غلیظ کاموں میں لگ گئے فحاشی اور بے حیائی بڑھ گئی۔ لہٰذا یہ حقیقت تھی کہ پہلی جنگ کی نسبت اس جنگ میں ہم ٹھنڈے تھے اور ہم نے کہا کہ آخر کس کے لیے کام کریں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اپنی حیثیت مطابق اس میں حصہ لیا جو کر سکتے تھے وہ کیا اور دلی تمنا بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو فتح نصیب کرے، لیکن خالی تمنائیں کارگر ثابت نہیں ہوئیں۔ شاید! اللہ تعالیٰ ہم پر رحم کرے۔

انگریزوں کو ملک سے نکالنے میں ہم نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا کیونکہ ہم کافی چھوٹے تھے ہمیں اس بارے میں ابھی کوئی پتہ ہی نہیں تھا اور یہ تحریک کافی پہلے شروع ہو چکی تھی۔ ہمیں جب پتہ چلا تو اس وقت یہ تحریک کافی زور شور سے شروع تھی اور قرارداد پاکستان منظور ہو چکی تھی بلکہ اس کے لیے کافی ٹائم پہلے مسلمان قدم اٹھا چکے تھے۔ مسلم لیگ بظاہر ایک طاقتور جماعت نظر آرہی تھی۔ البتہ ہمارے دادا رحمہ اللہ خلافت تحریک میں زبردست حصہ لیا تھا۔ انگریز دشمنی اور ان کی مخالفت میں کافی آگے بڑھ چکے تھے۔ آج بھی ان کا صحبتی موجود ہیں۔ جو اس وقت کی باتیں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دادا (پیر سائیں خلافت وارو) خلافت والے کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ اعتقاداً وعملاً اگرچہ میں اہل حدیث سے ہی وابستہ ہوں لیکن اگر کوئی مشترکہ ملی مفاد ہوتا ہے یا کوئی ایسا مسئلہ یا معاملہ ہوتا ہے۔ جس میں دوسری پارٹیوں یا جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مفاد ہے۔ تو ان کے ساتھ کام کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا ہمارے والد رحمہ اللہ کی وفات کے بعد کئی وجوہات اور اسباب کی بنا پر (جن کا تذکرہ یہاں مناسب نہیں) مدرسہ کو کافی نقصان پہنچا۔ اور یہ دینی مدرسہ کافی اتار چڑھاء سے گذرا۔ تاہم اللہ کے فضل وتوفیق سے اس کو بند ہونے نہیں دیا۔ اللہ کی مہربانی سے آج تک اس کو قائم رکھا ہوا ہے۔ کچھ وقت تک ہم نے مدرسہ کو صرف اہل حدیث تک مقید نہیں بنایا لیکن بعد میں اسی کو ہی مناسب سمجھا کہ مدرس صرف اہل حدیث ہونا چاہیے۔ اس وقت سے لے کر تا حال علماء اہل حدیث کو رکھ رہے ہیں۔ (فالحمد لله على ذالك) صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کا درس دیتا ہوں، عصر کی نماز کے بعد حدیث کی کتاب سے حدیثیں پڑھ کر سناتا ہوں۔ رسالہ (القواطع الرحمانیه) بھی لکھا ہے جو کہ غالباً مختلف مضامین اخباروں میں بھیجے۔ اس وقت ایک کتاب لکھنے میں مشغول ہوں جو عربی میں ہے۔ جو کہ فن الرجال پر ہے یعنی (قرون السبعة) سات صدی پہلے کے ثقہ اور معتمد علیہم رجال کو اس میں جمع کرنے کا خیال ہے اور یہ کام تمام بڑا ہے۔ اس کے لیے کتنی جان فشانی کی ضرورت ہے اور کتنی کتابیں اس سلسلے میں دیکھنا ضروری ہیں۔ اس سے وہی بخوبی واقف ہوگا جو اس بارے میں واقفیت رکھتا ہے بہر حال اللہ تعالیٰ مکمل کرے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ تصنیف اور تالیف کا کام کیا جائے۔ کافی دوست سوالات لکھتے ہیں۔ ان کے جوابات میں کافی ٹائم صرف ہو جاتا ہے۔ سید مسعود احمد صاحب امیر

جماعت المسلمین اپنے خطوط میں کتنے ہی سوالات لکھتا ہے جن کے جوابات دینے میں کافی وقت صرف ہوتا ہے اور نہ ہی ایسا ٹائم ملتا کہ جس میں ایسا کام کیا جائے، حدیث کے ساتھ شغف تو مجھے دیرینہ میں ملا ہوا ہے اور اس کے کتنے ہی فنون میں خصوصاً فن رجال میں زیادہ ہی شغف اور زیادہ ہی نسبت اور تعلق ہے۔ یہی سبب ہے کہ حرمین شریفین سے جو میں نے کتابیں لائیں تھیں ان میں اکثر کا تعلق فن الرجال سے تھا۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق مجھے بہت زیادہ ہے۔ جس کے لیے بہت زیادہ خرچ بھی کر چکا ہوں۔ اور کر رہا ہوں چونکہ وسائل آمدنی محدود ہیں اس لیے جتنا شوق ہے اتنا پورا نہیں ہو رہا اور دوسری وجہ ملک کے متمول اور باثر وۃ طبقے کو اس بارے میں کوئی فکر نہیں ہے کہ وہ فراخ دلی سے اس بارے میں مدد کریں تا کہ دین کا ذخیرہ اور کتاب وسنت کا مجموعہ ایک جگہ اکٹھا ہو سکے۔ ہماری جماعت بیچاری وقت گیر مدد کرتی ہے لیکن اس پر اور بھی کتنے ہی بوجھ ہیں مدرسہ کا سارا بوجھ اس پر ہے اس لیے اس پر زیادہ بوجھ ڈالنا زیادہ مناسب نہیں سمجھتا۔ حرمین شریفین میں بہت ہی کتابیں نظر آئیں۔ اور تھی بھی قابل قدر اور ان کی ضرورت بھی تھی اور ہے بھی بلکہ کچھ تو ایسی کتب بھی تھیں جن کی سالوں سے مجھے تلاش تھی، وہ بھی دستیاب تھی پاکستان کے مقابلے میں ان کی قیمت بھی بہت کم تھی لیکن افسوس کہ اتنی قیمت نہ ہونے کی بنا پر نہ لے سکا۔ وہاں دو تین آدمیوں سے میں نے کہا کہ مجھے اتنی کتابیں، اتنے ریال ادھار دے دو میں جلد ان شاء اللہ ادا کر دوں گا لیکن ایسے بھی نہ ہو سکا اور یہ حسرت باقی رہ گئی۔ فالی اللہ المشتکی۔ اہل حدیثوں کے تقریباً سارے رسالے اور اخبار میرے پاس آتے ہیں۔ اس وقت میرے صرف دو خیال ہیں۔ نمبر ایک مدرسہ کو عروج تک پہنچانا تا کہ کتاب وسنت کی اشاعت کا کام بدرجہ اتم سرانجام ہو اور دوسرا خیال کہ کتب خانہ کے لیے کتابیں اکٹھی کی جائیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ میرے ان دونوں مقصدوں کو پورا کرے۔ اللھم آمین! باقی چھوٹی بڑی خدمتیں جو سرانجام دے رہے ہیں وہ آپ سے مخفی نہیں ہیں۔ اس لیے یہاں ان کے لکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

سوال ۳: آپ اپنی عملی زندگی میں کن کن کتب اور مصنفین سے متاثر ہوئے ہیں؟

جواب: مختلف فنون میں مختلف کتب اور مصنفین سے متاثر ہوا ہوں۔ قرآن مجید کی تفسیر متعلق میں سید قطب شہید کی تفسیر "ظلال القرآن" سے کافی متاثر ہوا ہوں اور بھی کتنی ہی تفاسیر ہیں جن سے استفادہ کرتا ہوں لیکن اس سے خاص طرح متاثر ہوں۔ تھوڑا بہت مولانا مودودیؒ کی تفسیر سے بھی استفادہ کیا ہے۔ حدیث کے علم کے لیے صحیح بخاری اور اس کے مصنف کے برابر کا کوئی نظر نہیں آیا۔ اس سے کافی متاثر ہوں باقی حدیث کی شروحات میں اور حدیث کے باقی تمام فنون میں مثلاً اصول حدیث، فن رجال وغیرہما کے لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتب نہایت مفید نظر آئیں۔ ان کی کتاب فتح الباری بہت عالیشان کتاب ہے اور اس کو اگر حدیث کا دائرہ المعارف کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ ہمارے پاس حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اور بھی کافی ساری کتابیں قلمی اور مطبوع ہیں وہ سب ان کی تبحر علمی پر دلالت کرتی ہیں۔ اس سے کافی متاثر ہوا ہوں اسی طرح معارف ونکات کے بیان

کے لیے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتب نہایت مفید ہیں۔ان دونوں بزرگوں کی کافی کتابیں ہیں جن میں بہت بڑا علم سمایا ہوا ہے۔امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''منہاج السنۃ'' شیعہ اور قدریہ کے رد کے لیے بہترین کتاب ہے۔ ہمارے والد محترم بھی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے کافی متاثر تھے اس لیے تقلید کی طرف مائل اکثر لوگ اس نمونہ پر اعتراض کرتے تھے۔اس دور کے علمائے کرام میں مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ کی تصنیفات سے متاثر ہوں مولانا مرحوم کو عیسائیوں، آریہ اور بدعتی وغیرہم کے ساتھ کامیاب مناظرے کرنے کی اللہ نے صلاحیت عطا کی تھی جو اور کسی میں نظر نہیں آئی۔اس لیے ان کی تمام تصانیف از حد مفید ہیں اور ساتھ ساتھ دلچسپ اور دلکش بھی، پڑھنے والا جب تک مرحوم کی پوری کتاب نہیں پڑھے گا تب تک اس کو چین نہیں آئے گا اسی طرح مولانا آزاد کے قلم کو بھی داد دیتا ہوں۔واقعی مولانا آزاد ابوالکلام تھا۔ان کی تفسیر ترجمان القرآن کی کتنی ہی باتیں نہایت مفید اور اعلیٰ درجے کی ہیں۔ان سے بڑے بڑے نکات اور معارف حاصل ہو سکتے ہیں اگرچہ کن باتوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے، تاہم بحیثیت مجموعی مولانا کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والا ان سے متاثر ہو کر ہی رہے گا۔افسوس کہ مولانا کی پوری تصانیف منظر عام پر نہ آسکی حتیٰ کہ ترجمان القرآن بھی مکمل نہ ہوسکا۔''البیان'' اور ''مقدمۃ التفسیر'' تو پتہ نہیں کس کونے میں مدفون ہیں کہ جن کا کوئی پتہ نہیں ہے حالانکہ ترجمان القرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ دونوں کتابیں منظر عام پر آجاتی تو دنیا میں ایک تہلکہ برپا ہو جاتا۔ان سے جو علمی نکات اور قرآن وحدیث کے معارف حاصل ہوتے اسلام کے متعلق جو فوائد ملتے وہ نہایت قابل قدر اور قیمتی ہوتے لیکن افسوس! ان کا کوئی پتہ نہیں کہ وہ کہاں گئے بہر حال اللہ تعالیٰ حکیم علیم ہے اس میں حکمت پوشیدہ ہوگی۔آج کل کی نئی تعلیم کے لحاظ سے مولانا سید مسعود احمد صاحب بھی ایک قابل قدر ہستی ہیں۔میرا ان سے کافی تعلق ہے اللہ تعالیٰ ان کو اپنے صحیح مقصد میں کامیاب کرے۔اس سوال کے جواب میں قدرے اختصار سے کام لیا ہے کیونکہ طوالت کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔اس سے ہی آپ میرے مزاج کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں کن کن مصنفین اور کتب سے متاثر ہوا ہوں۔

سوال ٤ : علمی اور ادبی لحاظ سے کون سے جرائد آپ کو پسند ہیں؟

جواب: افسوس کہ سندھی زبان میں ایسا کوئی رسالہ یا اخبار یا مجلہ نہیں نکلتا جو علمی اور ادبی نقطہ نظر سے میری سمجھ کے مطابق معیاری ہو۔البتہ اردو میں اس قسم کا کافی مواد ہے اور ملک میں ایسے کتنے ہی جرائد اور مجلات ہیں، جو علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے نہایت اعلیٰ درجے کے ہیں مجھے رسالہ محدث، ترجمان القرآن، اہل حدیث اور تنظیم اہل حدیث، الاعتصام یہ سارے پسند ہیں، اس کے علاوہ جسارت اور چٹان بھی کسی حد تک اور کئی موضوعات میں ممد اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔مولانا مودودی رحمہ اللہ کا ترجمان القرآن بھی کسی حد تک مفید ہے، ان کے علاوہ اور بھی کئی جرائد اور رسائل ملک میں موجود ہیں۔کچھ مجھے پسند ہیں تو کچھ میرے مطالعے سے نہیں گذرے۔

سوال ٥ : آپ اپنے زمانہ تعلیم کے اساتذہ اور درسگاہوں کی ممتاز خصوصیات بیان کریں گے؟ نیز موجودہ

نصاب تعلیم پر روشنی ڈالیں گے؟

جــــواب: میں چونکہ سندھ یا سندھ کے باہر کسی اور مدرسہ میں نہیں پڑھا اس لیے باقی مدارس کی ممتاز خصوصیات بیان کرنے سے عاجز ہوں، البتہ اپنے مدرسے کے متعلق اتنا بیان کرنا کافی سمجھتا ہوں کیونکہ میں نے تعلیم وہیں پر حاصل کی ہے۔ اس ادارہ کا ماحول ہی ایسا تھا کہ علم حاصل کرنے کے لیے از خود شوق و ذوق پیدا ہو جاتا ہے اور شاگرد بھی سو دو سو سے کم نہیں ہوتے تھے تعلیم حاصل کرنے کا ذوق اور جذبہ اتنا تھا کہ طلباء تقریباً ہر روز اپنے سروں پر لکڑیاں اکٹھی کر کے آتے تھے، جن پر روٹی پکتی تھی اور پھر کھاتے تھے۔ اور روٹی بھی کوئی خاص نہ ہوتی تھی، بس دال، روٹی، اتفاقاً کوئی بڑا دن یا موقعہ ہوتا تو گوشت یا اور کوئی چیز میسر ہو جاتی تھی ورنہ وہی کھانا ہوتا تھا۔ آخر میں یہ ہوا تھا کہ ایک جمعہ چاول اور دوسرے جمعہ نہاری ہوتی تھی۔ یعنی گویا آٹھویں دن بعد ایسی ہیر پھیر ہوتی تھی لیکن یہ باتیں گویا کچھ نہیں ہیں۔ ہر ایک طالب علم خوشی سے اپنی تعلیم میں محو و مصروف ہوتا تھا۔ لیکن اس کے مقابلے میں آج طلباء پر کوئی کام نہیں ہے بلکہ روٹی بھی اچھی ملتی ہے بیٹھے بیٹھے کھا رہے ہیں لیکن علم کا ذرہ برابر بھی شوق نہیں ہے اور نہ ہی تعلیمی معیار وہ رہا ہے۔ بہر حال عرض کر رہا تھا کہ اتنی مشقت اور جدوجہد کے باوجود بھی علم کا شوق نہایت قابل رشک تھا۔ آپ کی معلومات میں اضافے خاطر یہ عرض کیا جاتا ہے کہ سندھ میں پہلا مدرسہ ہے جو ہمارے جد امجد علیہ الرحمہ نے قائم کیا اور اس سے پڑھ کر دوسری جگہوں پر مدارس کھلوائے مثلاً ٹھیڑھی وغیرہ کے مدارس، گویا پاکستان بننے سے پہلے سندھ میں جتنے بھی مدارس قائم تھے ان کے بانی کا بالواسطہ یا بلا واسطہ اسی مدرسے کے فیض یافتہ طلبہ تھے۔ وذالك فضل من الله عظيم.

پڑھانے والے جو بھی ہوتے تھے وہ نہایت اعلیٰ درجے کے ماہر تعلیمی فرائض ادا کرنے میں ماہر اور نہایت مستعد اور مشغول ہوتے تھے، ملک کے پایہ کے علماء کو بلا کر اس مدرسہ میں رکھا جاتا تھا، قانون کی پوری پابندی ہوتی تھی۔ اساتذہ کا احترام ادب ہوتا تھا بلکہ اساتذہ کا ڈر اور خوف بھی بہت ہوتا تھا۔ ایک واقعہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں کہ ہمارے پاس ایک استاد بنام محمد امیہ ذات میو، قرآن شریف پڑھاتا تھا۔ وہ ہمارے دادا جی کے بھی قرآن پڑھانے میں استاد تھے۔ اور میرے بھی۔ یعنی ہمارے دادا جی سے لے کر قرآن شریف حفظ اور ناظرہ کے لیے وہی ہوتے تھے نہایت ہی نیک اور صالح اللہ کے بندے تھے۔ میں نے اپنے والد کو کسی اور غیر کی وفات پر اتنا غمزدہ نہیں دیکھا جتنا حافظ مرحوم کی وفات پر دیکھا تھا، آپ نے ان کی پیشانی پر بوسہ بھی دیا تھا۔ بہر حال حافظ بڑی قابل قدر ہستی ہیں، ان کے پاس قرآن شریف پڑھنے والے طلباء تقریباً سو کی تعداد میں ہوتے تھے۔ یہ واقعہ اس طرح یاد نہیں آیا کہ میں حافظ صاحب کے پاس قرآن مجید ناظرہ پڑھتا تھا۔ ''یاد رہے قرآن مجید حفظ میں نے بہت عرصہ بعد کیا تھا۔'' پھر ایک دن ایک شاگرد بنام عبدالغفور ذات غالباً ''راہو'' کو میں نے کہا کہ پانی لاؤ، وہ شاگرد حافظ صاحب کا کٹورہ لے کر پانی بھرنے کنویں پر گیا، جیسے ہی پانی بھرنے لگا اتفاقاً کٹورہ اس کے ہاتھ سے

گر کر کنویں میں چلا گیا اور اب شاگرد بیچارے کو بڑا خوف ہوا کہ حافظ صاحب کہیں اس پر غصہ کا اظہار نہ کر دیں۔ اس خوف کی بنا پر وہ کنویں میں اترنے لگا حالانکہ وہ تیرنا بھی نہیں جانتا تھا لیکن استاد کے خوف اور ڈر کی وجہ سے وہ کنویں میں اتر گیا اور کٹورہ جو پانی پر تیر رہا تھا اس کو نکال لایا۔ اور ان کی شلوار تھوڑی سی گیلی ہوگئی تھی۔ حافظ صاحب کے پوچھنے پر انہوں نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ حیرت کا مقام ہے کہ استاد کا کتنا ڈر ہوتا تھا کہ ایک تیرا کی سے غیر واقف لڑکا کنویں میں داخل ہو جائے۔ آج کل استاذہ کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ نہ ہی دل میں ان کا احترام یا وقعت باقی رہی ہے، بہر حال اساتذہ کا تمام طلبہ کو بہت زیادہ ڈر ہوتا تھا اور عزت بھی ہوتی تھی اور تعلیم بھی کما حقہ کا حاصل کی گئی۔

آج جب یہ بات ہی نہ رہی تو علم جو حاصل کیا جاتا ہے وہ بھی معلوم ہے۔ شال اللہ تعالیٰ ہدایت دے۔ طلباء کی تفریح کا بھی خیال رکھا جاتا تھا مثلاً شام کو عصر نماز کے بعد کھیل کود ہوتا تھا اور کبھی کبھی مارک واہ (نہر کا نام ہے) جو کہ جدید نہروں کے نکلنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ وہاں پر استاذ طلباء اور کبھی کبھار ہمارے والد محترم بھی جاتے تھے۔ نہانا اور تیرا کی وغیرہ ہوتی تھی۔ اور تفریحات آج بھی یاد آتی ہیں تو دل کو وہ سرور والی کیفیت یاد آجاتی ہے۔ جو دوبارہ وہ کیفیت نہ مل سکی۔ کاش وہ زمانہ لوٹ آئے۔ رات کو ہر روز مغرب کی نماز کے بعد سے لے کر عشاء تک طلباء مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔ سندھی تعلیم کے لیے ایک پرائیویٹ ماسٹر بنام محمد قاسم ہوتا تھا جو ہمارے بھی استاد تھے۔ ابھی بھی غالباً زندہ ہے۔ ان کے چھوڑ جانے کے بعد دوسرا ماسٹر بنام عبدالکریم جو کہ نوشیرو فیروز کا رہائشی تھا، ان کو رکھا گیا جو کہ سندھی زبان، ریاضی اور جاگرافی وغیرہ پڑھاتا تھا مختصر وقت کے لیے ہمارے دادا کے دور میں ایک انگریزی ماسٹر بھی رکھا گیا تھا۔ لیکن ہمارے قریب میں کوئی انگریزی ماسٹر بھی نہیں تھا۔ والد صاحب کو میرے متعلق یہ خیال تھا کہ تھوڑی بہت انگریزی سیکھ جاؤں جس کے لیے استاد رکھا جائے گا مگر افسوس کہ حیاتی نے ساتھ نہیں دیا۔ اسی طرح ان کی حیاتی میں ماسوائے A.B C.D کے زیادہ کچھ نہ سیکھ سکا۔ لیکن بعد میں قدرتاً مجھے خیال جاگا اور کوشش کی الحمد للہ تھوڑے وقت میں کافی مہارت حاصل ہوگئی لیکن بعد میں پھر شوق جاگا کہ اس علم میں ڈگری حاصل کروں۔ قدرت نے ایسی مہربانی کہ ایم۔ اے کرا کے ہی چھوڑا۔ خیر یہ تو ضمنی بات ہے مطلب یہ ہے کہ کسی حد تک دنیاوی تعلیم کا بھی اس مدرسہ میں انتظام تھا عربی میں مضمون نویسی کا بھی کام کرتے تھے۔ بہر حال مختصراً اس دینی درسگاہ کے متعلق یہی عرض کرنا کافی ہوگا کہ ایسا علمی ماحول تھا کہ پڑھنے کا خود بخود شوق پیدا ہو جاتا تھا۔ اساتذہ کی ممتاز خصوصیات کے بارے میں یہی گذارش ہے کہ ہمارے کئی استاد تھے لیکن میں ان میں چند کی خصوصیات بیان کروں گا۔

ا......حافظ امین محمد کے متعلق ایسی برکت تھی کہ ان کی حیاتی میں کئی حافظوں نے ان سے دستار بندی حاصل کی لیکن ان کے بعد کوئی حافظ نہیں بنا تھا۔ البتہ ایک لڑکا ہم سے حافظ ہو کر نکلا تھا لیکن وہ بھی چودہ پندرہ پارے پہلے ہی

کسی گاؤں سے حفظ کر کے آیا تھا۔

۲...... ماسٹر محمد قاسم جو کہ سندھی زبان کے استاد تھے۔ان کی ہی قابلیت تھی کہ مجھے مختصر عرصے میں صورۃ خطی بالکل صحیح نمونہ لکھنا پڑھنا آ گیا بلکہ سندھی زبان دو سالوں میں ختم ہو جاتی تھی اور چار کلاسیں پڑھائی جاتی تھیں،لیکن اتنا ہے کہ خوش خطی مجھے حاصل نہ ہوسکی جس کا شاید یہ سبب بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارے پورے خاندان کی بھی کیفیت تھی کسی کی بھی خوشخطی صحیح نہ تھی۔شام کے وقت پہاڑے وغیرہ یاد کرائے جاتے تھے بہر کیف استاد نہایت ہی محنتی، مخلص اور دیندار تھے۔

۳...... مولوی ولی محمد کیریو مرحوم جو کہ اس مدرسہ میں پڑھے تھے اور بعد میں یہیں پر مدرس مقرر ہوئے۔ ابتدائی کتب علوم عالیہ اچھی طرح پڑھاتے تھے۔اسی طرح فارسی کی کتب بھی وہ پڑھاتے تھے۔

۴...... مولوی محمد اسماعیل پٹھان صاحب مرحوم، یہ بھی ہمارے استاد تھے اور کافی علوم میں ان کو مہارت تھی، خصوصاً علوم عالیہ نحو وصرف میں کافی دسترس تھی،نحو وصرف کی مشکل کتب ان کے ذمے ہوتی تھیں۔تمام علوم گویا ان کو ازبر یاد تھے۔عربی ادب میں بھی اچھی مہارت تھی۔ان کی تعلیم کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ جو سبق پڑھاتے تھے وہ تقریر کی طرح یاد سنا جاتے تھے، پھر جب طلباء ذہن نشین کر لیتے تھے اس کے بعد کتاب کھول کر پڑھاتے تھے اور آسانی کے ساتھ سمجھاتے تھے۔جس سے طلباء اچھی طرح سمجھ جاتے تھے،مولوی صاحب سندھی تھے، ہمارے گاؤں میں رہتے تھے، گویا حافظہ کمال کا تھا، حافظ قرآن تھے۔تراویح نماز ایک جگہ پر نہیں پڑھاتے تھے۔ان کی ایک خوبی یہ ہوا کرتی تھی کہ اگر کوئی شاگرد سبق یاد نہیں کرتا تھا یا زیادہ چھٹیاں کرتا یا کوئی ناشائستہ حرکت کرتا تھا تو اس کو سخت سزا دیتے تھے اور ان کے پاس جو ڈانڈا ہوتا تھا اس کا نام ہی انہوں نے (ڈمر شاہ) یعنی ''قہر شاہ'' رکھا تھا۔ انہوں نے علوم عالیہ میں ہمیں کافی دسترس دلوائی۔

ہمارے والد محترم کے زمانے سے لے کر ہمارے دور تک مدرسہ کے مہتمم رہے اور مدرسہ کا پورا اہتمام ان کے ذمے تھا لیکن کافی عرصہ بعد یہاں سے چھوڑ کر نیو سعید آباد میں جا کر رہے لیکن ہمارے ساتھ پھر بھی تعلق وہی رکھا۔ بالآخر سعید آباد میں ہی ان کی وفات ہوئی۔میرے ابا جی سے ان کی بچپن کی دوستی تھی۔ایک ساتھ پڑھے۔ایک ساتھ دستار بندی ہوئی۔ہمارے جد امجد سے لے کر والد کی وفات تک ہمیشہ ان کے ساتھ رہے، کبھی بھی جدا نہیں ہوئے طلباء میں ان کا ڈر بہت تھا۔ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اگر کوئی طالب علم عبارت میں غلطی کرتا تھا تو پُر مذاق اور خوش طبعی سے اس کی اصلاح کرتے تھے مثلاً: اگر کسی نے مضاف الیہ پر زیر نہ پڑھی یا مجرور کو زیر نہ دی تو کہتے تھے کہ بیچارا مضاف شاید اتنا کمزور ہو چکا ہے یا مجرور اتنی سست ہوگئی ہے کہ دونوں زیر دینے سے عاجز ہو گئے ہیں۔اس طرح طالب علم محظوظ بھی ہوتا تھا اور اپنی غلطی کی اصلاح بھی کرتا تھا۔اسی طرح باقی معاملات میں بھی پر مذاق نمونے سے طلباء کو تنبیہ کرتے تھے۔ان کی لکھائی نہایت نئی عالیشان تھی۔انگریزی سے بھی کچھ واقفیت رکھتے

تھے۔ کتنے ہی جملے بول لیتے تھے۔ اس کے امثال اور مقولہ پیش کرتے تھے۔ نماز کے متعلق جتنی بھی سنتیں احادیث میں وارد ہیں، ان سب کو مانتے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ چونکہ ان پر عمل کرنے سے لوگوں میں گڑ بڑ پیدا ہوئی۔ اس لیے ان کو مستحب سمجھنے کے باوجود فساد کو ٹالنے کی خاطر اس عمل کو ترک کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ یہ ان کا خیال تھا لیکن والد محترم صاحب ان سب باتوں سے بے نیاز سنت پر عمل کرتے تھے۔ کبھی کبھار کتابوں کا امتحان یاد لیتے تھے اور پھر دینی مسئلہ طلباء سے اس طرح پوچھتے تھے کہ جو مسئلہ کا جواب ہوتا تھا اس کے بالکل الٹ سوال کر ڈالتے تھے تاکہ طلباء کے حافظے کو پرکھا جائے، مثلاً کہا کرتے تھے کہ نماز میں دنیاوی کلام بھی کیا جائے اس سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سوال تھا لیکن رنگ ایسا دیتے تھے گویا کہ مسئلہ کو بیان کر رہے ہیں لیکن جب طالب علم کو مسئلہ کا پتہ ہوتا تھا وہ کہہ دیتا تھا کہ نہیں مسئلہ اس طرح نہیں اس طرح ہے۔

۵...... مولوی محمد اکرم انصاری ہالائی سندھی، یہ مولوی صاحب بھی درسی علوم میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ صرف کی مشہور کتاب ''ارشاد الصرف'' کے متن کے نیچے ان کا ہی حاشیہ ہے، وہ بھی اس مدرسہ میں پڑھاتے تھے میں سوائے ایک دو مرتبہ کے ان سے وہ بھی فارسی کے کتب کے زیادہ نہیں پڑھ سکا۔ انہوں نے کچھ عرصے بعد ہمارے مدرسے کو چھوڑ کر ہالا میں رہائش اختیار کر لی اور ہمارے والد سے ملنے کے لیے ہمارے ہاں آتے تھے اور ان کی صحبت کی وجہ سے آخر میں اہل حدیث مسلک کی طرف مائل ہو گئے تھے اور ان کا انتقال ہالا ہی میں ہوا۔

نوٹ: یہاں ان مدرسین کے نام ذکر کر رہا ہوں جن کو میں جانتا ہوں یا میں نے دیکھے ہیں:

۶...... مولوی محمد نور یہ پنجابی تھے۔ سرگودھا کے رہنے والے تھے ان کو معقولات منطق و فلسفہ وغیرہما پر کافی دسترس تھی، ہر فن میں معقولات کے نکات بیان کرتے تھے۔ چاہے حدیث یا نحو یا فقہ پڑھاتے لیکن ہر جگہ ایسی باتیں پیش کرتے جن کا تعلق معقولات سے ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مولانا صاحب معقولات سے رنگے ہوئے تھے تو بے جا نہ ہوگا ہمارے مدرسے میں کچھ عرصہ پڑھایا، پھر چلے گئے اور پھر والد صاحب کی عمر کے آخری ایام میں دوبارہ آئے اور ہمارے پاس ہی رہے رمضان المبارک کی چھٹیوں کے بعد واپس نہیں آئے۔ سن ۱۹۶۳ء میں بذریعہ جیپ کوہ مری ایبٹ آباد ریاست سوات، راولپنڈی، لائل پور، سرگودھا، کوئٹہ ادارہ کے چکر لگا کر آیا تھا۔ اس سفر میں ایک مولانا بنام محمد امیر راولپنڈی میں ملا تھا اور انہوں نے ہماری سرگودھا میں دعوت بھی کی تھی کیونکہ آپ وہیں رہتے تھے، اس سے معلوم ہوا تھا کہ مولوی نور صاحب ابھی تک زندہ ہیں۔ لیکن ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی، بعد کوئی پتہ نہ چلا کہ وہ زندہ ہیں یا وفات پا گئے۔ میں نے ان کے پاس چند کتب پڑھیں جن میں سنن نسائی، توضیح وتلویح اور کچھ منطق کی کتب اور کچھ شرح جامی کے مقامات ان سے پوچھے لیکن ہر جگہ ان کا رنگ ڈھنگ منطقی رہا، فنی اصطلاحات ان کو ازبر یاد تھیں۔ جس وجہ سے طلباء کو ان سے کافی معلومات حاصل ہو جاتی تھی۔

۷...... مولوی قطب الدین ہالیجو صاحب یہ مولوی صاحب سندھی تھے۔ پنو عاقل نزدیک ہالیجہ نامی گاؤں میں

رہتے تھے۔ جہاں پر مولوی حماد اللہ مرحوم رہتے تھے ان صاحب نے بھی ہمارے مدرسے سے تحصیل کل کی اور وہیں پر مدرس ہوئے اور کچھ عرصہ پڑھا کر پھر چلے گئے۔ دوبارہ آئے اور پھر چلے گئے اور بعد میں اپنے گاؤں ہالیجہ اور گھوٹکی میں پڑھایا اور ٹھیڑھی میں بھی کچھ عرصہ مدرس رہے، ہمارے والد صاحب کے وقت میں ان کے پاس ہم نے فارسی کے سات بوستان پڑھے ان کی یہ خصوصیت ہوا کرتی تھی کہ اگر طلباء مطالعہ کر کے آتے تھے تو پڑھاتے تھے ورنہ نہیں پڑھاتے یا بہت زیادہ غصہ کرتے تھے اور طلباء کے انداز سے سمجھ جاتے تھے کہ انہوں نے رات کو مطالعہ کیا ہے یا نہیں، مطلب کہ مطالعہ پر بہت زور دیتے تھے تاکہ طلباء میں کتب کے مطالعہ کا شوق اجاگر ہو سکے اور کتب سے استفادہ کرنے کا ملکہ حاصل ہو سکے۔ عربی ادب میں ان کو مہارت قدرے کم تھی۔ منطق وغیرہ کی طرف دھیان ورجحان تھا لیکن مولوی محمد نور سے کم تھا ہمارے والد صاحب کی وفات کے بعد ہمارے پاس دوبارہ پڑھانے آئے اور آخر میں نے انہی کے ہاتھوں دستار بندی اور تحصیل کی، اور بعد میں وہ یہاں سے چلے گئے اور شاید کچھ عرصہ ٹھیڑھی میں رہے بعد میں اپنے گاؤں میں چلے گئے۔ چند سال پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد کا پتہ نہیں، زندہ ہیں یا فوت ہو چکے ہیں۔

۸ ....مولوی حمید الدین صاحب یہ بھی پنجابی تھے۔ اور ہمارے والد صاحب کے دور میں پڑھانے آئے تھے۔ ان کو عربی ادب میں کافی دسترس حاصل تھی اور اس میں مہارت تامہ رکھتے تھے میں نے ان کے پاس ہدایۃ النحو ترکیب کے ساتھ پڑھی تھی اور علم الصیغہ صرف کی کتاب بھی ان کے پاس پڑھی اور ادب میں ''کتاب اطواق الذہب'' للزمخشری شروع حصہ سے کچھ پڑھا اور اسی سے ان کی عربی ادب میں مہارت کا ثبوت مل گیا لیکن آب وہوا کے نامناسب ہونے اور زیادہ بیمار رہنے کی وجہ سے وہ یہاں سے چلے گئے، جس وجہ سے ان سے پورا استفادہ حاصل نہ ہو سکا، مجھے بڑا شوق تھا کہ میں ان کے پاس عربی ادب میں مہارت حاصل کروں اور یہ کتاب ''اطواق الذہب'' ان کے ہی ایماء پر منگوائی تھی اور استاد محترم نے مشورہ دیا تھا کہ مذکورہ کتاب تجارتی کتب خانوں سے منگوا لو تاکہ میں آپ کو پڑھا سکوں، لہٰذا میں نے کتاب منگوائی اور ان کے پاس پڑھنے لگا، ہمارے ساتھ ایک مولوی بنام عبدالعلیم تھے وہ بھی اس درس میں شامل ہو جاتے تھے نیز میر نے کہنے پر مولوی صاحب موصوف کے نکات قلمبند کرتے تھے مگر افسوس سلسلہ (جس طرح اوپر ذکر کیا) قائم نہ رہ سکا اور یہ کتاب صرف ایک ہی صفحہ (تک) پڑھ سکے، بعد میں یہ کتاب ہم نے مولوی محمد اسماعیل صاحب مرحوم کے پاس پڑھ کر ختم کی، مولوی حمید اللہ صاحب حنفیت میں راسخ تھے۔ اشارتاً تھوڑا سا ذکر میں نے والد صاحب کی زندگی کے متعلق تذکرہ میں کر دیا ہے۔ کوئٹہ میں مشہور زلزلہ جب آیا تو مولوی صاحب اس وقت ہمارے پاس مدرس تھے اور ابھی جوان تھے۔ تقریباً شاید ۳۰/۳۵ سال کی عمر کے ہوں گے، ان کے جانے کے بعد کوئی پتہ نہ چل سکا۔

۹ ....مولوی محمد مدنی سندھی صاحب یہ اصل میں ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، ازلی سعادت ان کا مقدر

تھی۔ لہٰذا بچپن سے ہی مسلمان ہوگئے عربی علوم حاصل کے بعد حرمین شریفین ہجرت کر گئے اور مدینہ میں ہی رہے جس صاحب سے ان کو مدنی کہا جاتا ہے اور آج تک ان کو مدنی کہا جاتا ہے۔ وہاں ہی ان کی محمد عبید اللہ سندھی مرحوم۔ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

کیونکہ مولانا صاحب نے بھی انگریزوں کی سینہ زوری کی وجہ سے حرمین شریفین میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اسی طرح محمد مدنی صاحب بھی ان کی صحبت میں رہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کتب اور ان کے فلسفہ کا علم حاصل کرتے رہے۔ حرمین شریفین میں رہنے کی وجہ سے مرحوم موصوف نے عربی میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی بڑے سہل انداز میں عربی زبان بولتے اور تقریر کر لیتے تھے، اصل میں یہ بھی سندھی تھے اور عربی ادب میں ان کو بھی کافی مہارت تھی۔ انہوں نے حرمین شریفین سے واپسی آنے کے بعد میں مستقل رہائش کراچی میں اختیار کر لی اور ابھی تک وہیں پر ہیں۔ وہاں سے ہمارے والد صاحب نے ہمارے مدرسہ کے لیے ان کو بلایا، اباجی کی زندگی کا آخری زمانہ تھا، غالباً دو اڑھائی سال ان کے ساتھ بھی مدرسہ میں رہے اور ہمارے یہاں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان سے میں نے عربی ادب کی چند کتابیں پڑھیں جن میں مقامات الحریری بھی شامل ہے آپ عربی ادب میں کافی مہارت رکھتے تھے ان کو قرآن شریف کی قرأت کا بھی علم تھا اس کے ساتھ ساتھ سفر کا بھی علم رکھتے تھے۔ علم العروض والکافیہ میں بھی ماہر تھے اس وقت مجھے بھی شوق جاگا کہ میں بھی یہ علم حاصل کروں لیکن اباجی مرحوم غالباً (والشعراء يتبعهم الغاؤن) کی وجہ سے اس علم کے حصول کے خلاف تھے۔ میں نے ان کو عرض کیا کہ اس علم کی ایک دو کتابیں پڑھنے سے آدمی شاعر نہیں بن جاتا بلکہ ایک لحاظ سے اس فن کی ضرورت بھی ہے کیونکہ خود نحو میں کئی مقامات ایسے بھی آئے ہیں، جہاں پر اس علم کے بغیر کما حقہ سمجھ میں آنا بہت مشکل ہے۔ کافیہ اور شرح جامی پڑھنے والے اس سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے مجھے اجازت دیں کہ میں مولوی محمد مدنی صاحب کے پاس اس فن کی کتاب پڑھوں، آپ نے مہربانی فرما کر مجھے اجازت دی اور میں نے تھوڑے ہی وقت میں "محیط الدائرة فی علم العروض والكافيه" پڑھ لی اور ضرورت کے مطابق کافی واقفیت ہوگئی اور نحو کے وہ مقام اچھی طرح سمجھ گیا اور بعد از اں اتنی واقفیت پیدا ہوئی کہ عربی سفر کا ایک قصیدہ بھی بنالیا جن میں سے چند اشعار درج ذیل ذکر کرتا ہوں۔

يا عاشق الدنيا تبصر انها
مثل اليلامع في ملاع تلمع
فالمنهمك فيها وان يك مترفا
لاشك في عال الفدا فد يملح
فاقنع بها يا صاحب الزاد اليسير
ولا تبكن في كل واد تشرع

وعـن الـطـمـاع مـضـاربك فـاقـلـع ولا
تلك واقـعـا فيهـا تـعـز و تـرفـع

اس وقت ہمارے والد صاحب کافی ناخوش تھے اور علاج کی غرض سے حیدر آباد میں تھے۔ یہ ان کی آخری بیماری تھی، پھر یہ اشعار قاضی فتح الرسول نظامانی نے دیکھے۔ قاضی صاحب اس وقت ٹنڈو قیصر میں رہائش پذیر ہیں اور اسکول میں عربی ٹیچر ہیں، ان کے والد مرحوم قاضی فتح محمد نظامانی بھی بڑے چوٹی کے عالم تھے اور ہمارے دادا مرحوم کے بھی استاد تھے اور ہمارے دادا کے لیے کافی کتب حدیث بھی نقل کیں، مثلاً: مستدرک حاکم کا وہ صحیح نسخہ جن کا میں نے پہلے ذکر کیا وہ بھی قاضی فتح محمد صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ قاضی صاحب نے ہمارے دادا کے لیے حدیث اور اس سے تعلق رکھنے والے فنون کے کتنی ہی کتب نقل کیں۔ جن میں اکثر ہمارے ہاں موجود ہیں۔ ان کے فرزند بھی ہمارے والد صاحب کے صحبتی تھے۔ ہمارے ساتھ کافی تعلق اور دوستی تھی۔ قاضی فتح الرسول نے اپنے والد کے طریقے کو زندہ رکھتے ہوئے مجھے چند کتاب نقل کر کے دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

بہرحال بات یہ چل رہی تھی کہ میرے بنائے ہوئے اشعار قاضی صاحب نے دیکھے اور ان کو کافی پسند کیا اور مجھ سے لکھوا لیے اور بعد میں ہمارے والد صاحب کو دکھائے کہ میں نے بہت اچھے اشعار عربی میں کہے ہیں۔ آپ اس پر خوش ہوئے اور اس پر رضا کا اظہار کیا۔ بہرحال یہ فن بھی مولوی محمد مدنی سے حاصل کیا۔ ہمارے والد صاحب یونانی فلسفہ کے بھی برخلاف تھے مگر مولوی محمد مدنی اور مولوی محمد نور نے ان سے اجازت لی اور اس طرح یونانی فلسفہ کی ایک کتاب مولوی محمد مدنی صاحب کے پاس کافی پڑھی جو کہ مکمل نہ ہو سکی تو ان کی وفات کے بعد مولوی خلیل اللہ کے پاس اسے پڑھا اور مکمل کیا۔ جس کا تذکرہ بعد میں آئے گا، لیکن میری یونانی فلسفہ سے اصل بن ہی نہیں پائی۔ مولوی محمد مدنی صاحب ورثہ وترکہ کے مسائل وفرائض میں بھی عبور رکھتے تھے ہمیں ایک کتاب سندھی پر مشتمل آسان سندھی املاء کے نمونے پر لکھوائی لیکن پتہ نہیں وہ کہاں کھوگئی۔ سراجی بھی ان کے پاس پڑھی فقہ حنفی کی کتاب ''ہدایہ'' بھی ان کے پاس پڑھی، اس کے علاوہ ابوداؤد، ترمذی اور موطا امام مالک بھی ان کے پاس پڑھیں، بعد میں ان کی اسناد واجازۃ الروایۃ بھی مجھے عنایت کی جس طرح محدثین کا طرز عمل ہے۔ مولوی صاحب طب کے بارے میں معلومات رکھتے تھے، میرا بھی اس بارے میں ارادہ تھا لیکن موقعہ میسر نہ ہو سکا۔ ان کی وفات کے بعد کافی عرصہ بعد مولوی شریف الدین دہلوی (اہل حدیث) کے پاس علم طب پڑھا اور نفیسی پڑھنے کا خیال ہوا لیکن پڑھ نہ سکا۔ بہرحال یہ فن اچھی طرح حاصل نہ کر سکا۔ قانون سے بھی کوئی خاص واقفیت حاصل نہ ہوئی تھی۔ غالباً اس لیے کہ پڑھانے والا بھی کوئی خاص ماہر نہیں تھا۔ مولوی محمد مدنی صاحب خوش طبع انسان تھے، قرآن کریم کی تفسیر سندھی زبان میں کرتے تھے اور مجھ سے صلاح مشورہ کرتے تھے، پوچھا کرتے تھے کہ ترجمہ میں کون سا لفظ موزوں ہے؟ پھر میں بتاتا تھا اور بسا اوقات وہی سندھی لفظ لکھتے تھے اور اصل لکھا ہوا مٹا دیتے تھے۔ انہوں نے

والد صاحب کی وفات کے بعد ایک مرتبہ کراچی سے لوٹتے ہوئے قرآن کی سندھی ترجمہ کی ہوئی ایک کاپی میری طرف ارسال کی تھی تاکہ تصحیح کر کے بھیجوں۔ یہ ان کی تواضع اور انکساری تھی حالانکہ وہ تو میرے استاد تھے۔ قرأت کا علم ان کے ہاں حاصل نہ ہو سکا۔ کافی عرصہ بعد عزیز اللہ نام ایک قاری مدرسہ میں رکھا جس سے الحمدللہ قرأت کا پورا علم حاصل کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اکرامات ہیں ورنہ میں ناچیز کیا؟ اور یہ فنون کیا ہیں؟ مولوی محمد مدنی صاحب کی خوش طبعی کی کتنی ہی باتیں ہیں۔ لیکن میں صرف یہاں ایک واقعہ نقل کرتا ہوں۔ ہمارے پاس ایک فقیر بنام اسحٰق فقیر کیریو رہا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحب کا کام کاج کرتے تھے لیکن اس مرحوم کی ایک عادت تھی کہ ہر ایک کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، جس طرح کئی لوگوں کی عادت ہوتی ہے اور وہ اس عادت سے مجبور ہوتے ہیں اس طرح یہ بھی اپنی عادت سے مجبور تھے، بہر حال وہ ایک مرتبہ مولوی موصوف سے کسی بات پر لڑنا شروع ہو گئے، جس پر مولوی مدنی صاحب نے ان سے کہا کہ اسحٰق فقیر دیکھو اس گاؤں میں چالیس پچاس گھر ہیں، آپ ایسا کریں کہ باری مقرر کریں ایک دن ایک سے تو دوسرے دن دوسرے سے لڑیں، اور جس دن میری باری آئے اس دن مجھ سے لڑیں اور اپنی عادت پوری کریں لیکن بھلائی کریں ہر روز مجھ سے مت لڑیں اور نہ ہی ہر روز سب سے لڑیں۔ بس باری مقرر کر دیں، بس یہ بات اسحٰق فقیر پر ایسی تو منطبق بن گئی کہ بیچارا خاموش ہو گیا اور مولوی مدنی صاحب والی پُرلطیفہ بات کئی دن تک زبان زد عام رہی۔ موصوف نے دو اڑھائی سال میں مجھے اچھا خاصہ پڑھایا اللہ ان کو جزائے خیر دے۔

ترکہ کے متعلق آپ کی سندھی اور اردو میں کتب لکھی ہوئی ہیں نحو صرف کی بھی جو کہ اردو میں ہیں۔ ان کی بیٹی مولوی غلام مصطفیٰ قاسمی (آف شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد) کے گھر میں ہے، کبھی کبھار مولوی مدنی صاحب ہمارے یہاں گھومنے پھرنے آتے تھے۔ ابھی دو تین سال ہوئے ہیں دوبارہ نہیں آئے۔ سچ پوچھو تو اس وقت کی طالب علمی کا زمانہ یاد آتا ہے تو ایسا لطف اور سرور ملتا ہے کہ خواہش ہوتی ہے کہ طالب علم بن کر شاگردی شروع کر دی جائے لیکن آج وہ مدرس وہ طلباء وہ پر مذاق ماحول کہاں ہے؟ غالباً شرح تہذیب منطق میں وہ بھی مولوی مدنی صاحب کے پاس پڑھی تھی، کبھی کبھار ہم کہتے تھے کہ استاد جی آج کتاب کا درس عربی میں دیں پھر وہ سبق عربی میں شروع کرتے اور آخر میں کہتے فھـــمتـم یعنی سمجھے، کاش اس وقت کے سارے واقعات اسی وقت قلمبند کیے جاتے تو کافی تاریخی اور علمی مواد جمع ہو جاتا لیکن ماشاء اللہ کان وما لم یشأ لا یکون۔

یہ باتیں بھی تمہارے پوچھنے پر پتہ نہیں کس طرح یاد آ گئیں ورنہ میں سمجھ رہا تھا کہ ان باتوں کا تذکرہ شاید نہ ہو سکے۔ لیکن اب محسوس کر رہا ہوں کہ شاید ایک بات مستقل تذکرہ بن جائے۔ ابھی ماضی قریب ہی میں ہمارے دوست اور ہمارے مدرسہ کے مدرس مولوی دوست محمد صاحب کی عیادت کی غرض سے کراچی جانا ہوا جب وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ مولوی محمد مدنی صاحب کا گھر بھی وہیں پر ہے، خیال ہوا کہ ان سے ملاقات ہو جائے لیکن میرے

جانے سے قبل ہی مولوی صاحب کو میری آمد کی اطلاع ہو چکی تھی اور خود ہی میرے پاس چل کر آئے۔ مولوی صاحب کی حالت یہ تھی کہ ایک آدمی ساتھ لیے بغیر چل نہیں سکتے تھے مگر شاباش ہوان کو کہ میری وجہ سے تکلیف کر کے آئے حالانکہ میں تو ان کا شاگرد اور مجھے ہی ان کے پاس جانا چاہیے تھا لیکن! وہ مجھے کہنے لگے کہ آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ دل کہتا ہے کہ آپ کے گاؤں آئیں لیکن دیکھتے ہو دوسرے آدمی کے سہارے بغیر چلنا بہت مشکل ہے۔

ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ اب درس وتدریس کا کام نہیں دے سکتے لیکن اس کے باوجود بھی مطالعہ اور تصنیف وتالیف کا کام اس عمر میں بھی جاری رکھا ہوا ہے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ تھوڑی دیر مجلس کی پھر کھانا آیا، ہمارے اصرار پر تھوڑا سا کھایا، پھر چلے گئے۔

۹...... مولوی خلیل احمد یا محمد خلیل اللہ۔ یہ شیخ صاحب والد صاحب کی وفات کے کافی عرصہ بعد ہمارے مدرسے میں آئے تھے میں نے ان کے پاس عربی ادب میں سبع معلقات اور مناظرے کے علم میں رشیدیہ اور صحیح بخاری کا کچھ ابتدائی حصہ اور سلم العلوم منطق میں اور اصول فقہ میں مسلم الثبوت اور کچھ دوسری کتب ہیں۔ مولوی موصوف کی یہ خصوصیت ہوا کرتی تھی کہ وہ طلباء کو مناظرہ کرنا سکھاتے تھے اور جمعہ کی رات وہ درس دیا کرتے تھے جس میں بریلویوں، شیعوں اور قادیانیوں اہل سنت کی طرف سے مناظر مقرر کرتے تھے اور دوسرے کو اہل بدعت کی طرف سے مناظر مقرر کرتے، پھر دونوں کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے اور ایک دوسرے کا رد کرتے اور اپنے اپنے دلائل پیش کرتے۔ اس طرح لڑکوں کو مناظرے کی مشق کرواتے تھے۔ بدعتیوں اور اہل تشیع کے رد کے لیے اچھے اچھے دلائل پیش کرتے تھے اور ہمیں اس بارے میں املا کرواتے تھے اور کبھی کبھار خود عربی میں ہمیں لکھ کر دیتے تھے جس طرح شیعوں کے رد میں مجھے سورۃ نور والی آیت ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ الآیۃ کے متعلق تفسیر وتشریح عربی میں لکھ کے دی مگر افسوس وہ آج نظر نہیں آئی۔ مولوی صاحب اس زمانے میں پکے حنفی تھے اور بعد میں یہاں سے چلے گئے اور جا کر پنڈی میں رہے بعد میں وہاں سے بھی چھوڑ دیا اور پھر جماعت اسلامی کی طرف مائل ہو گئے اور وہی خیالات ان پر غالب رہے، پھر پرویزیت کی تصنیفات کا مطالعہ کیا اور اس کی طرف مائل ہو گئے جس کا کافی افسوس ہے لیکن اپنے اس میلان کو کھلی طرح ظاہر نہیں کرتے تھے مگر ان کی باتوں اور عمل سے پتہ چل جاتا تھا، کیونکہ یہ چھپنے جیسی بات ہی نہیں ہے۔ آخر کتنا چھپائے گا آدمی۔ ابھی مولوی صاحب نے سکھر میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا ہے اور وہیں پر رہتے ہیں اور پڑھاتے ہیں، اس کا ایک نصاب بھی بنایا تھا۔ جب سوشلزم اور پیپلز پارٹی کے برخلاف تقاریر اور جلسے جلوس کے سلسلہ میں سکھر جاتے ہوئے وہ بھی میرے ساتھ چلے تھے اور اپنے ادارے کے نصاب کی ایک کاپی بھی مجھے دی اور کہا تھا کہ اس بارے میں اپنی رائے ضرور دینا۔ میں نے واپس آ کر دیکھ کر جو بھی رائے یا ترمیم یا اضافہ کرنا پڑا وہ سب لکھ کر بھیجے اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا کوئی پتہ نہیں اور نہ ہی مولوی صاحب مجھ سے ملے ہیں۔ واللہ اعلم

اس کے بعد آخر میں مولوی قطب الدین ہمارے مدرسے میں آئے (س کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے) میں نے نحو میں امام زمخشری کی کتاب کچھ ادب کی کتب اور بخاری شریف ان کے پاس پڑھی۔ کچھ اور بھی درسی کتب پڑھیں، آخر میں ان کے ہی ہاتھ پر میری دستار بندی ہوئی جو کہ ایک جلسے میں ہوئی جو ہم نے اپنے گاؤں میں رکھا تھا۔ جس میں کافی جماعت والے اکٹھے ہوئے تھے۔ ابھی یہ یاد نہیں ہے کہ اس میں کون کون علمائے کرام شریک ہوئے تھے، بہر حال اس طرح میرا طالب علمی کا دور پورا ہوا۔ اوپر والے بیان سے آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ میرے اکثر اساتذہ حنفی تھے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ مجھے حنفیت کی طرف مائل یا متاثر نہ کر سکے بلکہ میری طبیعت کتاب وسنت کی طرف مائل رہی۔ تقلید سے طبیعت متنفر رہی، اس میں اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم شامل ہے کہ اس نے ہمیں ایسا والد دیا جس کو سنت سے تعلق اور محبت عشق کے درجہ تک تھا، بس یہی ان کا فیض ہے اور ان کی ہی تربیت کی برکت ہے کہ ناتواں طبیعت کو قرار صرف کتاب وسنت کے علم سے ہی نصیب ہوا، یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی ان کو یہ دعا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ان پر اپنی رحمت کی برکھا برسائے اور جنت میں اعلیٰ علیین میں اس بابرکت ہستی جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی رفاقت نصیب فرمائے۔ جن کی محبت نے دل سے ہر چیز کی محبت کو نکال دیا تھا۔ (اللھم آمین) میں نے معقولات بھی اگرچہ پڑھی یہ فن بھی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ان فنون میں سے کسی بھی فن سے دل نہ لگا اور نہ کوئی قلبی سکون اور شرح صدر نصیب ہوا بلکہ یہ سب کچھ کتاب وسنت کے علم سے ہی حاصل ہوا، حضرت شاہ ولی اللہ نے ایک شعر میں کتنی وسیع حقیقت ظاہر فرمائی ہے۔ فللہ اجرہٗ

علم کے ماخوذ از مشکوٰۃ نبی است
واللہ کے سید ابی ازاۃ تشنہ بہ است

واقعی باقی علوم اور فنون سے تشنگی یا پیاس نہیں بجھتی۔ ہمارے دل، دماغ روح اور ذہن کی پیاس صرف اور صرف کتاب وسنت کے علوم اور معارف ہی بجھا سکتے ہیں۔ یہ وہ علوم ہیں جو مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں۔ امام رازی نے تفسیر کبیر لکھی اس میں معقولات اور منطقی وفلسفانہ اصطلاحات کی بھرمار کی، اور اس میں منطق صرف استدلال کے طور پر لائے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک حقیقت حال سے واقف کا قول ہے کہ امام رازی کی تفسیر میں اور سب کچھ ہے سوائے تفسیر کے۔ یعنی تفسیر نہیں ہے اور یہ بالکل حقیقت ہے۔ افسوس کہ ہمارے کچھ علمائے کرام اور مفسرین نے قرآن کو انسانی عقل سے حل کرنے کی کوشش کی حالانکہ ہر ایک کو پتہ ہے کہ انسانی عقل اپنے مسائل بھی حل کرنے سے قاصر ہے، وہ قرآنی نکات یا ان کے مسائل کو کیا حل کر سکے گی۔ دراصل عقل انسانی ظاہری آنکھ کی طرح ہے۔ آنکھ کو بھی جب تک خارجی روشنی میسر نہیں ہوگی وہ کچھ نہیں دیکھ سکے گی اگرچہ کتنی بھی تیز کیوں نہ ہو اسی طرح عقل بھی اندر کی آنکھ ہے اس کو بھی جب تک باطنی روشنی (یعنی وحی الٰہی) نصیب نہ ہوگی تب تک وہ صحیح طور پر کام نہ کر سکے گی اور پھر جو وحی الٰہی سے پہل کر کے محض عقل پر مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرے گا وہ صرف

دھکے ہی کھائے گا، صحیح بات نہیں کر سکے گا۔ بس ایسے سمجھو کہ گویا کوئی بغیر روشنی کے ایسے ہی ہاتھ مارے اور کوئی چیز تلاش کرے۔ ظاہر ہے وہ کسی کانٹے وغیرہ میں بھی ہاتھ ڈال سکتا ہے یا کسی موذی جانور پر بھی ہاتھ رکھ سکتا ہے۔ جس کا نتیجہ کیا نکلے گا، اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں! اسی طرح معقولات کے ماہر عنبر عزیز جس کا بڑا وقت اسی شمع کے میلان میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے گذرا۔ جس نے آخر میں یہ کیا کہ: معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

یعنی اس ساری جدو جہد محنت اور کوشش کے بعد جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ کچھ معلوم نہیں ہوا۔ یعنی صرف اندھیرے میں ٹکریں ماریں ہیں باقی حاصل کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ اور زیادہ اپنے آپ کو اندھیرے میں دھکیل دیا ہے۔ اس طرح ایک اور معقولی اور معقولات کے گورکھ دھندھے میں اپنی ساری زندگی گذارنے والے نے آخر میں یہ کہا تھا کہ میں اس شہر کے بوڑھوں کے عقیدے پر مر رہا ہوں۔ امام غزالی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے آخر میں اپنے سینے پر صحیح بخاری رکھ کر کہا کہ اس سے پہلے میں نے جو کچھ کیا یا لکھا اس سے رجوع کرتا ہوں اور میرا ایمان اس پر ہے جو اس کتاب (بخاری شریف) میں ہے۔

عبرت کا مقام ہے کہ امام غزالی جیسا آدمی جس نے ان تمام فنون (منطق یونانی فلسفہ وغیرہم) میں امام کا مرتبہ حاصل کیا۔ اس کو بھی آخر اقرار کرنا پڑا کہ یہ فنون اور علوم انسانی رہنمائی کے لیے ذرے برابر بھی کام نہیں آتے، ان سے کوئی سیدھا راستہ نہیں ملتا۔ گھوم پھر کر بالآخر وحی الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ پھر کیوں نہ شروع سے ہی اس قیمتی چیز کو پکڑ لیں اور ادھر اُدھر دھکے کھانے سے بچیں جس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کچھ دینی مدارس جن کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ ہمارا مقصد صرف اور صرف کتاب وسنت کی تعلیم اور اس کی اشاعت ہے لیکن یہ علوم، نحو، صرف، اصول منطق اور فلسفہ وغیرہم محض کتاب وسنت تک پہنچانے کا ذریعہ سمجھ کر اس کو پڑھاتے ہیں۔ معنیٰ اصل مقصود ان کتاب وسنت کا علم ہے باقی دوسرے فنون اس تک پہچانے کے وسائل اور ذرائع ہیں مگر اس کے ہوتے ہوئے بھی اس طرح ہوتا ہے کہ ان وسائل پر طالب علم کے دس بارہ سال گزر جاتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اور جب طالب علم کتاب وسنت پر پہنچے تو ایک سال میں ہی ساری حدیث کی کتب پڑھ لے (ویالعجب وضيعة الادب) تفسیر میں صرف جلالین اور بیضاوی کا کچھ حصہ پڑھایا جاتا ہے جس سے کوئی خاص حاصلات نہیں ہوتی۔ خود سوچنے کا مقام ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنے محبوب، یا مقصود یا پسندیدہ چیز تک پہنچنے کا خواہاں ہے۔ جس پر کافی وقت لگاتا ہے۔ مشقتیں برداشت کرتا ہے، پھر جب وہاں پہنچتا ہے تو صرف اس کو دیکھ کر ہی واپس آجاتا ہے۔ تو ہر کوئی اس کو دیوانہ یا بے عقل کہے گا کہ جس کے لیے اتنی بڑی تکالیف اٹھائیں۔ اس کے پاس ٹھہرا ہی نہیں اور باقی اس تک پہنچنے کے جو ذرائع تھے ان پر بڑا وقت صرف کیا۔ تیرا اصل مقصد وہ نہیں تھا جس کے لیے تو نے وہ ذرائع استعمال کیے بلکہ وہ ذرائع وسائل ہی تیرے مقصود اصلی تھے کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟

ہمارے مدارس کو طلباء پر اصل محنت اسی وقت میں کرنی چاہیے تھی تا کہ وہ قرآن وحدیث پر پہنچ سکیں اور اس

تک پہنچنے کے لیے اتنا ٹائم اور وسائل وذرائع پر اتنا وقت صرف نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ مقصود اصلی تو قرآن حدیث ہیں اور پھران تک رسائی حاصل کرنے کے بعد بس اس کا منہ دکھا کر فارغ التحصیل کا ٹکٹ تھما دینا، یہی وجہ ہے کہ ان علوم اور فنون کے ماہر ہونے کے باوجود قرآن کریم کی کتنی ہی آیات کا صحیح ترجمہ اور تفسیر وتشریح کرنے سے وہ عاجز ہوتے ہیں اور حدیث سے مسائل مستنبط کرنے کا ان کے پاس ملکہ ہی نہیں ہوتا بلکہ حدیث شریف کو صحیح طور پر انہوں نے سمجھا ہی نہیں ہوتا اگر کوئی منکرین یا ملحدین ان احادیث میں سے کسی پر اعتراض کردے تو ان کے پاس اس کا کوئی جواب بھی نہیں ہوتا۔ تو پھر سوچنا چاہیے کہ اس علم میں اتنی عمر ضائع کرنے سے کیا حاصل ہوا۔ علاوہ ازیں معقولات پر طلباء پر اتنا وقت صرف کرنا سراسر ظلم عظیم ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ وہ علوم (یونانی فلسفہ وغیرہ) دنیا کے کسی بھی مسئلے کو حل نہیں کرسکتے۔ باقی جو ابحاث ان میں علوم طبیعیہ وغیرھا یا مابعد الطبیعات اور الاھیات وغیرھا کے متعلق آتے ہیں وہ بھی اکثر بالکل غلط ہیں۔ الاھیات اور مابعد الطبیعات میں جو دھکے ان فلسفیوں نے کھائے ہیں وہ اس علم رکھنے والوں پر مخفی نہیں۔ مسائل میں وہ کوئی رہنمائی نہیں کرتے بلکہ سیدھے سادھے اور قلب سلیم رکھنے والے انسان کو بھی حیرت کے گھڑے میں گرادیتے ہیں۔ اچھے بھلے انسان کے دماغ کو ناکارہ بنادیتے ہیں کیونکہ وہ مسائل کو صرف اندازے اور تخمینے کی بنیاد پر رکھتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہوتی کتاب وسنت (وحی الٰہی) سے روشنی حاصل کرنے کے بجائے محض اپنی ناقص عقل پر بھروسہ رکھ کر وہ مسائل جو غیب کے پردے میں ہیں ان کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھر بتائیں کہ ان مسائل کا حل کیا ہوگا۔ محض اندازے کے تیر اندھیرے میں چلانے کے مترادف ہے، مطلب کہ الاھیات یا مابعض العلمیات کے مسائل میں انہوں نے ایسی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ ان کا کوئی عضو سیدھا نہ رہا۔ علوم طبیعیہ کے متعلق جتنی بھی قیاس آرائیاں انہوں نے کی ہیں آج کے جدید فلسفہ نے ان سب کو باطل قرار دے دیا ہے اور وہ تمام نظریات سراسر بیکار ثابت ہوئے، لہٰذا ان یونانی علوم پر طلباء کی عزیز عمر ضائع کرنا سراسر فضول اور بیکار ہے بلکہ ان پر ایک ظلم عظیم ہے، آخر جو علم یا فن نہ دنیاوی لحاظ سے فائدہ مند ہو اور نہ دینی لحاظ سے اور نہ روحانی معاملات میں کام آسکتا ہو اس کے پڑھنے پڑھانے کا کیا فائدہ؟ ایسی بے مقصد چیزوں میں طلباء کو پھنسانے کی اور تو کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ صرف یا کہا جاسکتا ہے کہ مدارس کے بانی کار اور اراکین کو ٹائم پاس اور کوئی چیز نہیں ملی۔ اپنے دماغی گھوڑوں کو دوڑانے کے لیے اور کوئی میدان نہیں ملا۔ جس وجہ سے وہ ان بیکار اور جاہلانہ معقولات میں ذہنی گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔ درحقیقت اس وقت پرانا فلسفہ بیکار بن چکا ہے اگر کئی زمانہ میں اس کا مقصد تھا بھی تو اب کے زمانے میں کچھ نہیں ہے۔ اس لیے ان کو اس میں وقت ضائع کرنے کے بجائے قرآن وحدیث کے سمجھنے اور اس کے ادراک واستنباط میں ملکہ حاصل کرنے میں خرچ کرنا چاہیے اور اس طرح ہماری دنیاوی، دینی اور اخروی وروحانی زندگی سدھر جائے گی، ہر معاملے میں صحیح رہنمائی ہوگی،

ذہنی کوفت اور دماغی الجھن سے نجات مل جائے گی اور آدمی اس حیرت اور اضطراب سے بھی باہر نکل سکتا ہے جس میں ان بیکار فلسفوں نے کئی گناہوں کو پھینک دیا ہے لیکن کاش ہمیں وہ راستہ مل جائے۔ لیکن تقلید ان کو نہیں چھوڑتی۔ وہ مجبور کرتی ہے کہ بس لکیر کے فقیر بن کر اسی راستے پر چلتے رہو، جس پر کئی صدیاں پہلے لوگ چلا کرتے تھے پھر اصل مقصد ہو یا نہ ہو۔ معاف کرنا میں اصل سوال سے تھوڑا ہٹ کر اور موضوع کی طرف چل پڑا ہوں۔ لیکن سمجھتا ہوں کہ یہ بھی فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔ بہرحال اوپر کے مذکورہ اساتذہ کے علاوہ اور بھی میرے استاد رہے ہیں، جن کے پاس میں نے وقتاً فوقتاً ایک دو سبق پڑھے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے متعلق کوئی خاص واقعہ یا کوئی خاص امتیازی خصوصیت نظر نہیں آتی کہ جس کی بنا پر ان کے متعلق کچھ بیان کیا جائے۔ اسی طرح میرا طالب علمی کا دور ختم ہوا۔

سوال٦: زمانہ حال میں عالم اسلام کے لیے جن جدید مسائل اور حوادثات کے ساتھ مقابلہ ہے، ان کے دفاع کے لیے نوجوان نسل کو نئے یا پرانے کن کن مصنفین کی تصانیف کارآمد ہو سکتی ہیں؟

جواب: قدیم علمائے کرام نے اپنی تمام کتب عربی زبان میں لکھی ہیں، للہذا ان سے استفادہ کے لیے نئی نسل کو اول عربی علم سے کماحقہ واقف کرنا پڑے گا تا کہ وہ برائے راست فائدہ حاصل کر سکیں۔ یا کوئی ایسی مستقل جمعیت ہونی چاہیے جو ان کتب کا سلیس ترجمہ کرے تا کہ نئی نسل اس سے مستفید یا مستفیض ہو سکے۔ دوسری صورت مشکل ہے۔ ذیل میں قدیم علماء کرام مصنفین کی تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو اس وقت بھی اس قدر مفید ثابت ہو سکتے ہیں جتنا وہ اس دور میں تھے۔ ان مصنفین میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا نام سرفہرست سمجھنا چاہیے ان کے بعد ان کے تلمیذ رشید ابن قیم رحمہ اللہ کے کتب بھی کافی مفید ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کئی کتب ہیں، کچھ تفسیر میں لکھی ہیں تو کچھ غیر مسلموں کے ساتھ مباحثہ اور مناظرہ پر، مثلاً یہود و نصاریٰ کے ساتھ مقابلے پر ہیں۔ مطلب کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتب میں علم ہی علم ہے۔ (۱) ایک کتاب الجواب الصحیح ہے (۲) دوسری کتاب منہاج السنۃ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کتب اور رسائل ہیں جن میں علم ہی علم ہے بس کوئی استفادہ کرنے والا ہو۔ اسی طرح ابن حزم رحمہ اللہ کی کتاب الفصل فی الملل والنحل بھی عمدہ کتاب ہے۔ اسلام کا اچھا دفاع کیا ہے۔ اور وہ قابل دید ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کو بھی متقدمین کی لسٹ میں رکھنا چاہیے۔ جن کی تصنیفات اس سلسلہ میں نہایت مفید ہیں اور آج کل کے مسائل کے متعلق ان کی تحریرات سے کافی اور وافی مفید معلومات حاصل ہوتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان کی تالیف کا مطالعہ وہ کرے، جس کو کتاب و سنت سے واقفیت ہو اور خصوصاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ سے وہ نسبت اور عقیدت مندی ہونی چاہیے جو عقیدت مندی خود مؤلف رحمہ اللہ کو تھی اور وہی آدمی صحیح طور پر حضرت شاہ صاحب کے افکار کو سمجھ سکے گا ورنہ آج کل صوفی حضرات شاہ صاحب کے افکار و علوم یا فلسفہ و حکمت کی ترجمانی کے عنوان پر کچھ جدوجہد کر رہے ہیں۔ یا کچھ مضامین یا

رسائل وغیرہما شائع کر رہے ہیں۔ وہ شاہ صاحب کے فلسفہ وافکار کی صحیح ترجمانی تو نہیں کر رہے ہیں البتہ شاہ صاحب ان کے کارناموں کے نتیجے میں بے گناہ اور بلاوجہ بدنام ہو رہے ہیں۔ (گستاخی معاف) ان کے بیان کردہ افکار اور ولی اللہ کی حکمت سے خود ملحد اور دین سے پھرے ہوئے لوگ اور قرآن وحدیث سے روگردانی کرنے والے لوگوں کو اپنی تائید میں مواد مل رہا ہے۔ وہ حضرات نادان دوست کی طرح شاہ رحمہ اللہ کے افکار وحکمت کو ماڈرن (جدید) ثابت کرنے کے لیے اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ شاہ صاحب کی تعلیمات کی روح یہی نکل جاتی ہے یعنی دوستی کا حق ادا کرنے کے بجائے شاہ صاحب مرحوم رحمہ اللہ کی تعلیمات سے دشمنی کا پکا ارادہ کر دیتے ہیں۔ حقیقت میں آج کل کے مسائل کے حل کے لیے اور موجودہ الجھنوں کو سلجھانے اور اسلامی تعلیمات کی کما حقہ مدافعت جدید دور کے رنگ میں صحیح معنی میں صرف آج کل کے علمائے حق کی تصنیفات ہی کار آمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اور اللہ کے فضل وکرم سے ایسے علمائے کرام کی ملک میں کوئی کمی نہیں ہے گو کہ علمائے سوء کی کثرت ہے، تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس امت میں ہر دور میں ایک جماعت ہمیشہ قائم رکھی جو حق کی حمایت کرتی چلی آ رہی ہے اور اعدائے اسلام کے حملوں سے پوری مدافعت کرتی رہی ہے۔ اس وجہ سے یہاں کچھ علمائے کرام اور ان کی تصنیفات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱) مرحوم سید رشید رضا ان کی تفسیر ''المنار'' اور ان کی تمام تصانیف کار آمد ہیں۔

(۲) مرحوم شہید قطب شہید اور ان کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کم از کم راقم الحروف کو تمام تفاسیر میں ایک بہترین تفسیر نظر آئی ہے۔ اس کے مطالعے سے قرآن کے مطالب پر کافی اطلاع ہوتی ہے اور اسلام کے حقائق پر تفصیلی علم حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ آج کل کے اعتراضات وغیرہ اور الجھے ہوئے مسائل کا حل اور ان کے جوابات نہایت ہی سہل اور دلپسند انداز میں درج ہیں۔ کئی جگہوں پر تو بے اختیار تحسین اور آفرین کے الفاظ زبان سے نکل جاتے ہیں۔ کتاب وسنت کی تعلیمات کو یا مختصر الفاظ میں تمام مسائل اور ان کے جوابات میں ہر جگہ مصنف مرحوم نے اسلام کی رہنمائی کو بلند کیا ہے اور ہر نمونہ اور ہر پہلو سے بہترین ثابت کیا ہے۔ ان کی صرف یہی تفسیر نہیں بلکہ ان کی باقی تصنیفات بھی نہایت بہترین اور کار آمد ہیں۔ لہٰذا جو بھی اس سلسلہ میں مہارت تامہ اور واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ان کی تصنیفات کا مطالعہ اشد ضروری ہے لیکن ان کی تمام تصنیفات عربی میں ہیں۔

(۳) مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کی تصنیفات اور ان کی تحریرات بھی اردو دان طبقے کے لیے نہایت ہی مفید ہیں۔ واقعی جدید رنگ میں اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے کی کوشش میں مولانا کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں گو کہ ان کی کچھ باتوں سے ہم اتفاق نہیں کرتے۔ تاہم کسی کی کامیابی یا ناکامی کو اس انداز سے پرکھا جاتا ہے کہ وہ اکثر مقامات پر صحیح گیا ہے یا نہیں؟ اگر اکثر مقامات پر ان کی بات صحیح ہے تو پھر وہ یقیناً کامیاب ہے کیونکہ کلی اصابہ، یا ہر بات میں صحیح ہونا اس ذات پاک کی شان ہے جس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے: ﴿لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا

یَنْسٰی﴾ اور ﴿وَ مَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا﴾ یا وہ ہستی جس کو اپنی وحی سے نوازا (ﷺ) ان کے علاوہ باقیوں کی باتوں میں کچھ صحیح تو کچھ غلط کا اندراج ہوتا ہی ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی پوری تفسیر دستیاب نہیں۔ اور قرآن کے متعلق جو تفصیلی بیان اپنی کتاب ''البیان'' میں تحریر کیا تھا وہ بھی نہیں مل رہا۔ مقدمۃ التفسیر بھی ناپید ہے، کاش وہ دستیاب ہو جاتے تو قرآن کریم کے کئی مطالب جن کو سمجھنے میں آج کل دشواری ہو رہی ہے وہ کافی حد تک حل ہو چکی ہوتی۔ بہرحال اللہ کی مرضی۔ مولانا آزاد رحمہ اللہ کی تمام تصنیفات میں علم ہی علم ہے اور تو اور ان کے مکاتیب اور خطوط کا مجموعہ مثلاً: غبار خاطر وغیرہ پڑھنے سے آدمی حیران ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تحریر اور تقریر میں کتنی وافر دسترس عطا فرمائی ہے، اس وجہ سے ان کا لقب ہی ابوالکلام پڑ گیا۔

(۴) مولانا مودودی رحمہ اللہ اس بزرگ نے بھی اس سلسلہ میں کافی کام کیا ہے۔ ان کی تصانیف (جو کہ پورے ملک میں مشہور و معروف ہیں) ان کی اس محنت کا واضح ثبوت ہے اگر کوئی بے انصافی کرے یا تعصب سے کام لیتے ہوئے محض اس وجہ سے ان کی کتب سے استفادہ نہ کرے کہ مولانا کا اپنے آپ کو اہل حدیث نہیں کہلواتے تھے یا اس مسلک سے ان کا تعلق نہیں ہے، اس وجہ سے ان کی کتب کو زیر مطالعہ نہیں رکھتا تو انتہائی درجے کی تنگ دلی اور تنگ ظرفی ہوگی۔ عربی کا مقولہ ہے:

الحکمۃ ضالۃ المومن اور خذ ما صفا ودع ما کدر.

لہٰذا ان کی تصنیفات سے استفادہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی مسلکی اختلاف کی وجہ سے ان کی صحیح بات لینے میں عار محسوس کیا جائے۔ منصف مزاج، دماغی توازن پورا رکھنے والے لوگ کبھی بھی اس طرح نہیں کرتے۔ درحقیقت اگر انصاف سے کام لیا جائے تو مولانا مودودی رحمہ اللہ کی کتب میں (کتنی ہی باتوں کے غلط ہونے کے باوجود) کافی مفید معلومات موجود ہیں اور جدید حملوں کی مدافعت، جدید رنگ میں ان کی تالیفات کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ایک غیر جانبدار اور غیر متعصب ان سے بڑے فائدے حاصل کر سکتا ہے ان کی تفسیر اور کچھ رسائل اردو اور انگریزی نہایت ہی مفید ہیں۔

(۵) مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کی تصانیف بھی بہترین ہیں اس موضوع میں کافی ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے، حضرت مولانا کو تمام مخالفین کے ساتھ تحریر و تقریر اور روبرو کامیاب مناظرے اور مخالفین کو شکست دینے کا ملکہ خود اللہ نے عطا کیا تھا۔ وہ بیک وقت شیعہ، عیسائی، قادیانی، چکڑالوی، نیچری، اور آریہ سماج وغیرہم سے مقابلے کرتے چلے آرہے تھے اور اللہ کے فضل سے ہر موقع پر کامیاب ہو کر آرہے تھے اور مد مقابل کو شکست سے دوچار کرتے رہے (وذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء)

میری ان کے ساتھ انگریز کے دور میں امرتسر میں ملاقات ہوئی تھی اور بہت زیادہ عزت دی۔ مولانا مہمان نواز، خوش طبع، بلند اخلاق اور اعلیٰ علمی مقام پر فائز تھے۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ، بہرکیف ان کی

تصانیف اس سلسلے میں کافی وشافی کاوش ہے۔اور بڑی بات کہ مولانا کی کتب میں ایسے مزاح اور لطائف بکھرے ہوئے جن کے پڑھنے سے قاری خوب محظوظ ومسرور ہوتا ہے، تاہم ان کی تصنیف جدید رنگ کی آمیزش کے باوجود کافی حد تک قدیم معقولات ومنطق پر مشتمل ہے بہر حال مولانا صاحب کو اور ان کی تصنیف کو آج کل کے جدید علمائے کرام وجدید تصنیف کی لسٹ میں کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

(۶) آخر میں ایک مصنف کا ذکر کرتا ہوں جو پہلے یہودی تھے بعد میں اللہ کی طرف سے مہربانی ہوئی اور وہ اسلام کے سائے میں جاگزیں ہوئے۔ان کے تمام کتب انگریزی میں ہیں، ایک کتاب کا نام ہے۔ Islam of th Croos Roads یعنی اسلام کا راہی ہوں۔جس میں انہوں نے اسلام قبول کرنے کے قصہ کو بھی نقل کیا ہے۔دوسری کتاب ہے(Road to mecca) مکہ کی طرف راستہ۔تیسری کتاب ہے: (The principles of state and Governament in Islam) یعنی اسلام میں، حکومت اور ریاست کا اصول۔اس مصنف نے بھی اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے میں کافی محنت کی ہے۔ان کی مذکورہ کتب نہایت ہی قابل دید ہیں۔آخر میں اتنا عرض کیا جاتا ہے کہ ذکر کردہ تمام مصنفین اور ان کی تصنیفات سے یہ اندازہ لگانا صحیح نہیں ہے کہ میں نے ان تمام باتوں سے اتفاق کیا ہے بلکہ کئی باتیں جو ہماری نظر میں صحیح نہیں ہیں مگر بات دراصل یہ ہے کہ خطا زیادہ ہے یا اصابت زیادہ ہے علاوہ ازیں (خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ) کے اصول پر چل کر ہی استفادہ کیا جائے۔چونکہ آپ نے سوال کیا تھا۔جس کا جواب تو دینا تھا۔اس لیے جو بھی لکھتے وہ میری نظر میں بہترین تھے وہ عرض کردیئے ممکن ہے کہ کسی کو میرے ساتھ اتفاق نہ ہو۔﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف: ۵۳)

سوال ۷: علمی، فکری اور دینی محاذ پر انکار حدیث، مغربیت، عقلیت، قادیانیت اور عیسائیت کے احتساب کے لیے متلاشی حق کو کون سی کتب درکار ہیں؟

جواب: اس سوال کے متعلق سوال نمبر ۶ کے جواب میں ضمناً عرض کر چکا ہوں۔مزید بھی کچھ تحریر کررہا ہوں کہ عربی میں مذکورہ باتوں کے لیے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''الجواب الصحیح'' یا امام ابن قیم رحمہ اللہ ہدایۃ الحیاریٰ اور ابن حزم کی کتاب المفصل فی الملل والنحل اور آج کل کے علماء کرام میں سے علامہ احسان الٰہی ظہیر، ایڈیٹر ترجمان الحدیث کی قادیانیت پر عربی میں لکھی ہوئی کتاب (جو آج کل اردو زبان میں بھی ترجمہ ہو کر میسر ہے) جو ان کی اصلیت ظاہر کرتی ہے، یہ بلند پایہ کتب ہیں، لیکن عربی میں ہیں۔باقی اگر اردو میں دیکھا جائے تو مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کی تصنیف نہایت کارآمد ہے۔ایک حق کے متلاشی کے لیے نہایت ہی ضروری ہے کہ اس کے پاس مولانا کی تمام کتب کا مکمل سیٹ ہونا چاہیے، اسی طرح دوسرے نمبر پر مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمہ اللہ کی تصانیف بھی بے حد مفید ہے، خاص طور پر ان کی کتاب (الشہادۃ القرآن) دو جلدوں میں قادیانیت کے رد میں نہایت ہی قابل دید کتاب ہے۔مولانا کے اور بھی دوسرے چند رسالے قادیانی دعواؤں کے رد میں ہیں، وہ

سارے کے سارے از حد مفید ہیں۔ باقی مغربیت اور اس کے افکار کے تنقیدی تجزیے کے لیے وہ کتابیں مفید ہیں جن کا تذکرہ سوال نمبر ٦ کے جواب میں ہوا۔

انکار حدیث کے فتنے کی مدافعت کے لیے مولانا سید مسعود احمد صاحب اور زید مجدۃ بھی اچھا کام کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ اللہ ان کو اور توفیق دے۔ (اللھم آمین)

عربی میں بھی کچھ رسائل اور کتب ہیں جن میں ان تمام احادیث کا کامیابی سے جواب دیا گیا ہے جن پر منکرین حدیث اعتراض کرتے ہیں۔ جن میں کچھ ہمارے پاس بھی موجود ہیں لیکن مولانا مسعود رحمہ اللہ کا رنگ ہی نرالہ ہے۔ ان کی کوشش آج کل کے دور کے لحاظ سے نہایت کامیاب ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی اہل حدیث علمائے اس موضوع پر کام کر رہے ہیں اور جو اعتراضات اسلام اور قرآن وحدیث پر کیے جا رہے ہیں ان کے بہترین جوابات دے کر اسلام کی مدافعت کا کام بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ عالم اسلام کو درپیش مسائل کا جواب اور دینی خدمات اپنی حیثیت کے مطابق سرانجام دے رہے ہیں لیکن چونکہ ان کی تصنیفات اتنی مستقل تصنیفات نہیں ہیں کہ جن کا تفصیلاً تذکرہ کیا جائے۔ حنفی دیوبندی مکتبہ فکر کے علمائے کرام میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کی بھی چند کتب عیسائیت اور آریہ سماج کے رد میں لکھی گئی ہیں یا جو ان کے ساتھ مناظرے ہوئے ہیں وہ قلم بند کیے گئے ہیں۔ مولانا موصوف نے جو ان کے رد میں کتاب لکھی ہیں وہ تو بلاشبہ نہایت مفید ہیں۔ جن کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔ (١) مباحثہ شاہجہان پوری (٢) قبلہ نما (٣) تقدیر دلپذیر (٤) جواب ترکی بترکی وغیرہم یہ ساری ہمارے پاس موجود ہیں۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر ثنائی میں ان کے افکار جابجا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور اعداء اسلام کے اعتراضات کا کافی وشافی جواب دیا ہے۔

سوال ٨: **مسلم امت خصوصاً اہل حدیث کے انتشار واختلاف اور فتویٰ بازی کا کیا سبب ہے؟ اور کیا اس مصیبت سے آزاد ہونے کا کوئی راستہ ہے؟**

جواب: اصل بات یہ ہے کہ اس وقت مسلمہ امت کا اکثر حصہ صحیح معنی میں اسلام کا پیروکار نہیں ہے۔ اسی طرح اہل حدیث میں بھی کتنے ہی ایسے ہیں جو صرف لقب (اہل حدیث) تک محدود ہیں۔ گویا مردم شماری کے اعتبار سے تو مسلمان کروڑوں کی تعداد میں ہیں لیکن اگر بیٹھ کر ان کا احتساب کیا جائے یا اسلام کی مقرر کردہ کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی جائے تو کروڑ تو دور کی بات ہے ہزاروں کی تعداد بھی بمشکل ملے۔ ہمارا دین، اتحاد، اتفاق، محبت، الفت خیر خواہی، بھلائی اور بہبودی میں ہمارا کفیل اور ضامن ہے۔ عملاً دنیا نے مشاہدہ کیا کہ جب تک مسلمانوں نے اسلامی اصول کی کماحقہ پیروی کی۔ کتاب وسنت کے متبع رہے۔ تب تک وہ ترقی اور عروج پر رہے، سب کی ایک ہی بات تھی۔ کوئی کسی کا بدخواہ نہیں تھا خود قرآن گواہ ہے۔ ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ، وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ اور ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى

الْكٰفِرِيْنَ﴾ کے مصداق تھے مگر جب وہ اپنے اصل مرکز سے ہٹ گئے۔ان کے دلوں میں اسلامی تعلیمات کے لیے سابقہ جوش وجذبہ نہ رہا، عملاً کتاب وسنت کی پیروی سے پیچھے ہٹ گئے جس کا لامحال نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آہستہ آہستہ صحیح راستے سے ہٹتے چلے گئے۔آج ایک بات، کل دوسری بات، پرسوں تیسری بات بعینہٖ اسی طرح اسلام کا کافی حصہ عملاً متروک کرتے چلے گئے۔جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ غیر اسلامی اور ملحدانہ افکار آگے آنے لگے اور مسلمان اس کا شکار بنتے چلے گئے۔صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے ہر ایک اپنے آپ کو خودسر سمجھنے لگا۔ایثار و قربانی کا مادہ کم ہونے لگا اور اس کی جگہ خودغرضی اور مطلب پرستی آنے لگی۔خدمت خلق کا جذبہ معطل ہوگیا خود مخدوم اور دوسروں کو خادم بنانے کا شوق چھا گیا۔اقتدار کا نشہ اتنا غالب آیا کہ ہر طاقت میں آیا ہوا فرد (انــا و لا غیــری) کا نعرہ بلند کرنے لگا۔امیر یا صدر بننے والا اپنے آپ کو خادم سمجھنے کے بجائے۔حاکم مطلق سمجھنے لگا آخر نتیجتاً اقتدار کے حصوں پر رسہ کشی شروع ہوگئی، یہ امت مسلمہ کی مجموعی حالت عرض کی ہے جس سے آپ یہ اجزائے فساد منتخب کرسکتے ہیں۔

(۱) اسلام کے اصول سے انحراف (۲) خودغرضی (۳) ایثار وقربانی کا فقدان (۴) اقتدار حاصل کرنے کا شوق (۵) خادم کے بجائے مخدوم بننے کی خواہش یہ باتیں جیسے ہی بڑھتی گئیں نتیجتاً بے اتفاقی، بدخواہی، انتشار خود پسندگی، فتویٰ بازی، پیدا ہوکر ایک درخت عظیم بن گئیں۔جس کو اب آسانی سے ہٹانا بہت مشکل ہے۔جس کے ہٹانے کے لیے اسلامی جہادی ٹریکٹر لانا چاہیے لیکن اس ٹریکٹر یا بلڈوزر کو چلانے والا ڈرائیور یا مکینک بھی ایسا ہونا چاہیے جو خالص اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہو۔کفر اور شرک و بدعت سے حد درجے کا متنفر ہو۔جذبہ جہاد سے ایسا سرشار ہو کہ دوسری بات ہی نہ لے۔لیکن ایسے شخص کی دستیابی کے ابھی تو صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں باقی عملاً کیا ہوگا۔اس کا کوئی پتہ نہیں، قدرت کو ہم عیب داروں کے لیے کیا منظور ہے۔(اللھم اغفرلنا وارحمنا)

بس جماعت اہل حدیث (خصوصی طرح) کو بھی اس پر قیاس کریں۔آج کل للّٰہیت نہیں رہی، اقتدار کی بھوک بڑھ گئی ہے، ہر کوئی چاہتا ہے کہ میں بڑا ہوں یا کم از کم مجھے کسی پوزیشن پر ہونا چاہیے۔امیر یا صدر بنوں۔ وزیر اعلیٰ یا ناظم اعلیٰ کی کرسی میرے پاس ہونی چاہیے۔اس سے کم پر قناعت گویا کہ ہم سیکھے ہی نہیں ہیں۔حالانکہ اسلام کی تعلیمات کے بموجب عہدہ کے خواہش مند یا طالب کو کوئی عہدہ نہیں دیا جائے۔جس کا بیان احادیثوں میں موجود ہے۔جس سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ آخر اقتدار کے حصول کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی ہے یا نہیں؟ اور اس کا نتیجہ کیا نکلا اس سے آپ بخوبی آگاہ ہیں۔خود پسندی اتنی تو بڑھ گئی ہے کہ بعض علمائے اہلحدیث کی کئی تحریر یا مضمون پر اگر نیک نیتی سے تنقید یا تبصرہ کیا جائے تو اس پر وہ حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کے بجائے وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ فلاں کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اس پر تبصرہ یا تنقید کرے۔قوم عاد کی طرح اپنے بارے میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بس ہمارا لکھا آخر ہے یا مثل وحی ہے جو ہرگز غلط نہیں ہوسکتا۔لہٰذا جس نے

بھی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ان پر قلم اٹھایا ہے وہ ہی قابل گردن زنی ہے، بس پھر تو بیچارے کے اوپر بے جا اور غلط الزامات کی بھرمار شروع ہو جاتی ہے حتیٰ کہ وہ اپنی تحریر سے خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میں حق پر ہوں۔ بس یہی باتیں ہیں جس کے نتیجہ میں یہ فتویٰ بازی اور ایک دوسرے کی رگلا، غیبت، اتہام، دشنام طرازی اور بیہودہ بکواس ملک بھر میں چلتی رہتی ہے اور انتشار کا ایک ایسا طوفان برپا ہو جاتا ہے جس میں ہر کوئی تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے اور پھر اس ہمہ گیر آگ میں سوکھوں کے ساتھ ہرے بھی جل جاتے ہیں۔ کیا اس بارے میں اور بھی تفصیل کی ضرورت ہے؟ عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔

خلاصہ کلام کے موجودہ انتشار کے چند اسباب یہ ہیں (۱) صحیح اسلام سے ہٹ جانا۔ (۲) اخلاص اور بے لوث خدمت سے دلوں کا خالی ہونا۔ (۳) حصول اقتدار کی خواہش۔ (۴) خودغرضی اور خود پسندی۔ (۵) ایثار وقربانی کا ہمہ گیر فقدان۔

امید ہے کہ آپ کے لیے یہ کافی ہوگا۔ باقی اس خلفشار سے آزادی کا راستہ بالکل صاف ہے، مذکورہ باتوں کے برخلاف جو حقائق ہیں اس پر عمل پیرا ہونے سے سارا معاملہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔

(۱) اسلام کے حصول کی صحیح پیروی اور کتاب وسنت سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ (۲) حصول اقتدار کے بجائے خدمت خلق کا جذبہ دامن گیر ہونا چاہیے۔ (۳) خودغرضی اور خود پسندی کے بجائے اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھے، اپنے آپ کو خطا اور نسیان کا گھر سمجھے، تواضع اور انکساری سے اپنے آپ کو مزین کر دے، ہر معاملہ میں اخلاص مدنظر ہونا چاہیے۔ نیت خالص ہونی چاہیے۔ خدمت محض للّٰہیت خاطر ہو کسی اور سے معاوضہ یا اجر کی امید نہ رکھے محض اللہ سے جزا کی امید رکھے۔ (۵) جس جگہ یہ نظر آئے کہ یہاں پر میرا کام نہیں ہوتا یا میرے مفاد کے لیے کام نہیں ہو سکتا ہے اور میری ضرورت پر ضرب لگ سکتی ہے لیکن دوسرے مسلمان بھائی کا بھلا ہو سکتا ہے تو وہاں پر ایثار وقربانی سے کام لینا چاہیے۔ یہ ایسے اصول ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ پھر دیکھو ایک بہترین اور سنہری دور واپس آ سکتا ہے یا نہیں؟ اس نسخہ سے سو فیصد کامیابی مل سکتی ہے لیکن تجربہ شرط ہے۔ ہے کوئی عمل کرنے والا۔ (فھل من مدکر)

سوال ۹: نوجوان طبقے میں کم نظری سے اسلام سے بیزاری، اخلاقی انحطاط کے کیا اسباب ہیں؟ اور اس بیماری کی اصلاح کا کیا علاج ہے؟

جواب: اس سوال کے جواب کے لیے تفصیل کی ضرورت ہے۔ ہماری نئی نسل کی اخلاقی انحطاط کے راقم الحروف کی نظر دو سبب ہیں: (۱) موجودہ تعلیمی نظام اور تربیتی سرشتہ۔ (۲) جنسیت اور مرض یہ دوسرا سبب نہ صرف نوجوان طبقہ کی بے راہ روی کا سبب ہے بلکہ اس سے ساری قوم کا مجموعی لحاظ سے بیڑہ غرق ہو رہا ہے۔ جس کی تفصیل آئندہ آ رہی ہے۔ جہاں تک تعلیمی سسٹم کا تعلق ہے وہ بغیر خوف وخطرہ کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظام اور

اسلامی روح کے لیے زہر قاتل ہے، ہماری ملی خصوصیات اور امتیازیات کے لیے T.B اور جذام وغیرہ جیسی مہلک بیماریوں سے بھی زیادہ تباہ کن ہے ہمارے قومی تقاضوں کے خلاف ہے۔ درحقیقت تعلیمی نظام انگریزوں نے محض اپنی ذہنی غلامی کا کھیپ تیار کرنے کی غرض سے ہمارے ملک میں رائج کیا۔ کالجز اور یونیورسٹیز کو ایسے ذہنی غلاموں اور مغرب پرست پٹھو کی تیاری کے لیے ملز اور کارخانے بنا دیئے۔ مرحوم اکبرآبادی نے کیا سچ کہا ہے ؏

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کے فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یعنی فرعون نے بنی اسرائیل کو ہمیشہ غلام بنانے کے لیے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کرواتے تھے اور بچیوں کو زندہ رکھتے تھے حالانکہ اگر فرعون کو معلوم ہو جاتا کہ ان کا یہ مقصد کالج کھولنے سے پورا ہو جائے گا، تو وہ بچوں کو قتل کرنے کا یہ سیاہ دھبہ اپنے اوپر نہ لیتا۔ کیونکہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی بچ جائے تو اور کیا چاہیے۔ مگر چالاک انگریز نے یہ سوچی سمجھی اسکیم نکالی جس نے چپ چاپ پوری قوم کو یک قلم ذہنی بنا دیا اور ربع صدی گزرنے کے باوجود پاکستان کے رہوا اسی لیول پر کھڑے ہیں جہاں پر ۱۹۴۷ء سے پہلے تھے مغربیت ان کی معراج ہے، جو ان کی ہر رگ و پے میں سرایت کرگئی ہے آج تک وہ پوری طرح انگریزوں کی نقالی میں پاؤں سے لے کر سر تک رنگ چکے ہیں جس میں چالاک اور فریبی انگریز ان کو ایک مرتبہ رنگ کیا ہے تہذیب وتمدن وہی ہے۔ ثقافت وکلچر وہی ہے، سیرت وصورت میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ قانون اور دستور العمل بھی انگریزوں والا ہے۔ چال چلن میں بھی مغربی قوم کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے۔ اپنی ہر چیز کے بارے میں وہ احساس کمتری کا شکار ہیں۔ انگریزیت ہی ان کے لیے روشنی ہے۔ کتاب وسنت کے اٹل اصول ان کے یہاں ناقابل عمل ہیں بلکہ وہ ان کے نزدیک دقیانوسیت کے یادگار ہیں بلکہ کچھ تو ان کو بربریت اور وحشی دور کے یادگار قرار دیتے ہیں، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ اللھم اغفر لنا وارحمنا.

نیز جس انداز میں تعلیم دی جاتی ہے یا جو تعلیم دی جاتی ہے یا جس ماحول میں دی جاتی ہے۔ اس سے ہماری نئی نسل کے شاگرد مستقبل کے زمیندار بننے والے صرف ایکٹر، ڈراماسٹ محض گویا، ڈانسر اور بدترین قسم کے فریبی اور دغہ باز۔ عزیز اور گہرے دوست سے بے وفائی کرتے اور اس کی عزت لوٹنے کے لیے مکمل تیار ہوتے ہیں۔ جھوٹی اور منافقانہ محبت کے لاڈلے، ماڈرن لیلیٰ مجنوں بن کر ان بداخلاق فیکٹریوں سے باہر آتے ہیں۔ جنسی بداخلاقی کے متعلق (تعلیمی نظام) کے اور دوسرے سبب کی تفصیل بیان کرتے وقت عرض کروں گا۔ آپ خود سوچیں کہ ایسے ماحول سے تیار ہونے والے نوجوان ڈانسر، ایکٹر اور فرسٹ قسم کے بدکار اور بے ہودہ افراد بن کر نکلیں گے یا محمد بن قاسم، محمود غزنوی یا خالد بن ولید سیف اللہ جیسے مجاہد اور ملک وملت اور دین کے خادم بننے والے بنیں گے؟ اس سوال کا جواب بالکل ظاہر ہے۔ اس وقت ہمیں مجاہدین کی ضرورت ہے، ملک ومملکت کے لیے بے لوث خادموں

کی ضرورت ہے۔ تاریخ گواہ ہے۔ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرتے رہے ہیں کہ کبھی کسی گویائی یا ڈانسر نے کوئی ملک فتح نہیں کیا اور نہ ہی وہ اپنے ملک اور مذہب کی مدافعت کر سکے۔ ایسے لوگ سراسر بزدل، کم ہمت، عزم کی پختگی سے عاری حوصلہ اور اولوالعزم سے یک قسم محروم ہوتے ہیں حالانکہ یہ اوصاف ان لوگوں کے لیے ضروری ہوتے ہیں جو ملک وملت کے بچاؤ کے لیے سردھڑک کی بازی لگانے میں کوئی کسر نہیں اٹھار کھتے۔ اور وہ لوگ جو طبلی کی ناچ ناچنے والے ہیں یا پازیب کی آواز پر بے خود ہونے والے ہیں یا صبح شام، دن ورات صرف فلمی گانے سنتے رہتے ہیں ان لوگوں میں تلوار کے چمک کی تاب سمجھنے کی دہشت کہاں سے آئے گی اور دل دھلوانے والے ایسڈ یا ہائیڈ روجن بموں کے دھماکوں کی آواز سننے کی طاقت کہاں سے آئے گی۔ خوفناک اشیاء کا صرف تذکرہ ان کے حواس کو باختہ کر دیتا ہے ان کے ذہن ودماغ کو معطل کر دیتا ہے۔ سوچ وفکر کو مقفل بنانے کے لیے کافی ہے۔ چہ جائیکہ وہ ان ہنگاموں اور دھماکوں کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ وہ عام حالات میں نبی ﷺ کے دور کی جنگوں کے بارے میں سنتے ہیں یا سینما کے پردہ پر جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی نقالی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ دیکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ یہ بڑے بہادر ہیں۔ نازک مرحلہ پر اور کٹھن موقع پر آر پار ہونے والے ہیں۔ مگر جب جنگ کی حالت پیدا ہو جائے کہ بم برس رہے ہوں، ٹینکوں کی بھاگ دوڑ ہو تو میدان سے ایسے غائب ہو جاتے ہیں جس طرح گدھے کے سر سے سینگ یہ منظر ہی ان کے لیے دل دہلانے والا ہوتا ہے مطلب کہ جن تفریحات اور لغویات میں ہمارے نوجوان مبتلا ہیں انہوں نے ان کو بالکل ناکارہ بنا دیا ہے ہمت وحوصلہ کا نام ونشان باقی نہیں رہا۔ کالجز اور یونیورسٹیز میں اکثر وہ استاد، ٹیچر، لیکچرار اور پروفیسر ہوتے ہیں جو اسلامی تعلیم کے زریں اصول سے پھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ الا ماشاءاللہ

اس لیے طلباء وطالبات کے ذہنوں کو، دل ودماغ کو الحاد اور زندیقت کے زہر سے بھرتے رہتے ہیں، تعلیم کا رنگ روپ ہی ایسا ہوتا ہے اکثر طلبہ وہاں سے اسلام کے مخالف ہو کر نکلتے ہیں۔ اور پھر اعلیٰ تعلیم اور نام نہاد ترقی کے لیے مغربی ممالک گئے تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی کیونکہ جن مستشرقین کے آگے بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ اسلام کے پکے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ طلباء کو کون سی پٹیاں پڑھائیں گے، اس سے ہر کوئی واقف ہے بہر حال ایک تو کالج اور یونیورسٹیز کا ماحول بھی ملحدانہ ہوتا ہے اور دوسرا ان کے کئی اداروں میں مخلوط تعلیم کا مرض، پھر خود سوچو کہ ایک طرف آگ جل رہی ہو اس کے قریب میں پیٹرول کا ڈرم رکھا جائے تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ کیا میرے اس معقول مثال کی وضاحت ضروری ہے؟ اور دوسری بات ان اداروں میں ڈرامیں ہوتے ہیں جن میں طلباء طالبات پارٹ لیتے ہیں اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ وہ بھی واضح ہے اور اوپر سے ثقافتی شو کی بڑی محفلیں ہوتی ہیں۔ پھر کیا ہوتا ہے اور انسان کی دل پر کیا گذرتا ہے وہ نا قابل بیان ہے، اس کے بعد جو تعلیم ہوتی ہے وہ بھی سراسر دنیاوی نقطہ نظر پر مبنی ہے۔ آخرت، روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے، صرف مادیات تک محدود ہوتی ہے، لہٰذا

ان اداروں کا کامیاب شاگرد دنیا سمیٹنے، دھوکہ فریب، عیش وعشرت میں محور رہنے کے ہی گُر جانتا ہے اور انہی فنون میں مہارت رکھتا ہے گویا ایک طرف M.A یا M.A.C ہو کر نکلا تو دوسری طرف فریب اور دغا بازی میں بھی ماسٹر بن کر نکلا۔ (الا ماشاء اللہ)

یعنی ان کی اصل ڈگری یا ڈپلوما صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ دنیا سازی میں کتنا ماہر ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگریز اس تعلیمی سرکشی کو رائج کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جواب بالکل ظاہر ہے کہ حکومت کو قبضے میں کرنے کے بعد انہوں نے عہدے دینے کے لیے یہی حربہ استعمال کیا کہ جو ان کی زبان کا ماہر ہوگا اس کے لیے نوکری اور ملازمت کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے اور کلیکٹر، چانسلر، کمیشنر اور گورنر بن سکتا ہے۔ یہ لالچیں کوئی کم اہمیت کی حامل نہیں تھیں۔ یہ بڑے بڑے عہدے دیکھ کر کئی لوگوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور انہوں نے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس ممبر شپ کے لیے دستیاب کرایا اور جیسے جیسے خاندانوں کے خاندان اس مگر مچھ کے کشادہ منہ میں چلتے گئے ویسے ویسے ان کی شخصیت اور ممتاز ہستی ان کے اساتذہ (انگریزوں) کی ہستی میں مدغم ہوتی چلی گئی اور آئندہ کے لیے انگریزوں کے جانشین پیدا ہوتے چلے گئے گویا کہ انگریز گئے ہی نہیں، انگریزوں نے اس سرشتہ جو مسلمان کی ہستی کو مٹانے کے لیے بے ضرر ہتھیار تھا کا نام تعلیم رکھا، ظاہر ہے تعلیم کی کوئی مخالفت نہیں کرے گا۔ اگرچہ جو لوگ حقیقت بین اور رمز شناس تھے انہوں نے اس وقت ہی چالاک انگریز کی سازش کو بھانپ لیا تھا لیکن وہ تھوڑے تھے اس لیے ان کی کون سنتا تھا مثال مشہور ہے۔ ''نقار خانہ میں طوطے کی آواز کو کون سنتا ہے۔'' اور ان کو دقیانوسی تہذیب وتمدن کا دشمن اور نئی روشنی (جاہلیت میں ظلمت تھی) کا مخالف قرار دیا گیا یہی وجہ ہے کہ دنیا نے ان کے انتباہات کو کوئی اہمیت نہیں دی ان کی نصیحت اور خیر خواہی کی آواز کو خرافات کا پلندہ تصور کیا گیا جس وجہ سے ان کی آواز حق اور صدائے حق نظر انداز ہوتی چلی گئی۔ اور دوسری بات کہ انگریزوں نے جو نام نہاد ادارے قائم کیے ان میں جو بھی دلفریب رنگینیاں تھیں ان سے ہمارے پرانے مدارس خالی تھے اور انسان ظاہری رنگ روپ پر موہ جاتا ہے جس وجہ سے ان اداروں کی رنگینیاں سادہ لوح انسان کے لیے کشش کرنے میں سو فیصد کامیاب رہیں اور ان کا چاہ اس طرف بڑھتا گیا ویسے بھی عربی کا مقولہ ہے:

كُلُّ جَدِيْدٍ لَذِيْذٌ.

''ہر نئی چیز لذت والی ہوتی ہے۔''

اگرچہ وہ پہلی چیز کے مقابلے میں گھٹیا ہی کیوں نہ ہو مثلاً کوئی آدمی سالن اور چاول کھاتا رہے، پھر مہینے میں ایک مرتبہ دال مل جائے تو اس میں وہ بڑی لذت محسوس کرے گا۔ اس لیے یہ جانشین چیز نئی ہونے کے ساتھ ساتھ جاذب نظر آنے لگی۔ دلکش، دلفریب اور بے کود کرنے والی رنگینیوں سے پُر تھی تو وہ لاشعوری طور پر اس کی طرف مائل ہو گئے جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے، بس ایک مرتبہ پھنسنے کے بعد ان کے زلفوں کے بند ایسے نہ

تھے کہ آسانی سے ان کی الجھنوں سے نجات حاصل کی جاسکے۔ بہر حال یہ تعلیمی سرشتہ ہماری نئی نسل کو (۱) بے دینی کی تعلیم دیتا ہے۔ (۲) ان کو دنیاوی رنگینیوں میں رنگنے کی رہنمائی کرتا ہے۔ (۳) ان کو مادہ پرست بناتا ہے۔ (۴) ان کو فیشن ایبل بننے کا درس دیتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ ان اداروں کے شاگرد فیشن کے اتنے تو دلدادہ ہوتے ہیں کہ جو کوئی نیا فیشن نکلے گا اس کو اپنا لیتے ہیں چاہے وہ اخلاقی حدود سے گرا ہوا ہی کیوں نہ ہو، اس کو ضرور اختیار کریں گے۔ بالآخر وہ ان کو ہمیشہ انگریزوں کا ذہنی غلام بنالیتا ہے۔

تنزل اور انحطاط کا دوسرا سبب جنسیت کا مرض ہے۔ یہ مرض اتنا مہلک ہے کہ اس کی ہلاکت کی حدود کو ناپنے کے لیے کوئی آلہ ہی ایجاد نہیں ہوا ہے۔ جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کا فرمان ہے: مجھے اپنی امت کے مردوں پر سب سے زیادہ ضرر اور نقصان کا اندیشہ صرف عورتوں سے ہی ہے۔ (یہ حدیث صحیح ہے) پس اگر آج کل کی دنیا کا تجزیہ کیا جائے تو نظر آئے گا کہ ہماری ہر بات، ہر معاملہ، ہر ارادے، ہر نیت، ہر صورت وسیرت دل ودماغ، ذہن وفکر مطلب کہ زندگی کے ہر شعبے میں عورت ہی چھائی ہوئی ہے یعنی کوئی بھی کام صرف اسی نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے کہ یہ کام جنسی لطف میں کتنا مائل اور راغب کرسکتا ہے!! گویا آج کل کی نسل کا نصب العین صرف اور صرف جنس لطیف ہی ہے۔ جو بات یا عمل اس زاویہ نگاہ کے منحرف ہے وہ سننے یا سوچنے کی ہمت ہی نہیں ہے، میں آپ کے سامنے مثال پیش کرتا ہوں لیکن وہ جو میرے مشاہدہ میں آئی ہیں، صرف سنی سنائی بات پر اکتفا نہیں کی جائے گی۔

داڑھی کیوں منڈوائی جاتی ہے؟ اس لیے کہ یہ جنس لطیف اور صنف نازک کو ناگوار گذرتی ہے۔ ٹیڈی لباس اور پپی رنگ کا رواج کیوں بڑھتا جارہا ہے؟ کیونکہ وہ صنف نازک کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ اوطاق پر جاؤ تو وہاں کی دیواریں حسین وجمیل عورتوں کی تصاویر سے مزین نظر آئیں گی۔ کوئی دکان یا شاپ اور مرکزی تجارت گاہ اس وقت کامیاب تجارت کا اڈہ نہیں بنے گی جب تک وہاں اس جنس کی تصاویر یا مجسمے نصب نہ کیے جائیں۔ دار اللباس جائیں گے تو وہاں عورتوں کا پورا مجسمہ فٹ نظر آئے گا جس میں عورت کا نمایاں خدوخال سینے کا ابھار پوری طرح نمایاں ہوگا جس کو کوئی ڈیزائن پسند ہوگی وہ اس پر پہنی ہوئی ہوگی، بازاروں اور ایسی جگہوں کی رونق اس صنف نازک کی وجہ سے قائم ہے اگر ان کو روک دیا جائے تو تمام رونقیں ماند پڑ جائیں اور کوئی مرد وہاں نظر نہ آئے گویا بازاروں کی رونقیں اسی جنس کے لیے دم خم پر قائم ہیں تفریح گاہوں کے اہم عنصر وہی زہر شکن جنسیں ہیں۔ میلوں، قبرستان، زیارت گاہوں کو دیکھو وہاں رونق کا باعث عورت ذات نظر آئے گی اگر عورت کو یہاں سے ہٹایا جائے تو یہاں پر خاک اڑتی نظر آئے گی۔ سینما میں وہی فلم کامیاب ہوگی جس میں عشق محبت کی چاشنی عروج پر ہو اور شہوتی جذبات ابھارنے والے گانے ہوں اور بوس وکنار کی بھرمار ہو۔ اگر بالفرض عام فلم محض تعلیمی نقطہ نگاہ موجب تیار کی جائے تو پروڈیوسر کے فائدے کو تو چھوڑ و معمولی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوگا کرکٹ

وغیرہ کے کھیلوں میں بھی یہی نقطہ نظر ہوتا ہے، کھلاڑی اپنی گیم کے فن کے ذریعے جنس لطیف کو اپنی طرف کرتا ہے۔
ملک میں کتنے ہی ہوٹل ایسے ہیں جن میں رہنے والوں کی سروس (Service) کے لیے (عورتیں) لڑکیاں رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ کن میں تو کیبریٹ (Cabarat) بھی ہیں جن میں کئی بے حیائی کے کام اور کرتب دکھائے جاتے ہیں، نیم عریانہ ناچ (Naket dance) دکھایا جاتا ہے کیا بداخلاقی کی اس سے بھی زیادہ کوئی حد ہے؟!!

کتنے ہی آفیسر طبقے اور بڑے بڑے لوگوں کی پرائیویٹ سیکرٹریز بھی عورتیں ہوتی ہیں، کتنے ہی آفسوں میں خصوصاً کراچی، لاہور، اسلام آباد، پنڈی، گجرات، گوجرانوالہ، فیصل آباد وغیرہ میں اور باقی اس طرح کے بڑے بڑے شہروں میں اور بڑے بڑے بینکوں میں اکثر عورتیں ہی ملازمت کر رہی ہیں۔ ہماری اسمبلیوں کی کارروائیاں تب مؤثر ہوں گی یا اجلاس تب چلے گا جب اس کو رونق بخشنے کے لیے ممبر عورتیں موجود ہوں۔ پرانے زمانے میں ڈپٹی اسپیکر یہ عورت ہوا کرتی تھی اور پھر خود اسپیکری منظور نظر کے لیے اس کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑے گا اس کا بھی اندازہ ہونا چاہیے۔ اس وقت کیا حالات ہیں؟ اس بارے میں پتہ نہیں ہے لیکن بہرحال ممبر عورتوں کی موجودگی لازمی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ہوائی جہاز کی سواری کرتا ہے تو جہاز کے دروازے پر اس کے استقبال کے لیے ایک یا دو ائیر ہوسٹس دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ موجود ہوتی ہیں اور آخر تک اس کی خدمت پر مامور ہوتی ہیں اور کئی عیاش طبقے کے لوگ ان رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہوائی جہاز کا بار بار سفر کرتے ہیں۔ اور کوئی زیادہ متول آدمی ہے تو اپنی ملکیت اور حیثیت کی نمائش کے ذریعے ان ہوائی خادمان میں کسی ایک کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے اور اس کے ساتھ ناجائز تعلقات بھی قائم کر لیتا ہے۔ اصل مقصد ہے عورت کے ذریعے اپنے کاروبار کا عروج تاکہ گاہکوں میں اضافہ کیا جائے۔ گویا عورت کو اپنی کمائی کا آلہ کار بنایا گیا ہے اور صنف نازک اپنی جہالت بے وقوفی اور احمق پن کے سبب یہ محسوس کر رہی ہوتی ہے کہ وہ ترقی کے معراج پر پہنچ چکی ہے اور اسی طرح وہ اپنی عصمت کے انمول ہیرے کو اپنے ہی ہاتھوں سے پاش پاش کر رہی ہے۔ بس یہ مزے اور لطف اندوزی کے اسباب جب لوگ دیکھیں گے تو بالا ولیٰ اور لامحالہ اس طرف اور اس سواری کی طرف زیادہ راغب ہوں گے۔ بڑے بڑے کرائے بھر کر بھی اس میں سفر کریں گے۔ اسی طرح ان سواریوں کے مالک اور ان کمپنیوں کے سربراہان کی پانچوں انگلیاں گھی میں۔ (اگرچہ سر جہنم میں کیوں نہ پڑ جائے) جہاز میں سفر کرنے والے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بے دین اور دنیا دار ہوتے ہیں۔ جن کو دین، مذہب، عصمت اور اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں لیکن کچھ ایسے لوگ بھی سفر کرتے جو دیندار ہوتے ہیں اور پوری کوشش کر کے اپنے آپ کو اخلاقی پابندیوں سے باندھ کر رکھتے ہیں۔ بے حیائی کے کاموں سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتے ہیں مگر خدارا یہ تو سوچو کہ اس جہاز میں بیٹھنے کے مشروب و ماکول وہی ہوائی خادمات لا کر دیتی ہیں اور بالکل ایسے جیسے کوئی محرمہ ہو، اجنبی کے جسم سے اپنا جسم مس کرتی رہتی ہیں بے حجابی اور بے غیرتی سے کوئی اجتناب نہیں کرتیں تو اس صورت میں کوئی کتنا بڑا زاہد، شب بیدار، بااخلاق دیندار ہو لیکن

اس کے دل میں کیا کیا جذبات اٹھیں گے اگر چہ وہ کوشش کر کے اپنے آپ کو بچائے لیکن کم از کم آنکھوں کا بند کرنا تو از قبیل محالات ہے، یعنی ان اجنبیات کی طرف دیکھنے سے اپنے آپ کو بچانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اسی طرح غیر ممالک کی (فارمین ایکسچینج) ردوبدل کے لیے مسافروں کو بینکوں میں جانا پڑتا ہے اور وہاں بھی جنسی لطف کی ایسی بھرمار ہے کہ الامان والحفیظ۔ اور ناممکن ہے کہ کوئی ان کو دیکھنے سے اپنے آپ کو بچا سکے اگر چہ کتنا بڑا زاہد ہی کیوں نہ ہو۔ سوچنا چاہیے کہ قرآن کیا کہتا ہے:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ (النور: ۳۰)

لیکن ان حالات میں اس امر کی تکمیل کس طرح کی جائے؟ ایک دیندار آدمی کو دوسرے ملک کی طرف تبلیغ وغیرہ کی غرض سے سفر کی ضرورت پڑتی ہے یا فرض کریں کہ اور ممالک کی طرف نہیں تو حج کے لیے تو سفر کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کے لیے ان کو بینکوں کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ پھر بتائیں کیا کیا جائے؟ میں حج کا سفر کر کے آیا ہوں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے کہ کتنی مشکلات پیش آتی ہیں اس معاملہ میں کیا کچھ کرنا پڑتا ہے یا کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ایسی حالت تو انگریزوں کے دور میں بھی نہیں تھی۔ ایسی باتیں خصوصاً حج جیسے مقدس سفر کے لیے ہرگز پیش نہیں آتی تھیں مگر اس وقت پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کی دنیا ہی بدل گئی ہے اور کوئی بھی کام اگر چہ خدا تعالیٰ کا فرض ہی کیوں نہ ہو جب تک ان بیہودہ خرافات سے چار آنکھیں نہ کی جائیں تب تک اس کی تکمیل کو تو چھوڑو اس کے آغاز کا بھی تصور مشکل ہے اگر ہسپتالوں میں جائیں تو وہاں پر بیمار لوگوں کی تیمارداری اور ٹھل ٹکوں کے لیے نرسز موجود ہیں، کیا مریض کی خدمت کے لیے مرد مہیا نہیں ہو سکتے تھے؟ بالکل ہو سکتے تھے مگر اس کا کیا علاج کیا جائے کہ مرد ذات کے اوپر عورت پوری طرح سوار ہو چکی ہے۔ غالباً ۱۹۶۳ء کی بات ہے میری آنکھوں کی سفیدی پر گوشت چڑھتا گیا، کئی علاج کرائے گئے لیکن فائدہ نہیں ہوا بالآخر مجبوراً آپریشن کروانا پڑا جس کے لیے میں جامشورو کے سول ہسپتال میں داخل ہوا، وہاں پر ۲۱، ۲۲ دن گذارے۔ اس عرصہ کے دوران میں نے تجربہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ جس مرض کی خاطر مریض ہسپتال میں داخل ہوتا ہے اس سے چھٹکارا اس کو ملتا ہے یا نہیں لیکن اپنے دل کو ایسے مرض میں مبتلا کر کے باہر نکلتا ہے جس کا اثر شاید عرصہ بھر رہے۔ مگر جس کو اللہ تعالیٰ بچائے اور محفوظ رکھے۔ کچھ نرسیں تو عیسائی ہوتی ہیں جو جاہل اور کمزور ایمان والے مریضوں کے ساتھ میٹھی اور دلفریب باتیں کر کے اپنی چالاکی کے ذریعے مریض کے دل میں عیسائیت کا ایسا انجکشن لگا لیتی ہیں کہ مریض وہاں سے نکلنے کے بعد اپنا ایمان بھی وہاں چھوڑ کر نکلتا ہے۔ مریض اکیلا ہوتا ہے تو دن رات یہ زہریلی ناگنین اس پر چکر مارتی رہتی ہیں۔ مسخری مذاق کرتی رہتی ہیں حتیٰ کہ کئی دفعہ وہ اس کو دبا بھی لیتی ہیں پھر تو کچھ زندہ دل اور شاطر مریض حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو مذاق کے رنگ میں سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔ وہ بھی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو جاتی ہیں مجال کہ منہ بھی چڑا سکیں۔ مریض کو جو عزیز واقارب ایک مرتبہ صحت پوچھنے کی غرض سے آتے ہیں وہ یہی لطیفہ دہراتے

رہتے ہیں کہ ''ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی خواہش ہے۔''

اب آیئے کالجز اور یونیورسٹیز کی بھی خبر چار کریں ویسے مجھے کالجز اور یونیورسٹیز دیکھنے کا کافی مرتبہ اتفاق ہوا ہے۔ مگر ایم۔ اے کے پہلے سال میں چند دن با قاعدہ کلاسز بھی اٹینڈ کی تھیں جس وجہ سے جو کچھ بیان کرنے لگا ہوں وہ میرے مشاہدے کا نتیجہ ہے۔ یہ پہلے میں عرض کر چکا ہوں کہ اکثر کالجز اور تقریباً تمام یونیورسٹیز میں مخلوط تعلیم کا سسٹم رائج ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں آگ اور پیٹرول ملیں گے وہاں کیا کچھ ہوگا اس سے ہر کوئی سمجھ والا واقف ہے۔

مزید یہاں بیان کر دیتا ہوں کہ یونیورسٹیز میں جو بھی طالبات آتی ہیں وہ اول تو اپنے اندر دلکشی اور دل آویزی پیدا کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتیں۔ چہرے پر میک اپ، ہونٹوں پر لب اسٹک، چست لباس اور ایسی ڈریس جس سے پوری جسامت اور ان کے خدوخال پوری طرح نظر آ رہے ہوں۔ کچھ طالبات یونیورسٹیز کے احاطے تک تو برقعہ پوش ہوتی ہیں لیکن جیسے ہی کلاس میں داخل ہوں گی برقعہ اتار کر پورا منہ کھول کر بیٹھ جائیں گی، باہر برقعہ کرنے کا واللہ اعلم کیا مقصد تھا اور وہ طلباء اور طالبات کے ساتھ پوری بے حجابی کے ساتھ گفتگو کرتی رہیں گی بلکہ ان کے ساتھ خوش طبعی اور مذاق کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گی۔ یہاں اگر کوئی طالب علم حجاب والا ہوگا تو وہ بے حجابی میں گفتگو کرنے سے شرماتا رہے گا مگر طالبات کو کوئی حجاب نہیں ہوگا بلکہ از خود ایسے شرمیلے طالب علم کو لفٹ دینے یا بے حیا بنانے میں ایسا رول ادا کرتی ہیں کہ فلمی ایکٹرز بھی بھلے جا کر گھر بیٹھ جائیں اگر کوئی طالب علم ان کو پسند آ جاتا ہے یا کوئی نیا لیکچرار ابھی ابھی عہدے پر فائز ہوا ہے اور وہ خوبرو نوجوان ہے تو وہ بے حیائی کی ماڈلز خود ہی جرأت کر کے اس کو گلدستہ وغیرہ پیش کر دیتی ہیں یا اس کی کالر یا کوٹ وغیرہ پر پھول لگا دیتی ہیں اور اس خیال سے بالکل بے نیاز ہوتی ہیں کہ وہ ہمارے اس طرز عمل پر کیا سوچے گا۔ یعنی ان باتوں سے ان کا واسطہ ہی نہیں ہے کہ اگلا کیا گمان کرے گا۔ گویا ان کا نظریہ ہوتا ہے کہ اس ماحول میں جو بھی آتا ہے وہ ایسا ہی ہوتا ہے اگر چہ ان کا گمان سراسر غلط ہو۔

آگے ذرا پروفیسرز اور طالبات کی پوزیشن بھی ملاحظہ کرتے جائیں پروفیسر صاحب تقریباً بیچ میں بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور تعلیم وتدریس کی توہین کرنے والی وہ طالبات اس کے اردگرد حلقے کی طرف بیٹھتی ہیں، یعنی پورا دائرہ تو نہیں ہوتا لیکن نصف دائرہ کی شکل میں وہ منظر سامنے آتا ہے اگر اس منظر کو الفاظوں میں بیان کیا جائے یا کاغذ پر قلمبند کیا جائے تو اس طرح کہا جائے گا کہ بیچ میں حضرت کرشن صاحب (پروفیسر یا لیکچرار) بیٹھا ہے اور اس کے جو طرف نصف دائرے کی شکل میں گوپیاں براج سے ہیں۔ مجھے بتایئے کہ پروفیسر دنیا میں دنیا کی حوروں کے ایسے جمگھٹے میں بیٹھے ہوں ان کو اور کیا یاد ہوگا ایسے کرشن اپنی ان گوپیوں کو کیا پڑھائیں گے اس کے بیان سے قلم کانپتا ہے مجھے یاد ہے کہ میں نے کلاس کی ایک طالبہ کو دیکھا جو برقعہ پوش ہو کر بیٹھتی تھی باقی سارا خیر۔ پروفیسروں اور تعلیم دینے

والوں کا ایک پہلو نہایت افسوس ناک اور انتہائی نفرت انگیز ہے جس کا ذکر کرنا بھی یہاں ضروری ہے۔ پروفیسروں اور تعلیم دینے والوں کی جنس لطیف نوازی اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ امتحان میں بھی اس کو جا بجا فائدہ پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے اگر کوئی مرد طالب علم امتحان میں بیٹھتا ہے اور بد قسمتی سے اس کے ساتھ اسی امتحان میں کوئی طالبہ شریک ہوئی ہے تو پھر بس سمجھو کہ بیچارے طالب علم کی قسمت ہی خراب ہے کیونکہ وہ پروفیسر صاحبان طالبہ کو امتیازی نمبروں سے نوازتے ہیں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈویژن (Ist) یا کم از کم (IInd) سیکنڈ ڈویژن دینے کی کوشش کرتے ہیں اگرچہ بیچارہ طالب علم کتنا محنتی ہوشیار اور ذہین کیوں نہ ہو، چاہے ہر امتحان میں اس کو نمایاں اور ممتاز پوزیشن کیوں نہ ملی ہو مگر یہاں اس کو ضرور دوسرا درجہ ملے گا۔ کیونکہ (Ist) فرسٹ تو طالبہ لے گئی۔ ہاں اگر بد قسمتی سے دوسری بھی طالبہ ہے تو اس سے دوسری پوزیشن بھی گئی محض اس وجہ سے کہ اس کے مقابلے میں صنف نازک ہے اور پروفیسروں نے شاید قسم اٹھا رکھی ہے کہ صنف نازک کو نوازنے میں یہ سب کچھ کریں گے اگرچہ اس میں انصاف کا قتل عام کیوں نہ ہو۔ اگر کسی ذہین یا ممتاز شاگرد کو راستے سے ہٹانے کی ضرورت پڑی تو اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ مگر صنف نازک کو ضرور نوازیں گے کیونکہ ان کا اصول بھی یہی ہے کہ (لیڈیز فرسٹ) اور آج کی دنیا میں ہے بھی اسی طرح کیونکہ جنس کثیف حسن لطیف کا کس طرح مقابلہ کر سکتی ہے۔ مرد بیچارے میں یہ بہت بڑی خامی ہے کہ اس میں کثافت ہے۔ بھلا بتایئے کثافت لطافت کا کس طرح مقابلہ کر سکتی ہے حالانکہ حقیقت شناس کہتے ہیں کہ:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بھاری کا

مگر حقیقت اور صداقت کی تلاش کرنے والا تو آج کل بہت مشکل سے ملتا ہے۔ یہاں پر ایک واقعہ نقل کرتا ہوں۔ ہمارے ساتھ ایم۔اے میں بھی طالبات تھیں اور ہمارے ساتھ ایک ایسا طالب علم تھا جو ہمارے شعبہ (ریلجن) میں ایم۔اے کرنے سے پہلے دوسرے دو شعبوں میں ایم۔اے کر چکا تھا گویا کہ وہ پہلے سے ہی ڈبل ایم۔اے تھا اور اب تیسرے شعبہ میں ایم اے کر رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ ایل۔ایل۔بی بھی تھا اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کو پرچے حل کرنے کی کتنی مہارت ہوگی کیونکہ وہ تیسری مرتبہ ایم۔اے کر رہا تھا۔ دو مرتبہ امتحانات کا تجربہ ہو چکا تھا اور ہمارے ساتھ دو طالبات پہلی مرتبہ ایم۔اے کر رہی تھیں۔ اور میں بھی پہلی مرتبہ ایم۔اے کر رہا تھا لیکن مجھے اپنا کوئی خیال نہیں تھا کیونکہ میں نے اس بارے میں کوئی تیاری ہی نہیں کی تھی خصوصاً پہلے سال میں۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ میں نے ایم۔اے کی بربوش میں داخلہ لیا تھا۔ اس کے بعد چند دن کلاسز بھی اٹینڈ کیں لیکن گونا گو مصروفیت کی وجہ سے امتحان کی تیاری نہ کر سکا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ اس سال امتحان میں بھی نہیں بیٹھوں گا لیکن جب امتحان میں بیٹھنے کے لیے فارموں کو پر کرنے کی تاریخ آئی تو دوستوں نے

اصرار کیا کہ میں امتحان میں بیٹھوں اور سال ضائع نہ کروں لیکن میں نے کہا کہ امتحان کی رینج بہت بڑی ہے میری تیاری بالکل نہیں ہے، لہٰذا مجھے چھوڑ و مگر انہوں نے نہیں چھوڑا بس مجبور ہو کر عین امتحان سے ایک ہفتہ یا دس دن پہلے تیاری شروع کی چار پیپر حل کرنے تھے۔

۱۔ ہسٹری آف ریلجن (Histary of Religion) یعنی مذہب کی تاریخ

۲۔ کمپیئر ٹیو آف ریلجن (Comparetive Religion) یعنی بین المذاہب تقابل

۳۔ سکالوجی آف ریلجن (Psychalogg of Religion) یعنی مذہب کی نفسیات

۴۔ اسلام۔(Islam)

یہ چاروں پرچے انگلش میں حل کرنے تھے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مجھے کس طرح کی تیاری کرنی تھی اور ٹائم بھی بالکل نہیں تھا لیکن احباب کے اصرار پر (بسم اللہ) کر کے تیاری شروع کر دی اور اللہ کا فضل شامل حال رہا اور پھر امتحان میں بیٹھا خیر نتیجہ نکلا اللہ کی مہربانی سے ایک ہفتہ کی محنت بھی کامیاب گئی ڈویژن تو کوئی نہیں ملی لیکن بس پاس ہو گیا اور پھر ایم اے فائنل کی باری آئی تو اس میں مجھے کافی محنت کرنا پڑی اور اس میں بھی مجھے چار پرچے حل کرنے تھے اور ساتھ واءواء "یعنی زبانی امتحان" بھی دینا تھا اور وہ چار پرچے تھے۔

۱۔ ریلجن ایتھکس (Religion Ethics) مذہبی اخلاقیات

۲۔ سوشالوجی آف ریلجن (Sociologg of Rebigion) یعنی مذہبی عرانیات

۳۔ فلاسفی آف ریلجن (Plilosophy of Religion) یعنی مذہبی فلسفہ

۴۔ اسلام (Islam)

پہلے سال اور فائنل میں ایک پرچہ مشترکہ تھا، یعنی اسلام کے متعلق لکھنا تھا اور پانچویں واءواز اور اس آخری امتحان میں کچھ زیادہ ہی محنت کرنی تھی کیونکہ ای۔ ای میں ڈویژن دونوں سالوں کے نمبروں کو جمع کر کے دی جاتی ہے اور جس نے ایم۔اے میں سیکنڈ ڈویژن نہیں اٹھائی وہ گویا کہ ایک طرح سے فیل ہوا۔ جس طرح میں نے پہلے ذکر کیا کہ پہلے سال میں دیر سے تیاری کرنے کے سبب میں نے پاس ہونے کی حد تک جو مقرر کردہ نمبر تھے حاصل کیے۔ اب خیال کر لیا کہ فائنل میں مجھے کیا کرنا تھا یعنی پاس مارکس سے اوپر تھرڈ ڈویژن کو بھی کراس کر کے کم از کم سیکنڈ ڈویژن تک پہنچنا تھا۔ معاملے کی سنگینیت سے ہر سمجھدار واقف ہو گا مگر اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی اور میں نے محنت شروع کی، کتنی ہی عبارتیں از بریاد کر لیں۔

پھر ایک دن تھا کہ میں امتحان میں بیٹھا اور اللہ کا فضل ہوا۔ امتحان کا رزلٹ آیا اور میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ مارکس تو پوری فرسٹ ڈویژن کی تھیں لیکن پہلے سال کے پاس مارکس کے ساتھ مل کر سیکنڈ ڈویژن تک پہنچی تھیں۔ صرف ایک مضمون میں "۹۰" نمبر اٹھائے تھے۔ (ذالك فضل الله يوتيه من يشاء)

اتنا ہے کہ اس امتحان میں مجھے عربی علم نے کافی فائدہ پہنچایا تھا۔ اصل بات یہ چل رہی تھی کہ میں ایک تو پہلی مرتبہ ایم۔اے کے امتحان میں بیٹھا تھا۔ اس طرح کے اعلیٰ درجے کے امتحان کا پہلے تجربہ نہیں تھا اور دوسری بات کہ پہلے سال کے امتحان کی تیاری پوری طرح نہ ہونے کی وجہ سے کم نمبر ملے جس وجہ سے مجھے سیکنڈ ڈویژن ملی۔ جو کسی غنیمت سے کم نہیں تھی۔

بہر حال میں نہ زیادہ فائدہ میں رہا اور نہ ہی نقصان میں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہوا اور ابھی تک ہے کہ وہ طالب علم جس نے ڈبل ایم۔اے کے ساتھ ساتھ ایل۔ایل۔بی بھی کیا ہوا تھا وہ بھی ہمارے ساتھ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ اور فرسٹ ڈویژن اس کو نہ مل سکی اور جو دو طالبات تھیں ان میں سے ایک کو فرسٹ کلاس کی فرسٹ ڈویژن ملی اور دوسری کو سیکنڈ ڈویژن۔ سیکنڈ کلاس ملا۔ یعنی ڈبل ایم۔اے والا دوسرا نمبر بھی حاصل نہ کر سکا اور طالبات نے اس کو بھی مات دے دی۔ جب حسن کے ہاتھوں مارکس دینے کا قلم ہوا اور وہ ان کا فرادؤں کے زلفوں کے اسیر ہوں۔ تو وہ ان کو نچلے نمبر کس طرح دے سکتے۔ یہ نچلے نمبر تو بہر حال جنس کثیف والے کے لیے باقی رہتے ہیں حالانکہ ان دونوں طالبات کا وہ پہلا امتحان تھا اور عربی علوم پر بھی ان میں کوئی دسترس نہیں تھی اور نہ ہی عربی کے بارے میں کچھ جانتی تھیں حالانکہ اس امتحان میں عربی علوم پر دسترس نہایت ضروری تھی لیکن ہمارے ممتحن نے انصاف کا قتل کر کے ایک کو فرسٹ نمبر اور دوسری کو سیکنڈ نمبر سے نواز دیا اور مرد طلباء بیچارے صرف دیکھتے ہی رہ گئے۔ کیا اخلاق کے لحاظ سے یہ حد درجے کی پستی کا مظاہرہ نہیں ہے؟ سنے سنائے اس طرح کے کئی واقعات ہیں لیکن ہم نے یہاں صرف اس کا تذکرہ کیا جس کا ہم نے مشاہدہ کیا۔ اور ہماری حالت یہ ہے کہ

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اور ہماری مثال تربوزے اور چھری والی ہے

یعنی فالی اللہ سبحانہ وتعالی المشتکی!

میرے ایک دوست عبدالوحید صدیقی جو مولوی فاضل وغیرہ کے امتحانات میں میرے ساتھ تھے وہ بھی ایم۔ اے میں تھا انہوں نے مجھے دو چشم دید واقعات سنائے جن کو یہاں بیان کرنا نامناسب نہیں ہوگا۔ (۱) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن اچانک شور شرابہ ہو گیا۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ دو طالب علموں نے ایک دوسرے پر چاقو کے ساتھ حملہ کیا ہے اور دوسروں نے بیچ بچاء کرا کر فی الحال ان کو جدا کر دیا۔ لیکن پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے درمیان تنازعہ کس چیز کا تھا اس کشمکش کی وجہ یہ تھی کہ دو طالب علم ایک لڑکی کے عاشق تھے اور لڑکی نے ایک کو تو لفٹ کرائی لیکن دوسرے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس وجہ سے اس ناکام عاشق نے کامیاب عاشق پر چاقو کے ساتھ حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔

(۲) دوسرا واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ کچھ لڑکے جو اس کے جان پہچان والے تھے۔ انہوں نے ایم۔اے میں داخلہ لینے کا سوچا ان کا خیال تھا کہ ''ریلجن'' کے ڈپارٹمنٹ میں داخلہ لیا جائے یا ''اسلامک کلچر'' کے شعبہ میں داخلہ لیا جائے۔ کیونکہ وہ دونوں ڈپارٹمنٹ کافی وقت سے داخلہ کے لیے کھلے ہوتے تھے مگر ان حضرات نے آخری تاریخوں میں آ کر ''اسلامک کلچر'' میں داخلہ لے لیا۔ میں نے ان سے دیر سے داخلہ لینے کا سبب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اتنی دیر تک ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ دونوں شعبوں میں سے کس شعبہ میں لڑکیاں زیادہ ہیں اس میں داخلہ لیا جائے۔ اب معلوم ہو گیا ہے کہ اس شعبہ میں لڑکیاں زیادہ ہیں، اس لیے ہم نے بھی اس شعبہ میں داخلہ لیا ہے۔

خدارا سوچئے کہ یہ شاگرد یونیورسٹی میں داخلہ کیوں لیتے ہیں، ان کا مقصد کیا ہوتا ہے، ان اداروں میں تعلیم کے بہانے آ کر کیا رول ادا کرتے ہیں اور اس کے کیا نتائج نکلتے ہیں؟ مگر شاگرد، پروفیسر، عوام، خواص، بلکہ ساری کی ساری قوم اس خطرناک ناٹک کا کوئی نوٹس نہیں لے رہی۔ کیا ان اداروں کو تعلیمی ادارہ کہنا تعلیم کی اہانت نہیں ہے؟ کیا ان کو فحاشی، عریانی بدکاری اور بے غیرتی کی سکھیا کے اڈے کہنا زیادہ موزوں نہیں ہوگا؟ میرے عزیز دوست! سچ پوچھیں تو اندر جل رہا ہے اور حالت یہ ہے کہ ؎

تن ہمہ داغ داغ شد
پنبہ کجا کجا نہم

ان ہی اداروں کے طلباء اور طالبات اس گندے ماحول میں رنگ کر اپنی اور اپنے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی مگر افسوس کوئی غیرت والا نہیں ہے۔ اب غور کریں کہ کیونکر انگریز نے تعلیم کو بے ضرر نام میں لپیٹ کر پوری قوم کو کیا پلایا ہے اور اسی طرح وہ قوم جو سب سے زیادہ اپنی عزت کا خیال کرتی تھی اور قوم کی بیٹیوں کی عصمت وعزت وغیرت کے آبدار موتیوں کی حفاظت کے لیے اپنی جان کا نذرانہ دینے کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔ وہی قوم اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی بیٹیوں کی عصمت کو تار تار کر رہی ہیں۔ اللہ اکبر جب حجاج جیسے سفاک اور خونخوار کے کان پر سندھ کی صرف دو تین مسلمان بیٹیوں کے قید ہونے کی خبر پہنچتی ہے کہ ان عورتوں نے اس مشکل اور نازک موقع پر ان کو مدد کے لیے پکارا ہے تو وہ سفاک اور خونخوار آدمی بھی فوراً حرکت میں آ جاتا ہے اور لبیک لبیک کہہ کر خلیفہ سے اجازت لے کر اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو بھیجا جنہوں نے آ کر سندھ کو فتح کیا۔ یا تو وہ وقت آ گیا ہے جو قوم کے نونہال خود قوم کی بیٹیوں کی عصمت دری کرتے رہتے ہیں۔ کیا آپ کو کراچی میں ہونے والا واقعہ بھول گیا ہے جہاں چند شرابی نوجوانوں نے نشہ کی حالت میں وہاں آئی ہوئی طالبات کے ساتھ جو حشر کیا وہ ایک انتہائی دردناک داستان ہے ان کو جبراً برہنہ کیا گیا، پھر اسی حالت میں ان کو ناچنے پر مجبور کیا گیا اور آخر میں ان کی عصمت کے انمول ہیرے کو ان درندوں نے وہیں پر پاش پاش کر دیا مگر کیا اس کے لیے کسی غیرت والے نے یا قوم نے کوئی

تحریک چلائی؟ یا باعزت اور باغیرت لوگوں نے اپنی اولاد کو بے حیائی کی تعلیم دینے والے اداروں کی طرف بھیجنے سے روک ٹوک کی؟ ہرگز نہیں۔ جب بداخلاقی اس منزل پر پہنچ جائے تو وہ لاعلاج مرض بن جاتی ہے۔ کسی قوم کو ذہنی غلام اس وقت بنایا جاتا ہے جب ان کو بداخلاقی اور بدکرداری میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اب اس سے سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح چالاک انگریز نے اپنے ذہن سے یہ منصوبہ بنا کر اس کو عملی جامہ پہنا کر ساری کی ساری قوم کو بغیر چھری کے ذبح کرایا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا ذہنی غلام بنا دیا۔ اللہ کی قسم وہ لوگ جو اپنی اولاد کو بیٹوں اور بیٹیوں کو ان اداروں کی طرف بھیج رہے ہیں وہ ان کا ہر لحاظ سے ستیاناس کر رہے ہیں وہ ہرگز اللہ کے غضب سے نہیں بچ پائیں گے اور آخرت کے سخت مواخذے اور شدید عذاب سے نہیں بچ پائیں گے بلکہ وہ آخرت کے عذاب عظیم اور سخت برے حساب سے دوچار ہوں گے۔ اللھم احفظنا

آخر میں آتے ہیں ان خانقاہوں، مقابر اور درگاہوں کی طرف جن کو لوگوں نے تقدس کا رنگ دیا ہوا ہے۔ اپنے ملک میں ایسے کئی مقام ہیں۔

، بھٹ شاہ، قلندر شہباز آف سیون کا مقبرہ، ملتان کی درگاہ لاہور میں علی ہجویری کا دربار، جہانگیر کا مقبرہ وغیرہ وغیرہ ان تمام مقامات پر میلے لگتے ہیں بہت زیادہ خلق خدا جمع ہوتی ہے جن میں مرد عورتیں بچے بوڑھے سب شامل ہوتے ہیں بلکہ ان مقبروں پر کچھ بدمعاش اور لوفر قسم کے لوگ رات کو گھومنے کے بہانے اپنی گرل فرینڈز کو لے کر وہاں اپنا منہ کالا کرتے ہیں جس طرح جہانگیر کے مقبرے کے متعلق میرے ایک مولوی دوست نے لاہور میں بتایا۔ بھٹ شاہ کی بھی یہی حالت ہے۔ خاص خاص میلوں کے علاوہ جمعہ کی رات وہاں مجمع ہوتا ہے ہر رات وہاں بدکاریاں اور مرادیں پوری ہوتی ہیں اور ہر بدکار اور لوفر کی مرادیں وہاں پوری ہوتی ہیں، بے غیرت اور دیوس قسم کے لوگ اپنی بیویوں، بیٹیوں، بہنوں، بھابھیوں کو وہاں لاتے ہیں اور ان بدکار اور ناٹک باز عورتوں کے وہاں پر آئے ہوئے بدمعاش قسم کے لوگوں سے پروگرام سیٹ کیے ہوئے ہوتے ہیں اور اسی طرح بھٹ شاہ پر جمعہ کی رات عاشق معشوقوں کا بھی میلہ ہو جاتا ہے۔ کئی ایسے لوفر خود مانتے ہیں کہ ہم آتے ہی عورتوں کے چکر کے لیے ہیں۔ باقی شاہ صاحب سے کہا جائے اگر بالفرض وہاں کے گدی نشین اور مجاور تجربہ خاطر یہ آرڈر جاری کر دیں کہ آج کے بعد یہاں کوئی عورت نہیں آ سکتی پھر دیکھنا ایک مرد بھی وہاں پاؤں دھرتا ہے؟ یعنی کوئی وہاں نہیں آئے گا سناٹا ہی سناٹا چھایا ہوا ہوگا ان مجاوروں اور دغاباز پیروں کی دکانداری بند ہو جائے گی۔ ان کے نذر و نیاز کو بریک لگ جائے گی۔ بھلا وہ کس طرح اس سلسلہ کو بند کر سکتے ہیں۔ اس طرح سیون میں بھی باقاعدہ کمرے اور حجرے بنائے ہوئے ہیں۔ لوفر اور بدمعاشوں سے بھاری فیس لے کر وہاں آئی ہوئی عورتوں سے منتخب حسینائیں ان کو فراہم کرتے ہیں یعنی موٹے الفاظوں میں اس طرح کہا جائے گا۔ یہ درگاہیں اور مقبرے مہذب چکلے (فحاشی کے اڈے) بن چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک آدمی شاہ کے مقبرے میں بدکاری کر رہا تھا۔ مجاور نے اس کو دیکھا تو اس کو لات ماردی اور کہا کہ تو بزرگ سائیں کے قبے میں یہ کام کر رہا ہے؟ اتنے میں اس مجاور کی ٹانگ سوکھ گئی اور شاہ

صاحب نے ان کو کہا اندھے کیا میں نہیں دیکھ رہا؟ گویا شاہ صاحب خود یہ کام کروار ہے ہیں۔ دیکھو اس طرح یہ لوگ خودان بزرگوں کی عزت خاک میں ملا رہے ہیں ان کے معزز نام ونشان کو داغدار کر رہے ہیں۔ اس قصہ سے کیا نتیجہ اخذ ہوگا؟ یہی کہ دل کھول کے یہ کام پورا کرو کوئی تمہیں روکنے والا نہیں ہے اور جو روکے گا وہ خود مصیبت میں پڑ جائے گا۔

لہٰذا اسی طرح اس بزرگ کے مقبرے کے پاس زنا جیسے سنگین جرم کرنے کا لائسنس مل جاتا ہے۔ اور عورتیں اپنے خاوندوں کو کہتی ہیں کہ ہم نے اتنے نہیں اتنے جمعہ شاہ صاحب کی نذر کیے ہیں، لہٰذا ہم ضرور وہاں جائیں گی اور بے غیرت مرد بھی عورت کے پیچھے پیچھے ایسے جیسے خادم یا نوکر ہو، آئے گا۔ اللہ کے فرمان:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (النساء: ٣٤) کے بالکل برعکس کرائے کے ٹٹو کی طرح پیچھے پیچھے آئے گا اور رن (عورت) اس کے آگے آگے بازوؤں کو ہلا ہلا کر ایسے آئے گی جیسے کوئی بڑا قلعہ سر کرنے جارہی ہے، بس مرد اس کو مقبرے تک چھوڑ کر کہیں اِدھر اُدھر جا کر بے خوف ہو جاتا ہے اور عورت (رن) بھلے جا کر ساری رات عیش وعشرت کرے۔ اس بدکاری اور عورتوں کی وجہ سے اچھے بھلے انسان شرک میں مبتلا ہو کر اپنے دین ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ان واقعات پر نظر ڈالیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۂ نور میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ۝﴾ (النور: ٣)

اس کا مطلب کیا ہے اور اس حکم میں کیا حکمت ہے دراصل جو زنا جیسی برائی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ عورتوں کے پوجاری اور صورت پرست بن جاتے ہیں، یعنی ایک زانی غالباً اور اکثر مشرک ہوتا ہے۔ اور مشرک سے ایک زانیہ عورت اکثر طور پر مشرک ہو جاتی ہے، لہٰذا مشرک کے ساتھ مشرکہ اور مشرکہ کے ساتھ مشرک کا ہی جوڑ بنے گا۔ ایمان والے کے لیے مناسب نہیں ہے اور نہ ہی جائز ہے تو ایسی عورت کے ساتھ تعلقات قائم کرنا اور پھر ایسے مقامات پر سرور گلوکاری ہوتی ہے۔ جو کہ عورت خواہ مرد کے لیے اس طرح ہے جس طرح سانپ کے لیے مرلی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے اس طرح کی گلوکاری کو حقیقت شناس بزرگوں نے زنا کے لیے اکسیر قرار دیا ہے اور میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں ایسی قسم کا گانا بجانا اچھے خاصے ہوش ہواس والے انسان کو بھی مدہوش کر دیتا ہے اور وہ سفلی اور بہیمی جذبات کو ابھار کر انسان کی ایسی حالت کر دیتا ہے جو شراب ام الخبائث بھی انسان کی ایسی حالت مشکل سے کرتا ہوگا۔ تجربہ کے طور پر اگر کسی عورت کو اپنی طرف مائل کرنا ہو تو یہی کامیاب (شیطان کی طرف سے ایجاد کردہ) نسخہ استعمال کرے اور وہ عورت سانپ کی طرح بل سے باہر آ کر اس کے پاس حاضر ہوگی۔ پھر اس کی مرضی ہے کہ بے خوف ہو کر کچھ بھی کرے۔ شاہ صاحب کے مقبرے پر تو گانے بجانے کی بڑی بڑی محفلیں لگتی ہیں مقصد صرف جنسیت کی بھوک مٹانا ہوتا ہے اگر کوئی نہیں۔ افسوس کے ہماری ملت وملک کے رکھوالے بھی اس بلا کے سایے سے نہ بچ سکے۔ فوجی بھائیوں

کو بھی جب تک کوئی نور جہاں یا کوئی اور رنگین طبع کی گلوکارہ نہ بہلائے تب تک وہ تیغ وتفنگ چلانے سے عاجز ہوتے ہیں گویا جس قوم کو جہاد کی تیاری کے لیے قرآن کریم کی آیات اکسیر کا کام دیتی تھیں۔ اللہ کی راہ میں یا ہر مقام ومعاملہ اسلام کی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے مشعل راہ تھیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے محبوب العالمین کا پیارا نام روح کی راحت اور دل ودماغ کی غذا ہوا کرتا تھا اس قوم کے لیے آج نور جہان جیسی عورتوں کی آواز، طبلے کی تھاپ پر ناچنے والی اور صحیح جسم کے ہر عضو، اور حصے کو بہلانے والی منحوس کافر اداکارائیں اور ڈانسر کے منحوس کرتبوں سے ہی راحت ملتی ہے۔ فلمی گانوں کی فحش بیانی اور ساز پر ہی راحت ملتی ہے۔ جیسے ہی ان کے کانوں پر ''تینوں رب دیاں رکھاں، تینوں رب دیاں رکھاں'' کی آواز پڑتی ہے وہ ایسے تن وگوش بن جاتے ہیں گویا امرت دھارا کی بارش شروع ہوگئی ہے افسوس کہ ایک طرح بم اور گولے برس رہے ہیں ملک وملت پر کڑی گھڑی آن کھڑی ہے دشمن ہمیں تباہ کرنے کے لیے کمر بستہ کھڑا ہے تو دوسری طرف نور جہاں ریڈیو سے اعلان کرتی ہے کہ میں اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے دوبارہ میدان میں آرہی ہوں۔ پتہ نہیں ہمارا دماغ کہاں گیا ہے؟ آخر نور جہاں، جنگ وجدل، بموں اور ٹینکوں کے مقابلے میں ہماری کیا خدمت کرسکتی ہے اور ہمارے حکمرانوں کا بھی حال دیکھو انہوں نے نور جہاں کو ملکۂ ترنم کا خطاب دیا ہے اور ان کو فوجی بھائیوں کی خدمت بجالانے پر کئی انعامات اور تمغوں سے نوازا ہے۔

خدارا سوچیں جو گانے بجانے اور ساز پر سر ہلاتے ہوں وہ ملک کا کس طرح دفاع کریں گے، کیا میں سچ نہیں کہہ رہا؟ اس کے سوال کے جواب میں کافی بڑھ گیا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ مثالوں اور روزمرہ کے واقعات پر نظر ڈالو گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں پر عورت چھائی ہوئی نظر نہ آئے۔ جس کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ یہی نکلے گا کہ زنا کثرت سے ہونے لگے گا اور بعینہٖ یہی حال ہمارے ملک اور معاشرہ کا ہو چکا ہے۔ آج کی سوسائٹی کی ایک ایک شاخ اور ایک ایک شعبے پر عورت چھائی ہوئی ہے۔ نتیجتاً زنا بھی اتنا عام ہے کہ اس کی تفصیل بیان کرنا بھی مشکل ہے ہر افق پر زنا اور بدکاری کا سایہ ہے اور جس ملک اور قوم کی یہ حالت ہو اس خطہ اور ملک کی قوم اخلاقی لحاظ سے کس طرح کے عمیق گڑھے میں گری ہوئی ہوگی وہاں اللہ کا کیسا غضب ہوگا؟ ایسی قوم کی تباہی اور بربادی میں باقی کس چیز کی کمی ہوگی؟ بس راقم الحروف کی نظر میں ہمارے نوجوانوں کی تنزلی اور اخلاقی انحطاط کے یہی دو سبب ہیں اور باقی رہا اس کا علاج، وہ اولوالعزم اور ہمت والے مستقل مزاج اور حوصلہ مند قوم کے لیے بالکل آسان ہے لیکن افسوس یہ تینوں خوبیاں ہمارے اندر ناپید ہیں۔

بہر حال جب تک موجودہ تعلیمی نظام کو بالکل نئے سرے سے مرتب نہیں کیا جائے گا اور اس میں قومی وملی روحانی ومعنوی تقاضوں کی پذیرائی نہیں کی جائی گی اور اس گندے اور بگڑے ہوئے ماحول کو یکسر تبدیل نہیں کیا جائے گا، جنس لطیف کو اس ماحول سے بالکل الگ نہیں کیا جائے گا، مغربی نقالی کو طلاق بائینہ نہیں دی جائے گی، سراسر اسلامی بود وباش اختیار نہیں کی جائے گی اور اس کے تمام شعبہائے حیات کے افق سے صنف نازک کے سایہ

کو دور نہیں کیا جائے گا، طلباء واساتذہ میں اسلامی روح کو نہیں پھونکا جائے گا، الحادوزندیقہ کے بجائے ایسی تعلیم نہیں دی جائے گی جو ہمیں بلند اخلاق سے سنوارے ایک دیندار اور خدا ترس، خیرخواہ ملک وملت کا سچا خادم بنائے۔ مطلب یہ کہ جب تک مذکورہ تمام باتیں بروکار نہیں لائی جائیں گی تب تک اس صورتحال کی اصلاح نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بھی ہے۔ خلاصہ کلام کہ کسی بھی قوم خصوصاً امت مسلمہ کی ترقی اور عروج کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اخلاقی اعتبار سے بلند پائے کے ہوں۔ ورنہ بداخلاقی قوم اور معاشرے کے لیے سم قاتل ہے اور زنا سے بڑھ کر کوئی بداخلاقی نہیں ہوسکتی، جو قوم اس بداخلاقی میں مبتلا ہو جائے۔ وہ سمجھو تباہی کی طرف بڑی تیز رفتاری کے ساتھ جارہی ہے اگر جلدی میں اس کا تدارک نہیں کیا جائے گا تو سمجھو اس قوم کی تباہی کے دن آچکے اور اس تباہی کی ایک قطعی شدا امر بن چکی، یہ اس لیے کہ قوم کی ترقی کے لیے حوصلہ، اولوالعزمی، باہمت ہونا مجاہدی روح کی ضرورت ہوتی ہے اور زنا کاری کے جرم کے مجرم ان تمام خصلتوں سے محروم اور عاری ہوتے ہیں۔ حوصلہ مند ہونے کے بجائے بزدل ہوتے ہیں۔ اولوالعزم اور ہمت کے بجائے ان میں پست ہمتی ہوتی ہے۔ احساس کمتری کے شکار ہوتے ہیں، مجاہدانہ روح کا لفظ تو ان کی ڈکشنری میں بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے بجائے طبع کے عیاش، فیشن کے دلدادہ، عشق ومحبت جیسے بیکار جنسی کرتوتوں کے لاڈلے، سست اور کسی بھی محنت کے کام سے مغرور، انتہائی درجے کے ڈرپوک۔ لالچی اور چاپلوس، مطلب کے لیے گدھے کے بھی پاؤں میں گرنے والے، نکمے دوسروں پر بھارنے والے، ہر چڑھے سورج کے پجاری، ہر آنے والی قوت کے ایسے تو ساتھی بن جاتے ہیں گویا کہ اصل سے ہی اس کے یار تھے۔ عزت نفس اور خود اعتمادی جیسے جواہر سے ہاتھ دھو کر اپنے آپ کو کٹھ پتلی بنا دیتے ہیں۔ اس لیے ہزاروں حکومتیں بدلی ہوں لیکن ان کا اصول اٹل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اثر ورسوخ والے کے پاس آکر اس کے پاؤں چاٹتے ہیں اور اپنی وفاداری کا تاثر دیتے رہتے ہیں اور اس طرح آرام سے اپنا وقت عزیز عیاشی میں پورا کرتے رہتے۔ بلکہ ضائع کرتے رہتے ہیں۔ اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا آیا تو اس کے غلام، تیسرا آیا تو اس کے بھی گویا زرخرید غلام مطلب کہ حکومتیں رہیں یا نہ رہیں، صدر یا حاکم کوئی بھی بنے مگر ان لالچی لوگوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی کسی کو محسوس بھی نہیں کرواتے، یہ نمونہ بڑی بے غیرتی کا ہے۔ مگر ان کو کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔ ان کی یہ حس ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ جو عزت وذلت میں امتیاز کرے۔ پھر یہ اس طرح ہو جاتے ہیں جیسے کسی انسان کا عضو وہ سن وغیرہ ہو جاتا ہے، پھر اس عضو کو کچھ بھی کرو، کچھ محسوس نہیں ہوتا اس طرح یہ بھی حقیقت سے بے حس اور بے خبر ہو جاتے ہیں۔ جس کو اپنی عزت کا احساس ہوتا ہے وہ اپنی مدافعت پر تیار ہو جاتا ہے۔ مگر یہ مدافعت مجاہدانہ روح، حوصلہ مندی، اور خود اعتمادی کے بغیر ناممکن ہے، اس لیے چونکہ بداخلاقی کے مریض ان خوبیوں کو پہچانتے بھی نہیں۔ جہاد کے تو لفظ سے بھی کانپتے ہیں۔ لہٰذا اپنی عزت کے بچانے کے لیے اٹھنا لامحال ہے۔ ان برے اوصاف پر قناعت کرتے ہوئے اپنی عیاشی اور فحاشی کی جان بچانے میں ہی ان کو عافیت نظر آتی ہے بس یہی ہے

تنزل کی تہہ اور انحطاط کا گڑھا۔ انحطاط کا اور کوئی معنی نہیں ہے۔ دس سوال کے جواب کافی طول پکڑ گئے لیکن کیا کریں، میرے خیال میں اس کے جواب کے لیے اتنی تفصیل ناگزیر تھی۔ ہوسکتا ہے کوئی اس بارے میں مجھ سے اتفاق نہ کرتا ہو لیکن انصاف سے اگر کوئی غور کرے گا۔ پورے بیان کا تحقیقی نظر سے جائزہ لے گا جو پچھلے صفحات میں گزرا ہے تو ان شاء اللہ کلی طرح نہیں تو اکثر حصہ پر ضرور اتفاق رائے کرے گا اور میں نے اکثر وہ باتیں ذکر کی ہیں جو اپنے مشاہدے میں آئی ہوئی ہیں اور بھی کوئی مشاہدہ کر کے تحقیق کرسکتا ہے اگر اس کے آنکھوں پر تعصب یا جہالت یا مغربیت کی اندھی تقلید کا چشمہ چڑھا ہوا نہ ہو اور یقیناً وہ میری باتوں کی حرف بحرف تصدیق وتوثیق کرے گا۔ باقی مغربیت زدہ افراد کو حق نظر ہی نہیں آئے گا لیکن خود زیادہ چراغ پا نہیں ہوں گے اور وہ جن الفاظوں سے مجھے یاد کریں گے وہ ابھی سے میرے ذہن میں موجود ہیں اور ان کی کوئی خاص پرواہ بھی نہیں ہے۔ مجھ سے آپ جیسے مخلص اور عزیز دوستوں نے سوالات کیے اور دیانت کا تقاضا تھا کہ میں ان کا جواب بغیر کسی کمی بیشی کے حقیقت پر مبنی دوں (جس طرح دیا ہے) اس لیے یہ صفحے کالے کیے اور سوالات کے جوابات میں، میں کس قدر کامیاب رہا ہوں اس کا فیصلہ میں نہیں آپ نے کرنا ہے کیونکہ ہمارا کام صرف لکھنے تک محدود ہے باقی اس کی خوبی اور خامی مطلق فیصلہ، ہمارے حلقۂ عمل سعی اور جدوجہد کے دائرے سے باہر ہے اور مجھے امید ہے کہ جوابوں میں جو بھی خامی نظر آئے گی وہ درگزر کی جائے گی۔ انسان کے کسی بھی کام میں کمال تلاش کرنا عیب ہے۔ (الانسان مرکب من الخطا والنسیان) اس لیے آپ بھی اس حقیقت کو مدنظر رکھیں گے، باقی آپ کا ایک سوال رہتا ہے جس کا جواب عرض رکھتا ہوں۔

سوال ۱۰: **آپ کے کتب خانہ میں کتنی اور کس کس موضوع پر کتب ہیں؟ اور معتبر ذرائع کے ساتھ معلوم ہوا ہے آپ عربی میں کتب تصنیف کررہے ہیں؟**

جواب: ہمارے کتب خانہ میں دس، بارہ ہزار کتب ہوں گی، وہ عربی، فارسی، سندھی، انگریزی میں ہیں جبکہ کچھ باقی زبانوں میں بھی ملیں گی۔ عربی زبان میں کتب زیادہ ہیں اور تقریباً ہر فن کی کتاب عربی زبان میں ملے گی۔ اجمالی طور پر ان کو ان موضوعات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) دینیات (۲) تاریخ وجغرافیہ (۳) سیاسیات (۴) صفت وحرفت (۵) طب وجراحت (۶) دین ومذہب (عمومی معنی میں)۔ (۷) اقتصادیات کے متعلق (۸) شعر وسخن (۹) حکایات وافسانچات (۱۰) فلسفہ قدیم وجدید یہ موضوع مختصراً تحریر کیے ہیں۔ اس میں سے ہر ایک پر بفضلہ تعالیٰ تھوڑی یا زیادہ کتب موجود ہیں۔ یہاں اگر ان موضوعات کو تحلیل کیا جائے تو صورتحال اس طرح ہوگی۔ دینیات کے زمرہ میں (۱) صرف (۲) نحو (۳) ادب (۴) معانی وبیان وبدیع کسی حد تک (۵) منطق (۶) کچھ تاریخ کے متعلق (۷) تعلیم التاریخ (۸) قرآن حکیم کی تفاسیر (۹) اصول تفسیر یا متعلق بالعلم التفسیر (۱۰) حدیث (۱۱) اصول حدیث یا متعلق بعلم الحدیث (۱۲) فقہ (۱۳) اصول فقہ (۱۴) علم الفرائض (۱۵) اسرار

شریعت (۱۶) حدف اسلام (۱۷) اسلام کے مخالفین آریہ، قادیانی، شیعہ نیچرین اور پرویزیت اور ملحدین کے ساتھ مقابلے اور ان پر تردید اور ان کے ساتھ ہونے والے بحث ومباحثہ (۱۸) مسلمانوں میں جو فرقہ وغیرہ لکھے جاتے ہیں مثلاً حنفی وغیرہ اور ان پر تدوین (۱۹) فن عقائد اور کلام (۲۰) عربی لغت کے کتب (۲۱) فن سیرت ومناقب گویا یہ سارے دینیات کے موضوع کے تحت درج ہیں۔ اسی طرح اگر ان موضوعات میں سب ڈویژن کی جائے تو صورتحال کچھ اس طرح نظر آئے گی۔ فن حدیث کی سب ڈویژن اس طرح ہوگی (۱) فنون حدیث (۲) شروح حدیث (۳) اجزاء (۴) علل الحدیث (۵) تخریج الاحادیث (۶) اطراف الحدیث (۷) موضوعات (۸) متعلق بعلم الحدیث (۹) اصول حدیث (۱۰) فن رجال (۱۱) کچھ تاریخ کے کتب وغیرہ وغیرہ اور اگر اس چھوٹی سی تقسیم کو پھر تقسیم کریں تو معاملہ اس طرح ہوگا۔ مثلاً: متعلق بالعلم الحدیث میں (۱) غریب الحدیث (۲) ناسخ ومنسوخ (۳) تاویل مختلف الحدیث (۴) تصحیفات المحدثین (۵) جامع البیان العلم وفضلہ (۶) آداب سامع والمتکلم وغیرہ وغیرہ بس یہ ایک جھلک پیش کی ہے اس میں سے آپ ان موضوعات کی وسعت کے بارے میں اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اور مجھے جدید سائنس کی کتاب رکھنے کے بارے میں خیال تھا اور ہے اور موجودہ موضوعات میں اور بھی کئی کتب شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن کیا کریں اس کے لیے جن ذرائع ووسائل کی ضرورت ہے وہ محدود ہیں۔ اس لیے بے حساب آرزو اور چاہت کے ان کے حصول میں ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ اللہ تعالیٰ سے پوری امید ہے کہ وہ میری آرزؤں کو پورا کرے گا۔ (اللھم اٰمین)

آخر میں آپ نے دریافت کیا ہے کہ ''سننے میں آیا ہے کہ میں عربی میں کتب تصنیف کر رہا ہوں'' تو اس کے لیے گذارش یہ ہے کہ مجھے حدیث کے فن رجال کے ساتھ عشق کی حد تک شوق اور ذوق ہے اس لیے کافی وقت پہلے یہ خیال کیا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تہذیب التہذیب کے علاوہ دوسرے جو ثقہ معتمد ومستند رجال ہیں ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو یہ کام شروع کیا تھا۔ پھر چھوڑ دیا، کچھ وقت ہوا ہے یہ خیال ہے کہ قرون سبعہ یعنی ساتویں صدی ہجری کے ثقہ رجال کو ایک جگہ جمع کیا جائے، خواہ وہ تہذیب التہذیب میں آئے ہوں یا نہ بہرحال قرون سبعہ کے ثقات کو جمع کرنے کا خیال ہے۔ کتاب کا خطبہ بھی کسی حد تک لکھ دیا ہے جبکہ کافی رجال کو بھی جمع کیا ہے لیکن ابھی بہت کام پڑا ہے اور یہ کام کتنا بڑا ہے اس کے لیے کتنی سعی اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ مطلوب کتابوں کی شروع سے آخر تک ورق گردانی اور مطالعہ کی کتنی اشد ضرورت ہے وہ ہر اس آدمی سے بخوب آگاہ ہوگا جس کو اس فن کے ساتھ کچھ مس یا الحاق ہوگا۔

میرا ارادہ ہے کہ جو کچھ کتاب دیکھ لیے ہیں ان میں دیکھے ہوئے راویوں کو ایک جگہ کرتا جاؤں۔ کتابیں دیکھ رہا ہوں اور بہت سی کتب دیکھنی ہیں لیکن گونا گو مصروفیات اور مشغولیات کی وجہ سے ٹائم نہیں ملتا اور پھر اوپر سے دوست واحباب کے سوالات کے جوابات دینا اور تفسیر قرآن حکیم کے درس وتدریس کے لیے مطالعہ وغیرہ کرنا، یہ

ساری باتیں اتنا ٹائم نہیں دیتیں کہ صرف اس طرف متوجہ ہوا جائے۔ بہرصورت اللہ تعالیٰ یہ میری آرزو پوری کرے گا اور آپ بھی دعا کریں۔ کتاب لکھنے کا شوق ہے لیکن پھر ٹائم والی بات ہے۔ ٹائم نہیں یہ کیا کریں۔ یہاں آپ کے سوالات کے جوابات ختم ہوئے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين وصلى الله على خير خلقه سيدنا وحبيبنا وشفيعنا ومرشدنا واما منا محمد ن النبى الامى نبى الرحمة وعلى آله واصحابه وبارك وسلم تسليما كثيرا كثيرا. (والسلام)

وانا احقر العباد

محب الله شاه عفى الله عنه

۱۰ جمادى الثانى ۱۳۹۳هـ يوم الخميس

❁❁❁❁

”مقالات راشدیہ“ اور صاحب مقالات

اللہ رب العزت نے ہر دور میں نوع انسانی کے لیے ایک رہبر، راہنما اور اپنا برگزیدہ بندہ (رسول) بھیجا اور بعینہ اس امت کے لیے بھی اپنے پیارے پیغمبر محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا انہوں نے لوگوں کو امن و بھائی چارے کا پیغام دیا اور ساتھ ساتھ احکامات الٰہی سے روشناس کرایا۔ یہ پیغمبر جو چیز اپنے ورثہ میں چھوڑ گئے وہ صرف قرآن و حدیث ہے نہ کہ کوئی جائیداد وغیرہ اور اسی ورثہ کو جن لوگوں نے تھاما وہ انبیاء کے وارث کہلائے جنھیں علماء کے لقب سے نوازا گیا اور پھر انہی علماء کرام نے انبیاء کے ورثہ کو لوگوں میں تقسیم کیا اور اللہ نے ان لوگوں کو عزت و شرف سے نوازا۔

انہی برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہمارے ممدوح مصنف ”مقالات راشدیہ“ صاحب العلم السادس جناب سید محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ انکی شخصیت اسوۂ رسول کا عملی نمونہ تھی۔ کبھی تکبر اور غرور سے کسی سے بات نہ کی اور علم کے میدان میں تو ان کے کیا ہی کہنے۔ آپ کی بابت آپ کے شاگرد رشید استاذ الاساتذہ مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ فرماتے ہیں: شاہ صاحب کا اوڑھنا بچھونا صرف کتابیں تھیں، آپ اس بات کے حقیقی مصداق تھے

”مریں گے کتابوں میں ورق ہوں گے اپنا کفن“

آپ رحمہ اللہ کی شخصیت کا مفصل تذکرہ ان شاء اللہ رسالہ ”محدث العصر“ میں ہوگا۔ یہاں جو ہمارے ہاتھ میں مقالات ہیں سبحان اللہ ان کی علمیت، ان میں عمل کا پہلو، ان کی تحقیق کے تو کیا ہی کہنے، ہر مقالا اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے لیکن اس مجموعہ میں چند ایسے مضامین ہیں کہ جنہیں پڑھ کر ہر قاری ایک محقق بنے گا بالخصوص ”اذان عثمانی“، ”کیا آسیہ، حضرت مریم، اور موسیٰ کی بہن علیہم السلام جنت میں نبی ﷺ کی بیویاں ہوں گی؟“ کی تحقیق، ”رکوع کے بعد ہاتھ چھوڑنا ہی مسنون عمل ہے“ اور ”انسانی اعضاء کی پیوندکاری کا حکم“ جیسے نادر مضمون شامل ہیں۔ ان مقالات کو میں نے حرف بحرف پڑھا اور بہت مفید پایا، ہر مضمون اپنی علمی روشنی بکھیرتے ہوئے ایک دوسرے سے تحقیقی میدان میں آگے محسوس ہوا اور آپ بھی ان شاء اللہ مفید پائیں گے۔

آخر میں، میں جناب سید قاسم شاہ راشدی صاحب کا شکر گذار ہوں کہ جنہوں نے ہمارے ساتھ بے پناہ تعاون فرمایا اور ہر موڑ پر ہمارے ساتھ رہے اور اس عظیم کام کے لیے ہمیں علمی مواد سے نوازا۔ بالخصوص استاذ محترم جناب الشیخ افتخار احمد الازہری صاحب کا کہ جنھوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کو اس عظیم مشن کے لیے قربان کر دیا، جنھوں نے ان مقالات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑہ اٹھایا۔ اللہ تعالیٰ موصوف کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے۔

یاد رہے! یہ کتاب نعمانی کتب خانہ کی عظیم شاہکار ہے۔ اور مکتبہ کے مدیر محترم جناب ضیاء الحق نعمانی صاحب کے اعلی طباعتی ذوق کی آئینہ دار ہے جنھوں نے اس کتاب کو اپنی خداداد صلاحیتوں سے چار چاند لگا دیے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کے ادارہ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین

حافظ ثناء اللہ خاں (بیرانی)

نُعمانی کُتب خانہ

حق سٹریٹ اُردو بازار لاہور 042 37321865

E-Mail: nomania2000@hotmail.com

Zia ur Rehman 0321-4167895